

روزانہ درس قرآن پاک

تفسیر

سُورَةُ الْبَقَرَةِ

جلد

(۳)

افادات

حضرت مولانا صفوی عبد الحمید صاحب سواتی دام مجید



خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ

تیرھواں ایڈیشن

(جملہ حقوق بحق انجمن محفوظ ہیں)

نام کتاب	معالم العرفان فی دروس القرآن (سورۃ البقرہ آیت نمبر ۱۳۲ تا مکمل سورۃ) جلد ۳
ملاحظات	حضرت مولانا صوفی عبدالحمید سواتی خطیب جامع مسجد نور گوجرانوالہ
مرتب	الحاج لعل دین۔ ایم اے (علوم اسلامیہ) شالا مارٹاؤن لاہور
تعداد طباعت	پانچ سو (۵۰۰)
سرورق	سید الخطاطین حضرت شاہ نفیس الحسنی مدظلہ
کتابت	محمد امان اللہ قادری گوجرانوالہ
ناشر	مکتبہ دروس القرآن فاروق گنج گوجرانوالہ
قیمت	۲۱۰/- دو سو دس روپے
تاریخ چودھواں ایڈیشن	ذی القعدہ ۱۴۲۸ھ بمطابق نومبر ۲۰۰۷ء

ملنے کے پتے

- (۱) مکتبہ دروس القرآن، محلہ فاروق گنج گوجرانوالہ (۵) کتب خانہ رشیدیہ، راجہ بازار راولپنڈی
- (۲) مکتبہ رحمانیہ اقراء سنٹر اردو بازار لاہور
- (۳) مکتبہ قاسمیہ، الفضل مارکیٹ لاہور
- (۴) مکتبہ سید احمد شہید، اردو بازار، لاہور
- (۵) کتب خانہ مجیدیہ، بیرون بوہڑ گیٹ ملتان
- (۶) مکتبہ حلیمیہ نزد جامعہ بنوریہ سائٹ نمبر ۶ کراچی
- (۷) مکتبہ اسلامیہ کتب خانہ اڈا گامی، ایبٹ آباد
- (۸) مکتبہ رشیدیہ، سرکی روڈ کوئٹہ
- (۹) مکتبہ العلم ۱۸ اردو بازار لاہور
- (۱۰)

فہرست عنوانات

معالم العرفان فی دروس القرآن جلد نمبر ۳

صفحہ	مضامین	صفحہ	مضامین
۵۲	امم رومی اور قبلہ	۳۱	درس نمبر ۵۵ آیات ۱۴۲ تا ۱۴۳
۵۳	کتمان حق	۳۲	تحویل قبلہ اور ترجمہ
۵۵	درس نمبر ۵۷ آیات ۱۴۸ تا ۱۵۰	۳۳	تحویل قبلہ پر پہلا اعتراض
۵۶	آیات اور ترجمہ	۳۴	اس کا جواب
۵۷	رابط آیات	۳۵	مقام تحویل قبلہ
۵۸	ہر امت کے لیے جہت مقرر ہے	۳۶	افضل امت اور اس کی گواہی
۵۹	جہت فروغی چیز ہے	۳۷	تقرر قبلہ کی غایت
۶۰	بنیادی چیز نیکی ہے	۳۸	تحویل قبلہ پر دوسرا اعتراض
۶۱	استقبال قبلہ کے سہ گونہ احکام	۳۹	درس نمبر ۵۸ آیت ۱۴۴ تا ۱۴۵
۶۲	قبلہ تکمیل نعمت ہے	۴۰	آیات اور ترجمہ
۶۳	قبلہ ذریعہ ہدایت ہے	۴۱	رابط آیات
۶۴	درس نمبر ۵۹ آیات ۱۵۱ تا ۱۵۲	۴۲	تحویل قبلہ کی دوسری وجہ
۶۵	آیات اور ترجمہ	۴۳	تحویل قبلہ کا حکم
۶۶	رابط آیات	۴۴	جہت قبلہ
۶۷	اتمام نعمت	۴۵	مخالفت برائے مخالفت
۶۸	بعثت رسول	۴۶	استقبال قبلہ اور شعائر اسلامی
۶۹	ملاوت اور تزکیہ	۴۷	سرسوئی کا اعتراض
۷۰	کتاب و حکمت کی تعلیم	۴۸	آریہ سماج اور تثلیث
۷۱		۴۹	استقبال قبلہ میں اختلاف

۸۴	آیت اور ترجمہ	۶۴	ان جانی چیزوں کی تعلیم
"	صفا اور مروہ	۶۶	تہذیب الاخلاق کے پانچ اصول
۸۵	تہذیب الاخلاق کا پانچواں اصول [شعار اللہ کی تعظیم ہے]	"	پہلا اصول ذکر الہی
۸۶	تفسیر عزہ ندی	۶۸	دوسرا اصول شکر الہی
۸۷	طواف وسعی	۶۹	درس نمبر ۵۹ آیات ۱۵۳ تا ۱۵۴
۸۹	چاوڑم زم	"	آیات اور ترجمہ
۹۰	صفا اور دعوتِ توحید	"	گزشتہ سے پیوستہ
۹۱	بیت اللہ شریف میں شرک	"	بمصر عروج قوم کی پانچ منازل
"	سعی قدیم سنت ہے۔	۷۰	تہذیب الاخلاق کا تیسرا اصول صبر
۹۳	درس نمبر ۶۲ آیت ۱۵۹ تا ۱۶۳	۷۲	تہذیب الاخلاق کا چوتھا اصول نماز
"	آیات اور ترجمہ	۷۳	شہادت فی سبیل اللہ
۹۴	کتمانِ حق	۷۴	شور کا فقہان
"	کتمانِ حق کی سزا	۷۶	درس نمبر ۶۰ آیات ۱۵۵ تا ۱۵۷
۹۵	مولانا عبید اللہ سندھی	"	آیات اور ترجمہ
۹۷	تعلیم کی اہمیت	"	گزشتہ سے پیوستہ
۹۸	بنیات اور ہدایت	۷۷	آزمائش مقتضائے ایمان ہے
۹۹	معافی کا پروانہ	"	ذرائع آزمائش - خوف
"	لعنت کے مستحقین	۷۸	بھوک
۱۰۰	معبود صرف ایک ہے	۷۹	جان و مال کا نقصان
۱۰۲	درس نمبر ۶۳ آیت ۱۶۴	۸۰	ثمرات کی کمی
"	آیت اور ترجمہ	۸۱	صاحبزادوں کے لیے بشارت
"	گزشتہ سے پیوستہ	۸۳	صلہ صبر
"		۸۴	درس نمبر ۶۱ آیت ۱۵۸

۱۲۱	گزشتہ سے پیوستہ	۱۰۲	کسب معاش
۱۲۲	قانون کی پابندی	۱۰۳	آسمانی کمرے
۱۲۳	حلال و حرام کی تمیز	۱۰۴	زمین
۱۲۵	شیطان کا نقش قدم	۱۰۵	رات اور دن کا تغیر
۱۲۶	ابوابِ اجداد کا اتباع	۱۰۶	بحری جہاز
۱۲۸	صدقہ کا طریقہ	۱۰۷	پانی کا نزول
۱۲۹	کافروں کی مثال	"	جانوروں کی نسل کشی
۱۳۰	درس نمبر ۶۶ آیات ۷۲ تا ۷۳	۱۰۸	ہواؤں کی گردش
"	آیات ۷۴ اور ترجمہ	۱۰۹	مسخر بادل
"	اکل حلال	۱۱۰	نشانات قدرت
۱۳۱	شجرہ الہی	۱۱۱	درس نمبر ۶۷ آیات ۱۶۵ تا ۱۶۷
۱۳۲	محرماتِ اربعہ	"	آیات اور ترجمہ
"	مردار	۱۱۲	مقابل
۱۳۳	خون	"	محبت الہی
۱۳۵	خنزیر کا گوشت	۱۱۳	محبت کی اقسام
۱۳۸	درس نمبر ۶۸ آیت ۱۷۲ تا ۱۷۳	۱۱۴	محبت کی مختلف وجوہات
"	آیت اور ترجمہ	۱۱۵	محبت کی کسوٹی
"	گزشتہ سے پیوستہ	۱۱۷	غیر اللہ کی محبت
۱۳۹	مسئلہ انتقالِ خون	"	اہل ایمان کا طریقہ
۱۴۰	غیر اللہ کے نام پر	۱۱۸	اللہ ہی قادر مطلق ہے
۱۴۲	اھل کا مفہوم	"	تابع اور متبوع
۱۴۳	حالتِ اضطراب	۱۲۱	درس نمبر ۶۹ آیات ۱۶۸ تا ۱۷۱
۱۴۴	ایک شبہ اور اس کا ازالہ	"	آیات اور ترجمہ

۱۶۰	درس نمبر ۶ آیت ۱۷ تا ۱۷۹	۱۴۶	درس ۶۸ آیت ۱۷۲ تا ۱۷۶
"	آیات اور ترجمہ	"	آیات اور ترجمہ
"	اسلام کا فوجداری قانون	"	گزشتہ سے پیوستہ
۱۶۱	اسلامی قانون بمقابلہ قانون جاہلیت	۱۴۷	کتمان حق پر حقیر مفاد
۱۶۲	قتل کی تین اقسام	۱۴۸	علم قرآن کی اشاعت
"	سزائے قتل	۱۴۹	اللہ تعالیٰ کی ناراضگی
۱۶۳	معافی کی صورت	۱۵۰	خارے کا سودا
"	دیت	۱۵۱	درس نمبر ۶۹ آیت ۱۷۷
۱۶۵	قصاص میں زندگی ہے	"	آیت اور ترجمہ
۱۶۷	درس نمبر ۷ آیت ۱۸۰ تا ۱۸۲	"	گزشتہ سے پیوستہ
"	آیات اور ترجمہ	۱۵۳	استقبال قبلہ فروری مسئلہ ہے
"	حفاظت جان کا قانون	"	نیکی کیا ہے
۱۶۸	اسلام کا ضابطہ دیوانی	۱۵۴	ایمان باللہ
"	اسلامی قانون حکمت پر مبنی ہے	"	ایمان بالآخرت
۱۶۹	تحفظ نفس	"	ایمان بالملائکہ
۱۷۰	تحفظ مال	۱۵۵	ایمان بالکتاب
۱۷۱	قانون وصیت	"	ایمان بالانبیاء
۱۷۲	انبیاء کی وصیت	"	انفاق فی سبیل اللہ
۱۷۳	وصیت کی اقسام	۱۵۷	نماز و زکوٰۃ
۱۷۵	وصیت میں تبدیلی گناہ ہے	۱۵۸	ایمانی عہد
۱۷۷	درس نمبر ۸ آیت ۱۸۳ تا ۱۸۴	"	صبر کی عظمت
"	آیات اور ترجمہ	۱۵۹	سچے لوگ
"	گزشتہ سے پیوستہ	"	متقی لوگ

۱۹۵	آیت اور ترجمہ	۱۷۷	فرضیت روزہ
"	شانِ نزول	۱۷۸	روزہ کا مفہوم
"	رمضان اور دُعا	۱۷۹	سابقہ امتوں کے روزے
۱۹۷	آداب دُعا	"	روزہ باطنی عبادت ہے
۱۹۸	خانہانِ شاہ ولی اللہؒ	۱۸۰	روزہ کے جہانی فوائد
۲۰۰	قربِ خداوندی	۱۸۱	روزہ اور قانون کی پابندی
۲۰۱	قبولیت دُعا	۱۸۲	مریض اور مسافر کا روزہ
۲۰۴	درس نمبر ۵، آیت ۱۸۷	۱۸۳	روزہ کے بدلے فدیہ
"	آیت اور ترجمہ	۱۸۴	روزہ رکھنا ہی بہتر ہے
۲۰۵	گذشتہ سے پیوستہ	۱۸۶	درس نمبر ۳، آیت ۱۸۵
"	شانِ نزول	"	آیت اور ترجمہ
۲۰۶	فلسفہ لباس	"	گذشتہ سے پیوستہ
۲۰۷	سابقہ لغزش کی معافی	۱۸۷	ماہِ رمضان اور قرآن پاک
"	حصولِ اولاد	۱۸۸	مختلف مہینوں کی وجہ تسمیہ
۲۰۸	تکمیل روزہ	۱۸۹	مسئلہ خلقِ قرآن
"	سحری کی برکات	"	نزولِ قرآن
۲۰۹	صومِ وصال	۱۹۰	تلاوتِ قرآن
"	اعتکاف فی المساجد	"	قرآن ذریعہ ہدایت ہے
۲۱۰	عورتوں کا اعتکاف	۱۹۲	واضح اور فیصلہ کن دلائل
"	حفاظت بر حد و شرعیہ	۱۹۳	روزہ لازم ہے
۲۱۲	درس نمبر ۶، آیت ۱۸۸	"	روزے کی قصاص
"	آیت اور ترجمہ	۱۹۴	اللہ آسانی چاہتا ہے
"	گذشتہ سے پیوستہ	۱۹۵	درس نمبر ۴، آیت ۱۸۶

۲۲۵	حرمت والے میلنے	۲۱۲	رابط آیات
"	اوقات کا تعین	۲۱۳	شیخ السنہ کا ترجمہ قرآن
۲۲۶	چاند کی تقدیم	"	مولانا سید عزیز گل
۲۲۷	حج کے لیے جلدی	۲۱۴	مولانا سید وحید احمد مدنی
۲۲۸	رسومات باطلہ	"	انگریز کی چال بازی
"	صراطِ مستقیم	۲۱۵	شیخ سعدی
۲۳۰	درس نمبر ۸ آیت ۱۹۰ تا ۱۹۳	۲۱۶	ترک سلطنت
"	آیات اور ترجمہ	۲۱۷	سپر پاورز
"	جہاد کی قسمیں	"	ہزارہ اور گلستان
۲۳۲	جہاد پر اعتراض	۲۱۸	زوال کے اسباب
"	اقدامی اور دفاعی جہاد	"	فرقہ بندی کی لعنت
۲۳۳	قتال کا حکم	۲۱۹	تحرک ریشمی رومال
"	کفار کی طرف سے پہل	"	تزکیہ مال
۲۳۴	زیادتی کی ممانعت	۲۲۰	اکل حرام
۲۳۵	جہاد کا مقصد	"	رشوت
"	جہاد کے اصول	"	غاصبانہ قبضہ
۲۳۶	فتنہ و فساد کی بیخ کنی	۲۲۲	درس نمبر ۹ آیت ۱۸۹
۲۳۸	درس نمبر ۹ آیت ۱۹۴ تا ۱۹۵	"	آیت اور ترجمہ
"	آیات اور ترجمہ	"	رابط آیات
"	گزشتہ سے پوچھنا	"	شانِ نزول
۲۳۹	حدیث کا واقعہ	۲۲۳	امام بیضاوی
"	جنگ کی اجازت	"	سوالی و جواب میں اختلاف
۲۴۰	اوسے کا بدلہ	۲۲۴	چاند کی مختلف صورتیں

۲۵۶	ربط آیات	۲۴۰	خوف خدا
۲۵۷	حج کے مہینے	۲۴۱	اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنا
"	احرام کی پابندیاں	۲۴۳	فقہ حنفی
۲۵۸	بے حجابی	۲۴۴	قانونِ صلح و جنگ
"	نافرمانی	"	الفاق فی سبیل اللہ
۲۵۹	لڑائی جھگڑا	۲۴۵	فضول خرچی
"	سخت تہنہ	"	تبلیغ دین
"	حج مبرور	۲۴۶	احسانِ کرم
۲۶۱	زاوہ	۲۴۷	درس نمبر ۸۰ آیت ۱۹۶
۲۶۲	گداگری حرام ہے	"	آیت اور ترجمہ
۲۶۳	تقویٰ بہترین زاوہ ہے	"	گزشتہ سے پیوستہ
"	تجارت جائز ہے	۲۴۸	حج اور عمرہ
۲۶۵	درس نمبر ۸۲ بقیہ آیت ۱۹۸ تا ۱۹۹	۲۴۹	للہ کا مفہوم
"	آیات اور ترجمہ	۲۵۰	احصار کے مسائل
"	ربط آیات	۲۵۱	قربانی اور حلق
"	وقوفِ عرفہ	"	احرام کی جنایات
۲۶۷	عرفات کے معانی	۲۵۲	حج کی اقسام
۲۶۸	عرفات کی مصروفیات	۲۵۳	تمتع اور قربانی
"	عرفات سے واپسی	۲۵۴	قربانی کا بدلہ
۲۶۹	وقوفِ مزدلفہ	"	تمتع کی شرط
۲۷۰	ذکر الہی	۲۵۵	احکام کی پابندی
۲۷۲	قریش مکہ کا شخص	۲۵۶	درس نمبر ۸۱ آیت ۱۹۷ تا ۱۹۸ تقریباً نصف
۲۷۳	استغفار کا حکم	"	آیات اور ترجمہ

۲۸۹	سعودی عرب میں اجرائے حدود	۲۷۴	درس نمبر ۸۳ آیت ۲۰۰ تا ۲۰۳
"	جان نثارین اسلام	"	آیات اور ترجمہ
۲۹۲	درس نمبر ۸۵ آیت ۲۰۸ تا ۲۱۰	۲۷۵	منیٰ کی مصروفیات
"	آیات اور ترجمہ	۲۷۶	طواف زیارت
"	مکمل اسلام	"	خانہ فی تقاخر
۲۹۳	شیخ المنہ اور ترجمہ قرآن	۲۷۷	ذکر الہی
۲۹۴	بدعات کی تردید	۲۷۸	دنیا کی خواہش
۲۹۶	ظاہر و باطن میں یکجائی	"	دنیا اور آخرت
۲۹۸	اسلام انقلابی مذہب ہے	۲۸۰	ذخیرہ آخرت
۲۹۹	شیطان کے نقش قدم	"	ایام تشریق
"	وعید خداوندی	۲۸۱	قیام منیٰ میں تحفیف
۳۰۰	اللہ تعالیٰ کا فیصلہ	"	قانون کی پابندی
۳۰۲	درس نمبر ۸۶ آیت ۲۱۱ تا ۲۱۲	۲۸۲	تقویٰ کیا ہے
"	آیات اور ترجمہ	۲۸۳	درس نمبر ۸۴ آیت ۲۰۴ تا ۲۰۷
"	واضح نشانیاں	"	آیات اور ترجمہ
۳۰۳	انبیاء نعمت النبی ہیں	"	ربط آیات
۳۰۴	الغنائم کی ناقدری	۲۸۴	مخلص اور منافق
۳۰۶	حُب دنیا	۲۸۵	اصلاح قلب
۳۰۷	اہل ایمان سے ٹھٹھ	"	فاد فی الارض
"	اہل تقویٰ	۲۸۶	تولیٰ بمعنی حاکم
۳۰۸	رزق کی فراوانی	۲۸۷	جرائم کی سرپرستی
۳۰۹	مال کے تین مصروف	۲۸۸	تجربہ نگار
۳۱۱	درس نمبر ۸۷ آیت ۲۱۳	۲۸۹	مسلمان مگر منافق

۳۳۱	درس نمبر ۸۹ آیت ۲۱۶ تا ۲۱۸	۳۱۱	آیت اور ترجمہ
"	آیات اور ترجمہ	"	گذشتہ سے پیوستہ
۳۳۲	گذشتہ سے پیوستہ	۳۱۲	امت واحدہ
۳۳۳	جہاد اور قتال میں فرق	۳۱۳	بعثت انبیاء
"	فرض عین اور فرض کفایہ	۳۱۵	کتاب سادہ
۳۳۵	خیر و شر اللہ کے علم میں ہے	۳۱۶	درجہ اختلاف
"	غالب اور مغلوب	"	حق و باطل میں تمیز
۳۳۶	حرمت والے مہینے	۳۱۸	صبر و استقامت
۳۳۷	شانِ نزول	"	ہدایت ربانی
۳۳۸	حرام فعل	۳۲۰	درس نمبر ۸۸ آیت ۲۱۴ تا ۲۱۵
۳۳۹	مرتہ اور اسکی سزا	"	آیات اور ترجمہ
۳۴۰	اہل ایمان کے لیے خوشخبری	"	گذشتہ سے پیوستہ
۳۴۱	درس نمبر ۹۰ آیت ۲۱۹ تا ۲۲۰	۳۲۱	مشکلات کا سامنا
"	آیات اور ترجمہ	۳۲۲	سابقین کی مثالیں
"	گذشتہ سے پیوستہ	۳۲۳	نصرت الہی
"	موضوع آیت	۳۲۴	اشاعت دین
۳۴۲	شراب نوشی	۳۲۵	جانی اور مالی جہاد
۳۴۳	قمار بازی	۳۲۶	مجاہدہ ضروری ہے
۳۴۴	حرمت شراب کے مراحل	"	خرچ کی مدت (۱) والدین
۳۴۶	حرمت شراب پر تادمیں	۳۲۷	(۲) اقرباء
۳۴۸	حرام چیز کی تجارت بھی حرام ہے	۳۲۸	(۳) یتیم و مسکین
"	خرچ کی مقدار	"	(۴) مسافر
۳۴۹	ذخیرہ اندوزی کی ممانعت	۳۲۹	اسلامی معاشرہ

۲۶۹	توبہ اور پاکیزگی	۳۵۰	غزوہ فحیح کی دعوت
۳۷۰	عورت بمنزلہ کھیتی	۳۵۱	درس نمبر ۹۱ آیت ۲۲۰ بقیہ
۳۷۱	نیک اولاد صدقہ جاریہ	"	آیت اور ترجمہ
۳۷۲	درس نمبر ۹۲ آیت ۲۲۱ تا ۲۲۴	"	گزشتہ سے پیوستہ
"	آیات اور ترجمہ	۳۵۲	شان نزول
"	رابط آیات	۳۵۳	یتیم کی سرپرستی
۳۷۳	مسئلہ قسم	۳۵۵	مفسد اور مصلح
"	ناجائز قسم کی ممانعت	۳۵۷	درس نمبر ۹۲ آیت ۲۲۱
۳۷۴	قسم کی تین قسمیں	"	آیت اور ترجمہ
۳۷۵	قسم کا کفارہ	"	رابط آیات
۳۷۶	مسئلہ ایلاء	۳۵۸	مشرکین سے نکاح کی ممانعت
۳۷۹	درس نمبر ۹۵ آیت ۲۳۸	۳۵۹	ارتداد ناقض نکاح ہے
"	آیت اور ترجمہ	"	شرک کیا ہے
"	رابط آیات	۳۶۱	اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے
"	نکاح اور طلاق	۳۶۲	دوزخ اور جنت کی طرف دعوت
۳۸۰	دوسرے مذاہب سے تقابل	۳۶۴	درس نمبر ۹۳ آیت ۲۲۲ تا ۲۲۳
۳۸۱	اسلام میں نظریہ طلاق	"	آیات اور ترجمہ
"	عدت	"	رابط آیات
۳۸۳	حیض یا طہر	۳۶۵	عورتوں کے مختص خون
"	کتمانِ حمل جائز نہیں	۳۶۶	مدت حیض
۳۸۴	طلاقِ رجعی	"	افراط و تفریط
۳۸۵	حقوق زوجین	۳۶۷	سوال و جواب
۳۸۶	مرد کی فضیلت	۳۶۸	حائضہ کے احکام

۴۱۱	نکاح ثانی میں رکاوٹ نہ بنو	۲۸۷	طلاق کا حق مرد کو ہے
۴۱۳	درس نمبر ۹۹ آیت ۲۳۳	۲۸۹	درس نمبر ۹۶ آیت ۲۲۹
"	آیت اور ترجمہ	"	آیت اور ترجمہ
"	مسئلہ رضاعت	"	ربط آیات
۴۱۴	مدت رضاعت	۲۹۰	نکاح سنتِ انبیاء ہے
۴۱۵	رضاعت اور خیرچہ کی ذمہ داری	"	شرائط نکاح
۴۱۷	یتیم بچے کی رضاعت	۲۹۲	طلاق کی تین قسمیں
۴۱۸	مدت رضاعت میں رعایت	"	رجعی طلاق میں دوہری
"	اجنبی عورتوں سے رضاعت	۲۹۳	علحدگی کا طریق کار
۴۲۰	درس نمبر ۱۰۰ آیت ۲۳۲ تا ۲۳۵	۲۹۴	خلع کا بیان
"	آیات اور ترجمہ	۲۹۵	طلاق بالمال
۴۲۱	ربط آیات	۲۹۶	حدود اللہ کا احترام
"	عدت کی مختلف اقسام	۳۹۷	درس نمبر ۹۷ آیت ۲۳۰
۴۲۲	بیمہ کی عدت	"	آیت اور ترجمہ
"	غیر مذہب میں قبائیں	۳۹۹	حلالہ
۴۲۴	نکاح کی اجازت	۴۰۰	طلاق کی مختلف صورتیں
"	عدت میں اشارے کنائے کی اجازت	"	طلاق ثلاثہ کی تحقیق
۴۲۷	درس نمبر ۱۰۱ آیت ۲۳۶ تا ۲۳۷	۴۰۳	مشروط نکاح
"	آیات اور ترجمہ	۴۰۵	درس نمبر ۹۸ آیت ۲۳۱ تا ۲۳۲
"	ربط آیات	"	آیت اور ترجمہ
۴۲۸	حق مہر لازمی ہے	۴۰۶	طلاق برائے ایذا رسانی
۴۲۹	خاندان شاہ ولی اللہ	۴۰۸	بنہ کیر با احسان اللہ
۴۳۰	اوزنگ زیب عالمگیر	۴۰۹	نکاح میں عورت کی رضامندی
۴۳۱	حق مہر کا عدم تقرر	۴۱۰	مسئلہ ولایت

۴۵۱	درس نمبر ۱۰۴ آیت ۲۴۶	۴۲۲	مہرِ نعل
"	آیت اور ترجمہ	۴۲۳	نصفِ مہر
"	رابط آیات	"	معافی تقویٰ کی علامت ہے
۴۵۲	اسلام کا سیاسی نظام	۴۲۴	فضیلت کی پاسداری
"	بنی اسرائیل کا زوال	۴۲۵	درس نمبر ۱۰۲ آیت ۲۳۸ تا ۲۴۲
۴۵۳	حضرت اسماعیل علیہ السلام	"	آیات اور ترجمہ
"	آغاز واقعہ	۴۲۶	رابط آیات
"	لفظ ملک کی تشریح	"	صلوٰۃ و سلیٰ
۴۵۴	ملوکیت کا تصور	۴۲۸	منازخوت
۴۵۶	جماعت کی اہمیت	۴۲۹	بیواؤں پر احسان
"	بنی اور قوم میں مکالمہ	۴۳۰	مطلقہ کے حقوق
۴۵۷	بنی اسرائیل کی روگردانی	۴۳۱	درس نمبر ۱۰۳ آیت ۲۴۳ تا ۲۴۵
"	ظالم اور عادل	"	آیات اور ترجمہ
۴۵۹	درس نمبر ۱۰۵ آیت ۲۴۷ تا ۲۴۸	"	رابط آیات
"	آیات اور ترجمہ	۴۳۲	اسلوبِ خطاب
۴۶۰	رابط آیات	۴۳۳	جہاد سے فرار اور موت
"	طاوت بطور بادشاہ	۴۳۵	دوبارہ زندگی
۴۶۱	امیر کی خصوصیات	۴۳۶	جہاد سے گمراہی حرام ہے
۴۶۲	خلیفہ کا انتخاب	۴۳۷	جہاد کا حکم
۴۶۳	مولانا عبید اللہ سندھیؒ	۴۳۸	جہاد بالمال
۴۶۶	شرائط خلافت	"	جہاد کی اہمیت
۴۶۷	تابوتِ سکینہ	۴۳۹	قرضِ حسنہ
۴۶۹	درس نمبر ۱۰۶ آیت ۲۴۹	۴۵۰	قبض و لبط

۴۹۰	انسان اپنے ارادہ کا خود ذمہ دار ہے	۴۶۹	آیت اور ترجمہ
۴۹۲	درس نمبر ۱۰۹ آیت ۲۵۴	"	رابط آیات
"	آیت اور ترجمہ	۴۷۰	شکھ طائوت اور جالوت
"	رابط آیات	۴۷۱	شکھ کی آزمائش سپاہی کے اوصاف
"	جان و مال کی قربانی	۴۷۲	اکثریت کی ناکامی
۴۹۳	الفاق فی سبیل اللہ	"	تین گروہ
۴۹۴	خرج میں اعتدال کی راہ	۴۷۴	تاریخی واقعات
۴۹۵	روز قیامت خرید و فروخت نہ ہوگی	۴۷۷	درس نمبر ۱۰۷ آیت ۲۵۰ تا ۲۵۱
"	دوستی کام نہ آئیگی۔	"	آیات اور ترجمہ
۴۹۶	عام سفارش نہیں ہوگی	"	رابط آیات
"	کفار ہی ظالم ہیں	۴۷۸	میدان جنگ میں دعا
۴۹۸	درس نمبر ۱۱۰ آیت ۲۵۵	۴۸۰	جالوت سے مقابلہ
"	آیت اور ترجمہ	۴۸۱	حضرت داؤد علیہ السلام کا کاہنامہ
"	رابط آیات	۴۸۲	مناقب حضرت داؤد علیہ السلام
۴۹۹	آیت الکہفی کی فضیلت	۴۸۳	فلسفہ جہاد
۵۰۲	توحید باری تعالیٰ	۴۸۵	درس نمبر ۱۰۸ آیت ۲۵۲ تا ۲۵۳
۵۰۴	ملکہ شفاعت	"	آیات اور ترجمہ
۵۰۵	علم غیب خاصہ خداوندی ہے	"	رابط آیات
۵۰۷	عرش اور کرسی	۴۸۶	بعثت انبیاء کا مقصد
۵۰۹	درس نمبر ۱۱۱ آیت ۲۵۶ تا ۲۵۷	"	تصدیق رسالت
"	آیات اور ترجمہ	۴۸۷	انبیاء کی ایک دوسرے پر فضیلت
"	رابط آیات	۴۸۹	حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات
۵۱۰	دین میں جبر نہیں	"	روح القدس سے تائید

۵۳۲	گدھا کیسے زندہ ہوا	۵۱۲	شارن نزول
۵۳۳	عالم برزخ	۵۱۳	مضبوط کپڑا
۵۳۴	اجسام کی حفاظت	۵۱۴	نور اور ظلمت
"	یقین کے تین مدارج	۵۱۵	طاغوت کی دوستی
۵۳۶	درس نمبر ۱۱۴ آیت ۲۶۰	۵۱۷	درس نمبر ۱۱۲ آیت ۲۵۸
"	آیت اور ترجمہ	"	آیت اور ترجمہ
"	تمہید	"	ربط آیات
۵۳۷	پس منظر	۵۱۸	ابراہیم علیہ اور غرور میں مناظرہ
۵۳۸	انبار شک سے پاک ہیں	"	غرور کا شجرہ نسب
۵۴۰	چار پرندے	۵۱۹	مناظرہ کب ہوا
۵۴۱	پرندوں کی موت و حیات	۵۲۰	مناظرے کا پس منظر
۵۴۲	کمال قدرت کا مشاہدہ	۵۲۲	اصل مناظرہ
۵۴۳	معجزہ اور کرامت	۵۲۳	غیر اللہ کو سجدہ
۵۴۵	درس نمبر ۱۱۵ آیت ۲۶۱ تا ۲۶۳	"	ابراہیم علیہ السلام کا معجزہ
"	آیات اور ترجمہ	۵۲۴	ظالم ہدایت سے محروم ہیں
"	ربط آیات اتفاق فی سبیل اللہ	۵۲۶	درس نمبر ۱۱۳ آیت ۲۵۹
۵۴۶	اجرو ثواب کے درجات	"	آیت اور ترجمہ
۵۴۸	معیار قبولیت	"	ربط آیات
۵۴۹	سائل کے ساتھ نرم رویہ	۵۲۷	متعلقہ شخص کون تھا
۵۵۱	درس نمبر ۱۱۶ آیت ۲۶۴ تا ۲۶۶	۵۲۸	تاریخی پس منظر
"	آیات اور ترجمہ	"	واقعہ پر سطحی نظر
۵۵۲	ابطال صدقہ کی پہلی دو وجوہ	۵۳۰	تباہ شدہ بستی
"	تیسری وجہ ریاکاری	"	موت و حیات کا منظر

۵۷۳	آیات اور ترجمہ	۵۵۳	چٹان کی مثال
"	رابط آیات	۵۵۴	کافر راہنمائی سے محروم ہیں
۵۷۴	ابدایا احتفا	"	رضا الہی کے لیے خرچ
		۵۵۵	باغ کی مثال
۵۷۶	غیر مسلم کے لیے صدقہ	۵۵۷	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۶۷ تا ۲۶۸
۵۷۷	حبشی غیر مسلم محروم ہے	"	آیات اور ترجمہ
"	ہدایت دہندہ صرف اللہ ہے	"	رابط آیات
۵۷۸	پورا پورا بدلہ	۵۵۸	قبولیت کی چوتھی شرط۔ پاکیزگی مال
۵۸۰	درس نمبر ۱۲ آیت ۲۷۳	"	ذاتی کما فی میں سے خرچ
"	آیت اور ترجمہ	۵۵۹	درعی بیادار میں سے خرچ
"	رابط آیات	۵۶۱	معذنیات میں سے خرچ
۵۸۱	فقیر و مسکین	۵۶۱	خبیث مال قابل قبول نہیں
"	محصور و فقراء	۵۶۳	شیطان کا بہکاوا
۵۸۳	فقراء کی پہچان	"	اللہ تعالیٰ کا وعدہ
۵۸۵	گدا گدھی حرام ہے	۵۶۵	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۶۹ تا ۲۷۰
۵۸۶	دین کی خدمت	"	آیات اور ترجمہ
۵۸۸	درس نمبر ۱۲ آیت ۲۷۴ تا ۲۷۷	"	رابط آیات
"	آیات اور ترجمہ	۵۶۷	حکمت کا مفہوم
۵۸۹	صدقہ بمقابلہ سود	"	انفاق پر حکمت کا اثر
"	صدقہ کے چار مواقع	۵۶۹	حکمت منہج خسات ہے
۵۹۰	ایصال ثواب کے لیے تعیین وقت	"	مئلہ نذر
۵۹۱	سود خوردگی حالت زار	۵۷۱	نذر معصیت
۵۹۲	جن کا سایہ	۵۷۳	ظالم بے یار و مددگار ثابت ہونگے
		۵۷۳	درس نمبر ۱۱ آیت ۲۷۱ تا ۲۷۲

۶۱۳	رابط آیات	۵۹۲	تجارت بمقابلہ سود
"	گواہی کی شرائط	۵۹۳	سابقہ سود کی معافی
۶۱۴	عورتوں کی گواہی	۵۹۵	حرمت سود کی حکمت
۶۱۵	شہادت اور قسم	۵۹۶	اہل ایمان کے لیے بشارت
۶۱۶	گواہ کی ذمہ داری	۵۹۷	درس نمبر ۱۲۲ آیت ۲۷۸ تا ۲۸۰
"	جھوٹی گواہی	"	آیات اور ترجمہ
۶۱۷	تحریر کب ضروری ہے	"	رابط آیات
۶۱۸	کاتب اور گواہ کا تحفظ	۵۹۸	شان نزول
۶۱۹	خوف خدا	۵۹۹	سود خوردوں کے لیے تعزیر
۶۲۱	درس نمبر ۱۲۵ آیت ۲۸۳	۶۰۰	تنگہ ست مقرض کے لیے مہلت
"	آیت اور ترجمہ	"	معاف کردینا بہتر ہے۔
"	رابط آیات	۶۰۲	حکومت وقت کی ذمہ داری
۶۲۲	رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں	۶۰۳	آخرت میں محاسبہ
۶۲۳	امانت کی پاسداری	۶۰۴	درس نمبر ۱۲۳ آیت ۲۸۲ نصف اول
۶۲۴	کتمان شہادت گناہ ہے	"	آیت اور ترجمہ
"	شہادت کا معاوضہ جائز نہیں	"	دستاویز کی اہمیت
۶۲۶	درس نمبر ۱۲۶ آیت ۲۸۴	۶۰۵	تحریر کے مسائل
"	آیت اور ترجمہ	۶۰۶	قرض اور دین میں فرق
"	اختتامی کلمات	۶۰۷	بیع سلم
۶۲۷	حاکمیت اعلیٰ	۶۰۹	ادائیگی قرض کا عجیب واقعہ
۶۲۸	محاسبہ کب ہوگا	۶۱۰	تحریر مدیون کا حق ہے
۶۳۰	شان نزول	۶۱۲	درس نمبر ۱۲۴ آیت ۲۸۲ نصف آخر
۶۳۱	اللہ تعالیٰ قادر مطلق ہے	"	آیت اور ترجمہ

۶۳۲	درس نمبر ۱۲۸ آیت ۲۸۶	۶۳۳	درس نمبر ۱۲۷ آیت ۲۸۵
"	آیت اور ترجمہ	"	آیت اور ترجمہ
"	دین آسان ہے	"	ربط آیات
۶۳۴	بجھول اور خطا میں فرق	"	در مدح صحابہؓ
"	بجھول اور خطا پر مواخذہ نہیں	۶۳۴	تصدیق بالقلب
۶۳۵	دعاۓ کلمات	۶۳۵	صفات الہی پر ایمان ایمان بانظر
۶۳۶	معافی کی درخواست	۶۳۶	فرشتوں پر ایمان
"	غلبہ اسلام	۶۳۸	کتاہوں پر ایمان
۶۳۷	سورہ بقرہ کی خصوصیت	۶۳۹	رسولوں پر ایمان
۶۳۸	فضائل آیات آخر سورہ	۶۴۰	بخشش کی طلب
		"	قیامت پر ایمان

احکامِ عمرہ

مذہبِ اہل سنت و جماعت

مُرتب
مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

قیمت:
۱۵/-
روپے

مکتبہ درس القرآن فاروق گنج گوہر انوار
ملنے کا پتہ:

صفحات
۹۶

پیش لفظ

لَحْمُ اللَّهِ وَكَفَى وَسَلَوُ عَلَى عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَى
اَمَّا بَعْدُ

قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا وہ آخری کلام ہے، جسے خود اللہ جل شانہ نے احسن الحدیث کا لقب دیا ہے۔ اللہ نَزَلَ احْسَنَ الْحَدِيثِ كِتَابًا مُتَشَابِهًا مَثَانِیَ عربی کا ایک مقولہ ہے ”کلام الملوک ملوک الکلام“ جو کلام خود مالک الملک کہے، اس سے بہتر کلام کس کا ہو سکتا ہے جس کلام کی نسبت خالق کُلِّ شَیْءِ کی طرف سے اس کی ہمہری کا دعویٰ کون کر سکتا ہے۔ اور جس کے متعلق وہ خود اعلان فرمائے کَلِمَةً اللہ ھِیَ الْعَلِیَّٰ ط اُس سے اعلیٰ وارفع کلام کس کا ہو سکتا ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے خود چیلنج کر دیا وَمَنْ اَصْدَقُ مِنَ اللہ حَدِیْثًا اُس خداوند قدوس کی بات سے سچی بات کس کی ہو سکتی ہے فرمایا اگر ان حقائق کے متعلق کوئی شک ہے۔ فَاتَّوَلَّوْا بِسُوءَةٍ مِّنْ مِّثْلِهِ تُو اس جیسی ایک ہی سورۃ بنا کر لے آؤ۔ مگر یہ چیلنج آج تک تشنہ قبولیت رہا ہے۔

آئیے ہم اپنے دلوں کو ٹٹولیں اور اُن سے پوچھیں کہ کیا ہم نے قرآن حکیم کو وہ مقام دیدیا ہے جس کا وہ متقاضی ہے۔ اس سوال کے جواب کے لیے ہمیں اپنے دلوں کی زمین کو پرکھنا ہوگا کہ وہ قرآن پاک کی برکات کو جذب کرنے کے قابل بھی ہے یا نہیں وَالْبَلَدُ الطَّيِّبُ يَخْذُجُ نَبَاتَهُ بِإِذْنِ رَبِّهِ وَالْكَثِیْرُ نَجَبٌ لَا يَخْذُجُ اَلَّا نَسِیْدًا اچھی زمین اللہ کے حکم سے سبزیاں اُگاتی ہے مگر خراب زمین سے فضول چیزیں ہی پیدا ہوتی ہیں۔ اپنے دلوں سے سوال کرنے سے پہلے آئیے قرآن پاک کے اولین منیٰ طبین کی طرف ایک نگاہ اٹھا کر دیکھ لیں کہ

مکے آتے ہیں تو قریش نے ہر چند سمجھا یا کہ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے دامن میں نہ بچنس جانا۔ پہلے تو کانوں میں روٹی ٹھونس کر پھرتے رہے کہ کہیں حضور علیہ السلام کی آواز کان میں نہ پڑ جائے، پھر خیال آیا کہ میں بھی شعروادب پر عبور رکھتا ہوں، کیوں نہ اُس کلام کا بھی جائزہ لیا جائے جو حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم پیش کرتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نماز میں قرآن پاک کی تلاوت میں مشغول ہیں۔ طفیل سنتا ہے اور سنتا ہی رہ جاتا ہے جب آپؐ نے غمزدہ ختم کی تو ساتھ ہی بولیا۔ اور اپنے آپ کو اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ کا مصداق بنا دیا، خود کہا کرتے تھے ”خدا کی قسم آج تک اس سے بہتر کلام نہ میرے کانوں نے سنا اور نہ اس سے زیادہ عادلانہ مذہب کوئی دیکھا۔“

جبیر ابن مطعم نیک سیرت انسان تھے۔ مگر جاہلیت کی عصبیت قبول حق میں مانع تھی۔ جنگ بدر کے قیدی چھڑانے کے لیے دونوں مدینہ منورہ آئے، حضور نبی کریم نماز میں سورۃ طہ کی تلاوت فرما رہے ہیں وَالطُّورِ ۝ وَكِتٰبٍ مَّسْطُوْرٍ ۝ فَبِ رَقٍ مِّنْشُوْرٍ ۝ وَالْيَتِیْرِ الْمَعْمُوْرٍ ۝ جبیر کہتے ہیں مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے میرا قلب پھٹ جائیگا، پھر جب آپؐ نے یہ آیت تلاوت فرمائی اِنَّ عَذَابَ رَبِّكَ لَوٰقِعٌ ۚ نَّ مَّا لَهُ مِنْ دَافِعٍ ۚ تو کچھ طاری ہو گئی۔ ایسا خوف پیدا ہوا کہ کہیں اسی وقت اللہ کا عذاب نازل نہ ہو جائے۔ اس کے بعد آپؐ جلد ہی ایمان لے آئے۔

حضرت عثمانؓ ابن مظعون کے ساتھ بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا۔ سادہ طبیعت اور نیک انسان تھے، سورۃ نمل کی آیت سنتے ہیں اِنَّ اللّٰهَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِیْتَاٰ ذِی الْقُرْبٰی وَیَنْہٰی عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغِیِّ یُعْظِکُمْ لَعَلَّکُمْ تَذَکَّرُوْنَ خود بیان کرتے ہیں کہ ”یہی وہ قوت ہے جب ایمان میرے دل میں جاگنیں ہوا اور میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم سے محبت کرنے لگا۔ الغرض! خود قرآن پاک نے اپنے متعلق فرمایا۔ لَوْ اَنْزَلْنَا هٰذَا الْقُرْآنَ عَلٰی جَبَلٍ لَّرَاٰیَتْہُ خَاشِعًا مَّتَصَدِّعًا مِّنْ خَشِیْمَةِ اللّٰهِ ط اگر یہ قرآن پہاڑوں پر نازل ہوتا تو وہ بھی خوف الہی سے ریزہ ریزہ ہو جاتے۔ مگر ایک حضرت انسان

ہے، جو اسکی اثر انگیزی سے بیگانہ اور اس کی برکات سے محروم ہے۔ ہاں اس کا اثر وہ شخص قبل کرتا ہے۔ جس کے پاس سوچنے والا دماغ، سمجھنے والا دل اور دیکھنے والی آنکھ ہے۔ جس کی آنکھ میں روشنی نہیں اس کے لیے آفتاب کی روشنی بھی بیکار ہے۔ قرآن پاک قلب و ذہن کی کایا لپٹ مینے والا کلام ہے۔ اس میں دلوں کو کھینچ لینے والی مقناطیسیت ہے۔ اس نغمہ میں وہ سرور ہے، جس کو سن کر انسان تو کجا شجر و حجر بھی وجد میں آجاتے ہیں۔ یہ قلب کو گرم اور روح کو تڑپا مینے والا کلام ہے۔ اللہ نے اس کا نام ہدایت بھی رکھا ہے اور نور بھی۔ یہ برہان بھی ہے اور فرقان بھی۔ اس میں ہمت بھی ہے اور شفا بھی۔ کاش! ہم اس کی برکات کو اپنے دامن میں سمیٹ سکیں۔ اسی مقصد کے حصول کے لیے سلسلہ دروس القرآن جاری ہے۔ قارئین سے التماس ہے کہ اس کارِ خیر میں حصہ لینے والی پوری ٹیم اور اس کے ساتھ داتے، درمے، سننے تعاون کرنے والے حضرات کی استقامت اور کامیابی کی دعا کریں۔

الحمد للہ سلسلہ دروس القرآن کی تیسری جلد آپ کے ہاتھوں میں ہے۔ اس سے پیشتر — مختلف جلدوں کا مختصر تعارف ہر جلد کے ساتھ آچکا ہے۔ یہ جلد اس لحاظ سے اہم ہے۔ کہ اس کے ذریعے سورۃ بقرہ کی تکمیل ہو رہی ہے۔ قرآن حکیم کی طویل ترین سورۃ کو دو حصوں میں شائع کیا گیا ہے پہلا حصہ پہلے پائے پر مشتمل تھا، اب دوسرے حصے میں دوسرا مکمل پارہ اور تیسرا پارہ تا اختتام سورۃ شامل ہو گیا ہے اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکریہ ہے کہ اس نے اس کام کی توفیق بخشی۔ جیسا کہ گذشتہ جلد کی ابتداء میں عرض کیا جا چکا ہے۔ سورۃ آل عمران پر پیشتر کام مکمل ہو چکا ہے۔ یہ جلد بھی جلد ہی زیرِ طباعت سے مزین ہو کر قارئین کے مطالعہ میں آجائے گی۔ انشاء اللہ

سورۃ بقرہ سے پہلے تیسویں پائے پر مشتمل بیسویں جلد شائع ہوئی تھی۔ قارئین کرام تیسویں پائے اور سورۃ بقرہ کے مضامین میں واضح فرق محسوس کریں گے بیسویں جلد کی ۲۷ سورتوں میں سے ۳۴ مکی دور کی ہیں جب کہ صرف ۲ سورتیں مدنی دور سے تعلق رکھتی ہیں۔ تیرہ سالہ مکی دور میں قرآن پاک نے اپنے مخاطبین کو اسلام کی ابتدائی دعوت

دی چنانچہ مکی سورتوں میں کفر و شرک کا رد، ایمانیات اور معاد سے متعلق موضوعات ہیں
برخلاف اس کے مدنی سورتوں کے مضامین مختلف نوعیت کے ہیں۔

ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں مسلمانوں کو سب سے پہلے یہودیوں سے واسطہ
پڑا۔ یہ لوگ تورات میں نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی نشانیاں پڑھ کر ان کی آمد کے منتظر
تھے۔ وہ اس زعم میں مبتلا تھے کہ اللہ کا آخری نبی بنی اسرائیل میں سے آئے گا، اور وہ
اُسے فوراً تسلیم کر لیں گے، ان کی توقع کے خلاف جب دعویٰ نبوت بنو اسماعیل کے ایک
فرد نے کیا، تو یہودی حسد کی آگ میں جل گئے۔ وہ سمجھتے تھے کہ اگر انہوں نے حضرت
محمد صلی اللہ علیہ وسلم کو آخری نبی تسلیم کر لیا تو ان کی ساری اجارہ داری اور دوسری اقوام پر
تفوق ختم ہو جائے گا، لہذا انہوں نے آپ کی رسالت کا سکر سے انکار ہی کر دیا، اور پھر
اس انکار پر اصرار کرتے ہوئے اہل اسلام کے خلاف سازشیں کرنے لگے۔ دوسری طرف
کچھ یہودی ایسے بھی تھے، جو اسلام کا روشن مستقبل دیکھ کر لظاہر مسلمان ہو گئے، مگر ان کے
دل یہودیوں کے ساتھ فلک ہے۔ اور اس طرح یہ لوگ مسلمانوں کے اندر سے ان پر
شب خون مار کر ان کی جمیعت کو کمزور کرنے کی کوشش کرتے رہے یہ لوگ منافق کہلائے
چنانچہ سورۃ بقرہ کے بیشتر حصہ میں۔ اہل کتاب یہود اور منافقین کی سازشوں کا تذکرہ ہے۔
مدینہ منورہ پہنچ کر مسلمان ایک چھوٹی سی اسلامی ریاست قائم کرنے میں کامیاب ہو
گئے تھے۔ اب انہیں روزمرہ زندگی میں پیش آنے والے مسائل کے لیے قانون کی
ضرورت تھی چنانچہ اس طویل سورۃ میں ایمانیات کے علاوہ امانہ، روزہ، حج، قربانی،
انفاق فی سبیل اللہ وغیرہ سے متعلق کچھ تفصیلات آگئی ہیں۔ عدت و حرمت کے مسائل
ہیں۔ ازدواجی زندگی اور اس سے متعلق مسائل نکاح، طلاق، خلع، عدت، مہر، نان نفقہ
رضاعت وغیرہ کی بعض تفصیلات ہیں، معاشرتی مسائل میں والدین، اقربا، ہمسایوں اور
یتیموں وغیرہ سے حسن سلوک کی تلقین ہے۔ خیرات و صدقات کی بہکات، لین دین
کے معاملات، مہر و من کے ساتھ نرمی، شہادت اور امانت جیسے مسائل بھی آگئے ہیں
صلح و جنگ کے قواعد، قصاص اور دیت کی بعض مبادیات بھی آگئی ہیں۔ اس سورۃ

میں حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق، فرشتوں کے ساتھ مکالمہ اور ابلیس کا تذکرہ بھی مجلا ہو گیا
 جد الانبیاء حضرت ابراہیم علیہ السلام اور آپ کی اولاد میں منصب امامت کے قیام اور
 پھر اسی ضمن میں بیت اللہ شریف کی تعمیر اور دیگر شعائر اللہ کا مختصر بیان بھی آگیا ہے۔
 ہمیں پورا پورا احساس ہے کہ اس جلد کی اشاعت میں اندازے سے زیادہ عرصہ
 لگ گیا ہے۔ کام کی رفتار بھی قدرے سست رہی، نیز اس عرصہ میں ادارہ کو حضرت
 مولانا صوفی عبدالحمید صاحب کی گراں قدر تالیف "نماز مسنون کلاں" کی طرف بھی توجہ مبند دل
 کرنا پڑی۔ بلاشبہ نماز کے موضوع پر اس ضخیم کتاب نے باقی کتب سے بے نیاز
 کر دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے محترم صوفی صاحب کی ایک دیرینہ خواہش اور عوام کی اہم ضرورت
 کو پورا فرمادیا ہے۔ اللہ تعالیٰ صوفی صاحب کو اجر عظیم عطا فرمائے اور آپ کو دین کی مزید
 خدمت کی توفیق عطا فرمائے۔ قارئین سے التماس ہے کہ آپ کی صحت اور درازی عمر
 کے لیے صدق دل سے دعا کریں۔
 امید ہے کہ سلسلہ دروس القرآن کی آئندہ جلد کم از کم وقت میں شائع ہو جائے گی۔
 وَمَا تَوْفِيقِي إِلَّا بِاللَّهِ

احق البیاد

لعل دین
 ایم اے (علوم اسلامیہ)

شالامار ٹاؤن لاہور

سخنائے گھنٹی

الْحَمْدُ لِلَّهِ رَبِّ الْعَالَمِينَ وَالصَّلَاةُ وَالسَّلَامُ عَلَى رَسُولِهِ
الْكَرِيمِ خَاتَمِ الْأَنْبِيَاءِ وَالْمُرْسَلِينَ وَعَلَى آلِهِ وَ
أَصْحَابِهِ أَجْمَعِينَ ۝ آمَّا بَعْدُ

مستند جامع، قرآن، احادیث اور مسلک سلف کے مطابق تفسیر، سادہ، دلنہد،
پرمغز اور تصنع سے پاک انداز بیان، مختصر، عام فہم اور اغلاق سے مبرا مضامین، اسلام کے
بنیادی عقائد کی توضیح و تبیین، کفر، شرک اور بدعات کا احسن طریقے سے رد، مخالفین
پر تنقید میں اعتدال، اور تلخی و رشتگی سے گریز۔

مسلمانوں کی بنیادی خامیوں کی نشاندہی اور اس میں راہ عمل، باطل نظامہائے حکومت
پر بے لاگ تبصرہ، قصص کا سلسلہ مربوط اور دلکش، حکمت ولی اللہی، ضروری فقہی مسائل
سیاسی، اقتصادی، معاشی مسائل اور عصر حاضر میں ان کا حل اور اس طرح کی مفید بحثیں درمیں القرآن
کا خاص امتیاز ہے۔

ولی اللہی فکر اور قرآن کریم کی انقلابی روح کو پوری طرح ان دروس میں سمونے کی کوشش
کی گئی ہے، روال دوال، سہل، مانوس، آسان اور سادہ زبان استعمال کی گئی ہے۔
مسلمانوں کی اقتصادی اور معاشی بد حالی کا پورا کھوج لگایا گیا ہے۔ اور قرآنی طریق کار کی
طرف ان کا رخ موڑنے کی پوری کوشش کی گئی ہے۔ سائنسی اور جدید دور میں مشکل
حالات کا مقابلہ کیسے کیا جاسکتا ہے۔ اس بارے میں قرآنی روشنی کی طرف راہنمائی
کی گئی ہے۔ لہو و لعب، عیاشی و فحاشی اور رفاہیت بالغہ کی پوری طرح حوصلہ شکنی
کی گئی ہے۔

مسلمانوں کی فکری گمراہی اور ذہنی غلامی کے فساد کو پوری طرح نمایاں کیا گیا ہے۔

دروس القرآن صحیح معنوں میں اساتذہ و شیوخ سے حاصل کردہ اور حضرت صوفی صاحب دام مجید ہم کی زندگی بھر کے مطالعہ سے حاصل ہونے والے علوم و فنون کا انچور ہے۔
 زیر نظر جلد پارہ ۲ کے شروع سے سورۃ بقرہ کے آخر تک کے حصہ پر مشتمل ہے اس جلد میں دعوت الی التوحید والرسالت، فرائض خمسہ، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ ایمانیات، خلافت کبریٰ کے تمام اہم اصولوں، نظام سلطنت، سیاست مدن قانون خانہ داری، جہاد فی سبیل اللہ، صداقت قرآن، علم القصص اور بہت سی مثالوں اور دیگر بہت سے مضامین کا ذکر ہے۔

قرآن پاک کا انتشار سمجھنے اور افہام کو قرآن پاک کے قریب تر کرنے اور سلف صالحین کی تفاسیر سے صحیح آگاہی کے لیے دروس القرآن کا مطالعہ بہت ضروری ہے۔
 آخر میں دلی دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ ان دروس کو صاحب درس حضرت صوفی صاحب دام مجید ہم اور انجمن مجاہدان اشاعت قرآن کے جملہ اراکین اور خصوصاً جناب الحاج لعل دین صاحب ایم، اے علوم اسلامیہ اور اسکی اشاعت میں حصہ لینے والے تمام حضرات کی فوز و فلاح اور بخشش کا ذریعہ بنائے، ان کی اس سعی کو قبول فرمائے اور زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو اس سے فیض یاب ہونے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین

فقط

محمد الشافعی

(فاضل مدرسہ نصرت العلوم و دفاق المدارس العربیہ)

(۲۴ ذیقعدہ ۱۴۰۲ھ بمطابق ۲۱ جولائی ۱۹۸۷ء)

پیش لفظ

طبع ششم

الْحَمْدُ لِلّٰهِ وَكَفَى وَسَلَامٌ عَلَىٰ عِبَادِهِ الَّذِينَ اصْطَفَىٰ أَمَّا بَعْدُ !

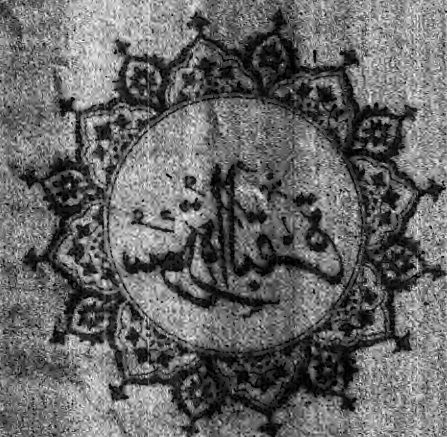
تفسیر عالم العرفان فی دروس القرآن کی تیسری جلد طبع ششم قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے۔ اللہ رب العزت نے اس تفسیر کو اپنی خصوصی عنایات سے بے شمار شرف قبولیت سے نوازا ہے جس کا منہ پورنا ثبوت ایک قلیل عرصہ میں اسکے متعدد ایڈیشنوں کا طبع ہو کر چار دانگ عالم پھیل کر دوا تحسین حاصل کرنا، تفسیر رمضان المبارک ۱۴۱۶ھ میں بیس ضخیم جلدوں میں طبع ہو کر منظر عام پر آچکی ہے۔ اندرون ملک اور بیرونی ممالک سے کثیر خطوط اور ٹیلیفون کے ذریعہ عوام الناس نے اس کے مکمل ہونے پر مبارک بادیں پیش کی ہیں اور اس بات کا برملا اقرار کیا ہے کہ اردو زبان میں اتنی سہل مفصل اور عام فہم تفسیر آج تک نہ دیکھنے میں نہیں آئی۔ اہل سنت والجماعت حنفی دیوبندی مسلک کی صحیح ترجمانی اور اکابر علماء دیوبند کے باجماع مفید ذکر نے اس کی افادیت کو مزید اجاگر کیا ہے۔ اللہ رب العزت کے حضور دعا ہے کہ وہ اس تفسیر کو صاحب تفسیر کے لیے اور تمام معادنین اور قارئین کے لیے نجات کا ذریعہ بنا دے اور دنیا میں لوگوں کی ہدایت کے لیے اور قرآن کریم سے تعلق قائم کرنے کا سبب بنائے۔ آمین۔

طبع ششم میں کتابت کی جو اغلاط رہ گئی تھیں انھیں بھی کافی حد تک درست کر دیا گیا ہے اللہ تعالیٰ قبول و منظور فرمائے۔ آمین۔

احقر:

محمد فیاض خان سواتی

ربیع الثانی ۱۴۲۰ھ بمطابق اگست ۱۹۹۹ء



سُورَةُ الْبَقَرَةِ



سَيَقُولُ ۲

درس پنجاہ و پنج (۵۵)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۴۲ تا ۱۴۳

۲۰

سَيَقُولُ السُّفَهَاءُ مِنَ النَّاسِ مَا وَلَّاهُمْ عَنْ قِبْلَتِهِمُ
الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا ط قُلْ لِلَّهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ يَهْدِي
مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيمٍ ﴿۱۴۲﴾ وَكَذَلِكَ جَعَلْنَاكُمْ
أُمَّةً وَسَطًا لَتَكُونُوا شُهَدَاءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُونَ
الرَّسُولُ عَلَيْكُمْ شَهِيدًا ط وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ
الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا إِلَّا لِنَعْلَمَ مَنْ يَتَّبِعُ الرَّسُولَ مِمَّنْ
يَنْقَلِبُ عَلَى عَقْبَيْهِ ط وَإِنْ كَانَتْ لَكَبِيرَةً إِلَّا عَلَى
الَّذِينَ هَدَى اللَّهُ ط وَمَا كَانَ اللَّهُ لِيُضِلَّ عَنِ اسْمَانِكُمْ
إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَءَوْفٌ رَحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ : پھر قریب لوگوں میں سے یقیناً لوگ کہیں گے کہ ان کو کس چیز نے ان کے
قبلہ سے پھیر دیا ہے، جس قبلہ پر یہ تھے۔ آپ کہہ دیجئے، اللہ ہی کے لیے ہیں مشرق
اور مغرب۔ وہ جس کو چاہتا ہے۔ سیدھے راستے کی راہنمائی کرتا ہے ﴿۱۴۲﴾ اور
اسی طریقہ سے ہم نے تمہیں ایک افضل امت بنایا ہے تاکہ تم لوگوں پر گواہی
دینے والے بنو۔ اور رسول تم پر گواہی دینے والا ہو۔ اور نہیں بنایا ہم نے اس قبلہ کو
جس پر آپ تھے مگر اس لیے تاکہ ہم ظاہر کر دیں کہ کون رسول کی تابعداری کرتا ہے
ان لوگوں میں سے جو اپنی ایڑیوں پر پھرتے ہیں۔ اور بیشک یہ بات بھاری ہے
مگر ان لوگوں پر کہ جن کو اللہ نے ہدایت دی۔ اور اللہ تعالیٰ تمہارے ایمانوں کو ضائع نہ کرے
نہیں ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ شفیق اور نہایت ہی مہربان ہے ﴿۱۴۳﴾

اس سے پہلے ملت ابراہیمی اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر ہو چکا ہے۔ یہ بیت اللہ شریف حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت اسماعیل علیہ السلام اور ان کی اولاد کا قبلہ رہا۔ قیام مکہ کے دوران حضور علیہ السلام کا قبلہ بیت المقدس اور بیت اللہ دونوں ہی تھے بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ آپ دوران نماز بیت اللہ شریف کی طرف اس طرح رخ کرتے تھے کہ یہ رخ بیت المقدس کی طرف بھی ہو جاتا تھا۔ ہجرت کے بعد مدینہ منورہ میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اللہ کے حکم سے سولہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف رخ کیا۔ اور تمام مسلمان اسی طرف منہ کر کے نماز ادا کرتے رہے، اس میں بھی مصلحت تھی۔ بیت المقدس بھی سابقہ انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ اور اسی طرح بہت سے انبیاء کا قبلہ بیت اللہ شریف بھی رہا ہے، اور آخر کار اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین علیہ السلام کے لیے خانہ کعبہ کو ہی قبلہ مقرر فرمایا، جو اقام قیامت قائم ہے گا۔

ہجرت کے ابتدائی عرصہ میں بیت المقدس کو قبلہ مقرر کرنے کا ایک مقصد یہودیوں کی تالیف قلبی بھی تھا تاکہ وہ مسلمانوں سے قریب تر ہو کر اسلام کی برکات سے فیضیاب ہوں۔ اور اس طرح دین حق کو قبول کر لیں مگر یہ لوگ انتہائی متعصب اور ضدی تھے، انہوں نے مسلمانوں کی رواداری سے کچھ فائدہ نہ اٹھایا بلکہ اپنی ہٹ دھرمی پر اڑے رہے۔ تاہم حضور علیہ السلام کی دلی خواہش یہ تھی کہ اللہ تعالیٰ بیت اللہ شریف کو مسلمانوں کا قبلہ مقرر فرمادیں۔ بالآخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش کو پذیرائی بخشی اور جیسا کہ اگلی آیات میں آئیگا، بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو قبلہ پھرنے کا صریح حکم نازل فرمادیا۔

اہل کتاب چونکہ ضدی، عنادی اور ہٹ دھرم تھے۔ اللہ رب العزت جانتے تھے کہ مسلمانوں کے قبلہ کی تبدیلی پر یہ لوگ اعتراض کریں گے اور مسلمانوں کے خلاف پراپیگنڈا کریں گے لہذا انہوں نے تحویل قبلہ کے حکم کے ساتھ ہی اہل اسلام کو خبردار کر دیا کہ یہ لوگ اس تبدیلی پر معترض ہوں گے۔ لہذا تم ان کے

تحویل قبلہ پر
پہلا اعتراض

پراپیٹڈ اسے متاثر ہو کر کسی قسم کے شک یا تردد میں مبتلا نہ ہونا۔ چنانچہ اہل کتاب کے پہلے اعتراض کا تذکرہ اس انداز میں بیان فرمایا سَقُولُ السَّفَهَاءِ مِنَ النَّاسِ عَفْرِبِ اہل کتاب کے یوقوف لوگوں میں سے بعض یوں کہیں گے مَا وَكَلَهُمْ عَنْ قَبْلَتِهِمُ الَّتِي كَانُوا عَلَيْهَا مُسْلِمَانِ کو ان کے قبلہ سے کس چیز نے پھیر دیا ہے، جس قبلہ پر وہ پہلے تھے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہوا، مسلمان ہجرت نبوی کے بعد سورہ یا سترہ ماہ تک بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے رہے۔ اور اس کے بعد بیت اللہ کے قبلہ مقرر ہونے کا حکم نازل ہوا۔ تو یہودیوں نے اعتراض پیش کر دیا۔ کہ کیا اللہ تعالیٰ کو اس قبلہ کا پہلے علم نہ تھا۔ جواب نیا حکم دے دیا۔ پہلے قبلہ میں کیا خرابی تھی۔ وہ بھی سابقہ انبیاء کا قبلہ رہا ہے۔ اب اس کی تبدیلی کی کیا ضرورت پیش آئی۔ یہاں پر اہل کتاب کے لیے سفہاء کا لفظ استعمال کیا گیا ہے، جو کہ سفیہ کی جمع ہے۔ جس کا معنی ایو قوف ہے۔ اس سے پہلے بیان ہو چکا ہے کہ جو کوئی ملت ابراہیمی سے اعراض کرتا ہے، وہ یوقوف ہے۔ وَمَنْ يُضِغْ عَنِ قِبْلَةِ ابْنِ هِيَمِ الْاَلَمْ مَنْ سَفِهَ نَفْسَهُ۔ ظاہر ہے کہ کوئی سلیم الفطرت آدمی ملت ابراہیمی سے انحراف نہیں کر سکتا۔ یہ یہود، نصاریٰ، اور مشرکین ہی ہیں، جو ایسا کرتے ہیں۔ لہذا یہ یوقوفوں میں داخل ہیں۔ جو دین فطرت اور دین توحید اسلام کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں۔

اہل کتاب کے اس اعتراض کا جواب اللہ تعالیٰ نے یہ دیا قُلْ لِلّٰهِ الْمَشْرِقُ وَالْمَغْرِبُ اے پیغمبر علیہ السلام! آپ فرمادیں۔ کہ یاد رکھو، مشرق و مغرب اللہ ہی کا ہے۔ یہ بات تو نہیں ہے کہ مشرق اللہ کا ہے اور مغرب کسی دوسرے کا۔ لہذا ہر حجت امسی کی ہے تو پھر اُسی کی اطاعت لازم ہے۔ وہ جس طرف کو منہ کرنے کا حکم دے ماننا پڑے گا۔ اس میں کسی کو اعتراض کرنے کا حق نہیں پہنچتا۔ جو کوئی اللہ تعالیٰ کے حکم کی تعمیل کرے گا، اُس کی خوشنودی کو پالے گا۔ اور جو اُس کے کسی حکم پر معترض ہو گا، اُس کی تعمیل میں لیت و لعل کرے گا۔ وہ ملعون اور مردود پٹھرے گا۔ اور پھر یہ بھی ہے کہ عبادت کے لیے کسی قبلہ یا حجت کا مقرر کرنا انسان کے محض جہانی

تقاضے کو پورا کرتا ہے۔ ورنہ حقیقت یہ ہے کہ انسان کے روح کی توجہ تو ہمیشہ
تجلی الہی کی طرف رہتی ہے، اس کا بظاہر رُخ کسی طرف بھی ہو، اس سے کچھ فرق
نہیں پڑتا۔ بیت المقدس یا بیت الشریف کی جہت کا تقرر تو مسلمانوں کے اتفاق و اتحاد
کی ایک علامت ہے کہ تمام عبادت گزاروں کا رُخ ایک ہی جہت میں ہوتا ہے
وگر نہ جس طرف بھی منہ کر لو، عبادت اسی کی ہوگی۔ پہلے گزر چکا ہے فَایَنْصَبُ
تَوَلَّوْا فَشَقَّ وَجْهَهُ اللّٰہُ۔ تم جہر بھی رُخ کر دو گے، اللہ تعالیٰ کی رضا اور خوشنودی
اُدھر ہی پاؤ گے۔ اسی لیے یہ مسئلہ ہے کہ دوران سفر اگر قبلہ کا تعین نہ ہو سکے۔ تو
جس طرف بھی رُخ کر کے نماز پڑھو گے۔ اللہ تعالیٰ قبول کرے گا۔ قبلہ معلوم
ہو جانے کے بعد نماز کو لوٹانے کی ضرورت نہیں ہوگی۔ دونوں قبول میں صرف
اس قدر فرق ہے کہ بیت المقدس اس لحاظ سے قومی قبلہ ہے کہ یہ خاص خاص
پیغمبروں کا قبلہ رہا ہے۔ اور بیت اللہ شریف بین الاقوامی قبلہ ہے۔ کہ یہ تمام
انبیاء بشمول حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا قبلہ ہے۔

مقام تحویل قبلہ

آگے تفصیل سے ذکر آئے گا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم نبی مکہ کی مسجد میں ظہر یا عصر کی نماز ادا فرماتے تھے۔ کہ دوران نماز
ہی قبلہ کی تبدیلی کا حکم نازل ہوا۔ آپ نے آدھی نماز بیت المقدس کی طرف منہ کر کے
پڑھی اور بقیہ نصف بیت اللہ شریف کی جہت میں صحیح حدیث میں آتا ہے کہ
نزدول حکم پر جب حضور علیہ السلام نے پلٹ کر رُخ پھیر لیا۔ تو تمام صحابہ کرام بھی پلٹ
گئے کسی کو کچھ تردد نہیں ہوا۔

اگلے روز قبا کے لوگ اپنی مسجد میں فجر کی نماز ادا کر رہے تھے۔ اُن کا رُخ
حسب معمول بیت المقدس کی طرف تھا۔ اسی دوران میں کسی نے آکر خبر دی کہ قبلہ
کا حکم تو بدل چکا ہے۔ تم ابھی تک بیت المقدس کی طرف رُخ کیے ہوئے ہو۔ یہ
سننے ہی لوگوں نے نماز کی حالت میں اپنا رُخ بیت اللہ شریف کی طرف پھیر
لیا۔ کسی شخص نے حیل و حجت نہ کیا۔ یہ صرف اہل کتاب تھے۔ جو تحویل قبلہ پر اعتراض

کر رہے تھے۔ اُن کے یہ اعتراضات آگے دُر تک چلے گئے ہیں اَلْمُتَوَكِّلُ
 اِلَى اللّٰهِ اِنَّ خَيْرَ مِمَّا يَدْعُوْنَ تَوَكَّلْ عَلٰى اللّٰهِ سُبْحٰنَہٗ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ
 نصاریٰ کا یہ شکوہ بار بار منظر عام پر آتا ہے۔ حالانکہ اگر مسلمانوں کی طرح وہ بھی
 مکتب ابراہیمی پر قائم ہوتے تو اس قسم کے اعتراضات پیش کرنے کی بجائے
 اللہ تعالیٰ کے حکم کے آگے سر تسلیم خم کر لیتے۔

فرمایا مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے ہیں۔ اس کے ہر حکم کی تعمیل ہونی چاہیے
 مگر بات یہ ہے کہ یٰہْدِیْ مَنْ يَّشَاءُ اِلٰى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ وہ جسے
 چاہتا ہے۔ سیدھے راستے کی طرف ہدایت دیتا ہے۔ اہل کتاب اپنی ضد کی
 وجہ سے اس ہدایت سے محروم ہے حالانکہ اُن کی اپنی کتابوں میں بیٹے اللہ شریف
 کے افضل اور بین الاقوامی قبلہ ہونے کے احکام موجود تھے اور یہ پیش گوئی بھی پائی
 جاتی تھی کہ نبی آخر الزماں کا قبلہ بیت اللہ شریف یعنی خانہ کعبہ ہوگا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جس طرح ہم نے تمہارا قبلہ افضل بنایا ہے۔ اسی طرح
 ہم نے تمہیں (اے اہل اسلام) امت بھی افضل بنایا ہے۔ وَكَذٰلِكَ
 جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا وَّسَطُ کے لفظی معنی درمیان کے ہیں۔ یعنی تمہیں
 درمیانی امت بنایا۔ اور ظاہر ہے کہ درمیان والی چیز ہی عدل و انصاف پر
 مبنی اور افراط و تفریط سے پاک ہوتی ہے۔ لہذا یہی چیز افضل ہوتی ہے۔ گویا اللہ
 تعالیٰ نے امت محمدیہ کو وَسَطًا کا لقب دیکر اے افضلیت کے مقام پر فائز فرمایا
 ہے اور اس امت کے افضل ہونے کی غرض و غایت یہ ہے لَتَكُوْنُوْا شٰہِدًا
 عَلٰی النَّاسِ تاکہ تم دو سر لوگوں پر گواہ بن جاؤ وَّيَكُوْنُ الرَّسُوْلُ عَلَیْكُمْ
 شٰہِدًا اور رسول اکرم علیہ التحیۃ والسلام تم پر گواہی دینے والے بن جائیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس دوہری گواہی کا مظاہرہ قیامت والے
 دن میدانِ محشر میں ہوگا۔ حضرت عبداللہ بن مبارک اپنی کتاب الزہد
 میں حدیث لائے ہیں جس سے مذکورہ گواہی کی تفصیلات معلوم ہوتی ہیں۔

افضل امت
 اسکی گواہی

بیان کرتے ہیں۔ کہ قیامت کے روز جب سب لوگ اللہ تعالیٰ کے دربار میں پیش ہوں گے۔ اور مقدمہ چلے گا۔ تو سب سے پہلے اللہ رب العزت اسرافیل سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے میری امانت ادا کر دی۔ اسرافیل علیہ السلام عرض کریں گے کہ ہاں باری تعالیٰ میں نے وہ امانت جبرائیل علیہ السلام کو پہنچا دی۔ پھر جبرائیل کو طلب کر کے پوچھا جائے گا۔ کہ کیا اسرافیل نے میری امانت تم تک پہنچا دی۔ وہ اقرار کریں گے کہ ہاں اسرافیل علیہ السلام نے وہ امانت مجھ تک پہنچا دی۔ چنانچہ اسرافیل کو چھوڑ دیا جائے گا۔ اور جبرائیل سے مزید سوال ہو گا۔ کہ تم نے میری امانت کے ساتھ کیا کیا، وہ عرض کریں گے کہ اے باری تعالیٰ! میں نے تیری امانت تیرے رسولوں تک پہنچا دی۔ اب رسولوں کو طلب کر کے پوچھا جائے گا کیا جبرائیل نے میری امانت تم تک پہنچا دی۔ تو رسول بھی عرض کریں گے، ہاں مولا کریم! جبرائیل علیہ السلام نے تیری امانت ہم تک پہنچا دی۔ اللہ تعالیٰ پوچھیں گے کہ تم نے اس امانت کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ رسول عرض کریں گے کہ ہم نے تیرا پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ پھر امتوں کو طلب کیا جائے گا۔ اور پوچھا جائے گا۔ کیا میرے نبیوں نے میری امانت تم تک پہنچائی۔ **فَمِنْهُمْ الْمُصَدِّقُ وَمِنْهُمْ الْمُنْكَذِبُ** پھر ان میں سے بعض امتیں تصدیق کریں گی۔ کہ اے اللہ! تیرے نبیوں نے تیری امانت ہم تک پہنچائی۔ اور بعض امتیں انکار کریں گی۔ کہ ہم تک وہ امانت نہیں پہنچی۔ انکار کرنے والی امتوں کے نبیوں سے کہا جائے گا کہ وہ اس بات پر گواہ پیش کریں۔ کہ واقعی انہوں نے امانت اپنی امتوں تک پہنچا دی۔ تو انہیں کرام اپنی گواہی کے لیے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی امت کا نام پیش کریں۔ امت محمدیہ کو طلب کر کے پوچھا جائے گا تو وہ لوگ اس بات کی گواہی دیں گے کہ انہی نے کرام نے اپنی امانت اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دی۔ وہ امتیں اس گواہی کا انکار کریں گی کہ مولا کریم۔ یہ لوگ ہمارے زمانہ میں نہیں تھے، ہم ان کو بالکل نہیں پہچانتے لہذا یہ ہمارے خلاف کیے گواہی دے سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ

پھر دریافت فرمائے گا کہ اے امت محمدیہ کے لوگو! تم ان کی گواہی کیسے دیتے ہو جبکہ تم تو ان کے زمانے میں پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ تو لوگ عرض کریں گے۔ یا اللہ! تو نے ہماری طرف آخری رسول بھیجا۔ اور کتاب نازل فرمائی۔ تیرے خاتم النبیین علیہ السلام اور تیری کتاب بتایا کہ قَدْ أَكْبَلَعُوا رِسَالَتِي رِثْیَہُمْ کہ تمام انبیاء نے اللہ کا پیغام اپنی اپنی امتوں تک پہنچا دیا۔ لہذا ہم اس یقین کے ساتھ گواہی دیتے ہیں۔ کہ واقعی تیرے انبیاء نے تیرا پیغام پہنچا دیا۔

اس کے بعد اپنی امت کے تذکرہ کے لیے اللہ تعالیٰ خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو کھڑا کرے گا۔ آپ اپنی امت کا تذکرہ کریں گے کہ یہ لوگ صحیح گواہی دے رہے ہیں۔ اسی کے متعلق فرمایا جَنَّتْنَا مِنْ كُلِّ أُمَّةٍ شَهِيدًا وَجَنَّتْنَا بِكَ عَلَى هَؤُلَاءِ شَهِيدًا۔ یعنی ہم ہر امت میں سے ایک گواہ لائیں گے۔ اور پھر ان سب پر آپ کو بطور گواہ پیش کیا جائے گا۔

فرمایا وَمَا جَعَلْنَا الْقِبْلَةَ الَّتِي كُنْتَ عَلَيْهَا اَدْرَئِیْسَ نَبَاہِمُ لَیْ قَبْلَہُ جس پر پہلے آپ تھے یعنی بیت المقدس کو اِلَّا لِنَعْلَمَ مَکْرَہُ تَاکُمُہُمْ جَانِ لَیْسَ۔ اللہ تعالیٰ کے لیے ہر چیز کا جاننا لازمی ہے یہاں نَعْلَمَ سے مراد ہے ظاہر کر دیں مَنْ يَتَّبِعِ الرَّسُولَ مِمَّنْ يَنْقَلِبْ عَلٰی عَقْبَيْہُ کہ کون رسول کی پیروی کرتا ہے۔ اور کون اپنی ایڑیوں پر پھرتا ہے یعنی انکار کرتا ہے۔ وَارِثٌ کَانَ لَکَ بَیْرُہُ اِلَّا عَلٰی الَّذِیْنَ هَدٰی اللہ اور بیشک یہ چیز بجا رہی یعنی یہود و نصاریٰ پر اپنے قبلہ اول کو چھوڑنا بڑا دشوار ہے اسوائے اُن لوگوں کے جن کو اللہ تعالیٰ نے ہدایت سے نوازا ہے۔ ایسے لوگ ہی ملتِ ابراہیمی کے پابند ہیں اور یہی لوگ اللہ رب العلمین کی فرمانبرداری کو اختیار کرتے ہیں۔ ان لوگوں کے لیے سنئے حکم کی تعمیل بالکل دشوار نہیں۔ وہ ہمیشہ تعمیلِ حکم میں پیش پیش رہتے ہیں پہلے گزر چکا ہے۔ اِذْ قَالَ لَہُ رَبُّہُ اَسْلِمْتُ فَقَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِیْنَ یعنی جب ابراہیم علیہ السلام کو اُن کے رب نے کہا کہ

تقریباً کی
غایت

فرمانبردار ہو جاؤ۔ تو انہوں نے کہا کہ میں رب العلیین کا فرمانبردار ہو گیا۔ جو ارشاد ہو اس کی تعمیل کے لیے بسر و چشم تیار ہوں۔ اس قسم کے اصول پر چلنے والے لوگوں کے لیے تحویل قبلہ جیسی چیز کیسے بھاری ہو سکتی ہے۔ نماز کے متعلق بھی پہلے پارہ میں گزر چکا ہے وَلَا تَحْمِلُ الْکِبْرَیَّةَ إِلَّا عَلَى الْخَشِيعِینَ۔ یہ نماز منافقین پر بڑی بھاری ہے مگر ان لوگوں پر نہیں، جن میں عاجزی اور خنثیت الہی جیسی صفات موجود نہ ہوں ان کے لیے تو نماز راحت کا ذریعہ ہے کیونکہ اس سے تعلق بالشر پیدا ہوتا ہے۔ تو یہاں پر بھی فرمایا کہ تحویل قبلہ کا حکم اہل کتاب کے لیے سخت گراں ہے مگر ان لوگوں کیلئے نہیں ہے۔ جنہیں اللہ نے ہدایت دے دی ہے۔

تحویل قبلہ پر
دوسرا اعتراض

تحویل قبلہ سے متعلق اہل کتاب کا دوسرا اعتراض یہ تھا کہ جو لوگ بیت اللہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے سے پہلے فوت ہو گئے ہیں۔ انہیں تو اس طرف رخ کر کے نماز پڑھنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ وہ تو بیت المقدس کی طرف ہی منہ کرتے رہے۔ لہذا اس نئے حکم کی روشنی میں ایسے لوگوں کی نمازوں کی کیا حیثیت ہوگی۔ وہ مقبول ہوں گی یا نہیں۔ اس اعتراض کے جواب میں اللہ نے فرمایا وَكَانَ اللَّهُ لِيُضَيِّعَ أَيْمَانَكُمْ اللہ ایسے لوگوں کے ایمان ضائع کرنے والے نہیں ہیں۔ امام بخاریؒ فرماتے ہیں کہ یہاں پر ایمان سے مراد نماز ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کی نمازیں ضائع نہیں کرے گا۔ جو لوگ تحویل قبلہ سے پہلے فوت ہو گئے، ان پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ کیونکہ إِنَّ اللَّهَ بِالنَّاسِ لَکَرُؤُوفٌ رَّحِيمٌ اللہ تعالیٰ لوگوں کے ساتھ بڑے ہی شفیق اور مہربان ہیں۔ سابقہ لوگوں نے جو نمازیں پڑھی ہیں۔ وہ اپنے اپنے انبیاء کے حکم کے مطابق صحیح طریقے سے ادا کی ہیں۔ لہذا ان کی نمازیں مقبول ہیں، ان پر کوئی الزام نہیں ہے۔

اس قسم کا معاملہ شریعوں کے متعلق سورۃ مائدہ میں آئے گا۔ کہ جن لوگوں نے جو امت شراب سے پہلے شراب نوشی کی تھی اور وہ فوت ہو گئے، ان کا کیا بنے گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکی کرنے والوں پر کوئی الزام نہیں ہے۔ جس

وقت ایک چیز حرام نہیں تھی، اس وقت اس کے استعمال سے گناہ لازم نہیں آتا۔ ہاں جو شخص حرمت شراب کے حکم آجانے کے بعد ٹسے پئے گا، وہ ضرور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آجائے گا۔ اس مقام پر بھی اعتراض کا جواب یہی دیا کہ جن لوگوں نے تبدیلی قبلہ سے پہلے بیت المقدس کی طرف منہ کر کے نمازیں پڑھی ہیں۔ ان کی نمازیں بالکل درست اور اللہ کے ہاں قابلِ قبول ہیں۔ اللہ تعالیٰ کسی کا عمل ضائع نہیں کرتے وہ بڑے شفقت کرنے والے اور مہربان ہیں۔

قَدْ نَرَىٰ تَقَلُّبَ وَجْهِكَ فِي السَّمَاءِ ۚ فَلَنُوَلِّيَنَّكَ
 قِبْلَةً تَرْضَاهَا ۖ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ
 وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ۚ وَإِنَّ
 الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ لَيَعْلَمُونَ أَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ
 رَبِّهِمْ ۚ وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ ﴿١٤٤﴾ وَلَئِنْ
 آتَيْتَ الَّذِينَ أُوتُوا الْكِتَابَ بِكُلِّ آيَةٍ مَا تَتَّبِعُوا
 قِبْلَتَكَ ۚ وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتَهُمْ ۚ وَمَا بَعْضُهُمْ
 بِتَابِعٍ قِبْلَةَ بَعْضٍ ۚ وَلَئِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَ هُمْ مِّنْ
 بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ ۖ إِنَّكَ إِذَا لَمِنَ الظَّالِمِينَ ﴿١٤٥﴾
 الَّذِينَ اتَّبَعْتَهُمْ الْكِتَابَ يَعْرِفُونَهُ كَمَا يَعْرِفُونَ آبَاءَهُمْ
 وَإِنَّ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿١٤٦﴾
 الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ ﴿١٤٧﴾

ترجمہ: تحقیق ہم آپ کے چہرے کا آسمان کی طرف (بار بار) پلٹنا دیکھتے ہیں۔ پس ہم آپ کو الیٰ بنادیں گے اُس قبلے کا جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ پس اب پھیر دیں آپ اپنا چہرہ مسجد حرام کی طرف۔ پھر جہاں بھی آپ ہوں، پس پھیر دیں اپنے چہرہ کو اُنکی طرف۔ اور بیشک وہ لوگ جن کو کتاب دی گئی۔ البتہ جانتے ہیں۔ کہ یہ حق ہے، اُن کے رب کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے، جن کو یہ کرتے ہیں ﴿۱۴۴﴾ اور اگر آپ اُن لوگوں کے پاس جن کو کتاب دی گئی ہے، ہر قسم کی نشانی

بھی لائیں۔ تو وہ پھر بھی آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے اور آپ بھی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ اور نہ ان میں سے بعض، بعض کے قبلہ کی تابعداری کرنے والے ہیں۔ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کا اتباع کیا اس کے بعد کہ آپ کے پاس علم آچکا ہے، تو بے شک آپ اس وقت نا انصافوں میں سے ہوں گے (۱۳۵) وہ لوگ جن کو ہم نے کتاب دی، وہ اس کو اس طرح جانتے ہیں، جس طرح وہ اپنے بیٹوں کو جانتے ہیں۔ اور بیشک ایک گمراہ ان میں سے البتہ حق کو چھپاتا ہے اور وہ جانتے ہیں (۱۳۶) حق تیرے رب کی طرف سے ہے پس آپ شک کہ نوالوں میں سے نہ ہوں (۱۳۷)

رہائیات

بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بیان کی جا چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ امتحان لے کہ ظاہر کرنا چاہتا تھا کہ کون اللہ کے رسول کا اتباع کرتا ہے اور کون ہے جو تعصب اور عناد پر مٹھرا رہا ہے۔ چنانچہ اہل کتاب اپنی ہٹ دھرمی پر قائم ہے۔ کیونکہ وہ لوگ قتل انبیاء، ضد اور عناد میں مبتلا تھے۔ انہوں نے اپنی کتابوں کو تبدیل نہ دیا تھا اور بلایوں میں منہمک ہو چکے تھے۔ وہ اگرچہ اپنی نسبت حضرت ابراہیم علیہ السلام، حضرت یعقوب علیہ السلام، حضرت اسمعیل علیہ السلام اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف کرتے تھے مگر عملی طور پر ان میں نسبت کا شائبہ تک نہ تھا۔

تحویل قبلہ کی دوسری وجہ

بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کرنے کی دوسری وجہ اللہ تعالیٰ نے یہ بیان فرمائی قَدْ كُنَّا فِي السَّمَاوَاتِ فَتْحِمْكُمْ فِي السَّمَاوَاتِ تحقیق ہم آپ کے چہرے کا بار بار آسمان کی طرف اٹھنا دیکھتے ہیں۔ ہجرت مدینہ کے بعد اگرچہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم بیت المقدس کی طرف ہی منہ کر کے نماز ادا فرماتے تھے۔ مگر آپ کی دلی خواہش یہ تھی کہ بیت اللہ شریف قبلہ مقرر ہو جائے۔ چنانچہ تبدیلی قبلہ کے حکم کے لیے وحی کا انتظار کرتے تھے۔ اور اپنا چہرہ مبارک آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔ تزدی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کی عام عادت مبارکہ یہ تھی۔ لَقَدْ رَأَى الْاَرْضَ اَكْثَرُ مِنْ نَظَرِهِ اِلَى السَّمَاءِ یعنی آپ کی نگاہ مبارک اکثر زمین کی طرف رہتی ہے

مگر انتظارِ وحی میں آپ اپنی نگاہ بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔
 سابقہ کتب میں اس بات کی پیشین گوئی موجود تھی کہ نبی آخر الزمان کا قبلہ وہی
 ہوگا، جو حضرت ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ تھا یعنی خانہ کعبہ۔ نیز یہی جذبہ آپ کے قلب
 مبارک میں بھی ڈال دیا گیا تھا۔ لہذا آپ کی خواہش تھی کہ بیت اللہ شریف کی طرف
 منہ کرنے کا حکم نازل ہو جائے۔ اور آخری نبی کی آخری امت کا قبلہ قومی کی بجائے
 بین الاقوامی مقرر ہو جائے۔ مسلمانوں کو اُسی قبلہ (بیت اللہ شریف) کی طرف منہ
 کرنے کا حکم ہو۔ جو حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ لہذا آپ اسی شوق
 میں نگاہ مبارک بار بار آسمان کی طرف اٹھاتے تھے۔

آخر اللہ تعالیٰ نے آپ کی خواہش کو شرف قبولیت بخشا اور تحویل قبلہ کا حکم
 نازل فرمایا۔ فَلَنُؤْتِيَنَّكَ قَبْلَةً تَرْضَاهَا اب ہم آپ کو اس قبلے کا
 والی بنا دیں گے، جس کو آپ پسند کرتے ہیں۔ لہذا حکم ہوا۔ قَوْلٍ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ آپ اپنا چہرہ النور مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔ وَحَيْثُ
مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ اور آپ لوگ جہاں بھی ہوں۔
 اپنے چہروں کو اُسی کی طرف پھیریں۔

تحویل قبلہ
 کا حکم

تاریخی روایتوں میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام بنی سلمہ کے محلہ میں
 بشر ابن برز ابن معرور کے گھر میں تشریف فرما تھے۔ یہ جگہ مدینہ طیبہ سے چار میل
 کے فاصلہ پر ہے۔ نماز ظہر کا وقت ہوا۔ تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم مع دیگر صحابہ محلہ
 کی مسجد میں نماز کے لیے تشریف لے گئے آپ نماز ادا فرما رہے تھے کہ اسی
 دوران میں یہ آیت مبارکہ نازل ہوئی قَوْلٍ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ آپ دو رکعت ادا فرما چکے تھے۔ نزول وحی پر فوراً آپ نے اپنا رخ مبارک
 بیت المقدس سے بیت اللہ شریف کی طرف پھیر لیا۔ آپ کی اقتداء میں
 مرد اور عورتیں نماز پڑھ رہے تھے۔ جب آپ نے رخ تبدیل کیا۔ تو تمام
 صحابہؓ نے بھی اپنی صفوں کو پلٹ دیا۔ اسی لیے بنی سلمہ کی اس مسجد کو مسجدِ بنی

یعنی دو قبلوں والی مسجد کہا جاتا ہے۔

اس آیت کریمہ میں لفظ شطر تفصیل طلب ہے۔ اس میں ایک حکم تو یہ ہے کہ قَوْلَ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ یعنی آپ اپنا منہ مسجد حرام کی طرف کر لیں۔ دوسری بات یہ فرمائی وَخَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ ظنم جہاں کہیں بھی ہو، اس کی طرف منہ کرو۔ لفظ شطر مختلف معانی میں استعمال ہوتا ہے۔ اس کا ایک معنی

نصف آتا ہے۔ جیسے حدیث شریف میں آتا ہے، اِنْ شِئِ اَزْجُوْا اَنْ تَكُوْنُوْا شَطْرَ اَهْلِ الْجَنَّةِ یعنی مجھے امید ہے کہ جنت میں جانے والے کل لوگوں میں نصف تعدد تمھاری ہوگی۔

شطر کا دوسرا معنی اجز بھی آتا ہے۔ جیسا کہ اِنْ الْفُرَاتُضَ شَطْرَ الْعِلْمِ یعنی فرائض اور وراثت علم کا جز دہے۔ مگر اس آیت کریمہ میں شطر جہت کے معنی میں آیا ہے۔ اس سلسلے میں فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ نماز شروع کرتے وقت جس شخص کو کعبہ شریف نظر آ رہا ہو۔ اُسے عین کعبہ کی طرف رُخ کرنے کا حکم ہے۔ اور جس کو کعبہ نظر نہ آتا ہو، اُسے عین کعبہ کی بجائے اُس کی طرف یا اُس کی جہت میں رُخ کرنے کا حکم ہے۔

اس آیت میں عین کعبہ کی بجائے مسجد الحرام کی طرف رُخ کرنے کا حکم دیا گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ عین کعبہ کی طرف رُخ کرنا قدرے مشکل ہے۔ لہذا پوری مسجد حرام کہہ جہت کو وسعت دے دی گئی ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ مسجد حرام میں نماز پڑھنے والوں کے لیے عین کعبہ جہت ہوگی۔ جو لوگ حد و حریم کے اندر پہنچنے والے ہیں۔ اُن کے لیے مسجد الحرام جہت ہے۔ اور جو لوگ حد و حریم سے باہر دروازے پہنچنے والے ہیں۔ اُن کیلئے پورا حرم جہت ہے۔ مقصد یہ کہ جوں جوں لوگ خانہ کعبہ سے دور ہوتے جائیں گے اُن کے لیے جہت میں وسعت پیدا ہوتی جائے گی۔

ایک دوسری حدیث شریف میں آتا ہے۔ مَا بَيْنَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ قِبْلَةٌ یعنی مشرق و مغرب کے درمیان قبلہ ہے۔ اور یہاں اس کو ہم یوں کہیں گے کہ شمال اور جنوب کے درمیان قبلہ ہے بمقصد یہ کہ اگر عین کعبہ کی طرف رُخ کھنے کا حکم ہوتا تو یہ دشوار تھا۔ اور جہت عام ہے۔ حتیٰ کہ جب تک کعبہ کی طرف بالکل پشت نہ ہو جائے۔ نماز درست ہے۔ اس کے لیے زاویہ قائمہ ضروری نہیں ہے اگر زاویہ حادہ کے ساتھ رُخ کر کے بھی نماز پڑھی جائے گی، تو وہ درست ہوگی۔ البتہ اگر آسانی کے ساتھ جہت کا تعین ہو سکے، تو ضرور کرنا چاہیے۔ ایک زمانہ میں غنایت اللہ خاں مشرقی نے اپنی تحقیق کے مطابق عام مسجدوں کے رُخ غلط بتائے تھے۔ وہ ایک ریاضی دان تھے۔ ان کے نزدیک صرف بادشاہی مسجد کا رُخ درست تھا، باقی سب غلط تھے ان کے بقول نمازیوں کا رُخ عین قبلہ کی طرف نہ ہونے کی وجہ سے ان کی نمازیں باطل تھیں۔ ان کا یہ نظریہ غلط تھا۔ کیونکہ قبلہ کا تعین اللہ تعالیٰ نے ریاضی کے اصولوں پر کرنے کا حکم نہیں دیا۔ بلکہ فطری اصول پر جہت کعبہ یا جہت مسجد حرام کا حکم ہے۔

اگر عین کعبہ یا عین مسجد حرام کی پابندی لازمی ہوتی تو واقعی یہ بڑا مشکل کام تھا بعض مقامات پر جمعہ اور عیدین کی نمازوں میں بڑی بڑی لمبی قطاریں بن جاتی ہیں ایسی صورت میں ہر نمازی کا رُخ عین کعبہ یا عین مسجد حرام کی طرف ہونا ممکن ہی نہیں رہتا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے صرف جہت کا حکم دیا ہے۔

جس طرح بدن، کپڑا اور مکان کی طہارت نماز کی شرائط میں سے ہے۔ اسی طرح استقبال قبلہ بھی نماز کے لیے بمنزلہ شرط کے ہے۔ اسی لیے حکم یہ ہے کہ نماز شروع کرتے وقت جہت قبلہ کا ہونا ضروری ہے۔ اگر ریل گاڑی یا جہاز پر بھی سفر کر رہا ہے۔ تو قبلہ کا تعین کر سکتا ہے۔ تاہم اگر دوران نماز سواری پر ہونے کی وجہ سے رُخ تبدیل بھی ہو جائے، تو کوئی حرج نہیں، نماز درست ہوگی۔ البتہ جہاں تعین قبلہ ممکن نہ ہو، وہاں تحریر کا حکم ہے۔ یعنی اپنی طرف سے استقبال قبلہ کی

پوری کوشش کرے۔ اور نماز شروع کر لے۔ اور پھر اس طرح سے متعین کیا ہو
رُخ غلط بھی ہوگا، تو نماز درست ہوگی۔ کیونکہ یہ نمازی کے اختیار سے باہر تھا
اس کے متعلق آیت گزر چکی ہے۔ "فَاَيُّنَا تَوَلَّوْا فَنَسَمَّ وَجْهَ اللّٰهِ اَيُّكُمُ
موقع پر رات کے وقت صحابہ کرام سے یقین کے ساتھ تعین قبلہ نہ ہو سکا۔ ہر ایک
نے اپنی اپنی کوشش اور سمجھ کے مطابق قبلہ کا تعین کیا۔ اگرچہ ان کے استقبال
قبلہ میں ایک دوسرے سے اختلاف پایا جاتا تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن سب کی
نمازوں کو شرف قبولیت بخشا۔ اور اس آیت کے ذریعے نماز کی درستگی کی تصدیق فرمائی

مخالفت
بیشک مخالفت

استقبال قبلہ کے بیان کے بعد اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی ہٹ دھرمی کا ذکر
کیا ہے۔ کہ یہ لوگ اہل ایمان کی مخالفت محض مخالفت کی بنا پر کرتے ہیں۔ دگر
ان پر حق تو واضح ہو چکا ہے۔ فرمایا، "وَالَّذِينَ اٰتَوُا الْكِتٰبَ" اور وہ لوگ جن
کو کتاب دی گئی ہے۔ "لَيَعْلَمُوْنَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّهِمْ" وہ جانتے ہیں
کہ یہ حق ہے اُن کے رب کی طرف سے، مگر دیدہ دلستہ حق کی مخالفت کر رہے ہیں۔
انہیں علم ہے کہ اُن کی اپنی کتابوں کے مطابق بیت اللہ شریف کی جہت بالکل
درست ہے۔ وہ جانتے ہیں کہ نبی آخر الزمان کا قبلہ یہی ہے۔ اس کے باوجود
مخالفت پر کمر بستہ ہیں۔

ام المؤمنین حضرت صفیہؓ یہودی خاندان سے تعلق رکھتی تھیں۔ آپ کا باپ
اور چچا یہودی عالم تھے اور خیبر میں رہتے تھے۔ جب حضور علیہ السلام مکہ مکرمہ سے
ہجرت کر کے مدینہ منورہ تشریف لائے، تو یہ دونوں بھائی آپ کو ملنے کے لیے
آئے۔ آپ سے بالمشافہ گفتگو ہوئی۔ ملاقات کے بعد جب واپس خیبر پہنچے تو
دونوں بھائیوں نے حضور علیہ السلام کے متعلق آپس میں کچھ بات چیت کی
جسے ام المؤمنینؓ نے بھی سن لیا۔ آپ کے چچا نے آپ کے پاسے پوچھا،
کہ سچ سچ بتاؤ کہ کیا یہ وہی نبی ہیں۔ جن کا ذکر ہماری کتابوں میں موجود ہے۔
صفیہؓ کے باپ نے تصدیق کی کہ ہاں یہ وہی نبی آخر الزماں ہیں۔ جن کی نشانیاں ہمارے

پاس موجود ہیں۔ اس پر چپانے کہا کہ اگر ایسا ہی ہے۔ تو پھر ہمیں اُن پر ایمان لے آنا چاہیے۔ مگر باپ کہنے لگا کہ جب تک میری جان میں جان ہے۔ میں اسکی مخالفت کرتا رہوں گا۔ اور آپ کے پروگرام میں رکاوٹ بنا رہوں گا۔ مقصد یہ ہے کہ محض عناد کی وجہ سے حضور علیہ السلام اور اہل ایمان کے ساتھ مخالفت ان کا جزو ایمان بن چکی تھی۔ حضرت صفیہؓ کا باپ جنگ خیبر میں قتل ہوا۔ آپ لونڈی کی حیثیت میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس پہنچیں۔ حضور علیہ السلام نے اُن کو آزاد کر دیا اور پھر اُن سے نکاح کر لیا۔ یہ واقعہ خود حضرت صفیہؓ نے سنایا۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے اُن کی ضد اور عناد کا تذکرہ بیان کرتے کے بعد فرمایا۔ کہ یہ لوگ حق کو چھپانے کی جتنی بھی کوشش کریں مگر وَمَا اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا يَعْمَلُونَ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال سے غافل نہیں بلکہ ان کی ایک ایک حرکت کو خوب جانتا ہے۔

فرمایا، اے بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم وَلَکِنَّ الَّذِیْنَ اٰوْتُوا الْكِتٰبَ بِکُلِّ اٰیَةٍ اِذَا رَآوْا اٰیٰتِ الْاٰفَاقِ اُتُوْا مِنْ جَانِبِکَ اِذْ تَنْزِلُ السَّمَاءُ سَاجِدًا لِلّٰهِ اِذْ یُنَزِّلُ السَّمٰوٰتِ مَآءً فَاٰتٰی السَّجٰدَہُ فَاٰتٰی السَّجٰدَہُ فَاٰتٰی السَّجٰدَہُ فَاٰتٰی السَّجٰدَہُ۔ اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! میں تمہاری طرف اپنے خداوند کی جانب سے اُس موعود کو بھیجتا ہوں جس کا وعدہ کیا گیا ہے۔ مگر اے لوگو! جب تک تمہیں عالم بالا سے قوت حاصل نہ ہو جائے تم پر وِشْلَم میں ہی ٹھہرنا یعنی تمہارا قبلہ یہی ہوگا، اور پھر جب تمہیں قوت حاصل ہو جائے گی، تو تمہارا قبلہ بھی تبدیل ہو جائیگا۔ اس کے باوجود یہودیوں نے بیت اللہ شریف کو قبلہ تسلیم نہ کیا۔

اکشا جہان کے زمانے میں مولانا عبدالحکیم سیالکوٹیؒ بہت بڑے عالم ہوئے

ہیں۔ انہوں نے بیضاوی پر حاشیہ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں کہ سابقہ کتب کی پیش گوئیاں بعض صریح الفاظ میں ہیں۔ اور بعض کنایت کی زبان میں ہیں۔ اس آیت میں کنایت بتایا گیا ہے۔ کہ موعود سے مراد حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات گرامی ہے اور نخیل کے الفاظ میں اس بات کی طرف اشارہ پایا جاتا ہے۔ کہ جب حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت ہو جائے۔ اور انہیں قوت یعنی مسیح اور غلبہ حاصل ہو جائے گا تو قبلہ بھی تبدیل ہو جائے گا۔ اس کے بعد یہ دو شکم قبلہ نہیں رہیں گے۔ چنانچہ قبلہ ہونے کی وجہ سے یہ دو شکم یعنی بیت المقدس اب بھی محترم اور معزز ہے۔ مگر وہ قبلہ نہیں رہا۔ اس طرف رخ کر کے نماز ادا نہیں کر سکتے۔

استقبال قبلہ
شعار اسلامی

فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ نماز کی حالت میں نمازی کے سینے کا جہت قبلہ ہونا فرض ہے۔ اور چہرے کا اُس رخ پر ہونا سنت ہے۔ چنانچہ اگر نماز کے دوران سینہ جہت قبلہ سے منحرف ہو گیا تو نماز باطل ہو جائے گی۔ چہرے کے منحرف ہونے سے نماز باطل نہیں ہوگی۔ بلکہ یہ محض مکروہ ہوگا۔ استقبال قبلہ سے متعلق ایک حدیث میں یوں ارشاد فرمایا کہ ملت ابراہیمی کو ماننے والوں میں سے مَنْ صَلَّى صَلَاتَنَا وَاسْتَقْبَلَ قِبْلَتَنَا وَكَلَّ ذِبْ يَحْتَسِفْ ذَلِكَ الْمُؤْمِنُ یعنی جس نے ہمارے جیسی نماز پڑھی، ہمارے قبلہ کی طرف رخ کیا۔ اور ہمارا ذبیحہ کھایا، تو وہ مؤمن ہے۔ اگرچہ یہودی بھی بیت المقدس کی طرف رخ کرتے ہیں۔ مگر یہاں پر ہمارا قبلہ کہہ کر ان کے قبلہ کی نفی کر دی۔ اسی طرح وہ ہمارے نماز نہیں پڑھتے اور مسلمانوں کا ذبیحہ بھی نہیں کھاتے لہذا وہ ملت اسلامیہ میں شامل نہیں گویا حضور علیہ السلام نے استقبال قبلہ کو شعار اسلامی میں شامل کیا۔

مصدقی کا
اعتراض

دیانند سرسوتی آریہ سماجی ہندوؤں کا مشہور لیڈر گزرا ہے۔ اس نے مسلمانوں پر اعتراض کیا تھا کہ یہ لوگ ہندوؤں کو توبت پرستی کا طعنہ دیتے ہیں۔ مگر خود ایک مکان کی طرف منہ کر کے نماز پڑھتے ہیں۔ جو پتھروں سے تعمیر کیا ہوا ہے۔ کیا یہ بت پرستی نہیں ہے؟ اس کے جواب میں حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ نے دو حصوں پر مشتمل کتاب لکھی اس کے ایک حصہ میں سرسوتی کے اہل اسلام پر دسٹس عام اعتراضات کے جوابات لکھے، اور دوسرے حصہ میں صرف قبلہ پر اعتراضات کا جواب دیا۔ قبلہ نما، مہمی یہ کتاب

بڑی مستیق اور نہایت ہی عمدہ کتاب ہے۔ مولانا فرماتے ہیں۔ کہ عجیب اعتراض ہے۔ کجا ہمارا استقبال قبلہ اور کجا تمہاری بہت پرستی۔ تم تو بتوں کو نافع اور ضار سمجھ کر انکے سامنے سجدہ کرتے ہو، ان کی پوجا کرتے ہو۔ مگر ہم تو خانہ کعبہ کا صرف استقبال کرتے ہیں۔ لفظ استقبال خود بتلارہا ہے۔ کہ خانہ کعبہ کی طرف صرف توجہ کرتے ہیں۔ اسکی پوجا ہرگز نہیں کرتے۔ لہذا تمہاری بہت پرستی اور ہمارے استقبال میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ بہت تمہارے مقصود ہیں۔ مگر ہمارا صرف رُخ قبلہ کی طرف ہوتا ہے مقصود تو ذاتِ خداوندی ہوتی ہے۔

پھر دیکھئے عبادت کے لیے نیت ضروری ہے۔ اس کے بغیر عبادت قبول نہیں۔ مگر استقبال قبلہ کے لیے نیت ضروری نہیں ہے۔ محض اس طرف رُخ کر لینا ہی کافی ہے۔ بشرطیکہ بتوں کی پوجا نیت اور ارادے سے کرتے ہیں لہذا محض استقبال قبلہ عبادت کے زمرے میں نہیں آتا۔ پھر یہ بھی ہے کہ اول سے آخر تک نماز کے کسی لفظ سے بھی تعظیم کعبہ کا اظہار نہیں ہوتا۔ یہاں تو ایک ایک لفظ سے اللہ تعالیٰ ہی کی حمد و ثنا اور تعظیم بیان ہوتی ہے۔ لہذا کعبہ شریف کی عبادت کا سوا ہی پیدا نہیں ہوتا۔

ذرا اور آگے چلیے خانہ کعبہ کی دیواریں یا اُس کے پتھر مسلمان کا مقصود و مقار نہیں ہے۔ اس کا ثبوت یہ ہے۔ کہ اگر کسی وقت کعبہ کی دیواریں مندم بھی ہو جائیں۔ العیاذ باللہ تو پھر بھی مسلمان نماز پڑھتے وقت اسی طرف رُخ کریں گے۔ گویا ان کے نزدیک اینٹوں اور پتھروں کی کوئی حیثیت نہیں، بلکہ اُس جگہ کو مرکز تجلیاتِ الہی سمجھ کر اُس طرف رُخ کیا جاتا ہے۔ عبداللہ بن زبیرؓ کے زمانے میں بیت اللہ شریف کی تعمیر نو کے سلسلے میں جب ساری دیواریں گر کر اُس جگہ پر قناتیں کھڑی کر دی گئیں تو نماز کے وقت اُسی طرف ہی کیا جاتا تھا۔ لہذا معلوم ہوا کہ بیت اللہ شریف صرف جہت ہے، وہ مجبود نہیں ہے۔ برخلاف اس کے بت پرست ہر اس طرف کو رُخ کر کے عبادت کریں گے۔ جس طرف بت رکھے ہوں گے کیونکہ

بت اُن کے معبود ہیں۔ اور بتوں کی منتقلی پر اُن کا رُخ بھی اُسی طرف منتقل ہو جائیگا۔
 لفظ بیت اللہ سے خود بخود واضح ہے کہ اس سے مراد اللہ کا گھر ہے، نہ کہ
 خود اللہ رب العزت۔ اور یہ مکان یا کعبہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایات کا مرکز ہے،
 یہ بذاتِ خود معبود نہیں ہے۔ ایک اور بات بھی ہے۔ کہ جب کوئی کسی مکان کی طرف
 جاتا ہے۔ تو اس کا مقصود مٹی اور پتھر کا بنا ہوا مکان نہیں ہوتا، بلکہ اس کا مقصود وہ
 مطلوب اُس مکان کا سکین ہوتا ہے۔ لہذا استقبالِ قبلہ سے ہمارا مقصود اللہ تعالیٰ
 ہوتا ہے، نہ کہ خانہ کعبہ۔ اور یہ ایک بنیادی اصول ہے۔ کہ مستحقِ عبادت وہ ذات
 ہو سکتی ہے۔ جو خود بخود ہو۔ اور جس چیز کا قیام و بقا دوسروں کا مرہونِ منت ہو، وہ
 عبادت کے لائق کیسے ہو سکتی ہے۔ اس خانہ کعبہ کو تو فرشتوں نے بنایا۔ آدم علیہ
 السلام نے تعمیر کیا، پھر ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں پایہ تکمیل کو پہنچا، یہ کیونکر معبود ہو سکتا ہے۔
 مولانا نانوتویؒ نے آخری بات یہ فرمائی۔ کہ یہ قاعدہ کلیہ ہے کہ کسی چیز کا عکس
 یا تجلی اُس چیز کا عین ہوتا ہے۔ اور تصویر یا تجلی اُسی چیز کی سمجھی جائیگی جس کی وہ فی الواقع
 ہے۔ تو بھائی ہم کعبہ کو معبود نہیں مانتے بلکہ تجلی گاہِ معبود مانتے ہیں۔ اور اس طرف
 رُخ کر کے عبادت کرتے ہیں۔ تو گویا عین معبود حقیقی یعنی خداوند تعالیٰ کی عبادت کرتے ہیں۔
 خانہ کعبہ کے مرکزِ تجلیات ہونے کو ایک دوسرے طریقے سے سمجھیے۔ اور وہ
 یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کی تجلیات کی مثال ایسی ہے، جیسے سورج کی تجلی جو پوری کائنات
 پر پڑھ رہی ہے۔ اور کائنات کیا ہے۔ یہ زمین ہے۔ اس کے اوپر کچھ فضا ہے
 اور پھر عدم ہے۔ یعنی آگے کچھ بھی نہیں۔ جب سورج کی تجلی عدم پر پڑتی ہے۔
 تو زمین کی طرف واپس پلٹتی ہے۔ اور زمین پر بیت اللہ شریف مثلِ آئینہ کے
 ہے آپ دیکھتے ہیں۔ کہ جب سورج کی شعائیں آئینہ پر پڑتی ہیں۔ اور اس میں سورج
 کی چمک نظر آتی ہے۔ اسی طرح جب اللہ تعالیٰ کی تجلیات خانہ کعبہ پر پڑتی ہیں۔ تو
 اس میں آکر ٹپک جاتی ہیں۔ اور اسے مرکزِ تجلیات بنا دیتی ہیں۔ یہی وجہ ہے۔ کہ
 اللہ تعالیٰ کی تجلیات کے اس مرکزِ خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ چنانچہ خانہ کعبہ

کی طرف رخ کرنے سے خشوع اور اخبات پیدا ہوتا ہے۔

ذرا غور فرمائیے، جس طرح خداوند تعالیٰ جہت سے پاک ہے۔ اسی طرح روح جیسی لطیف چیز کو بھی جہت کی ضرورت نہیں۔ برخلاف اس کے جسم انسانی مادی چیز ہے۔ اور مادی چیز کا رخ جس چیز کی طرف متعین کیا جائے گا وہ مادی ہوگی۔ لہذا مادی چیز ہونے کی بنا پر خانہ کعبہ کو قبلہ مقرر کیا گیا ہے۔ کہ اس کے اندر ایک قسم کا جہاد اور استقرار ہوتا ہے۔ مقصد یہ کہ ہم اُس تجلی الہی کی طرف رخ کھینچیں۔ اور اُس مالک الملک کی عبادت کرتے ہیں، جس ذات کی تجلی خانہ کعبہ پر پڑ کر اُس کی صفت بنتی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تجلی اسی مقام پر پڑ رہی ہے اور یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ پوری زمین کی ابتداء اسی مکہ مکرمہ کے مقام سے ہوئی تھی۔ یہ جگہ ساری زمین کی ناف ہے۔ سب سے پہلے اسی مقام سے پانی کا ایک بلبہ اٹھا تھا جو پھیل کر زمین جیسی بڑی چیز میں تبدیل ہو گیا۔ اسی وجہ سے اس جگہ کو مقسم بلاد بھی کہا جاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کی سب سے زیادہ تجلیات اسی مقام پر پڑتی ہیں۔ لہذا یہ ہمارا قبلہ ٹھہرایا گیا۔

مسلمانوں کے قبلہ سے متعلق اعتراضات کے جواب حضرت مولانا نانوتویؒ کے علاوہ بعض دیگر علمائے کرام نے بھی دیے ہیں۔ ان میں دہلی کے مولانا ابوالمنصورؒ ہیں۔ اور پھر مولانا رحمت اللہ کیرلویؒ ہیں۔ جو ہندوستان سے ہجرت کر کے مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں انہوں نے مدرسہ صوفیہ کی بنیاد رکھی۔ جو گذشتہ ایک صدی سے دینی طلبہ کی آبیاری کے علاوہ حجاج کرام کی خدمات بھی سرانجام دے رہا ہے۔ آپ نے عیسائیت کے رد میں ایک مدلل کتاب لکھی۔ جس پر تبصرہ کرتے ہوئے لندن کے سنڈے ٹائمز اخبار نے لکھا تھا کہ اگر دنیا میں اس کتاب کو پڑھا گیا۔ تو عرصہ تک عیسائیت کی ترقی میں رکاوٹ پیدا ہو جائے گی۔

آریہ سماج ہندوؤں کا ایک فرقہ ہے۔ ہندوؤں کے ۳۳ کروڑ دیوتا سمجھے جاتے ہیں۔ یہ لوگ بت پرستی کے خلاف اعتراضات کا جواب نہ دے سکے اور گھبرائے گئے ظاہر

آریہ سماج اور
تنقید

ہے۔ کہ بت پرستی فطرت کے خلاف ہے۔ اس لیے یہ لوگ بحث مباحثے میں مارکھا جاتے چنانچہ انہوں نے تمام بتوں کا انکار کر کے تثلیث کا ایک نیا عقیدہ وضع کیا۔ اور کہا کہ بت وغیرہ کچھ نہیں، صرف تین چیزیں قدیم ہیں یعنی خدا، مادہ اور روح، حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ صرف خدا تعالیٰ کی ذات قدیم ہے۔ مادہ اور روح حادث ہیں یہ بد بخت بت پرستی کو ترک کرنے کے باوجود بھی مشرک ہی ہے، جس طرح نصاریٰ باپ، بیٹا اور روح القدس کی تثلیث میں مبتلا ہوئے، اسی طرح آریہ سماج بھی خدا، مادہ اور روح کی تثلیث کے قائل ہوئے۔

استقبالِ قبلہ
میں خلوت

الغرض! فرمایا اے نبی علیہ السلام، اگر آپ ان کے پاس ہر طرح کی نشانی بھی لے آئیں، تو اہل کتاب آپ کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے، ان میں سے ہر ایک کا الگ الگ قبلہ ہے۔ اور یہ آپس میں ایک دوسرے کے قبلہ کو بھی تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں۔ یہودیوں کا قبلہ بیت المقدس ہے اور نصاریٰ صخرہ سمیتر کی طرف رخ کرتے ہیں۔ اور ہر ایک اپنے اپنے قبلہ پر مگن ہے۔ یہ لوگ اس قدر تعصب میں مبتلا ہیں۔ فرمایا جس طرح یہ لوگ آپ کے قبلہ کا اتباع کرنے کے لیے تیار نہیں ہیں۔ اسی طرح وَمَا أَنْتَ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِمْ آپ بھی ان کے قبلہ کی پیروی کرنے والے نہیں ہیں۔ کیونکہ جب تک اللہ کا حکم تھا۔ آپ اُس طرف رخ کرتے رہے جب خداوند تعالیٰ کا دوسرا حکم آگیا۔ تو آپ نے اُس کے سامنے سر تسلیم خم کر لیا۔ اور بیت اللہ شریف کی طرف رخ کر لیا۔ اور ان کا اپنا حال بھی یہی ہے۔ وَمَا بَعْضُهُمْ بِتَابِعٍ قِبْلَتِهِ بَعْضٍ طرہ بھی بعض بعض کے قبلہ کی پیروی نہیں کریں گے وَلَكِنْ اتَّبَعْتَ أَهْوَاءَهُمْ اور اگر آپ نے ان کی خواہشات کی پیروی کی مِنْ كِبَرٍ مَّا جَاءَكَ مِنَ الْعِلْمِ بعد اس کے کہ آپ کے پاس قطعی علم آچکا ہے۔ إِنَّكَ إِذَا لَمِنَ الظُّلُمَاتِ تو پھر آپ نا انصافیوں میں سے ہوں گے دوسرے مقام پر شرک کے متعلق فرمایا لَا يَأْتِيَنَّكَ لِيُغَيِّطَنَّ عَمَلُكَ وَلَتَكُونَنَّ مِنَ الْخَاسِرِينَ یعنی فرض کرو اگر آپ شرک سرزد ہو گیا تو آپ کے اعمال ضائع ہو جائیں گے آپ نقصان اٹھائیں گے اور لوگوں میں ہر جا

اس مقام پر فرمایا کہ اگر آپ نے لوگوں کو راضی کرنے کے لیے انہی بات مان لی بعد اس کے کہ آپ کے پاس قطعی حکم آچکا ہے۔ تو پھر آپ کے لیے یہ بڑی نا انصافی کی بات ہوگی۔

اس آیت کی روشنی میں کہ بعض لوگ بعض لوگوں کے قبلہ کی پیروی نہیں کرتے مولانا رومیؒ نے اپنی مثنوی میں قبلہ سے متعلق بڑے نکات پیدا کیے ہیں۔

ایم رومیؒ
اور قبلہ

فرماتے ہیں اسے

بادشاہوں کا قبلہ تاج و تخت ہوتا ہے
وہ ہمیشہ اس فکر میں رہتے ہیں کہ
سنہری ٹیکا انہیں کے پاس ہے اور
دنیا دار لوگوں کا قبلہ سونا چاندی یعنی
مال و دولت ہوتا ہے۔

قبلہ شاہاں بود تاج و کمر
قبلہ ارباب دنیا سیم و زر

سورج پرستوں کا قبلہ پانی اور مٹی کا
بنا ہوا پتلا ہوتا ہے اور وہ اُسی بت
پر فریفتہ ہوتے ہیں۔ مگر معافی سے
واقعہ حال لوگوں کا قبلہ جان اور
دل ہے۔ وہ ہمیشہ جان، دل،
روح اور قبر کی صفائی کے لیے کوشاں
ہوتے ہیں

قبلہ صورت پرستاں آب و گل
قبلہ معنی شناساں جان و دل

عابد و زاہد لوگوں کا قبلہ قبولیت کا
محراب ہوتا ہے۔ وہ ہمیشہ اس فکر
میں رہتے ہیں کہ کسی طرح ان کی نیکیاں
قبول ہو جائیں اور بدکردار لوگ فضول کاموں
میں منہمک ہیں۔ ان کا قبلہ وہی ہے

قبلہ زہاد محراب قبول
قبلہ بدسیرتاں کار فضول

قبلہ تن پر وراں خواب و خورش
 پیٹ کے بجا ریوں کا قبلہ کھانے پینے
 قبلہ انال بانس پرورش
 اور سونے کے سوا کچھ نہیں۔ وہ اسی فکر
 میں رہتے ہیں۔ مگر انسان بحیثیت انسان
 عقل و دانش کی پورکش کرتے ہیں۔ وہ
 اسی تگمے دو میں رہتے ہیں۔

قبلہ عاشق وصال بے زوال
 عاشق کا قبلہ وصل لازوال ہوتا ہے۔ یعنی وہ
 قبلہ عارف جمالِ ذوالجلال
 ایسی ملاقات کا خواہشمند ہوتا ہے
 جس کو کبھی زوال نہ آئے۔ اور عارف
 لوگوں کا منتہائے مقصود حق تعالیٰ
 کا دیدار ہے وہ ہمیشہ وہاں تک کی
 رسائی کے لیے کوشاں رہتے ہیں۔

قبلہ اصحابِ منصب مال و جاہ
 منصب پر فائز لوگوں کا قبلہ مال و
 قبلہ اہل سلوک اسبابِ راہ
 دولت اور عزت و عظمت ہوتا ہے
 جب کہ خدا تعالیٰ کے راستے پر چلنے
 والے لوگوں کا قبلہ اُس راستے کے
 اسباب ہوتے ہیں جن کے ذریعے
 وہ مطلوبہ منزل حاصل کرتے ہیں۔

قبلہ حرص و امل باشد ہوا
 حرص اور آرزو والے لوگوں کا قبلہ ان
 قبلہ قانع توکل بر خدا
 کی خواہش کی تکمیل ہوتا ہے اور قناعت
 کرنے والوں کا قبلہ اللہ تعالیٰ پر
 اعتماد اور بھروسہ ہوتا ہے۔

فرمایا اَلَّذِينَ اتَّيْنَهُمُ الْكِتَابُ جن لوگوں کو ہم نے کتاب دی ہے
 یعنی یہود و نصاریٰ۔ يَعْرِفُونَ كَمَا يَعْرِفُونَ ابْنُ آدَمَ وہ اس
 کتاب حق

کو یعنی پیغمبر اسلام علیہ السلام یا قرآن پاک کو اسی طرح جانتے ہیں جس طرح وہ اپنے سیٹوں کو جانتے ہیں۔ وَاِنْ فَرِيقًا مِّنْهُمْ لَيَكْتُمُونَ الْحَقَّ اور بے شک ان میں ایک گروہ حق کو چھپاتا ہے۔ وَهُمْ يَكْذِبُونَ حالانکہ وہ سب کچھ جانتے ہو جھٹتے ہیں شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ کہ پیغمبر اور کلام پاک کو سیٹوں کی طرح جاننے کا مطلب یہ ہے۔ کہ جس طرح بیٹا گود میں ہونے کی وجہ سے اُس پر شک نہیں گزرتا، اسی طرح اہل کتاب حضور علیہ السلام کو اپنی ہی کتابوں میں موجود نشانوں سے پہچانتے ہیں۔ کہ یہ آخری نبی ہیں۔ مگر تسلیم نہیں کرتے۔ حضرت عمرؓ اور حضرت عبداللہ بن سلامؓ کا مقولہ ہے۔ کہ مجھے اپنے بیٹے کے متعلق شک ہو سکتا ہے۔ کہ شاید اس کی ماں نے خیانت کی ہو۔ مگر پیغمبر اسلام علیہ السلام کے بارے میں تردد نہیں ہو سکتا۔ فَرَمَا الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ یہ حق آپ کے رب کی طرف سے ہے۔ فَلَا تَكُونَنَّ مِنَ الْمُمْتَرِينَ۔ آپ شک اور تردد کرنے والوں میں نہ ہوں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبُقْعَةِ ۲

آیت ۱۳۸ تا ۱۵۰

درس پنجاہ و ہفت (۵۷)

وَقَالَ الرَّسُولُ يَا رَبِّ اجْعَلْ لِي قُلُوبًا فَغَفَلَ

وَلِكُلِّ وُجْهَةٍ هُوَ مَوْلِيَّهَا فَاسْتَبَقُوا الْخَيْرَاتِ ط
 اِنَّ مَا تَكُونُوا يَاتِ بِكُمْ اللّٰهُ جَمِيعًا ط اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ
 شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۱۳۸﴾ وَمَنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
 شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَاِنَّهُ لَلْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ ط وَمَا
 اللّٰهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ ﴿۱۳۹﴾ وَمَنْ حَيْثُ خَرَجْتَ
 فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط وَحَيْثُ مَا
 كُنْتُمْ فَوَلُّوْا وُجُوْكُمْ شَطْرَهُ لِمَا يَكُوْنُ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ
 حُجَّةٌ ط اِلَّا الَّذِيْنَ ظَلَمُوْا مِنْهُمْ ط فَلَا تَخْشَوْهُمْ وَاخْشَوْنِيْ
 وَلَا تَمْنَعَتْكُمْ عَلَيْنِمْ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ ﴿۱۵۰﴾

ترجمہ: اور ہر ایک کے لیے ایک جہت ہے، وہ اُس کی طرف اپنا رخ
 کرنے والا ہے۔ پس سبقت کر دیکھو کی طرف۔ تم جہاں بھی ہو گے، تم سب کو
 اللہ تعالیٰ اکٹھا کر کے لائے گا۔ بیشک اللہ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۱۳۸﴾
 اور جس جگہ بھی آپ کہیں نکلیں۔ پس اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔ اور بیشک
 یہ حق ہے آپ کے رب کی طرف سے۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں
 ہے، جو تم کرتے ہو ﴿۱۳۹﴾ اور جہاں بھی آپ نکلیں پس اپنا رخ مسجد حرام کی
 طرف پھیر دیں۔ اور جس جگہ بھی تم ہو (اے اہل ایمان) پس پھیر دینے چہروں کو اُس
 کی طرف، تاکہ نہ ہو لوگوں کو تمہارے لیے اور پر الزام اور حجت، مگر وہ لوگ جنہوں نے ظلم
 کیا اُن میں سے۔ پس اُن سے نہ ڈرو، اور مجھ سے ڈرو، اور تاکہ میں تم پر اپنی
 نعمت پوری کر دوں اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ ﴿۱۵۰﴾

تحويل قبلہ کا حکم نازل کرنے کے ساتھ ہی اللہ تعالیٰ نے بتلادیا کہ یہ وقت لوگ یعنی متعصب یہود و نصاریٰ یہ ضرور اعتراض کریں گے کہ تحويل قبلہ کی ضرورت کیوں محسوس ہوئی۔ مگر اے نبی کریم آپ ان کے اعتراضات کو خاطر میں نہ لائیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ بیت المقدس کا استقبال عارضی حکم تھا۔ اور کسی خاص مصلحت کے تحت دیا گیا تھا۔ مستقل قبلہ تو بیت اللہ شریف ہے جس کا حکم حضور نبی کریم علیہ السلام کی دلی خواہش کے پیش نظر دیا گیا۔ یہ تقرر کوئی نیا نہیں ہے، بلکہ سابقہ کتب سماویہ میں موجود تھا۔ کہ آخری دور اور آخری نبی کا قبلہ وہی خانہ کعبہ ہوگا، جو ابراہیم علیہ السلام کا قبلہ ہے۔ اور اس میں اہل کتاب کے لیے آزمائش کا سامان بھی تھا۔ کہ ان میں سے کون ہے۔ جو اللہ کے نازل کردہ احکام کی پیروی کر کے ابراہیمی قبلہ کی طرف رجوع کرنا ہے۔ لہذا حضور علیہ السلام کو تسلی بھی دی گئی کہ آپ ان کے یہودہ اعتراضات کی پروا نہ کریں۔ بلکہ آپ صراطِ مستقیم پر گامزن رہیں۔ اور اس سلسلہ میں آپ کو کسی قسم کا شک یا تردد نہیں ہونا چاہیے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ایک اصولی بات بیان فرمائی ہے۔

ہر امت کیلئے

جہت مقرر ہے

وَلِكُلِّ أُمَّةٍ وَجْهَةٌ ۖ هُوَ مَوْلَاهُمْ ۚ لَعْنَةُ اللَّهِ عَلَى الَّذِينَ هُمْ عَنْ جِهَةِ اللَّهِ بَدَّلُوا مَا بَدَّلَ اللَّهُ ۚ وَلَئِنْ كُنْتُمْ تُحِبُّونَ اللَّهَ فَاتَّبِعُوا أَمْرَهُ ۚ وَلَا تَتَّبِعُوا أَهْوَاءَ قَوْمٍ ۚ قَدْ يُدْرِكُ الْأَعْيُنَ عَنِ اللَّهِ حُبُّ الْأَنْفُسِ ۚ وَاللَّهُ عَنِ السَّمْعِ عَلِيمٌ ۚ

کی طرف وہ رخ کرتے ہیں۔ دنیا میں کوئی امت ایسی نہیں ہوگی جس کی جہت مقرر نہ ہو۔ اب یہ جہت صحیح بھی ہو سکتی ہے اور غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اور محرف بھی ہو سکتی ہے۔ تاہم ہر امت کا قبلہ ضرور مقرر ہے۔ اور پھر آخری امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر فرمایا۔ جب یہ ایک اصول موجود ہے تو پھر اہل کتاب کو مسلمانوں کے قبلہ پر معترض نہیں ہونا چاہیے۔ ایسا کرنا سخت ناانصافی کے مترادف ہے۔

یہاں پر اس بات کی وضاحت بھی کر دی کہ استقبال قبلہ اللہ تعالیٰ کے احکام میں سے ایک حکم ہے۔ اور فرعی حیثیت کا حامل ہے۔ یہ کوئی ایسا بنیادی مسئلہ نہیں ہے۔ جس پر انسان بہت اصرار کرے لہذا اس قسم کی معمولی بات پر جھگڑنا

جہت فردی چیز ہے

انصاف پسند لوگوں کا کام نہیں ہے۔ اسی سورۃ میں آگے چل کر آئے گا کہ اصل مقصد تہ عبادت الہی ہے۔ جنت کا تعین تو محض توجہ کے لیے ہوتا ہے وگرنہ مشرق و مغرب سب اللہ ہی کے لیے ہیں۔ جنت کی وجہ امت میں مرکزیت پیدا ہو جاتی ہے۔ اور یہ عبادت کے لیے وسیلہ یا شرط ہے

بنیادی چیز
نیکی ہے

فرمایا اصل اور بنیادی چیز نیکی ہے۔ فَاسْتَبِقُوا الْخَيْرَاتِ۔ لہذا نیکیوں کی طرف سبقت کرو۔ یعنی زیادہ سے زیادہ نیکیاں حاصل کرنے کی کوشش کرو۔ اَيُنْمِصَاتُ كَوْفُؤًا تَمَّ جِهَالٌ يَّهْمُكَ اَيَّاتِ بِكُمُ اللّٰهُ جَمِيعًا ط اللہ تعالیٰ تم سب کو اکٹھا کرے گا اور پھر آخرت میں بھی سب کو اکٹھا کر کے سب کا جہاں کرے گا۔ یہ توجہ کی بات ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دنیا میں بھی بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کر کے سب کا رخ ادھر مقرر کر دیا۔ اور سب کو اس پر جمع کر دیا۔ فرمایا آگے چل کر نیکی ہی تمہارے کام آئے گی۔ لہذا نیکی میں سبقت حاصل کرو۔ حضور علیہ السلام نے حضرت علیؓ کو فرمایا، اے علی! تین چیزوں میں تاخیر نہ کرو، "اَلصَّلٰوۃُ اِذَا اَتَتْ" یعنی نماز کا وقت ہو جائے تو تاخیر نہ کرو۔ "وَالْحَنَازَہُ اِذَا احْضَرَتْ" اور جب جنازہ تیار ہو جائے تو جلد پڑھو، تاخیر نہ کرو۔ "وَالْاَيُّمُ اِذَا وَجَدَتْ لَهَا كُفُوًا" اور جب بے نکاح (مرد یا عورت) کا ہمسرہ مل جائے تو نکاح میں تاخیر نہ کرو۔ یہ سب نیکی میں سبقت کے بنیادی باتیں ہیں۔

فرمایا جس طرح اللہ تعالیٰ نے دنیا میں سب کو ایک قبلہ پر اکٹھا کر دیا، اسی طرح آخرت میں بھی سب کو جمع کرے گا۔ اور یہ اُس کے لیے قطعاً محال نہیں کیونکہ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰی كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ اُس کے احاطہ اختیار سے کوئی چیز باہر نہیں۔

استقبال قبلہ
کے نہ گونہ
احکام

اگلی دو آیات میں استقبال قبلہ کا تین دفعہ حکم دیا گیا ہے ارشاد ہوتا ہے وَمَنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ط اور آپ جس جگہ نکلیں، اپنا رخ مسجد حرام کی طرف پھیر دیں۔

فرمایا۔ وَلَا تِلْكَ لَمَنْ رَّبَّتْ اور بیشک یہ آپ کے رب کی طرف سے حق ہے
وَمَا اللَّهُ بِغَافِلٍ عَمَّا تَعْمَلُونَ اور اللہ تعالیٰ اُن کاموں سے غافل نہیں ہے
جو تم کرتے ہو۔ دوسری بار پھر ارشاد فرمایا وَمِنْ حَيْثُ خَرَجْتَ فَوَلِّ وَجْهَكَ
شَطْرَ الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور آپ جہاں کہیں بھی نکلیں، اپنا رخ مسجد حرام کی طرف
پھیر لیں۔ اسی آیت میں پھر آگے فرمایا وَحَيْثُ مَا كُنْتُمْ فَاَنْتُمْ فِيهَا اور آپ لوگ جس مقام
پر بھی ہوں فَوَلُّوا وُجُوهَكُمْ شَطْرَهُ اپنے چہروں کو اسی کی طرف پھیر لیں۔
ایک ہی مقام پر تین بار استقبال قبلہ کا حکم دینے کی مختلف توجہات ہیں۔
بعض فرماتے ہیں کہ استقبال قبلہ کا پہلا حکم ان لوگوں کے لیے ہے۔ جو حدود
حرم کے اندر رہتے ہیں۔ اور دوسرا حکم اُن کے لیے ہے جو ملک عرب میں اقامت
پذیر ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تیسرا حکم عرب کے علاوہ باقی ساری دنیا کے
سہنے والوں کے لیے نازل ہوا ہے۔

بعض دوسرے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلا حکم اس لیے دیا گیا کہ حضور نبی کریم
صلی اللہ علیہ وسلم کی اپنی مرضی اور خواہش تھی۔ کہ قبلہ ابراہیمی ہی ہمارا قبلہ مقرر ہو۔ لہذا یہ حکم
دیا گیا۔ فرمایا دوسرا حکم اس واسطے دیا گیا کہ سابقہ حکم میں اسکی پیش گوئیاں موجود
تھیں۔ اور ان کی تصدیق کے لیے یہ دوسرا حکم نازل کیا گیا۔ پھر تیسری دفعہ استقبال
کا حکم اس لیے دیا کہ لوگوں کو الزام کا موقع نہ ملے۔ کہ دیکھو! مسلمان ہمارے قبلہ کی طرف
رخ کرتے ہیں۔ لہذا ہمارا دین سچا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے علم میں تھا۔ کہ یہ بخاری اہل
کتاب اس قسم کے اعتراض کریں گے۔ لہذا ان کو رفع کرنے کے لیے فرمایا
لِيَلْزَمَ يَكُونَنَّ لِلنَّاسِ عَلَيْكُمْ حُجَّةٌ تاکہ آپ پر لوگوں کا الزام یا کوئی حجت
باقی نہ رہے۔ کبھی یہ نہ کہنے لگیں کہ جب قبلہ ہمارا تسلیم کرتے ہیں۔ تو ہمارا باقی دین
کیوں تسلیم نہیں کرتے۔

فرمایا اس اتمام حجت کے باوجود بعض لوگ حجت بازی سے باز نہیں آتے
گے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا إِلَّا الَّذِينَ ظَلَمُوا مِنْهُمْ یہ اُن اہل کتاب

میں سے ظالم لوگ ہونگے جو اپنی بات پر اڑے نہیں گے اور تحویل قبلہ پر یہودہ قسم کے اعتراض کرتے ہیں چیکچاہٹ محسوس نہیں کریں گے فرمایا کہ اہل کتاب تو صرف تحویل قبلہ پر ایک اعتراض کریں گے مگر مشرکین ہر در صورت میں معترض ہونگے یعنی بیت المقدس کو قبلہ بچڑھانے پر بھی اعتراض کریں گے اور اس کے بیت اللہ شریف کی طرف پلٹنے پر بھی معترض کے معترض رہیں گے۔

فرمایا اس قسم کے حجت بازوں کی آپ بالکل پرواہ نہ کریں۔ فَلَا تَخْشَوْهُمْ آپ ان سے خوفزدہ نہ ہوں وَالْخَشْيَةُ بِلَاکِہِمْ آپ مجھ سے ہی خوف کھائیں۔ یہ لوگ محض تعصب کی وجہ سے حق کو چھپاتے ہیں۔ اور آپ پر طرح طرح کے اعتراض کرتے ہیں ان کے اعتراضات سے گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ صرف اور صرف اللہ تعالیٰ کا خوف جانگزیں ہونا چاہیے۔ جب اللہ کا خوف پیدا ہو جائیگا تو باقی تمام خوف خود بخود ختم ہو جائیں گے۔

اللہ تعالیٰ نے قبلہ مقرر کرنے کی ایک وجہ یہ بھی بیان فرمائی وَلَا تَقْرَبُوا مَنَاسِبَہُمْ عَلَیْکُمْ اور تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں گویا بیت اللہ کا تقرر نعمت خداوندی کی تکمیل ہے۔ وہی بیت اللہ شریف جو تمام قبلوں سے افضل ہے۔ تجلی گاہ خداوندی اور پوری دنیا کے لیے مرکز ہدایت ہے وہاں پر کیے جانے والے عمل کا اجر و ثواب لاکھ گنا زیادہ ہے۔ اسی لیے یہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام اور آپ کے ماننے والوں کے لیے ایک عظیم نعمت ہے۔ اگلی آیتوں میں کتاب، نبی اور عبادت خانے کا ذکر بھی آئے گا۔ تو یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان ہے۔

اس کے علاوہ یہ بات بھی ہے۔ کہ جس طرح اللہ تعالیٰ نے بے مثال قبلہ مقرر کیا ہے۔ اسی طرح کتاب بھی بے مثال دی ہے۔ اور دین بھی جامع اور کامل عطا کیا ہے گویا اللہ تعالیٰ نے ہر نعمت اس آخری امرت کے لیے اٹھا رکھی ہے۔ منجملہ ان کے اللہ تعالیٰ نے انسان کو اپنی خلافت بخشی ہے۔ یہ بھی بہت بڑا انعام ہے۔ جو اولاد آدم کے علاوہ کسی اور مخلوق کو حاصل نہیں ہوا

قبلہ تکمیل
نعمت ہے

کَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنْكُمْ يَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا
وَيُزَكِّيْكُمْ وَيُعَلِّمُكُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ وَيُعَلِّمُكُمُ
مَا لَمْ تَكُونُوا تَعْلَمُونَ ﴿١٥١﴾ فَاذْكُرُونِي اذْكُرْكُمْ وَاشْكُرُوا لِي
وَلَا تَكْفُرُونِ ﴿١٥٢﴾

ترجمہ: جس طرح کہ ہم نے تم میں سے تمہارے درمیان ایک رسول بھیجا، جو تم پر ہماری
آیتیں پڑھتا ہے، اور تم کو پاک کرتا ہے۔ اور تم کو کتاب اور حکمت سکھاتا ہے۔ اور تمہیں وہ
سکھاتا ہے، جو تم نہیں جانتے تھے ﴿۱۵۱﴾ پس مجھے یاد کرو، میں تم کو یاد رکھوں گا۔
اور میرا شکر یہ ادا کرو۔ اور تم ناشکر نہ گزاردنو ﴿۱۵۲﴾

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ہمت قبلہ کے متعلق فرمایا کہ تم جہاں کہیں
ہو، اپنا رخ بوقت نماز بیت اللہ شریف کی طرف کر لو۔ مگر یہود و نصاریٰ جو ظالم لوگ
ہیں اور بات بات پر بے جا اعتراض کرتے ہیں، ان سے خوفزدہ نہ ہوں۔ ان کے طعن
و تشنیع اور اعتراضات کی پروا نہ کریں۔ بیت المقدس کی طرف منہ کرنے کا حکم منوع
ہو چکا ہے۔ لہذا آپ ہر قسم کی مخالفت سے بے نیاز ہو کر بیت اللہ شریف کو اپنا
قبلہ اپنالیں۔ فرمایا اس کی غایت یہ ہے کہ وَلَا تُكْفِرُوا بَعْدَ نِعْمَتِي عَلَيْكُمْ تاکہ میں تم پر اپنی
نعمت پوری کر دوں۔ وَلَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ اور تاکہ تم ہدایت پا جاؤ۔ مقصد یہ
کہ قبلہ کی طرف رخ کرنا بھی اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے ایک بڑی نعمت ہے۔
اللہ تعالیٰ نے کعبہ شریف کو زیادہ فضیلت والا قبلہ مقرر فرمایا ہے۔ جو کسی خاص
قوم اور علاقے کے لیے نہیں بلکہ اقوام عالم کے لیے بن الاقوامی نوعیت کا قبلہ
ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی بکثرت بڑا احسان ہے کہ اس خطہ کو یہ شرف بخشی ہے۔ کہ اس

جگہ عبادت اور ریاضت کا اجر و ثواب دوسرے کسی بھی مقام کی نسبت بہت زیادہ ہے یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے۔ اور پھر اس انعام کے دو حصے ہیں یعنی مادی اور روحانی۔ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کا وجود مبارک مادی انعام ہے اور قرآن پاک اللہ تعالیٰ کا روحانی انعام ہے۔

اتمامِ نعمت

اتمامِ نعمت کے متعلق حضرت علیؑ کی روایت میں آتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ **الانسان کے لیے اتمامِ نعمت یہ ہے کہ وہ جنت میں داخل ہو جائے۔ جو اللہ تعالیٰ کی رحمت کا مقام ہے۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے اتمامِ نعمت یہ ہے کہ انسان کا خاتمہ ایمان پر ہو جائے۔** کیونکہ صحیح معنوں میں مومن وہی ہے جس کا خاتمہ بالا ایمان ہو۔ اسی لیے خود انبیائے کرام بھی یہی دعا کرتے تھے۔ **تَوَفَّنِي مُسْلِمًا وَأَلْحِقْنِي بِالصَّالِحِينَ**۔ یعنی اے مولانا کریم مجھے اسلام اور ایمان کی حالت میں موت دینا اور میرا حشر صالح لوگوں کے ساتھ کرنا۔ اسی طرح خلافت بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے نعمت ہے۔ جو اللہ تعالیٰ اہل ایمان کو عطا فرماتا ہے

بعثت رسول

فرمایا **كَمَا أَرْسَلْنَا فِيكُمْ رَسُولًا مِّنكُمْ** جس طرح ہم نے تم میں سے تمہاری طرف ایک رسول بھیجا۔ یہاں یہ لفظ کا تشبیہ کے لیے آیا ہے۔ یعنی جس طرح ہم نے بیت اللہ شریف کو قبلہ مقرر کر کے تم کو فضیلت بخشی اور اتمامِ نعمت کیا۔ اسی طرح ہم نے تمہاری طرف عظیم الشان رسول بھیج کر تم پر احسان کیا اور اپنی نعمت کو کامل بنایا۔ رسول کا بھیجنا بھی اللہ تعالیٰ کے بہت بڑے انعامات میں سے ہے دوسری جگہ قرآن پاک نے حضور علیہ السلام کے وجود مبارک کو نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ **الَّذِينَ يَدْعُونَ لِنُفْعِكَ اللَّهُ كُفْرًا** کیا آپ نے قریش مکہ اور مشرکین عرب کو نہیں دیکھا۔ جنہوں نے اللہ تعالیٰ کے انعام کی ناقدری کی۔ گویا نعمت کو کفر کے ساتھ تبدیل کیا۔ مراد یہ ہے کہ خود حضور علیہ السلام جن کا وجود پاک اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ اس کی ناقدری کا مقصد یہ کہ جس طرح ہم نے تمہاری طرف

تمہیں میں سے ایک رسول مبعوث کیا۔

کما کا یہ کاف علت کے لیے بھی ہو سکتا ہے اس لحاظ سے کلمہ سے مراد یہ ہوگا۔ تاکہ میں تم پر اپنی نعمت پوری کر دوں اور تاکہ تم ہدایت کے راستے پر قائم رہو۔ اور اس طرح یہ کاف تشبیہ کا نہیں بلکہ تعلیل کا ہوگا۔ اور معنی یہ ہوگا کہ ہم نے تمہارے درمیان ایک عظیم الشان رسول اس لیے بھیجا تاکہ تمام نعمت ہو جائے اور ہدایت کا راستہ بھی واضح ہو جائے۔ اس لحاظ سے یہ لفظ کما بالکل اسی طرح ہے۔ جسطرح حضور علیہ السلام نے دعائیں سکھایا اللّٰهُمَّ رَبَّنَا لَكَ الْحَمْدُ کَمَا كَسَوْتَنِي کہ جب لباس پہن تو یوں کہو کہ اے اللہ تیرا شکر ہے۔ کہ تو نے ہمیں لباس پہنایا۔ یہ لباس بھی تو نے ہی عطا کیا ہے گویا اس لحاظ سے یہ کاف تشبیہ کی بجائے تعلیل کے لیے ہے یعنی جو علت کا معنی دیتا ہے۔

یہاں پر بھی لفظ رسولاً بطور اسم مکرر آیا ہے۔ اور اس کا معنی یہ ہے کہ ہم نے تمہاری طرف ایک عظیم الشان رسول بھیجا ہے۔ بڑا رسول بھیجا ہے۔ جو کہ مِنْكُمْ تم میں سے ہی ہے۔ اس سے پہلے براہیم علیہ السلام کی دعائیں بھی گزر چکا ہے رَبَّنَا وَابْعَثْ فِيهِمْ رَسُولًا مِّنْهُمْ یعنی اے ہمارے رب ہماری اولاد میں سے امت مسلمہ برپا کر اور پھر اُن کے اندر ایک عظیم الشان رسول مبعوث فرما۔

فرمایا ایک ایسا رسول یَتْلُو عَلَيْكُمْ آيَاتِنَا جو تمہارے سامنے ہماری آیتیں پڑھتا ہے۔ لفظ آیت مختلف معانی کے لیے آتا ہے۔ اس سے مراد معجزہ، نشانی، حکم یا فرمان ہوتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ ہمارا مبعوث کردہ رسول ہماری آیت یعنی ہمارا کلام جو بذریعہ وحی نازل ہوتا ہے وہ پڑھ کر سنا ہے۔

وَيُذَكِّرُكُمْ اور تمہارا تذکرہ کرتا ہے یعنی پاک صاف کرتا ہے۔ ردِ ذیل اور گندے اعتقادات سے بچا کر تمہارے اندر اچھے اخلاق اچھے اعمال اور اچھے عہد قائم کرتا ہے۔

یہ ایسا عظیم الشان رسول ہے جو تلاوت و تذکرہ کے ساتھ ساتھ وَهْلَكُمْ مِّنْ کُتُبِ الْحِکْمَةِ تمہیں کتاب و حکمت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔ اس تعلیم کا ذکر حضرت

تلاوت اور تذکرہ

کتاب و حکمت کی تعلیم

ابراہیم علیہ السلام کی دُعا میں بھی آچکا ہے ہاں بھی انہوں نے یہی دُعا کی تھی۔ کہ اے
 ہمارے رب اس امت مسلمہ میں ایسا رسول بھیج جو انہیں کتاب و حکمت کی تعلیم دے
 اور ان کا تزکیہ کرے۔ ہاں پر تزکیہ کا ذکر کتاب و حکمت کی تعلیم کے بعد کیا تھا۔
 مگر یہاں پر اس کا ذکر پہلے آیا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس لفظ میں
 بھی نکتہ پنہاں ہے۔ ہاں پر دُعا کا مقام تھا۔ کہ مولا کریم! ایسا رسول مبعوث فرما جو ان
 کو کتاب و حکمت کی تعلیم دے۔ جس کا نتیجہ یہ ہو کہ اُن کا تزکیہ ہو جائے وہ ظاہری اور
 باطنی طور پر ہر لحاظ سے پاک صاف ہو جائیں اور یہ مقام عمل کا مقام ہے۔ تعلیم کتاب
 و حکمت کی غرض و غایت یہ ہے کہ انسان کا تزکیہ ہو جائے۔ اب جب کہ امت
 مسلمہ پیدا ہو چکی عظیم الشان رسول مبعوث ہو چکا۔ تو اب کتاب و حکمت کی تعلیم کی اصل
 غرض و غایت یعنی تزکیہ کو پہلے بیان فرمایا کہ جس طرح ہم نے تم میں سے ایک رسول
 مبعوث فرمایا جو ہماری آیات پڑھتا ہے۔ تمہارا تزکیہ کرتا ہے۔ اور تمہیں کتاب و حکمت
 کی تعلیم دیتا ہے۔

الغرض! ابراہیم علیہ السلام کی دُعا کا مقام تعلیم اور پیش گوئی کا مقام تھا۔ اور یہ
 عمل کا مقام ہے۔ لہذا کتاب و حکمت کی تعلیم کی غرض و غایت یعنی تزکیہ کو پہلے بیان
 فرمایا جب تک مقصد حاصل نہ ہو، عمل کا کچھ فائدہ نہیں۔ تعلیم اُسی وقت مفید ہوگی۔
 جب اس کا مقصد تزکیہ حاصل ہو جائے۔ تعلیم مقصود بالذات نہیں بلکہ مقصود بالذات
 تزکیہ ہے۔ جس کا تذکرہ اس مقام پر پہلے کیا ہے۔

فرمایا کتاب و حکمت کی تعلیم کے علاوہ ہمارا رسول و یُعَلِّمُكُمْ مَا لَمْ
 تَكُونُوا تَعْلَمُونَ۔ تمہیں وہ چیزیں بھی سکھاتا ہے۔ جو تم نہیں جانتے تھے۔ مثلاً
 لوگ وضو اور طہارت کا طریقہ نہیں جانتے تھے۔

ان جانی
 چیزوں کی
 تعلیم

اللہ تعالیٰ نے انہیں پیغمبر علیہ السلام کی تعلیم کے ذریعے سکھایا۔ لوگ غل جنابت
 کے طریقہ سے ناواقف تھے۔ انہیں تعداد رکعات معلوم نہ تھیں۔ نماز اور دیگر عبادت
 کا طریقہ معلوم نہیں تھا۔ حلال و حرام کی تمیز نہ تھی۔ یہ سب چیزیں اللہ نے نبی کے ذریعے

سکھائیں۔ اسی کو فرمایا۔ کہ ہمارا رسول تمہیں وہ چیزیں سکھاتا ہے۔ جو تمہارے علم میں نہ تھیں۔

حضرت جعفرؓ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ جب کچھ مسلمان قریش مکہ کی ایذا رسانیوں سے تنگ آکر حبشہ کی طرف ہجرت کر گئے۔ اور کفار نے وہاں بھی مسلمانوں کا پیچھا کیا تو حضرت جعفرؓ نے نجاشی کے دربار میں جو تقریر کی اُس کا لب لباب یہ تھا۔ کہ اے بادشاہ! ہم بت پرستی کرتے تھے۔ ہمارے اندر ہر قسم کی برائیاں موجود تھیں۔ حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتے تھے۔ ظلم و جور کرنے کے عادی ہو چکے تھے۔ حق و انصاف کے تقاضوں سے نا آشنا تھے، اللہ تعالیٰ نے ہم میں نبی آخر الزماں مبعوث فرما کر سب سے پہلا حکم یہ دیا۔ کہ خدا کے ساتھ شرک نہ کرو، بت پرستی سے باز آ جاؤ۔ صرف اُسی وحدہ لا شریک کی عبادت کرو۔ حلال و حرام میں تمیز پیدا کرو۔ کسی کو ظلم کا نشانہ نہ بناؤ۔ اللہ کے نبی نے ہمیں عبادت کا صحیح طریقہ سکھایا۔ تہذیب و تمدن کے اصول بتلائے اور معیشت کے نکات سمجھائے۔

آپ نے عقائد کی اصلاح کے اصول بتائے۔ اور پھر پیش آنوالے واقعات کو بیان فرمایا۔ مثلاً یہ کہ مرنے کے بعد کیا ہو گا۔ قبر کی زندگی، قیامت کو دوبارہ جی اٹھنا پلصراط پر سے گزرنا اور آخر میں محاسبے کی منزل، میزانِ عدل کا قیام اور پھر رب العزت کا آخری فیصلہ، یہ سب باتیں حضور علیہ السلام نے امت کو بتلادیں گویا انسان کو وہ کچھ سکھایا جو وہ نہیں جانتا تھا۔ سورۃ اعراف میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی زبان سے کہلوا دیا اے لوگو! آؤ میں تم کو نہ بتلاؤں کہ تمہارے لیے اللہ تعالیٰ نے کس کس چیز کو حلال اور کس کس کو حرام قرار دیا ہے۔ مطلب یہی ہے کہ میں تمہیں وہ چیزیں بتلاؤں، جو تم نہیں جانتے۔

اسی طرح حضور علیہ السلام نے مظالم سے بچنے کا طریقہ بتلایا۔ مولانا علیؒ فرماتے ہیں اللہ تعالیٰ کا خصوصی انعام یہ ہے کہ اُس نے بہترین نظام حکومت قائم کرنے کے اصول بتلائے اور پھر انہی اصولوں کے مطابق نظام خلافت قائم ہوا۔ عرب

کے لوگ ہزاروں سال تک نظام حکومت سے نابلد رہے، حالانکہ دیگر اقوام مثلاً رومی اور ایرانی نظام حکومت سے بخوبی واقف تھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا احسان تھا۔ کہ اپنے پیغمبر کے ذریعے نظام حکومت کی تعلیم دی۔ جسکی وجہ سے تھوڑے ہی عرصہ میں پرچم اسلام اُدھی دنیا پر لہرانے لگا۔ یہ سب چیزیں **وَيَعْلَمُ كُنْهَ تِلْكَ كُونُوا لَعَلَّكُمْ لَا تَمْنَحُوا** بولنا ثبوت ہیں۔

ان انعامات کا تذکرہ بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ جب میں نے اتنے بڑے بڑے انعامات تم پر کیے ہیں۔ تو پھر تمہارا بھی فرض ہے کہ **فَاذْكُرُونِي** مجھے یاد کرو۔ گویا یہاں سے تہذیب کا باب شروع ہوتا ہے۔ پہلے اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی قباحتیں بیان کیں۔ پھر ملت ابراہیمی کی بنیاد کا ذکر کیا۔ خانہ کعبہ کے مرکز ہدایت ہونے کا بیان ہوا۔ پیغمبر علیہ السلام کا ذکر ہوا۔ کتاب کا بیان آیا۔ اور اب یہاں سے تہذیب اسنلاق یا تہذیب نفس کے احکام شروع ہوتے ہیں۔ جن کی بدولت انسان میں تہذیب اور شائستگی پیدا ہوتی ہے۔ اس ضمن میں اس مقام پر دو اصول بیان ہوئے ہیں۔ اور باقی تین اصول آئندہ دکرغ میں بیان ہوں گے۔

تہذیب اخلاق کے
پانچ اصول
ذکر اشکاء صبر
و دعا تعلیم شاعرانہ

تہذیب نفس کا پہلا اصول جو یہاں بیان ہوا، وہ ذکر الہی ہے۔ گویا ہمارا نصاب تعلیم اللہ تعالیٰ کے ذکر سے شروع ہوتا ہے۔ یہ ذکر زبان، عمل، قلب اور روح کے ذریعے ہوتا ہے۔ ذکر کا عام فہم طریقہ زبان کے ذریعے سے ہے۔ انسان زبان کے ساتھ خدا تعالیٰ کی حمد و ثناء بیان کرتا ہے۔ اس کی تعریف و توصیف کرتا ہے۔ تلاوت کلام پاک کرتا ہے۔ یہ سب ذکر کی زبانی صورتیں ہیں۔ ایک صحابی نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا، حضور! **أَيُّ الْأَعْمَالِ أَفْضَلُ** کونسا عمل افضل ہے۔ فرمایا **لَا يَزَالُ لِسَانُكَ ذِكْرًا لِلَّهِ** یعنی تمہاری زبان ہمیشہ اللہ کے ذکر سے تر رہنی چاہیئے۔ ایک دوسری روایت میں فرمایا افضل عمل ایمان باللہ ہے۔ کہیں فرمایا کہ نماز سب سے افضل عمل ہے اور کہیں جہاد فی سبیل اللہ کو افضل عمل قرار دیا تاہم یہ بھی ارشاد فرمایا کہ انسان کی زبان ہر وقت ذکر الہی سے تر رہنی چاہیئے۔ ذکر الہی ایک

پہلا اصول
ذکر الہی

ایسی عبادت ہے۔ جسکی کوئی حد نہیں، نماز، روزہ، جہاد وغیرہ سب محدود ہیں مگر ذکر الہی غیر محدود ہے اسی لیے فرمایا اذکروا اللہ ذکرا کثیرا اللہ تعالیٰ کو کثرت سے یاد کرو۔ ایک اور روایت میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کو اس قدر کثرت سے یاد کرو، ذکر الہی میں اتنے محو رہو کہ لوگ دیوانہ کہنے لگیں۔ اور پھر ذکر الہی کا صلہ یہ ملیگا کہ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُونَ تاکہ تم فلاح پا جاؤ۔ الغرض ذکر الہی کثرت سے کرو، کیونکہ اس کی کوئی حد مقرر نہیں۔

اہم شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی حکمت کے مطابق جب کوئی شخص اللہ تعالیٰ کا ذکر اخلاص، نیک نیتی اور اچھی کیفیت کے ساتھ کرتا ہے۔ ترانس کا رخ حظیرۃ القدس کی طرف ہو جاتا ہے۔ پھر اس کا تعلق روحِ غفر کے ساتھ قائم ہو جاتا ہے جو کہ حظیرۃ القدس میں ایک بڑی روح ہے۔ بنی نوع انسان کی یہ چھوٹی چھوٹی روحیں بڑی روح کے اعضا و جوارح ہیں۔ اس طرح گویا ذکر الہی کرنے والے کا تعلق براہِ راست خدا تعالیٰ کی تجلی عظم کے ساتھ ہو جاتا ہے۔ اس طرح ذاکر کی اغنیائی کیفیت جس قدر روح عظم کے مطابق ہوگی اسی قدر اس کو قرب الہی حاصل ہوگا۔ تو ظاہر ہے کہ اس سے انسان کے اندر شائستگی پیدا ہوگی جس کے بغیر وہاں داخلہ ممکن نہیں۔ اگر جسم، روح، قلب یا نفس میں کسی قسم کی نجاست ہوگی تو قرب الہی نصیب نہیں ہو سکتا۔ یہ ملک ابراہیمی کا اہم اصول ہے۔ جس سے انسان کو تہذیب نصیب ہوتی ہے۔

الغرض! فرمایا فَاذْكُرُونِي اَذْكُرْكُمْ پس تم مجھے یاد کرو، میں تمہیں یاد رکھوں گا۔ یعنی میں تمہیں اس ذکر کی بدولت اجر و ثواب عطا کرتا رہوں گا، تقرب نصیب کرتا رہوں گا حدیث شریف میں آتا ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ اللہ تعالیٰ فرماتا ہے جو شخص مجھے اپنے جی میں یاد کرے گا میں بھی اس کو اپنے جی میں یاد کروں گا جس کو اللہ تعالیٰ شانہ اپنے جی میں یاد کرے اسکی عظمت فوقیت کس قدر قابل رشک ہوگی پھر فرمایا جو مجھے کسی جمع میں یاد کرے گا میں اس کا ذکر اس سے بہتر مجمع میں کروں گا۔ جو شخص میری طرف چل کر آئے گا میں اُس کی طرف دوڑ کر آؤں گا۔ یہ سب ذکر الہی کی برکات ہیں حضور علیہ السلام نے حضرت معاذ بن جبلؓ سے فرمایا اے معاذ! جب بھی

مازہ پر جو تو اس کے بعد یوں کہا کرو اَللّٰهُمَّ اَعِزِّيْ عَلٰی ذِكْرِكَ وَشُكْرِكَ وَحُسْنِ عِبَادَتِكَ یعنی اے اللہ! مجھے اپنا ذکر کرنے، شکر کرنے اور اچھے طریقے سے عبادت کرنے کی توفیق عطا فرما۔

دو مہر اول
شکر الہی

تہذیب نفس کا دوسرا اصول یہاں پر یہ بیان فرمایا وَاشْكُرْ لِلّٰہِ اور میرا شکر یہ ادا کرو وَلَا تَكْفُرْ اَوْ میرے ناشکر گزار نہ بنو۔ اللہ تعالیٰ کا شکر یہ ادا کرنے کی مختلف صورتیں میں شکر یہ نہ بان سے بھی ادا ہوتا ہے اور عمل سے بھی ادا ہوتا ہے مثلاً جب کوئی انسان کھانا کھاتا ہے۔ تو زبان سے الحمد للہ کہتا ہے۔ گویا اللہ کا شکر یہ ادا کر رہا ہے۔ اس سے اللہ راضی ہوتا ہے۔ اگر اللہ نے اولاد دی ہے۔ تو انسان عقیدہ کہہ کے اللہ کا شکر گزار بناتا ہے۔ اللہ کی نعمت کا شکر یہ ادا کر رہا ہے۔ اگر انسان کو حج نصیب ہو تو قربانی کر کے شکر یہ ادا کر رہا ہے۔ اگر انسان کو نیا لباس میسر آجائے تو اس کا شکر یہ یہ ہے کہ پُرانا لباس فی سبیل اللہ دیدے جھنور علیہ السلام کی عادت مبارک یہی تھی۔ جب نیا کپڑا پہنا، دھوا کی اور پرانا کپڑا کسی محتاج کو دے دیدے اگر کسی کو اللہ نے دودھ پینے والا جانور دیا ہے۔ تو اس کا شکر یہ یہ ہے کہ اس کا دودھ کبھی کبھی محتاجوں کو بھی دے دیا کرے۔ ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ اگر جانور نے کسی دین دودھ نہیں دیا تو پیڑا دم کرنے کے لیے لے آتے ہیں۔ بھائی! تم نے اس کا دودھ محتاج کو دیکھ اس کا شکر یہ تو ادا ہی نہیں کیا۔ کرنے کا اصل کام تو وہ تھا۔ الغرض زبان۔ جوارح، مال اور عمل سے اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر یہ ادا کرنا تہذیب نفس کا دوسرا اصول ہے۔

فرمایا وَلَا تَكْفُرْ اَوْ ناشکر گزار نہ بنو۔ ظاہر ہے کہ اگر حصولِ نعمت پر شکر یہ ادا نہیں کیا تو گویا انسان نے اللہ تعالیٰ کی ناشکری کی۔ ایسا شخص اتصالِ حظیرۃ القدس سے محروم رہ گیا۔ لہذا اگر کامیابی کی خواہش ہے تو ہر نعمت پر اللہ کا شکر ادا کرو۔ اور کسی صورت میں بھی ناشکر گزار نہ بنو۔

سَيَقُولُ ۲

البَقَّة ۲

درس پنجاہ ونہ (۵۹)

آیت ۱۵۳/۱۵۴

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ إِنَّ اللَّهَ
مَعَ الصَّابِرِينَ ① وَلَا تَقُولُوا لِمَنْ يُقْتَلُ فِي سَبِيلِ
اللَّهِ أَمْوَاتٌ ۚ بَلْ أَحْيَاءٌ وَلَكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ②

ترجمہ: اے ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ مدد حاصل کرو۔ بیشک اللہ تعالیٰ
صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ① اور نہ کہو ان لوگوں کے بے ہوش ہیں مردہ
جو اللہ کے راستے میں مارے گئے ہیں۔ بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تم شعور نہیں رکھتے ②

بنی اسرائیل کا شکوہ بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام
اور خانہ کعبہ کی تعمیر کا ذکر کیا۔ پھر حضور علیہ السلام کی رسالت کا تذکرہ فرمایا۔ ابراہیم علیہ السلام
کی دعا اور ”کَمَا أَرْسَلْنَا فِيكَ رَسُولًا مِّنْكُمْ“ اور ملت ابراہیمی کا ذکر فرمایا
اور اس کے بنیادی اصول بیان کیے۔ بیت اللہ شریف کے قبلہ مقرر ہونے پر
یہودیوں کے اعتراضات کا تذکرہ ہوا۔ اس کا مزید بیان آگے بھی آئے گا۔

”فَإِذْ كُفِّرُوكَ وَقَالُوا كُفُّوا عَنَّا وَاسْأَلُوا عَنَّا وَلَا تَكْفُرُوا“ سے ایک
نیا باب شروع ہوا۔ شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اسے اپنی حکمت میں تہذیب الاخلاق
سے تعبیر کرتے ہیں۔ اس باب میں تہذیب الاخلاق کے بڑے بڑے اصول بیان
ہوتے ہیں۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ کی حکمت کے مطابق کوئی بھی قوم ترقی کی پانچ
منڈیوں میں سے کسی ایک میں پہنچ سکتی۔ ترقی یافتہ قوم کی پہلی منزل تہذیب الاخلاق
ہے۔ اور دوسری تدبیر منزل۔ تدبیر منزل کے آگے چار قانون ہوتے ہیں۔ پہلا
قانون شادی بیاہ سے متعلق ہے۔ جس میں میاں بیوی کے حقوق و فرائض آتے

بہر عمر و قوم
کی پانچ منڈی

ہیں، دوسرا قانون والدین اور اولاد کی اصلاح سے متعلق ہے۔ تیسرا قانون مالک اور مملوک کے تعلقات پر مبنی ہونا ہے۔ اور چوتھے قانون میں اقربا اور دوسرے لوگوں کے ساتھ تعلقات اور ان کی اصلاح کی تدبیر ہوتی ہے۔

تہذیب الاخلاق اور تدبیر منزل کے بعد ترقی یافتہ قوم کی تیسری منزل تدبیر مذہب ہوتی ہے۔ جس کے ذریعے شہر، بستی یا محلہ کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔ اس کے بعد چوتھی منزل اصلاح ملک سے متعلق ہوتی ہے۔ اور پانچویں منزل خلافت کبریٰ کی ہے جس کے ذریعے تمام جہاں کی اصلاح مطلوب ہوتی ہے۔

شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو ارتفاق رباعی کے اصول کے مطابق مبعوث فرمایا۔ اور اس سے مراد بین الاقوامی یعنی تمام عالم کی اصلاح ہے۔ الغرض جو قوم ترقی کے باوجود پہنچتی ہے، اُسے بہر حال یہ پانچ منازل طے کرنا پڑتی ہیں۔ ترقی کے آخری زینہ پر پہنچنے کا مطلب یہ ہے کہ انسان میں اس قدر صلاحیت پیدا ہو جائے کہ وہ حظیرہ القدس یا بہشت بریں کا ممبر بن جائے۔ یہ انسان کی انتہائی ترقی کا مقام ہے۔ اگر وہ حظیرہ القدس کی منزل تک نہیں پہنچ سکا تو وہ کامیابی حاصل نہیں کر سکا۔

گذشتہ درس میں تہذیب الاخلاق کے پانچ اصولوں کا تذکرہ اجمالاً اچکا ہے۔ ان میں سے دو اصول ذکر الہی اور شکر کا بیان گذشتہ رکوع میں اچکا ہے ظاہر ہے کہ ان پانچ اصولوں پر عمل کیے بغیر کوئی شخص مہذب نہیں کہلا سکتا۔ موجودہ زمانے میں جس شخص کے لیے مذہب کا ہم معنی لفظ کلچرڈ (CULTURED) بولا جاتا ہے۔ وہ اسلام کے اصولوں سے قطعاً مطابقت نہیں رکھتا۔ بلکہ صحیح معنوں میں کلچرڈ یا مذہب اُسے کہیں گے جو اسلام کے قائم کردہ ان پانچ اصولوں پر پورا اترے گا۔

آیت زیر درس میں تہذیب الاخلاق کا تیسرا اصول صبر بیان کیا گیا ہے ارشاد تہذیب الاخلاق کا تیسرا اصول صبر ہوئے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ** ایمان والو صبر اور نماز کے ساتھ استعانت پکڑو۔ صبر ملت ابراہیمی کا ایک اہم اصول

ہے۔ کنز العمال میں یہ حدیث موجود ہے، جسے اہم غزالیؒ نے احیاء العلوم میں اور
 دیگر علماء نے بھی نقل کیا ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ صبر کا معنی
 کسی چیز سے رُک جانا یا کسی شے کو برداشت کرنا ہے اور اس کے تین مادے
 ہیں، صبر علی المصیبت، صبر علی الطاعة اور صبر عن المعصية۔

صبر علی المصیبت یہ ہے کہ اہل ایمان پر جب کوئی مصیبت آتی ہے۔ کوئی
 حادثہ پیش آتا ہے۔ تو وہ اسے من جانب اللہ سمجھ کر اُس پر صبر کرتے ہیں اور
 اس کے جواب میں اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُونَ۔ کہتے ہیں، ایسے شخص کا
 تعلق باللہ مضبوط ہوتا ہے۔ اسی لیے ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے۔

وَمِنَ الْيَقِينِ مَا تَهْوُونَ بِهِ عَلَيْنَا مَصَائبُ الدُّنْيَا حضور علیہ السلام نے
 امت کو یہ دُعا سکھائی کہ اے اللہ یقین میں اس قدر درجہ عطا کر کہ دنیا کی مصیبتیں
 ہلکی ہو جائیں۔ ایسا شخص ہر تکلیف پر یہ سمجھتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے۔

اسی کا ارادہ اور مشیت کام کر رہی ہے۔ وہ ہر تکلیف کو خوشی سے برداشت
 کرے گا، اُس پر جزع و فزع نہیں کرے گا۔ نہ چیخے چلائے گا اور نہ کوئی ولولہ
 کرے گا۔ یہ اس کے تعلق باللہ کی نشانی ہے۔ اس کی مزید تشریح یوں بیان فرمائی
 اَلصَّبْرُ عِنْدَ صَدْمَةِ الْاَوَّلٰی کسی مصیبت کی ابتداء میں صبر کرنا ہی صبر
 کی علامت ہے۔ وگرنہ جب تکلیف کا سامنا کرتے ہوئے انسان تھک جاتا
 ہے اور تمام وسائل سے مایوس ہو جاتا ہے، تو پھر صبر کرنا ہی پڑتا ہے۔

اللہ تعالیٰ کے ہر حکم کی اطاعت پر صبر کرنا صبر علی الطاعة کہلاتا ہے ظاہر
 ہے کہ کوئی کام بھی بغیر حوصلہ اور برداشت کے انجام نہیں پاسکتا۔ گرمی سردی
 میں وضو کے لیے تکلیف اٹھانا پڑتی ہے۔ جہاد فی سبیل اللہ بہت بڑی مشقت
 کا کام ہے۔ حج و عمرہ میں تکالیف برداشت کرنا پڑتی ہیں۔ غرضیکہ اطاعت کا
 کوئی بھی کام صبر کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں پہنچ سکتا۔

صلو عن المعصیت یہ کہ جب نفسانی خواہشات سامنے آئیں تو

انسان اُن پر کنٹرول کرے۔ اور اپنے نفس کو معصیت سے روکے۔ جو شخص حرص و ہوا کا بندہ ہو جاتا ہے۔ وہ ہر نفسانی خواہش کے آگے جھک جاتا ہے۔ اور اس طرح معصیت میں گرفتار ہو جاتا ہے۔ یہی وہ موقع ہے۔ جب انسان صبر عن المعصیت کا دامن پکڑ لیتا ہے۔ اور کامیابی سے ہم کنار ہو جاتا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے اِنَّكَ اِلٰهُ قِيَمَ الصَّابِرِيْنَ اَجْرُهُمْ يَغْفِرُ حَسَابٌ
یعنی اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کو بغیر حساب اجر عطا کرے گا۔

طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے۔ الصَّابِرُ نَصَفُ الْاِيْمَانِ
صبر نصف ایمان ہے۔ بعض روایات میں آتا ہے الصَّابِرُ مِثْلُ الْاِيْمَانِ
بِعَنْزِلَةِ الرَّاسِ مِنَ الْجَسَدِ صبر کا تعلق ایمان کے ساتھ ایسا ہے جیسا سر کا تعلق جسم کے ساتھ ہے جسم سے سر علیحدہ ہو جائے تو جسم بیکار ہو جاتا ہے اسی طرح اگر صبر کا مادہ مفقود ہو جائے۔ تو ایمان کا کوئی فائدہ نہیں صبر ایسا مہتمی حول ہے کہ اس کے متعلق فرمایا لَا اِيْمَانَ لِمَنْ لَا صَبْرَ لَهُ جس نے صبر کا دامن چھوڑ دیا، اُس کا ایمان باقی نہیں رہا۔ اس کا ایمان ڈالوانا ڈول ہو گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اے ایمان والو! صبر کے ساتھ مدد حاصل کرو یعنی اس پر کاربند ہو جاؤ۔ کوئی مشکل درپیش ہو، اطاعت کا نحل ہو یا معصیت سے روکنے کا موقع ہو، ہر حالت میں صبر کا دامن تھامے رکھو۔ تہذیب الاخلاق کا یہ تیسرا اصول ہے۔

فرمایا اے ایمان والو! استعانت حاصل کرو صبر اور نماز کے ساتھ۔ ظاہر ہے کہ جس شخص میں نماز کی روح پیدا ہوگی اس میں توحید کا اعلیٰ مقام پیدا ہو گا۔ ایسے شخص کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہو جائے گا۔ اُس کو بلند مقام حاصل ہو گا۔ نماز کے متعلق اللہ نے فرمایا اَقِمِ الصَّلَاةَ لِذِكْرِي میری یاد آوری کے لیے نماز قائم کرو۔ اس سے اخبات حاصل ہو گا۔ فرمایا وَرَبَّكَ فَكُنْ اپنے رب کی تجسیر بیان کرو تو شایبک فطحت اپنے کپڑوں کو پاک صاف رکھو طہارت قائم رکھنا فرشتوں سے مشابہت رکھنا ہے۔ اور یہ نماز کے لیے

تہذیب الاخلاق
کا چوتھا اصول

بمنزلہ شرط کے ہے۔ ”اَحْبَبْتُوْا اِلٰی رَبِّہُمْ“ نماز میں اجبات پایا جاتا ہے۔ جو کہ بہت بڑی صفت ہے۔ اس سے اللہ تعالیٰ کے ساتھ تعلق قائم ہوتا ہے۔ نماز افضل العبادات ہے۔ جب انسان دنیوی امور میں پڑکر اللہ سے غافل ہو جاتا ہے۔ تو نماز اُس کا تعلق اللہ سے بچھرقائم کر دیتی ہے۔ انسان کا تعلق حظیرۃ اللہ سے جُڑ جاتا ہے۔ نماز کو بار بار قائم کرنے سے انسان کی غفلت دور ہو جاتی ہے اور تعلق باللہ قائم رہتا ہے۔

فرمایا اِنَّ اللہَ مَعَ الصَّابِرِیْنَ بیشک اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا، خوشنودی اور اعانت صابرین کے ساتھ ہے الغرض! ذکر، شکر، صبر، دُعا اور تعظیم شعاۃ اللہ تہذیب الاخلاق کے بڑے بڑے اصول ہیں۔ ان میں سے ہر اصول اہم ہے۔ فرمایا یہود و نصاریٰ کے اعتراضات کی پروا نہ کریں فَلَا تَحْشَوْہُمْ وَاخْشَوْنِیْ اَی آپ اُن سے خوف نہ کھائیں۔ بلکہ صرف میرا خوف دل میں رکھیں۔ اُن کے باطل اعتراض پر صبر سے کام لیں۔ ”وَاصْبِرْ وَمَا صَبْرُکَ اِلَّا بِاللّٰہِ“ صبر بھی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے ہی حاصل ہوگا۔ دوسری جگہ فرمایا۔ ”اِنْ تَصْبِرُوْا وَتَتَّقُوْا اَکْرَمُ صَبْرٍ کَرُوْکَ“ اور تقویٰ کی راہ اختیار کر گئے اِنْ ذٰلِکَ مِنْ عَزْمِ الْاُمُوْرِ یہ پختہ بات ہے۔ فلاح نصیب ہو جائیگی۔ جس شخص یا جماعت میں صبر کی روح پیدا ہو جائے گی۔ نماز پر استقامت ہو جائیگی وہ شخص یا جماعت کبھی شکست سے دوچار نہیں ہوگی۔ اسی طرح جب دشمن سے ٹکرائے کا موقع آئے گا۔ تو جذبہ جہاد کام آئے گا۔ اور اس موقع پر اگر جان بھی چلی جائے، تو انسان فنا نہیں ہوتا بلکہ اُسے دائمی حیات نصیب ہو جاتی ہے۔ انسان اس خلفشار کی زندگی سے نکل کر بلند تر زندگی میں داخل ہو جاتا ہے جو شخص اللہ کی رضا کی خاطر اور اس کے دین کی تقویت کے لیے مارا گیا، وہ شہید ہو گیا۔ اور کامیاب ہو گیا۔

کے راتے میں جان دینے والوں کو مردہ مت کہو بَلْ اَحْيَا ۱؎ وہ زندہ ہیں اس میں شک نہیں کہ الکا ظاہری جسم تو مر جاتا ہے۔ اس کی مادی حیات ختم ہو جاتی ہے۔ مگر شہید کو لگے جہان میں اعلیٰ تر زندگی حاصل ہو جاتی ہے۔ انیس انبیاء (علیہم السلام) جیسی اعلیٰ زندگی نصیب ہوتی ہے۔ دنیا کی زندگی تو بہر حال ختم ہونے والی ہے۔ یہ تو مصائب و آلام کی زندگی ہے اس کے مقابلے شہید کو جو زندگی حاصل ہوتی ہے۔ وہ نہایت فائق اور اعلیٰ تر ہوتی ہے حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ انسانی جسم اگر چہ بالطبع فانی ہے۔ مگر بعض اوقات شہدا کے جسم بھی محفوظ رہتے ہیں۔ اور ان پر زمانے کے تغیر و تبدل اور مٹی کا اثر نہیں ہوتا۔ انبیاء علیہم السلام کے اجسام کے متعلق تو واضح طور پر موجود ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا ہے۔ کہ وہ انبیاء علیہم السلام کے جسموں کو کھا جائے۔ مگر بعض اوقات شہدا کے جسم بھی اللہ کے حکم سے محفوظ رہتے ہیں۔ چند سال پہلے تاتاریوں کے علاقہ میں چھ سات سو سال پرانے شہدا کے جسم بالکل صحیح و سالم برآمد ہوئے ہیں۔ جو اس بات کی دلیل ہیں۔ کہ اللہ چاہے تو شہدا کے اجسام کو بھی آج نہ آنے دے۔ تاہم یہ کلی اصول نہیں ہے۔ البتہ عالم برزخ میں شہدا کو اعلیٰ درجے کی زندگی نصیب ہوتی ہے، برزخ کی زندگی تو ہر نیک و بد اور مومن و کافر کو حاصل ہے۔ مگر شہدا کی زندگی نہایت اعلیٰ و ارفع ہے سورۃ آل عمران میں آتا ہے کہ شہدا کو عیش کے سامان نصیب ہوتے ہیں۔ اعلیٰ درجے کی خوراک حاصل ہوتی ہے۔ اس لیے انہیں مردہ مت کہو۔ انہیں اعلیٰ درجہ کی زندگی حاصل ہوتی ہے۔ اگرچہ مادی زندگی کے اعتبار سے انہیں مردہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ مگر اپنی اعلیٰ و ارفع اور دائمی زندگی کی بنا پر وہ زندہ جاوید ہیں۔

شور کا فضان

فرمایا وَلَٰكِنْ لَا تَشْعُرُونَ ۱؎ اے لوگو! تم شہدا کی زندگی کا شعور نہیں دیکھتے۔ وجہ یہ ہے۔ کہ انہیں جو دائمی زندگی حاصل ہوئی ہے وہ اس جہاں سے الگ ایک دوسرے جہان ہے جو تمہارے فہم و ادراک سے بالا ہے۔ آپ اس مادی جہاں کی چیزوں سے واقف ہیں۔ اس کی اشیاء آپ آنکھ سے دیکھ سکتے

ہیں کان سے سُن سکتے ہیں، عقل سے سمجھ سکتے ہیں۔ مگر اگلے جہان کی چیزوں کو نہ تم دیکھ سکتے ہو، نہ تمہارے کان اس کی سماعت کی تاب لا سکتے ہیں اور نہ تمہاری عقل انہیں سمجھنے کے قابل ہے اُس جہان کی چیزوں کو وہاں جا کر ہی دیکھا اور پرکھا جاسکتا ہے۔

اہم غزالی فرماتے ہیں۔ لوگ کہتے ہیں۔ عذاب قبر سمجھ میں نہیں آتا حالانکہ یہ اکٹھ اس قابل نہیں ہے۔ کہ عالم ملکوت کی چیزوں کو دیکھ سکے۔ یہ تمام چیزیں اگلے جہان میں موجود ہیں، مگر ہمیں نظر نہیں آتیں۔ ان کا ادراک وہاں پہنچ کر ہی ہوگا اب تو صرف آسمان نظر آتا ہے۔ مگر قیامت والے دن اوپر کی تمام اشیاء نظر آنے لگیں گی، اوپر کے تمام پرے کھول دیے جائیں گے، عرش الہی نظر آجائے گا۔ جن اور فرشتے بھی نظر آئیں گے۔ اسی لیے فرمایا کہ تمہاری مادی نظریں اور دماغ اگلے جہان کی چیزوں کے ادراک کا شعور نہیں رکھتے۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت (۶۰)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۵۵ تا ۱۵۷

وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ
الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالثَّمَرَاتِ وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ ۝ (۱۵۵) الَّذِينَ
إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ وَإِنَّا إِلَيْهِ رَاجِعُونَ
۝ (۱۵۶) أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِّنْ رَبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ
وَأُولَٰئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ ۝ (۱۵۷)

ترجمہ: اور البتہ ہم ضرور تم کو آزمائش کے کچھ خوف، بھوک، مالوں —
جانوں — اور — بچلوں کے گھائے سے۔ اور آپ صبر کرے خواہ مالوں
کو خوشخبری سنائیں (۱۵۵) وہ لوگ جب آنکو کوئی مصیبت پہنچتی ہے۔ تو وہ کہتے ہیں
کہ بیشک ہم اللہ کے لیے ہیں اور بیشک ہم اُسی کی طرف لوٹ کر جانوالے
ہیں (۱۵۶) یہی لوگ ہیں کہ ان پر عنایتیں ہیں۔ ان کے رب کی
طرف سے اور مہربانی ہے۔ اور یہی لوگ ہیں۔ — — — — — پادشہ

والے (۱۵۷)

ترقی کے لیے جن منزلوں کو طے کرنا پڑتا ہے، اس میں تہذیب اخلاق
اور اس کے اصولوں کا ذکر ہو رہا ہے۔ سب سے پہلے اللہ کے ذکر اور شکر کا تذکرہ
ہوا۔ اور پھر تیسرے بڑے اصول صبر کا بیان ہے، جو تھا اصول۔ دُعا ہے جس کا
ذکر انا للہ وانا الیہ راجعون میں اجمالی طور پر کیا گیا ہے دراصل دعا اور نماز کا تعلق بھی اسی سلسلہ ہے
اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے صبر کا بطور خاص ذکر فرمایا ہے

گزشتہ
سے
پیوستہ

صبر کی قوت

اور اس کی فضیلت بیان فرمائی ہے اِنَّ اللّٰهَ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ اس کے
بعد اللہ اور اس کے دین کی خاطر قتل ہونے والے لوگوں کے متعلق ارشاد ہوا کہ

اُن کو مردہ نہ کہو بلکہ وہ زندہ ہیں مگر تمہیں اس کا شور نہیں۔ یہ صبر کی عظمت ہے۔ ظاہر ہے کہ جو شخص اللہ کے راستے میں موت جیسی بڑی مصیبت کو بھی بخوبی برداشت کرتا ہے۔ تو یقین ہے کہ ایسے شخص کو حیاتِ جاوداں نصیب ہو جاتی ہے۔ اور یہ بڑی راحت والی زندگی ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ شہید کے لواحقین بھی یہ صدمہ برداشت کرتے ہیں جس کے بدلے میں انہیں زندگی میں عزت حاصل ہوتی ہے اور وہ ترقی کے منازل طے کرتے ہیں۔ گویا تہذیبِ الاخلاق کے ضمن میں صبر کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ لہذا جس شخص نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق موت جیسی بڑی مصیبت کو برداشت کیا وہ تہذیبِ الاخلاق کا مالک بن گیا۔

آزمائش مقتضائے ایمان ہے

موت جیسی بڑی مصیبت کے تذکرہ کے بعد زیرِ درس آیات میں اللہ تعالیٰ نے بعض چھوٹی چھوٹی مصیبتوں کا ذکر فرمایا کہ ہم ان کے ذریعے بھی تمہیں آزمائیں گے **فَرَايَا وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ** ہم تمہیں ضرور آزمائیں گے اور یہ آزمائش مقتضائے ایمان چنانچہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں فرمایا ہے **مَنْ مِّنْكُمْ لَوْ كَانَ يَدْعُو إِلَى الْإِسْلَامِ فَهُوَ يَدْعُو إِلَى الْفِتْنَةِ أَوْ يَدْعُو إِلَى الْكُفْرِ أَوْ يَدْعُو إِلَى الْبَغْيِ أَوْ يَدْعُو إِلَى الْفَحْشَاءِ أَوْ يَدْعُو إِلَى الْمُنْكَارِ أَوْ يَدْعُو إِلَى الْإِسْلَامِ فَهُوَ يَدْعُو إِلَى الْإِسْلَامِ** حاصل کر لیں گے۔ بلکہ فرمایا ہم ضرور انہیں امتحان سے گذاریں گے **بِحُضُورِ عَلِيِّ بْنِ أَبِي طَالِبٍ** کا بھی ارشاد مبارک ہے۔ **يُثَبِّتُ لِي السَّجْدَ بِقَدَرٍ دِينِهِ** آدمی کا امتحان اس کے دین کے مرتبہ کے مطابق ہوتا ہے۔ جس قدر اس کا دین مضبوط ہوگا اُسی قدر اُس کی آزمائش بھی کڑی ہوگی۔ اور اگر دین کمزور ہے۔ تو آزمائش بھی کمزور ہوگی، مگر آزمائش سے خالی کوئی نہیں۔ بہر حال ایمان کا تقاضا ہے کہ آزمائش آئے۔ اب یہ اللہ تعالیٰ کی مشیت پر منحصر ہے۔ کہ وہ کسی شخص کی آزمائش کس طریقہ سے کرے گا ہے۔ اس کے مختلف طریقے ہیں۔ جن کا ذکر اس آیت میں کیا گیا ہے۔

فرمایا **وَلَنَبْلُوَنَّكُمْ بِشَيْءٍ** ہم تمہیں کسی نہ کسی چیز سے ضرور آزمائیں گے۔ اور وہ کون سی چیزیں اور کون سے ذرائع ہیں جن سے آزمائش ہوتی ہے فرمایا **مِنَ الْخَوْفِ** مبجلہ اُن ذرائع کے ایک ذریعہ خوف ہے۔ یعنی تم پر خوف

طاری کر دیں گے۔ جس سے انسان مصیبت میں مبتلا ہو جائے گا۔ خوف بالعموم بیرونی اسباب سے ہوتا ہے مثلاً کسی بیرونی دشمن کا خوف مسلط کر دیں گے۔ جس سے زندگی کا لطف برباد ہو جائے گا۔ اہل مکہ کے متعلق سورۃ قریش میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے قریش پر اتنا احسان فرمایا کہ **أَطْعَمَهُمْ مِّنْ جَوْعٍ وَآمَنَهُمْ مِّنْ خَوْفٍ** یعنی انہیں بھوک سے نجات دلانے کے ساتھ ساتھ انہیں خوف سے بھی مومن رکھا۔ وہ لوگ نہایت امن و امان کی زندگی بسر کرتے تھے۔ بیت اللہ شریف کے متولی ہونے کی بنا پر نہایت باعزت مقام حاصل تھا۔ اور وہ ہر قسم کے بیرونی خطرات سے محفوظ تھے۔

خوف ایک ایسی چیز ہے۔ جس کی موجودگی میں زندگی کا کاروبار ٹھپ ہو کر رہ جاتا ہے۔ تجارت، زراعت، صنعت و حرفت ہر چیز خوف کی زد میں آ کر اپنا مقام کھو بیٹھتی ہے۔ جنگ کے موقع پر دیکھ لیں۔ دھیان ہر وقت اُسی طرف رہتا ہے۔ کہیں گولہ باری کا خطرہ ہے کہیں ہوائی حملہ ہو رہا ہے۔ سائنس بچ ہے ہیں۔ لوگ پناہ گاہوں کی طرف دوڑ رہے ہیں۔ عجیب افراتفری کا عالم ہوتا ہے پوری زندگی معطل ہو کر رہ جاتی ہے۔ جس سے ملکی معیشت تباہ ہو جاتی ہے زندگی کا سکون ختم ہو جاتا ہے۔ اور لوگ ہر آن نئی مصیبت کے منتظر رہتے ہیں۔ اسی کو فرمایا کہ ہم خوف کے ذریعے تمہاری آزمائش کریں گے۔

بھوک

وَالْجُوعُ آزمائش کا دوسرا ذریعہ بھوک ہے۔ انسانی زندگی کا انحصار اس کی خوراک پر ہے۔ غذا کا حصول انسان کا طبعی اور فطری حق ہے۔ انسانوں کے علاوہ حیوانات، کیڑے مکوڑے، چرند، پرند، خشکی اور پانی کے تمام جانداروں کی زندگی خوراک سے وابستہ ہے۔ حتیٰ کہ انبیاء علیہم السلام جیسی مقدس ترین ہستیوں کے متعلق بھی اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ **وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ** یعنی ہم نے انبیاء کے جسم بھی ایسے نہیں بنائے جنہیں غذا کی ضرورت نہ ہو۔ بلکہ وہ بھی کھانا کھاتے ہیں۔ اُن کو بھی بھوک کا احساس ہوتا ہے بھوک کی

وجہ سے بعض اوقات وہ بھی مضطرب ہو جاتے ہیں۔ غزوہ خندق کے موقع پر خود تمام انبیاء صلی اللہ علیہ وسلم نے بھوک کی وجہ سے پیٹ پر پتھر باندھے۔ صحابہ کرامؓ فرماتے ہیں کہ بھوک کی وجہ سے ہم نے حضور علیہ السلام کو بے چین ہوتے ہوئے بھی دیکھا بعض اوقات بھوک کا اتنا غلبہ ہوتا کہ سیدھے بیٹھ بھی نہ سکتے بلکہ ٹیک لگانا پڑتی۔ الغرض چونکہ خوراک ہر ذی جان کے لیے لازمی ہے۔ لہذا اس کے بغیر اس کا اضطراب بھی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ بسا اوقات ہم انسان و حیوان کی خوراک روک کر اور اسے بھوک میں مبتلا کر کے اسکی آزمائش کرتے ہیں مفسرین کرامؓ فرماتے ہیں کہ بھوک دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک اضطراری اور دوسری اختیاری۔ پانی اور خوراک کی قلت اضطراری بھوک ہے، اور اس کا مظاہرہ دنیا میں ہوتا رہتا ہے۔ قحط سالی کی وجہ سے خوراک پیدا ہی نہیں ہوتی یا کوئی بیرونی آفت مثلاً طوفان یا زلزلہ وغیرہ کے ذریعے اس کے ذخائر تباہ ہو جاتے ہیں۔ جس کی وجہ سے خوراک کا حصول ممکن نہیں رہتا اور لوگ آزمائش میں مبتلا ہو جاتے ہیں۔ قریبی زمانہ میں بنگال کا مشہور قحط واقع ہوا۔ آج سے تقریباً ۲۵ سال قبل اس قحط کی وجہ سے نوے لاکھ انسان لقمہ اجل بنے۔ چھوٹے چھوٹے سیلاب تو اکثر ساحلی علاقوں میں آتے رہتے ہیں۔ جس سے سینکڑوں اور ہزاروں جانیں تلف ہو جاتی ہیں۔ یہ اضطراری بھوک ہے اور آزمائش کے لیے وارد ہوتی ہے۔ بھوک کی دوسری صورت اختیاری ہے۔ اہل ایمان کے لیے ماہ رمضان میں روزوں کی فرضیت مسلمان خود اس بھوک کو اختیار کر کے آزمائش خداوندی پر پورا اترتے ہیں۔

فرمایا آزمائش کی تیسری صورت وَتَقْصُصْ مِنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ یعنی مال و جان کا نقصان ہے۔ انسانی معیشت کا دار و مدار اپنی دو چیزوں پر ہے۔ انسان مال کے ساتھ کاروبار کرتا ہے۔ تجارت، حرفت یا زراعت کرتا ہے اور یہ امور انجام دینے کے لیے افرادی قوت کی ضرورت ہے۔ لہذا اگر جان یعنی افرادی قوت اور مال یعنی روپیہ پیسہ، گلے کسے بیل، بمینس، اونٹ بکری وغیرہ

جان و مال
کا نقصان

میں کمی آجائے گی تو انسانی معیشت کو نقصان پہنچے گا۔ لہذا یہ بھی آزمائش کا ذریعہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ کہ ہم جان و مال میں کمی کر کے بھی لوگوں کا امتحان لیتے ہیں۔ آفاتِ ارضی و سماوی مال و جان میں نقصان کا ذریعہ ہیں۔ لہذا اوقاتِ مملکت و بانیِ امراض مثلاً طاعون، ہیضہ، تپِ مہرقہ وغیرہ انسانی زندگی کے احوال کا سبب بنتی ہیں۔ یا پھر زلزلہ، طوفان اور سیلاب وغیرہ کے ذریعہ جانی و مالی نقصان پہنچتا ہے۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے آزمائش کا ذریعہ ہیں۔

ثمراتی کمی

آزمائش کا چوتھا ذریعہ فرمایا وَالْحُمُرَاتِ پھل ہیں۔ کہ بعض اوقات پھلوں میں کمی کے ذریعے بھی آزمائش آتی ہے۔ کسی سال فصلوں میں غلہ یا درختوں پر پھل زیادہ آتا ہے، کسی سال کم آتا ہے۔ اور کسی سال بالکل نہیں آتا۔ غلہ اور پھلوں کی فراوانی یا کمی قبضہ قدرت میں ہے۔ لہذا یہ بھی آزمائش کا ایک ذریعہ ہے۔

امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ خوف سے مراد دشمن کا خوف ہے۔ بھوک سے مراد اختیاری بھوک یعنی عبادت، ریاضت اور روزہ کا حکم ہے۔ اور مال و جان کی کمی سے مراد راس المال کی کمی ہے۔ جس کے ذریعے انسان کام کاج کرتا ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ پھلوں میں کمی سے مراد انسانی اولاد میں کمی ہے۔ اولاد انسان کا ثمرہ ہوتا ہے۔ بعض اوقات افزائشِ نسل انسانی میں کمی واقع ہو جاتی ہے۔ پھل سے مراد درختوں کا پھل بھی ہے اس میں بھی کمی بیشی ہوتی رہتی ہے۔ تاہم امام شافعیؒ نے پہلی تاویل کو اختیار کیا ہے یعنی ثمرات میں کمی سے مراد نسل انسانی میں کمی ہے۔ اور اس کی تصدیق حدیث شریف سے بھی ہوتی ہے۔ حضور علیہ السلام فرماتے کہ جب کسی کا بیٹا فوت ہو جاتا ہے، تو اللہ تعالیٰ فرشتوں کو مخاطب کر کے فرماتا ہے۔ قَبَضْتُ رُوحَ ابْنِ عَبْدِي کہ تم نے میرے بندے کے بیٹے کی روح قبض کر لی ہے فرشتے عرض کرتے ہیں کہ یا مولا کریم ہم نے تیرے حکم کے مطابق ایسا کیا ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں اَخَذْتُ مَرَّةً قَلْبَهُ تم نے اس کے دل کا پھل لے لیا ہے۔ فرشتے عرض کرتے ہیں۔ ہاں ہم نے لے لیا ہے۔ اللہ تعالیٰ پھر

پوچھتے ہیں کہ ایسا کرنے پر میرے بندے نے کیا کہا۔ فرشتے کہتے ہیں کہ بندے نے **حَمْدًا وَاسْتَوْجَعَ** تیری تعریف کی اور انا اللہ کہا۔ اس پر اللہ تعالیٰ اس بندے سے راضی ہو کر کہتا ہے کہ اس کے لیے بہشت میں ایک خاص کوٹھی اور ایک جگہ بنا دو اور اس کا نام بیت الحمد رکھ دو۔ یہ اُس بندہ مومن کا انعام ہے اس سے معلوم ہوا کہ غم سے مراد اولاد بھی ہے

صابرؓ کے
بشارت

اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قسم کی آزمائشوں کا ذکر فرمایا اور مقصود اس سے یہ ہے کہ ان آزمائشوں میں پورا اتمہ یعنی ہر مصیبت پر صبر و شکر کا دامن تھامے رکھنا ہی انسانیت کی معراج ہے جو شخص تکلیف آنے پر اُسے برداشت کرتا ہے ہجر و فرار یا کوئی خلاف شرع حرکت نہیں کرتا، صبر کا پورا پورا راسخ ادا کرتا ہے تو ایسے ہی لوگوں کے متعلق اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں **وَبَشِّرِ الصَّابِرِينَ** ایسے صابر و شاکر لوگوں کو خوشخبری سنا دو کہ فلاں و کامیابی اُن کے مقدر میں ہو چکی ہے۔ اور وہ کون لوگ ہیں جنہیں یہ بشارت دی جا رہی ہے۔ **الَّذِينَ إِذَا أَصَابَتْهُمُ مُصِيبَةٌ قَالُوا إِنَّا لِلَّهِ** جب اُن کو کوئی تکلیف پہنچتی ہے **فَقَالُوا إِنَّا لِلَّهِ** **وَلَنَا إِلَيْهِ وَرَجْعٌ** ہم سب خدا کا مال ہیں۔ اور پھر لوٹ کر اُسی کے پاس جانے مقصد یہ کہ ہم سب اللہ کی مخلوق ہیں ہماری جانیں اور مال اللہ ہی کا دیا ہوا ہے یہ سب اُسی کی مہربانی کا مہر ہون منت ہے اور نہ ہمارا تو کچھ بھی نہیں ہے دوسری جگہ فرمایا **لِلَّهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ** آسمان و زمین کی ہر چیز اللہ کی عطا کردہ ہے۔ بقول اکبر الہ آبادی ہمارا تو صرف دہم و گمان ہی ہے۔ باقی ہر چیز اللہ کی ہے وہ مالک و مختار ہے اپنی ملکیت میں جب اور جیسے چاہتا ہے تصرف کرتا ہے۔ **اِنَّ لِلَّهِ مَا عَطٰی وَلَکُمْ مَا آخَذَ** کُلُّ شَيْءٍ عِنْدَهُ بِاَجَلٍ مُّسَمًّى سب کچھ اُسی کا ہے۔ جب چاہتا ہے عطا کرتا ہے اور جب چاہتا ہے اٹھا لیتا ہے زندگی ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ وہ جب اور جتنی چاہتا ہے دیتا ہے۔ اور جب چاہتا ہے لے لیتا ہے۔ جسم و جان اور موت و حیات کا مالک تو وہی ہے

لہذا جب کسی مومن کو تکلیف پہنچتی ہے تو وہ اِنَّا لِلّٰہِ کہہ کر اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ یہ مال و دولت اُمّی کا عطا کردہ ہے، وہ جیب چاہے لے لے۔ لہذا وہ کسی قسم کے نقصان پر چیخ و پکار یا دادیلا نہیں کرتا، بلکہ صبر سے کام لیتا ہے۔ اور ایسے ہی صابریں کے لیے اللہ تعالیٰ نے بشارت دی ہے۔

مصیبت کے وقت رونا پیٹنا، نوحہ کرنا، بالوں کو نوچنا یا گالیں پیٹنا ہرگز ایمان کا جزو نہیں ہے حضور علیہ السلام نے عورتوں سے بیعت لیتے وقت غم نہ لیا تھا کہ رونا پیٹنا جائز ہے، نوحہ کرنا حرام ہے، ایسا ہرگز نہ کرنا، البتہ غم و اندوہ سے کسی کے آنسو بہ نکلیں تو یہ ایک فطری امر ہے اور درست ہے مگر چیخ و پکار کہہنا خلاف طبع اور ناجائز ہے۔ اس سے بچنا چاہیے۔

مصیبت کے وقت صبر کرنا اور اِنَّا لِلّٰہِ کہہ دینا گویا اللہ تعالیٰ کے فیصلہ پر رضا مندی کا اظہار ہے کہ اللہ تعالیٰ نے میرے لیے جو بھی پسند فرمایا ہے میں اس پر راضی ہوں۔ اگر اللہ ہم سے راضی ہو گیا، تو یہ اجر و ثواب کا باعث ہوگا۔ اور وہ ناراض ہو گیا۔ تو ہم یقیناً تباہ و برباد ہو جائیں گے۔ کیونکہ لوٹ کر بھی اسی کے پاس جانا ہے اسی کی بارگاہ میں پیش ہونا ہے اس کے علاوہ اور کوئی مقام نہیں چنانچہ صبر کا قانون بتلا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ فرماتے ہیں کہ میں آسمان سے گر جاؤں، زمین پر ہلاک ہو جاؤں یہ بات میرے لیے اس بات سے بہتر ہے کہ خدا تعالیٰ کے کسی فیصلہ کے متعلق میں یوں کہوں کہ یہ مجھے پسند نہیں۔ بلکہ اللہ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ جو خدا کے فیصلے پر راضی ہو جائے گا، اللہ تعالیٰ بھی اُس سے راضی ہوگا۔ اور جو شخص خدا کے کسی فیصلہ پر ناراض ہوگا، اللہ تعالیٰ بھی اُس سے ناراض ہو جائے گا۔ ظاہر ہے کہ جس شخص سے اللہ ناراض ہوگا، اُس کا حشر کیا ہوگا۔ اہم البکر حصہ ص ۱۱ فرماتے ہیں کہ ان آیات سے واضح ہے کہ رضا بالقضا فرض ہے۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا چاہیے۔ اور صبر کا دامن نہیں

چھوڑنا چاہیے۔ فرماتے ہیں۔ کہ ان آیات نے وہ احکام مترشح ہوتے ہیں یعنی فرض اور نفل۔ اللہ تعالیٰ کے ہر فیصلے پر راضی ہو جانا فرض حکم ہے اور ہر مصیبت پر اِنَّا لِلّٰهِ وَاِنَّا اِلَيْهِ رَاجِعُونَ کتنا نفی حکم ہے حضور علیہ السلام نے یہ دعا کھائی اَللّٰهُمَّ اِحْبِنِيْ فِيْ مُصِيبَتِيْ وَاخْلُقْ لِيْ خَيْرًا مِنْهَا۔ یعنی اے اللہ! مصیبت میں مجھے اجر عطا فرما اور اس کا مجھے بہتر بدلہ عطا کر۔ یہ ایمان والوں کی نشانی ہے کہ وہ ہر مصیبت پر اس طرح کے کلمات کہ کر راضی برضا ہو جاتے ہیں تکلیف خواہ تھوٹی ہو یا بڑی، اُس پر صبر کرنا اور کلمات خیر کرنا ایمان کی نشانی ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ اگر جوتے کا تسمہ بھی ٹوٹ جائے یا کھڑکھرا لگ جائے تو اُس پر بھی اِنَّا لِلّٰهِ پڑھنا چاہیے تاکہ اللہ کی رضا پر راضی ہونے کی سند حاصل ہو جائے۔

صلہ صبر

فرمایا صبر کرنے والے اور اللہ کی رضا پر راضی ہونے والے لوگوں کا صلہ یہ ہے اُولَئِكَ عَلَيْهِمْ صَلَوَاتٌ مِنْ رَّبِّهِمْ وَرَحْمَةٌ اِلَيْهِ هِيَ لَوْكُ هِيَ لَوْكُ ہر جن پر رب تعالیٰ کی عنایتیں اور مہربانی ہے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد خاص رحمت اور مہربانی ہے۔ اور رحمت سے مراد عام مہربانیاں ہیں۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ صلوٰۃ سے مراد وہ عنایتیں اور مہربانیاں ہیں جو ان لوگوں کو انبیاء علیہم السلام کی وساطت سے پہنچتی ہیں۔ اور رحمت وہ مہربانی ہے جو ان لوگوں کو اللہ کے فضل سے پہنچتی ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کی حکمت کے مطابق صلوٰۃ جیسی بلند پایہ رحمت کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بندے کا اتصالِ حظیرۃ القدس جیسے بلند پایہ مقدس مقام سے ہو جاتا ہے جہاں اللہ تعالیٰ کی تخلیقِ عظیم پڑتی ہے۔ اس طرح گویا اس کا رابطہ خدا تعالیٰ سے قائم ہو جاتا ہے اور اُسے بڑی بلندی اور ترقی نصیب ہوتی ہے۔ وَاُولَئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُونَ اور یہی لوگ ہدایت یافتہ ہیں۔ انہیں یہ مقام اسی لیے حاصل ہوتا ہے کہ وہ صراطِ مستقیم کے راہی ہوتے ہیں۔ اور اسی سیدھے راستے پر چل کر اعلیٰ مقام حاصل کرتے ہیں۔

إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ
أَوْ اعْتَمَرَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ أَنْ يَطَّوَّفَ بِهِمَا وَمَنْ
تَطَوَّعَ خَيْرًا فَإِنَّ اللَّهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ ﴿۱۵۸﴾

ترجمہ: بے شک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ پس جس شخص
نے بیت اللہ شریف کا حج کیا یا عمرہ کیا، اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ وہ ان دونوں
کا طواف کرے۔ اور جس شخص نے خوشی سے نیکی کا کام کیا، تو بیشک اللہ تعالیٰ
قدر دان اور سب کچھ جاننے والا ہے ﴿۱۵۸﴾

صفا اور مروہ

تہذیب الاخلاق کے تین اصول پہلی آیات میں بیان ہو چکے ہیں اور وہ
ہیں ذکرہ اللہ، شکرہ اللہ، صبر اور دعا اس آیت میں ایک اور اہم اصول شعائر اللہ
کا بیان ہے۔ منجملہ دیگر شعائر کے اس آیت میں صفا اور مروہ کو خاص طور پر شعائر اللہ کہا گیا
ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ إِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللَّهِ
بیشک صفا اور مروہ اللہ کی نشانیوں (شعائر) میں سے ہیں۔ یہ دونوں پہاڑیاں
بیت اللہ شریف سے متصل واقع ہیں۔ زیادہ اونچی نہیں ہیں۔ اُس زمانہ میں بھی
یہ چھوٹی چھوٹی پہاڑیاں تھیں۔ بس ارد گرد کے خطے سے ذرا ابھری ہوئی تھیں۔ اب
تو جزافیہ ہی بدل چکا ہے۔

ان کا
بیشتر حصہ کاٹ دیا گیا ہے۔ اور نشان کے طور پر تھوڑی تھوڑی چھوڑ دی گئی ہیں ان
دونوں پہاڑیوں کی درمیانی جگہ پست ہے۔ جہاں پر سعی کی جاتی ہے اور حجاج و عمرہ
کے ارکان میں سے ہے۔ لغوی طور پر صفا سخت قسم کی چکنی چٹان کو کہتے ہیں اور مروہ
سفید رنگ کے پتھروں کو کہا جاتا ہے۔ شاید انہی خصوصیات کی بنا پر ان پہاڑیوں

کو یہ نام دیے گئے۔

تہذیبِ اخلاق کا
پانچواں اصول
شعارِ اللہ کی
تعظیم ہے

یہاں پر صفا مردہ کو شعارِ اللہ کہا گیا ہے قرآن کریم کے درجہ مقام پر شعارِ اللہ کی عظمت کے بیان میں فرمایا لَا تُحْلُوا شَعَائِرَ اللَّهِ یعنی اللہ کے شعار کی بے حرمتی مت کرو۔ بلکہ ان کی تعظیم کرو۔ اس کو شیعرہ اس لیے کہا جاتا ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کی یاد کی علامت اور نشانی ہوتی ہے۔ اس کو دیکھ کر اللہ کی یاد تازہ ہوتی ہے۔ شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ شعارِ اللہ کی تعظیم اللہ تعالیٰ کی تعظیم کے مترادف ہے۔ کیونکہ یہ چیزیں اللہ کی یاد آوری کا ذریعہ ہیں ان کو بت پرستی یا شرک اس لیے نہیں کہہ سکتے کہ ہم ان چیزوں کی تعظیم ان کی ذات کی وجہ سے نہیں کہہ سکتے ہیں بلکہ حقیقت میں یہ اللہ تعالیٰ کی ہی تعظیم ہے۔ جن کو دیکھ کر اسکی عظمت اور یاد دل میں آتی ہے۔ شعارِ اللہ میں مکان کے علاوہ کئی قسم کے افعال بھی داخل ہیں مثلاً اہم شاہ ولی دہلوی فرماتے ہیں کہ مِنْ أَعْظَمِ شَعَائِرِ اللَّهِ چار چیزیں اللہ کے شعار میں سب سے بڑی ہیں اور ان میں خانہ کعبہ حضور علیہ السلام کی ذات مبارکہ، نماز اور قرآن پاک شامل ہیں اسی طرح شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی تفسیر عزیزی میں فرماتے ہیں کہ شعارِ اللہ میں عرفات بھی داخل ہے۔ جہاں نو ذوالحجہ کو لوگ جمع ہوتے ہیں۔ یہاں کا وقوف ہی حج کا رکن اعلیٰ ہے۔ لوگ غروب آفتاب تک وہاں قیام کرتے ہیں۔ اور خوب گڑ گڑا کر اللہ تعالیٰ کے حضور دعائیں مانگتے ہیں۔ اسی طرح منظر الحرام بچے مزدلفہ کہا جاتا ہے وہ بھی شعارِ اللہ میں شامل ہے۔ منیٰ میں رمی جمار بھی شعارِ اللہ میں داخل ہے۔ صفا و مردہ کا ذکر تو خود قرآن پاک نے فرمایا۔ علاوہ انہیں تمام مساجد رمضان کا مہینہ، اور اشہر الحرام (حرمت والے مہینے) یعنی رجب، ذی قعدہ، ذوالحجہ اور محرم الحرام یہ سب شعارِ اللہ ہیں۔ یہ سب واجب الاحترام مہینے ہیں۔ اور ان میں گناہوں سے بچنا زیادہ ضروری ہے۔ ان میں عبارت کا اجر و ثواب بھی بڑھ جاتا ہے اور گناہ کا وزن بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔

آپ فرماتے ہیں کہ عید الاضحیٰ، عید الفطر، جمعہ، ایام تشریق، اقامت، ختنہ

نماز باجماعت، رمل، طواف، ہدی قربانی اور صفارہ کی سعی سب شعائر اللہ میں داخل ہیں۔ قرآن پاک کا ارشاد ہے۔ **وَمَنْ يُعَظِّمْ شَعَائِرَ اللَّهِ فَإِنَّهَا مِنْ تَقْوَى الْقُلُوبِ** یعنی شعائر اللہ کی تعظیم دلوں کے تقویٰ کی بنا پر ہے جس کے دل میں خدا کا تقویٰ ہوگا، وہی شعائر اللہ کی تعظیم کرے گا۔

تفسیر عزیزی

تفسیر عزیزی شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی کی مشہور تفسیر ہے جو کہ فارسی زبان میں لکھی گئی۔ آپ کے والد ماجد امام شاہ ولی اللہ نے سب سے پہلے قرآن پاک کا فارسی میں ترجمہ کیا جس کا نام **فتح الرحمن** رکھا۔

اُس زمانے میں ہندوستان میں مسلمانوں کی حکومت تھی۔ کابل سے لے کر برہمک سارا علاقہ مسلمانوں کے زیر نگیں تھا۔ سرکاری زبان فارسی تھی۔ ساتھ ساتھ عربی کو بھی اعلیٰ مقام حاصل تھا۔ اس وقت اردو زبان اپنے ابتدائی مراحل میں تھی اور محدث تھی۔ البتہ مرہٹی اور تامل ناڈ زبانیں اپنے اپنے علاقوں میں فروج تھیں۔ ہندی کا بھی عام چرچا تھا۔ تاہم ان دو بزرگوں نے فارسی زبان کو ذریعہ ابلاغ بنایا۔ امام شاہ ولی اللہ کی کتابیں فارسی اور عربی دونوں زبانوں میں پائی جاتی ہیں۔ آپ کی مشہور عالم تصنیف اصول تفسیر فارسی زبان میں ہے۔ ازالۃ الخفا بھی فارسی میں ہے موطا کی شرح ایک فارسی میں ہے اور ایک عربی میں بمقصد بہر حال ابلاغ دین تھا جس میں آپ کے خاندان کو کماحقہ کامیابی حاصل ہوئی۔

الغرض! آپ کے زمانہ میں رائج الوقت زبان فارسی تھی۔ دفتری خطوط کتابت بھی اسی زبان میں ہوتی تھی، جس طرح آجکل سکولوں، کالجوں، دفتروں اور بیرون ملک انگریزی زبان کا چرچا ہے۔ اسی طرح اُس زمانے میں فارسی سروج تھی۔ لہذا اپنے زیادہ فارسی کے ذریعے ہی دین کی اشاعت کا کام کیا۔

شاہ ولی اللہ کا خاندان برصغیر پاک و ہند میں بڑا نورانی خاندان گذرا ہے آپ تمام مسلمانوں کے پیر و مرشد اور مربی تھے۔ برصغیر میں دینی تعلیم کا بیڑا آپ نے ہی اٹھایا۔ آپ وقت کے فقیہ تھے۔ ان لوگوں نے تعلیم کے مراکز اور مدارس

قائم کیے۔ شاہ ولی اللہؒ اپنے والد ماجد کے مدرسہ رحیمیہ میں تعلیم و تربیت اور درس و تدریس کے فرائض انجام دیتے تھے۔ آپ حج کے لیے حجاز مقدس گئے تو وہاں دو سال تک قیام کیا اور وہاں کے علماء سے علمی استفادہ کیا۔ واپس آکر پھر درس و تدریس کے سلسلہ میں منہمک ہو گئے۔

شاہ عبدالعزیزؒ نے لمبی عمر پائی ہے۔ آپ ساری عمر تدریس کے کام میں مشغول رہے۔ فتویٰ بھی دیتے رہے۔ آپ نے سنت جہاد کو دوبارہ زندہ کیا اور بڑے بڑے مجاہد پیدا کئے۔ آپ کے زمانہ میں برصغیر میں انگریز کا عمل دخل ہو چکا تھا۔ اسی زمانے میں آپ نے یہ تفسیر عزیزی لکھی۔ تفسیر عزیزی کے آخری دو پارے یعنی پارہ ۲۹ اور ۳۰ دو مختلف جلدوں میں ہیں۔ ابتداء میں سورۃ بقرہ کی نصف تک تفسیر لکھی تھی۔ کہ زندگی نے ساتھ نہ دیا اور یہ کام وہیں رہ گیا۔ یہ عظیم تفسیر حکمانہ فکر کے ساتھ لکھی گئی ہے جس میں اسلام کے حقائق کو خوب اجاگر کیا گیا ہے۔ حضرت ابو شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں کہ اگر تفسیر عزیزی مکمل ہو جاتی تو یہ سمجھا جاتا کہ قرآن پاک کا حق ادا ہو گیا ہے۔ اس وقت اس تفسیر کی صرف تین جلدیں موجود ہیں۔ تاہم یہ کمال درجہ کی چیز ہے۔ اس کا ترجمہ اردو میں بھی ہو چکا ہے۔

طواف سعی

اہم ابن جریرؒ نے مفسر قرآن حضرت قتادہؒ سے روایت نقل کی ہے۔ کہ صفا اور مروہ کے درمیان دوڑنا حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کی سنت ہے۔ حاکم نے مستدرک میں بیان کیا ہے۔ کہ صفامروہ کی سعی حضرت اسماعیل علیہ السلام کی والدہ کی میراث ہے۔ اُن سے یہ چیز بطور وراثت نقل ہو چکی آ رہی ہے حضرت ہاجرہؓ پہلی شخصیت ہیں جنہوں نے صفا و مروہ کے درمیان سعی کی المومنین حضرت عائشہؓ کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ حضور سرور کائنات صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا بیت اللہ شریف کا طواف، صفامروہ کی سعی اور رمی جمار اللہ کے ذکر کے اقامت کے لیے ہے۔ طواف تو بجائے خود نماز کی مانند ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے الطَّوَافُ حَوْلَ الْبَيْتِ مِثْلُ الصَّلَاةِ یعنی بیت اللہ شریف

کے گرد طواف کرنا نماز کی مثل ہے۔ فرق صرف اتنا ہے کہ نماز کے دوران گفتگو کی قطعاً اجازت نہیں جب کہ طواف کے دوران حسب ضرورت بات چیت کی جا سکتی ہے۔ تاہم بہتر یہ ہے کہ کلام سے اجتناب کرے اور اللہ کے ذکر میں منہمک رہے۔ ذکر الہی کے لیے مختلف کلمات موجود ہیں۔ حضرت لاہوریؒ کے بڑے فرزند مولانا حبیب اللہ طواف کے ساتھ چمکے دل میں پورا قرآن پاک ختم کر لیتے تھے۔ اللہ نے اس قدر توسیع بخشی تھی۔ آپ بڑے ہی عبادت گزار تھے۔ طواف میں دو تین گھنٹے صرف کرتے تھے۔ اور شدید تہین گہمی میں بھی طواف کرتے رہتے تھے۔

حضرت عبداللہ بن مسعودؓ سے روایت ہے کہ جب حضرت موسیٰ علیہ السلام حج کے لیے آتے تو صفا و مروہ کے درمیان بیک پکارتے ہوئے دوڑتے اور اللہ کی طرف سے بھی بیک بخدی کی آواز سنتے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے کہ تمہاری پکار پر میں بھی موجود ہوں۔ سعی کے دوران پڑھی جانے والی مشہور دعا رَبِّ اغْفِرْ وَارْحَمْ إِنَّكَ أَنْتَ الْغَفُورُ الرَّحِيمُ حضرت موسیٰ علیہ السلام کی طرف منسوب کی گئی ہے۔ یعنی اے اللہ! معاف فرما دے اور رحم فرما۔ تو عزت والا اور بڑے کرم والا ہے۔ اس کے علاوہ سعی کی اور بھی دعائیں منقول ہیں جن میں لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ ہے۔ اس کے علاوہ ایمان پر ثابت قدمی کی دعا ہے۔ یعنی اللَّهُمَّ إِنِّي أَسْأَلُكَ كَمَا هَكَذَا يَسْتَعِي لِلْإِيمَانِ أَنْ لَا تَنْفَعَنِي مِنِّي حَتَّى تَوْفِقَنِي عَلَى ذَلِكَ۔ اے اللہ! جس طرح تو نے مجھے ایمان اور اسلام کی طرف ہدایت فرمائی ہے۔ میں تجھ سے التجا کرتا ہوں کہ تھے مجھ سے نہ چھیننا یہاں تک میری موت آجائے۔

صفا و مروہ کی سعی کی حیثیت کے متعلق مختلف آراء ہیں مشہور روایت یہ ہے کہ امام احمدؒ کے نزدیک سعی سنت ہے البتہ امام شافعیؒ طے رکن کہتے ہیں۔ اگر حج میں سعی نہیں کی تو حج نہیں ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ اسے واجب کہتے ہیں

اگر سعی نہ ہو سکے تو دوم دینا پڑے گا۔ جس سے اس کی تلافی ہو جائے گی واجب بھی بہت بڑا درجہ ہے۔ فرض کے بعد اسی کا نمبر ہے۔ حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرمی ہے۔ اَيُّهَا النَّاسُ اسْعَوْا لِي لَوْ كُنْتُمْ اَصْفَادَ مَرُوءَہِ كَعَدُوِّمَانِ سَعَى كَرُو اِنَّ اللّٰهَ كَتَبَ عَلَیْكُمْ السَّعْيَ اللّٰهُ تَعَالٰی نے تم پر سعی کو ضروری قرار دیا ہے حضور علیہ السلام جب سعی کے لیے تشریف لاتے تو فرماتے اَبْدًا اَبْدًا اَبْدًا اللّٰهُ تَعَالٰی میں وہیں سے شروع کرتا ہوں جہاں سے اللّٰهُ تَعَالٰی نے ابتداء فرمائی ہے یعنی صفا سے کیونکہ آیت زیر درجہ میں اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ فَرَمَا یَا کَیَاہُ گویا صفا سے ابتداء کی گئی ہے۔ الغرض! حضور علیہ السلام سعی صفا سے شروع کر کے مروہ پر ختم کرتے تھے یہی سنت مبلکہ آج تک جاری ہے یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ جسے محبوب سے محبت ہوتی ہے اُسے اس کے متعلق بے بھی محبت ہوتی ہے حج کے تمام شعائر مٹی، عرفات، قربانی وغیرہ محبوب کے تعلقات ہیں۔ جب دل میں اللّٰهُ تَعَالٰی کی محبت جاگنیں ہوتی ہے۔ تو پھر وہ اس کے شعائر سے بھی محبت کرے گا ان کی تعظیم کرے گا۔ صبر اور شکر ادا کرے گا، یہی چیزیں تہذیب نفس کے حصول کی علامتیں ہیں

چاہ زم زم کے اجر کا واقعہ مشہور ہے۔ ابراہیم علیہ السلام بے آب و گیاہ چاہ زم زم وادی میں حضرت ہاجرہؑ اور اسماعیل علیہ السلام کو چھوڑ گئے۔ حقوڑی بہت کھجوریں اور چھپا گل میں پانی تھا۔ جب پانی ختم ہو گیا تو مائی صاحبہؑ نے ادھر ادھر پانی کی تلاش شروع کر دی آپ کبھی صفا پر جاتیں اور وہاں سے مایوس ہو کر مروہ پہاڑی پر پہنچ جاتیں بچہ پیاس سے تڑپ رہا تھا۔ جب آپ کی پریشانی انتہا کو پہنچی تو اللّٰهُ تَعَالٰی نے اپنی حکمت نامہ سے جبرائیل علیہ السلام کو بھیجا۔ انہوں نے اللّٰہ کے حکم سے اپنا پُر زمین پر مارا، تو وہاں سے پانی جاری ہو گیا۔ یہ بڑا متبرک پانی ہے فاسی نے تاریخ مکہ میں روایت بیان کی ہے کہ یہ پانی کوثر اور سبیل سے زیادہ فضیلت رکھتا ہے۔ پانی کے اس چشمہ کو کسی حوادث بھی آئے مگر بالآخر

اُسے کنواں کی صورت حاصل ہو گئی۔ جاہلیت کے زمانہ میں یہ کئی دفعہ بند ہوا اور کھولا گیا اب اس کنواں سے ساری دنیا سیراب ہوتی ہے۔ زمانہ بن حرم خوب سیر ہو کر یہ پانی پیتے ہیں۔ اور جاتے وقت دنیا کے اکابر اطراف میں یہ تبرک کے طور پر لے جاتے ہیں۔ اُس وقت سے لے کر آج تک اسکی آبیاری جاری ہے۔ اور انشاء اللہ تاقیامت جاری رہے گی۔ اس کا ذائقہ بھی عام پانیوں سے مختلف ہے۔ یہ پانی بیک وقت دروا، شفا اور غذا کا قدرتی مجموعہ ہے۔ سائنس دانوں کا کہنا ہے کہ انسانی جسم کے لیے اس سے بہتر کوئی پانی دنیا بھر میں موجود نہیں ہے۔

صفا اور
دعوتِ توحید

صفا کی یہ وہی تاریخی پہاڑی ہے۔ جس پر چڑھ کر حضور علیہ السلام نے قریش کو دعوتِ توحید دی۔ عربوں میں یہ طریقہ رائج تھا۔ کہ کسی سخت خطرے کے وقت بلند جگہ پر چڑھ کر **وَصَبَّاحَاہُ** کا نعرہ لگاتے۔ جس کا مطلب یہ ہوتا تھا کہ دشمن آگیا ہے یا اور کوئی خطرہ ہے۔ لہذا سب لوگ اکٹھے ہو جائیں۔ اور پھر ایسا ہی ہوتا تھا۔ حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی صفا پر چڑھ کر یہی نعرہ لگایا۔ قوم کے لوگ اکٹھے ہو گئے کہ کوئی خطرے کی بات ہوگی۔ جب سارے لوگ آگئے تو آپ نے فرمایا اگر میں تم سے یوں کہوں کہ صبح کے وقت اس پہاڑ کے پیچھے سے تمہارا دشمن حملہ آور ہو رہا ہے تو کیا تم میری بات کو تسلیم کر لو گے۔ سب نے بیک زبان ہو کر کہا **مَا** **حَسْبُنَا عَلَیْكَ** **كَذَبْنَا** ہم نے کبھی آپ پر جھوٹ کا تجربہ نہیں کیا۔ آپ ہمیشہ سچ فرماتے ہیں۔ اس پر آپ نے ارشاد فرمایا **إِنِّي نَذِيرٌ لِّكُمُ** لوگو! میں تم کو اس بات سے ڈرانے کے لیے آیا ہوں۔ کہ تم پر سخت عذاب آنے والا ہے۔ اگر اس سے بچنا چاہتے ہو تو میری بات مان لو **فَقُلْ لَا إِلَهَ إِلَّا اللَّهُ** کلمہ طیبہ کا اقرار کر لو، فلاح پا جاؤ گے۔ ان لوگوں میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے چچا ابولسب بھی تھے۔ وہ اس بات سے بڑے سیخ پا ہوئے اور کہا **يَا مُحَمَّدُ** اے محمد! آپ کے لیے ہلاکت ہو **إِلَهَذَا** **جَمَعْتُمْ** کیا تو نے اس لیے ہمیں جمع کیا تھا۔ ہم تو سمجھے تھے کہ کوئی خاص بات

ہوگی، مگر تو نے ہمیں ایسی بات بتادی۔

فتح مکہ کے روز بھی آپ اسی صفا پر کھڑے ہوئے اور فرمایا اَلْحَمْدُ لِلّٰهِ
الَّذِيْ اَنْجَزَ وَعْدَهُ وَفَضَلَ عَبْدَهُ وَهَزَمَ الْاَحْزَابَ وَوَحَّدَهُ
یعنی اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے، جس نے اپنا وعدہ پورا کیا، اپنے بندے کی مدد فرمائی
اور اس وعدہ لاشریک نے اکیلے ہی ان سب کو شکست دی۔ یہاں پر اللہ کے
وعدے سے مراد وہی وعدہ ہے۔ جب مشرکین مکہ حضور علیہ السلام کو طرح طرح
کی تکالیف پہنچاتے تھے۔ اور آپ کو مکہ میں رہنے نہیں دیتے تھے۔ تو اللہ
نے وعدہ فرمایا کہ ایک دن فتح ہوگا اور یہ سب لوگ مغلوب ہو جائیں گے۔

بیت اللہ شریف
میں شرک

بیت اللہ شریف حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیر کیا تھا۔ وہی ابراہیم
علیہ السلام جنہوں نے بت خانے کے تمام بتوں کو پاش پاش کر دیا تھا۔
مگر انہیں کے نام نہاد پیر و کاروں یعنی مشرکین مکہ نے اسی کعبہ شریف میں
جگہ جگہ بت رکھے ہوئے تھے۔ خانہ کعبہ کے سامنے بت تھے۔ اس کی دیواروں
پر بت تھے۔ چارہ زم زم کے پاس بت رکھے تھے۔ صفا اور مروہ پر بت موجود تھے۔
غرضیکہ مشرکین نے ہر چیز کو بگاڑ دیا تھا۔ اور اس طرح خود خانہ کعبہ میں شرک کے مرکب
ہو رہے تھے۔

مشہور روایت کے مطابق صفا اور مروہ پر جو بت رکھے ہوئے تھے ان میں
سے اساف مرد کا بت تھا اور وہ صفا پہاڑی پر تھا اور ناکہ عورت کا بت تھا اور وہ
مروہ پر رکھا ہوا تھا۔ یہ مرد و زن مشرک تھے۔ انہوں نے خانہ کعبہ میں برائی کا ارتکاب
کیا تھا جس کے نتیجے میں اللہ تعالیٰ نے پتھر کی صورت میں مسخ کر دیا۔ لوگوں نے
ان پتھروں کو اٹھا کر باہر رکھ دیا تاکہ لوگ عبرت حاصل کریں کہ برائی کا نتیجہ کیا ہوتا ہے
وقت گزرنے کے ساتھ ان بتوں کی پوجا ہونے لگی اور یہ لوگوں کے معبود بن گئے پھر لوگوں
ان میں سے ایک کو صفا پر رکھ دیا اور دوسرے کو مروہ پر۔

سعی قدیم
سنت ہے۔

جب اسلام کا دور آیا تو مسلمانوں کو صفا و مروہ کی سعی کرنے میں چھکنا ہٹا

محسوس ہوئی۔ اُن کا خیال تھا کہ یہ سعی شاید ان بتوں کی وجہ سے ہو۔ اُس دور میں اس سے ملتی جلتی اور بھی مثالیں موجود تھیں مثلاً اوس اور خزرج قبیلہ کے لوگ جب حج کے لیے آتے تھے۔ تو منات نامی بہت کے نام پر احرامِ مدینہ سے باندھتے تھے یہ بہت کسی بزرگ کے نام سے موسوم تھا۔ اور سمندر کے کنارے مشکل کے مقام پر پر رکھا ہوا تھا۔ یہ لوگ خانہ کعبہ کا طواف تو کرتے تھے مگر صفا و مروہ کی سعی نہیں کرتے تھے۔ اس قسم کے نظریات اُس وقت موجود تھے۔

مسلمانوں کے اس شک کو دور کرنے کے لیے قرآن پاک نے فرمایا اِنَّ الصَّفَا وَالْمَرْوَةَ مِنْ شَعَائِرِ اللّٰهِ صفا اور مروہ تو اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اور یہ قدیم سلسلہ سے منسلک ہیں۔ ان کے درمیان دوڑنا ان بتوں کی تعظیم کے لیے نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو محض اللہ تعالیٰ کی تعظیم اور اس کی رضا جوئی کے لیے ہے۔ چنانچہ ان بتوں کو وہاں سے ہٹا دیا گیا۔ خطہ عرب کے تمام بتوں کو توڑ دیا گیا۔ بیت اللہ شریف کو ان کی نجاست سے پاک و صاف کر دیا گیا۔ اور اس طرح مرکز اسلام سے ایک دفعہ پھر توحید کی صدا بلند ہونے لگی۔

اسی لیے فرمایا کہ صفا و مروہ شعائر اللہ میں سے ہیں۔ فَمَنْ حَجَّ الْبَيْتَ اَوْ اعْتَمَرَ پس جو کوئی حج یا عمرہ کرے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِ اس پر کوئی حرج نہیں ہے اَنْ يَّطُوفَ بِهِمَا کہ ان دونوں کا طواف کسے سعی احکام حج میں سے ہے اور قدیم سنت ہے۔

فرمایا وَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا جس نے خوشی سے نیکی کا کام کیا فَإِنَّ اللّٰهَ شَاكِرٌ عَلِيمٌ تو اللہ تعالیٰ قدر دان اور جاننے والا ہے۔ یاد رہے کہ شک سے فاعل کا صیغہ جب اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب کیا جائے تو اس کا معنی قدر دانی ہوتا ہے یعنی اللہ تبارک و تعالیٰ قدر دان ہے۔ اگر معمولی سی نیکی بھی خلوص نیت سے کی جائے تو اللہ تعالیٰ اس پر بھی بڑے سے بڑا اجر عطا کرتا ہے اور علیم سے مراد یہ ہے کہ وہ سب کچھ جاننے والا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں حتیٰ کہ وہ انسان کی نیت اور باطنی ارادہ کو بھی جانتا ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و دو (۶۲)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۵۹ تا ۱۶۳

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنزَلْنَا مِنَ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدَىٰ مِنْ
 بَعْدِ مَا بَيَّنَّاهُ لِلنَّاسِ فِي الْكِتَابِ ۚ أُولَٰئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللَّهُ
 وَيَلْعَنُهُمُ اللَّعْنُونَ ۝۵۹ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا وَأَصْلَحُوا وَبَيَّنَّوْا
 فَأُولَٰئِكَ أَتُوبُ عَلَيْهِمْ ۚ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ ۝۶۰ إِنَّ
 الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارٌ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ
 وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ۝۶۱ خُلِدُوا فِيهَا لَا يُخَفَّفُ
 عَنْهُمْ الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ۝۶۲ وَاللَّهُ كُفَرًا لَهُمْ
 لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَنُ الرَّحِيمُ ۝۶۳

۱۵۹

ترجمہ: تحقیق وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں جس کو ہم نے واضح باتوں اور
 ہدایت کے ساتھ اتارا ہے۔ بعد اس کے کہ ہم نے اسے لوگوں کے لیے کتابیں بیان کر
 دیا ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں۔ جن پر اللہ لعنت کرتا ہے اور دوسرے لعنت کرنے
 والے بھی لعنت کرتے ہیں ۝۵۹ مگر جن لوگوں نے توبہ کر لی اور اپنے آپ کو سنوایا۔
 اور انہوں نے بیان کیا۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر میں رجوع کرتا ہوں۔ اور میں رجوع
 کرنے والا مہربان ہوں ۝۶۰ بیشک وہ لوگ جنہوں نے کفر کیا اور مر گئے ایسی
 حالت میں کہ وہ کفر کرنے والے ہیں۔ پس یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ فرشتوں اور
 لوگوں کی لعنت سب کی ۝۶۱ اس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اُن کے عذاب
 میں تخفیف نہیں کی جائیگی۔ اور نہ اُن کو مہلت دی جائیگی ۝۶۲ اور تمہارا معبود
 برحق ایک ہی معبود ہے۔ اس کے سوا کوئی معبود نہیں وہ مہربان نہایت رحم کرنے والا ۝۶۳

گذشتہ آیات میں تہذیب الاخلاق کے پانچ اصول بیان ہو چکے ہیں۔ سابقہ درس میں سبجلہ اُن کے تعظیم شعار اللہ کا ذکر تھا۔ تہذیب نفس کے جملہ مسائل حسبِ بت پر متفرع ہوتے ہیں، وہ مسئلہ توحید ہے۔ اس درس میں اسی مسئلہ کو بیان فرمایا گیا ہے اور اس سے پہلے مسئلہ کتمان حق کا بیان ہے۔ جیسا کہ گذشتہ دروس میں ذکر ہو چکا ہے۔ یہودیوں میں کتمان حق کی بیماری بدرجہ اتم موجود تھی۔ پہلی آیات میں اچکا ہے **وَتَكْتُمُوا الْحَقَّ وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ** یعنی اے اہل کتاب تم جان بوجھ کر حق کو چھپاتے ہو۔ اسی طرح تمویل قبلہ کے متعلق فرمایا **يَقْرِفُونَ كَمَا يَقْرِفُونَ** اَبْتَاؤُهُمْ یعنی یہ لوگ اس حقیقت کو اسی طرح پھپھانتے ہیں جیسا کہ اپنی اولاد کو مگر اس کے باوجود انکار کرتے ہیں۔ یٰ اُن کے کتمان حق کی واضح مثالیں ہیں یہ ظالم لوگ جو حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے باسے پیش گوئیوں کو چھپاتے تھے۔ اس کی بجائے لوگوں کے سامنے غلط بائیں بیان کرتے تھے تو رات میں رجم کا حکم موجود تھا۔ مگر یہودیوں نے اُسے چھپایا۔ اس کی تفصیل سورۃ مادہ میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل سے عہد لیا تھا۔ **لَتُبَيِّنَنَّكَ لِلنَّاسِ وَلَا تَكْتُمُونَهُ** کہ تم لوگوں کے سامنے حقیقت حال کی پوری پوری وضاحت کرو گے اور اُسے چھپاؤ گے نہیں مگر اس کے باوجود اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا **قَدْ جُودَ وَرَأَوْا ظُهُورَهُمْ** ان لوگوں نے حقائق کو پس پشت ڈال دیا۔ **كَأَنَّهُمْ لَا يَعْلَمُونَ** گویا کہ وہ بالکل نہیں جانتے۔

کتمان حق کی بیماری صرف یہودیوں تک ہی محدود نہیں بلکہ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر عام قانون کے طور پر اعلان فرمایا **اِنَّ الَّذِيْنَ يَكْتُمُوْنَ مَا اَنْزَلْنَا مِنْ الْبَيِّنَاتِ وَالْهُدٰى جَولُوْا كَذٰبًا** یعنی جو لوگ بھی اللہ تعالیٰ کی واضح باتوں اور ہدایت کو چھپاتے ہیں **مِنْ اَبَعْدِ مَا بَيَّنَّنَا لِّلنَّاسِ فِي الْكِتٰبِ** بعد اس کے کہ ہم نے اُسے کتاب میں وضاحت سے بیان کر دیا۔ **اُولٰٓئِكَ يَلْعَنُهُمُ اللّٰهُ وَيَلْعَنُهُمُ الْمُؤْمِنُوْنَ** یعنی یہی وہ لوگ ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی بھی لعنت ہے۔ اور دیگر لعنت کرنے

والوں کی بھی لعنت ہے۔ ظاہر ہے کہ اِنَّ الْكَافِرِيْنَ میں تمام لوگ شامل ہیں جو اس آیت کے مصداق ہیں خواہ وہ کسی سابقہ امت سے ہوں یا بنی آخر الزمان کی موجودہ امت سے متعلق ہوں۔ ہر وہ شخص اس آیت کرمیہ کا نشانہ ہے۔ جو حق بات کو چھپاتا ہے۔ حدیث شریف میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے مَنْ سَكَبَ عَلٰی عِلْمًا جس سے کوئی علم کی بات پوچھی گئی جسے وہ جانتا ہے۔ مثلاً کسی عقیدہ سے متعلق سوال ہے یا حلال و حرام کی وضاحت طلب کی گئی ہے فَكَمَثَلُكَ تو صاحب علم شخص نے اُسے چھپا دیا۔ معاملہ کو ظاہر نہ کیا۔ یا اُس کی کما حقہ وضاحت نہ کی، وجہ خواہ کچھ بھی ہو اُسے کوئی نقصان کا خطرہ تھا یا اس کی مالی منفعت متاثر ہوتی تھی یا کوئی اور فاسد مقصد کار فرما تھا جس کی وجہ سے اس نے حق کو چھپا دیا تو حضور علیہ السلام نے فرمایا اَلْجَمْعُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ بِلِجَامٍ مِّنْ سَاكِ۔ قیامت کے دن اُسے آگ کی لگام پہنائی جائے گی۔ چونکہ دنیا میں اُس شخص نے اپنی زبان سے حق کو ظاہر نہیں کیا تھا اس لیے قیامت کے دن اُس کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائیگی۔ اتنی سخت سزا دی جائیگی کہ اُس نے حق کو چھپایا تھا۔

مولانا عبید اللہ سندھی

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہمارے دور کے عظیم مفسر قرآن ہوئے ہیں آپ تعلیم یافتہ لوگوں کو چھ ماہ میں قرآن پاک سے کما حقہ واقف کرا دیتے تھے، اللہ تعالیٰ نے آپ کو ایسا ملکہ عطا کیا تھا۔ حضرت مولانا لاہوریؒ، مولانا سلطان محمود کٹیلیہؒ وائے حکیم فضل الرحمنؒ وغیرہم نے آپ ہی سے قرآن پاک پڑھا تھا۔ آپ شیخ السنہ حضرت مولانا محمود الحسنؒ کے شاگردوں میں سے تھے۔ اور ان میں بڑا مقام رکھتے تھے۔ انگریزوں سے بہت خوفزدہ تھا۔ ہندوستان میں آپ کا داخلہ بند کر دیا تھا بلکہ سخت سزا رکھی تھی، لہذا آپ نے ۲۵ سال کا عرصہ جلا وطنی میں بسر کیا۔ آپ اپنے استاد محترم کا اشارہ پا کر کابل ہجرت کر گئے اور کابل کو انگریزوں کے پنجہ سے آزاد کرایا۔ مگر انگریزوں نے وہاں بھی آپ کو جھنجھنے نہیں دیا۔ اور آپ کو روس جانا پڑا۔ وہاں پر صرف ایک سال کا عرصہ گزارا۔ اس کے بعد آپ ترکی چلے گئے اور چار سال وہاں

قیام کیا۔ آپنے ترکوں کو خواب غفلت سے جگایا اور انہیں بار کر لیا کہ تم بے دینی کی آغوش میں جا رہے ہو۔ قرآن پاک کی چند سورتوں کا مطلب سمجھ لو تو بے دینی سے بچ جاؤ گے۔ مگر اُن لوگوں نے آپ کی دعوت کا خاطر خواہ جواب نہ دیا، لہذا آپ ترکی سے حجاز مقدس چلے گئے۔ آپ بارہ سال تک مکہ مکرمہ میں مقیم رہے۔ انگریز آپ کے پیچھے لگا ہوا تھا۔ وہاں بھی آپ کی جاسوسی کی جاتی تھی۔ ایک دفعہ طواف کے دوران آپ نے دیکھا کہ جاسوس آپ کے پیچھے پیچھے آرہا ہے آپنے اُسے پہچان لیا اور سخت ڈانٹ پلائی۔ فرمایا تمہیں شرم نہیں آتی، یہاں بھی میرا پیچھا کر رہے ہو۔ خدا کا خوف کرو، کم از کم حرم پاک کا ہی احترام کرو۔ آپ زبردست انقلابی ذہن کے مالک تھے اسی لیے تو انگریز آپ سے ڈرتا تھا۔ آپنے قیام پاکستان سے تین سال قبل وفات پائی۔ آپنے زندگی کے آخری ایام میں فرمایا تھا کہ میں نے انگریز کی جڑوں کو ہندوستان سے اکھاڑ دیا ہے اگر یہ چند سال کے اندر اندر اس ملک سے نہ بھاگا تو میری قبر پر اکمرلات مارنا اور کہنا کہ عبید اللہ نے جھوٹ بولا۔ چنانچہ آپ کی یہ پیش گوئی حرف بحرف پوری ہوئی۔ اور انگریز تین سال کے اندر اندر ہندوستان کو خیر باد کہ گیا۔

کسی زمانہ میں برطانیہ، برطانیہ عظمیٰ کہلاتا تھا۔ یہ اتنی بڑی سلطنت تھی کہ اس پر کبھی سورج نہیں ڈوبتا تھا۔ مقصد یہ کہ اس سلطنت کا رقبہ اتنا وسیع تھا کہ کسی نہ کسی حصے پر سورج موجود ہوتا تھا۔ اس کے مقابلہ میں امریکہ، روس، جرمنی وغیرہ سب کمزور تھے۔ مگر اس کے ظلم کی وجہ سے اللہ نے اتنی بڑی حکومت جھین لی اور اب یہ اپنے اصل ملک میں محصور ہو کر رہ گیا ہے۔ تو یہی وہ انگریز تھا جس نے مولانا عبید اللہ سندھی کو جلا وطنی کی زندگی گزارنے پر مجبور کر دیا تھا۔

مولانا دینی طور پر محدث ہونے کے ساتھ ساتھ سیاست دان بھی تھے آپ خود فراتے ہیں کہ قبول اسلام کے بعد ہم نے اٹھارہ سال تک شیخ الاسلام مولانا محمد حنیف کی خدمت میں رہ کر سیاست بھی سیکھی ہے اور دین بھی حاصل کیا ہے۔ آپ

اہم شاہ ولی اللہؒ کی حکمت کے بڑے ماہر تھے۔ نہایت نیک سیرت انسان تھے۔
 نو مسلم ہو کر اتنا مشہور حاصل کرنا۔ اللہ تعالیٰ کی خاص مہربانی تھی۔ جھاکشی کا یہ عالم تھا۔ کہ
 آٹھ دس میل کا سفر پیدل طے کر کے نماز جمعہ کیلئے آتے تھے۔ جب کہ یہ نہیں ہوتا
 تھا پیدل ہی چل جیتے۔ ایک دفعہ ملتان کے لئے سفر شروع کیا۔ مظفر گڑھ کے ریلوے
 سٹیشن پہنچے تو پاس صرف اتنے ہی پیسے تھے۔ جس سے ملتان کے لئے ٹکٹ
 خرید لیا۔ اتنے میں ایک اور مسافر نے سوال کیا۔ کہ سخت لاچار ہوں، ملتان جانا ہے
 مگر ٹکٹ کے لئے پیسے نہیں ہیں۔ آپ نے خریدا ہوا ٹکٹ اس سائل کو دیدیا اور
 خود پیدل ہی ملتان کے لئے چل دیے۔

بعض لوگ کہتے ہیں۔ کہ آپ آخر میں اشتراک ہو گئے تھے۔ حالانکہ یہ غلط ہے
 البتہ آپ سرمایہ دارانہ نظام کے خلاف تھے۔ آپ نے اپنی تفسیر میں اشتراکیت کے
 سخت خلاف لکھا ہے۔ کیونکہ اس دور میں اسلامی نظام سے ٹکرا لینے والا اشتراک
 نظام ہی ہے۔ آپ نے فرمایا تھا کہ اشتراک کی نظام کے پاس کوئی پروگرام نہیں ہے۔
 ایک وقت ضرور آئے گا جب انہیں قرآنی پروگرام کی طرف متوجہ ہونا پڑے گا۔
 اسلامی پروگرام سے بہتر کوئی پروگرام نہیں ملے گا۔ آپ نے یہ بھی فرمایا۔ کہ جو بھی قوم قرآنی
 پروگرام سے اعراض کرے گی وہ کبھی فلاح نہیں پا سکتی۔ نہ دینی اعتبار سے کامیاب
 ہو سکتی ہے اور نہ ہی دنیوی لحاظ سے درجہ کمال حاصل کر سکتی ہے۔

یہی مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہیں۔ جنہوں نے آیات زہر درس کے متعلق
 فرمایا۔ کہ میں ان آیات سے یہ اصول اخذ کرتا ہوں کہ تعلیم جبری ہونی چاہیئے
 تاکہ تعلیم حاصل کر کے ترقی کی منازل طے کی جا سکیں، یورپی ممالک میں جہاں دینی
 تعلیم جبری ہے۔ وہاں مرد و زن کسی کو تعلیم سے مستثنیٰ قرار نہیں دیا جاتا۔ سب
 کو لازماً تعلیم حاصل کرنا پڑتی ہے۔ یہی وجہ ہے۔ کہ یہ اقوام دینی اعتبار سے ترقی
 یافتہ ہیں۔ مگر کہاؤں ہاں تعلیم پندرہ بیس فیصد سے زیادہ نہیں ہے۔ دینی تعلیم
 تو ویسے ہی بالکل کمزور ہے۔ کسوف ایک دو فیصد لوگ ہی دینی تعلیم حاصل

تعلیم کی
 اہمیت

کہتے ہیں، ادنیٰ ہی طور پر بھی ہمارے پچاس فیصد لوگ گنتی تک نہیں جانتے۔ اُردو لکھنا پڑھنا نہیں جانتے اور نہ ہی حساب کچھ واقفیت ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ حضرت عثمانؓ کے زمانے تک مسلمان حصول تعلیم کے اصول پر عمل پیرا تھے، اور ترقی کی منازل بھی طے کرتے تھے۔ لہذا لازم ہے کہ کسی مرد اور عورت کو ضروریات دین کی تعلیم سے بے بہرہ نہیں رہنا چاہیے۔

اس مقام پر کتمان حق کے متعلق یہ نکتہ بیان کیا گیا ہے کہ دیکھو جس قوم کے پاس بام عروج تک پہنچانے والی تعلیم موجود ہو، وہ طے لوگوں کے سامنے پیش کرنے کی بجائے اُسے چھپائے تو ایسا شخص لعنت کا مستحق نہیں ہوگا تو اور کیا ہوگا۔ اس وقت دنیا جہنم کہہ نہی ہوئی ہے۔ جہنم کی بھر مار ہو رہی ہے۔ اور ہم خاموش بیٹھے ہیں۔ حالانکہ ہمارے پاس وہ تعلیم اور وہ پروگرام موجود ہے۔ جس سے جہنم کی بےخ کنی ہو سکتی ہے۔

فہمی ترقی ہو سکتی ہے اور جس سے تہذیب الاخلاق پیدا ہو سکتا ہے مگر ہم اس تعلیم کو لوگوں تک پہنچانے کے لیے تیار نہیں۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا کہ سخت ضرورت کے باوجود جب اس تعلیم کو عام نہیں کیا جائے گا تو اس کا وبال لعنت کی صورت میں ظاہر ہوگا۔ اسی لیے مولانا عبید اللہ سندھیؒ نے فرمایا تھا کہ ضروریات دین میں سے سب سے پہلا نمبر تعلیم کا ہے۔ اُسے جبری طور پر نافذ کرنا چاہیے۔

اسی آیت میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں یعنی بینات اور ہدایت کا ذکر کر کے فرمایا کہ جو لوگ ان دو چیزوں کو چھپاتے ہیں، وہ اللہ اور لوگوں کی لعنت کے سزاوار ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ بینات سے مراد وہ واضح باتیں ہیں جو معمولی توجہ سے سمجھ میں آجاتی ہیں۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، اس کی نعمتوں کا شکریہ اور صبر وغیرہ شامل ہیں اور ہدایت سے مراد ایسی باتیں ہیں جن کو سمجھنے کے لیے استاد کی راہنمائی کی ضرورت ہوتی ہے، ایسی چیزیں آسانی سے سمجھ میں نہیں آتیں ان میں شعاۃ اللہ کی تعظیم بھی شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں کہ ان تمام

بینات اور
ہدایت

چیزوں کو ہم نے کتاب میں بیان کر دیا ہے۔ اس کے بعد اگر کوئی شخص انہیں چھپانے کی کوشش کرے گا، تو وہ لعنت کا مستحق ٹھہرے گا۔

کتمان حق کی بیماری مسلمانوں کے لیے بھی ویسی ہی خطرناک ہے جس طرح یہود و نصاریٰ کے لیے منکس ہے۔ اہل کتاب نے کتاب اللہ سے اعراض کیا، اور دیگر خرافات میں لگ گئے لہذا ناکام ہوئے۔ یاد رکھیں یہی حال ہے مسلمانوں نے قرآن پاک کو پس پشت ڈال دیا ہے۔ اور ٹوٹنے لڑکوں، بدعات اور شرک پر گزارہ ہے۔ ظاہر ہے کہ ہمارا انجام بھی اہل کتاب سے مختلف نہیں ہو سکتا۔

معانی کا پڑاؤ

فرمایا لعنت کی اس تعزیر سے وہی بچ سکیں گے إِنَّ الَّذِينَ تَكَلَّمُوا جنہوں نے توبہ کر لی، وَأَصْلَحُوا اپنے آپ کی اصلاح کر لی۔ یعنی خود کو سنوار لیا۔ سَالِفَةُ فراموش و حقوق ادا کئے اور آئندہ کے لیے مستعد ہونے کا عہد کیا وَبَيَّنُوا اور جس چیز کو چھپا رہے تھے اُسے واضح طور پر بیان کر دیا۔ مَضْرُوبًا فَأُولَٰئِكَ أَكُوبُهُمْ میں ایسے ہی لوگوں پر رجوع کرتا ہوں۔ وَأَنَا التَّوَّابُ الرَّحِيمُ اور میں رجوع کرنے والا مہربان ہوں۔ مطلب یہ کہ جب کوئی شخص سابقہ کوتاہیوں اور غلطیوں سے تائب ہو کر راہِ راست پر آجائے تو میں اس کی تمام سابقہ لغزشیں معاف کر دیتا ہوں۔ مجھ سے بڑھ کر معاف کرنے والا۔ رحیم و کریم اور کوئی نہیں جتنی کفر و شرک جیسے اکبر الکبائر کو بھی معاف کر دیتا ہوں۔

لعنت کے مستحقین

فرمایا اس کے برخلاف إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا جنہوں نے حق کو تسلیم کرنے کی بجائے اس کا انکار کر دیا۔ اور پھر اسی حالت میں وَمَاتُوا ان کو موت آگئی وَهُمْ كُفَّارٌ اور وہ کافر ہی رہے۔ أُولَٰئِكَ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ۔ تو ایسے لوگوں پر اللہ، اس کے فرشتوں اور تمام لوگوں کی لعنت ہوگی۔ خَالِدِينَ فِيهَا اس لعنت میں وہ ہمیشہ گرفتار رہیں گے لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ الْعَذَابُ ان کے لیے تخفیف عذاب کا بھی کوئی

امکان نہیں وَلَآ هُمْ يُنْظَرُونَ اور نہ ہی انہیں کوئی مہلت ملیگی۔ مقصد یہ کہ جو لوگ کفر کی حالت میں ہی مر جائیں گے وہ دائمی عذاب میں مبتلا ہوں گے۔ نہ قرآن کے عذاب میں کچھ کمی کی جائے گی اور نہ ہی اس عذاب کو کچھ دیر کے لیے مؤخر کر کے انہیں مہلت دی جائے گی۔ لعنت کا عذاب اس قدر سخت ہوگا۔

مسئلہ لعنت کے متعلق مفسرین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ کسی پر لعنت نہیں کرنی چاہیے سوائے اس کے کہ یہ ثابت ہو جائے۔ اُس کا خاتمہ کفر پر ہوا ہے۔ کسی کا فر پر بھی اس کی زندگی میں لعنت نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ ممکن ہے کہ وہ موت سے پہلے تائب ہو جائے۔ ابلیس پر لعنت کرنا جائز ہے۔ کیونکہ اُس کا کفر معلوم ہے۔ اس کے علاوہ برائی پر لعنت درست ہے، جیسا کہ صحابہ کرام کو بُرا بھلا کہنے والوں کے متعلق فرمایا لَعْنَتَ اللّٰہِ عَلٰی شَرِّکُوْہِمَا مَہْمَا سَءَوْا شَرٌّ مَّہْمَا سَءَوْا کی لعنت یا مثلاً بُرا کام کرنے والے پر لعنت ہے لَعْنَ اللّٰہُ السَّارِقُ یعنی چور پر اللہ کی لعنت ہو۔ یا لَعْنَ اللّٰہُ مَنْ سَبَّ وَالِدَیْہِ اپنے ماں باپ کو گالی دینے والے پر خدا کی لعنت ہو۔ اسی طرح فرمایا لَعْنَ اللّٰہُ مَنْ غَيَّرَ مَسَارَ الْاَرْضِ مَشْرُکَ زَمَیْن کے نشانات مٹانے والے پر اللہ کی لعنت ہو۔ لَعْنَ اللّٰہُ مَنْ ذَبَحَ لِغَیْرِ اللّٰہِ غَیْرِ اللّٰہِ کے تقرّب کے لیے ذبح کردیوالے پر اللہ کی لعنت ہو۔ وغیرہ وغیرہ۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَاللّٰہُ کُمْ مِلَّةً وَّاحِدَةً تمہارا معبود صرف ایک ہی معبود ہے۔ کوئی اور معبود حق نہیں ہے۔ لہذا عبادت صرف اُسی کی کر دو، کفر و شرک سے باز آ جاؤ۔ لفظ اللہ میں محبت کا معنوم بھی پایا جاتا ہے اور اس کا معنی فریفتہ ہونا بھی ہے۔ اس لیے اللہ کا معنی دلیر بھی کیا جاتا ہے۔ شاہ فضل الرحمن گنج مراد آبادی نے اس کا ہندی ترجمہ من مومن بھی کیا ہے۔ غرضیکہ لفظ اللہ میں محبت کا عنصر بھی پایا جاتا ہے اور محبوب حقیقی خدا تعالیٰ ہے۔ لہذا اس کی وحدانیت پر ایمان لانا چاہیے اور خالص اسی کی عبادت کرنی چاہیے اس کے ساتھ کسی چیز کو شریک نہیں بنانا

معبود صرف
ایک ہے

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و سہ (۶۳)

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۱۶۴

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمُوتِ وَالْأَرْضِ وَاخْتِلَافِ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ
وَالْفُلْكِ الَّتِي تَجْرِي فِي الْبَحْرِ بِمَا يَنْفَعُ النَّاسَ وَمَا أَنْزَلَ
اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ فَأَحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا
وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ ۖ وَتَصْرِيفِ الرِّيْحِ وَالسَّحَابِ
الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْأَرْضِ لَآيَاتٍ لِقَوْمٍ يَعْقِلُونَ ﴿١٦٤﴾

فقہاء و شیک آسمانوں اور زمین کے پیدا کرنے میں، اور رات اور دن کے
اختلاف میں، اور کشتیوں میں جو یکسر چلتی ہیں دریا میں لوگوں کے فائدہ کی چیزیں اور جو پانی
اللہ تعالیٰ نے آسمان کی طرف سے اتار ہے جس کے ذریعے زمین کے خشک ہونے کے بعد
دوبارہ زندہ کیا ہے۔ اور اس زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلا دیے ہیں۔ اور ہواؤں کے
پھرنے میں، اور بادل جو آسمان و زمین کے درمیان سفر کیے ہوئے ہیں، ان سب چیزوں
میں عقلمند لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں ﴿۱۶۴﴾

پہلے خانہ کعبہ کے مرکز ہدایت اور قبلہ ہونے کا بیان ہوا۔ اس کے بعد امت
اسلام کے اہم ترین اصول یعنی ذکر اللہ، شکر اللہ، صبر اور تعظیم شعار اللہ کا ذکر ہوا۔ پھر
کتاب اللہ کی تعلیم اور اس کی ضرورت و اہمیت بیان کر دی ہوئی، ان لوگوں
پر وبال کا ذکر کیا۔ جو تعلیم کو چھپاتے ہیں۔ اور پھر آخر میں ان تمام چیزوں کی بنیاد
توحید اَللّٰھُکُمْ وَاللّٰھُ وَاحِدٌ کا بیان ہوا۔ اور پھر آگے توحید کے دلائل کے
طور پر دس چیزوں کا ذکر فرمایا ہے

گذشتہ سے
پیوستہ

تمہذیب الاخلاق کے بعد سوسائٹی کا دوسرا اہم مسئلہ کسب معاش ہے۔
یہ ایک ایسا معاملہ ہے کہ ہر شخص کو اس سے واسطہ پڑتا ہے۔ گھر و اوقات

کسب معاش

کے لیے معاش کا کوئی نہ کوئی ذریعہ اختیار کرنا ہی پڑتا ہے، اس سے کوئی انسان لاتعلق نہیں رہ سکتا۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں جگہ جگہ اس بات کا ذکر فرمایا ہے کہ ہم نے تمہیں زمین میں اپنا نام نہ مقرر کیا۔ اور تمہارے لیے معیشت کے مختلف سامان پیدا کیے۔ جنہوں پر اللہ کی حدیث پاک میں بھی آیا ہے کہ رزق حلال کی طلب فَرِيضَةٌ مِّنْ جَعَدِ الْفَرَائِضِ اللہ کے مقدّر کردہ فرائض کے بعد یہ بھی ایک فریضہ ہے اور چونکہ وسائل معاش اللہ تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں۔ اس لیے انسان کے لیے ضروری ہے کہ رزق حلال کی تلاش کے ساتھ ساتھ عبادت بھی صرف اللہ تعالیٰ ہی کی کرے۔ دوسرے مقام پر آتا ہے "كَابِتُغُوا عِندَ اللَّهِ الرِّزْقَ" روزی اللہ کے پاس تلاش کرو۔ کیونکہ اس کے بغیر نہ کوئی رزاق ہے اور نہ کوئی معبود ہے۔ آیت زیر در کس میں اللہ تعالیٰ نے اُن انعامات کا ذکر کیا ہے جنہیں اللہ نے وسائل معاش بنایا ہے۔ اور انسان کو غور و فکر کی دعوت دی ہے کہ جب اللہ جل جلالہ نے تم پر اتنے بڑے بڑے انعامات کیے ہیں کہ جن کے بغیر تمہاری گذراوقات ہی ممکن نہیں، بلکہ زندگی کا دار و دار ہی ان چیزوں پر ہے تو پھر تم اللہ کو چھوڑ کر دوسروں کو کیسے معبود بناتے ہو وسائل معاش کے ان انعامات میں تمہارے لیے توحید الہی کے واضح دلائل موجود ہیں

اس آیت میں بیان کردہ دس احسانات میں سے اللہ تعالیٰ نے سب آسمانی کائناتوں سے پہلے تخلیق آسمان کا ذکر فرمایا اِنَّ فِيْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ یعنی آسمانوں کو پیدا کرنے میں صاحب عقل لوگوں کے لیے واضح نشانات موجود ہیں۔ تخلیق آسمانی کا ذکر کر کے اللہ تعالیٰ نے وہ تمام احسانات جلائے ہیں جو آسمان کے ساتھ وابستہ ہیں۔ ان میں وہ تمام کمرے شامل ہیں جو آسمان کی فضاؤں میں موجود ہیں اور باقاعدہ گہروں میں گہرے ہیں۔ پورا نظام شمسی جس سے کرہ ارض والے مستفید ہو رہے ہیں۔ آسمانی نظام کا ایک حصہ ہے۔ آسمانی کمروں میں سورج، چاند اور زمین بڑے اہم کمرے ہیں۔ جن پر انسانی زندگی کا انحصار ہے۔ پھر یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے

نہ صرف انہیں پیدا کیا ہے۔ بلکہ انہیں ایک خاص رفتار سے گردش میں لاکر نسل انسانی کی تمام ضروریات زندگی فراہم کر دی ہیں۔ نوع انسانی کے لیے روشنی اور حرارت سورج کی سرہون منت ہے۔ اگر انسان کو یہ چیزیں میسر نہ ہوں۔ تو نہ کوئی کام ہو سکے اور نہ خوراک کے لیے غلہ، سبزیاں اور پھل پک سکیں۔ اور پھر یہ ہے کہ سورج ۲۶۵ دن میں ایک خاص رفتار سے اپنا چکر پورا کرتا ہے۔ جس سے موسموں کا تغیر و تبدل پیدا ہوتا ہے۔ اور انسان گوا، نمر، بہار اور خزاں ہر موسم سے مستفید ہوتا ہے۔ پورے چوبیس گھنٹے کا چکر بھی دن اور رات کی تخلیق کا باعث ہے جسکی وجہ سے انسان کی روزمرہ زندگی میں باقاعدگی پیدا ہوتی ہے۔ اگرچہ موجودہ زمانے کی سائنس نے یہ ثابت کیا ہے کہ سورج اور چاند زمین کے گرد چہر نہیں لگاتے بلکہ زمین ان کے گرد چکر لگاتی ہے اور خود بھی اپنے محور کے گرد گھومتی ہے۔ تاہم جس طریقہ سے بھی ہے آسمانی گروں کا یہ نظام اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما کر انسان پر احسان عظیم کیا ہے۔ کیونکہ انسانی زندگی کا انحصار اس نظام کے ساتھ وابستہ ہے۔

زمین کے بعد چاند اپنی منزل ۲۸ یا ۲۹ دن میں پوری کرتا ہے۔ بعض سیارے دو سال میں اپنا چکر پورا کرتے ہیں۔ ماہرین فلکیات کا کہنا ہے۔ کہ ثوابت سیارے ایسے ہیں جو اپنا چکر ۳۵ یا ۳۶ ہزار سال میں مکمل کرتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورج کے متعلق خاص طور پر فرمایا کہ یہ ضیا ہے۔ اسی طرح چاند کی دھیمی دھیمی روشنی کے ذریعے اللہ تعالیٰ پھلوں میں رس پیدا فرماتے ہیں۔ اسی طرح سمندر کے مہ و حشر کا تعلق بھی چاند کے بڑھنے گھٹنے کے ساتھ وابستہ ہے۔ بغرض کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق آسمانی کا ذکر کر کے اس سے وابستہ نظام اور اس سے انسانی مفاد بیان فرمایا ہے۔

إِنَّ فِي خَلْقِ السَّمَوَاتِ وَالْأَرْضِ فِي اللّٰهِ تَعَالٰی نے جس دور کے احسان کا ذکر کیا ہے وہ تخلیق زمین ہے۔ زمین کے ساتھ انسانی زندگی کی بقا کس قدر وابستہ ہے۔ یہ روزمرہ کا مشاہدہ ہے۔ انسانی ضرورت کی ہر چیز زمین سے پیدا

ہوتی ہے۔ غلہ، سبزی، پھل، نباتات، جانور، ہر چیز کا منبع زمین ہے۔ انسانی زندگی کی اہم ترین چیز پانی بھی زمین کے کھودنے سے نکل آتا ہے۔ اس کے علاوہ معدنیات کے وسیع ذخائر مثلاً سونا، چاندی، کوئلہ، تانبہ، نمک، گندھک، تیل وغیرہ سب زمین کی پیداوار ہیں۔ لوسہ کا تو اللہ تعالیٰ نے خاص طور پر قرآن پاک میں تذکرہ کیا ہے ”وَأَنْزَلْنَا الْحَدِيدَ فِيهِ بَأْسٌ شَدِيدٌ“ ہم نے بے حد زور والا لوہا پیدا کیا۔ اس میں لوگوں کے لیے بڑے بڑے فائدے رکھے ہیں۔ اس زمانے کو تو لوسہ کا زمانہ (ARON AGE) بھی کہا جاتا ہے۔ دیکھیے لیجیے آج کی دنیا میں لوہا کتنا اہم عنصر ہے۔ ریل، موٹر، جہاز بحری ہو یا ہوائی، اچھوٹے چھوٹے اوزار سے لے کر بڑی بڑی مشینری تک تمام کے تمام لوسہ کے محتاج ہیں۔ اور پھر اللہ تعالیٰ نے اس کے ذخائر بھی زمین ہی میں رکھے ہیں۔ اس کو کلام میں لانے کے لیے اسے نرم کر نیکی ضرورت ہوتی ہے اور اس کے لیے ایندھن بھی کوئلے کی صورت میں زمین ہی سے پیدا کیا ہے۔

قرآن پاک میں پہاڑوں کا ذکر بار بار آتا ہے۔ پہاڑوں کے ساتھ بھی انسانی زندگی کے بہت سے مفاد وابستہ ہیں۔ جن میں پتھر، چٹان، جڑی بوٹیاں اور معدنیات شامل ہیں۔ اور یہ پہاڑ بھی اللہ تعالیٰ نے زمین پر ہی پیدا کیے ہیں۔ کہیں مندرمایا "جَعَلَ فِيهَا رَوَاسِيَ" زمین میں بوجھل پہاڑ جگہ جگہ رکھ دیے کہیں مندرمایا۔ "وَالْجِبَالِ اَوْتَادًا" پہاڑوں کو زمین میں میخوں کی طرح گاڑ دیا۔ الغرض پہاڑ بھی زمین ہی کا حصہ ہیں اور زمین ہی سے تمام ضروریات زندگی وابستہ ہیں اور بالآخر مرنے کے بعد زمین ہی اسے اپنی آغوش میں لیتی ہے۔

شب و روز کے تغیر و تبدل کے متعلق فرمایا۔ **وَاخْتَلَفَ اللَّيْلُ وَالنَّهَارُ** یعنی دن رات کے تغیر میں بھی قدرتِ الہی کے واضح نشانات موجود ہیں۔ بھٹکنے والے سمجھتے ہیں کہ دن رات کی تبدیلی میں اللہ تعالیٰ نے انسان کے لیے کس قدر منفعت رکھی ہے۔ دن کے وقت انسان کام کاج کر کے اپنی

روز پیداکرتاہے۔ اور پھر جب دن بھر کے کام سے تھک جاتا ہے تو آرام کی ضرورت محسوس کرتاہے۔ اللہ تعالیٰ نے اُس کے آرام کے لیے رات بنادی تاکہ وہ آرام و سکون حاصل کر کے اگلے دن کی مشقت کے لیے پھر سے کمر بستہ ہو جائے اگر ہمیشہ دن ہی رہتا یا ہمیشہ رات ہی چھائی رہتی تو گذر اوقات میں کس قدر مشکلات آتیں۔ سورۃ قصص میں فرمایا ذرا دیکھو تو سہی اِنْ جَعَلَ اللّٰهُ عَلَیْکُمُ اللَّیْلَ سَرْمَدًا اِلٰی یَوْمِ الْقِیَامَةِ مَنْ اِلٰہٌ غَیْرِ اللّٰهِ یَا رَتِیْکُمْ بِضِیْکُمْ اگر اللہ تعالیٰ قیامت تک کے لیے دن ہی قائم رکھتا، تو تمہارے سکون و آرام کے لیے رات کو کون لاسکتا تھا۔ مقصد یہ کہ اللہ تعالیٰ نے دن اور رات میں اختلاف پیدا کر کے انسان پر احسان عظیم کیا ہے

بحری جہاز

اس کے بعد فرمایا اِنَّ الْبَحْرَ دَرِیَا اَوْ سَمْنَدٍ میں چلنے والی کشتیاں اور جہاز جَمَا یَنْفَعُ النَّاسَ جن سے لوگ فائدہ اٹھاتے ہیں یہ بھی ایسی چیزیں ہیں جن میں عقل و شعور رکھنے والے لوگوں کے لیے نشانیاں ہیں۔ دریاؤں اور سمندری رستے زمانہ قدیم سے نقل و حمل کے معروف رستے ہیں۔ جہول جہول دنیا نے ترقی کی ہے۔ ان ذرائع میں خاطر خواہ ترقی ہوئی ہے۔ بادبانی کشتیوں کی جگہ بڑے بڑے مال بردار جہاز معرض وجود میں آئے ہیں۔ جن کے ذریعے لاکھوں ٹن مال ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل کیا جاسکتا ہے۔ خشکی اور ہوائی ذرائع کی نسبت بحری ذرائع سے نقل و حمل آج بھی سستی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا کے کسی ایک کونے میں پیدا ہونے والی چیز دنیا کے دوسرے کونے تک باسانی پہنچ رہی ہے جس سے لوگ فائدہ اٹھا رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں کشتی نوح کا ذکر کر کے اُسے ہمیشہ کے لیے نمونہ بنا دیا ہے

لاکھوں ٹن وزن کی بحری جہاز جدید ٹیکنالوجی اور علم ریاضی کے مہر و منت ہیں مگر ان فنون کی تحقیق ایجاد و دراصل حضرت ادریس علیہ السلام کے ہاتھوں سے ہوئی انکو اخنوخ کہا گیا ہے تفسیر مرکب والے نے لکھا ہے کہ قلم کے ساتھ لکھنے کا سلسلہ بھی سب سے پہلے حضرت ادریس علیہ السلام سے شروع ہوا پھر پڑے سینے کا ہنر اور زمینری بھی ان کے ہاتھوں سے ایجاد ہوئی۔

ستاروں سے متعلق معلومات، علم حساب اور ناپ تول کے اوزان بھی انہوں نے رائج کیے مختلف مواقع پر استعمال کہونے والا اسلحہ بھی حضرت ادریس علیہ السلام کے ہاتھوں سے ظہور میں آیا۔

پانی کا نزول

نشاناتِ قدرت ہی کے بیان میں فرمایا وَمَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ السَّمَاءِ مِنْ مَّاءٍ اور یہ بھی اللہ تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ہے کہ اس نے آسمان سے پانی نازل کیا ہے فَاحْيَا بِهِ الْأَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا جس کے ذریعے مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کیا ہے۔ انسان اور جانوروں کے لیے خوراک کی پیداوار کا انحصار پانی پر ہے۔ اگر پانی نہ ہو تو کوئی چیز پیدا نہ ہو۔ آسمان سے نزولِ آب سے مراد بارش ہے۔ قرآن پاک میں بار بار آتا ہے۔ کہ دیکھو ہم کس طرح بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ چلاتے ہیں اور پھر ان کے ذریعے خشک زمین پر بارش برساتے ہیں۔ جس کے ذریعے ہم کھیتیاں اگاتے ہیں جو تمہارے اور تمہارے جانوروں کے لیے خوراک بنتی ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کا انعام ہے۔ کہ کھیتی باڑی کا کام جدید طریقہ پر ہونے لگا ہے۔ آلاتِ زراعت میں ترقی ہوئی ہے۔ ذرائع آبپاشی کی سہولتیں میسر آئی ہیں۔ نئی قسم کی کھادیں دریافت ہوئی ہیں جن سے پیداوار میں اضافہ ہوا ہے۔ یہ تمام چیزیں انسانی معیشت سے متعلق ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ ان میں عقل مند لوگوں کے لیے واضح نشانات ہیں۔

جانوروں کی نسل کشی

نزولِ آب کے بعد فرمایا وَبَثَّ فِيهَا مِنْ كُلِّ دَابَّةٍ یہ اللہ تعالیٰ کے واضح دلائل میں سے ہے کہ اُس نے زمین میں ہر قسم کے جانور پھیلادیے۔ ذرا غور فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کی خدمت کے لیے اتنے جانور پیدا فرمائے ہیں جن کا شمار نہیں کیا جاسکتا۔ انسانی زندگی کا جانوروں کے ساتھ گہرا تعلق ہے خصوصاً وہ مویشی جن کا گوشت، دودھ، کھال اور ہڈیاں لوگ استعمال کرتے ہیں انہیں انسانی معیشت میں بڑا عمل دخل ہے اونٹ، گائے، بھینس، بھیر بھیریاں، نہ صرف دودھ میا کرتے ہیں۔ بلکہ یہ انسانی خوراک کا بھی حصہ ہیں۔ اسی طرح گھوڑے، اونٹ اور گدھے وغیرہ بار بڑی

اور سواری کے کام آتے ہیں۔ مرغ، بیڑ، اور مچھلی خوراک کا حصر ہیں۔ مرغی کے انڈے انسانی خوراک کا اہم جز ہیں۔ شکاری جانور بھی انسان کے لیے خوراک مہیا کرتے ہیں۔ اب توصیہ الحیوانات ایک مستقل سلسلہ اور ہمیشہ بن گیا ہے۔ یہ تمام چیزیں اسباب معاش میں داخل ہیں اور اللہ نے انہیں نشانات قدرت کے طور پر بیان فرمایا ہے آگے اللہ تعالیٰ کی قدرت کی اور نشانی ہوا کا ذکر ہے۔ فرمایا وَتَصْنَعُ الْإِنسَانَ

ہواؤں کی گردش

الْبَیِّنَاتِ ہواؤں کی گردش بھی صاحب عقل لوگوں کے لیے نشان رہا ہے۔ ہر ذی جان کے لیے ہوا اس قدر ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان و حیوان چند منٹ بھی زندہ نہیں رہ سکتے۔ ہوا ہمیشہ گردش کرتی رہتی ہے کبھی مشرق سے مغرب کی طرف اور کبھی مغرب سے مشرق کی طرف چلتی ہے کبھی اس کا رخ شمالاً جنوباً ہوتا ہے۔ جو انسانوں اور جانوروں کے لیے سکون کا باعث ہوتا ہے۔ جب ہوا کی گردش رُک جاتی ہے۔ تو لوگ گرمی میں تڑپ جاتے ہیں۔ پرانے زمانے میں ہوا کے ذریعے بادبانی کشتیاں چلتی تھیں، اسی کے ذریعے لوگ بھوسے سے غلہ علیحدہ کرتے تھے۔ ہوا ہی بادلوں کو ایک جگہ سے دوسری جگہ لیجانے کا باعث بنتی ہے اور دُور دُور تک بارش ہوتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے تسخیر ہوا کا قانون بھی انسان کو سمجھایا۔ پانی سے بھاپ بنتی ہے جس سے ریل گاڑیاں چلتی ہیں اور مکوں میں بڑے بڑے کام لیے جاتے ہیں۔ بڑھنی سے بڑی مشینری حرکت میں آتی ہے جس کے ذریعے انسانی مفاد کی بے شمار چیزیں تیار ہوتی ہیں۔ دغانی جہاز بھی بھاپ سے چلتے ہیں۔ یہ سب تسخیر ہوا کے کوششے ہیں۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے تیز ہوا یعنی آنڈھی کے وقت کے لیے دعا سمجھائی اَللّٰهُمَّ اِنِّیْ اَسْأَلُكَ مِنْ خَیْرِهَا وَخَیْرِ مَا فِیْهَا اے اللہ میں ہوا اور جو کچھ اس کے اندر موجود ہے۔ اس کی خیر مانگتا ہوں۔ وَاعُوْذُ بِكَ مِنْ شَرِّهَا وَشَرِّ مَا فِیْهَا اور میں تیری ذات

کیا تھا ہوا کے شر سے اور جو کچھ اس میں ہے اس کے شر سے پناہ مانگتا ہوں۔ دوسری جگہ فرمایا اَللّٰهُمَّ اجْعَلْهُم اَرِيَا حَاوِلًا وَاجْعَلْهُم اَرِيْحًا اے اللہ! ہو کہ وریح یعنی خوشگوار بنا اور اس کو ریح یعنی عذاب نہ بنا۔ قرآن پاک میں جہاں کہیں لفظ ریح استعمال ہوا ہے تو وہاں سزا کا ذکر ہے۔ جیسے فرمایا کہ ہم نے قوم عاد پر بانجھ قسم کی ہوا بھیجی اِذَا ارْسَلْنَا عَلَيْهِمُ الرِّيحَ الْعَقِيْمَ۔ یہی ہوا بعض اوقات بڑی نرم اور خوشگوار ہوتی ہے۔ فرمایا نَصَحْتُ بِالصَّبَا مِمَّنْ مَشَرَّقَ سَاحِلِ الْيَمِّ الْخَمْرُ الْخَمْرُ ہوا سے مدد کی گئی ہے۔ اللہ نے مجھ پر مہربانی فرمائی ہے۔ اسی تند و تیز ہوا نے غزوہ خندق کے موقع پر کفار کے خیمے اکھاڑ دیے، سامان درہم برہم کر دیا اور انہیں وہاں سے بھاگنا پڑا۔ اسی طرح قوم عاد مغرب کی طرف سے چلنے والی گرم ہوا کا شکار ہوئی اور تباہ و برباد ہو گئی وَامَّا عَادٌ فَاهْلُكُوا بِسِجِّ صَوَّصٍ عَاتِيَةٍ تَوْبَرِحَالْ ہل وُل کا چلنا بھی نشانات قدرت میں سے ہے اور عقلمند لوگوں کے لیے باعث عبرت ہے۔

فرمایا وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ بَيْنَ السَّمَاءِ وَالْاَرْضِ زمین و آسمان کے درمیان تسخیر شدہ بادل بھی لَا يَتَّخِذُ الْقَوْمُ لِقَوْمٍ يُهْزَمُونَ صاحب عقل لوگوں کے لیے نشانات ہیں۔ بادلوں کی تسخیر کا مطلب یہ ہے کہ یہ مکمل طور پر اللہ تعالیٰ کے دست قدرت میں ہیں۔ وہ جس طرح چاہتا ہے ان سے کام لیتا ہے جس رخ پر چاہے انہیں موڑ دیتا ہے۔ اور جہاں اسکی مشیت ہوتی ہے۔ ان سے بارش برسا دیتا ہے۔ جس سے فصلوں میں بار آجاتی ہے۔ کھیتیاں ہری بھری ہو جاتی ہیں مگر جب انہیں بادلوں سے وافر پانی بہا دیا جاتا ہے۔ تو بڑے بڑے طوفانوں کا پیش خیمہ ہوتے ہیں اور تباہی اور بربادی کا باعث بنتے ہیں۔ جب اللہ کا حکم ہوتا ہے۔ تو انہی صحابِ مسخر سے اٹے برسنے لگتے ہیں اور دیکھتے ہی دیکھتے پکی پکائی فصلیں کوڑے کا ڈھیر بن جاتی ہیں۔ لہذا یہ بھی نشانات قدرت میں سے ہے کہ اللہ تعالیٰ سفید، سیاہ اور سرخ بادلوں کے ذریعے

اپنی منشاء کے مطابق مختلف قسم کے کام لیتا ہے

یہ تمام چیزیں اللہ تعالیٰ کی قدرت اور اس کی وحدانیت کی دلیل ہیں۔ یہ تمام چیزیں ممکنات میں سے ہیں اور اللہ تعالیٰ کی پیدا کردہ ہیں۔ اللہ کے سوا ان کو پیدا کرنے والا کوئی نہیں ہے۔ یہ تمام چیزیں اپنے جسم، مفاد، اغراض اور ہقامتیں خود محتاج ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا ثبوت ہیں۔ اس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے اسباب معاش بھی سمجھا دیے۔ یہ تمام چیزیں اس کی قدرت کے نشان ہیں مگر ان لوگوں کے لیے جو صاحب عقل ہیں اور سوچنے سمجھنے کی صلاحیت سے محروم نہیں ہیں مگر جو لوگ غور و فکر کی اہلیت سے محروم ہیں۔ انہیں قدرت کے یہ بڑے بڑے نشان بھی کچھ فائدہ نہیں دیتے ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا کُفِرُوا بِكَ آلِهَتُهُمْ وَهُمْ عَنْهُمْ مُعْرِضُونَ کہ لوگ اللہ کی نشانیوں سے گزر جاتے ہیں مگر وہ اُن سے غافل ہوتے ہیں۔ قدرت کی دلیلیں اُن پر کچھ اثر نہیں کرتیں۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے اَلْهٰكُمُ اللّٰهُ وَاحِدٌ پُر یہاں دس دلائل بیان فرمائے ہیں اور ساتھ یہ بات بھی سمجھا دی کہ تہذیب اخلاق کے بعد دوسرا مسئلہ کسب معاش کا آتا ہے۔ اور معاش کے تمام اسباب خدا تعالیٰ کے پیدا کردہ ہیں لہذا عبادت بھی صرف اُسی کی کرنی چاہیے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس شصت و چار (۶۴)

آیت ۱۶۵ تا ۱۶۷

وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَندَادًا يُحِبُّونَهُمْ
 كَحُبِّ اللَّهِ ط وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ ط وَلَوْ يَرَى الَّذِينَ
 ظَلَمُوا أَذْيَرُونَ الْعَذَابَ لَا إِنَّ الْقُوَّةَ لِلَّهِ جَمِيعًا ۖ وَأَنَّ
 اللَّهَ شَدِيدُ الْعَذَابِ ۝ (۱۶۵) اذ تَبَرَّأ الَّذِينَ اتَّبَعُوا مِنَ الَّذِينَ
 اتَّبَعُوا وَرَأَوْا الْعَذَابَ وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ ۝ (۱۶۶)
 وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا لَوْ أَنَّا كُنَّا نَاكِرَةً فَنُتَبَرَّأُ مِنْهُمْ كَمَا
 تَبَرَّءُوا مِنْهُمْ ط كَذَلِكَ يُرِيهِمُ اللَّهُ أَعْمَالَهُمْ حَسَرَاتٍ
 عَلَيْهِمْ ط وَمَا هُمْ بِخَارِجِينَ مِنَ النَّارِ ۝ (۱۶۷)

ترجمہ: اور لوگوں میں سے بعض وہ ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو خدا کا شریک بناتے
 ہیں۔ ان سے ایسے ہی محبت کرتے ہیں جیسی محبت اللہ سے کرنی چاہیئے اور جو
 ایمان دار ہیں وہ اللہ کے لیے محبت میں زیادہ شدید ہیں اور اگر دیکھیں وہ لوگ
 جنہوں نے ظلم کیا جب کہ وہ عذاب کو دیکھیں گے کہ بیشک ساری قوت اللہ ہی
 کے لیے اور اللہ تعالیٰ سخت عذاب والا ہے (۱۶۵) جب کہ بیزار ہو جائیں گے
 وہ لوگ جن کی پیروی کی گئی ان لوگوں سے جنہوں نے پیروی کی اور وہ عذاب
 کو دیکھ لیں گے اور ان کے اسباب منقطع ہو جائیں گے (۱۶۶) اور وہ لوگ
 جنہوں نے پیروی کی کہیں گے کہ کاش اگر ہم جہنم

یہ دنیا میں پلٹنا ممکن ہو تو ہم بھی ان بیزاروں کا اعلان کریں۔ جیسا کہ یہ آج ہم سے
 بیزار ہوئے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ دکھلائے گا ان کو ان کے اعمالِ حسرت
 دلانے کے لیے اور وہ دوزخ کی آگ سے نکلنے والے نہیں ہوں گے (۱۶۷)

گذشتہ آیات کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے اُن انعامات کا ذکر فرمایا جو اسباب
مغیشت کی صورت میں بنی نوع انسان پر کیے۔ اس احسان کا تقاضا یہ تھا۔ کہ
لوگ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کو پہچانتے اور خالص اسی کی عبادت کرتے۔ مگر
ایسا نہیں ہوا بلکہ وَمِنَ النَّاسِ مَن يَتَّخِذُ مِنْ دُونِ اللَّهِ أَنْدَادًا
بعض لوگ ایسے بھی ہیں جو اللہ کے سوا دوسروں کو مذہبی مد مقابل بناتے ہیں۔
دوسرے لفظوں میں اللہ کا شریک ٹھہرتے ہیں۔ مذہبی مدت میں پہلے بھی آپ کا
ہے کہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَا تَجْعَلُوا لِلَّهِ أَنْدَادًا وَأَنْتُمْ تَعْلَمُونَ۔
اللہ تعالیٰ کے مد مقابل اور شریک نہ بناؤ۔ کیونکہ تم بخوبی جانتے ہو کہ خالق، مالک
اور رازق صرف وہی ہے۔ مسبب الاسباب بھی وہی ذات ہے۔ لہذا
دوسروں کو اللہ کا شریک ٹھہرانے کا قطعاً کوئی جواز نہیں۔

فرمایا جب لوگ غیروں کو اللہ کا مد مقابل تسلیم کر لیتے ہیں۔ تو پھر کرتے
یہ ہیں کہ يُحِبُّونَهُمْ كَحُبِّ اللَّهِ اُن سے اُس درجہ کی محبت کھتے
ہیں جس درجہ میں اللہ تعالیٰ سے محبت کرنی چاہیے۔ اور یہی غرابی کی جڑ ہے
یہیں سے شرک کی ابتدا ہوتی ہے۔ جب غیر اللہ کی محبت اللہ کی محبت سے
ستجا کر جاتی ہے۔ یا اُس کے برابر آ جاتی ہے تو پھر تمام وہ صفات غیر اللہ میں
بھی تسلیم کر لی جاتی ہیں جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہیں۔ اور پھر غیر اللہ سے بھی
اُسی طرح حاجت روائی اور مشکل کشائی کا مطالبہ ہوتا ہے جو اللہ جل جلالہ سے
ہونا چاہیے۔ اسی لیے فرمایا کہ بعض بد بخت ایسے بھی ہیں۔ جو اللہ کا شریک ٹھہراتے
ہیں۔ اور پھر اُن سے ایسی ہی محبت کھتے ہیں، جیسی محبت اللہ تعالیٰ کی ذات
پاک سے ہونی چاہیے۔

فرمایا شرک کی اس نجاست کے برخلاف وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ
حُبًّا لِلَّهِ اہل ایمان کا گروہ ایسا بھی ہے۔ جن کے دل میں شدید ترین محبت صرف
اللہ ہی کی ہے۔ وہ اللہ کے ساتھ دوسروں کو مد مقابل ٹھہرا کر اُن کو اللہ کی محبت

میں برابر کا شریک نہیں بنتے۔
 قیامت تو ابھی دُور کی بات ہے۔ قرآن پاک شاہد ہے کہ مشرکین بعض اوقات
 دنیا میں ہی اپنے معبودوں کی محبت کو ترک کر دیتے ہیں، جب ان کی کشتی
 طوفان میں پھنس جاتی ہے، تو قرآن پاک کہتا ہے "دَعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ"
 تو جعلی معبودوں کو چھوڑ کر خالص اللہ تعالیٰ کو پکارنے لگتے ہیں۔ اور پھر آخرت میں
 تو بیزاری کا اعلان کر ہی دیں گے۔ جیسا کہ اگلی آیت میں آرہا ہے۔ اس کے برخلاف
 اہل ایمان کی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہمیشہ قائم رہنے والی ہے۔ انہیں خواہ
 تنگی ہو یا راحت، غم و شغل ہو یا کسی مصیبت میں مبتلا ہوں، تندرست ہوں یا بیمار
 ان کی محبت اللہ کی حالت میں بھی زائل نہیں ہوتی۔ باقی رہی انبیاء، اولیاء اور بزرگانِ
 دین کی محبت تو ایسی محبت اللہ ہی کے حکم سے ————— ہوتی ہے، ان
 ہستیوں سے محبت بالذات نہیں ہوتی بلکہ محبت بالذات صرف خدا تعالیٰ
 سے ہی ہوتی ہے۔

محبت کی مختلف قسمیں ہیں جیسے طبعی محبت، عقلی محبت اور شرعی محبت وغیرہ محبت کا تمام
 طبعی محبت کی مثال ایسی ہے۔ جیسے عاشق اپنے معشوق کیساتھ محبت کرتا ہے
 یا خاوند کو بیوی سے اور والدین کو اولاد اور دیگر اقرباء سے محبت ہوتی ہے۔
 عقلی اور شرعی محبت کی مثال حضور علیہ السلام کی دعا سے ملتی ہے اَللّٰهُمَّ
 اِنِّیْ اَسْئَلُكَ جُبَّتَكَ وَحُبَّیَّ مَنْ یُّحِبُّكَ وَحُبَّ عَمَلٍ یُّقَرِّبُنِیْ اِلَیْ جِبَّتِكَ
 یعنی اے اللہ! مجھے اپنی محبت عطا کر اور اس کی محبت عطا کر جو مجھ سے محبت کرتا
 ہے اور ایسے عمل کی محبت عطا کر جو مجھے تیرے محبت قریب کر دے۔ اور آخر میں یہ بھی
 آتا ہے وَاجْعَلْ جُبَّتَكَ اَحَبَّ اِلَیَّ مِنْ نَفْسِیْ وَاهْلِیْ وَمَالِیْ
 وَمِنْ الْمَاءِ الْبَارِدِ اور اے اللہ! اپنی محبت کو میرے نفس، میرے اہل،
 میرے مال اور ٹھنڈے پانی سے زیادہ محبوب بنا دے یہاں پر ٹھنڈے
 پانی کا بطور خاص ذکر فرمایا، ٹھنڈا پانی گرم ممالک ایک عظیم نعمت ہوتا ہے جس کے ذریعے انسان راحت

حاصل کرتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ جس شخص کے دل میں اللہ اور اس کے رسول کی محبت باقی تمام چیزوں سے زیادہ ہوگئی، اُس کا ایمان کامل ہوگیا لیکن قرآن پاک نے اس بات کی وضاحت فرمائی کہ اللہ اور رسول کی محبت کے مختلف مخرج ہیں۔ اللہ کی محبت اصالتاً اور بالذات ہے اور رسول کی محبت اللہ ہی کے حکم سے ہوتی ہے۔ بنی کے ساتھ امتی کی محبت کو نیکی کے ساتھ مشروط کر دیا۔

گیا ہے۔ سورۃ ممتحنہ میں جہاں عورتوں سے بیعت لینے کا ذکر آتا ہے۔ فرمایا: اُن سے عہد لیں کہ وہ شرک نہیں کریں گی۔ چوری اور زنا کا ارتکاب نہیں کریں گی، اولاد کو قتل نہیں کریں گی، بہتان نہیں باندھیں گی وَلَا يَعْصِيَنَّكَ فِي مَعْصُوفٍ اَوْ نِيٍّ کے کام میں آپ کی نافرمانی نہیں کریں گی اور بعض مقامات پر مطلق رسول کی اطاعت کو اللہ کی اطاعت قرار دے دیا جیسے هُنَّ يَطِيعُ الرَّسُولَ فَتَدِ اطَاعَ اللّٰہ جس نے رسول کی اطاعت کی اُس نے گویا اللہ ہی کی اطاعت کی۔ دوسری جگہ فرمایا اَطِيعُوا اللّٰہَ وَاَطِيعُوا الرَّسُولَ اللہ اور رسول کی اطاعت کرو۔ تاہم اطاعت اور عبادت میں فرق ہے۔ عبادت صرف اللہ تعالیٰ کی ہو سکتی ہے۔ اور اطاعت رسول کی بھی اسی طرح فرض ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی فرض ہے۔

ترمذی شریف کی حدیث میں حضور بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے اَحِبُّوا اللّٰہَ لِمَا يَفْذُلُكُمْ مِنْ نِعْمَةٍ لَّوْكَرَا اللّٰہُ سَے محبت کرو کہ اُس نے تمہیں نعمتیں عطا کی ہیں۔ وہ نعم حقیقی ہے۔ تمہارا اپنا وجود اور اس کے علاوہ جتنی بھی چیزیں ہیں، سب اللہ تعالیٰ کے انعامات ہیں لہذا اُس سے محبت کرو۔ پھر فرمایا اَحِبُّوا نَبِيَّ اللّٰہِ اللہ تعالیٰ کی محبت کی وجہ سے میرے ساتھ بھی محبت کرو۔ میں نے تمہیں اللہ تعالیٰ کا راستہ اور اس کا پیغام پہنچایا ہے۔ اس کا کلام اور اس کی شریعت تم کو دی ہے۔ اور پھر فرمایا کہ میری وجہ سے میرے اہل بیت کے ساتھ بھی محبت کرو۔ کسی کے ساتھ محبت کرنے کی کئی ایک وجوہات ہیں۔ مثلاً اگر کوئی جہاں

محبت کی
مختلف درجات

کی جسے محبت کرتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ جمیل بالذات ہے لہذا اصلی اور ذاتی محبت اُسی کے ساتھ ہونی چاہیے۔ حسن و جمال خود خدا کی صفات میں سے ہے۔ اس لیے اس کا تقاضا یہی ہے کہ اہل محبت اُسی سے ہو۔ محبت کی ایک وجہ کمال بھی ہے۔ ظاہر ہے کہ اللہ تعالیٰ کا کمال بالذات ہے۔ اور باقی چیزوں میں کمال اللہ تعالیٰ کا عطا کردہ ہے۔ لہذا اس لحاظ سے بھی محبت کے لائق ذاتِ خداوندی ہی ہے اسی طرح محبت کی وجہ احسان بھی ہے۔ جس کے ساتھ احسان کرو، وہ محبت کرتا ہے اور سب سے بڑا محسن خود خدا تعالیٰ ہے۔ لہذا مخلوق کا فرض ہے کہ وہ اپنے محسن کے ساتھ محبت رکھے۔

بعض اوقات محبت کا معیار نفع اور نقصان ہوتا ہے کسی نے نفع پہنچایا ہے یا نفع کی توقع ہے تو اُس سے محبت پیدا ہوگئی۔ کبھی سے اس لیے بھی محبت کی جاتی ہے کہ اس کے بغیر نقصان کا خطرہ ہے۔ حقیقی نفع اور ضرر تو اللہ تعالیٰ ہے۔ لہذا اس وجہ سے بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت ہونی چاہیے۔

محبت کا ایک اور معیار ضروریاتِ زندگی کی تکمیل بھی ہے۔ انسان کا مال و متاع، گھر بار، زن و اولاد سب ضروریات کی تکمیل کا ذریعہ ہیں۔ لہذا ان سے بھی محبت کی جاتی ہے۔ ظاہر ہے۔ کہ یہ محبت بھی محبت بالذات نہیں، یہ تو اللہ تعالیٰ نے محض ذرائع پیدا کیے ہیں۔ امیر ہو یا حاکم، رُسیق ہو یا دوست، برادری ہو یا کوئی ادارہ، یہ تو محض اسباب ہیں، ورنہ ضروریات کا حقیقی بہم پہنچانے والا اللہ واحد لا شریک ہے۔ لہذا محبت بالذات اُسی کو سزاوار ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی محبت اور اختیار کی نسبت کو ایک سطح پر لے گئے گا۔ تو شرک کا مرتکب قرار پائے گا۔

یہ بات تو واضح ہوگئی کہ اللہ تعالیٰ ہی محبوبِ حقیقی ہے اس کے ساتھ محبت باقی تمام مخلوق کی محبت سے زیادہ ہونی چاہیے۔ غیر اللہ کی محبت کو اللہ کی محبت کے مساوی بھی درجہ نہیں دیا جاسکتا ورنہ یُحْسِنُوْنَ لَهُمْ كَحُبِّ اللّٰهِ

کی زد میں آجائے گا۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص اَشَدُّ حُبًّا لِلّٰہ یعنی اللہ کے ساتھ سب سے زیادہ محبت کا دعویٰ کرے تو اس کی جانچ کے لیے کوئی کسوٹی ہے۔ کہ اُس کا دعویٰ درست ثابت ہو جائے۔ تو مفسرین کرام فرماتے ہیں کسی کی محبت کی کسوٹی اطاعت ہے۔ جب اطاعت کا وقت آئے گا تو پتہ چلے گا۔ کہ محبت کا دعویٰ اپنے محبوب حقیقی کی اطاعت کرتا ہے یا کسی اور کی ظاہر ہے کہ جس شخصیت کی اطاعت کریگا، اُس کی محبوب ترین ہستی وہی ہوگی۔ مثال کے طور پر ایک طرف خدا تعالیٰ کا حکم ہے۔ اور دوسری طرف والدین، پیر یا استاذ کا حکم ہے۔ تو ان میں سے وہ کس کو ترجیح دیتا ہے۔ اس مقام پر بشرعی محبت کا تقاضا یہ ہے۔ وہ اپنے اللہ کی اطاعت کر کے اُس کے ساتھ شدید ترین محبت کے دعوے کو سچ کر دکھائے۔ اور اگر اُس نے اللہ تعالیٰ کے حکم کو چھوڑ کر کسی دوسرے کے حکم کو ترجیح دی۔ تو ظاہر ہے کہ اُس کا محبوب حقیقی کے ساتھ محبت کا دعویٰ باطل قرار پائے گا۔ اور اس کی شدید ترین محبت اُسی کے ساتھ ثابت ہوگی۔ جس کی اُس نے اطاعت کی۔ اللہ کے حکم کے مقابلہ میں جو کوئی بھی ملک، آباؤ اجداد یا برادری کے رسم و رواج کی پیروی کرے گا۔ مشرک ہو جائے گا۔ بعض لوگ انبیاء، اولیاء، ملائکہ یا ارواح کی محبت کو خدا کی محبت کے برابر قرار دیتے ہیں۔ اُن سے ایسی محبت کہتے ہیں جیسی خدا تعالیٰ سے محبت ہوتی ہے اسی لیے نذرِ نیاز اور قربانی پیش کرتے ہیں یا نیاز مندی بجالاتے ہیں۔ یا اُن کی یادگار بناتے ہیں تو ایسے لوگ بھی مشرک میں ملوث ہو جاتے ہیں۔ غیر اللہ کے ساتھ محبت کرنے کی اجازت ہے مگر ایسی محبت جو اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق ہو اور اس کی محبت سے کم تر صبحے ہو۔ محبت دراصل ایک میلان، تعلق اور خواہش کا نام ہے۔ طبعی محبت میں دنیاوی غرض کارفرما ہو سکتی ہے مگر اللہ تعالیٰ سے محبت کا تقاضا یہ ہے۔ کہ وہ عبادت، اطاعت اور اس کی رضا کے لیے ہو۔

شاہ عبدالعزیزؒ فرماتے کہ اللہ تعالیٰ سے محبت کی علامت یہ ہے کہ جو اس کے ساتھ محبت کا دعویٰ کرے گا، وہ اُس کے محبوبوں کے ساتھ بھی محبت رکھے گا۔ اور اس کے دشمنوں سے نفرت کرے گا۔ محبت کی دوسری علامت یہ ہے کہ محبوب کو اللہ کی اطاعت اور عبادت کرنے میں روح کا کامل نشاط حاصل ہوگا۔ وہ خوشی کے ساتھ عبادت الہی میں منہمک ہوگا اور معصیت سے گریز کرے گا۔ اسی طرح وہ خدا تعالیٰ کی رضا کی خاطر جان و مال کی بازی لگانے میں بھی دریغ نہیں کرے گا۔

اب دیکھ لیجیے کہ دنیا میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ لوگ کس طرح غیر اللہ کی محبت میں گرفتار ہو چکے ہیں۔ عیسائی مذہب نے اللہ تعالیٰ کی محبت کے مقابلے میں بڑے خوش خدا کے بیٹے، کنواری ماں اور روح القدس کی محبت میں مبتلا ہیں۔ یہی مشرکانہ محبت ہے۔ ہندو مت والے بھی محبوب حقیقی کی بجائے جنہیں وہ پر مانتا یا شہور کہتے ہیں، درگاہ دیوی اور مکشمی مائا کی محبت میں مبتلا ہیں۔ سادھو اور شیوہوں سے محبت کی پیٹگیں بڑھا رہے ہیں۔ ان کے نام کی نذر و نیاز دیتے ہیں۔ اسی طرح کلمہ گو مسلمان بھی غیر اللہ کی محبت کا دم بھرتے ہیں۔ یا علی مدو اور یا غوث اعظم کے نعرے لگاتے جا رہے ہیں۔ کبھی پیر بابا کو مدد کے لیے پکارا جا رہا ہے اور کبھی خواجہ سرمد دہلوی کی جا رہی ہے یہ لوگ تو اللہ کے پیارے، محبوب اور صالح لوگ ہیں۔ ان کو اللہ کا شریک ٹھہرایا ہے۔ یہی چیزیں ہیں جو ثابت کرتی ہیں کہ ان لوگوں نے غیروں کی محبت کو اللہ کی محبت کے مساوی قرار دے لیا ہے اللہ تعالیٰ تو کہتا ہے "فَادْعُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ خَالصِينَ" اللہ ہی کو پکارو کہ وہی حاضر و ناظر مالک و مختار اور مدد کرنے والا ہے۔ مگر یا اللہ کو بھی اللہ ہی کے ہم پلہ بنا کر شرک کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اللہ والوں کا یہ طریقہ قطعاً نہیں ہے۔

غیر اللہ کی محبت

اہل ایمان کا طریقہ

اہل ایمان کا ہمیشہ یہی طریقہ رہا ہے وَالَّذِينَ آمَنُوا أَشَدُّ حُبًّا لِلَّهِ کہ انہیں سب سے زیادہ محبت اللہ تعالیٰ کی ذات سے ہوتی ہے۔ وہ کسی غیر اللہ

میطیع اُن کے ہر حکم پر سر تسلیم خم کر لیتے تھے، آج وہی پادری، ریشی اور پیر اپنے مریدوں کو صاف جواب دے دیجئے کہ ہم نے تمہیں کب کہا تھا کہ ہمیں اللہ کا شریک ٹھہراؤ۔ یہ بیہودہ کام تو تم اپنی مرضی سے کہتے تھے۔ ہم نے تو نہیں کہا تھا کہ ہمیں اللہ کا بیٹا بناؤ، اُس کا اوتا رہنا تو یا مشکل کشا اور حاجت روا بناؤ۔ حتیٰ کہ جب حضرت عیسیٰ علیہ السلام سے بھی سوال ہو گا کہ کیا آپ نے لوگوں سے کہا کہ مجھے اور میری ماں کو اللہ بناؤ۔ تو آپ جواب دیں گے۔ اے مولا کریم! یہ کیسے ممکن ہے۔ کہ میں کوئی ایسی بات کہوں مَآلِیْسَ لِي بِحَقِّ خَلْقٍ كَسَنے کا مجھے کوئی حق نہیں۔ غرضیکہ تمام مطاع اُس دن انکار کر دیں گے۔ وَمَرَأُو الْعَذَابِ عَذَابِ سَلَمَ نَظَرِ آئِے گا وَتَقَطَّعَتْ بِهِمُ الْأَسْبَابُ اور تمام اسباب منقطع ہو جائیں گے۔ وَقَالَ الَّذِينَ اتَّبَعُوا اور پیر و کار کہیں گے، افسوس کا اظہار کریں گے۔ لَوْ أَنَّ لَنَا كَدَّةً اگر ہمیں ایک دفعہ پھر دنیا میں پلٹنے کی اجازت مل جائے فَنَتَّبِعُكُمِنْهُمُ تو ہم بھی ان راہنماؤں سے اسی طرح بیزار ہو جائیں۔ كَمَا تَبَعُوا وَاٰمَنَّا جیسا کہ یہ آج ہم سے بیزار ہو گئے ہیں یعنی اب ہمیں حقیقت حال کا علم ہو گیا ہے اب اگر یہ ہیں دنیا میں مل جائیں تو ہم ہرگز انکی تابعداری نہیں کریں گے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق سورۃ احزاب میں آتا ہے كِرِیَا اللّٰہُ اِنَّا اَطَعْنَا سَادَتَنَا وَكُنَّا لَكُمْ تم نے تطیعہ سرداروں اور بڑوں کا اتباع کیا فَاَصْلَحْنَا السَّبِيلَ انہوں نے ہمیں گمراہی سے ہمیں سیدھے راستے سے بٹھکا دیا۔ کاش کہ ہم نے تیرے رسولوں کا اتباع کیا ہوتا ہم نے تو اپنے بزرگوں کی بات مانی اے مولا کریم رَبَّنَا اَتَّهَمُ ضَعِیْفِیْنَ مِنَ الْعَذَابِ آج ان کو دو گنا عذاب دے کیونکہ یہ خود بھی گمراہ ہوئے اور ہمیں بھی گمراہ کیا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا کہ تم نے دنیوی اغراض کے لیے معبود بنا رکھے ہیں، قیامت کے دن یہ سارا سلسلہ منقطع ہو جائے گا۔ اور آج کے تمام دوست اُس دن دشمن بن جائیں گے۔ پیار محبت اور الفت صرف وہی کام آئے گی، جو اللہ کی رضا کی خاطر کی گئی۔ اس کے علاوہ تمام ذرائع کٹ جائیں گے فرمایا كَذٰلِكَ یُرِیْہُمُ اللّٰہُ اَعْمَالَهُمْ حَسَنًا علیہم اس طرح اللہ تعالیٰ اُن کے اعمال ان کو حسرت بنا کر دکھائے گا دلوں پر

ان کا بیزاری کا اعلان کچھ کام نہ آئے گا۔ بلکہ اُن کے عذاب میں اضافہ ہی ہوگا وَمَا
 هُوَ بِخَارِجٍ مِّنَ النَّارِ اِنَّ كَسْبَ لِهٰۤیْ جَهَنَّمَ سَعٰیً ۚ اِنَّ كٰۤیۤیۤسَ لَیۤسَ بِمُؤْمِنًا ۚ
 ہوگی، وہ ہمیشہ ہمیشہ اس میں جلتے رہیں گے۔ وجہ بیان ہو چکی ہے کہ انہوں نے غیر اللہ
 کی محبت کو اللہ تعالیٰ کی محبت کے برابر قرار دیا، شرک میں مبتلا ہوئے اور باطل
 پرست لوگوں کا اتباع کیا۔

سَيَقُولُ ۲

البقرة ۲

درس شصت و پنج (۶۵)

آیت ۱۶۸ تا ۱۷۱

يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا طَيِّبًا وَلَا
تَتَّبِعُوا خُطُوتِ الشَّيْطَانِ ط إِنَّكَ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿١٦٨﴾
إِنَّمَا يَأْمُرُكُمْ بِالسُّوءِ وَالْفَحْشَاءِ وَأَنْ تَقُولُوا عَلَى اللَّهِ
مَا لَا تَعْلَمُونَ ﴿١٦٩﴾ وَإِذَا قِيلَ لَهُمُ اتَّبِعُوا مَا أَنْزَلَ اللَّهُ
قَالُوا بَلْ نَتَّبِعُ مَا أَلْفَيْنَا عَلَيْهِ آبَاءَنَا أَوْ لَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ
لَا يَنْفَعُونَ شَيْئًا وَلَا يَضُرُّونَ ﴿١٧٠﴾ وَمَثَلُ الَّذِينَ
كَفَرُوا كَمَثَلِ الذِّبْيِ يَعْنِقُ بِمَا لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً
وَنِدَاءً ط صُمُّ أَبْكُمْ عُمًى فَهُمْ لَا يَفْقَهُونَ ﴿١٧١﴾

ترجمہ: اے لوگو! زمین میں جو حلال اور پاکیزہ چیزیں ہیں ان میں سے کھاؤ۔ اور شیطان
کے قدموں کی پیروی نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارے لیے صریح اور کھلا دشمن ہے ﴿۱۶۸﴾
بے شک شیطان تم کو برائی اور بے حیائی کی باتوں کا حکم دیتا ہے اور یہ کہ تم اللہ تعالیٰ
پر وہ چیزیں کہہ دو جو تم نہیں جانتے ﴿۱۶۹﴾ اور جب ان لوگوں سے کہا جاتا ہے کہ تم اُس
چیز کی پیروی کرو، جس کو اللہ نے اتارا ہے۔ تو کہتے ہیں۔ بلکہ ہم اُس چیز کی پیروی
کریں گے، جس پر ہم نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ اگرچہ ان کے باپ دادا کسی
چیز کو سمجھتے ہوں اور نہ وہ سیدھی راہ پر ہوں ﴿۱۷۰﴾ اور ان لوگوں کی مثال جنہوں نے
کفر کیا، اُس شخص کی سی ہے، جو آواز دیتا ہے۔ اُس کو کہ نہیں سنا مگر بلانا

اور پکارنا، یہ بہرے ہیں گونگے ہیں اندھے ہیں وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے ﴿۱۷۱﴾

گزشتہ آیتوں میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے دلائل اور شرک کا رد تھا اور یہ

بتلا یا گیا تھا۔ کہ جو لوگ دوسروں کے ساتھ ایسی محبت کرتے ہیں جیسی اللہ کے ساتھ
 کمرہ فی چاہیے، وہ لوگ کفر اور شرک میں مبتلا ہوتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ کی سزا اور عذاب
 کے مستحق بنتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایلے لوگوں کے برے انجام سے خبردار کیا ہے
 اور بتلایا ہے کہ ان کے اعمال ان کے لیے حسرت کا باعث بنیں گے۔ قیامت
 کے دن ایلے لوگ افسوس کا اظہار کریں گے۔ مگر وہ افسوس ان کے لیے کچھ مفید نہیں
 ہوگا اور نہ وہ کبھی دوزخ کی آگ سے باہر نکل سکیں گے۔

قانون کی
 پابندی

قرآن پاک کا یہ اسلوب بیان ہے۔ کہ موضوع کی نوعیت کے اعتبار سے کبھی
 خطاب عام ہوتا ہے۔ جیسے يَا أَيُّهَا النَّاسُ یعنی اے لوگو! اے بنی نوع انسان۔ اور
 کبھی خطاب خاص ہوتا ہے۔ جیسے يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا یا کھو
الْكِتَابُ وغیرہ وغیرہ۔ آیت زیر درس میں خطاب عام ہے۔ اور تمام بنی نوع
 انسان کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔ يَا أَيُّهَا النَّاسُ كُلُوا مِن ثَمَرِ
حَلَالِ طَيِّبَاتِ اے لوگو! زمین کی حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ وَلَا تَتَّبِعُوا خُطَايَا
الشَّيْطَانِ اور شیطان کے نقش قدم پرست چلو، إِنَّهُ لَكُمُ عَدُوٌّ
مُبِينٌ۔ وہ تمہارا صریح دشمن ہے۔

در اصل یہاں پر حلال اور پاکیزہ چیزیں کھانے کا حکم ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بنی
 نوع انسان کو قانون کی پابندی کا درس دیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جو چیزیں حلال قرار
 دی ہیں صرف انہیں استعمال کرو اور حرام غوری سے بچ جاؤ اگر تم اللہ کے قائم
 کردہ اس قانون کی پابندی نہیں کرو گے، تو اصل سائے سے بہک کر شیطان کے
 نقش قدم پر چلنے لگو گے۔ نتیجہ ظاہر ہے کہ ترقی کے مقام حظیرۃ القدس
 میں پہنچنے کی بجائے ظلمت کی اتھاہ گریزوں میں پہنچ جاؤ گے۔

اہم شاہ ولی اللہ دہلویؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں اس موضوع پر باب باندھ
 کہ بات سمجھائی ہے۔ فرماتے ہیں کہ انسان مکلف ہے۔ اور مکلف سے مراد قانون
 کی پابندی کرنے والا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کی ساخت میں ملکیت

اور پیمیت دونوں مائے رکھے ہیں اور ان دونوں کا تقاضا یہ ہے کہ ان قانون کی پابندی کرے۔ اور اگر وہ ایسا نہیں کریگا، تو اس کے حصے میں ناکامی اور محرومی کے سوا کچھ نہیں آئے گا۔

نسل انسانی تمدن نسل ہے۔ اور یہ دیات، قصبول اور شہرول میں مل جل کر رہتی ہے۔ ظاہر ہے کہ اس صورت میں کسی قانون کی پابندی اُس وقت تک نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔ جب تک وہ اجتماعی صورت میں نہ ہو۔ قانون پر عملدرآمد بھی اُسی حالت میں ممکن ہے جب کہ لوگوں کو قانون سے واقفیت ہو۔ اور اس کے لیے قانون کی تعلیم کا عام ہونا ضروری ہے۔ تاکہ معاشرے کا کوئی فرد قانون کے جاننے سے بے بہرہ نہ رہ جائے۔ جب یہ تحت پوری ہو جائے گی تو پھر قانون شکنی کرنے والے کے خلاف کارروائی بھی لازم ہو جائیگی، تاکہ معاشرہ اس قسم کے فساد سے محفوظ رہ سکے۔ قانون شکن کوئی فرد واحد ہو یا جماعت وہ قانون کی مقرر کردہ تعزیر کی زد میں ضرور آئے گا۔ اور اگر کوئی دوسری باہر کی جماعت قانون کے نفاذ میں کاٹ ڈالنے کی کوشش کریگی، تو اس کے خلاف اعلان جنگ کرنا ہوگا، تاکہ فتنہ و فساد کا دروازہ فوراً بند کیا جاسکے۔

حلال و حرام کی تمیز

حلال چیز وہ ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے اپنے انبیاء علیہم السلام کے ذریعے شرعاً حلال قرار دیا ہے۔ اور پاکیزہ وہ چیز ہے جو بذاتہ لذیذ بھی ہو۔ کیونکہ بدبودار چیز کو کوئی شخص کھانا پسند نہیں کرے گا، خواہ شریعت کے نزدیک وہ حلال ہو۔ کسی چیز کی پاکیزگی کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ اس کے ساتھ کسی کا حق متعلق نہ ہو۔ اگلی آیات میں حلال و حرام کی حکمت اور ان اشیاء کی تفصیل آ رہی ہے۔ مثلاً بکری حلال ہے۔ مگر خنزیر حرام ہے۔ اسی طرح اونٹ حلال ہے مگر شیر حرام ہے۔ بکری اور اونٹ وغیرہ کی حلت کے باوجود اس کے ساتھ یہ بھی شرط ہے کہ وہ شرعی طریقے سے مذکور ہو۔ ورنہ ایسے جانور کا گوشت استعمال نہیں کیا جائے گا۔ اس سلسلہ میں حکم موجود ہے ”وَلَا تَأْكُلُوا

مَعَالَمُ يُذَكِّرُ سَمُ اللّٰهِ عَلَیْہِ یعنی چیر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو اُسے مرت کھاؤ، وہ حرام ہے۔ اس طرح جس جانور پر غیر اللہ کا نام لیا گیا ہو، وہ بھی حرام ہے۔ سردار بھی حرام ہے۔ ایسی چیزوں کا استعمال جسمانی یا روحانی صحت کے لیے مضر ہوگا کیونکہ جن چیزوں کو شریعت نے ناجائز قرار دیا ہے، اُن میں کوئی نہ کوئی حشرابی ضرور ہوگی۔

”اَحْلِلْ لَکَ الْغَیْرَ اللّٰہِ“ کی حکمت اگلی آیتوں میں آرہی ہے۔ جو چیز غیر اللہ کے نام پر دی جاتی ہے، خواہ وہ مسٹائی ہو یا فروٹ، چاول ہوں یا گوشت، اُن میں بظاہر تو کوئی خرابی نظر نہیں آتی مگر اس میں روحانی نجاست پائی جاتی ہے، جو روح کو پلیدہ کنہ دیتی ہے۔ لہذا ایسی چیز روحانی طور پر مضر ہوگی، ترمذی شریف میں ہے کہ طافی یعنی ایسی مچھلی جو خود مر کر پانی کے اوپر تیرنے لگتی ہے۔ وہ مکروہ ہے اس میں حکمت یہ ہے کہ وہ جسمانی صحت کے لیے مضر ہے۔ جو کوئی کھائے گا بیمار ہو جائے گا۔ ہم نے خود دیکھا ہے کہ ایک شخص نے ایسی مچھلی کا گوشت کھایا اور اور چوبیس گھنٹے کے اندر ہلاک ہو گیا۔ یہ گوشت اتنا زہراؤ تھا کہ اُس کا سارا خون پیپ میں تبدیل ہو گیا۔ ایسے ہی حوادث سے معلوم ہوتا ہے کہ شریعت نے جن چیزوں سے منع کیا، وہ کسی نہ کسی طور انسانی جسم کے لیے مضر ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ۔

حرمیت کی ایک اور صورت دوسرے کی حق تلفی بھی بیان ہوئی ہے۔ ایک شخص چوری کی بکری لاکھ ذبح کر تا ہے۔ وہ حلال جانور ہے۔ اُس پر اللہ کا نام بھی لیا گیا ہے۔ مگر چوری کے فعل نے اس میں نجاست کو جنم دے دیا ہے۔ کہ وہ کسی دوسرے شخص کا حق تھا۔ جو ضائع ہو گیا۔ اس لیے اس کا کھانا حرام ٹھہرا۔ رشوت اور سود کا مال بھی اسی زمرہ میں آتا ہے کہ ایسا مال طیب نہیں رہتا بلکہ خبیث ہو جاتا ہے۔ اس لیے حرام ہے۔

اس کا مطلب یہ ہوا۔ کہ نبی نورع انسان کو اللہ تعالیٰ کے قائم کردہ قانون

کی پابندی کرنا چاہیے۔ جن چیزوں کو اللہ نے حلال اور پاکیزہ کہا ہے انہیں کھانا چاہیے اور حرام چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے۔ حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا کہ دعا فرمائیں۔ اللہ تعالیٰ مجھے مستجاب الدعوات بنائے یعنی اللہ میری ہر دعا کو قبول فرمائے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا اے سعید! اَطْبَبْ مَطْعَمَكَ اپنی خوراک کو پاک بنا لو۔ یعنی طیب غذا استعمال کرو تَنْكَرُ مُسْتَجَابِ الدَّعَوَاتِ مستجاب الدعوات بن جاؤ گے۔ فرمایا اس ذات پاک کی قسم ہے جس کے قبضہ میں میری جان ہے جب کوئی شخص حرام کا ایک لقمہ اپنے پیٹ میں ڈالتا ہے۔ تو چالیس دن تک اس کی نیکی قبول نہیں ہوتی۔ الغرض اللہ تعالیٰ کے حلال و حرام کے قانون کی پابندی لازمی ہے اس کے برخلاف کفرناشیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔

شیطان کا
نقش قدم

حضرت مسروقؓ ام المؤمنین حضرت عائشہ صدیقہ کے رشتہ دار اور شاگرد ہیں۔ آپ تابعین میں سے ہیں، کسی نے آپ سے دریافت کیا کہ اگر کسی نے بچے کو ذبح کر نیکی منت مانی ہو، تو اس کے متعلق کیا حکم ہے فرمایا بچے کی بجائے بکری ذبح کر دے تو اس کی نذر پوری ہو جائیگی کیونکہ بچے کو ذبح کرنا شیطان کے نقش قدم پر چلنے والی بات ہے اور شیطان ہمارا اُکھلا دشمن ہے۔ وہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر اب تک اور قیامت تک اپنی دشمنی کا اظہار کرتا رہے گا۔ اس کے غزائم واضح ہیں اَلْحَمْدُ لَكَ مُحَمَّدُ احْزَبَكَ لِيَكُوْنُوْا مِنْ اَصْحَابِ السَّعِيْرِ وہ اپنے لوگوں کو دعوت دیتا ہے کہ وہ اُس کے گروہ میں شامل ہو کر جہنم میں داخل ہو جائیں۔ ابلیس کا انانوں کے متعلق گمان تھا کہ یہ اندر سے کھڑکھلے ہیں، میں ان کو ہر طریقے سے اپنے دام میں پھنسانے کی کوشش کروں گا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ابلیس نے اپنا گمان سچ کر دکھایا۔ لوگوں کی اکثریت اس کے تابع ہو گئی اَلَا قَلِيْلًا سَوَّاهُ اے ایک چھوٹی جماعت کے جنہوں نے شیطان کا اتباع نہ کیا۔ بلکہ انہوں نے خدا تعالیٰ کے قانون کی پابندی کی۔ وہ شیطان کے فریب سے محفوظ رہے۔

فرمایا شیطان کا کام یہ ہے کہ اِنکایا مُرکُوباً لِسُوْرٍ وَ الْفَحْشَآءِ
 وہ تمہیں بُدی باتوں اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ بُدی باتوں سے مُراد فسق و فجور اور
 گناہ کے کام ہیں اور فحشا سے مُراد شہوت رانی کی باتیں ہیں۔ شیطان چاہتا ہے کہ
 اس قسم کی لغویات میں پڑے رہیں۔ اور خدائے عزوجل کے قانون کی طرف نہ آسکیں
 وہ یہ بھی چاہتا ہے۔ اِنَّ تَقُوْلُوْا عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کہ تم خدا تعالیٰ کے
 کے متعلق ایسی باتیں کہو، جو تم نہیں جانتے۔ یعنی بغیر جانے بوجھے اللہ تعالیٰ کے
 ساتھ ایسی باتیں منسوب کر دی جائیں جو اس کی شان کے شایان نہیں۔ چنانچہ کچھ لیجئے
 یہ مشرک اور بدعتی لوگ اپنی تمام خرافات اللہ تعالیٰ کے ساتھ منسوب کرتے ہیں۔ کہ
 یہ افعال اس کے حکم سے کر رہے ہیں۔ حالانکہ ایسا ہرگز نہیں ہے۔ بلکہ یہ تو اللہ تعالیٰ
 کی ذات پر افتراء باندھنا ہے۔ ایک زمانہ ایسا بھی آیا تھا۔ کہ لوگ بیت اللہ شریف
 کا طواف بالکل بے ہنہ حالت میں کرتے تھے۔ اُن کی توجہ یہ بھی تھی وَاللّٰهُ اَمْرُنَا
 پچھا یعنی اللہ نے ہمیں ایسا حکم دیا ہے حالانکہ اِنَّ اللّٰهَ لَا یَاْمُرُ بِالْفَحْشَآءِ
 اللہ تعالیٰ بے حیائی کا ہرگز حکم نہیں دیتا۔ شیطان نے اُن کے دل میں یہ بات
 ڈال دی کہ جن کپڑوں کے ساتھ ہم گناہ کا ارتکاب کرتے ہیں، اُن کے ساتھ
 طواف نہیں کرنا چاہیئے۔ لہذا انہوں نے مادر زاد نیچے طواف شروع کر دیا۔ سورۃ
 اعراف میں بھی آتا ہے۔ اَتَقُوْلُوْنَ عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کیا تم اللہ کے
 ساتھ ایسی باتیں منسوب کرتے ہو جس کا تمہیں علم ہی نہیں۔

انہی لوگوں کے متعلق فرمایا وَاِذَا قِیْلَ لَهُمْ اَتَّبِعُوْا مَا اَنْزَلَ
 اللّٰهُ اور جب اُن سے کہا جاتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں کی اتباع
 کرو یعنی اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ قانون پر چلو قَاتِلُوْا بَل تَتَّبِعُوْا مَا
 الْفِیْئَا عَلَیْہِ الْاَبَآءُ نَا تو کہتے ہیں کہ ہم تو اُمی چیز کی پیروی کریں گے جس پر ہم
 نے اپنے باپ دادا کو پایا ہے۔ کہتے تھے ہم تو اپنے بڑوں کے راستے کو
 نہیں چھوڑیں گے، ہم اُن کے عقیدے اور رسم و رواج کی پابندی کریں گے،

آباؤ اجداد
 کا اتباع

وہ بھی تو آخر عقل و شعور رکھتے تھے، کوئی بیوقوف تو نہ تھے اگر ان لوگوں کے آباؤ اجداد واقعی سمجھ بوجھ کے مالک ہوتے تو ان کے راستہ پر چلنا نیکی کی بات تھی۔ حضرت یوسف علیہ السلام نے بھی تو کہا تھا۔ وَاتَّبَعْتُ مِلَّةَ آبَائِي میں اپنے آباؤ اجداد کی ملت پر ہوں۔ یعنی میں اپنے باپ دادا ابراہیم، اسحاق اور یعقوب علیہم السلام کے طریقے پر ہوں۔ جو کہ صحیح راستے پر تھے۔ اس کے برخلاف اگر آباؤ اجداد غلط راستے پر چل رہے ہوں تو پھر ان کی پیروی کرنا کس قدر حماقت اور بیوقوفی کی بات ہوگی۔ اسی لیے فرمایا اَوَلَوْ كَانَ آبَاؤُهُمْ لَا يَعْقِلُونَ شَيْئًا وَلَا يَهْتَدُونَ۔ کہ اگر ان کے آباؤ اجداد نہ تو عقلمند ہوں اور نہ وہ ہدایت یافتہ ہوں تو کیا پھر بھی یہ انہی کے راستے پر چلیں گے۔ مقصد یہ کہ معروف میں تو کسی کی پیروی کی جاسکتی ہے، مگر منکرات میں ایسا کرنا کسی طرح بھی روا نہیں ہے۔

بعض چیزیں ہماری سوسائٹی کو دینے میں ملی ہیں مگر یہ خدا کے قانون اور پیغمبر علیہ السلام کے طریقے کے خلاف ہیں، محترم کے مہینے میں بعض لوگ بیان نہیں کھاتے۔ مگر رخ لباس نہیں پہنتے، کالا لباس پہنا ضروری سمجھتے ہیں۔ تاکہ اظہار غم ہو۔ یہ سب شیطانی طریقہ اور آباؤ اجداد کے راستے پر چلنے والی بات ہے۔ بعض لوگ حضرت فاطمہؑ کے نام کی نیاز دیتے ہیں۔ اور کہتے ہیں کہ کوئی مرد اس میں سے نہ کھائے۔ اسی طرح ۲۲ رجب المرجب کو حضرت ام جعفر صادقؑ کے نام کی نیاز دیتے ہیں جسے کوڑے کا نام دیا گیا ہے۔ کہتے ہیں کہ اس نیاز کا کھانا گھر سے باہر نہیں نکلنا چاہیئے۔ اور یہ سوچ طلوع ہونے سے پہلے کھالینا چاہیئے۔ اس قسم کے تمام مفروضات پر عمل درآمد آباؤ اجداد کی پیروی کے مترادف ہے۔ اس کا حقیقت سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اسی طرح شاہ عبدالحقؒ کا توشہ حلاوا ہوتا ہے۔ مگر حقہ پینے والا یہ توشہ نہیں کھا سکتا۔ اسپر پابندی ہے۔ بوعلی قلندرؒ کی نیاز میں سویاں پکائی جاتی ہیں۔ عید کے موقع پر لوگ اس کی بھی پابندی کرتے۔ اصحاب کہف کی نیاز گوشت رزنی کی صورت میں دی جاتی ہے۔ اس کے بغیر

نیا زاد ادا ہی نہیں ہوتی۔

اسی طرح پیران پیر شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی نیاز کے لیے گیارہویں تاریخ کی پابندی کی جاتی ہے۔ یہاں پر یہ غلط عقیدہ راسخ ہو چکا ہے کہ اگر مقررہ تاریخ پر گیارہویں نہ دی تو مال میں نقصان ہو جاتا ہے یا بھیتس کا دودھ کم ہو جاتا ہے اس قسم کی تمام چیزیں اَنْ تَقُولُوْا عَلٰی اللّٰهِ مَا لَا تَعْلَمُوْنَ کی زد میں آتی ہیں۔ مَکَا اَنْزَلَ اللّٰهُ مِنْ تَوْحٰیْمٍ یہ ہے کہ اموات کے لیے دعا کرو، اِنْ کے لیے ایصال ثواب کرو، یہ ملک ابراہیمی کا اصول ہے۔ ان کے لیے صدقہ اور استغفار کرو، اس میں کوئی پابندی نہیں، جب چاہو اجازت ہے۔ مگر ہمارے ہاں ایسی چیزوں پر طرح طرح کی پابندیاں لگا کر اسے بدعائیں شامل کر دیا ہمارے ہاں صدقہ کے بہت سے خود ساختہ طریقے رائج ہو چکے ہیں۔ کئی ایک پابندیاں عائد ہو چکی ہیں۔ کہتے ہیں کہ صدقہ کے لیے کالے جانور کی بھری ہوئی چلبھیے۔ اس کے بغیر صدقہ ادا نہیں ہوتا۔ حضور علیہ السلام کا تو واضح ارشاد ہے تصدق بدمس ہمہ بدینارہ جس کے پاس درم ہے وہ درم دے دے اور جس کے پاس دینار کی گنجائش ہے، وہ دینار صدقہ کر دے مقصد یہ کہ جو چیز بھی میسر ہے اس میں صدقہ دیا جاسکتا ہے مثلاً غنہ اجناس، کھجوریں، کپڑا کتاب وغیرہ ہر چیز صدقہ میں دی جاسکتی ہے۔ گوشت اور سری کی کوئی پابندی نہیں۔ یہ تو شیطان کی شریعت ہے۔

حضرت ابو طلحہؓ حضور علیہ السلام کی خدمت اقدس میں حاضر ہوئے اور عرض کیا حضور! میرا یہ بہترین بارغ ہے، میں کچھ سے صدقہ کرنا چاہتا ہوں۔ آپ نے فرمایا تیرے قرابت داروں میں جو غریب لوگ ہیں انہیں تقسیم کر دو۔ چنانچہ انہوں نے ایسا ہی کیا۔ اس طرح آپ نے حضرت سعدؓ کو صدقہ میں کنواں لگوانے کا حکم دیا۔ آج بھی صدقہ کے طور پر نلکے یا ٹوب دیل لگوا جاسکتا ہے۔ مسجد کی تعمیر ہو سکتی ہے۔ دین کی تبلیغ پر خرچ کیا جاسکتا ہے۔ نادار طالب علموں کی تعلیم کے

صدقہ کا طریقہ

لیے صدقہ کا مال خرچ کیا جاسکتا ہے۔ پریشان حال مسافر کی مدد کی جاسکتی ہے۔ ایسی ہی بہت سی مدت ہیں جن پر صدقہ کا مال خرچ ہو سکتا ہے۔ مگر لوگوں نے کالے جانور کی کالی ہمری کمرہ ہی صدقہ سمجھ لیا ہے۔ اس خول سے باہر ہی نہیں نکلتے۔ اس لئے فرمایا کہ جو شریعت اللہ تعالیٰ نے نازل کی ہے۔ اس کا اتباع کرو، باپ دادا کے غلط اقدام کی اتباع مت کرو۔ کتنی بیوقوفی کی بات ہے۔ کہ بے عقل اور بے ہمت آباد اجداد کے نقش قدم کو اصل دین سمجھ لیا گیا ہے

کنجروں کی مثال

آگے اللہ تعالیٰ نے شیطان کے نقش قدم پر چلنے والے کفار کی مثال بیان فرمائی ہے۔ وَمَثَلُ الَّذِينَ كَفَرُوا كَمَثَلِ الدَّمِيِّ يَنْفُخُ بِنَافِثَةٍ لَا يَسْمَعُ إِلَّا دُعَاءً وَنِدَاءً ط کافروں کی مثال اس چر داسے کی ہے۔ جو اپنے جانوروں کو آواز دیتا ہے۔ جو اس کی چیخ اور پکار کو سُننے تو ہیں مگر سمجھ نہیں سکتے اسی طرح کافر بھی اللہ کے نبی کی آواز تو سُننے ہیں مگر جانوروں کی طرح اُنکی سمجھ میں کچھ نہیں آتا۔ فرمایا صُمْ بُكُمْ عُنِيَ فَهُمْ لَا يَعْقِلُونَ وہ بہرے، گونگے اور اندھے ہیں، یہ لوگ عقل و شعور سے بھی عاری ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تین بڑی نعمتیں عطا کی ہیں یعنی قوت سماعت، قوت گریائی اور قوت بھروسے مگر لوگ ہیں۔ کہ ان قوی کو استعمال نہیں کرتے اور گونگے، ابھرے اور اندھے بنے ہوئے ہیں یہ لوگ اللہ کی ان نعمتوں سے کوئی فائدہ نہیں اٹھاتے۔ نہ تو حقیقت بات سننے کی تاب لا سکتے ہیں، نہ حقیقت کو دیکھ کر پرکھتے ہیں۔ اور نہ حق کی بات پر چھپنے کے لیے بولتے ہیں۔ یہ اللہ کی عطا کردہ نعمتوں کو ضائع کر رہے ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و شش (۶۶)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۱۴۲ تا ۱۴۳

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَ
اشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ إِيَّاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۴۲﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ
عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أَهْلَ بِهِ
لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ
عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تم کو روزی دی ہیں۔ اور
اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اگر تم خاص اسی کی عبادت کرنے والے ہو ﴿۱۴۲﴾ بیشک اللہ
تعالیٰ نے تم پر حکم قرار دیا ہے، مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ
کے سوا کسی دوسرے کا نام پکارا گیا ہو۔ پس جو شخص مجبور ہو گیا اس حال میں کہ وہ نافرمانی
کرنے والا نہیں ہے اور نہ زیادتی کرنے والا ہے، پس اس پر کچھ گناہ نہیں

ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا مہربان ہے ﴿۱۴۳﴾

گزشتہ آیات میں **يَا أَيُّهَا النَّاسُ** کہہ کر پوری نوع انسانی کو خطاب کیا گیا تھا
اب ان آیات میں خاص طور پر مومنوں سے خطاب ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔

اکل حلال

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ اے ایمان والو۔
پاک چیزیں کھاؤ، جو ہم نے تمہیں روزی دی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے
کہ اکل حلال کا یہ وہی حکم اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو دیا ہے، جو اس نے اپنے
نبیوں اور رسولوں کو دیا ہے۔ یعنی **يَا أَيُّهَا الرُّسُلُ كُلُوا مِنَ الطَّيِّبَاتِ**
وَأَعْمَلُوا صَالِحًا یعنی اے رسولوں کی جماعت پاک چیزیں کھاؤ اور نیک اعمال
کرو۔ وغرضیکہ تمام انبیاء اور اہل ایمان کو پاک چیزوں کے کھانے سے منع فرمایا

ہے۔ کیونکہ ایسی چیزیں کھانے سے انسان میں خرابی پیدا ہوتی ہے۔ پاک اشیاء کا کھانا اور ناپاک چیزوں سے پرہیز ایک ایسا عمل ہے کہ اللہ تعالیٰ نے اسے غیر اسلام صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت کے طور پر بیان فرمایا ہے۔ وہ ایسا رسول ہے کہ ”مُحِلُّ لَہُمْ الطَّيِّبَاتِ وَ مُحَرِّمٌ عَلَیْہِہُمُ الْخَبَائِثَ“ لوگوں کے لیے پاکیزہ چیزوں کو حلال اور خبیث اور ناپاک چیزوں کو حرام ٹھہراتا ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جن چیزوں کو خبیث قرار دیا ہے۔ اُن کے استعمال سے یا تو جسمانی طور پر خرابی پیدا ہوگی یا روحانی طور پر۔ پاک چیز وہ ہے جس میں کوئی خباثت نہ ہو، خباثت ظاہری بھی ہوتی ہے اور باطنی بھی ہوتی ہے۔ ظاہری خباثت تو یہ ہے کہ کوئی چیز ظاہری طور پر گندی ہو اور باطنی گندگی میں مالِ حرام اور قسم چوری اور خیانت وغیرہ آتا ہے۔ اسی طرح روحانی گندگی یہ ہے کہ اس میں کسی غیر کا حق شامل ہو۔ علامہ اقبال مرحوم نے بھی کہا ہے کہ اکل حلال اور صدق مقال دین کی گرہ اور راز ہے مسلم شریف کی حدیث میں آتا ہے کہ ایک آدمی لمبا سفر کرتا ہے۔ جسم اور لباس گندہ اور دھسے، بڑی تکلیف پاتا ہے وہ دعا کرتا ہے یا رَبِّ یَا رَبِّ اے مولا کریم! میری دعا قبول کرے مگر حضور فرماتے ہیں فَاتَّی السُّجَّابُ لَکَ، اس کی دعا کیسے قبول ہوگی جب کہ مَطْعَمُکَ حَرَامٌ وَ مَشْرَبُکَ حَرَامٌ جب کہ اس کا کھانا پینا حرام ہے۔ وَ عَزِیْ بِحَرَامِ حَرَامِ نَدَاتِ پرورش پاتا ہے مقصد یہ کہ دعا کی قبولیت کے لیے اکل حلال بمنزلہ شرط ہے اسی طرح عبادت کی قبولیت کے لیے بھی لازم ہے کہ عابد حلال اور طیب چیزیں استعمال کرے

شکر الہی

فرمایا اللہ کی عطا کردہ روزی میں سے پاکیزہ چیزیں کھاؤ وَ اشکروا لِلّٰہِ اور اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو، اِنْ کُنْتُمْ اَیَّاهُ تَشْبُرُونَ۔ اگر تم خالص اسی کے عبادت گزار ہو شکر ادا کرنے کے کسی طریقے ہیں مثلاً زبان سے شکر ادا کرنا یہ ہے کہ اللہ کی حمد و ثنایاں کرے۔ اعضا کا شکر یہ ہے کہ ایسے اعمال انجام دیے جائیں جن سے اللہ تعالیٰ کی تعظیم کا اظہار ہو۔ اور دل سے شکر ادا کرنا یہ ہے

کہ دل میں یہ اعتقاد رکھے کہ مستحق تعظیم صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ اس کے ساتھ اس کا کوئی شریک نہیں ہے ایک حدیث قدسی میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جنوں اور انسانوں کی ایک حالت یہ بھی ہے کہ اَخْلَقُوا وَيَعْبُدُ غَيْرِي پیدا میں کرتا ہوں اور عبادت دوسروں کی کرتے ہیں۔ ان کے نام کی نذر و نیاز میتے ہیں۔ اسی طرح فرمایا اَرْضُ قِي وَكَيْتُ كَرُ غَيْرِي رزق میں دیتا ہوں اور وہی میں پہنچاتا ہوں مگر غمگین دوسروں کا ادا کرتے ہیں۔ اس مضمون کو امام رازیؒ اور بعض دیگر مفسرین نے بھی نقل کیا ہے۔

محرمات

اکل حلال کا قانون بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس مقام پر محرمات رابعہ یعنی چار حرام چیزوں کا تذکرہ کیا۔ جن کا استعمال انسان کے لیے قطعاً جائز نہیں فرمایا۔ لَا مَحْظَرُ عَلَيْكُمْ كَمُ الْمَيْتَةِ وَالدَّمِ وَخَمِ الْخَنَازِيرِ وَمَا أَهْلَ بِهِ لَخَيْرٍ لِلَّهِ بِشَكِّكُمْ پر حرام ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی غیر کا نام پکارا گیا ہو،

مردار

محرمات میں پہلا نمبر مردار کا ہے۔ اس سے وہ جانور مراد ہے جو حلال ہو اور ذبح کرنے کے قابل ہو، مگر بغیر ذبح کیے مر جائے۔ ایسا جانور حرام کی فہرست میں آجائے گا، اس کا کھانا قطعاً ناجائز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ مائدہ میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے۔ وہاں پر بھی مذکورہ بالا چار محرمات کا ذکر کرنے کے بعد فرمایا کہ محرمات میں مردار کی یہ صورتیں بھی شامل ہیں وَالْمُتَخَفِقَةُ وَالْمَوْقُودَةُ وَالْمُتَرَدِّدَةُ وَالنَّطِيجَةُ وَمَا أَكَلَ السَّبُعُ إِلَّا مَا ذَكَّيْتُمْ وَمَا ذُكِيَ عَلَى النَّصَبِ وَإِنْ تَسْتَقْسِمُوا بِالْآزِلَةِ یعنی وہ حلال جانور جو گلا گھٹ کر یا چوٹ کھا کر یا بلندی سے گر کر یا کھر کھا کر مر ہو یا جسے کسی درندے نے پھاڑا ہو۔ سوائے اس کے کہ جسے تم نے زندہ پا کر ذبح کر لیا۔ یا جو کسی تھان پر ذبح کیا گیا ہو یا یہ کہ پانسوں کے ذریعے اپنی قسمت معلوم کرو۔ ایسی چیزوں کا کھانا مسلمان کے لیے حلال نہیں ہے۔ مردار کے حرام ہونے میں حکمت یہ ہے

کہ اس کے گوشت کھانے سے انسان میں سستی اور کاہلی پیدا ہو جاتی ہے کسی عبادت اور نیکی کے کام میں نشاط حاصل نہیں ہوتی۔

یہاں پر جس خون کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ وہ بہتا ہوا خون ہے۔ جو رگوں میں چلتا ہے اور ذبح کرتے وقت بہ جاتا ہے۔ سورۃ النعام میں اسے دَمًا مَسْفُوحًا یعنی بہایا ہوا خون کہا گیا ہے۔ یہ قطعی حرام ہے۔ اور اس کا استعمال جائز نہیں۔ البتہ رگوں کا خون بہ جانے کے بعد جو خون گوشت میں رہ جاتا ہے وہ حرام نہیں ہے اگر گوشت بغیر دھوئے بھی پکا کر کھالیا جائے تو وہ پاک ہے۔ تاہم نظافت کا تقاضا ہے کہ اُسے دھویا جائے، مگر اس کی علت میں کوئی شبہ نہیں۔ البتہ جس جانور کو شرعی طریقہ سے ذبح کرنا ناممکن نہ ہو، اُس کو ذبح کرنا شرط نہیں ہے۔ بلکہ اُسے اللہ کا نام لے کر زخمی کر دینا ہی کافی ہے۔ بھاگ جانے والے جانور کو اگر تیر چلائے وقت یا نیزہ بھالا وغیرہ مارتے وقت اللہ کا نام لے لیا جائے تو وہ جانور حلال ہوگا، خواہ اُسے زخم جسم کے کسی بھی حصہ پہ آیا ہو۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ لکھتے ہیں کہ مردار وہ جانور ہے جو خود بخود مر جائے، یعنی جس پر اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ سورۃ النعام میں موجود ہے وَلَا تَأْكُلُوا مِمَّا لَمْ يَذْكُرْ اسْمُ اللَّهِ عَلَيْهِ جس پر اللہ کا نام نہ لیا گیا ہو۔ اس کو مت کھاؤ۔ ہاں جس جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا جائے گا، وہ اُس نام کی برکت سے پاک ہو جائے گا۔ اور جس جانور کو شرعی طریقہ کے خلاف شکار یا ذبح کیا جائے وہ بھی مردار تصور ہوگا۔ مثلاً کسی جانور کو ذبح کرنے کی بجائے اُس کا گلا گھونٹ دیا جائے یا زندہ جانور کا کوئی عضو کاٹ لیا جائے، تو ایسے گوشت کا کھانا جائز نہیں ہوگا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ مَا أَبْيَنَ مِنَ الْحَيِّ فَهُوَ مَيِّتٌ زندہ جانور کا کوئی حصہ علیحدہ کر دیا جائے تو وہ مردار ہی تصور ہوگا۔ اسی طرح لکڑی، غیل یا بندوق سے مارا جائے اور ذبح نہ کیا جائے۔ تو وہ مردار ہوگا ایک موقع پر مولانا مودودی صاحب نے فتویٰ دیا تھا کہ بندوق کا شکار بغیر ذبح

کیے ہوئے جائز ہے، حالانکہ تمام فقہائے کرام اس کے خلاف فتویٰ دیتے ہیں تاہم بعد میں انہوں نے رجوع کر لیا صحیحین اور نسائی شریف کی روایت کے مطابق صرف وہ جانور بغیر ذبح کے حلال ہے۔ جو تیر کے نوکدار حصہ سے زخمی ہوا ہو۔ اگر ویسے ہی تیر کی چوٹ سے مر جائے تو ایسا جانور موقوفہ شمار ہوگا اور حلال نہیں ہوگا۔ یہ ایسے ہی ہے جیسے کوئی عام چوٹ از قسم مکڑی پتھر وغیرہ کے لگنے سے موت واقع ہو جائے۔ بندوق کی گولی بھی ٹھوس ہوتی ہے۔ نوکدار چیز نہیں ہوتی، اس لیے بندوق کے ساتھ شکار کیا ہوا جانور بغیر ذبح کیے حلال نہیں ہوتا۔

لَعْنَةُ ذِكْرِ اسْمِ اللّٰهِ عَلَيْهِ میں وہ جانور آئے گا۔ جس پر بوقت ذبح قصد اللہ کا نام نہ لیا جائے۔ ہاں اگر ذبح کرتے وقت بسم اللہ اللہ اکبر کہنا بھول جائے۔ تو وہ مردار نہیں ہوگا، اس کا کھانا جائز ہوگا۔ اگر قصد تکبیر کو ترک کیا ہے۔ تو ایسا جانور مردار تصور ہوگا۔ البتہ حدیث شریف کے مطابق دو جانور اس حرمت سے مستثنیٰ ہیں اور ان کا کھانا جائز ہے۔ فرمایا اُحِلَّتْ لَنَا مَيْتَاتَانِ ہمارے لیے دو مردار حلال ہیں اَلْسَمَةُ وَالْجُرَادُ یعنی مچھلی اور ٹڈی۔ ان کا شکار کر کے بغیر ذبح کیے کھایا جاسکتا ہے۔ حضور نے انہیں جائز قرار دیا ہے۔

نخون کی اکیٹم لبتہ یعنی جما ہوا خون ہے۔ اسے شریعت نے حلال قرار دیا ہے۔ فرمایا اُحِلَّتْ لَنَا ذِمَّانِ ہمارے لیے دو خون حلال ہیں اَلْكَبْدُ وَالطَّحَالُ یعنی جگر اور تلی۔ یہ دونوں اعضا منجمد خون ہیں مگر حلال ہیں۔ دم مسفوح یعنی رگوں سے نکلنے والے خون کی حرمت کی حکمت یہ ہے کہ طے استعمال کرنے والے آدمی میں درندگی کا مادہ پیدا ہو جاتا ہے۔ شیر، رچھیر وغیرہ جو شکار کا خون پی جاتے ہیں۔

— اس لیے ان میں درندگی کی صفات پائی جاتی ہیں۔ اگر کوئی انسان بھی ایسا ہی خون استعمال کرے گا۔ تو اس میں بھی ایسی خصلتیں پیدا ہو جائیں گی۔ لہذا دم مسفوح کو شریعت نے حرام قرار دیا ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ہر چیز کا خامہ ہوتا ہے جو شخص سورج نکلنے تک

کہ کھاتے ہے۔

امام شاہ دلی الشرف فرماتے ہیں کہ خنزیر کی حرمت کی وجہ یہ ہے کہ اس جانور میں ایسی خصلتیں پائی جاتی ہیں جو انسانی فطرت کے خلاف ہیں۔ اولاً یہ گندگی کھانے والا جانور ہے اور حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ جلالہ جانور یعنی گندگی کھانے والا جانور کا کھانا مکروہ تحریمی ہے۔ حتیٰ کہ اگر حلال جانور مثلاً گائے بھینس اونٹ، بکری وغیرہ بھی گندگی کھانے لگ جائے تو اسے باندھ کر دس دن تک گھاس کھلاؤ ورنہ اس کا دودھ اور گوشت مکروہ ہوگا۔ بعض اوقات گندگی کھانے کی وجہ سے جانور میں طرح طرح کی بیماریاں پیدا ہو جاتی ہیں اور اس کی وجہ سے جانور کا ذوق بھی بگڑ جاتا ہے۔ چونکہ خنزیر گندگی کھاتا ہے۔ لہذا اس کا اثر اس کے گوشت بلکہ ہر عضو میں سرایت کر جاتا ہے اس واسطے اس کا کھانا قطعی حرام ہے۔

خنزیر میں ایک اور قبیح خصلت بھی پائی جاتی ہے جو کسی اور جانور میں نہیں ملتی یہ اس قدر بے غیرت جانور ہے کہ اس کے متعدد نر بیک وقت ایک مادہ سے ملتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اور جانور نہیں ہے جو دو سکر نہ کی موجودگی میں مادہ سے جھٹی کرے۔ اگر کوئی دوسرا موجود ہوگا تو جب تک اُسے بھگانیں دے گا، نفاتی خواہش پوری نہیں کرے گا۔ مگر خنزیر ہی ایک ایسا جانور ہے جس کو دو سکر نہ جانور کی موجودگی قطعاً ناگوار نہیں گذرتی اور یہ بے غیرتی کی انتہا ہے۔ چنانچہ اس جانور کا گوشت کھانے والی اقوام میں بھی اس خصلت کا بیدار ہو جانا لازمی امر ہے۔ انگریز اور سکھ خنزیر کا گوشت کھاتے ہیں، دیکھ لیجئے دونوں قومیں اس قسم کی بے غیرتی کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے خنزیر کے گوشت کو حرام قرار دیا ہے۔

اگرچہ خنزیر کی ہر چیز حرام ہے۔ تاہم اس مقام پر صرف گوشت کی حرمت دو وجوہ کی بنا پر بیان کی گئی ہے۔ پہلی وجہ تو یہ ہے چونکہ بیاں پر ذکر کھانے کا ہوا ہے کہ اے مومن! حلال اور پاکیزہ چیزیں کھاؤ، ترکھانے کی مناسبت سے گوشت کا ذکر کیا گیا ہے۔ اس جانور کی باقی اشیاء یعنی ہڈیاں، چمڑا، چربی

وغیرہ حرام تو ہیں مگر یہ کھانے کے کام نہیں آتیں بلکہ بعض دوسرے طریقوں سے انسانی استعمال میں آتی ہیں۔ گوشت کے ذکر کی دوسری وجہ یہ ہے کہ اس کا گوشت ہر حالت میں حرام ہے۔ خواہ وہ شرعی طریقہ سے ذبح کیا گیا ہو یا نہ کیا گیا ہو۔ حلال جانور کی حرمت اس وقت ثابت ہوتی ہے۔ جب کہ وہ خود مر گیا ہو یا شرعی طریقہ سے ذبح نہ کیا گیا ہو مگر خنزیرہ کی حرمت ہر صورت میں قائم رہی خواہ اسے شرعی طریقہ پر ہی کیوں نہ ذبح کیا گیا ہو۔ جس طرح باقاعدہ ذبح کرنے سے کتے کا گوشت جائز نہیں ہو جاتا، اسی طرح خنزیرہ کا گوشت بھی حلال نہیں خواہ اسے شرعی طریقہ سے ہی کیوں نہ ذبح کیا گیا ہو۔ اس کا گوشت ہر صورت میں حرام ہی ہے گا۔ اسی لیے اسے نجس العین کہتے ہیں۔

اہم ابو حنیفہ کا فتویٰ ہے کہ ہر جانور کی کھال رنگ دینے کے بعد پاک ہو جاتی ہے خواہ وہ جانور حلال مگر مردار ہو یا جانور ہی سرے سے حرام ہو، سوائے خنزیرہ کی۔ کھال کے کہ یہ دباغت سے بھی پاک نہیں ہوتی۔ رہی انسان کی کھال، تو وہ احترام استعمال میں نہیں لائی جاتی مگر دباغت سے وہ بھی پاک ہو جاتی ہے۔ غرضیکہ خنزیرہ الیا جانور ہے۔ جس کی کوئی چیز بھی کسی حالت میں بھی قابل استعمال نہیں ہوتی۔ انسانی اخلاق پر اس کی غذا کا گہرا اثر ہوتا ہے۔ انسان جس قسم کی غذا استعمال کرے گا، اس کے اخلاق کی تعمیر اس کے مطابق ہوگی۔ اگر کوئی شخص خنزیرہ یا کوئی دوسری حرام چیز استعمال کرتا ہے۔ تو اس کا اثر اس کے اخلاقیات یعنی طہارت، اخبات، سماحت اور عدالت پر پڑے گا اور وہ شخص اپنے مقام کو قائم نہیں رکھ سکیگا۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے طہارت و حرمت کا قانون نافذ کر کے انسانی اخلاقیات کی تعمیر کی ہے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس شصت و ہفت (۶۷)

آیت ۱۴۲ تا ۱۴۳

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُلُوا مِن طَيِّبَاتِ مَا رَزَقْنَاكُمْ وَ
اشْكُرُوا لِلَّهِ إِن كُنتُمْ لَآيَاهُ تَعْبُدُونَ ﴿۱۴۲﴾ إِنَّمَا حَرَّمَ
عَلَيْكُمْ الْمَيْتَةَ وَالْدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيرِ وَمَا أُهْلَ بِهِ
لِغَيْرِ اللَّهِ ۖ فَمَنِ اضْطُرَّ غَيْرَ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ
إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿۱۴۳﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! وہ پاکیزہ چیزیں کھاؤ جو ہم نے تمہیں روزی دی ہیں اور اللہ کا
شکر ادا کرو اگر تم خاص اُمی کی عبادت کرنے والے ہو ﴿۱۴۲﴾ بے شک اللہ تعالیٰ نے
تم پر حرام کیا ہے مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور وہ چیز جس پر اللہ کے سوا کسی اور کا نام بکارا
گیا ہو۔ پھر جو شخص مجبور ہو گیا اس حال میں کہ وہ نافرمانی کرنے والا نہیں ہے اور نہ زیادتی
کرنے والا، پس اس پر کچھ گناہ نہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے ﴿۱۴۳﴾

گزشتہ سے
پیوستہ

گزشتہ درس میں حلال و حرام کی بحث آچکی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے پاکیزہ چیزوں کو
حلال قرار فرمایا ہے اور انہیں کھانے کی اجازت دی ہے۔ اور حرام چیزوں سے منع فرمایا۔
حلال اشیاء کی تفصیل قرآن میں بیان ہو چکی ہے۔ اسی سلسلے میں حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے
أَطِيبُ مَا أَكَلَ الرَّجُلُ مِنْ كَسْبِهِ پاکیزہ چیز وہ ہے۔ جو انسان اپنے ہاتھ
سے کما کر کھاتا ہے۔ یعنی جو چیز محنت کر کے حاصل کی جائے۔ وہ پاکیزہ ہے۔
انسان کی اولاد کے متعلق فرمایا وَلَا تَهْتِكُوا مَا أَنشَأَ مِنْ كَسْبِهِ یعنی اولاد بھی انسان کی کمائی کا ایک
حصہ ہے۔ لہذا ماں باپ کے لیے اولاد کی کمائی سے کھانا بالکل درست اور جائز ہے
حرام اشیاء میں سے مردار، خون اور خنزیر کے گوشت کا ذکر ہو چکا ہے اور ان
کی وضاحت بھی گزشتہ درس میں ہو چکی ہے۔ حضور نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام سے

انسان کے کسی عضو کو دوائی کے طور پر بھی استعمال کرنا درست نہیں ہے۔

انسان کا خون اگرچہ اعضا کی مانند تو نہیں ہے۔ مگر اعضا کی طرح محترم ضرور ہے لہذا اس کا استعمال بھی دوسرے اعضا کے استعمال کی طرح ناجائز ہے۔ اور عام حالات میں ایک شخص کا خون دوسرے کے جسم میں منتقل کرنا درست نہیں ہے۔ ہاں ایک اضطراری حالت ایسی ہے جس میں وقتی طور پر حرام چیز بھی جائز ہو جاتی ہے۔ اس کا ذکر آیت کے اگلے حصے میں آ رہا ہے۔ چونکہ انسانی اور حیوانی جسم و روح کا تعلق خون کے واسطے سے قائم رہتا ہے۔ اس لیے جب جسم میں خون کی مقدار اس قدر کم ہو جائے کہ جان بچانا مشکل نظر آئے تو ایسی مجبوری کی حالت میں انتقال خون کی اجازت ہوگی۔ اور وہ بھی اس مقدار تک کہ اس سے کم پر جان کو خطرہ ہو۔ بلاوجہ کئی کئی بوتل خون لگائے جانا جائز نہیں ہوگا۔ لہذا اس معاملہ میں بڑی احتیاط کی ضرورت ہے۔ انتقال خون دوائی سے بڑھ کر غوراک کی حد میں داخل نہیں ہونا چاہیے۔

خنزیر کی حرمت کا بیان بھی گزشتہ درس میں آچکا ہے۔ یہ جانور کھلی سادی امتوں میں حرام رہا ہے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے کہ عیسائیوں نے اسے بھی بھینٹ بکری کی طرح استعمال کیا حالانکہ تورات کے سفر الاحبار میں صاف موجود ہے کہ خنزیر نہ تو جگالی کمرہ ہے۔ اور نہ ہی اس کا پاؤں پھٹا ہوا ہے لہذا یہ قطعی حرام ہے۔ بے حشر استثناء میں بھی خنزیر کو حرام قرار دیا گیا ہے۔

محرمات اربعہ میں سے پہلے تین کا بیان گزشتہ درس میں ہو چکا ہے۔ اب یہاں پر چوتھے حرام کا بیان آئے گا۔ اور وہ ہے وَمَا اٰهَلْ بِہِمْ لَغَیْرِ اللّٰہِ یعنی تمہارے لیے وہ چیز بھی حرام ہے جس پر اللہ کے سوا غیر کا نام پکارا جائے۔ یعنی ایسا جانور یا کوئی دوسری چیز جسے غیر اللہ کے تقرب اور اس کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے نامزد کیا جائے ایسی چیزیں مردار سے بھی زیادہ خباثت و سریت کر جاتی ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے اس کو حرام قرار دیا ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ اَجْمَعَ الْعُلَمَاءُ اس بات پر علماء کا اتفاق ہے کہ لَوْ قَصَدَ

غیر اللہ کے نام پر

بِذَنبِهَا التَّقَرُّبَ إِلَى غَيْرِ اللَّهِ جو شخص غیر اللہ کے تقرب اور خوشنودی کے لیے جانور ذبح کرے صَارَ مُتَقَدِّدًا وہ مرتد ہو جائے گا۔ اور اس کا مذبح بھی مردار کی طرح حرام ہوگا۔ مثلاً کسی بہت لات، عمرانی کے نام پر ذبح کیا ہے یا فرشتوں جنوں، انبیاء، بزرگ، پیر، فقیر کے نام پر ذبح کیا ہے، سب حرام ہوگا۔ اس میں مجوی بھی شامل ہیں کیونکہ وہ بھی آگ کے نام پر تقرب حاصل کرتے ہیں۔

ذبح کے بارے میں مسلم شریف کی روایت موجود ہے۔ لَعَنَ اللَّهُ مَنْ ذَبَحَ لِغَيْرِ اللَّهِ جو اللہ کے سوا کسی غیر کے نام پر ذبح کرنا ہے۔ اس پر اللہ کی لعنت ہے۔ فقہائے کرام نے یہ مسئلہ بیان کیا ہے کہ اگر کوئی شخص حاکم کی آمد پر اس کی تعظیم کے طور پر جانور ذبح کرے گا، تو دَمًا أَهْلًا بِہِ لَغَيْرِ اللَّهِ میں داخل ہو کر حرام ہو جائے گا۔ ایسی صورت میں اگر بوقت ذبح بسم اللہ اللہ اکبر بھی کہ دیا، تو وہ حلال نہیں ہوگا، بلکہ مردار ہی ہے گا، وجہ یہی ہے کہ اس نے ایک جاندار کی جان حاکم کے تقرب اور اس کی خوشنودی کے لیے لی ہے۔ حالانکہ جان کا لینا صرف اللہ ہی کے نام پر ہو سکتا ہے۔ اور اگر جانور ذبح کرنے سے مقصود مہمان کی ضیافت کرنا ہو، تو پھر یہ جائز ہے۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ تقرب اور ضیافت میں تفریق کرنا آسان ہے۔ کسی شخص سے کہا جائے کہ بھائی یہ جانور منت ذبح کرو بلکہ اس کی بجائے اتنی ہی مقدار میں گوشت لے کر بچا لو اور مہمان کی مہمان نوازی کر لو۔ اور اگر وہ شخص مان جائے تو یہ ضیافت ہوگی۔ اور اگر وہ کہے کہ میں تو جانور ہی ذبح کروں گا، تو اس کی نیت ضیافت کی نہ ہوگی بلکہ تقرب کی ہوگی اور یہی چیز حرام ہے مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ذبح کرتے وقت جو بسم اللہ اللہ اکبر کہا جاتا ہے اس میں اللہ اکبر کی بالکل دہی حیثیت ہے، جو نماز شروع کرتے وقت اللہ اکبر کی ہے اگر نماز میں ریاکاری کا مادہ ہوگا، تو وہ نماز حرام ہوگی، اسی طرح بوقت ذبح اگر نیت تقرب غیر اللہ کی ہوگی، تو وہ ذبح بھی مردار کی طرح حرام ہوگا۔ ہاں اگر نفل نماز تقرب الی اللہ کے لیے ادا کرے اور اس کا ثواب کسی دوسرے کے لیے ادا کرے

کرے تو جائز ہے۔ اسی طرح اگر کوئی شخص ذبح تقرب الی اللہ کے لیے کرے، اور اس کا ثواب کسی دوسرے کو پہنچا دے، تو اس کی ممانعت نہیں۔

مَا أَهْلَ بِهِ لغيرِ اللَّهِ کا مسئلہ بڑا اہم مسئلہ ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ اور مولانا نانوتویؒ نے اس کو وضاحت سے بیان فرمایا ہے اس مسئلہ میں مولانا نانوتویؒ کا ایک مکتوب بھی موجود ہے۔ فرماتے ہیں کہ ذبح کے حلال ہونے کی علت وہ نیت ہے، جو خالص اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے ہو، اور اس کے حرام ہونے کی علت وہ نیت ہے، جو غیر اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ زمانہ جاہلیت کے مشرک نیت سے بھی غیر اللہ کے نام پر ذبح کرتے تھے اور ذبح کرتے وقت نام بھی غیر اللہ کا لیتے تھے۔ مومنوں کا شیوہ یہ ہے کہ وہ نیت سے بھی تقرب الہی چاہتے ہیں اور بوقت ذبح بھی اللہ اکبر کہتے ہیں۔ البتہ اس دور میں مبتدعین کا ایک تیسرا گروہ پیدا ہوا ہے۔ جو ذبح کرتے وقت تو اللہ ہی کا نام لیتے ہیں مگر نیت غیر اللہ کی خوشنودی کی ہوتی ہے۔ یہ شرک اور نفاق ہے۔ دانا صاحبؒ کی نیاز کے طور پر ذبح کیے گئے جانور پر اگر اللہ اکبر بھی کہ دیا جائے گا، تو وہ حلال نہیں ہوگا کیونکہ یہاں پر نیت میں فسور ہے یہ تو بالکل ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص خنزیر کو بسم اللہ اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، یا یہی عمل کتے پر دہرائے، تو وہ حرام ہی رہیگا۔ ہاں کوئی شخص غیر اللہ کی نیاز سے توبہ کرے، اور پھر اللہ اکبر کہہ کر ذبح کرے، تو جانور حلال ہوگا۔ کیونکہ عمل کا دار و مدار نیت پر ہوتا ہے بعض لوگ کہتے ہیں کہ اہل غیر اللہ کا مطلب یہ ہے کہ بوقت ذبح غیر اللہ کا نام لیا جائے، تو وہ چیز حرام ہو جاتی ہے اور اگر بوقت ذبح اللہ کا نام لیا جائے تو ذبح حلال ہے۔ یہ غلطی ہے۔ اہلال کا معنی آواز کو بلند کرنا یا شہرت دینا ہے اسی لیے چاند نظر آ جانے کو اہلال کہتے ہیں۔

اُھلِ کافِرِمْ

اب اگر کسی جانور یا چیز کے متعلق شہرت دی جائے کہ یہ چیز پیران پیر یا فرشتوں یا پیغمبر کی نیاز ہے۔ تو یہ اُھلِ غیر اللہ میں داخل ہو کر شرک کا ارتکاب ہوا اور چیز حرام ہو گئی۔

تابعین کے زمانہ میں ایک مسئلہ پیدا ہوا تھا، جسے اہم قرطبیؒ نے نقل کیا ہے مسئلہ یہ تھا کہ بچوں نے کھیل کھیل میں گڑیا اور گڈے کی شادی طے کی اور اس خوشی میں اونٹ ذبح کیا، تو اس اونٹ کا کیا حکم ہے، وہ جائز ہو گا یا ناجائز۔ امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ یہ ناجائز ہے۔ کیونکہ یہ اونٹ گڑیا گڈے کے مجھے کے نام پر ذبح کیا گیا ہے جو بت کی مثال ہے۔ ہاں اگر یہی ذبح کسی مرد و عورت کے اصل نکاح کے لیے ہوتا تو درست تھا۔

اسی طرح حضرت علی کرم اللہ وجہہ کے دور میں طعم متبایین کا مسئلہ پیدا ہوا۔ دوسرا دل میں اس بات پر مقابلہ ہو گیا۔ کہ اُن میں سے کون مہمان نواز ہے۔ ایک سردار نے مہمانوں کے لیے دس اونٹ ذبح کیے تو دوسرے نے بیس کر دیے پہلے نے سو اونٹ ذبح کیے تو دوسرے نے چار سو ذبح کر دیے۔ اسی طرح ایک سردار نے مہمان نوازی کے لیے دس من آٹا گوندھا تو دوسرے نے بیس من گوندھ دیا۔ پھر پہلے نے حوض بھر آٹا گوندھا تو دوسرے نے اتنی زیادہ مقدار میں آٹا گوندھا کہ جب اُس میں گھوڑا دوڑایا گیا تو وہ پھنس گیا۔ حضرت علیؑ کی خدمت میں مسئلہ پیش ہوا کہ آیا اس قسم کا کھانا جائز ہے یا نہیں، تو انہوں نے فرمایا کہ یہ سب کچھ ریاکاری کی بنا پر ہوا ہے۔ لہذا ایسا کھانا حرام ہے اس میں اللہ تعالیٰ کا تقرب مطلوب نہیں بلکہ غیر اللہ کی خوشنودی مقصود ہے۔

بعض لوگ مکان بناتے وقت اس کی بنیادوں میں جانور کا خون ڈالتے ہیں اس ذبح سے مقصد یہ ہوتا ہے کہ جنات کے شر سے محفوظ رہیں۔ یہ بھی شرک ہے۔ ہاں اگر اللہ تعالیٰ کی نیابت کے طور پر جانور ذبح کر کے فقر کو کھلایا جائے تو درست ہے۔

چار محرمات کو بیان فرمایا کہ یہ سب انسان کے لیے حرام ہیں البتہ — ایک صورت ایسی بھی ہے کہ یہ حرام مباح ہو جاتے ہیں فَمِنْ اضْطُرٍّ غَيْرِ بَاغٍ وَلَا عَادٍ فَلَا اِثْمَ عَلَيْهِ ط جو کوئی اضطراری حالت میں ہو مثلاً بھوک سے مر رہا ہے اور صرف محرمات میں سے کوئی چیز میسر ہے۔ تو ایسی صورت میں جان

بچانے کی خاطر ان اشیاء کا کھانا درست ہوگا۔ فرمایا یہ اس حد تک ہی جائز ہے۔ کہ نہ تو بغاوت پر آمادہ آئیے اور نہ ہی ضرورت سے زیادہ استعمال کرنے والا ہے۔ اہم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ باغ سے مراد یہ ہے کہ اضطراری حالت میں مباح چیز سے نہ لذت طلب کرے اور نہ اس کو حلال سمجھے۔ اور تعدی سے مراد یہ ہے کہ ایسی کوئی چیز کم از کم مقدار میں استعمال کرے جس سے اس کی جھوک دُور ہو سکتی ہو۔ اور ضرورت سے زیادہ کھائے گا تو عادی میں داخل ہو جائے گا۔ بعض دوسرے آئمہ فرماتے ہیں کہ باغ سے مراد بغاوت کرنے والا ہے اور عادی سے مراد معصیت کرنے والا ہے مثلاً ایک شخص چوری کی نیت سے جا رہا ہے اور اس پر اضطراری حالت وارد ہو گئی تو ایسے شخص کے لیے مباح نہیں ہوگا۔ وہ گناہ میں مبتلا ہے۔ اور ایسی حالت میں اگر اس کی موت بھی واقع ہو جائے تو کوئی پر وا نہیں۔ بہر حال فقہائے کرام نے فرمایا ہے کہ اضطرار تین حالتوں میں ثابت ہوتا ہے۔ اگر ان میں سے کوئی حالت وارو ہو جائے، تو حرام کا کھانا مباح ہو جائیگا، اور جان بچانے کی حد تک جائز ہوگا۔ شدید جھوک لگ رہی ہو یا سخت بیماری ہو اور حرام کردہ چیز استعمال کرنے کے علاوہ کوئی اور صورت باقی نہ ہو۔ تیسری حالت اضطرار یہ ہے کہ کوئی غالب مظلوم کو ایسی چیز کھانے پر مجبور کر دے، اور عدم تعمیل کی صورت میں جان کا خطرہ ہو، تو ایسی حالت میں بھی حرام چیز مباح ہوگی۔ فرمایا مجبوری کی حالت میں حرام کو استعمال کرنے پر کوئی مؤاخذہ نہیں **إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ**۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے وہ کسی مخلوق پر اُس کی طاقت سے زیادہ بوجھ نہیں ڈالتا۔

اس آیت میں صرف چار چیزوں کو حرام قرار دیا گیا ہے یعنی مردار، خون، خنزیر کا گوشت اور غیر اللہ کے نام پر ناسزدگی ہوئی چیز، حالانکہ ان کے علاوہ بھی بہت سے جانور مثلاً کتا، بلی، رتھچھ، بندر، لنگور، اگدھا، کوا، چھپکلی، کیر، طے، مکور، طے وغیرہ حرام ہیں۔ شاہ رفیع الدینؒ فرماتے ہیں کہ صرف چار چیزوں کی حرمت بیان کرنے کا مطلب یہ نہیں ہے کہ ان چار کے علاوہ باقی تمام چیزیں حلال ہیں۔ بلکہ بات یہ ہے کہ یہاں

ایک شبہ اور اس کا ازالہ

صرف ان چیزوں کا نام لیا گیا ہے، جو عام طور پر استعمال میں آتی ہیں۔ اور مقصود یہ ہے کہ ان چیزوں کو کبھی حلال نہ جانا، یہ قطعی حرام ہیں۔ البتہ اس کے علاوہ بہت سی دوسری چیزیں بھی حرام ہیں جن کا ذکر قرآن پاک کے دو سکے مقامات پر آتا ہے۔ حدیث پاک میں بھی بعض اشیاء کی حرمت بیان ہوئی ہے۔ لہذا ان چار کے علاوہ باقی سب چیزوں کو حلال سمجھنا درست نہیں۔

صرف چار چیزوں کی حرمت بیان کرنے کی ایک دوسری وجہ یہ ہے کہ مشرک لوگ چار حلال چیزوں کو حرام سمجھتے تھے۔ ان کا ذکر سورۃ مائدہ میں موجود ہے۔ کہ وہ لوگ بکھرہ، سائبہ، وحیدہ اور حام کو حرام سمجھتے تھے، مگر اللہ نے فرمایا کہ ہم نے تو ان چیزوں کو حرام نہیں کیا، تم نے ان کی حرمت کس شریعت سے نکالی ہے۔ ان چار حلال چیزوں کے مقابلہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہ چار چیزیں قطعی حرام ہیں۔

البقرة ۲

آیت ۱۶۲ تا ۱۶۱

سَيَقُولُ ۲

درس شصت و ہشت (۶۸)

إِنَّ الَّذِينَ يَكْتُمُونَ مَا أَنْزَلَ اللَّهُ مِنَ الْكِتَابِ وَيَشْتُرُونَ بِهِ ثَمَنًا قَلِيلًا أُولَٰئِكَ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّارَ وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ ۖ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۶۲﴾ أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اشْتَرُوا الضَّلَالَةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابُ بِالْمَغْفِرَةِ ۖ فَمَا أَصْبَرَهُمْ عَلَى النَّارِ ﴿۱۶۳﴾ ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ طَوَّلَ الَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ ﴿۱۶۴﴾

ترجمہ

ترجمہ: بے شک وہ لوگ جو اس چیز کو چھپاتے ہیں، جس کو اللہ نے کتاب میں نازل کیا ہے، اور اس کے بدلے تھوڑی قیمت خریدتے ہیں۔ یہی لوگ ہیں جو نہیں کھاتے (بھرتے) اپنے پیٹوں میں مگر آگ۔ اور اللہ تعالیٰ اُن کے ساتھ قیامت کے دن بات نہیں کرے گا۔ اور نہ اُن کو پاک کرے گا۔ اور اُن کے لیے دردناک عذاب ہوگا ﴿۱۶۲﴾ یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی کو اور مغفرت کے بدلے عذاب کو خریدا ہے۔ یہ لوگ دوزخ کی آگ پر کس قدر صبر کرنے لگے ہیں ﴿۱۶۳﴾ یہ اس وجہ سے کہ بیشک اللہ تعالیٰ نے کتاب کو حق کے ساتھ نازل کیا ہے۔ اور بیشک وہ لوگ جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا، البتہ وہ حند میں دور جا پڑے ہیں۔ ﴿۱۶۴﴾

اس سے پہلے اللہ تعالیٰ نے طیبات اور محرمات کا قانون بیان کیا ہے مشرکین کا رد کیا ہے۔ اور توحید کے دلائل بیان فرمائے ہیں۔ مزید برآں اللہ تعالیٰ نے اپنے مقرر کردہ قانون کی پابندی کا حکم دیا ہے اس سے پہلے

گزشتہ پیرچہ

کے سپرد فرمائی۔ لَبَّيْكَ لِلَّهِ مَا نَزَّلَ إِلَيْهِمْ فِي سَعْيٍ مِمَّنْ يَفْهَمُونَ مَا يَكُونُ لَهُمْ يَوْمَ الْقِيَامَةِ بِأَعْيُنِهِمْ فَلَا يُفْهَمُونَ إِلَّا بِأَعْيُنِنَا وَسَيَمْنَنَ اللَّهُ لِلَّذِينَ يَتَّقُونَ فِي هَذِهِ الْأُمَّةِ الْأُمَّةِ الْغَافِلِينَ ۖ

شاہ رفیع الدینؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ پہلے پائے میں کتمان حق کا جو بیان ہے۔ اُس سے مراد یہ ہے کہ اہل کتاب حضور نبی علیہ السلام کی بعثت کے متعلق جو پیشین گوئیاں موجود تھیں انہیں چھپاتے تھے۔ اور اس مقام پر کتمان حق کا مطلب یہ ہے کہ یہ لوگ اللہ تعالیٰ کے احکام بابت حلال و حرام وغیرہ کو چھپاتے تھے۔ کتمان حق بلاشبہ کفر ہے۔ اسی لیے مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ ہر مسلمان مرد و زن کے لیے تعلیم جبری ہونی چاہیے، تاکہ وہ حقوق و فرائض اور حلال و حرام کو پہچان سکیں۔ اسی لیے فقہائے کرام نے فرمایا ہے۔ کہ ضروریات دین کا یکھنا فرض کا درجہ رکھتا ہے۔ اگر مسلمان اس فرض کو پورا نہیں کریں گے، تو جہالت کی بنا پر کتمان کے مرتکب سمجھے جائیں گے۔

علم قرآن کی
اشاعت

حضرت مولانا سندھیؒ فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کا علم ہونے کے باوجود دوسرے لوگوں تک نہ پہنچانا ایسا ہے۔ جیسے کسی جنگل بیابان میں پانی کا چشمہ یا کنواں ہو، اور کوئی شخص اس پر زبردستی قابض ہو جائے۔ لوگ پیاس بجھانے کے لیے چشمے پر جاتے ہیں مگر وہ قابض شخص انہیں پانی نہیں پینے دیتا۔ جس کی وجہ سے وہ ہلاک ہو جاتے ہیں، تو ایسی صورت میں کتنا بڑا مجرم سمجھا جائے گا۔ اسی طرح قرآن پاک کا عالم اگر دوسرے لوگوں کی آبیاری نہیں کرتا، تو وہ غاصب ہے۔

حضرت عبداللہ بن عمرؓ کے پاس کچھ لوگوں نے شکایت کی کہ ہم فلاں بستی میں گئے، وہاں پر پانی موجود تھا، مگر اُن لوگوں نے ہمیں پینے کے لیے پانی نہ دیا، جس کی وجہ سے ہمیں بڑی تکلیف اٹھانا پڑی۔ تو حضور علیہ السلام کے صحابی نے فرمایا هَلَّا وَضَعْتُمْ فِيهِمُ السِّيفَ تَمْنَعُ مِيَانُكُمْ تَلَوْرِي كَيْفَ لَا تَنْكَلُ لَيْسَ۔ یہ تو بڑا جرم ہے۔ کہ لوگ پانی کے بغیر مر رہے ہیں اور کوئی شخص پانی سے روکتا ہے۔

الغرضیکہ! قرآن پاک کا علم دوسروں تک نہ پہنچانا بہت بڑا جرم ہے۔

آج دنیا قرآنی تعلیم کے بغیر ہلاک ہو رہی ہے۔ مگر ہمارے علماء اسے عام کرنے کی بجائے اسے چھپا رہے ہیں اور اس کے بدلے میں بدعتا جاری کر رہے ہیں۔ مسائل سے پیسے لے کر غلط طوطے جاری کر رہے ہیں، کہیں نذرانہ اور شکرانہ وصول کیا جا رہا ہے کہیں رسومات باطلہ کو رواج دیا جا رہا ہے۔ مردوں کو بخشوانے کی فیس وصول کی جاتی ہے۔ تبرکات کے نام پر ٹوٹا جا رہا ہے۔ کہیں ہشتی دروازہ بنا دیا ہے کہ یہاں سے گزرنے والا سیدھا جنت میں جایگا۔ کیسے متبور پرستی ہو رہی ہے۔ چمڑے چمڑے چمڑے جاتے اور وصول کیے جاتے ہیں۔ کہیں گیارہویں منائی جا رہی ہے، کہیں عرس ہو رہا ہے اور کہیں میلاد منایا جا رہا ہے۔ کہیں تیسرے اور دسویں کا ختم اور کہیں چالیسویں کا ختم ہے۔ لوٹنے کا ایک لامتناہی سلسلہ ہے جو جاری ہے دین کے ابتدائی اصول کہاں کھو گئے۔ لوگوں کو اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کا درس کون دے گا، مقام رسالت کون بیان کرے گا، احلال و حرام کی تمیز کون بتائے گا، علماء نے ان بنیادی چیزوں کو چھپا لیا ہے اور خرافات کی تعلیم ہو رہی ہے۔ یہ کھانا حق نہیں کہہ اور کیا ہے۔

اسی لیے فرمایا کہ جو لوگ اللہ تعالیٰ کی نازل کردہ چیزوں کو چھپاتے ہیں۔ اور اس سے حقیر مفاد حاصل کرتے ہیں ان کی حالت یہ ہے کہ مَا يَأْكُلُونَ فِي بُطُونِهِمْ إِلَّا النَّامُ وَهُ لُوكُ اپنے پیٹوں میں آگ کے سوا کچھ نہیں بھرتے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے۔ کہ جو شخص سونے چاندی کے برتن میں پانی پیتا ہے۔ وہ اپنے پیٹ میں دوزخ کی آگ ڈال رہا ہے۔ مسلم شریف کے الفاظ ہیں۔ انما یحب جن فی بطنہ نار جہنم۔ اسی طرح یتیموں کا مال ناحق کھانے والوں کے متعلق فرمایا کہ وہ بھی اپنے پیٹوں میں جہنم کی آگ ڈال رہے ہیں۔ لہذا باطل رسوم کے ذریعہ لوگوں کا مال کھانا، شرک اور بدعات کا اجر یہ سب پیٹ میں آگ بھرنے والی بات ہے۔

فرمایا ایسے لوگوں پر قیامت کے دن اللہ تعالیٰ سخت ناراض ہونگے

ان کی طرف مہربانی کے ساتھ توجہ کرنا تو درکنار **وَلَا يُكَلِّمُهُمُ اللَّهُ يَوْمَ الْقِيَمَةِ** اللہ تعالیٰ ان کے ساتھ کلام کرنا بھی پسند نہیں کریں گے، بلکہ ان کی طرف غیظ و غضب کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ **وَلَا يُزَكِّيهِمُ اللَّهُ** ان کا تزکیہ بھی نہیں کریں گے۔ اہم تر مذہبی فرماتے ہیں کہ ان الموحدين لا يخلدن فيها خذ اكي وحدانيت پر ایمان رکھنے والے دوزخ میں ہمیشہ نہیں رہیں گے۔ گنہگار ہونے کی صورت میں دوزخ میں جائیں گے مگر تزکیہ کے لیے۔ جب اپنے گناہوں کی سزا بھگت لیں گے۔ تو اللہ تعالیٰ ان کو پاک کر دیں گے اور وہ دوزخ سے نکال لیے جائیں گے مگر یہاں یہ کتنا حق کرنے والوں کے متعلق فرمایا کہ اللہ تعالیٰ انہیں کبھی پاک نہیں کرے گا، بلکہ وہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے دوزخ میں ہیں گے **وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ** اور وہاں ان کے لیے دردناک عذاب ہوگا۔

فرمایا **أُولَٰئِكَ الَّذِينَ اسْتَرَوْا الصَّلَاةَ بِالْهُدَىٰ وَالْعَذَابُ بِالْمَعْصِيَةِ** یہی لوگ ہیں جنہوں نے ہدایت کے بدلے گمراہی اور مغفرت کے بدلے عذاب خرید لیا ہے۔ اگر یہ لوگ حق کو چھپانے کی بجائے اُسے ظاہر کرتے۔ خود بھی حق پر عمل کرتے اور ان کی دیکھا دیکھی دوسرے بھی عمل پیرا ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ کی رحمت ان کے شامل حال ہوتی، ان کو گناہوں کی معافی ملتی اور یہ قیامت کے دن سرخرو ہوتے۔ مگر یہ لوگ تو خود دوزخ کو اختیار کر رہے ہیں۔ **فَمَا أَصْبَرُ** علی التکذیب دوزخ کی آگ پر کس قدر صبر کرنے والے ہیں۔ ان کا بڑا حوصلہ ہے جو دوزخ میں داخل ہوں گے۔

ذَٰلِكَ بِأَنَّ اللَّهَ نَزَّلَ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ یہ اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے کتاب حق کے ساتھ نازل فرمائی ہے مگر ان لوگوں نے اُسے چھپا لیا ہے۔ حق کو ظاہر نہیں ہونے دیا۔ **وَالَّذِينَ اخْتَلَفُوا فِي الْكِتَابِ** اور جنہوں نے کتاب میں اختلاف کیا۔ یعنی اپنی مرضی کا مطلب بیان کیا، جیسا کہ یہودیوں کا شیوہ ہے کہ وہ مطلب بھی غلط بیان کرتے ہیں اور تشریح بھی غلط کرتے

نہایت کاٹو

ہیں۔ تو ایسے لوگوں کے متعلق فرمایا لَفِي شِقَاقٍ بَعِيدٍ وہ ضد میں دور جا پڑے ہیں
 ایسے لوگوں کے راہِ راست پر آنے کی کوئی توقع باقی نہیں رہی اور سزا کے
 مستحق ہیں۔ یہ حکم تاکیداً دوبارہ فرمایا۔ اس کے قوانین آگے بھی آئیں گے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبُقَرَةُ ۲

درس شخصیت و نہ (۶۹)

آیت ۱۷۷

لَيْسَ الْبِرَّ أَنْ تُولُوا وَجُوهَكُمْ قَبْلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ
وَلَكِنَّ الْبِرَّ مَنْ آمَنَ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ وَالْمَلَائِكَةِ وَالْكِتَابِ
وَالنَّبِيِّينَ وَآتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ ذَوِي الْقُرْبَىٰ وَالْيَتَامَىٰ
وَالْمَسْكِينِ وَابْنَ السَّبِيلِ وَالسَّائِلِينَ وَفِي الرِّقَابِ وَأَقَامَ
الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ وَالْمُوفُونَ بِعَهْدِهِمْ إِذَا عَاهَدُوا
وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرَّاءِ وَحِينَ الْبَأْسِ أُولَئِكَ
الَّذِينَ صَدَقُوا وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ ﴿۱۷۷﴾

ترجمہ: جو نیکی یہ نہیں ہے کہ تم اپنے چہروں کو مشرق اور مغرب کی طرف پھيرو۔
بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو ایمان لایا اللہ پر، اور قیامت کے دن پر اللہ کے
فرشتوں پر اور سب کتابوں پر اور اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں پر۔ اور دیا اُس نے مال
اُس کی محبت پر قربت دلوں کو، یتیموں کو، مسکینوں کو، اور مسافروں کو اور محتاجوں کو
اور گردنوں کے چھڑانے میں۔ اور اس نے نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کرنا اور اپنے
وعدوں کو پورا کرنے والے ہیں جب کہ عہد کرتے ہیں۔ اور سختی اور تکلیف میں صبر کرنے
والے ہیں اور لڑائی کے وقت بھی۔ یہی لوگ سچے ہیں اور یہی لوگ متقی ہیں ﴿۱۷۷﴾

بنی اسرائیل کی خرابیاں بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم
علیہ السلام کا ذکر کیا تھا۔ اور ساتھ خانہ کعبہ کی تعمیر کا بیان تھا۔ اور اس کو قبلہ مقرر کیے جانے
کی وجہ بیان فرمائی تھی۔ اس پر اہل کتاب کے اعتراض کا بھی ذکر ہوا۔ اس کے
بعد اللہ تعالیٰ نے ملت ابراہیمی کے اہم ترین اصول بیان فرمائے جن پر ہر شخص کا
کاربند ہونا ضروری ہے۔ ان میں اللہ تعالیٰ کا ذکر، شکر، صبر اور تعظیم شعار اللہ

گذشتہ
پیوستہ

ان میں سب سے اہم مسئلہ ایمانیات کا ہے۔ جب تک عقیدہ درست نہیں ہوگا، کوئی عمل مقبول نہیں۔ یہود و نصاریٰ اور عرب کے مشرکین صحیح اعتقاد سے محروم ہیں اُن کا عقیدہ مشرکانہ ہونے کی بنا پر باطل ہے۔ لہذا یہ سب نیکی سے محروم ہیں، مگر قبلہ کے مسئلہ پر جھگڑا کرتے ہیں۔

ایمان باللہ

تو فرمایا نیکی یہ ہے کہ مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ یعنی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اُس کی ذات اور اُسکی صفات پر ایمان لانا نیکی ہے۔ جس طرح اللہ تعالیٰ کی ذات پر ایمان ضروری ہے اسی طرح اُسکی صفات کو ماننا بھی لازمی ہے۔ اللہ تعالیٰ کی صفات کا انکار بھی اُسی طرح کفر ہے جس طرح اُس کی ذات کا انکار دہریت ہے۔ مثلاً مقدر کرنا اللہ تعالیٰ کی صفت ہے۔ لہذا تقدیر پر ایمان لانا ضروری ہوا۔ اس کے بغیر انسان مومن نہیں ہو سکتا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ کوئی شخص احد پہاڑ کے برابر اللہ تعالیٰ کی راہ میں سونا خرچ کرے مگر تقدیر پر ایمان نہیں لاتا تو اس کی اتنی بڑی خلیت بھی مقبول نہیں۔

ایمان بالآخرت

ایمان باللہ کے بعد فرمایا، نیکی اس شخص کی ہے جو ایمان لایا وَالْيَوْمِ الْآخِرِ آخرت کے دن پر۔ قیامت کے دن پر ایمان لانا جزا ایمان ہے۔ اس کے بغیر انسان دہریہ یا کافر ہوگا۔ اہم بریبادی فرماتے ہیں کہ ایمان بالآخرت میں وہ تمام چیزیں آجاتی ہیں، جن کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ یا جنہیں حضور نبی کریم رُفُوتِ الرَّحْمِیمِ صلی اللہ علیہ وسلم نے بیان فرمایا ہے۔ موت کے بعد دوبارہ جی اٹھنا، حساب کتاب کا معقد ہونا، نیکی بدی کا امتیاز، پلصراط سے گزرنا، دوزخ، جنت وغیرہ یہ سب چیزیں ایمان بالآخرت میں داخل ہیں۔ لہذا نیکی اُس شخص کی ہے جو ان سب چیزوں پر ایمان لایا۔

ایمان بالملائکہ

ایمان بالملائکہ یعنی فرشتوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ وَالْعَلٰیکُمْ یہ اللہ تعالیٰ کی نورانی مخلوق ہے جسے اللہ جل شانہ نے زمین و آسمان اور اس کائنات کی تخلیق سے لاکھوں سال پہلے پیدا فرمایا۔ اور یہ بھی نوح النبی کی مصلحت کی خاطر اہتمام فرمایا۔ فرشتوں کی آگے دو قیسیں ہیں۔

پہلی قسم ملا اعلیٰ والے فرشتوں کی ہے، جو حظیرۃ القدس میں ہیں۔ اور دوسرے ملائکہ سفل والے ہیں، جو ملا اعلیٰ والوں کے معاون ہیں یہ تمام فرشتے اللہ تعالیٰ کا حکم بجا لانے پر مستعد رہتے ہیں اور کائنات تک فیضانِ ہنپچا نے کا ذریعہ ہوتے ہیں چنانچہ ایمان بالملائکہ بھی ایمان کا ایک حصہ ہے۔

ایمان بالکتاب

ایمان کے چوتھے جزو کے طور پر فرمایا وَالْكِتَابَ یعنی کتاب پر ایمان لانا بھی مکمل ایمان کا ایک حصہ ہے۔ یہاں کتاب سے مراد منس کتاب ہے اور مطلب یہ ہوگا کہ اللہ تعالیٰ نے جتنی بھی کتابیں نازل فرمائی ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے أَهْنَتْ لَكُمْ أَنْزَلَ اللَّهُ مِنْ كِتَابٍ یعنی اللہ تعالیٰ نے فرع انسانی کی ہدایت اور رہنمائی کے لیے جو کتاب بھی اتاری ہے۔ اُس پر میرا ایمان ہے۔ کہ وہ برحق ہے۔ اور پھر کُتُبِ سماویہ کے سلسلہ کی آخری کتاب قرآن حکیم پر تفصیلی ایمان لانا ضروری ہے۔ پہلی کتابوں پر صرف ایمان لانا ضروری ہے، ان پر عمل کرنا ضروری نہیں کیونکہ ان میں سے بعض احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ البتہ آخری کتاب قرآن پاک پر ایمان بھی ضروری ہے اور اس پر عمل کرنا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے احکام قیامت تک کے لیے نافذ العمل ہیں۔ وَالْتَّبِعِينَ اور اللہ تعالیٰ کے سب نبیوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔

ایمان بالانبیاء

دیگر اجزائے ایمان کی طرح انبیاء علیہم السلام پر ایمان لانا بھی ضروری ہے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک جتنے بھی رسول اور نبی مبعوث ہوئے ہیں، سب پر ایمان لانا ضروری ہے اس لحاظ سے لَا تَفْشِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْ رُسُلِهِ ہم کسی رسول میں فرق نہیں کرتے۔

الغرض ایمان کی تمام جزئیات کا زبان سے اقرار کرنا اور دل سے تصدیق کرنا لازم ہے۔ ان میں سے کسی چیز کا انکار یا کسی چیز میں شک کرنا گمراہی کے مترادف ہے اس کے بغیر نیکی کے باقی اجزاء کا بیان ہے، جن کا تعلق تہذیب نفس سے ہے یا مال کے ساتھ ہے یا انسان کے بدن سے ہے۔

اتفاق فی میل

فرمایا مال کے لحاظ سے نیکی یہ ہے کہ وَأَتَى الْمَالَ عَلَى حُبِّهِ کوئی شخص

مال کے ساتھ محبت ہونے کے باوجود اُسے خرچ کرے۔ انسان کی مال کے ساتھ محبت ایک فطری امر ہے۔ دوسرے مقام پر خود قرآن پاک نے بیان کیا اِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ انسان مال کی محبت میں سخت ہوتا ہے مگر اس کے باوجود اگر مال صرف کرتا ہے۔ تو یہ نیکی کا کام ہے۔ اس سے انسانی ہمدردی اور اجتماعیت کا سبق ملتا ہے علیٰ حُبِّہ کا دوسرا مطلب یہ بھی ہے کہ انسان اللہ تعالیٰ کے ساتھ محبت کی بنا پر اس کی رضا کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ تو یہ بہت بڑی نیکی ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ مال کو کس جگہ خرچ کرنا ہے۔ تو فرمایا ذَوِی الْقُرْبٰی اپنے قرابت داروں پر خرچ کرنا ہے۔ اِنْفَاقٌ فِیْ سَبِيلِ اللّٰہِ کی یہ اولین مدہ ہے۔ اپنے عزیزوں پر خرچ کرنے پر دوسرا اجر ملتا ہے۔ ایک اجر صلہ رحمی کا حاصل ہوتا ہے اور دوسرا صدقہ کا۔ قرابت دار اگرچہ دشمن ہی کیوں نہ ہو۔ اگر وہ مستحق ہے۔ تو اس پر خرچ کرنا باعث اجر و ثواب ہے۔

خرچ کی دوسری مد کے متعلق فرمایا وَالْيَتٰمٰی وَالْمَسٰكِيْنَ يَتِيْمُوْنَ اور مسکینوں کی حاجت برابری بھی نیکی ہے۔ نابالغی کی حالت میں ہو اور باپ فوت ہو گیا ہے۔ کھانے والا کوئی نہیں رہا۔ یتیم ہو گیا ہے اس کی سرپرستی ضروری ہے۔ اس پر مال خرچ کرنا چاہیے اور مسکین وہ ہے جو محنت مزدوری کرتا ہے۔ مگر کوٹشٹ کے باوجود اس کی بنیادی ضروریات پوری نہیں ہوتیں، وہ بھی مستحق ہے ایسے شخص کی مالی اعانت یقیناً نیکی کا کام ہے۔ فرمایا وَابْنُ السَّبِيلِ اور وہ مسافر بھی امداد کے مستحق ہیں جو دوران سفر محتاج ہو جائیں، زاد روہ ختم ہو گیا ہے۔ یا چوری ہو گئی ہے یا کسی تکلیف میں مبتلا ہو گیا ہے۔ تو ایسے شخص پر خرچ کرنا بھی نیکی ہے۔ خرچ کرنے والا ثواب کا مستحق ہو گا۔ فرمایا وَالسَّائِلِیْنَ محتاج بھی اعانت کے مستحق ہیں۔ اُن پر مال خرچ کرنا بھی نیکی کا کام ہے۔ سائل کے لفظی معنی مانگنے والے کے ہیں۔ مگر مراد محتاج ہیں۔ کیونکہ سوال برائے سوال درست نہیں ہے۔ جب تک کہ سائل

واقعی مستحق نہ ہو۔ بلا ضرورت سوال کرنے سے منع فرمایا گیا ہے۔ اور پتہ دارانہ گزری کو حرام ٹھہرایا گیا ہے۔ شرعی سائل وہ ہے جو ہر لحاظ سے محتاج ہو۔ اور اس کیلئے سوال کرنے کے بغیر کوئی چارہ کار باقی نہ رہے۔ ایسے شخص کو سوال کرنا جائز ہوگا، اور اس سوال کو پورا کرنا نیکی کا کام ہوگا۔

الفاق کی ایک اور مدنی الرقاب یعنی گردنوں کا آزاد کرنا ہے اس کا عمومی مضموم غلاموں کی آزادی ہے۔ غلام خرید کر آزاد کر دیا جائے یا کسی مکاتب کا زمرہ مکاتبت ادا کر کے اسے آزادی دلائی جائے۔ اس کی ایک اور صورت یہ بھی ہے کہ کسی مقروض کا قرض معاف کر کے یا اس کا قرض ادا کر کے اس کی گردن چھڑائی جائے۔ اس آیت پاک کے مطابق ایسا کرنا بھی نیکی ہے اور باعث اجر و ثواب ہے۔ فرمایا نیکی

صرف مشرق یا مغرب کی طرف منہ کر لینا ہی نہیں بلکہ اصل نیکی ایمان اور افاق فی سبیل اللہ ہے پھر فرمایا کہ نیکی اس شخص کی ہے جس نے وَأَقَامَ الصَّلَاةَ وَآتَى الزَّكَاةَ نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ نماز کے فیصلے انسان کا تعلق اللہ تعالیٰ کے ساتھ درست ہوتا ہے۔ اور اسی توجہ خطیرۃ القدس کی طرف ہو جاتی ہے۔ گویا فوز و فلاح کا اہم ترین ذریعہ نماز ہے، جو کہ بدنی عبادت ہے۔ اور بہت بڑی نیکی کی بات ہے۔

زکوٰۃ مالی عبادت ہے، اور یہ فرائض میں شامل ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے اِنَّ فِي الْمَالِ حَقًّا سَوَّى الزَّكَاةَ یعنی مال میں زکوٰۃ کے علاوہ بھی حق ہے۔ صرف زکوٰۃ کے ادا کر دینے سے مال کا مکمل حق ادا نہیں ہو جاتا، یہ تو فرض ہے اور صاحب نصاب ہر سال ادا کرتا ہے جب کوئی شخص نصاب کو نہیں پہنچ پاتا تو زکوٰۃ فرض نہیں رہتی۔ البتہ سال کے دیگر حقوق باقی رہتے ہیں جیسے فرمایا۔ وَفِيْ اَمْوَالِهِمْ حَقٌّ لِّلسَّائِلِ وَالْمَحْسُوْرِ یعنی اس میں سائل اور محتاج کا بھی حق ہے۔ اس میں اہل و عیال اور قربت داروں کا حق ہے۔

والدین کا حق ہے۔

اللہ تعالیٰ نے نماز اور زکوٰۃ کو اکٹھا بیان فرمایا ہے۔ ایک بنی عبادت ہے اور دوسری مالی عبادت ہے۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں بیس ۳ مرتبہ اَقِیْمُوا الصَّلَاةَ وَآتُوا الزَّكَاةَ کا اکٹھا ذکر فرمایا ہے۔ یہ اتنے اہم فرائض ہیں۔ جن کے ذریعے ایک طرف اللہ تعالیٰ سے تعلق قائم ہوتا ہے اور دوسری طرف مخلوق خدا کے ساتھ روابط بڑھتے ہیں۔ لہذا ان دونوں امور کو نیکی میں شامل فرمایا۔ کہ نیکی اُس شخص کی ہے جو نماز پڑھتا ہے اور زکوٰۃ ادا کرتا ہے۔

ایمانی عہد

نیکی کی ایک اور قسم ہے وَالْمُؤْمِنُونَ بَعَثُوا إِذَا عَاهَدُوا۔ یعنی نیکی اُن لوگوں کی ہے کہ جب وہ وعدہ کرتے ہیں تو اُسے پورا کرتے ہیں۔ ایمانی عہد حسن اخلاق اور حسن معاشرت کا ایک بنیادی اصول ہے اللہ تعالیٰ نے دوسرے مقام پر فرمایا۔ اَوْفُوا بِالْعُقُودِ اپنے عہد کو پورا کیا کرو۔ نیز تمہیں عہد کے انداز میں فرمایا اَوْفُوا بِالْعَهْدِ لوگو! اپنے وعدہ کا پاس کیا کرو۔ اِنَّ الْعَهْدَ كَانَ مَسْئُولًا قیامت کے دن اس کی باز پرس ہوگی۔ وعدہ خواہ اللہ تعالیٰ سے ہو یا اُس کی مخلوق سے، اس کی وفلازم ہے۔ جب کوئی شخص کلمہ طیبہ پڑھتا ہے اِنَّ اللہَ لَکُمُ اللّٰہُ تَوَالِّہُ تعالیٰ سے وعدہ کرتا ہے۔ کہ تیرے احکام کی تکمیل کروں گا۔ مگر پھر جب اس وعدے کو پورا نہیں کرتا تو اس میں نفاق کی علامت پائی جاتی ہے۔ اسی طرح کسی مخلوق سے وعدہ خلافی بھی نفاق کی علامت ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ نیکی اُن لوگوں کی ہے جو اپنے وعدوں کو پورا کرتے ہیں۔

مہر کی غفلت

اس کے بعد فرمایا نیکی میں وہ لوگ بھی شامل ہیں وَالصَّابِرِينَ فِي الْبَأْسَاءِ وَالضَّرِّ وَالْأُحْصٰی اور سختی اور تکلیف میں صبر کرتے ہیں۔ بَأْسَاء اور اس تکلیف کو کہتے ہیں جو انسان پر باہر سے وارد ہو۔ مثلاً کوئی مالی یا جانی نقصان ہو جائے۔ زلزلہ یا طوفان آجائے اور ضرر وہ تکلیف ہے جو انسانی جسم کے اندر پیدا ہو، جیسے بیمار ہو گیا، بھوڑا نکلا۔ جسم کے کسی حصے میں درد ہونے لگا، وغیرہ وغیرہ۔ الغرض فرمایا کہ نیکی اُن لوگوں کی ہے

جو اندرونی یا بیرونی پریشانی میں مبتلا ہو کر صبر کرتے ہیں وَحَسْبُكَ الْبَاسُ اور وہ لوگ بھی نیکی والے ہیں کہ میدانِ جہاد میں پہنچنے والی تکلیف کو بخوشی برداشت کرتے ہیں۔ حتیٰ کہ اپنی جان تک کی بازی لگاتے ہیں مگر صبر کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑتے صبر کی یہ تین مختلف صورتیں بیان کی ہیں۔ اور صبرِ علیہ بھی ہمارے دین کا بنیادی اصول ہے۔ پہلے گزر چکا ہے۔ اَسْتَعِينُوا بِالصَّبْرِ وَالصَّلَاةِ یعنی صبر اور نماز کے ساتھ امداد حاصل کرو۔ تو یہاں پر صبر کا بیان بھی آگیا۔

فرمایا جن لوگوں میں مذکورہ اوصاف پائے جائیں، نیکی الیٰ لوگوں کی ہے۔ سچے لوگ اُولَئِكَ الَّذِيْنَ صَكَ فَوَاسِي سچے لوگ ہیں۔ وہ ایمان کی دولت سے مالا مال ہیں۔ راہِ خدا میں خرچ کرتے ہیں۔ نماز قائم کرتے ہیں۔ اور زکوٰۃ ادا کرتے ہیں، ایفائے عہد ان کا شیوہ ہے اور صبر کا دامن نہیں چھوڑتے۔ فرمایا اصل نیکی کے کام تو یہ ہیں مگر یہود و نصاریٰ نے قبلہ کے مسئلہ کو جھگڑے کا سبب بنا رکھا ہے اصل نیکی کے کام کرنے والے ہی فائز المرام ہوں گے۔ ان کی نیکی کی وجہ سے ان کے بیگانے بھی اپنے بن جائیں گے۔ اور اگر ان کا عقیدہ درست نہیں ہے۔ مال کی محبت میں مبتلا ہیں۔ حلال و حرام کی تمیز سے عاری ہیں، تو وہ سچے کیسے ہو سکتے ہیں۔ رشوت اور سود خوار کیسے سچا ہو سکتا ہے۔ وہ تو ذرائع آمدن میں حلال و حرام کی تمیز نہیں کرتا۔ قربت داروں، محتاجوں اور غریبوں کے حقوق ادا نہیں کرتا۔ وہ نیکی کے راستے پر گامزن نہیں ہے۔

وَأُولَئِكَ هُمُ الْمُتَّقُونَ اور یہی لوگ متقی ہیں۔ جو کفر اور شرک سے پاک ہیں۔ معاصی سے بچتے ہیں۔ سورۃ بقرہ کی ابتدائی آیات میں گزر چکا ہے۔ کہ یہ کتاب ہُدًی لِّلْمُتَّقِينَ یعنی تقویٰ پکڑنے والوں کے لیے ہدایت ہے اور متقین وہی لوگ ہیں جو مذکورہ صفات کے حامل ہیں اور لمبے چوڑے دعویٰ کھکے چھوٹی چھوٹی باتوں پر جھگڑا نہیں شروع کرتے۔ جن لوگوں کا اخلاق اچھا ہے اور نہ وہ تنذیب نفس کے حامل ہیں مال کی محبت میں حسد بڑھائے ہیں ان کا تعلق باللہ درست نہیں ہے حقوق و فرائض ادا نہیں کھتے وہ متقی کیسے بن سکتے ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةُ ۲

درس ہفتاد (۷۰)

آیت ۱۷۸ تا ۱۷۹

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ ۖ الْحُرُّ
بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ ۖ وَالْأُنْثَىٰ بِالْأُنْثَىٰ ۚ فَمَنْ عُفِيَ لَهُ
مِنْ أَخِيهِ شَيْءٌ فَاتَّبِعْهُ ۚ بِالْمَعْرُوفِ ۚ وَأَدَاؤُهُ إِلَيْهِ بِإِحْسَانٍ ۗ
ذَٰلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ ۚ فَمَنِ اعْتَدَىٰ بَعْدَ
ذَٰلِكَ فَلَهُ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۱۷۸﴾ وَلَكُمْ فِي الْقِصَاصِ حَيَوةٌ
يَا أُولِي الْأَلْبَابِ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۷۹﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تمہارے اوپر قصاص فرض قرار دیا گیا ہے مقتولوں میں آزاد
کے بدلے میں آزاد آدمی، غلام کے بدلے میں غلام، عورت کے بدلے میں عورت
پس جس کو معاف کیا گیا اس کے بھائی کی طرف سے کچھ اپس دستور کے مطابق پیچھے
لگنا ہے، اور اس کی طرف سے نیکی کے ساتھ ادا کرنا ہے۔

یہ تمہارے رب کی طرف سے تخفیف ہے اور مہربانی ہے
پس جس شخص نے اس کے بعد تعدی کی، اس کے لیے عذاب الیم ہے ﴿۱۷۸﴾ اور تمہارے

لیے قصاص میں زندگی ہے۔ اے عقل مندو! تاکہ تم متقی بن جاؤ۔ ﴿۱۷۹﴾

اسلام کا
فوجداری قانون

گذشتہ آیت میں نیکی کی تعریف بیان کی گئی تھی۔ کہ نیکی کیا ہے۔ اور کیا نہیں ہے
نیکی دینے والوں کے متعلق کہا گیا تھا کہ یہی لوگ سچے اور متقی ہیں۔ اب ان آیات میں
بعض تقویٰ والی باتوں کا ذکر ہے۔ اور ان میں سے ایک مقتولوں کے معاملہ میں
مساوات ہے اور دوسرا مال کا قانون ہے۔ اور پھر اس کے بعد روزہ کا قانون بھی
بیان ہو گا۔ ان سب کا تعلق تقویٰ سے ہے آیات زیر در کس میں اللہ تعالیٰ نے
اسلام کا فوجداری قانون بیان فرمایا ہے۔ جس میں یہ واضح کیا گیا ہے کہ انسانی جان

ایک محترم چیز ہے اور اس کی حفاظت ضروری ہے اور اگر خدا خواستہ کوئی جان تلف ہو جائے تو اس کے لیے قصاص کا قانون بتلایا گیا ہے۔ جس کا اہرام اور پھر اس کی پابندی لازم ہے۔ اگر قصاص نہ ہو سکے، تو پھر خون بہا کا مسئلہ آئیگا۔ جسے دیت کہا جاتا ہے۔ اس مالی معاوضہ کی ادائیگی بھی ضروری ہے۔

اسلام کا قانون
بمقابلہ قانون جاہلیت

زمانہ جاہلیت میں قصاص کے معاملہ میں عدم مساوات اور انصاف پائی جاتی تھی۔ ادنیٰ اور اعلیٰ خاندان کے مقتول کا قصاص بھی مختلف تھا۔ اگر کوئی کمزور اور ادنیٰ خاندان کا آدمی اعلیٰ خاندان کے کسی فرد کو قتل کر دیتا تو مقتول کے ورثاء دوسرا قصاص طلب کرتے ایک مقتول کے بدلے میں دو افراد قتل کہتے یا عورت کے ثمنے میں مرد کا قصاص لیتے یا غلام کے بدلے آزاد کو قتل کرتے حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے اس مقام پر بڑی اچھی تقریر بھی فرماتے ہیں زمانہ جاہلیت میں یہود اور اہل عرب کا دستور تھا کہ عورت کے بدلے میں مرد کو، غلام کے بدلے میں آزاد کو اور ایک آزاد کے قصاص میں دو کو قتل کیا جاتا، یہ زیادتی اور ظلم تھا۔ جو زبردست زیر دستوں پر روا رکھتے تھے۔ جب اسلام آیا تو اس نے اور سچ، نیچ، شریف اور رذیل، غلام اور آزاد اور عورت اور مرد کو قصاص کے معاملہ میں برابر قرار دیا۔ اسلام نے امیر اور غریب کے درمیان حاملہ دیوار کو گرا دیا اور قصاص کے معاملہ میں مساوات کا درس دیا، اسلام نے عالم اور جاہل، سچے جوان اور بوڑھے تندرست اور بیمار صحیح الاعضاء اور لنگھڑے، پانچ اور اندھے کے امتیاز کو یکجہ ختم کر دیا اور سب میں مساوات قائم کر دی۔ اسلام نے انہیں بتلایا کہ قصاص کا معنی ہی برابر ہی ہے۔ لہذا قصاص کے معاملہ میں کسی انسان سے امتیازی سلوک روا نہیں رکھا جائے گا، بلکہ سب کے ساتھ یکساں سلوک ہوگا۔ یہ قانون قانون قصاص کہلاتا ہے

ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ فِي الْقَتْلِ اے اہل ایمان! تمہارے اوپر مقتولوں کے معاملہ میں قصاص یعنی برابر ہی کو فرض کیا گیا ہے۔ قصاص کا معنی ہی برابر ہی ہے اور قتلی مقتول کی جمع ہے مطلب یہ کہ ایک آزاد مقتول کے بدلے میں ایک ہی آزاد کو قتل کیا جائے گا۔

ایک کے بدلے میں دو کو تختہ مشق نہیں بنایا جائے گا۔ اسی طرح غلام کے عوض میں غلام کو، عورت کے بدلے میں عورت کو مرد کے بدلے میں مرد ہی قتل ہوگا۔ قصاص کے معاملہ میں کسی قسم کی عدم مساوات روا نہیں رکھی جائے گی۔ قرآن پاک کے الفاظ میں الْحُرُّ بِالْحُرِّ وَالْعَبْدُ بِالْعَبْدِ وَالْأُنْثَى بِالْأُنْثَى فرمایا گیا ہے۔

قتل کی تین اقسام

حدیث اور فقہ کی کتب میں قتل کی تفصیلات موجود ہیں۔ قتل کی تین قسمیں ہیں، یعنی قتل عمد، شہ عمد، قتل خطا، قتل عمد ہے کہ کوئی شخص دوسرے کو قتل کیا تو مار ڈالے۔ مثلاً بندوق یا پستول سے فائر کر دے، چھرا یا نیزہ مار دے یا کوئی اور ایسا کہ استعمال کر دے جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال کیا جاتا ہے۔ قتل کی یہ واحد صورت ہے جس میں قصاص ہے۔ باقی دو صورتوں یعنی قتل شہ عمد اور قتل خطا میں خون بہا ہے قصاص نہیں۔ پھر قصاص میں بھی بعض استثناء ہیں۔ مثلاً باپ اپنے بیٹے یا بیٹی کو قتل کر دے تو قصاص نہیں لیا جائے گا۔ بلکہ معاوضہ اور تعزیر ہوگی۔ جس میں سزائے قید بھی ہو سکتی ہے اسی طرح اگر ماں اپنے بیٹے یا کوئی اور پوتے کو یا نواسے کو یا نواسی کو ہلاک کر دے تو بھی قصاص نہیں ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر بیٹا باپ کو قتل کر دے تو اسے قصاص میں قتل کیا جائے گا۔

قتل شہ عمد یہ ہے کہ کوئی شخص قتل تو ارادہ کرتا ہے مگر ایسے آگے کے ساتھ جو عام طور پر قتل کے لیے استعمال نہیں ہوتا۔ مثلاً لاشٹھی، پتھر یا کوئی اور ایسی چیز مار دی جس سے قتل واقع ہو گیا۔ تو ایسی صورت میں قاتل سے قصاص نہیں لیا جائے گا، بلکہ اس کے عوض خون بہا یا دیات ہوگی۔

قتل کی تیسری صورت قتل خطا ہے۔ جس میں ارادہ قتل نہیں ہوتا بلکہ قاتل کی سہو سے کوئی شخص قتل ہو جاتا ہے۔ مثلاً شکاری نے شکار کو نشانہ بنایا مگر وہ کسی آدمی کو لگ گیا اور اس سے قتل واقع ہو گیا۔ یہ قتل خطا ہے اور اس کا مفصل بیان آگے قرآن پاک میں آئے گا۔

قتل کی تین اقسام میں سے پہلی قسم یعنی قتل عمد میں قصاص یعنی جان کا بدلہ جان کا

سزا قتل

اگر کوئی شخص کسی دوسرے کو قتل کرے گا، تو اس کے بدلے میں وہ بھی قتل کیا جائے گا۔
باقی دو صورتوں یعنی قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں دیت ہے قصاص نہیں۔ اب قصاص
لیتے ہیں بھی بعض پابندیاں ہیں۔ مثال کے طور پر مقتول کے چار وارث ہیں۔ اور قصاص
لینا ان کا حق ہے نہ کہ حکومت کا۔ حکومت کا کام تو صرف حق دلانا ہے۔ اُس کے
لیے انتظام کرنا ہے۔ اصل حق تو وراثت کا حق ہے۔ جو کہ حکومت دلائیگی۔ فسرمایا
فَقَدْ جَعَلْنَا الْوَلِيَّ سُلْطَانًا هُمْ نَعْنِي مَقْتُولِ كَيْ دَلِي كَيْ لِي حَقَّ رَكَا هُ
برخلاف اس کے انگریزی قانون میں مستغیث حکومت ہوتی ہے۔ اور پھر جرمانہ کی رقم
بھی اپنے خزانہ میں داخل کمرتی ہے۔ اسلامی قانون میں معاوضہ حاصل کرنے کا حق صرف
وارثوں کو پہنچتا ہے۔

اسلامی قانون قتل میں یہ ایک اہم شق ہے۔ کہ قصاص صرف اسی صورت میں
لیا جائے گا، جب کہ تمام وارثان مقتول اس پر رضا مند ہوں۔ چار بیٹوں میں سے اگر ایک
نے بھی قصاص سے دست برداری اختیار کی، تو قصاص ساقط ہو جائے گا اور قاتل کو دیت
ادا کرنا ہوگی۔ اور اگر مقتول کے وارث نہ قصاص لیں اور نہ دیت طلب کریں بلکہ
بالکل ہی معاف کر دیں تو بات ختم ہوگئی۔ اس کی جزا انہیں آخرت میں ملے گی۔ اور اگر
وارثان قصاص کی بجائے غران بہالینا چاہیں۔ تو قتل عمد کی صورت میں قاتل کو پورا معاوضہ
ادا کرنا ہوگا۔ اس کی برادری پر کوئی تاوان نہیں ہوگا۔ البتہ قتل شبہ عمد اور قتل خطا میں جب
دیت ادا کرنا ہوگی، تو قاتل کی ساری برادری ادائیگی کی ذمہ دار ہوگی۔ اگر کسی سرکاری
ملازم سے ایسا فعل سرزد ہو گیا ہے۔ تو اس کے معاوضہ کی ادائیگی اُس کے دفتر والے
یا محکمہ والے کریں گے۔ اسے دیت علی العاقلہ کہتے ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا
کہ دیت عاقلہ پر ہوتی ہے اور یہ تین سال کے اندر اندر قسطوں میں واجب الادا ہوتی
ہے۔ اس میں سارے متعلقین شریک ہوتے ہیں۔ اور ہر شخص اپنے حصے کی قسط ادا کرنا
پابند ہوتا ہے۔ قاتل کی برادری کو تاوان ڈالنے کا مقصد یہ ہے کہ وہ اپنے متعلقین
کی تربیت اس طرح کریں کہ اس طرح کے ناخوشگوار واقعات پیدا ہونے کی نوبت ہی نہ آئے۔

فرمایا قصاص کا قانون تو یہی ہے البتہ فَمَنْ عَفَىٰ لَهُ مِنْ إِخْتِيَةِ شَيْءٍ جو کوئی اپنے بھائی کی طرف کچھ معاف کر دیا گیا بمقتول کے درنا خيال کریں کہ قاتل بھی ہمارا دینی بھائی ہے۔ اس کی وجہ سے قتل تو ہو گیا۔ مگر بردار نہ تعلقات ختم نہیں ہونے چاہئیں۔ لہذا اگر درنا میں سے کسی ایک نے بھی معاف کر دیا تو مقتول پر قصاص ساقط ہو جائے گا۔ اور اس کے بدلے میں کیا ہو گا فَاتَّبَعَ بِأَلْمَعُوفِ پھر مالی معاوضہ ہے دستور کے مطابق کہ لازماً بھائی معاوضہ ادا کرو وَكَأَنَّهُ إِلَيْهِ بِأَحْسَنِ اور قاتل کو نیکی کے ساتھ ادا کرنا چاہیئے۔ معاوضہ ادا کرنا ہی ہے۔ تو اگر جھگڑا کر نہیں بلکہ نیکی اور بھلائی کے ساتھ دستور کے مطابق ادا کرنا چاہیئے۔ اور اس کا پچھا کرنا چاہیئے کہ صحیح طریقے سے ادا ہو جائے۔ اس میں کوئی مزید ضرابی پیدانہ ہونے پائے۔ اس طریقے سے شریعت نے جانوں کی حفاظت کا قانون مقرر فرمایا ہے۔

فرمایا ذَلِكَ تَخْفِيفٌ مِّن رَّبِّكُمْ وَرَحْمَةٌ یعنی اس میں تمہارے رب کی طرف سے تخفیف اور رحمت ہے۔ مطلب یہ کہ پہلی امتوں میں قتل کا بدلہ صرف قتل تھا دیت کا قانون موجود نہیں تھا۔ مگر نبی آخر الزمان علیہ السلام کی امت کے لیے اللہ تعالیٰ نے خاص مہربانی فرمائی۔ اور قاتل کی سزا میں تخفیف کر کے قصاص کے ساتھ ساتھ دیت کا قانون بھی نازل فرمایا۔ چنانچہ شریعت محمدیہ میں تین صورتیں مقرر کی گئی ہیں، مقتول کے درنا قصاص طلب کر لیں یا مالی معاوضہ مقبول کر لیں یا بالکل ہی معاف کر دیں، یہ ان کی صوابدید پر منحصر ہے۔ بہر حال یہ تخفیف اور اللہ کی مہربانی ہے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے دیت کی مقدار ایک سو اونٹ مقرر فرمائی ہے اگر اونٹوں کا تبادلہ نہ ہو سکے تو پھر دس ہزار درہم جو چاندی کا سکہ ہے یا ایک ہزار دینار جو سونے کا سکہ ہے، اس کا بدلہ ہو گا۔ اس سے زیادہ کا مطالبہ نہیں کیا جا سکتا۔ البتہ اگر فریقین اجناس یا کپڑے کے لین دین پر رضامند ہو جائیں تو مقررہ مقدار سے زیادہ بھی لے سکتا ہے۔ یہ بخوان بہا کا قانون ہے اور اس کے بعد فَمَنْ اعْتَدَىٰ بَعْدَ ذَلِكَ يَكُونُ فِي كَذِبٍ یعنی مالی معاوضہ

ٹے کر کے وہ بھی لے لیا۔ اور پھر بعد میں قتل بھی کر دیا، تو ایسی صورت میں قُلُّهُ عَذَابُ
 اَلْبَیْضِ تو ایسا کر نے والا در دناک عذاب کا مستحق ہوگا۔ اس سے مراد تو آخرت کا
 عذاب ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ اس قسم کی زیادتی کھنہ ٹالنے کے لیے
 کوئی معافی نہیں ہوگی۔ بلکہ اس سے قصاص ہی لیا جائے گا اس دُنیا میں بھی اُسے سزا
 ملے گی اور اگلے جہان میں بھی وہ عذاب میں مبتلا ہوگا۔

قصص میں
 زندگی ہے

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے قصاص کا فلسفہ بھی بیان فرمایا وَلَکُمْ فِي الْقِصَاصِ
 حَیْوةٌ یَّا اُولِی الْاَلْبَابِ۔ یعنی اے صاحب عقل و خرد قصاص میں تمہارے لیے
 زندگی کا راز پوشیدہ ہے۔ ظاہر یہ ہے کہ ایک آدمی قتل ہو گیا اور جب قصاص
 میں قاتل کو بھی قتل کر دیا گیا، تو ایک اور جان ضائع ہو گئی حالانکہ اللہ تعالیٰ اسے زندگی
 سے تعمیر فرماتے ہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قصاص کی عدم موجودگی میں لوگ
 بلا خوف و خطر قتل کے مرتکب ہوں گے کیونکہ وہ جانتے ہیں۔ چھوٹی موٹی سزا
 بھگت لیں گے، جان تو بچ ہی جائے گی۔ برخلاف اس کے جب قصاص کا قانون
 موجود ہوگا۔ اور لوگوں کو علم ہوگا کہ قتل کے بدلے میں قاتل بھی قتل کیا جائے گا، تو وہ
 قتل جیسا بڑا جبرم کرنے وقت سو دفعہ سوچے گا۔ اور ایسے اقدام سے
 باز آ جائے گا۔ انگریز کے بنائے ہوئے قانون میں یہی خامی ہے۔ ہر روز کتنے
 قتل ہو رہے ہیں۔ مگر چونکہ قاتل کو قرار واقعی سزا نہیں ملتی، ایک قتل کے بعد
 اُسے مزید شہ ملتی ہے۔ اور وہ بلا خوف و خطر وارداتیں کرتا چلا جاتا ہے۔ چورنی کا بھی
 یہی حال ہے اگر لوگوں کو حد جاری ہونے کا یقین ہو تو پھر چوری کرنا اتنا آسان نہ
 ہو۔ سعودی عرب میں جرائم نہ ہونے کے برابر ہیں۔ وجہ یہی ہے کہ وہاں حدود اللہ
 جاری ہیں۔ قاتل اور چور بلا دھڑک جرم نہیں کر سکتے جب سے خاندان ابن سعود نے
 حدود نافذ کیں ہیں، چور کی کتنی سزائیں ہوئی ہیں۔ گزشتہ پچاس سال میں ایک
 سو لوگوں کے ہاتھ بھی نہیں کٹے ہوں گے۔ سزا کی دہشت ہی ایسی ہے کہ سرعام
 سونا پڑا ہوا یا ریا ل کی بوری رکھی ہو، کوئی ہاتھ تک نہیں لگائے گا۔ یہ اسلامی قانون

پر عمل درآمد کی برکت ہے۔ اسی طرح اگر زنا کی حد سنگاری ہوگی اور مجرم کو سر عام سزا دی جائیگی، وہاں یہ جرم کیسے ہوگا۔ برخلاف اس کے جہاں ایسی عبرتناک سزائیں نہیں ہیں۔ وہاں جرائم میں روز بروز اضافہ ہو رہا ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے سزا دیا کہ اے لوگو! تمہارے لیے قصاص میں زندگی ہے۔ چند ایک کو قصاص میں قتل کرنے سے عام لوگوں کی جانیں بچ جائیں گی۔

عربی ادب کی کتاب جماسہ میں صحابہ کرام کے زمانے کا ایک واقعہ ہے کہ کوئی شخص قتل ہو گیا قاتل با اثر آدمی تھا۔ اُس کے بہت سے سفارشی تھے حضرت سعید بن العاص بھی انہیں میں شامل تھے لوگوں نے بڑی کوشش کی کہ کسی طرح مقتول کا بیٹا قصاص کی بجائے دیت لینے پر راضی ہو جائے کہ سات گنا دیت تک کی پیش کش کی گئی۔ مگر بیٹا یہی کہتا رہا کہ میں تو قصاص لیے بغیر نہ چھوڑوں گا۔ ظاہر ہے کہ جب قصاص کا قانون جاری ہو گا تو پھر اس جرم کا ارتکاب کوئی اٹکاؤں کا ہی کرے گا۔ اکثر لوگوں کی جان محفوظ ہو جائے گی۔ اسی لیے قصاص کو زندگی سے تعبیر کیا گیا ہے۔ فرمایا یہ قانون اس لیے جاری کیا گیا ہے۔

لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ تاکہ تم متقی بن جاؤ اور ایسے گھناؤنے جرم کا ارتکاب نہ کرو گویا اس قانون کا اجر اصول تقویٰ کا ایک ذریعہ ہے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبُقْرَةِ ۲

درس ہفت دیک (۱۱)

آیت ۱۸۰ تا ۱۸۲

كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ أَنْ تَرَكَ خَيْرَ مَا لِلْوَصِيَّةِ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ ۚ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ﴿١٨٠﴾ فَمَنْ أَبْذَلَكَ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ فَإِنَّمَا أَثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يَبْدُلُونَهُ ۚ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿١٨١﴾ فَمَنْ خَافَ مِنْ مُوَصَّ جَنَفًا أَوْ أَثْمًا فَاصْلَحْ بَيْنَهُمْ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ إِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿١٨٢﴾

ترجمہ: چھ فرض کی گئی ہے تمہارے اوپر جس وقت کہ آئے تم میں سے کسی کے پاس موت اگر اُس نے مال چھوڑا ہے، تو وصیت والدین کے حق میں اور قرابت داروں کے حق میں دستور کے مطابق۔ یہ لازم ہے پر ہمیں گارنٹی پر (۱۸۰) پس جس شخص نے اس وصیت کو تبدیل کیا اُسے سننے کے بعد، بیشک اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے جو اس کو تبدیل کرتے ہیں۔ بیشک اللہ تعالیٰ سب کچھ سننے والا اور ہر چیز کو جاننے والا ہے (۱۸۱) پس جس نے خوف محسوس کیا۔ وصیت کھنسنے والے کی طرف سے ایک طرف مال ہونے کا یا گناہ کا، پس اُس نے اُن کے درمیان صلح کرادی، تو اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے۔ (۱۸۲)

حفظ جان
کات لائن

گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ کہ قصاص کا قانون تقویٰ کا ایک جزو ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے یہ قانون جاری فرمایا کہ انسانی جانوں کی عظمت فرمائی ہے۔ اس کے بغیر انسانی جان کا ضیاع ایک معمولی چیز تھی۔ مگر اللہ تعالیٰ نے یہ قانون نافذ کر دیا کہ اگر عدل و انصاف کا دامن تھامے رکھو گے، تو جانیں

محفوظ رہائیں گی اور تم کو صحیح زندگی نصیب ہوگی۔ اس کے ساتھ قانون دیت بھی حفاظتِ جان ہی کا ایک حصہ ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ نے انسانی جان کو بڑی اہمیت دی ہے اور اس کی حفاظت کے لیے قوانین نافذ کیے ہیں حضور نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قتلِ ناحق اکبر الکبائر میں سے ہے۔ یعنی سات بڑے گناہوں میں سے پہلا نمبر شرک کا ہے اور دوسرا قتلِ ناحق کا ہے۔ قَتْلُ النَّفْسِ الْحَيِّ حَرَّمَ اللَّهُ حضرت عثمانؓ کی روایت میں آتا ہے کہ ایک توحید میں جان کا انکسار ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ صرف تین صورتوں میں جان کو تلف کیا جاسکتا ہے۔ اگر ان تین صورتوں کے علاوہ کسی کی جان لے گا، تو کبیرہ گناہ کا مرتکب ہوگا۔ پہلی صورت قصاص کی ہے۔ کسی شخص کو قتل کے بدلے میں قتل کیا جائے، تو وہ جائز ہوگا۔ دوسرا قتلِ اُس مرد یا عورت کا جائز ہے، جسے زندہ کے جرم میں سنگسار کیا گیا ہو، اور تیسرا قتلِ اس شخص کا جائز ہے۔ جو دین اسلام چھوڑ کر مرتد ہو جائے۔ الغرض گذشتہ درس میں حفاظتِ جان کا قانون بیان کیا گیا تھا۔

اسلام کا ضابطہ
دیوانی

ضابطہ فوجداری کی طرح اسلام نے ضابطہ دیوانی یعنی مال کا قانون بھی عطا کیا ہے جسکی تفصیلات قرآن و سنت میں موجود ہیں اس سے پہلے قصاص یعنی فوجداری قانون کا بیان آچکا ہے۔ دیوانی قانون کی بنیاد کے متعلق قرآن پاک میں جگہ جگہ آیا ہے۔ لَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے سے مت کھاؤ۔ خبردار کسی حرام یا مشکوک ذریعے سے مال مت حاصل کرو۔ اگر الیا کرو گے، تو کمال سے محروم ہو جاؤ گے اور جب مال ناجائز طریقے سے حاصل کرو، تو اس کو غلط اور ناجائز امور پر خرچ نہ کرو۔ اگر بیجا تصرف کرو گے تو ظالم اور گنہگار بن جاؤ گے۔ الغرض مالی امور کے متعلق بھی اسلام نے پورا ضابطہ عطا کیا ہے فوجداری قانون میں انسانی جان کے تحفظ کی ضمانت تھی، اس دیوانی قانون میں مال کے تحفظ کے اصول بتلائے ہیں۔ اور دونوں قوانین کا تعلق تقویٰ ہے۔ اہم شاخیں کا تعلق اندس سے ہے۔ آپ مالکی مسک کے بہت بڑے

اسلامی قانون
حکمت پر مبنی ہے

اہم گزرتے ہیں۔ آپ نے ”موافقات“ نامی کتاب بھی لکھی ہے۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ اسلام کا سارا قانون حکمت پر مبنی ہے۔ اس کی کوئی شق حکمت سے خالی نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قانون میں بڑی بڑی باریکیاں اور حکیمانہ مصلحتیں رکھی ہیں۔ بھرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ قرآن پاک کی ایک ایک آیت میں اس قدر حکمتیں، مصلحتیں اور باریکیاں موجود ہیں۔ کہ دنیا کے تمام انسان مل کر سوچیں، تو اس کے برابر نہیں سوچ سکتے۔ آپ ”فیوض الحرمین“ میں لکھتے ہیں کہ بعض اوقات جب میں بعض آیات پر غور کرتا ہوں تو ان کی تہ میں مجھ پر کجریاں جیسے وسیع انکشافات ہوتے ہیں۔ جو عام انسانوں کی سوچ و بچار سے باہر ہوتے ہیں۔

تخفظ نفس

اسلام نے جہاں دیگر تحفظات لیے ہیں، وہاں تحفظ نفس کی بھی ضمانت دی ہے۔ نسب بالکل محفوظ ہونا چاہیے۔ اس میں غلط طعنے نہیں ہونا چاہیے۔ برخلا اس کے غیر اقوام میں تحفظ نسب کی کوئی گارنٹی نہیں۔ ڈاکٹر اسپنسر گزشتہ صدی کا بہت بڑا فلاسفر ہوا ہے۔ اب تو یورپ کی آبادی بہت زیادہ ہے۔ اس وقت صرف چالیس پینتالیس لاکھ تھی وہ کہتا ہے کہ یورپی قانون پر لعنت ہو کہ پینتالیس لاکھ میں سے یقین کے ساتھ پینتالیس آدمی بھی حلال کے نہیں نکالے جاسکتے۔ یہاں کا قانون ایسا گندہ ہے۔ مگر اسلام نسب کی حفاظت کرتا ہے قرآن و سنت میں اس کے متعلق بہت سے قانون موجود ہیں۔ اسی طرح دین کی حفاظت کا قانون بھی اسلام میں موجود ہے۔ اگلی آیات آرمی ہیں نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ وغیرہ دین کی حفاظت کے ہی قوانین تو ہیں۔ اہم شاطیٰ فرماتے ہیں۔ کہ اللہ تعالیٰ نے عقل کے تحفظ کا قانون بھی عطا کیا۔ شراب جیسی قبیح چیز کو حرام قرار دیکر اسلام نے عقل کی حفاظت کا انتظام کر دیا ہے۔ شراب ایسی نشہ آور چیز ہے عقل و خود کیے قائم رہ سکتی ہے۔

الغرض! اسلام نے تو بہترین حکیمانہ قوانین عطا کیے ہیں۔ مگر یہ خود ہماری نالائقی ہے۔ کہ ہم ان سے استفادہ نہیں ہونا چاہتے۔ ان سنہری اصولوں کو چھوڑ کر ہم غیروں کے گندے قوانین تلاش کر رہے ہیں۔ کبھی امریکہ کی طرف جاتے ہیں، کبھی یورپ

کی طرف دیکھتے ہیں کبھی ایشیا کا رخ کرتے ہیں۔ کہ کیس سے اچھا دستور مل جائے
کوئی اچھا فوجی نظام حاصل ہو جائے یا کوئی اقتصادی نظام ہی میسر آجائے مگر وہاں
پر لغت کے سوا کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ قرآن و سنت جیسے اعلیٰ و ارفع قوانین کیس سے
نہیں ملیں گے۔

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں۔ کہ اس دور میں اسلامی تحریک کے خلاف
سب سے بڑھ کر روسی ذہن کا کام کر رہا ہے۔ اس وقت اسلام کی مخالفت میں سب سے
زیادہ اشتراکی نظام کا فرما ہے۔ مگر ایک وقت آئے گا جب یہ نظام بھی مجبور ہو کر
قرآنی قوانین کے سامنے ہتھیار ڈال دیگا۔ اُن کے پاس محض دعویٰ ہے، عملی طور
پر کچھ نہیں اس لیے بالآخر انہیں اسلام کے سامنے ٹھٹھنے پڑیں گے۔

تختہ مال

اسلام نے مال کا مکمل تحفظ عطا کیا ہے۔ اگر کسی جگہ کوئی خرابی موجود ہے
تو اسے درست کرنے کا قانون بھی موجود ہے۔ اسلام نے مال کو ضائع کرنے
سے منع فرمایا ہے۔ البتہ اسے احسن طریقے سے خرچ کرنے کے اصول بتلائے ہیں
اس کے متعلق مختلف قوانین گزر چکے ہیں۔ "وَلَا يَأْكُلُ الْمَالُ عَلَى حَبْتٍ" یعنی مال کی محبت
کے باوجود اسے خرچ کرو۔ زکوٰۃ کا مکمل قانون موجود ہے۔ اس کے علاوہ بھی "وَصَمًا
رَزَقْنَاهُمْ يُنفِقُونَ" ہمارے دیے ہوئے مال سے خرچ کرو۔ اس سلسلے
میں مکاتب غلاموں کی آزادی کا قانون دیا ہے۔ سورۃ نور میں آتا ہے "وَأَنزَلْنَاهُمْ
مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكُمْ" یہ مال اللہ کا دیا ہوا ہے اس نے ایسے ذرائع پیدا
کر دیے ہیں۔ کہ تمہیں مال پہنچتا رہتا ہے۔ محنت کوئی کرتا ہے۔ مگر تمہیں وراثت
میں سے نیٹھے بٹھائے مل جاتا ہے۔ اسے اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ ہر انسان
فطری طور پر آزاد ہے اسے غلامی کے پھندے سے چھڑاؤ۔ ان پر اللہ کے دیے
ہوئے مال میں سے خرچ کرو۔ یہ نہ سمجھو کہ اس مال کے حقیقی مالک تم ہو۔ اصلی
مالک تو اللہ تعالیٰ ہے۔ جس نے تم پر مہربانی کی اور ایسے وسائل تمہارے سپرد
کیے۔ جن کے ذریعے مال تم تک پہنچتا ہے۔ پھر اس میں تصرف بھی وہ کرو جس کی

اجازت اللہ تعالیٰ نے دی ہے۔ اگر اس کی مرضی کے خلاف خرچ کر دو گے، تو جہنم رسید ہو گے۔

قانون وصیت

ان آیات میں وصیت کا قانون بیان کیا گیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا أَحْضَرُوا أَحَدَكُمْ الْمَوْتَ أَنْ تَرَكَ خَلِيلَ الْوَصِيَّةِ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْأَقْرَبِينَ بِالْمَعْرُوفِ یعنی جب کسی کی موت کا وقت قریب ہو اور وہ مال چھوڑ کر اس دنیا سے رخصت ہو رہا ہے۔ تو اس پر لازم ہے کہ وہ والدین اور قرابت داروں کے حق میں وصیت کر جائے۔ اور یہ وصیت ہو بھی بالمعروف یعنی دستور کے موافق۔ فرمایا ایا کرنا حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ یعنی متقیوں کے لیے ضروری ہے۔

وصیت کا مکمل قانون قرآن پاک کے مختلف مقامات پر موجود ہے۔ یہ آیات اس قانون کی ابتدائی آیات ہیں، جنہیں سورۃ نساء کی آیات نے منسوخ کر دیا۔ جب تک اللہ تعالیٰ نے ورثہ کے حصے مقرر نہیں کیے تھے، آیات زیر درس کے ذریعے وارثوں کے لیے وصیت کا حکم دیا گیا تھا۔ تاکہ انہیں بھی میت کے ترکہ میں سے حصہ مل سکے مگر سورۃ نساء کی آیات نازل ہونے سے ورثہ کے حصے مقرر ہو گئے اس لیے ان کے لیے وصیت کا قانون منسوخ ہو گیا۔ اب ورثہ کے لیے وصیت نہیں ہے۔ البتہ غیر ورثہ کے لیے ایک تہائی مال تک وصیت کر سکتا ہے۔ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ورثہ یعنی ماں باپ، بیوی، خاوند، اولاد وغیرہ کے متعلق فرمایا۔ إِنَّ اللَّهَ أَعْطَى كُلَّ ذِي حَقٍّ حَقَّهُ یعنی اللہ تعالیٰ نے ہر حق دار کو اس کا حق مے دیا ہے۔ اب لا وصیۃ لک لو ادیث کسی وارث کے لیے وصیت روا نہیں ہے۔ انہیں ورثہ سے مقرر حصہ خود بخود مل جائے گا۔ بعض علمائے کرام فرماتے ہیں کہ ورثہ کے لیے وصیت والی یہ آیت منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات ایسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں کہ والدین کے لیے وصیت کرنا بھی ضروری ہو جاتا ہے۔

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں۔ کہ خود ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آیا۔ کہ انہیں
 ماں کے حق میں وصیت کرنے کا خیال پیدا ہوا۔ اور انہوں نے محسوس کیا۔ کہ واقعی یہ آیت
 منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ بعض اوقات وراثہ کے لیے بھی وصیت ضروری ہو جاتی ہے
 آپ خود نو مسلم تھے۔ آپ کی والدہ آخر تک اپنے مذہب پر قائم رہی۔ فرماتے ہیں۔ کہ
 ایک دفعہ میں بیمار ہو گیا۔ مجھے خیال آیا کہ موت کی صورت میں میری ماں کو میرے ترکہ
 سے کوئی حصہ نہیں ملے گا، کیونکہ وہ غیر مسلم تھی اور مومن اور کافر کے درمیان وراثت
 نہیں چلتی۔ تو اُس وقت میری سمجھ میں یہ بات آئی کہ ماں کے حق میں وصیت کر دے
 بہر حال یہ اُسی صورت میں ہوتا جب کہ ماں غیر مسلم ہونے کی وجہ سے وراثت کی حقدار
 نہ تھی۔ کیونکہ لَا يَرِثُ الْمُسْلِمُ الْكَافِرَ وَلَا الْكَافِرُ الْمُسْلِمَ نہ کافر
 مسلمان کا وارث ہے۔ اور نہ مسلمان کافر کا وارث ہے۔ ایسی صورت میں وصیت
 ہی کے ذریعے ترکہ تقسیم ہو سکتا ہے۔

انبیاء کی وصیت

قرآن پاک میں وصیت کا قانون کی جگہ بیان ہوا ہے۔ جہاں بھی وراثہ کے
 حصص کا بیان آتا ہے۔ تو ارشاد ہوتا ہے۔ کہ فَلَإِنْ فُلَانٌ رَّشَتْ دَارَکَ لِیْے اتنا
 حصہ مقرر کیا گیا ہے۔ مگر مِّنْ بَعْدِ وَصِیَّتِهِ تَوْصُوْنَ لِّهَآؤْ دِیْنِ۔
 یہ ترکہ وصیت شدہ مال اور قرضہ نکال کر باقی تقسیم ہوگا۔ منجملہ وصیت کی دیگر اقسام
 کے انبیاء علیہم السلام کی بھی وصیت ہوتی ہے۔ مگر وہ مال کے متعلق نہیں ہوتی۔
 پوچھنے والے صحابہ کرام سے دریافت کرتے ہیں۔ کہ کیا حضور علیہ السلام نے کوئی وصیت
 کی ہے۔ صحابی جواب دیتے ہیں کہ آپ نے مال سے متعلق کوئی وصیت نہیں فرمائی
 کیونکہ آپ کا ارشاد ہے مَا تَرَکْنَا صَدَقَةً یعنی نبی جو چیز چھوڑ جاتے
 ہیں۔ اس کے متعلق وصیت کرنے کی کوئی ضرورت نہیں کیونکہ اُن کا ترکہ صدقہ
 ہوتا ہے۔ اُسے وراثہ میں تقسیم نہیں کیا جاتا۔

فرمایا البتہ نبی علیہ السلام نے وصیت ضرور فرمائی ہے۔ اور وہ قرآن پاک پر عمل
 کرنے کی۔ غلاموں کے متعلق حُرین سلوک کی وصیت کی ہے۔ نماز پر بلا وصیت اور

شرک سے بچنے کی تاکید فرمائی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا لَعَنَ اللَّهُ الْيَهُودَ وَالنَّصَارَى
یہود و نصاریٰ پر اللہ کی لعنت ہو۔ انہوں نے انبیاء کی مقبروں کو سجدہ گاہ بنالیا
آپ نے امت کو تعلیم دی کہ تم میری قبر کے ساتھ وہ سلوک نہ کرنا جو یہود و نصاریٰ
نے اپنے انبیاء کی مقبروں کے ساتھ کیا۔ مگر آج کل قبروں کے ساتھ جو کچھ معاملہ
ہو رہا ہے، وہ ہمارے سامنے ہے۔ بیرون ملک سے آنے والا ہر سربراہ مملکت
سب سے پہلے جناح صاحب کی قبر پر چادر چڑھاتا ہے۔ حضرت علی ہجویریؒ کی قبر
کے ساتھ کیا سلوک ہو رہا ہے۔ کوئی ریشمی چادر چڑھا رہا ہے، کوئی پھولوں کی
چادر لے کر آیا ہے۔ کوئی بچی پکائی دیگ پیش کر رہا ہے۔ کوئی بکرا، چھتر اندر
کر رہا ہے۔ کوئی سجدہ کر رہا ہے، کوئی حاجت روائی کا طالب ہے۔ کوئی مشکل
کٹائی کے لیے دعائیں کر رہا ہے۔ یہ سب شرکیہ امور ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم
نے امت کو ڈرایا مَحْذَرُهُمْ صَنَعُوا لِيَ كَأَمَّا مَکْرَهُمْ اَللّٰهُ چل
رہے ہیں۔

وصیت کی کئی ایک قسمیں ہیں۔ منجملہ اُن کے مباح یا مستحب وصیت
کا ذکر حدیث میں آتا ہے۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ روایت کرتے ہیں۔ حضور نے
فرمایا کہ جس شخص کے پاس کوئی ایسی چیز ہو جس کے متعلق وہ وصیت کرنا چاہتا ہو
تو اُسے چاہیے کہ وہ دو راقی بھی لے کر اسے ملے مگر وصیت اس کے سر ہانے کے نیچے
لکھی ہوئی موجود ہونی چاہیے۔ حضرت ابن عمرؓ فرماتے ہیں کہ جب سے میں نے حضور علیہ السلام
کی زبان مبارک سے یہ بات سنی ہے۔ اس وقت سے میں نے وصیت لکھ
کر سر ہانے کے نیچے رکھ لی ہے۔ وصیت کی یہ مستحب قسم ہے۔

بعض اوقات وصیت فرض ہو جاتی ہے۔ کسی شخص کو یقین ہے کہ اُسکی
زندگی کے آخری ایام آ پہنچے ہیں اور اب اس کے بچنے کے کوئی آثار دکھائی
نہیں دیتے۔ نیز اُس کے ذمے ایک دو سال کی زکوٰۃ واجب الادا ہے۔ تو ایسی
صورت میں اس کے لیے وصیت کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ کہ وہ اپنے مال سے

وصیت کی
اقسام

زکوٰۃ کی ادائیگی کی وصیت کر جائے۔ وگرنہ عدم ادائیگی کی صورت میں فرض کا تارک ہو کر گنہگاروں کی صف میں کھڑا ہو گا۔ اسی طرح کسی کی امانت موجود ہے۔ یا کسی کا قرض ادا کرنا ہے۔ تو اس کے لیے لازم ہے۔ کہ مرنے سے پہلے وصیت کر جائے کہ فلاں فلاں چیز کی ادائیگی کر دینا۔ اگر ایسا نہیں کرے گا۔ تو اس کا مال تو درنہا ہضم کر جائیں گے، اور وہ خود دوسروں کا مقروض رہ جائے گا۔ اسی لیے اسلام نے مرنے والے کے متعلق یہ قانون وضع کر دیا کہ سب سے پہلے مرنے والے کے مال میں سے اس کے کفن و دفن کا انتظام کیا جائے۔ یہ بنیادی ضروریات میں داخل ہے اس کے بعد اگر مرنے والے کے ذمہ قرضہ ہے۔ تو وہ ادا کیا جائے۔ پھر اگر کوئی وصیت ہے۔ تو کل مال کے ایک تہائی تک اسے پورا کیا جائے۔ اس کے بعد بقیہ مال وراثہ میں تقسیم کر دیا جائے۔ مگر کس قدر افسوس کا مقام ہے۔ کہ لوگ ان ضروری امور کی طرت تووجہ نہیں کرتے۔ اس کی بجائے مرنے کے قتل، تیجہ، ساتواں، دسواں اور چالیسواں کے چکر میں پڑ کر مرنے والے کا مال ضائع کرتے ہیں۔ جو کہ بالکل ناجائز ہے۔ اور اگر مرنے والے کے مال کی بجائے لواحقین اپنے مال سے خرچ کرتے ہیں۔ تو بھی محض رسومات کی خاطر ایسا کرنا فضول ہو گا کیونکہ شریعت میں اس کا کوئی ثبوت نہیں۔ اور اگر خدا نخواستہ ایسی رسومات پر یتیموں کا مال صرف ہو رہا ہے تو یہ قطعاً حرام ہے۔ کھانے والے حرام کھا رہے ہیں۔ اس سے بچنا چاہیے۔ اور جن چیزوں کا شریعت نے حکم دیا ہے انہیں پورا کرنا چاہیے۔

وصیت کی ایک قسم ناجائزہ بھی ہے۔ اگر مرنے والا کسی ناجائز کام کی وصیت کرتا ہے تو ایسی وصیت ناجائزہ ہی کہلائیگی مثلاً کوئی شخص وصیت کر جائے کہ میرے مال میں فلاں قبر پر چادر چڑھا دینا یا فلاں مزار پر کچرا چڑھا دینا وغیرہ وغیرہ ناجائزہ وصیت ہوگی۔ اور ایسی وصیت پر عمل کرنا روا نہیں ہے۔

بہر حال حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے فرمایا کہ کار خیر کے لیے ایک تہائی مال تک وصیت کرنے کی اجازت ہے۔ تاکہ مرنے والے کو آخرت میں

اس کا حصہ ملتا ہے مثلاً مسجد تعمیر کر دے، اندر سے بنوائے، غیر وارث، ارثہ داروں اور مستحقین میں تقسیم کر لیگی وصیت کر جائے تو یہ جائز اور درست ہے اور اگر کوئی شخص ایک تہائی مال سے زیادہ کی وصیت کر جائے تو یہ ورثاء کی اجازت پر موقوف ہوگا اگر وہ سب رضی ہو جائیں تو وصیت پر عمل ہوگا ورنہ صرف ایک تہائی پر عمل کرنا ہوگا اگرچہ اس کے لیے بھی وَالثَّلَاثُ كَثِيرٌ کے الفاظ آتے ہیں مگر اس حد تک جائز ہے، حضرت سعدؓ نے عرض کیا تھا کہ میرے پاس بہت مال ہے اور حق دار صرف ایک ہی بیٹی ہے۔ حضور! اگر اجازت دیں تو میں سارا مال صدقہ کر دجائوں۔ آپ نے فرمایا نہیں۔ پھر عرض کیا اُدھا مال دے دوں، فرمایا نہیں انہوں نے تیسری دفعہ پوچھا کیا دو تہائی مال کی وصیت کر دوں آپ نے پھر بھی اجازت نہ دی جب آپ نے ایک تہائی مال کی اجازت طلب کی تو آپ نے فرمایا کہ اگرچہ یہ بھی زیادہ ہے مگر اس کی اجازت ہے۔ مقصد یہ کہ وارثوں کو ترکہ سے زیادہ سے زیادہ حصہ ملنا چاہیئے۔

وصیت میں
تبدیلی گناہ ہے

فرمایا فَمَنْ بَدَّلَهُ بَعْدَ مَا سَمِعَهُ جس شخص نے اس وصیت کو تبدیل کیا اُسے سُننے کے بعد فَاتَّمَا أَثْمُهُ عَلَى الَّذِينَ يَبْدِلُونَهُ تو اس کا گناہ ان لوگوں پر ہے۔ جو اس کو تبدیل کرتے ہیں بطلب یہ کہ اگر کوئی شخص وصیت کر کے فوت ہو جائے اور اس وصیت کو سُننے والے یا جاننے والے اس پر عمل درآمد کرنے کی بجائے اُسے تبدیل کرنے کی کوشش کریں۔ تو اس کا وبال وصیت میں تحریف کرنے والوں پر ہوگا۔ کیونکہ وصیت کرنے والا تو اپنا فرض ادا کر گیا۔ اب اس پر عمل درآمد کے وقت کبھی بیشی کرنے والے گنہگار ہوں گے۔ إِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ بیشک اللہ تعالیٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔

وصیت میں تبدیلی کی کسی ایک صورتیں ہو سکتی ہیں۔ مثلاً مرنے والا کسی ایسے شخص کو کوئی حصہ دے گیا، جسے وارث پسند نہیں کرتے۔ یا کسی کے کم حصے کو زیادہ یا زیادہ کو کم کرنا چاہتے ہیں۔ اور اس طرح اپنی طرف سے رد و بدل کرتے

ہیں۔ تو وہ لوگ گنہگار ہوں گے۔ کیونکہ جائز وصیت پر عمل نہیں کیا، وارثان کے حصص کی تقسیم وصیت اور قرضہ کی ادائیگی کے بعد ہوتی ہے۔ جیسا کہ قرآن پاک نے بار بار تصریح کی ہے۔ اسی طرح اگر کوئی وصیت کرنے والا وصیت صحیح طریقے سے نہیں کرتا۔ کسی کو حق سے زیادہ دے دیتا ہے اور کسی کو پورا حق بھی نہیں دیتا اور اس طرح سپانڈگان میں تنازعہ پیدا ہو جاتا ہے۔ تو اس نازک صورت حال کو دیکھتے ہوئے۔ فَمَنْ خَافَ مِنْ مَوْصٍ جَنَفًا أَوْ أَثَمًا جو شخص ڈر گیا۔ وصیت کرنے والے کے ایک طرف جھک جانے سے یا کسی گناہ کے ارتکاب سے فَأَصْلَحَ بَيْنَهُمْ پس اس شخص نے فریقین میں صلح کرادی فَلَا رَافِعَ عَلَيْهِ تو ایسے شخص پر کوئی گناہ نہیں بعض اوقات کوئی بیٹا نافرمان ہوتا ہے اور وصیت کرنے والا اُسے جائیداد سے محروم کرتا ہے۔ تو یہ بات غلط ہے۔ اور کبیرہ گناہ ہے۔ وارث بننا ایک غیر اختیار کی چیز ہے۔ اور جو حصہ اللہ نے ورثہ کو دیا ہے۔ وہ نیکی بدی یا فرمانبرداری اور نافرمانی پر موقوف نہیں ہے۔ اس کا اچھا یا بُرا صلہ کسی اور طریقے سے دیا جاسکتا ہے۔ مگر وراثت سے محروم نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ حق اُسے اللہ تعالیٰ نے عطا کیا ہے۔ ایسی ہی صورت میں فرمایا کہ اگر کوئی شخص درمیان میں آخر صلح کر دے۔ تو یہ اچھی بات ہے۔ اس سے دونوں کو فائدہ ہوگا۔ وارثان کو ان کا جائز حصہ مل جائیگا اور وصیت کرنے والا بھی سرخرو ہوگا۔ ایسی صورت میں اگر کوئی چھوٹی موٹی لغزش ہوگئی ہے۔ تو اللہ تعالیٰ معاف فرمائے گا۔ كَيْفَ تَعْرِفُ أَنَّ اللَّهَ عَفُوٌّ رَحِيمٌ بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ كَمَا كُتِبَ عَلَى
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ ﴿۱۸۳﴾ أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ
فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا أَوْ عَلَى سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِنْ أَيَّامٍ
أُخْرَىٰ وَعَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَهُ فِدْيَةٌ طَعَامُ مِسْكِينٍ ط
فَمَنْ تَطَوَّعَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَهُ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَكُمْ
إِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۴﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں جیسا کہ ان لوگوں پر فرض
کئے گئے تھے، جو تم سے پہلے گزرے ہیں۔ تاکہ تم پر ہیز گار بن جاؤ۔ ﴿۱۸۳﴾ چند گئے
ہوئے دن ہیں۔ پس جو شخص تم میں سے بیمار ہو یا سفر پر ہو۔ پس وہ سب دنوں میں
گنتی پوری کرنا ہے۔ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں ایک مسکین کا طعام فدیہ ہے
پس جو شخص خوشی سے نیچی کرے گا، وہ اس کے لیے بہتر ہے۔ اور اگر تم روزے
رکھو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ ﴿۱۸۴﴾

گدہ نہ پیوستہ

اس سے پیشتر اللہ تعالیٰ نے نفس الانی کی حفاظت کا قانون بیان فرمایا۔ پھر
مال کی حفاظت کا قانون بتلایا۔ اور مال کے بیجا تصرف سے منع فرمایا۔ حق تلفی کو
ناجائز قرار دیا اور بتایا کہ یہ بات تقویٰ کے خلاف ہے۔ ایمانیات کے ذکر کے
بعد اللہ تعالیٰ نے اسلام کا قانون فرجہ الکلیان فرمایا، اور قصاص اور دیت کا تذکرہ
کیا اور فرمایا یہ اصول بیان کرنے کا مقصد یہ ہے کہ تم اس پر عمل پیرا ہو کہ تقویٰ
حاصل کرو۔

آیات زیر در رس میں ارکان اسلام میں سے ایک اہم رکن روزہ کا بیان ہے فرضیت روزہ

جس طرح اس سے پہلے اصولوں کو تقویٰ کے حصول کا ذریعہ قرار دیا گیا۔ اسی طرح روزہ رکھنے کی غرض و غایت بھی تحصیل تقویٰ ہی بیان کی گئی ہے۔ ارشاد ربانی ہے
يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَئِذَا بَلَغَ الْإِيمَانُ عَلَيْكُمْ كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ تَمَّ عَلَيْهِ
 روزے فرض کیے گئے ہیں۔ كَمَا كُتِبَ عَلَى الَّذِينَ مِنْ قَبْلِكُمْ
 جیسا کہ تم سے پہلے لوگوں پر فرض کئے گئے۔ اور مقصد یہی ہے لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ
 تاکہ تم پر بہتر گامری اختیار کر لو۔

کُتِبَ کا لفظ فرضیت کے لیے آتا ہے۔ جیسے اس سے پہلے قصاص کے متعلق آیات كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِصَاصُ یعنی تم پر قصاص فرض کیا گیا ہے اسی طرح وصیت کے متعلق آچکا ہے كُتِبَ عَلَيْكُمُ إِذَا أَحْضَرْتُمْ أَحَدَكُمْ الْمَوْتَ أَنْ تَتَرَكُوا خَيْرًا مِنْ الْوَصِيَّةِ اگر مال چھوڑا ہے۔ تو تم پر وصیت کرنا لازم ہے۔ اسی طرح یہاں پر روزوں کے متعلق كُتِبَ عَلَيْكُمُ الصِّيَامُ یعنی تم پر روزے فرض کئے گئے ہیں۔

روزہ کے لفظی معنی رُک جانے کے ہیں۔ عربی زبان میں اس کے لیے امام کا کالفظ بھی آتا ہے۔ تاہم صوم کا لفظ بھی رُک جانے کے معنی میں استعمال ہوتا ہے مثال کے طور پر عرب کہتے ہیں۔

خَيْلٌ صِيَامٌ وَخَيْلٌ غَيْرُ صَائِمَةٍ تَحْتَ الْعَبَاجِ وَخَيْلٌ لَعَلَّكَ الْجَمَاءُ
 کچھ گھوڑے کے بونے ہیں یعنی خاموش ہیں کچھ حرکت کر رہے ہیں اور کچھ گردوغبار کے نیچے گھام جیا۔

ہیں۔ شریعت میں روزہ کی تعریف یوں بیان کی گئی ہے۔ إِلَّا مَسَاكُ عَنْ
الْكُلِّ وَالشَّرْبِ وَالْجَمَاعِ مِنْ طُلُوعِ الْفَجْرِ إِلَى غُرُوبِ الشَّمْسِ
 طلوع فجر سے لے کر غروب آفتاب تک کھانے پینے اور خواہشات نفسانی سے اپنے آپ کو روکے رکھنے کا نام روزہ ہے۔

روزہ نہاں شرعی کے اندر ہوتا ہے۔ اور شرعی دن سے مراد پوپھوٹنے سے لے کر سورج غروب ہونے تک کا وقت ہے۔ اس دوران کھانے پینے

اور نفسانی خواہشات سے باز رہنا اس نیت کے ساتھ کہ میرا روزہ ہے یہی صوم ہے اور اسلام کے ارکان میں سے تیسرا رکن ہے۔ ارکان اسلام میں توحید و رسالت پر عقیدہ کے بعد نماز، پھر زکوٰۃ اور پھر روزہ کا نمبر ہے۔ چوتھا نمبر حج کا ہے اسی ترتیب سے پانچواں رکن جہاد ہے۔ اور اس کا ذکر بھی بعد میں آ رہا ہے ان تمام ارکان کا تذکرہ سورۃ بقرہ میں اسی ترتیب سے آ رہا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے عَلَيْنَا كُمُ بِالصَّوْمِ فَإِنَّهُ لَاعِدْلٌ لَّهُ رَوْزَةٌ کو لازم پکڑو کیونکہ روزہ جیسی کوئی اور عبادت نہیں۔

سابقہ امتوں کے روزے

الغرض! فرمایا اے ایمان والو! یہ روزے صرف تم پر ہی نہیں فرض کیے گئے بلکہ تم سے پہلے گزرنے والے لوگوں پر بھی اسی طرح فرض تھے۔ البتہ ان روزوں کی مقدار اور تعدد مختلف امتوں کے لیے مختلف رہی ہے۔ چنانچہ مشہور ہے کہ حضرت آدم علیہ السلام ایام بیض یعنی ہر ماہ کی تیرہ چودہ پندرہ تاریخ کا روزہ رکھتے تھے۔ اور یہ روزے امتِ نجر کے لیے مستحب کا درجہ رکھتے ہیں حالانکہ حضرت آدم علیہ السلام کے لیے فرض تھے۔ حضرت نوح علیہ السلام کی امت کے لوگ بڑے سخت مزاج اور اکھڑے تھے، ان میں بہیمیت کا عنصر زیادہ مقدار میں پایا جاتا تھا۔ اسے کم کرنے کے لیے اس امت کو سارا سال روزے رکھنے کا حکم تھا حضرت داؤد علیہ السلام ایک دن روزہ رکھتے تھے اور دوسرے دن افطار کرتے تھے حضرت عیسیٰ علیہ السلام دو دن روزہ رکھتے تھے۔ اور تیسرے دن افطار کرتے تھے اس امتِ آخر الزمان کے لیے اللہ تعالیٰ نے سال بھر میں ایک ماہ کے روزے فرض کیے۔ ان کے متعلق فرمایا اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ یہ گنتی کے چند دن ہیں۔ یعنی تین سو ساٹھ دن میں بے انتیس یا تیس دن کے روزے فرض قرار دیے گئے ہیں۔

روزہ باطنی عبادت ہے

اہم طحاویؒ اپنی کتاب مشکل الآثار میں فرماتے ہیں کہ ہر عبادت میں ریا کا امکان ہے۔ صرف روزہ ہی ایک ایسی عبادت ہے جس میں ریاکاری کا کوئی مسئلہ

نہیں۔ یہ باطنی عبادت ہے۔ اور اس کا تعلق ایک طرف اللہ تعالیٰ کے ساتھ ہے اور دوسری طرف بندہ کے ساتھ۔ نماز، زکوٰۃ، حج وغیرہ ایسی عبادت ہیں۔ جنہیں دوسرے لوگ دیکھ سکتے ہیں، انہیں محسوس کر سکتے ہیں۔ اور زکوٰۃ سے استفادہ بھی ہو سکتے ہیں۔ مگر روزہ کے ساتھ ایسا معاملہ پیش نہیں آ سکتا۔ اس کا تعلق

صرف روزہ دار کی ذات سے ہوتا ہے۔ دوسرا شخص نہ اسے دیکھ سکتا ہے اور نہ محسوس کر سکتا ہے۔ اگر کوئی شخص عام لوگوں کے سامنے تو نہیں کھاتا پیتا مگر درپردہ ایسا کر لیتا ہے۔ تو اس کا روزہ کہاں ہو گا؟ وہ لاکھ اعلان کرتا پھرے کہ میں روزہ دار ہوں مگر اس کی حقیقت کو وہ خود جانتا ہے۔ یا اللہ رب العزت جانتا ہے کہ وہ روزے دار ہے یا نہیں۔ اس کا تعلق براہ راست اللہ تعالیٰ سے ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ ہر عبادت کا بدلہ دیا جائیگا۔ مگر روزہ ایک ایسی عبادت ہے۔ جسکی جزا میں خاص طور پر خود عطا کر دیں گے۔ حدیث قدسی کے الفاظ ہیں۔

اَلصَّوْمُ لِيْ وَ اَنَا اَجْزِيْ بِہِ رَوْزَہ خاص میرے لیے ہے اور میں ہی اسکی جزا دوں گا۔ روزہ کے روحانی فوائد کے ساتھ ساتھ اس کے جسمانی فوائد بھی ہیں۔

روزہ کے
جسمانی فوائد

صَوُّوْهُوْاْ ذٰلِصَّحُوْاْ روزہ رکھو تاکہ تمہیں صحت نصیب ہو۔ لیورپ کے بہت سے نامور ڈاکٹروں کا کہنا ہے کہ اسلام نے فاقہ کا جو طریقہ روزہ کی صورت میں مقرر کیا ہے، اس سے بہتر حفظانِ صحت کا کوئی اصول نہیں مختلف بیماریوں کے حملہ کی صورت میں بھی روزہ صحت مندی کا سبب بنتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص بلغمی مادہ کی زیادتی کا مریض ہو تو روزہ رکھنے سے بالکل تندرست ہو جائے گا۔ فاقہ کرنے سے بلغمی اور کئی دوسری دلویتیں خشک ہو جاتی ہیں اور آدمی صحت یاب ہو جاتا ہے اسی لیے فرمایا کہ روزہ رکھو، صحت نصیب ہوگی اور سفر کرو غنیمت حاصل ہوگی۔ بسا اوقات اقامت میں آدمی کامیاب نہیں ہوتا مگر سفر کرنے سے اللہ تعالیٰ کے مسائل پیدا کر دیتا ہے۔ جو اس کی کامیابی کا سبب بن جاتے ہیں۔ اور انسان تنگی سے نکل کر فراخی میں داخل ہو جاتا ہے۔

روزہ اور قانون
کی پابندی

فرضیت روزہ کے لیے خطاب اہل ایمان سے ہوا ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ**
آمَنُوا گویا روزہ ایمان کا تقاضا بھی ہے جو شخص ایمان نہ ہونے کا دعویٰ کرے۔ اُسے روزے
کی فرضیت پر ایمان لانا ہوگا۔ ورنہ وہ اہل ایمان ہونے کا تقاضا پورا نہیں کرتا۔ علمائے
کرام فرماتے ہیں۔ روزہ کا ایک اہم فائدہ یہ ہے۔ کہ یہ قانون کی پابندی کھاتا ہے
روزہ کے ذریعے انسان ایک مقررہ وقت کے لیے حلال اکل و شرب سے بھی رُک
جاتا ہے۔ مقصد اس کا یہ ہے۔ کہ انسان قانون کا پابند ہو جائے۔ جب وہ قانون
کی پابندی کے ذریعے حلال چیزوں سے رُک سکتا ہے۔ تو وہ حرام چیزوں سے
بھی رُک جائے گا۔ کھانے پینے اور نفسانی خواہش کی تکمیل سے انسان کا نفس
مزید پھیلتا پھولتا ہے۔ اسے کمزور کرنے کے لیے اسلام نے روزہ کا قانون نافذ
کیا۔ تاکہ نفس انسانی کو فاقہ کے ذریعے کمزور کیا جاسکے۔ **لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ**
کا یہی مطلب ہے کہ انسان میں تقویٰ جیسی اچھی خصلت پیدا ہو جائے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ فرماتے ہیں کہ روزے کے ذریعے جب نفس کو مغربا
سے روکنے کی عادت پڑ جائیگی۔ تو پھر اسے شرعاً حرام چیزوں سے روکنا آسان ہو
جائے گا۔ جب روزہ کی وجہ سے قوت نفس اور شہوت میں ضعف آئیگا، تو تم متقی
بن جاؤ گے۔ روزہ میں یہ بہت بڑی حکمت پوشیدہ ہے۔ کہ اس سے سرکش
نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ اور شریعت کے احکام پر پابندی ہونے لگتی ہے۔

موسىٰ علیہ السلام کی شریعت میں تو چالیس روزے رکھنے کا ذکر آتا ہے۔ اور نصاریٰ
پر ایک ماہ کے روزے فرض تھے۔ مگر انہوں نے اس حکم میں تبدیلی پیدا کر لی۔
طبرانی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ عیسائیوں کا کوئی بادشاہ بیمار ہو گیا۔ گرجی کے
روزے تھے۔ اس نے کہا۔ کہ اگر اللہ تعالیٰ نے تندرستی دی، تو ہم تیس کی
 بجائے چالیس روزے رکھیں گے۔ اسی طرح ایک اور بادشاہ بیمار ہوا۔ تو اس نے
کہا کہ تندرست ہو کر مزید سات روزے رکھوں گا۔ اس طرح انہوں نے روزوں کی تعداد
سینتالیس تک پہنچا دی۔ اس کے بعد عیسائی علماء کا اجتماع ہوا۔ اور انہوں نے

فیصلہ کیا کہ سینتالیس کی بجائے پورے سچاس روزے مقرر کر دینے چاہئیں۔ البتہ موسم گرمائی بجائے موسم بہار میں رکھ لیا کریں گے۔ تو اس طرح انہوں نے اپنی مرضی سے روزوں کی تعداد اور موسم میں تغیر و تبدل کر دیا۔

مولانا شیخ النبیؒ فرماتے ہیں۔ کہ لَعَلَّكُمْ تَتَّقُونَ میں یہ اشارہ بھی پایا جاتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ کے مقرر کردہ روزوں میں تبدیلی نہ کرنا بلکہ ہر سال ماہ رمضان المبارک کے روزے رکھنا خواہ وہ گہمی میں آئیں یا سُرخی میں۔ بہار میں آئیں یا خزاں میں۔ چنانچہ قمری سال کے مطابق رمضان المبارک مختلف موسموں میں آتا رہتا ہے۔ متقی بننے کا مقصد یہ ہے کہ انسانی نفس اس کے تابع ہو جائے اور احکام شریعت پر عمل آسان ہو جائے۔ فرمایا اَيَّامًا مَّعْدُودَاتٍ طے گنتی کے دن ہیں یعنی پورے سال میں انیس یا تیس دن کے روزے ہیں۔ ان کو احکام الہی جانتے ہوئے خوشی خوشی سے پورا کرو اور اپنے اندر تقویٰ جیسی عظیم خصلت پیدا کرو۔

فرمایا ماہ رمضان المبارک میں روزے رکھنے کا حکم تندرست اور مقیم کے لیے ہے، جسے روزہ رکھنے میں غیر معمولی مشقت نہ برداشت کرنی پڑے۔ البتہ ایسے لوگوں کے لیے روزے مؤخر بھی کیے جاسکتے ہیں۔ جو مقررہ ماہ میں روزہ رکھنے کے قابل نہ ہوں۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا پس جو کوئی تم میں سے بیمار ہو۔ أَوْ عَلَى سَفَرٍ یا مسافر ہو فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ تو یہ گنتی دو سکر دنوں میں پوری کر لے مثال کے طور پر کسی شخص کو بخار آتا ہے ظاہر ہے کہ اس حالت میں خاص طور پر گرمی کے موسم میں وہ زیادہ دیر تک بھوک پیاس برداشت نہیں کر سکتا۔ اگر روزہ رکھنے کی کوشش کرے گا تو بیماری میں اضافہ بھی ہو سکتا ہے۔ تو ایسی صورت میں اسے اجازت ہے کہ روزہ نہ رکھے بلکہ رمضان کے بعد چھوٹ جانے والے روزوں کے بدلے روزے رکھ لے۔

اسی طرح مسافر کو بھی روزے مؤخر کر لینے کی اجازت ہے۔ سفر آرام و سکون کا ہو یا مشقت طلب، ہوائی جہاز کا ہو یا بحری جہاز کا، ریل گاڑی کا ہو یا سبیل کا کسی

مریض اور مسافر
کا روزہ

جانور کی سولاری ہو یا پیدل سفر کر رہا ہے۔ اگر اُس کا جی نہیں چاہتا تو اسے اجازت ہے کہ روزہ قضا کرے۔ اُس پر کوئی عرج نہیں۔ رمضان کے بعد روزے رکھ سکتا ہے تاہم یہ گنتی پوری کرنی پڑے گی۔ اس سے بچ نہیں سکتا۔ یہ ایک قسم کا نصاب ہے جسے ہر حالت میں مکمل کرنا ہو گا۔ اس کی مثال ایسے ہے جیسے کوئی طالب علم کسی امتحان میں مشریک ہوتا ہے مگر کسی ایک یا دو پرچے میں ناکام ہو جاتا ہے۔ یا سرے سے وہ پرچے دیتا ہی نہیں۔ تو اسے وہ نصاب پلیمنٹری امتحان کی صورت میں پورا کرنا ہوتا ہے۔ اس کے بغیر اُسے ڈگری نہیں مل سکتی۔ اسی طرح جب تک چھوٹے ہوئے روزے پورے نہیں کرے گا، اس فرض سے عمدہ برا نہیں ہو سکتا۔ اُسے تقویٰ کی سند نہیں مل سکتی۔

روزہ کے
برے فدیہ

فَرَا عَلَى الَّذِينَ يُطِيقُونَكَ فِدْيَةَ طَعَامٍ مَسْكِينٍ اور جو لوگ اس کی طاقت رکھتے ہیں۔ اُن پر ایک مسکین کا کھانا فدیہ ہے بمفسرین کرام نے اس حصہ آیت کی مختلف تفاسیر کی ہیں۔ اہم ابن کثیر فرماتے ہیں کہ یہ حکم روزوں کا حکم آنے کے بعد ابتدائی ایک دو سال کے لیے تھا جب کہ لوگ اس مشقت سے ابھی مانوس نہیں ہوئے تھے۔ اُس زمانے میں اجازت تھی کہ جو کوئی روزہ نہ رکھے اور وہ اس قابل ہو کہ ایک روزہ کے بدلے ایک مسکین کو دین رات کا کھانا کھلائے، تو وہ ایسا کر سکتا تھا۔ جس سے اُس کا روزہ ادا ہو جاتا تھا، اس کے بعد جب اگلی آیت نازل ہوئی، تو مریض اور مسافر کے سوا روزہ رکھنا لازم قرار دے دیا گیا۔ اور اس کے ساتھ اس کے فوائد بھی سمجھائیے گئے۔

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں۔ اس آیت يُطِيقُونَكَ سے پہلے لفظ لاَ مَحْذُوف ہے اور مراد یہ ہے کہ فدیہ ادا کرنے کی رعایت ان لوگوں کے لیے ہے۔ لَا يُطِيقُونَكَ جو روزہ رکھنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس ضمن میں دو قسم کے لوگ آتے ہیں، اولادہ لوگ جو بہت بوڑھے ہو گئے ہوں۔ شیخ فانی یا محوزہ فانیہ یعنی بہت بوڑھا مرد ہے۔ یا بہت بوڑھی عورت ہے

دو چار گھنٹے بھی بغیر کھائے پیئے نہیں رہ سکتے تو ایسے لوگوں کے لیے حکم ہے کہ اگر وہ مالدار ہیں تو روزے کے بدلے ایک مسکین کو کھانا کھلا دیں۔

ثانیاً، ایسے بیمار لوگ جو لمبی بیماری میں مبتلا ہیں، تندرست ہونے کی چنداں امید نہیں کہ تندرست ہو کر روزہ قضا کر لیں گے، تو ایسے لوگ بھی روزہ کے بدلے میں اُس کا فدیہ ادا کر سکتے ہیں۔ البتہ اگر بعد میں تندرست ہو جائیں۔ تو انہیں روزہ رکھنا ہوگا، اس کے بغیر ان کی فرضیت ادا نہیں ہوگی، البتہ ادا شدہ فدیہ کا انہیں علیحدہ ثواب حاصل ہوگا۔ اسی طرح حاملہ اور دودھ پلانے والی عورت کو بھی یہ رعایت حاصل ہے کہ وہ روزہ کے بدلے میں فدیہ ادا کر دے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اس حالت میں روزہ نہ رکھے جب کہ پیٹ میں بچہ ہے۔ یا دودھ پینے والے بچے کی زندگی خطرہ میں ہے۔ تاہم مصنف عبدالرزاق میں حضرت عبداللہ بن عباسؓ کا فتویٰ موجود ہے کہ ایسی عورتوں کو روزہ معاف نہیں ہوگا۔ جب ان کی علت دور ہو جائے۔ تو روزہ قضا کرنا ہوگا۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ یُطِيقُونَهُ لفظ اطاقہ سے ہے اور یہ باب افحال سے ہے۔ اس کا معنی ہے جو لوگ روزے کی طاقت نہیں رکھتے۔ یعنی روزے سے مانوس نہیں ہیں۔ اس کے عادی نہیں ہیں۔ وہ روزے کے بدلے فدیہ دے سکتے ہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ نے اس کی دوسری تفسیر یہ بیان فرمائی ہے کہ یہاں پر فدیہ سے مراد صدقہ فطر ہے۔ جو صاحب استطاعت پر واجب ہے۔ اور یہ روزوں کا کفارہ بنتا ہے۔ اس میں اور بھی کئی ایک مصلحتیں ہیں۔ بہر حال اسے صدقہ فطر پر محمول کیا گیا ہے۔ جسکی مقدار ایک مسکین کا دو وقت کا کھانا ہے یا ہر روزہ کے بدلے دوسیر گندم یا اس کی قیمت ادا کرے۔ گندم کی بجائے اگر باجرہ وغیرہ ہے۔ تو ایک صاع یعنی چار سیر ادا کرنا ہوگا اور گندم ہے تو نصف صاع یعنی دو سیر۔

فرمایا فَمَنْ فُطِقَ خَيْرًا فَهُوَ خَيْرٌ لَّهِ اور جو کوئی خوشی سے نیکی

روزہ رکھنا
ہی بہتر ہے

کر لیا، تو یہ اس کے لیے بہتر ہے۔ یعنی اگر شرعی عذر کے باوجود روزہ رکھتا ہے تو یہ بہت اچھی بات ہے اور روزہ رکھنے والے کے لیے بہتر ہے۔ وَأَنْ تَصُومُوا خَيْرٌ لَّكُمْ یعنی اگر تم روزہ رکھتے ہو تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے اِنْ كُنْتُمْ تَعْلَمُونَ اگر تم سمجھ رکھتے ہو۔ روزہ رکھنے میں بہت سے فوائد حاصل ہوتے ہیں۔ اسکے ذریعے نفس کی اصلاح ہوتی ہے۔ قانون کی پابندی کرنے کی عادت پڑتی ہے۔ جس کی وجہ سے شریعت کے جملہ احکام کی تعمیل آسان ہوتی ہے۔ اور انسان کے لیے بندہ درستی کا ذریعہ پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم سمجھ لو جو رکھتے ہو، تو تمہارے لیے روزہ چھوڑنے کی بجائے روزہ رکھ ہی بہتر اور افضل ہے۔

شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ هُدًى لِّلنَّاسِ
وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ۚ فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ
الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ ۖ وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ
فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ ۗ يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ
بِكُمُ الْعُسْرَ ۖ وَلِتَكْمِلُوا الْعِدَّةَ وَلِتُكَبِّرُوا اللَّهَ عَلَىٰ مَا
هَدَاكُمُ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُونَ ﴿۱۸۵﴾

ترجمہ :- رمضان کا مہینہ وہ ہے جس کے اندر قرآن نازل کیا گیا ہے۔ وہ قرآن جو لوگوں کے لیے ہدایت ہے اور ہدایت کی واضح اور روشن دلیلیں ہیں اور فصلہ کھانے والی بات ہے۔ پس تم میں سے جو شخص اس مہینہ میں حاضر ہو جائے پس اُس کو اس کا روزہ رکھنا چاہیے۔ اور جو شخص بیمار ہو یا سفر پر ہو، پس دو سکرہ دنوں میں گنتی پوری کرنی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ کرتا ہے۔ اور تمہارے ساتھ دشواری کا ارادہ نہیں کرتا۔ اور تاکہ تم گنتی پوری کرو۔ اور تاکہ تم اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرو۔ جیسا کہ اُس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔

اور تاکہ تم شکر گزار بن جاؤ ﴿۱۸۵﴾

انسان کے متقی بننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے بہت سے اصول بیان فرمائے ہیں۔ پہلا قانون قصاص کی پابندی ہے اور دوسرا اصول مال کے معاملہ میں عدم زیادتی ہے۔ تاکہ کسی شخص کی حق تلفی نہ ہو۔ تقویٰ کا تیسرا اصول مقررہ اوقات میں روزہ رکھنا ہے۔ یہ سب ایسے افعال ہیں، جن کی ادائیگی سے ایک مسلمان میں تقویٰ کی صفت پیدا ہوتی ہے۔

کد شہد پیوستہ

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے روزہ کی فرضیت بیان فرمائی کہ ایمان والوں پر ایک ماہ کے روزے فرض کئے گئے ہیں۔ یہ چند گئے ہوئے دن ہیں جو کہ پورے سال میں انیس یا تیس دن ہیں اور جن میں روزہ رکھنا ضروری قرار دیا گیا ہے۔ ماہ رمضان کے روزوں کی فرضیت سے پہلے عاشورہ کا روزہ فرض تھا۔ یہ روزہ حضور نبی علیہ السلام نے بھی رکھا اور دوسرے لوگوں سے بھی رکھوایا گیا، بلکہ بچے بھی یہ روزہ رکھتے تھے۔ اس کے بعد جب رمضان کے روزوں کی فرضیت کا حکم نازل ہوا، تو عاشورہ کے روزہ کی فرضیت ختم ہو گئی۔ البتہ عاشورہ کے دو روزے رکھنے کی اب بھی بڑی فضیلت ہے۔ اور یہ بڑے اجر و ثواب کا باعث ہے۔ یوم عرفہ کا روزہ بھی بڑے ثواب کا حامل ہے۔ مگر فرض نہیں ہے اسی طرح ایام بیض یعنی ہر ماہ کے درمیانی تین روزے مستحب ہیں۔ رمضان کے بعد شوال کے چھ روزے بہت بڑے اجر کا موجب ہیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جس نے ماہ رمضان کے روزے رکھے۔ اور اس کے بعد چھ روزے شوال سے ملا لیے، وہ شخص ایسا ہے۔ جیسے پورے سال کا روزے دار ہو۔ تاہم فرضیت صرف رمضان کے روزوں کی ہے۔ جنہیں اللہ تعالیٰ نے أَيَّامًا مَعْدُودَاتٍ فرمایا۔

ماہ رمضان اور
قرآن پاک

اب آیت ذیل در کس میں ماہ رمضان کے اُن گئے چنے دنوں کی تفصیل بیان ہو رہی ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ شَهْرُ رَمَضَانَ الَّذِي رَمَضَانَ كَامِينَهُ وہ مبارک مہینہ ہے۔ أُنْزِلَ فِيهِ الْقُرْآنُ جس میں قرآن پاک نازل ہوا۔ یہ بڑی برکتوں والا مہینہ ہے۔ اور رب سے بڑی برکت یہ ہے کہ اس میں قرآن پاک کا نزول ہوا۔ نزول قرآن کے سلسلہ میں مفسرین کے بہت سے اقوال ہیں۔ مجملہ اُن کے یہ ہے کہ اس ماہ میں قرآن کریم کو نقل کر کے لوح محفوظ سے بیت العزت میں رکھا گیا جو کہ آسمان دنیا یعنی پہلے آسمان پر واقع ہے۔ اہم جعفر صادق کا قول ہے کہ اللہ تعالیٰ کی نعمتوں میں سے دو نعمتیں سب سے بڑی ہیں۔ ایک حضور علیہ السلام کا وجود مبارک اور دوسرا

قرآن پاک، کتابیں تو دنیا میں ہزاروں لاکھوں ہیں۔ مگر قرآن حکیم کوئی اور ہی چیز ہے۔
 ایں کتاب نیست، چیزے دیگر است

بہر حال یہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے۔ اس کا حکم دوسرے کلاموں جیسا نہیں ہے
 لوگوں کا مقولہ ہے کلام الملوک ملوک الکلام بادشاہوں کا کلام، کلاموں کا بادشاہ ہوتا ہے،
 مگر یہ کلام تو مالک المملک کا ہے۔ جو کہ شہنشاہ مطلق ہے، اس کا کلام کس قدر قدرت
 منزلت کا حامل ہو گا۔ لہذا یہ قرآن پاک اللہ تعالیٰ کے انعامات میں سے بہت
 بڑا انعام ہے۔

انسان بڑا ہی ناشکر گزار ہے جس نے قرآن پاک جیسی بڑی نعمت کی قدر
 نہیں کی۔ جس قوم کے پاس یہ کلام ہو، وہ بھی بھٹکتی پھرتی تو کتنی افسوس کی بات
 ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جس شخص کے پاس قرآن پاک جیسی نعمت
 موجود ہو، وہ اپنے آپ کو حقیر نہ سمجھے۔ خدا تعالیٰ کے ہاں وہ بڑی عزت والا ہے
 مگر افسوس کہ حامل قرآن نے اغراض فاسدہ اور غفلت کی وجہ سے اس کی کوئی قدر
 نہیں کی، خود تو اس سے استفادہ نہیں ہو رہے ہیں۔ باقی دنیا کو بھی محروم رکھا ہوا
 ہے۔ مسلمانوں کے پاس اللہ تعالیٰ کی اتنی بڑی نعمت موجود ہے۔ مگر پھر بھی یہ
 ناشکر گزار ہیں۔

شہر کے معنی مہینہ کے ہیں اور اس کی جمع شہور آتی ہے۔ رمضان کا
 معنی پیش ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ فرضیت روزوں کے زمانہ میں گرمی کے موسم
 میں رمضان کا مہینہ آیا تھا۔ اس واسطے اسے رمضان یعنی گرمی یا پیش والا مہینہ کہتے
 ہیں۔ رجب سے مراد عزت والا یعنی معظم مہینہ ہے۔ جمادی الاولیٰ اور جمادی الآخری
 سردی کے موسم کے مہینے تھے۔ جہد کا معنی امجد ہونا یا جم جانا ہے۔ اسی طرح شعبان
 کا معنی پراگندہ ہونا ہے۔ اس موسم میں قبائل ادھر ادھر پراگندہ ہو جاتے تھے
 ذی قعدہ، قعدہ یعنی بیٹھنے کے معنی میں آتا ہے۔ ذوالحجہ کا یہ نام اس لیے ہے
 کہ اس مہینہ میں حج ادا کیا جاتا ہے۔ محرم سے مراد حرمت والا مہینہ ہے۔ صفر

مختلف مہینوں
 کی وجہ تسمیہ

سے مراد خالی مہینہ ہے اسی طریقہ سے ربیع بہار کو کہتے ہیں۔ ربیع الاول اور آخر اسی مناسبت سے نام ہیں۔

الغرض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ رمضان کو یہ نام پیش کی وجہ سے ملا ہے۔ جب ہر چیز گرم ہو کر پگھلنے لگتی ہے، ہمیں پگھلنے اور پگھلانے کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ اسکی ایک توجیہ یہ بھی کی جاتی ہے کہ روزے رکھنے سے مسلمان کو جسمانی طور پر تکلیف پہنچتی ہے، جب وہ اس تکلیف کو برداشت کرتا ہے تو اس کے گناہ پگھلنے لگتے ہیں۔ گویا یہ مہینہ گناہوں کو پگھلانے والا مہینہ ہے۔

مسئلہ خلق قرآن

ایک زمانہ میں مسئلہ خلق قرآن پیدا ہوا تھا۔ بعض گمراہ لوگوں نے قرآن پاک کے کلام اللہ ہونے کا انکار کیا۔ اس کے بجائے قرآن کو مخلوق کہا گیا۔ اور یہ فتنہ دو تین صدیوں تک قائم رہا، البتہ اور کئی قسم کے فتنے موجود ہیں۔ اس زمانے میں اس مسئلہ کی وجہ سے اللہ والوں نے بڑی بڑی تکلیفیں برداشت کیں، کئی علماء اسی مسئلہ کی وجہ سے سولی پر لٹک گئے۔ امام احمد بن حنبلؒ نے چار سو متول کا زمانہ اسی ابتلاء میں گزاریا۔ ان پر مسلسل ظلم و ستم کے پہاڑے توڑے گئے۔ ان سے قرآن پاک کے مخلوق ہونے کا فتویٰ حاصل کرنے کی کوشش کی گئی۔ مگر آپ نے ہمیشہ انکار کیا، فرماتے تھے۔ میرے پاس اللہ کی کتاب اور رسول اللہ کی سنت ہے تم کوئی اور چیز لے کر آئے ہو تا کہ میں اس کے مطابق بات کر دوں۔ آپ نے ہزار مصائب برداشت کیے مگر قرآن و سنت کے خلاف فتویٰ نہ دیا۔

نزول قرآن

قرآن پاک کے رمضان المبارک میں نزول کے متعلق حضرت عبداللہ بن عباسؓ سعید بن جبیرؓ، اور امام حسن بصریؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کو ماہ رمضان کی ایک رات لیلۃ القدر میں لوح محفوظ سے بیت العزت میں اتارا۔ اور پھر وہاں سے پورے تیس برس ہیں محفوظاً محفوظاً کر کے حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم پر نازل فرمایا، نزول قرآن کی اس رات کے متعلق خود رب العزت نے فرمایا لَیْلَةُ الْقَدْرِ حَيَّرَ مَنْ أَلْفَ شَهْرٍ یہ تو ایک ہزار مہینوں سے

بھی زیادہ بہتر ہے۔ اگر یہ میسر آجائے۔ تو اس ایک رات کی عبادت، تو اسی سال کی عبادت سے زیادہ افضل ہے۔ یہ بڑی فضیلت والی رات ہے۔

دیگر آسمانی کتابوں کی فضیلت کے متعلق بھی بہت سی روایات آئی ہیں۔ مثلاً طبرانی شریف کی حدیث میں ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفے رمضان المبارک کی پہلی تاریخ کو نازل ہوئے۔ تو رات چھ رمضان کو اور انجیل ۱۳ رمضان کو نازل ہوئی۔ قرآن پاک چوبیس رمضان کو نازل ہوا۔ یہ تفسیری روایات سے معلوم ہوا ہے۔ بہر حال رمضان المبارک کو قرآن پاک کے ساتھ خصوصی تعلق ہے۔ یہ وہ ماہ مبارک ہے جس میں اللہ تعالیٰ نے انسان کو بہت بڑی نعمت عطا فرمائی۔

تلاوت قرآن

اس ماہ مبارک کو قرآن پاک کے ساتھ بطور یادگار خصوصی لگا دیا ہے۔ اسی لیے حکم ہے کہ اس مہینہ میں قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت کی جائے اگرچہ محض تلاوت مفتائے مقصود نہیں، بلکہ اس کا مقصد یہ ہے کہ اس سے نصیحت پکڑ لی جائے اس کے بتلائے ہوئے اصولوں کی پیروی کی جائے اور اس کے احکام پر عمل کیا جائے۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ ”مقصد از نزول قرآن محض تلفظ نیست؛ اگرچہ اس زمانہ میں محض تلاوت بھی غنیمت ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ قرآن پاک کا ایک ایک حرف پڑھنے سے دس دس نیکیاں حاصل ہوتی ہیں۔ فرمایا جب کوئی شخص خلوص دل کے ساتھ تین حرف اللہ پڑھتا ہے۔ تو تیس نیکیوں کا مستحق ہو جاتا ہے اللہ تعالیٰ کے کلام کی اس قدر برکت ہے شیخ الاسلام حضرت مولانا سعید حسین احمد مدنیؒ نے مکتوبات میں لکھا ہے کہ قرآن پاک کے علاوہ باقی جو بھی کلام یا اوراد ہیں، انہیں بغیر سمجھے پڑھنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ صرف کلام پاک ہی ایک ایسا کلام ہے۔ جسے سمجھ کر یا بے سمجھے ہر حالت میں پڑھنے سے فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس کے لیے صرف ایمان اور نیت صالحہ کی ضرورت ہے۔

قرآن کیا ہے ہُدًی للنااس یہ لوگوں کے لیے ہدایت کا سامان ہے

قرآن ذریعہ ہدایت ہے

یہ ایسی ہدایت ہے۔ جو انسان کے لیے سب سے ضروری چیز ہے آپ نماز کی ہر رکعت میں پڑھتے ہیں اِهْدِنَا الصِّرَاطَ الْمُسْتَقِيمَ۔ اے اللہ! ہم کو سیدھے راستے پر چلا اور ہمیں سیدھا راستہ دکھا، تو سیدھا راستہ وہی ہے جو قرآن پاک دکھاتا ہے یعنی اس طرح اعتقاد رکھو، اس طرح عمل کرو اور اس طرح کے اخلاق پیدا کرو اپنے معاشرتی اور معاشی مسائل کو اس طرح حل کرو، قرآن پاک میں ہے حضور علیہ السلام کی حدیث اس کی شرح ہے یہ قرآن پاک کو کھلو کہ بیان کرتی ہے امام شافعیؒ، شاہ ولی اللہؒ اور مولانا رشید احمد گنگوہیؒ فرماتے ہیں کہ ہر صحیح حدیث قرآن پاک کی شرح ہے۔ صحیح احادیث کے بغیر قرآن پاک کو سمجھنا ممکن نہیں پروردگار ہی اور چکر الہوی محض اس لیے حدیث کا انکار کرتے ہیں کہ قرآن پاک کی من مانی تفسیریں کر سکیں۔ اس طرح کہنا گمراہی کا دروازہ کھولنا ہے۔ کیونکہ احادیث کے بغیر انسان قرآن کی منزل کو نہیں پاسکتا۔ لہذا جب بھی دشواری پیش آئے قرآن پاک کی طرف رجوع کرو۔ هَلْ مِنْ مَّذْكِرٍ کون ہے جو اس سے نصیحت پکڑے۔ خود مفتی نہ بن بیٹھو، بلکہ فاسَلُوا هَلَّ الذِّكْرِ اِنْ كُنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ اگر تمہیں خود علم نہیں تو اہل علم کے پاس جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ نے قسم اٹھا کر کہا، کہ قسم ہے اُس ذات پاک کی جس کا کوئی شریک نہیں۔ حضور علیہ السلام کے بعد اپنے اس دور میں اگر مجھے معلوم ہو جائے کہ فلاں شخص مجھ سے زیادہ قرآن کریم جاننے والا ہے۔ تو میں سواری پر سوار ہو کر اُس کے پاس جاؤں، خواہ مجھے کتنا ہی لمبا سفر کرنا پڑے۔ صحابہ کرامؓ نے ایک ایک حدیث کی خاطر دو دو ماہ کا سفر کیا۔ ایک ایک مسئلہ معلوم کرنے کے لیے طویل سفر کی صعوبتیں برداشت کیں۔ مگر اس مقصد سے مہٹ کر کوئی دردِ سر مفاد حاصل نہیں کیا۔ حتیٰ کہ وہاں سے کھانا تک نہیں کھایا۔ ناشتہ تک نہیں کیا۔ اور حصولِ مقصد کے بعد فوراً واپس لوٹ گئے۔ ڈر تھا کہ ایسا کہنے سے کہیں ہمارے اجر میں کمی نہ واقع ہو جائے۔ وہ لوگ اتنے محتاط تھے۔ خراسان سے حجاز یا حجاز سے خراسان تک ہزاروں میل کی مسافت محض کسی آیت کی تشریح معلوم کرنے کے لیے طے کرتے تھے۔

مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنی تفسیر ترجمان القرآن کو مولوی محمد دین قندھاریؒ کے نام سے معنون کیا ہے۔ وجہ یہ تھی کہ مولوی صاحب نے قرآن پاک کی چند آیات کی تفسیر سمجھنے کے لیے قندھار سے رانچی تک کا سفر اختیار کیا۔ انہوں نے مولانا کے پرچے ”الہلال“ میں بعض آیات کی تفسیر پڑھی، تو کچھ شبہ پیدا ہوا جسے دور کرنے کے لیے آپ نے اتنا طویل سفر کیا۔ مولانا ان دنوں رانچی میں نظر بند تھے۔ اُس شخص نے ایسا مسئلہ حل کرنے کے بعد مسجد میں نماز ادا کی اور چٹا بنا۔ مولانا نے ہر چند کوشش کی کہ اس کی کچھ خاطر مدارت کی جائے۔ اُسے واپسی کے لیے کہہ دیا ہی فراہم کیا جائے مگر اس شخص کا کوئی پتہ نہ چلا۔ مولانا اس کے تقویٰ سے اس قدر متاثر ہو گئے کہ اپنی تفسیر کو ان کے نام سے معنون کیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ قرآن پاک لوگوں کے لیے ذریعہ ہدایت ہے۔ جو چاہے اس سے مقصد حاصل کر سکتا ہے۔

واضح اور فیصلہ کن
دلائل

فرمایا قرآن پاک سامان ہدایت ہی نہیں، بلکہ وَبَيِّنَاتٍ مِّنَ الْهُدَىٰ وَالْفُرْقَانِ ج اس میں ہدایت کے واضح دلائل موجود ہیں اور حق و باطل کے درمیان فیصلہ کن بات بھی ہے۔ یہ کسی معاملہ کو ادھر اُنہیں چھوڑنا، بلکہ حق و باطل کے درمیان امتیاز کرنا ہے۔ کہ یہ حق ہے اور یہ باطل ہے۔ لِيَهْلِكَ مَن هَلَكَ عَنْ بَيِّنَةٍ نَّامَكَ ج جسے ہلاک ہونا ہے وہ واضح بات کے بعد ہلاک ہو وَيَجِيْءُ مَن سَخِيَ بَيِّنَةٍ اور جو زندہ ہے۔ وہ واضح بات کے بعد زندہ ہے یعنی کسی انسان کے لیے کوئی عذر باقی نہیں رہنا چاہیے۔ کہ اُسے حق و باطل کی پہچان نہیں ہو سکی۔ قرآن پاک ہر چیز کی خوب خوب وضاحت کرتا ہے گویا قرآن پاک ہدایت بھی ہے اور فرقان بھی ہے۔ اسی لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ رمضان المبارک میں تراویح ادا کی جائیں جن کے دوران قرآن پاک کی تلاوت ہو۔ اور پورے رمضان میں ہر مسلمان کے کان سے کم از کم ایک دفعہ قرآن پاک گزر جائے۔ یہ خدا تعالیٰ کی ہدایت کا پردہ گرام ہے اُسے ہر گھر میں پڑھا جانا چاہیے۔ اس کی اشاعت اور تعلیم عام ہو، تاکہ کوئی نفس اس سے محروم نہ رہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تمہارے

لیے رمضان کے روزے فرض کیے اور میں نے تمہارے لیے تراویح کو سنت قرار دیا۔ اس میں قرآن پاک کی زیادہ سے زیادہ تلاوت ہونی چاہیے۔

روزہ لازم ہے

فرمایا فَمَنْ شَهِدَ مِنْكُمُ الشَّهْرَ فَلْيَصُمْهُ جو کوئی تم میں سے ماہ رمضان المبارک کو پائے، تو اُسے روزہ رکھنا چاہیے۔ گویا اس آیت کے ذریعے روزہ لازم قرار دے دیا گیا۔ اور اس سے پہلے روزہ کے محض میں فدیہ کی جو رعایت دی گئی تھی، وہ ختم ہو گئی، اب سوائے عذر شرعی ہر عاقل بالغ کے لیے روزہ ضروری ہو گیا۔ عذر شرعی میں بیمار اور مسافر آتے ہیں۔ اور شرعی سفر تین دن کی مسافت ہے جو کہ ۴ میل بنتا ہے۔ اہم البر حنیفہ کے نزدیک کم از کم اس قدر سفر کرنا ہو تو روزہ قضا کر سکتا ہے۔ بعض علماء نے کم از کم مسافت ۳۶ میل بتائی ہے۔ البتہ البوداؤد شریف کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں۔ مَنْ كَانَ لَهُ حَمُولَةٌ جس کے پاس سفر کے لیے سواری موجود ہو، اس کے لیے بہتر ہے کہ سفر میں بھی روزہ رکھے اور اگر نہیں رکھ سکے، تو بعد میں قضا بہر حال لازم ہے۔

روزے کی قضا

فرمایا وَمَنْ كَانَ مَرِيضًا أَوْ عَلَىٰ سَفَرٍ فَعِدَّةٌ مِّنْ أَيَّامٍ أُخَرَ جو کوئی بیمار ہو یا سفر پر ہو، تو دوسرے دنوں میں گنتی پوری کر لے۔ سال بھر میں ۲۹ یا ۳۰ دن کی گنتی پوری کرنا انسان کے اندر تقویٰ اور روحانیت پیدا کرنے کے لیے ضروری ہے۔ اس کے بغیر تقویٰ کا ڈپلومہ نہیں ملے گا۔ اس کی مثال ایسے ہی ہے جیسے کسی طالب علم کو سند اُسی صورت میں ملتی ہے جب وہ امتحان میں پاس ہو جاتا ہے۔ لہذا حصول تقویٰ کے لیے روزوں کی گنتی پوری کرنا لازم ہے۔ خواہ یہ رمضان کے بعد ہی کہہ دینی پڑے۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ اگر کسی شخص کے رمضان کے بعض روزے رہ جائیں اور وہ آئندہ رمضان تک ان کی قضا نہ کر سکے۔ تو پھر ہر قضا روزہ کے ساتھ اُسے دو مدغلہ بطور تادان بھی ادا کرنا ہو گا۔ اہم البر حنیفہ کا فرمان ہے کہ تادان ضروری نہیں ہے۔ اُسے روزوں کی قضا کرنی پڑے گی۔ خواہ آئندہ رمضان کے بعد ہی کیوں نہ ہو۔

فرمایا يُذِئِدُ اللّٰهُ بِكُمْ اَلْيَسْنٰى اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی کا ارادہ
 کرتا ہے۔ وَلَا يُزِيْدُ بِكُمْ اَلْعُسْرٰى تمہاری دشواری منظور نہیں۔ اس
 نے تمہاری آسانی کی خاطر تمہیں سہولتیں اور رخصتیں بھی دی ہیں۔ جیسا کہ حاملہ اور مرضعہ
 کو سہولت حاصل ہے۔ مقصد یہ ہے کہ وَلِتُكْمِلُوا الْعِدَّةَ تاکہ تم گنتی پوری
 کر لو۔ اور اس کے اثرات تمہارے اندر تقویٰ کی صورت میں ظاہر ہوں وَلِتُكَبِّرُوا
اللّٰهُ عَلَىٰ مَا هٰذِكُمْ اور تاکہ تم اللہ کی بڑائی بیان کرو جیسا کہ اُس نے تمہیں
 ہدایت دی ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ اس سے وہ تجسیمیں مراد ہیں جو رمضان المبارک
 کے اختتام پر نماز عید پر پڑھی جاتی ہیں۔ وَلَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ اور تاکہ تم اللہ
 کا شکر ادا کر لو۔ البودوؤد شریف کی روایت میں ہے۔ لِكُلِّ شَيْءٍ زَكَاةٌ
 ہر چیز کی زکوٰۃ ہوتی ہے وَزَكَاةُ الْجَسَدِ الصَّوْمُ اور جسم کی زکوٰۃ روزہ
 رکھنے سے ادا ہوتی ہے۔ اور اس طرح انسان اللہ کا شکر ادا کرتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ
 کی توفیق سے اس نے اس فریضہ کو پورا کیا۔ اور اس طرح تقویٰ اور روحانیت
 کو اپنایا اور اس سے فائدہ اٹھایا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَّةُ ۲

درس ہفتاد و چہار (۴۳)

آیت ۱۸۶

وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي فَإِنِّي قَرِيبٌ ۖ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ
إِذَا دَعَانِ ۖ فَلْيَسْتَجِيبُوا لِي وَلْيُؤْمِنُوا بِلِعَالَمِهِمْ يَرْشُدُونَ ﴿۱۸۶﴾

ترجمہ: اور جب میرے بندے آپ کے میرے بارے میں پوچھتے ہیں، پس میں قریب ہوں۔ میں دعا کرنے والے کی دعا قبول کرتا ہوں، جب وہ مجھ سے دعا کرتا ہے پس چاہیے کہ یہ لوگ میرا حکم مانیں اور چاہیے کہ یہ مجھ پر یقین رکھیں۔ تاکہ یہ ٹھیک راہ پا جائیں (۱۸۶)

شاید نفل

آیت زہر در کس سے ماقبل اور مابعد آیات روزہ سے متعلق ہیں۔ پہلی آیت میں مخدور لوگوں کو حاصل ہونے والی رعایت کا ذکر تھا۔ اور بعد والی آیت میں روزے کے احکام ہیں۔ اس درمیانی آیت میں اُس دعا کا ذکر ہے۔ جو بندہ اپنے رب کے حضور کرتا ہے گذشتہ آیت کے آخری حصہ میں اللہ تعالیٰ کی بڑائی بیان کرنے اور اس کا شکریہ ادا کرنے کا بیان تھا۔ اس ضمن میں بعض حضرات نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے سوال کیا کہ اللہ تعالیٰ کو کس طرح پکارنا چاہیے۔ کیا وہ انسان کے قریب ہے یا بعید۔ اگر قریب ہے تو اس کے ساتھ سرگوشی سے مناجات کریں۔ اور اگر وہ دور ہے تو زور سے پکاریں۔ اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَإِذَا سَأَلَكَ عِبَادِي عَنِّي جب میرے بندے میرے بارے میں آپ سے سوال کریں، فَأِنِّي قَرِيبٌ تو میں ان کے بالکل قریب ہوں۔ أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ میں دعا کرنے والے کی دعا کو سنتا ہوں، جب وہ دعا کرتا ہے، اور مجھے پکارتا ہے۔

رمضان اور قبولیت نما

روحانیت کے لحاظ سے رمضان کا مہینہ ایسا ہی ہے۔ جیسے سال بھر کے مہینوں میں موسم بہار ہوتا ہے۔ جب ہر چیز اپنے جو بن پدہ ہوتی ہے اسی طرح

رمضان شریف میں دو ستر مہینوں کی نسبت نیچی کی قدر قیمت اور وقت کمی گنا بڑھ جاتی ہے۔ حضور علیہ السلام فرماتے ہیں کہ نفل فرض کے برابر ہو جاتا ہے۔ اور ایک فرض ستر فرضوں کے اجر کے برابر ہوتا ہے، ترمذی شریف میں امام زہریؒ کا قول ہے فرماتے ہیں تسبیحۃ فی رمضان خیر من الف تسبیحۃ فیما سواہ رمضان المبارک میں اخلاص کے ساتھ کی گئی ایک تسبیح غیر رمضان کی ایک ہزار تسبیح سے بڑھ جاتی ہے۔ گویا یہ مہینہ تکمیل روحانیت کے لیے موسم بہار کا درجہ رکھتا ہے۔ لہذا قبولیت دعا کے لیے بھی یہ مبارک مہینہ خصوصی اہمیت کا حامل ہے دعا کی قبولیت میں زمان اور مکان کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ اس لحاظ سے رمضان کا مہینہ ایسا مبارک مہینہ ہے۔ جس میں دعا زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ زمان کے لحاظ سے حضور نے جُوفَ اللَّیْلِ الْآخِرِ یعنی رات کے آخری حصہ کا ذکر فرمایا کہ قبولیت دعا کا وقت ہوتا ہے جمعۃ المبارک کے متعلق بھی فرمایا کہ اس روز ایک ایسی گھڑی ہوتی ہے۔ جس میں دعا ضرور قبول ہو جاتی ہے۔ مکان کے لحاظ سے ایسے بہت سے مقامات ہیں جہاں کی گئی دعائیں لازمی قبول ہوتی ہیں جیسے مقامات مقدسہ منیٰ، عرفات، مزدلفہ، صفا و مروہ۔ بیت اللہ شریف، ملترم حطیم وغیرہ۔

ایک حدیث میں یوں آتا ہے کہ جو شخص رمضان المبارک میں مانگتا ہے، اللہ تعالیٰ اس کو ناکام نہیں لٹاتا۔ دعا ہمارے دین کا اہم حصہ ہے۔ عبادت کا ایک اہم اصول ہے الدعاء هو العبادۃ دعا عبادت ہی ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے۔ قرآن پاک میں آتا ہے اِنَّ الَّذِیْنَ یَسْتَكْبِرُوْنَ عَنْ عِبَادَتِیْ جَٰوِلٌ مِّرَے سامنے دعا کرنے سے تکبر کرتے ہیں۔ وہ ذلیل ہو کر دوزخ میں داخل ہوں گے۔ متذکر حاکم کی روایت میں یہ الفاظ آتے ہیں الدعاء نور المؤمن سلاح المؤمن، نور السموات والارض، عماد الدین یعنی دعا مؤمن کا نور ہے۔ مؤمن کا ہتھیار ہے۔ زمین و آسمان کا نور اور دین کا ستون ہے۔

اللہ تعالیٰ کا ذکر آہستہ آواز سے کرنا چاہیئے۔ یا بلند آواز سے اس کا بیان آ
 آداب چکا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ میں بندے سے بالکل قریب ہوں۔ ایک
 موقع پر سفر کی حالت تھی۔ صحابہ کرام حضور علیہ السلام کے ہم کرکاب تھے۔ اور بلند آواز
 سے ذکر الہی یعنی تجسیر و تسلیل میں مصروف تھے آپ نے ارشاد فرمایا اِرْجِعُوا عَلٰی اَنْفُسِكُمْ
 لو کہ! اپنی جانوں پر نرمی اختیار کرو۔ تم جس ذات کو پکار رہے ہو، وہ بعید نہیں ہے۔
 وہ تو قریب ہے۔ لہذا بلند آواز سے چیخ و پکار نہ کرو۔ ترمذی شریف کی حدیث میں آتا
 ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری سواری کی گردن سے بھی زیادہ قریب ہے۔ البتہ قرآن کریم
 میں یہ بھی موجود ہے وَحَنُّ اَقْرَبُ اِلَيْهِ مِنْ حَبْلِ الْوَرِيدِ
 ہم تو انسان کی رگ جاں سے بھی زیادہ قریب ہیں۔ لہذا اُسے آہستگی سے پکارو
 اور اس کے سامنے آہستہ اور خاموشی سے دُعا کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔
 اَدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَخُفْيَةً اپنے رب کو عاجزی سے پوشیدہ اور
 گڑ گڑا کر پکارو۔

البتہ اونچی آواز سے دُعا کرنا بھی جائز ہے۔ لیکن بلند آواز اس جگہ پر ہوگی جہاں
 کسی کو تکلیف نہ پہنچتی ہو۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ آواز بلند کرنے سے اگر کسی
 کی نماز میں خلل واقع ہوتا ہو یا تلاوت منقطع ہوتی ہو تو پھر بلند آواز سے دُعا کرنا بھی
 مکروہ ہے۔ لہذا آہستہ آواز سے پکارنا ہی بہتر ہے اگرچہ با آواز بلند بھی روا ہے
 حضرت زکریا علیہ السلام کے بیان میں خود قرآن پاک کا ارشاد ہے اِذْ سَأَلَهُ
 رَبُّهُ بِسَاءِ خَفِيٍّ جَبَّ کہ وہ چپکے چپکے اپنے رب کے سامنے دُعا
 کر رہے تھے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد بھی ہے۔ خَيْرُ الذِّكْرِ مَا يَخْفَى
 بہتر ذکر وہ ہے جو مخفی ہو دوسری جگہ فرمایا خَيْرُ الذِّكْرِ الْخَفِيُّ وَخَيْرُ الرِّزْقِ
 مَا يَكْفِي بہترین ذکر وہ ہے جو پوشیدہ ہو اور بہترین روزی وہ ہے
 جو کفایت کر جائے۔

غرضیکہ مخفی ذکر میں ایک تو دوسرے کی ایذا رسانی نہیں ہوتی اور دوسرے

ریکاری سے بچ جاتا ہے۔ لوگ بلند آواز سے ذکر و اذکار کرتے ہیں اور درود شریف پڑھتے ہیں۔ لاوڈ سپیکر کھول کر اہل محلہ بیماروں اور دیگر عبادت گزاروں کے لیے ایذا رسانی کا باعث بنتے ہیں۔ دوسروں کی عبادت میں خلل انداز ہوتے ہیں۔ یہ اچھی علامت نہیں ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ ہم نیک کام کر رہے ہیں۔ حالانکہ اس سے دوسروں کو تکلیف ہو رہی ہے۔ ایسی صورت میں آپ کی عبادت اللہ کی بارگاہ میں باعث گناہ ہو سکتی ہے۔

بہر حال ماہ رمضان سے متعلق دو آیات کے درمیان دُعا کا ذکر اس لیے ہوا۔ کہ اس ماہ مبارک میں دُعا زیادہ مقبول ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے واضح فرمایا کہ میرے بندے جب بھی مجھے پکاریں، میں قریب ہوں دُعا کرنے والے کی دُعا سُننا ہوں اور اُسے مقبول کرنا ہوں مگر دو شرائط کے ساتھ۔ ایک یہ کہ دُعا کرنے والا میرے حکم کو مانے اور دوسری یہ کہ وہ ایمان رکھتا ہو۔

شاہ ولی اللہ دہلوی کا خاندان برصغیر پاک و ہند کا مشہور خاندان ہے۔ اس خاندان کے علمی کارنامے ساری دنیا میں مشہور ہیں۔ آپ کے والد بزرگوار مولانا شاہ عبدالرحیم برٹے پائے کے بزرگ تھے۔ آپ ان پانچ سو علماء کی مجلس کے رکن تھے جنہیں اورنگ زیب عالمگیر نے فتاویٰ عالمگیری مرتب کرنے کے لیے منتخب کیا تھا۔ یہ سارے علماء بادشاہ سے تنخواہ پاتے تھے۔ مگر شاہ عبدالرحیم کو یہ چیز کھٹکتی تھی۔ اُن کا ضمیر تنخواہ لینا پسند نہیں کرتا تھا۔ جب عالمگیر نے آپ کا نام اس مجلس سے خارج کر دیا۔ تو آپ نے اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کیا۔ کہ اُس نے انہیں اس معاملے سے بچا لیا جسے وہ پسند نہیں کرتے تھے اس کے بعد آپ نے مدرسہ قائم کر کے درس و تدریس کا کام شروع کر دیا۔ آپ اہل مجدد الف ثانی کے مریدوں کے سرپرست تھے۔

خاندان
شاہ ولی اللہ

شاہ ولی اللہ بارہویں صدی ہجری مجدد تھے۔ آپ نے دین اور علم کی تجدید کی آپ نے سب سے پہلے فارسی زبان میں فتح الرحمن فی ترجمۃ القرآن کے نام سے

سے قرآن پاک کا ترجمہ لکھا۔ اُس وقت فارسی ہی دفتری زبان تھی۔ لہذا اس زبان میں استفادہ کا زیادہ امکان تھا۔ اُس وقت اردو زبان ابھی ترقی کے ابتدائی مراحل میں تھی۔ تاہم آپ کے فرزند ارجمند شاہ رفیع الدینؒ نے اردو زبان میں قرآن پاک کا سب سے پہلا ترجمہ کیا۔ اگرچہ آج وہ زبان پرانی ہو چکی ہے۔ تاہم یہ لفظی ترجمہ کمال درجے کا ہے آپ نے قرآن پاک کی تفسیر و تشریح کا سلسلہ بھی شروع کیا۔ اور آپ کے ایک شاگرد نے آپ کے ارشادات نوٹ کر کے سورۃ بقرہ کا حصہ شائع بھی کیا۔

شاہ عبدالعزیزؒ کی تفسیر عزیزی بھی اپنی نوعیت کی بہترین تفسیر میں سے ہے یہ تفسیر شاہ صاحب نے اپنے ہاتھ سے نہیں لکھی، آپ تو نابینا ہو چکے تھے۔ اس لیے یہ خدمت آپ کے شاگردوں نے انجام دی۔ آپ تو زبانی تفسیر بیان کرتے تھے۔ ہفتہ میں ایک دن وعظ بھی کرتے تھے۔ جس میں ہزاروں لوگ شریک ہو کر فیضیاب ہوتے تھے۔ بعض اوقات غیر مسلم بھی اس پاکیزہ مجلس میں شریک ہوتے اور ایمان کی دولت سے مالا مال ہو کر جاتے، وعظ اتنا مؤثر ہوتا تھا کہ اپنا محاورہ درست کرنے کے لیے شاعر لوگ بھی مجلس وعظ میں بیٹھ جاتے۔ اُس زمانے میں مومن خان مومن بڑا مشہور شاعر ہوا ہے۔ صحیح العقیدہ آدمی تھا۔ شاہ صاحب کی محفل میں شریک تھا، کسی نے پوچھا آپ تو وعظ وغیرہ کے شائق نہیں ہیں، آپ کیسے تشریف لائے۔ تو وہ کہنے لگا، کہ شاہ صاحب کی زبان کی شستگی حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوتا ہوں۔ آپ کی زبان سے نکلے ہوئے الفاظ ہم لوگ محاورہ میں استعمال کر کے اپنی شاعری کو چمکاتے ہیں۔

مولانا انور شاہ صاحب کشمیریؒ فرماتے ہیں۔ کہ اگر یہ تفسیر مکمل ہو جاتی تو کہا جاسکتا تھا۔ کہ امت نے قرآن پاک کا حق ادا کر دیا ہے۔ غرضیکہ یہ تفسیر پُر مغز، بامحاورہ اور حکمت آمیز تفسیر ہے۔ یہ تفسیر قرآن پاک کے آخری دو پاروں اور دوسرے پارہ میں کُتِبَ عَلَیْکُمُ الصَّیَامُ تک ہے۔ اس کے بعد شاہ صاحب وفات پا گئے اور یہ سلسلہ یہیں رُک گیا۔ بہر حال جتنا حصہ بھی میسر ہے، حکیمانہ تفسیر کے لحاظ سے بہترین تفسیر ہے۔

شاہ عبدالقادرؒ نے بھی قرآن پاک کا اردو ترجمہ کیا۔ جسے حضرت مولانا احمد علی لاہوریؒ نے مزید سلیس کیا ہے۔ مولانا شیخ الحدادؒ کا ترجمہ جو میرے سامنے ہے، وہ شاہ عبدالقادرؒ کے ترجمہ کی آسان صورت ہے۔ آپ نے ایڈورڈ روڈ دہلی کی اکبری مسجد میں بارہ سال تک استکفاف کیا اور یہ ترجمہ لکھا۔ جو کہ بالکل بامحاورہ اور سلیس ترین ہے۔ تاج کھنی اور دیگر اداروں نے اس کے بیشمار ایڈیشن شائع کیے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نے بھی آج سے اسی برس قبل قرآن پاک کا ترجمہ اور تفسیر لکھی۔ آپ نے ترجمہ قرآن کو اور زیادہ آسان کرنے کی کوشش کی۔ اپنی نوعیت کی یہ بھی کمال درجے کی کاوش ہے۔ اس کے بعد اور بھی بہت سے حضرات نے قرآن پاک کے تراجم لکھے ہیں۔

قرب خداوندی

الغرض! شاہ رفیع الدینؒ تفسیر ربیعی میں فَاِنِیْ قَرِیْبٌ کی تفسیر بیان کرتے ہوئے فرماتے ہیں کہ قرب خداوندی کی کئی ایک صورتیں ہیں مثلاً خدا تعالیٰ باعتبار ذات قریب ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ تمام موجودات میں کوئی ایک ذرہ بھی ایسا نہیں، جس کا قیام اور بقا خدا تعالیٰ کے وجود کے بغیر حاصل ہو۔ خدا تعالیٰ کی صفت قیومیت کی وجہ سے ہر چیز کو وجود حاصل ہوتا ہے۔ لہذا اللہ تعالیٰ وجود اور ذات کے اعتبار سے قریب ہے۔

علم اور قدرت کے لحاظ سے بھی خدا تعالیٰ قریب ہے۔ کیونکہ اُس کے علم، ارادے اور تاثیر کے بغیر کوئی چیز حاصل نہیں ہو سکتی۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ محبت اور حمایت کے اعتبار سے بھی قریب ہے۔ اللہ تعالیٰ تجلی کے اعتبار سے بھی قریب ہے، جب انسان اللہ تعالیٰ کو اپنے دل میں یاد کرتا ہے، تو ادھر سے تجلی پڑتی ہے اسی طرح عبدیت کے رابطہ کے اعتبار سے بھی خداوند تعالیٰ قریب ہے انبیاء علیہ السلام کو بارگاہِ خداوندی کے ساتھ براہِ راست رابطہ حاصل ہوتا ہے۔ یہ رابطہ وحی کی صورت میں ہوتا ہے۔ اولیاء اللہ کو انبیاء کے کرام کے بتلانے سے قرب خداوندی حاصل ہوتا ہے۔ اور عام لوگوں کو رابطہ بندگی کے ذریعہ اللہ کا قرب حاصل ہوتا ہے

یہ تو یہودی اور عیسائی سب تسلیم کرتے ہیں کہ آدم علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے بغیر ماں باپ کے مٹی سے پیدا کیا۔ بائبل اور قرآن دونوں کتابوں میں یہ آیات موجود ہیں۔ لہذا اگر تم آدم علیہ السلام کو ماں باپ کے وسیلہ کے بغیر مانتے ہو تو عیسیٰ علیہ السلام کو بغیر باپ کے کیوں تسلیم نہیں کرتے۔ گویا اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے ایک عجیب و غریب چیز پر قیاس کر کے مسیح علیہ السلام کی پیدائش کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ تو فرمایا بیشک عیسیٰ علیہ السلام کی مثال اللہ کے نزدیک ایسی ہے جیسے آدم علیہ السلام کی مثال خَلَقَهُ مِنْ تُرَابٍ اُسے اللہ نے مٹی سے پیدا کیا۔ پھر نَفَخَ فِيهِ الرُّوحَ اس میں جان ڈالی۔ قرآن پاک میں خشک مٹی اور گارے کا ذکر بھی آتا ہے گارے میں جب خمیر پیدا ہوتا ہے تو وہ گل سڑ جاتا ہے۔ یہ وہ عنصر (ELEMENT) ہے جس سے آدم علیہ السلام کی تخلیق ہوئی۔ اُسے قرآن پاک میں صَلْصَالٍ اور حَمًا مَسْنُونٍ بھی کہا گیا ہے۔ اور پھر یہ بھی ذکر آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پیدا فرما کر اپنے دست قدرت سے اس میں روح ڈالی۔ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُنْ فَيَكُونُ پھر اُسے کہا ہو جاؤ، تو وہ کامل انسان ہو گیا۔ آدم علیہ السلام کامل انسان تھے۔ عقلمند ایسے کہ نبی سے زیادہ کوئی شخص عقلمند، ذہین اور دانا نہیں ہو سکتا۔ دارون کا نظریہ بالکل باطل ہے جس میں وہ کہتا ہے کہ اولین انسان کی تخلیق بطور بندر ہوئی، پھر آہستہ آہستہ ترقی کر کے انسان بن گیا۔ یہ بالکل غلط بات ہے۔ حضور نے فرمایا بَشَرًا مَكْلَمًا آدم علیہ السلام نبی مکلم تھے۔ نبی ہمیشہ کامل انسان ہوتا ہے۔ آدم علیہ السلام سب سے پہلے انسان اور نبی تھے۔ اور بالکل مکمل انسان تھے۔ سمجھانا یہ مطلوب ہے کہ جب اللہ تعالیٰ بغیر ماں باپ کے مٹی سے انسان کی تخلیق کر لیتا ہے۔ تو عیسیٰ کو بغیر باپ کے پیدا فرما دینا کون سی شکل بات ہے۔ یہ کوئی تعجب کی بات نہیں ہے۔ لہذا عیسیٰ علیہ السلام عبد اللہ یعنی اللہ کے بندے ہیں، وہ خود اللہ نہیں ہیں۔ فرمایا الْحَقُّ مِنْ رَبِّكَ الْحَقُّ وہ ہے جو تیرے پروردگار کی طرف سے

غافل ہے سو لعب میں مشغول ہے۔ اُس کی دُعا قبول نہیں کی جاتی۔ نیز یہ بھی آتا ہے کہ دُعا جب پورے یقین کے ساتھ کی جائے گی تو اللہ تعالیٰ ضرور قبول فرمائیں گے۔ حضرت یحییٰ معاذ رازیؑ بڑے پائے کے بزرگ ہوئے ہیں۔ ایک موقع پر فرمایا کَيْفَ اَدْعُوْكَ وَاَنَا اِثْمٌ یعنی پروردگار! میں تجھ سے کیسے دُعا کروں۔ کیونکہ میں تو گنہگار ہوں۔ پھر عیدی سے فرمایا کَيْفَ لَا اَدْعُوْكَ وَاَنْتَ كَرِيْمٌ میں تیرے سامنے کس طرح نہ دُعا کروں چنانکہ تو کریم ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کریم ہے وہ حیا کرتا ہے۔ جب اس کا بندہ دُعا کے لیے ہاتھ اٹھاتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس بات کو ناپسند کرتا ہے کہ بندے کے ہاتھ خالی ٹوٹنے لہذا اس کی دُعا ضرور قبول کر لیتا ہے اور حدیث شریف میں ایسی دُعا سے پناہ مانگی گئی ہے جو قبول نہ ہو۔

دُعا کی قبولیت کا معنی بھی سمجھ لیا چاہیے۔ قبولیت دعا صرف اسی چیز کا نام نہیں کہ انسان جو مانگے فوراً مل جائے بلکہ کسی چیز کا حاصل ہونا تو حکمت خداوندی کے مطابق ہوتا ہے اور بعض اوقات انسانی ذہن بالکل بچوں والی حرکات کر بیٹھتا ہے وہ اللہ سے ایسی چیز طلب کرتا ہے جو اس کی حکمت کے مطابق انسان کے لیے بہتر نہیں ہوتی لہذا اللہ تعالیٰ ایسی چیز اس کے مقدر میں نہیں کرتا۔ انسان سمجھتا ہے کہ اُس کی دُعا قبول نہیں ہوئی۔ حالانکہ اُس چیز

کا نہ ملنا ہی اُس کی خیر خواہی میں ہوتا ہے۔ اس کی مثال ایسی ہی ہے جیسے کوئی ناکھ بچہ اصرار کرے کہ آگ کا انگارہ اُس کے ہاتھ میں پھڑا دیا جائے۔ مگر کون غفلت نہ ہوگا جو بچے کی یہ خواہش پوری نہ کیا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ انسان کی دُعا قبول ضرور کرتا ہے مگر اپنی مصلحت کے مطابق۔ حضور علیہ السلام نے قبولیت دُعا کی تین صورتیں بیان فرمائی ہیں۔ جب دُعا مصلحت خداوندی کے مطابق ہوتی ہے، تو وہ فوراً قبول کر لی جاتی ہے۔ اور بندہ کو اسکی مطلوبہ چیز دے دی جاتی ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ مطلوبہ شے تو بندہ کو نہیں ملتی مگر اُس دُعا کی برکت سے بندہ پر نازل ہونے

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

اَلْاَمْرَانِ ۳

درس بستم ۲

آیت ۶۱ تا ۶۳

فَمَنْ حَاجَّكَ فِيهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَكَ مِنَ
 الْعِلْمِ فَقُلْ تَعَالَوْا نَدْعُ أَبْنَاءَنَا وَأَبْنَاءَكُمْ وَ
 نِسَاءَنَا وَنِسَاءَكُمْ وَأَنْفُسَنَا وَأَنْفُسَكُمْ ثُمَّ
 نَبْتَهِلْ فَنَجْعَلْ لَعْنَتَ اللَّهِ عَلَى الْكَاذِبِينَ ﴿٦١﴾
 إِنَّ هَذَا لَهُوَ الْقَصَصُ الْحَقُّ وَمَا مِنْ إِلَهٍ إِلَّا اللَّهُ
 وَإِنَّ اللَّهَ لَهُوَ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ ﴿٦٢﴾ فَإِنْ تَوَلَّوْا
 فَإِنَّ اللَّهَ عَلَيْهِ بِالْمُفْسِدِينَ ﴿٦٣﴾

خلاصہ

ترجمہ: پس جو شخص اس باسے میں آپ سے جھگڑا کرے بعد اس کے کہ آپ
 کے پاس علم آچکا ہے۔ پس کہہ دیجئے، آؤ، بلائیں ہم اپنی اولادوں کو، تم اپنی اولادوں
 کو، ہم اپنی عورتوں کو، تم اپنی عورتوں کو، ہم اپنی جانوں کو، تم اپنی جانوں کو۔ پھر ہم
 التجا کریں اور گڑگڑائیں۔ پھر ہم سب اللہ کی لعنت کریں اُن لوگوں پر جو جھوٹیں ﴿٦١﴾
 بیشک یہی بات صحیح اور سچا بیان ہے۔ اور نہیں ہے کوئی عبادت کے لائق سوائے
 اللہ کے۔ اور بیشک البتہ اللہ زبردست اور حکمت والا ہے ﴿٦٢﴾ پس اگر یہ
 لوگ قبول نہ کریں، تو بیشک اللہ خوب جانتا ہے مفسدوں کو ﴿٦٣﴾

گذشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ مسیح علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے بندے
 اور رسول ہیں۔ وہ نہ تو خدا کے بیٹے ہیں اور نہ خود خدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو
 فضیلت عطا فرمائی ہے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے یہ بات ایک واضح مثال کے
 ذریعے سمجھائی۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام کا بغیر باپ کے پیدا ہونا ناممکنات میں سے
 نہیں ہے۔ آپ کی مثال حضرت آدم علیہ السلام کی مثال جیسی ہے۔ جسے

أَحِلَّ لَكُمْ لَيْلَةَ الصِّيَامِ الرَّفَثُ إِلَى نِسَائِكُمْ هُنَّ لِبَاسٌ لَكُمْ وَأَنْتُمْ لِبَاسٌ لَهُنَّ ۚ عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ كُنْتُمْ تَخْتَانُونَ أَنْفُسَكُمْ فَتَابَ عَلَيْكُمْ وَعَفَا عَنْكُمْ ۚ فَالْآنَ بَاشِرُوهُنَّ وَابْتَغُوا مَا كَتَبَ اللَّهُ لَكُمْ ۚ وَكُلُوا وَاشْرَبُوا حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَبْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ مِنَ الْفَجْرِ ۚ ثُمَّ أَتُمُوا الصِّيَامَ إِلَى اللَّيْلِ ۚ وَلَا تُبَاشِرُوهُنَّ وَأَنْتُمْ عَاكِفُونَ فِي الْمَسَجِدِ ۚ تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْرُبُوهَا ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَّقُونَ ﴿۱۸۷﴾

ترجمہ :- حلال قرار دیا گیا ہے تمہارے لیے روزہ کی راتوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ بے پردہ ہونا۔ وہ تمہارے لیے بمنزلہ لباس کے ہیں۔ اور تم اُن کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم اپنی جانوں کے ساتھ خیانت کرتے تھے پس اللہ نے تمہارے اوپر رجوع فرمایا ہے ہر بانی کے ساتھ، اور تم کو معاف کر دیا ہے۔ پس اب ابو عورتوں سے اور تلاش کرو وہ چیز جو اللہ نے تمہارے لیے لکھ دی ہے اور کھاؤ اور پو پو یہاں تک کہ صاف ظاہر ہو جائے تمہارے لیے سفید دھاگایا دھاگے سے فجر سے۔ پھر پورا کرو روزہ کو رات تک۔ اور نہ ابو عورتوں سے اس حال میں کہ تم مسجدوں میں اعتکاف بیٹھنے والے ہو۔ یہ اللہ کی قائم کردہ حدیں ہیں پس اُن کے قریب نہ جاؤ۔ اسی طریقے سے اللہ تعالیٰ اپنی آیتیں لوگوں کے لیے بیان فرماتے ہیں تاکہ وہ متقی بن جائیں۔ ﴿۱۸۷﴾

زیادہ سمجھدار اور صاحب رائے تھا وہ کہنے لگا وَاللّٰهِ لَقَدْ عَرَفْتُمْ نَبُوْتَهُ
خدا کی قسم تم اس شخص کی نبوت کو پہچان چکے ہو۔ وَلَقَدْ جَاءَكُمْ بِالْفَصْلِ
فَإِنْ أَمَرٌ مِّنْ صَاحِبِكُمْ أَوْ تَمَارِئِهِ صَاحِبٌ لِّعِيسَىٰ عَلَيْهِ السَّلَامُ كَے
متعلق اس نے فیصلہ کن بات کی ہے۔ کہ عیسیٰ علیہ السلام خدا کے بندے

اور اس کے رسول ہیں۔ وہ الہ نہرگز نہیں ہیں۔ اور میں کہتا ہوں وَاللّٰهِ مَا بَآهَلَ
قَوْمٌ سَيِّئًا إِلَّا هَلَكَوْا خدا کی قسم جس قوم نے بھی کسی نبی سے مباہلہ کیا، وہ قوم
ہلاک ہو گئی۔ فَإِنْ أَبَيْتُمْ إِلَّا إِلَافَتَ دِينِكُمْ اور اگر تم اس رسول
برحق کا انکار کرتے ہو۔ اور اپنے ہی دین پر قائم رہنا چاہتے ہو۔ فَوَادِعُ الْجَلْ
تو اس شخص کے ساتھ موافقت کر لو، مصالحت کر لو۔ اور یہاں سے واپس چلے جاؤ

چنانچہ وہ لوگ مشورہ کے لیے باہر چلے گئے۔ حضور علیہ السلام خود بھی گھر
تشریف لے گئے۔ اور پھر اس حالت میں باہر آئے کہ حضرت حسینؑ آپ کی
گود میں تھے۔ وَآخَذَ بِمِصَدِّ الْحَسَنِ اور آپ نے حضرت حسنؑ کا ہاتھ پکڑا
ہوا تھا۔ حضرت فاطمہؑ آپ کے پیچھے پیچھے آرہی تھیں۔ اور حضرت علیؑ
اُن کے پیچھے تھے۔ آپ اُن سے فرما رہے تھے إِذَا نَادَعَوْتُمْ فَاِمْتَنُوا
جب میں مباہلے کے لیے دُعا کروں، تو تم آمین کہنا۔ گویا آپ مباہلہ کے لیے
بالکل تیار ہو کر تشریف لے آئے۔ جب عیسائیوں نے آپ کو اس حالت میں
دیکھا تو ان کا لاٹ پادری اپنے ساتھیوں سے کہنے لگا لِمَعَشَى النَّصَارَى
اے نصاریٰ کے گمروہ! اِنِّیْ لَا رَیَّ وَجُوهًا میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں
لَوْ سَأَلُوا اللّٰهَ اَنْ یَّسْرِیْلَ جَبَلًا مِنْ مَّكَانِهِ لَآ ذَالَ اِمْ
یہ اللہ تعالیٰ سے سوال کریں کہ یہ پہاڑ اپنی جگہ سے ہٹ جائے، تو وہ ضرور ہٹا
دے گا۔ لہذا تمہاری خیریت اسی بات میں ہے فَلَا تُبَاہِلُوْا
کہ تم مباہلہ نہ کرو، ورنہ تم تباہ و برباد ہو جاؤ گے۔

چنانچہ عیسائیوں کے وفد نے مباہلے کا چیلنج قبول نہ کیا۔ اور ان شر الطیر

واقعہ پیش آیا تھا کہ اپنی بیوی سے مباشرت کر لی اور حضور علیہ السلام کے سامنے اس غلطی کا اعتراف کیا۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے افسوس کا اظہار کیا اور فرمایا کہ ایسا نہیں کرنا چاہیئے تھا۔ اس قسم کے واقعات پیش آنے پر اللہ تعالیٰ نے یہ پابندی دے کر کہ اہل اسلام کے لیے آسانی پیدا کر دی۔ اب رات کے وقت اعتدال سحر ہی تک کے لیے یہ پابندی ہٹالی گئی۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے أَحِلَّ لَكُمْ أَنْ تَلْبَسُوا الدِّفْعَةَ إِلَى نِسَاءِكُمْ طَحْلًا قرار دیا گیا ہے۔ تمہارے لیے رمضان کی راتوں میں اپنی عورتوں کے ساتھ بے پردہ ہونا۔ رفت کا معنی اعرابی اور بے حجابی کی بات کہنا ہے۔ اور مرد عورت سے ملنا، اس سے مباشرت کہنا ہے۔

فلسفہ لباس

آگے عورتوں کو بمنزلہ لباس قرار دیکر لباس کی حکمت اور فلسفہ بھی بیان کر دیا
هَٰذَا لِبَاسٌ لَّكُمْ یہ عورتیں تمہارے لیے لباس کی مانند ہیں وَكَأَنَّكُمْ
لِبَاسٌ لَّهُنَّ اور تم ان کے لیے بمنزلہ لباس کے ہو گویا ان دو جملوں میں پوری از دوامی زندگی کا فلسفہ بیان کر دیا ہے۔ لباس انسان کے جسم کے ساتھ ملا ہوا ہوتا ہے۔ جس طرح انسانی جسم اور لباس کے درمیان کوئی پردہ حامل نہیں ہوتا۔ اسی طرح میاں بیوی کے درمیان کوئی پردہ نہیں ہوتا۔ لہذا تم اپنی عورتوں سے مستفید ہو سکتے ہو۔ لباس کا دوسرا فائدہ یہ ہے کہ اس سے انسان کو زینت حاصل ہوتی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دو کمرے مقام پر لباس کی حکمت اور فلسفہ خود بیان فرمایا ہے۔ وَأَنْزَلْنَا عَلَيْكُمْ لِبَاسًا لِيُكَلِّمُوا بِأَرْوَاحِهِمْ سَوَآتَكُمْ وَرِيشًا یعنی ہم نے تمہارے لیے لباس پیدا کیا۔ اس کے دو فائدے ہیں۔ ایک تو یہ ستر پوشی کہنا ہے، جو فطری چیز ہے کہ اس کے بغیر انسان اور حیوان میں امتیاز باقی نہیں رہتا۔ اور دوسرا یہ زینت کا باعث بھی ہے۔ الْبَاسُ بِاللِّبَاسِ لوگ لباس کے ساتھ ہی پہنچتے ہیں، لباس کے بغیر کوئی زینت نہیں۔ چونکہ عورت مرد کے لیے زیب و زینت کی بنیاد ہے اس لیے عورت کو لباس کے ساتھ

کہ جنت صرف انہی کے لیے ہے، کوئی دوسرا شخص جنت میں داخل نہیں ہوگا تو پھر یہ لوگ موت کی تمنا کیوں نہیں کرتے، حضور نے فرمایا۔ اگر یہ موت کی تمنا کرتے تو فوراً مر جاتے۔ اور اپنا ٹھکانا دوزخ میں دیکھ لیتے۔ قرآن پاک کا دعویٰ اس قدر سچا ہے۔ کہ یہودیوں نے کبھی موت کی تمنا نہیں کی۔ نیز فرمایا کہ اگرہم نجران کے عیسائی مباہلہ پر آمادہ ہو جاتے، تو جب واپس لوٹتے نہ اُن کا مال باقی رہتا نہ اہل۔ ہر چیز فنا ہو جاتی۔ ایک دوسری روایت میں جسے امام بیضاویؒ نے نقل کیا ہے۔ یہ الفاظ آتے ہیں۔ لَمَسِخُوا فِرْدَہَ وَخَنَازِیْسَ اللہ تعالیٰ اُن کی تسکینِ مسخ کر کے بندر اور سور بنا دیتا۔ اللہ تعالیٰ وادی نجران پر آگ برساتا اور ساری وادی آگ سے بھڑک اٹھتی، پوری وادی میں پرندوں اور درختوں تک کوئی چیز باقی نہ رہتی بغیر مباہلہ کے لوٹ جانے سے وہ لوگ اس وبال سے بچ گئے۔

پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ مباہلہ کے لیے حضور علیہ السلام اپنے اہل خانہ میں سے بیٹی فاطمہؓ، حسنؓ، حسینؓ اور علیؓ کو لے کر نیکے شیعہ حضرات اس ایک روایت سے استدلال کرتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کے اہل بیت ہی افراد ہیں۔ ان کے علاوہ اور کوئی اہل بیت میں شامل نہیں ہے۔ حالانکہ اہل بیت میں ازواج مطہرات بھی شامل ہیں۔ مگر سب کو اس موقع پر لانا ضروری نہیں تھا۔ یہ تو دُعا کا مقام تھا، آپ چند افراد کو لے کر فوراً نکل آئے۔ تاہم مذکورہ روایت میں واقعہ کی پوری تفصیل موجود نہیں ہے۔

ابن عساکرؒ بہت بڑے مؤرخ گزرتے ہیں جنہوں نے بڑی مستند تاریخ لکھی ہے۔ وہ امام جعفر صادقؑ سے اور وہ اپنے والد امام محمد باقرؑ سے روایت بیان کرتے ہیں۔ کہ جب حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم مباہلہ کے لیے تشریف لائے تو اُن کے ساتھ حضرات ابو جحزہ صدیقؓ، عمر فاروقؓ، عثمان غنیؓ، علی المرتضیٰؓ اور اُن سب کی اولاد بھی تھی۔ یہ روایت امام جلال الدین سیوطیؒ نے درمنثور میں اسی طرح بیان کی ہے۔ اور یہی روایت تفسیر روح المعانی میں بھی موجود

منقطع ہوتی ہے۔ کیونکہ متعہ کے ذریعہ پیدا ہونے والی اولاد مرد کی اولاد ہی تصور نہیں ہوتی نہ اس سے نسب ثابت ہوتا ہے۔ اور نہ مولود کو وراثت میں حصہ ملتا ہے۔ لہذا یہ غلط کام ہے نہ صرف انسانی حقوق تلف ہوتے ہیں بلکہ یہ تو انسانیت کی توہین ہے لہذا نکاح کا مقصد نسل انسانی کی بقا ہونا چاہیے

مکمل روزہ

فرمایا وَكُلُوا وَاشْرَبُوا رَاتِ كُوكْھَا دُپُورَا سَکِی اجازت ہے۔ اب کوئی پابندی باقی نہیں رہی سوائے اس کے کہ حَتَّى يَتَبَيَّنَ لَكُمُ الْخَيْطُ الْأَخْيَضُ مِنَ الْخَيْطِ الْأَسْوَدِ یہاں تک کہ صاف ظاہر ہو جائے سفید دھاگا سیاہ دھاگے سے۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ بعض لوگوں کو اس معاملہ میں غلطی لگی اور انہوں نے دھاگا سے عام قسم کی ڈوری مراد لیا۔ عدی بن حاتم کا ذکر اس ضمن میں خاص طور پر آتا ہے۔ انہوں نے اپنے پاس سفید و سیاہ رنگ کی دو دریاں رکھ لیں تاکہ اُن کی شناخت تک کھاپی سکیں۔ جب اس بات کا ذکر حضور علیہ السلام سے کیا، تو آپ مسکرائے۔ اور فرمایا اِذَا وَسَّادَتْكَ عَرِيضَتُهُمَا اَتَمَّكِهْ تو بہت لمبا چوڑا ہے کہ اسمیں رات اور دن کو لپیٹ رکھا ہے۔

مفسرین کو اِس فرماتے ہیں کہ جب اس قسم کی غلط فہمی پیدا ہوتی تو اللہ تعالیٰ نے اگلے الفاظ مِنَ الْفَخْرِ آتا کہ معاملہ کو بالکل واضح کر دیا کہ دھاگے سے مراد عام ڈوری نہیں بلکہ اس سے مراد صبح کی سفیدی اور رات کی سیاہی ہے۔ جب رات کی سیاہی ختم ہو کہ صبح کی سفیدی ظاہر ہو جائے، اُس وقت تک تم کھا پی سکتے ہو اور اپنی بیویوں سے مباشرت بھی کر سکتے ہو۔ گویا روزے کی ابتدا صبح صادق سے ہوگی۔

ثُمَّ اَتَمُّوا الصِّيَامَ اِلَى اللَّيْلِ پھر رات تک روزے کو پورا کرو یعنی طلوع فجر سے لے کر رات کی آمد تک روزہ رکھو۔ رات سے مراد مطلق مغرب آفتاب ہے نہ کہ سرخی یا سفیدی کا زائل ہونا جو بنی سورج ڈوب گیا، رات ہو گئی۔ روزہ افطار کر لینا چاہیے۔ مزید کسی چیز کا انتظار نہیں کرنا چاہیے

اس سے یہ بھی اخذ کیا گیا ہے کہ عام لوگ صوم وصال نہ کریں یعنی متواتر کئی کئی

سحری کی برکت

بعض فرماتے ہیں۔ کہ مباہلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات کے ساتھ مخصوص تھا۔ اگر آپ کے بعد کوئی دوسرا شخص مباہلہ کرے گا، تو اس کے وہ نتائج برآمد نہیں ہو سکتے، جو حضور علیہ السلام کے اپنے زمانے میں ہوتے، تاہم اس کے جواز کی گنجائش موجود ہے۔ چنانچہ شیخ الاسلام علامہ شبیر احمد عثمانیؒ اس آیت کی تشریح میں فرماتے ہیں، کہ جب نصاریٰ حضور علیہ السلام کے مقابلہ پر آئے تو ان کے سمجھاروں نے کہا، اے گمراہ نصاریٰ! تم خوب سمجھ چکے ہو کہ محمد صلی اللہ علیہ وسلم نبی مرسل ہیں اور انہوں نے مسیح علیہ السلام کے متعلق بڑی واضح اور فیصلہ کن بات کی ہے۔ تم جانتے ہو کہ اللہ تعالیٰ نے بنو اسماعیل میں آخری نبی بھیجنے کا وعدہ کر رکھا ہے۔ لہذا کچھ بعید نہیں کہ یہ وہی نبی ہوں جن کی بشارت ہم سنتے چلے آئے ہیں۔ یاد رکھو! نبی کے ساتھ مباہلہ کسی قوم کے حق میں اس کے سوا کیا نکل سکتا ہے کہ ایسی قوم کا کوئی چھوٹا بڑا عذاب الہی سے نہ بچ سکے۔ اور پھر پیغمبر کی لعنت کا اثر نسلوں تک پہنچے۔ لہذا بہتر یہی ہے کہ ہم ان سے صلح کر کے اپنی بقیوں کو لوٹ جائیں۔ ہم سارے عرب سے لڑائی مول نہیں لے سکتے آخر آپ کی خدمت میں پہنچے۔ آپ حسن، حسین، فاطمہؓ اور علیؓ کو ساتھ لیے باہر تشریف لائے تھے۔ یہ نورانی صورتیں دیکھ کر عیسائیوں کے لاٹ پادری نے کہا، میں ایسے چہرے دیکھ رہا ہوں جن کی دُعا پاٹروں کو بھی ان کی جگہ سے سر کا سکتی ہے۔ تم ان سے مباہلہ کر کے اپنی ہلاکت کو دعوت نہ دو۔ ورنہ زمین پر ایک بھی نصرانی باقی نہیں رہیگا۔ چنانچہ انہوں نے مقابلہ ترک کر دیا۔ جزیرہ دینا قبول کیا اور صلح کر کے واپس چلے گئے۔

مولانا عثمانیؒ لکھتے ہیں کہ قرآن پاک نے یہ نہیں بتایا کہ مباہلہ حضور علیہ السلام کے بعد بھی کیا جا سکتا ہے۔ اور یہ کہ مباہلے کا اثر آپ کے بعد بھی وہی ہونا چاہیے جو آپ کی موجودگی میں ہونے والا تھا۔ البتہ بعض سلف اور بعض فقہائے حنفیہ کی تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ مباہلے کی مشروعیت اب بھی باقی ہے۔

سے نہیں مل سکتے۔ اگر عورت کو شہوت کے ساتھ ہاتھ لگانے سے بھی مادہ خارج ہو گیا تو اعتکاف باطل ہو جائے گا۔ یہاں پر مساجد کے ذکر سے یہ مراد نہیں کہ گھروں میں اعتکاف کی حالت میں ایسا کر سکتے ہو۔ بلکہ لَا اَعْتَكَا فِي الْمَسْجِدِ مسجد کے بغیر تو مرد کا اعتکاف ہوتا ہی نہیں۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ مسجد بھی ایسی ہونی چاہیے جہاں پنجگانہ نماز باجماعت کا انتظام ہو۔ تاکہ نماز کے لیے کسی دوسری جگہ نہ جانا پڑے۔ البتہ اعتکاف کے لیے جامع مسجد کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ معتکف کو نماز جمعہ کے لیے دوسری مسجد میں جانے کی اجازت ہے۔ ایسی صورت میں نماز جمعہ کے بعد اُسے فوراً واپس اپنی اعتکاف والی جگہ میں آ جانا چاہیے۔

عورتوں کا
اعتکاف

عورتوں کے اعتکاف کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہم مالک کا مسلک یہ ہے کہ مردوں کی طرح عورتیں بھی مسجد میں اعتکاف کریں مگر اہم شافعی فرماتے ہیں۔ چونکہ عورت اور غلام پر نماز باجماعت اور جمعہ فرض نہیں ہے۔ اس لیے وہ جہاں بھی اعتکاف بیٹھنا چاہیں ایسا کر سکتی ہیں۔ ان کے لیے اپنے گھر میں اعتکاف بیٹھنا بھی روا ہے۔ اہم ابوحنیفہ اور ان کے شاگردان اہم ابو یوسف اور اہم محمد اور اہم زفر فرماتے ہیں۔ کہ عورت کو اپنے گھر میں ایسی جگہ اعتکاف بیٹھنا چاہیے جو اُس نے نماز کے لیے منتخب کر رکھی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے لَا تَعْنَعُوا امَاةَ اللَّهِ مَسَاجِدَ اللَّهِ اللہ کی بنیوں کو مسجد میں جانے سے مت روکو وَ يَوْمَ تَقُفُّ السَّيْرُ مگر ان کے گھر ان کے گھر ان کے لیے زیادہ بہتر ہیں۔ عورت کی گھر میں نماز مسجد کی نسبت زیادہ فضیلت رکھتی ہے لہذا عورت کو اعتکاف بھی گھر میں ہی بیٹھنا چاہیے۔ ہاں اگر مسجد پر امن ہو اور وہاں عورتوں کے اعتکاف بیٹھنے کا معقول انتظام ہو، تو مسجد میں اعتکاف بیٹھ سکتی ہے حضور علیہ السلام کی ازواج مطہرات مسجد میں اعتکاف کیا کرتی تھیں۔

یہ مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يَوْمَ تَقُفُّ السَّيْرُ کہ وہ حدیں ہیں۔ فَلَا تَقْرَبُوهَا پس ان کے قریب مت جاؤ، یعنی حدوں

حفاظت پر
حدود شرعیہ

ہے۔ سب اُسی کے محتاج ہیں۔ آگے سورۃ مائدہ اور بعض دوسری صورتوں میں بھی عیسیٰ علیہ السلام کے بارے میں تفصیل سے موجود ہے کہ وہ خود بھی محتاج ہیں۔ فرمایا قرأت اللہ لَکُمُ الْعَزِيزُ الْحَكِيمُ۔ بیشک خدا تعالیٰ ہی غالب اور کمال قوت رکھنے والا حکیم ہے۔ وہ اپنی حکمت سے چاہے کسی کو بغیر باپ کے یا ماں اور باپ دونوں کے بغیر پیدا فرمائے۔ وہ کمال حکمت کا مالک ہے۔

فرمایا فَانْ تَوَلَّوْا اَکْمِرُہِ لَوْکَ اَعْرَاضَ کُمْرِی۔ حق واضح ہو جانے کے بعد بھی خدا کی وحدانیت کو تسلیم نہ کریں۔ اور اسی طرح خدا کو کرتے رہیں، تو آپ فرما دیکھئے فَانْ اللّٰہُ عَلَیْکُمْ بِالْمُفْسِدِیْنَ اللّٰہُ تعالیٰ فساد کرنے والوں کو خوب جانتا ہے۔ اور زمین میں سب بڑا فساد شرک ہے۔ کیونکہ امن کا قیام ایمان، توحید، اطاعت اور نیکی سے ہی ممکن ہے۔ کفر، شرک اور برائیوں سے پراسنی، فساد، بد اعتقاد ہی، ذہنی پستی اور طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہوتی ہیں۔ لہذا خوب اچھی طرح سمجھ لو، کہ فساد ہی اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔ فساد کی خاطر کفر و شرک کا ارتکاب کرنے والے اُس کی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔ اللہ تعالیٰ اُن کو ضرور سزا دیگا۔

البقرة ۲

آیت ۱۸۸

سیقول ۲

درس ہفتاد و شش (۷۶)

وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ وَتَذَلُّوا بِهَا إِلَى
الْحُكَّامِ لِيَأْكُلُوا فَرِيقًا مِّنْ أَمْوَالِ النَّاسِ بِالْإِثْمِ وَأَنْتُمْ
تَعْلَمُونَ ﴿۱۸۸﴾

۲۳

ترجمہ: اور نہ کھاؤ ایک دوسرے کا مال اپنے درمیان باطل اور ناحق کے ساتھ اور
نہ پہنچاؤ مالوں کو حاکموں تک تاکہ تم لوگوں کے مالوں سے ایک حصہ گناہ کے
ساتھ کھاؤ۔ اور تم جانتے ہو ﴿۱۸۸﴾

گناہ شدہ پیر

اس سے پہلے اعتکاف کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ اعتکاف کی حالت
میں عورتوں سے مفارقت جائز نہیں۔ حدود اللہ کی حفاظت کا مسئلہ بھی بیان ہوا۔
تاکہ انسان کے اندر تقویٰ کی روح پیدا ہو جائے۔ روزہ کی مدت کا تذکرہ بھی آگیا کہ
روزہ طلوع فجر سے لے کر غروب شمس تک کے لیے ہے۔ رات کو کھانے
پینے اور عورتوں سے ملنے کی اجازت دے دی۔ الغرض اس پورے رکوع میں
روزہ ہی کا بیان ہے۔ جس میں صدقہ فطر، نزول قرآن، دعا، سحری کھانے اور
اعتکاف کے مسائل شامل ہیں۔

رابط آیات

اس رکوع کے بعد اگلے رکوع میں حج کا ذکر ہے۔ یَسْأَلُونَكَ عَنِ
الْأَهْلِیَّةِ سے شروع کر کے مناسک حج کی ترتیب بیان کی گئی ہے۔ اس
کے بعد جہاد کا مسئلہ ہے۔ مفسرین کرام کے لیے اشکال پیدا ہوا ہے کہ درمیان
میں مال کا تذکرہ کیونکر آگیا ہے۔ جب کہ ایک طرف روزے کا بیان ہے اور
دوسری طرف جہاد کا مسئلہ ہے۔ بظاہر یہ مضامین آپس میں غیر مربوط معلوم ہوتے
ہیں۔ مگر حقیقت میں سابقہ مضمون کے ساتھ اس کا گہرا ربط ہے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے اس کی تشریح یوں بیان کی ہے کہ روزہ

ارشاد ہوتا ہے۔ قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ اے نبی (علیہ السلام) آپ
 فرمائیے اے اہل کتاب! یعنی اے تورات کے ماننے والے یہودیوں اور انجیل
 کے ماننے والے عیسائیوں! یہ دونوں گروہ کفر و شرک میں مبتلا ہو چکے تھے۔ یہودیوں
 نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی تکذیب کر کے اور انہیں ایذا پہنچا کر کفر کا ارتکاب
 کیا جب کہ عیسائیوں نے عیسیٰ علیہ السلام کو الوہیت کا درجہ دے کر شرک کو اختیار
 کیا۔ اُس زمانے میں اہل کتاب کے علاوہ ایران کے آتش پرست مجوسی تھے۔
 اور وہ بھی مشرک۔ عرب کے لوگ جو اپنے آپ کو براہمنی کہلاتے تھے، وہ بھی
 کفر و شرک میں غرق تھے۔ نزول قرآن کے زمانے میں کوئی لاکھ آدمی ہی ملت
 ابراہیمی پر چلنے والا ہو گا۔ ورنہ سب کے سب کفر و شرک کی ظلمات میں بھٹکے ہیں
 کھائے تھے۔

ان حالات میں اللہ تعالیٰ نے اپنے پیغمبر آخر الزمان علیہ السلام سے
 اہل کتاب کو کہلایا تَعَالَوْا إِلَىٰ كَلِمَةٍ ایک ایسے کلمے کی طرف
أَجْمَعُونَ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ جو ہم اے اور تمہارے درمیان برابر
 ہے۔ یعنی مسلم ہے۔ اس بارے میں تورات، انجیل اور قرآن کی بات مساوی
 ہے۔ اور وہ ہے مسئلہ توحید پر سب کا مشترک مسئلہ ہے یعنی أَلَّا تَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ
 ہم اللہ کے سوا کسی کی عبادت نہ کریں۔ اس مسئلہ پر تورات، انجیل اور قرآن پاک
 متفق ہیں بلکہ ہر نبی کی یہی تعلیم ہے۔ لہذا ہم سب اس پر کاربند ہو جائیں۔ قرآن
 پاک نے یہی مسئلہ دوسرے مقام پر یوں بیان فرمایا فَاعْبُدُوا اللَّهَ مُخْلِصِينَ
لَهُ السَّيِّئَاتِ پس اللہ کی عبادت کرو اپنے دین کو اسی کے لیے خاص کر کے
 ہر نبی نے اپنی قوم سے یہی کہا يَقُومُوا عِبَادًا لِلَّهِ مَا لَكُمْ مِنْ
إِلَهِ غَيْرِهِ اے قوم! صرف اُسی ایک خدا کی عبادت کرو، اس کے سوا
 کوئی مستحق عبادت نہیں۔ وَلَا تَشْرِكُوا بِهِ شَيْئًا اور اُس کے
 ساتھ ہم کسی چیز کو شریک نہ بنائیں۔ امام ابن کثیرؒ لفظ شَيْئًا کی تفسیر

کی نوہی آپ کے نکاح میں تھی۔ اُس کے علاوہ سندھ کے انگریز کمشنر کی بیٹی مسلمان ہو کر آپ کے نکاح میں آئی اور تیس سال کی رفاقت کے بعد فوت ہوئی۔ مولانا عزیز گل ایک تاریخی انسان ہیں۔ سخاکوٹ ایجنسی میں اُن کی اپنی زمین ہے، وہیں آپ کی رہائش ہے۔ کافی بوڑھے ہو چکے ہیں۔ تاہم اپنے زمانے میں بڑے بہادر اور دلیر آدمی تھے

مولانا حمید

مولانا شیخ المند کے ساتھیوں میں مولانا سید حسین احمد مدنی کے بھتیجے مولانا وحید احمد مدنی بھی تھے۔ آپ کے ایک شاگرد مولانا حکیم سید نصرت حسین صاحب بھی آپ کے ساتھ مالٹا میں قید رہے۔ اور وہیں فوت ہوئے۔ انگریزوں نے اُن کے ساتھ بڑے ظلم کیے۔ اُن کی وفات کے بعد مولانا شیخ المند نے بڑی کوشش کی کہ حکیم صاحب کو دفن کرنے سے پہلے مسنون طریقے سے غسل دیا جاسکے۔ مگر انگریزوں نے اسی اجازت نہ دی اور کہا کہ اُن کی طرف سے دیا گیا غسل کافی ہے۔ بہر حال آپ نے تیمم کر کے جنازہ پڑھا، اور ان کو دفن کیا۔

حضرت شیخ المند انگریز کے سخت مخالف تھے۔ اگر کوئی انگریز کے متعلق مسئلہ دریافت کرتا، تو فرماتے ابھی کسی اور عالم سے پوچھ لو، شاید میں مبالغہ نہ کر جاؤں کیونکہ مجھے انگریزوں سے سخت نفرت ہے۔ آپ خوب سمجھتے تھے۔ کہ انگریز نے اسلام کو کس قدر نقصان پہنچایا ہے۔ ترکوں کی سلطنت کو انگریز نے ہی درہم برہم کیا۔ مولویوں کی قلم اور زبان سے ترکوں کی خلافت پر کفر کا فتویٰ لگوایا۔ اور انہیں بدنام کیا۔

انگریز کی
چال بازی

اشخاصی طور پر انگریز بڑی بااخلاق قوم ہے۔ آپ اُن سے تجارت کریں، کوئی اور لین دین کا معاملہ ہو، بڑے اچھے طریقے سے پیش آئیں گے، اسی لیے انگریز بڑا چال باز ہے۔ گزشتہ زمانے میں تجربہ کار لوگوں میں یہ محاورہ مستعمل تھا کہ اگر جو سن ختم ہو جائے، تو دنیا سے مشینری ختم ہو جائے۔ کیونکہ جرمنی لوگ مشین ذہن کے لوگ ہیں۔ انہوں نے بڑی مشینری ایجاد کی ہے۔ سچی کڑ سلائی مشین بھی انہی کی ایجاد ہے۔ تو یہ محاورہ استعمال کیا جاتا تھا۔ اگر دنیا سے انگریز قوم ختم ہو جائے تو چال بازی ختم

میتے ہیں مسلمانوں میں اولیاء پرستی بھی اسی سلسلے کی کڑی ہے۔ شہد پرستی اور پیر پرستی مسلمانوں میں عام پائی جاتی ہے۔ اُن کی ایسی تعظیم کرتے ہیں جیسی خدا کی کرنی چاہیے۔ اُن کی بات کو خدا اور رسول کی بات سے مقدم سمجھتے ہیں۔ اُن کے سامنے سجدے کرتے ہیں۔ اور اُن کا تقرب حاصل کرنے کے لیے نذر و نیاز دیتے ہیں۔

قبر پرستی کی بیماری سیود و نصاریٰ میں بھتی اور اب مسلمانوں میں بھی عام ہے۔ حکومت خود اس معاملے میں پیش پیش ہے۔ پارسی چڑھائی جا رہی ہیں۔ قبروں کی بے جا تعظیم ہو رہی ہے۔ یہ سب، شرکیہ رسوم اور اسراف ہے بھائی! قبروں پر جاکر وہ کام کرو، جو شریعت سے ثابت ہے اور جس کا حکم دیا گیا ہے۔ وہاں جاکر فاتحہ پڑھو، اور فوت شدگان کے لیے دعا کرو۔ حضور علیہ السلام نے خود اپنے متعلق فرمایا اللّٰهُمَّ لَا تَجْعَلْ قَبْرِيْ وَثَنًا يُّعْبَدُ لَے اللّٰہ! میری قبر کو صنم یا بت نہ بنانا کہ لوگ اس کی پوجا کرنے لگیں۔ اس زانیہ قبر پرستی کی بہت سی صورتیں رائج ہیں۔ یہ عرض کیا ہے۔ شرک و بدعت کے ارتکاب کا ایک طریقہ ہے۔ قبر کو کچھ نہ بنانا جائز نہیں بلکہ حرام ہے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا لَا تَجْصَّصُوا قُبُورَہُمْ پر چونا نہ لگاؤ۔ مگر اب چسپ ہو رہے ہیں۔ گنبد بنائے جاتے ہیں۔ نقش و نگار ہوتا ہے۔ اللہ کے بندو! یہ ایرٹ، مسالہ کسی غریب کو دے دو، اُس کے سر چھپانے کے لیے جھونپڑی بن جائے اور تمہیں ثواب بھی حاصل ہو۔ کسی محتاج کی دعائیں لو، قبروں پر چڑھاں کرنے، بلب لگانے اور پنکھے نصب کرنے سے کیا حاصل۔ یہ تو صریحاً قبر پرستی ہے۔

خواجہ معین الدین چشتی اجمیری بہت بڑے ولی اللہ ہوئے ہیں۔ آپ کا لقب سلطان الہند ہے۔ تقریباً نو سو لاکھ انسانوں کو آپ کی وساطت سے ایمان کی دولت نصیب ہوئی، اسی طرح سید خواجہ علی ہجویریؒ اپنے پیر و مرشد حضرت فتلیؒ کے حکم سے لاہور تشریف لائے اور تبلیغ کا کام کیا۔ جب آپ کو لاہور آنے

ہیں، جو ایک آدمی کا کام معلوم نہیں ہوتا۔

بہر حال شیخ سعدیؒ کی قید و بند سے واضح ہوتا ہے کہ ساتویں صدی ہجری میں بھی انگریز مسلمانوں کا جانی دشمن تھا۔ اس زمانے میں مسلمانوں کی چھوٹی چھوٹی سلطنتیں مگر وہ بام عروج پر تھے۔ فرانس اور برطانیہ تو اس وقت بالکل غیر متمدن تھے انہیں ترکیڑے پہننے کا سلیقہ بھی نہیں آتا تھا۔ پشت پر چڑا باندھتے تھے۔ انگریز اس وقت بالکل پسماندہ تھا۔ انہیں مسلمانوں کی وجہ سے ترقی نصیب ہوئی۔ اندلس میں بھی مسلمانوں کا طوطی بولتا تھا۔ انگریز تو چودھویں صدی میں جا کر متمدن ہوئے ہیں انہوں نے سائنس میں ترقی کی اور پھر انہیں غلبہ حاصل ہوا۔

ترک سلطنت

اس زمانے میں مسلمانوں کی ترک سلطنت کو بڑا عروج حاصل تھا ترکوں نے چار سو سال تک عیسائی سلطنتوں کے ساتھ ٹکرائی۔ انگریز، جرمن، فرانسیسی، روسی سب اسلام کے ازلی دشمن تھے۔ ترکوں نے ہر ایک کے ساتھ خوب معرکے سر کیے بڑے بہادر لوگ تھے۔ حنفی مملک کے راسخ العقیدہ مسلمان تھے علم کی طرف سے زیادہ تہ تشنہ ہی ہے۔ مگر اسلام کا جذبہ بدرجہ اتم موجود تھا۔ تاہم کمال اتا ترک جس کا آج کل ٹٹے منایا جا رہا ہے۔ اس نے اسلام کو نقصان بھی پہنچایا ہے۔ اس نے خلافت کو ختم کر دیا جو مسلمانوں کے زوال کا باعث بنا۔ مگر اس نے ترکی کو بڑی طاقتوں سے الگ کر کے اسے سازشوں سے بچالیا۔ اس نے عربی زبان کو ملک سے بالکل نکال باہر کیا حتیٰ کہ عربی اذان بھی بند کر دادی۔ اس نے غلطیاں بھی بہت کی ہیں مگر ترکی حکومت کا زوال عربوں کی وجہ سے آیا۔ یہ غدار نکلے۔ انگریزوں کے ساتھ مل کر ان کے آلہ کار بن گئے۔ اردن کے موجودہ فرمانروا کا دادا شریف حین سید ہونے کے باوجود انگریزوں کا پھٹو تھا، اس نے ترکوں کو بہت نقصان پہنچایا انگریز نے ان کو وفاداری کی بنا پر چھوٹی چھوٹی ریاستیں دے دیں۔ ایک کو عراق میں جگر دے دی۔ ایک کو اردن میں اور ایک پروردہ کو فلسطین میں بٹھا دیا پھر اس نے شاہ سعود کے ساتھ ساز باز کی۔ اس کی پوزیشن بدوؤں والی تھی، یہ مستقل مزاج

نہ عظیم کل، نہ مشکل کشا اور حاجت روا۔ کسی کو پیر دستگیر اور غوث اعظم بھی تسلیم نہ کریں یہ سب مشرک یہ باتیں ہیں۔ صرف خدا تعالیٰ کے لیے لائق ہیں۔ مافوق الاسباب حاجت پڑائی اور مشکل کشائی صرف خدا کی ذات ہی کر سکتی ہے۔ جگہ جگہ یا علی اور یا غوث بکھا ہوا ہے یہ سب مشرک کی نشانیاں اور غلط عقیدے کا اظہار ہے۔ پیروں کے سامنے رکوع اور سجدہ کیا جاتا ہے۔ بلکہ قبل پر بھی سجدے ہوتے ہیں۔ یہ تو انجیل نے بھی منع کیا ہے۔ وہاں یہ آیت موجود ہے۔ خداوند کو سجدہ کر اور صرف اسی کی عبادت کرو مگر عیسائی اس کی خلاف ورزی کر رہے ہیں۔ مسیح علیہ السلام کو ابن اللہ یا اللہ مانتے ہیں مشکل کشا اور حاجت روا سمجھتے ہیں۔ اور ان کے ساتھ وہی معاملہ کرتے ہیں۔ جو خدا تعالیٰ کے ساتھ ہونا چاہیے۔

اَکْفِرُوا بِاللَّهِ مَا تَدْعُوْنَ ۖ اِنَّکُمْ کَافِرٌۭ بِہٖ ۚ وَلَا تَتَّخِذْ بَعْضُنَا اَرْبَابًا مِّنْ دُونِ اللّٰهِ ۚ مِمَّنْ ہِیَ سَآءُ مِثْلًا ۚ لَّآ رَبَّ سِوَاہٖ ۚ خدا کے سوا کوئی رب نہیں۔ ہم بار بار پڑھتے ہیں اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ پھر یہ بھی کہتے ہیں۔ قُلْ اَعُوْذُ بِرَبِّ النَّاسِ ۝ مَلِکِ النَّاسِ مطلب یہ کہ ربوبیت کا مالک، پرورش کرنے والا کسی چیز کو درجہ کمال تک پہنچانے والا اور تمام اسباب مہیا کرنے والا

بزرگان دین کے کلام میں پیر دستگیر اور غوث اعظم وغیرہ الفاظ بعض مقامات پر استعمال کیے گئے ہیں۔ لیکن انہوں نے اس سے ہرگز وہ معانی مراد نہیں لیے جو اہل شرک مراد لیتے ہیں۔ بلکہ غوث سے مراد ایسی مقبول کار آمد مستجاب الدعوات ہستی جنہی دعاؤں اور برکات سے اللہ تعالیٰ لوگوں کو فیض پہنچاتا ہے اور یہ لوگوں کا تذکرہ کرتے ہیں اور روحانی فیض پہنچاتے ہیں۔ اور لوگوں کی طرح طرح کی مشکلات اور ضروریات کی گہرہ کشائی ان حضرات کی تعلیم و تربیت، تلقین و تذکرہ، نصفیہ، دعاؤں اور توجہات وغیرہ کی وجہ سے ہوتی رہتی ہے۔ ۱۲

مولانا شیخ المنذر فرمایا کرتے تھے کہ وسیع مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ مسلمانوں کے زوال کے دو اسباب ہیں، قرآن سے دوری اور فرقہ بندی۔ اسی لیے شاہ ولی اللہ دہلوی، ان کے خاندان اور حضرت شیخ المنذر نے قرآن پاک کی تعلیم دینے میں زندگیاں بکھیا دیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی نے حضرت لاہوری کو قرآن پاک کی تعلیم سے آراستہ کر کے فرمایا تھا، احمد علی اپنی پوری زندگی قرآن کی تعلیم کے لیے وقف کر دیا، اور پھر آپ نے اس نصیحت پر پورا پورا عمل کیا۔ ساری عمر لوگوں کو قرآن پاک پڑھاتے رہے۔ چالیس برس میں آپ نے پانچ ہزار علماء کو قرآن کی تعلیم دی۔ آپ دوسری کتابیں عام طور پر نہیں پڑھاتے تھے۔ کبھی کبھی مشکوٰۃ شریف یا حجتہ اللہ البالغہ کا درس دے دیتے تھے۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ نے بھی قرآن کریم کا ترجمہ اور تفسیر لکھی ہے۔ یہ بھی کمال وجہ کا مفصل ترجمہ ہے۔ آپ سمجھتے تھے کہ لوگ قرآن سے دور ہو گئے ہیں۔ انہیں قریب کرنے کی کوشش میں آپ نے یہ ترجمہ اور تفسیر لکھی۔

فرقہ بندی
کی لعنت

حضرت شیخ المنذر فرقہ بندی کو بہت بڑی لعنت سمجھتے تھے۔ وہ جانتے تھے کہ پارٹی بازی مسلمانوں کی ترقی کے راستے میں رکاوٹ ہے اور اگر اسے دور نہ کیا گیا تو مسلمان تباہ ہو جائیں گے۔ وہ ہمیشہ اتفاق و اتحاد کی دعوت دیتے تھے۔ انہوں نے علی گڑھ والوں کو قریب کرنے کی کوشش بھی کی۔ آپ نے مولانا شاکر علیؒ اور مولانا محمد علی جوہر کو قریب کیا اور پھر علی گڑھ پارٹی کو ساتھ ملایا تاکہ سب مل کر مسلمان قوم کی خدمت کر سکیں اور اس سلسلہ میں متحدہ پروگرام پر عمل پیرا ہو سکیں حضرت مولانا محمود حسنؒ کو شیخ المنذر کا خطاب مولانا محمد علی جوہر نے ہی دیا تھا جسے برصغیر کے تمام لوگوں نے تسلیم کیا۔ واقعہ بھی یہی ہے کہ مولانا محمود الحسن نہایت نیک، متدین اور صالح آدمی تھے۔ خاموش رہ کر بڑے بڑے کام کرتے تھے۔ ہندوستان میں انگریزوں کی جبر طوں کو انہوں نے ہی کھوکھلا کیا۔ اپنے شاگردوں اور مریدوں کے ذریعے دور دورہ کر جاتے پھرتے جاتے تھے۔ حتیٰ کہ غالب پاشا اور الزمر شاہ بھی سمجھتے تھے کہ آپ

کی سخاوت ضرب المثل بن چکی ہے۔ امام ابن قتیبہؒ نے اپنی کتاب "الشعر والشعراء" میں تذکرہ کیا ہے۔ کہ حاتم کی سخاوت کو شہرت ایسے ہی حاصل نہیں ہو گئی، اس شخص نے انیس^{۱۹} مرتبہ اپنا گھڑ بار، مال و متاع گٹا دیا تھا۔ عیسائی مذہب رکھتا تھا اور اسی پر اُسکی موت واقع ہوئی، اُس کا بیٹا عدی بن حاتم بھی عیسائی تھا اور اہل بیت میں اسلام کا سخت مخالف تھا۔ مگر کسی نیک آدمی کے مشورہ سے حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر مشرف بہ اسلام ہوا۔ اُس کی بہن کو بھی ایمان کی دولت نصیب ہوئی۔ عدی خود بیان کرتے ہیں کہ جب میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں حاضر ہوا، تو اُس وقت **فِي عُنُقِي صَلَيبٌ مِّنْ ذَهَبٍ** میری گردن میں سونے کی صلیب لٹک رہی تھی۔ آنحضرت علیہ السلام نے دیکھتے ہی فرمایا **اَلْقِ عَنْكَ هَذَا الْوَشْنَ اِسْ بُيُوتَ كُوَ اِپْنِیْ مَرْدَنَ سَ اَمَارِیْ**۔ گویا آپ نے صلیب کو وشن کہا۔ صنم اور وشن میں فرق یہ ہے کہ جو بُت گھڑا ہوا ہوتا ہے۔ وہ صنم کہلاتا ہے۔ اور جو اُن گھڑا ہو، اُسے وشن کہتے ہیں۔ اس لحاظ سے صلیب کو وشن فرمایا۔ نیز حضور علیہ السلام نے یہ بھی تلاوت فرمایا **اَتَتَّخِذُوْا اَحْبَارَهُمْ وُرُهْبَانَهُمْ اَرْبَابًا مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ یُّهْدُوْا یُهْدُوْا** اور عیسائیوں نے اپنے مولویوں اور درویشوں کو رب بنالیا ہے۔ حضرت عدیؒ کہتے ہیں کہ میں نے عرض کیا حضرت! **مَا كُنَّا نَخْبُدُھُمْ** ہم ان کی عبادت تو نہیں کرتے تھے۔ رب تو جب بناتے جب ان کی عبادت کرتے۔ اس پر حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا **اَلَيْسَ اَنْھُمْ كَالْوُجُوْهِ لَھُمْ مَا حَرَّمَ اللّٰھُ** کیا یہ واقعہ نہیں ہے کہ اہل کتاب کے مولوی اللہ کی حرام کردہ اشیاء کو حلال قرار دیتے تھے اور وہ لوگ اُسے حلال ہی سمجھتے تھے۔ نیز یہ کہ جس چیز کو اللہ نے حلال فرمایا یہ درویش اُس چیز کو حرام قرار دیتے تھے، اور وہ لوگ اُسے حرام ہی سمجھتے تھے۔ حضرت عدیؒ نے عرض کیا، حضور! **اِیَا تُوْہِبَ**۔ تو آپ نے فرمایا۔ یہی تو رب بنانا ہے۔ کیونکہ حلال و حرام اُن کے اختیار میں نہیں تھا۔

ارشاد ہوتا ہے وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُم بَيْنَكُم بِالْبَاطِلِ اِیك دوسرے کا مال ناحق طریقے سے مت کھاؤ۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد پاک ہے۔ لَا يَحِلُّ مَالُ امْرِئٍ اِلَّا بِطَيِّبٍ نَفْسِهِ، کسی مسلمان کا مال اس کی رضا مندی کے بغیر حلال نہیں۔ دوسرے مقام پر یہ بھی آتا ہے اِیك دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ۔ اِلَّا اَنْ تَكُوْنَ تِجَارَةً۔ سوائے اس کے کہ تجارت ہو کہ اس طریقے سے منافع کھانا جائز ہے۔ منافع بھی دوسرے کے لیے فائدہ ہی ہوتا ہے، اس کو جائزہ فتراہ دیا گیا ہے۔ مگر ناجائز اور باطل چیز کسی وقت بھی مسلمان کے لیے جائز نہیں۔ ناجائز مال خواہ چوری کے ذریعے حاصل ہو یا خیانت یا دھوکا یا رشوت کے ذریعے یہ کسی صورت میں بھی جائز نہیں۔

مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ رشوت سلفیوں کو تباہ و برباد کرنے والی لعنت ہے۔ اس لعنت سے کوئی بھی محفوظ نہیں ہو یا برطانیہ، اور آپ کا ملک تو صحتاً اہل میں ہے۔ اس کے بغیر کوئی جائز کام بھی نہیں کر لیا جاسکتا۔ آپ رشوت دینے کے بغیر ملک سے سامان نہیں چھڑا سکتے۔ اس کے بغیر ڈاک خانے والے بات نہیں سنتے پولیس میں رپٹ نہیں لکھائی جاسکتی۔ محکمہ اوقاف مقدس محکمہ سمجھا جاتا ہے۔ یہ بھی اس لعنت میں گرفتار ہو چکا ہے۔ انسانیت کی دو بڑی دشمن طاقتیں رشوت اور سود ہیں، اسلام نے ان دونوں چیزوں کو قطعی حرام قرار دیا ہے۔ اور حکم دیا ہے کہ اِیك دوسرے کا مال باطل طریقے سے مت کھاؤ۔

اکل حرام کی ایک اور صورت غاصبانہ قبضہ بھی ہے، جیسا کہ پبلیز پارٹی کے زمانہ میں زمین اور کارخانے چھینے گئے، پچیس سال میں واجب الادا قیمتیں لگائی گئیں اور اصل مالکوں کو بے دخل کر دیا گیا۔ اس سے تو بھارت والے اچھے رہے جنہوں نے چھینا بیشک مگر طریقے سے۔ بیکرم کسی کی زمین یا کارخانہ چھین لینا ظالمانہ طریقہ ہے اس کا درست طریقہ یہ تھا کہ کوئی کمیشن بٹھایا جاتا جو تحقیقات کے بعد فیصلہ کرتا کہ کون سی جائیداد جائزہ ذرائع سے حاصل کر رہی ہے اور کون سی ناجائزہ ذرائع سے۔

اجر بھی یعنی دوسرا اجر ملے گا۔ فَإِنْ تَوَلَّيْتَ اور اگر تم روگردانی کرو گے فَإِنَّ عَلَيْكَ إِثْمَ الْيَاسِينِ تو تمام رعیت کا گناہ بھی تم پر ہوگا۔ کیونکہ تمہاری وجہ سے سب لوگ ایمان سے محروم رہ جائیں گے۔ اس کے بعد یہ آیت بھی جو آج کے درس میں آئی ہے۔ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تَعَالَوْا إِلَى كَلِمَةٍ سَوَاءٍ بَيْنَنَا وَبَيْنَكُمْ أَلَّا نَعْبُدَ إِلَّا اللَّهَ وَلَا نُشْرِكَ بِهِ شَيْئًا وَلَا يَتَّخِذَ بَعْضُنَا بَعْضًا أَرْبَابًا مِنْ دُونِ اللَّهِ فَإِنْ تَوَلَّوْا فَقُولُوا اشْهَدُوا بِأَنَّا مُسْلِمُونَ

حضور نبی کریم ﷺ رؤف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم صبح کی نماز کی سنتوں میں پہلی رکعت میں پہلے پائے کی یہ آیت تلاوت فرماتے تھے۔ قُولُوا آمَنَّا بِاللَّهِ وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا وَمَا أُنْزِلَ إِلَيْنَا مِنْ دُونِ الْكِتَابِ إِبْرَاهِيمَ وَإِسْمَاعِيلَ وَإِسْحَاقَ وَيَعْقُوبَ وَالْأَسْبَاطَ وَمَا أُوتِيَ مُوسَى وَعِيسَى وَمَا أُوتِيَ النَّبِيُّونَ مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُونَ اور دوسری رکعت میں آج کی آیت يَا أَهْلَ الْكِتَابِ تلاوت فرماتے۔ بعض اوقات آپ پہلی رکعت میں سورۃ کافرون اور دوسری رکعت میں سورۃ اخلاص بھی تلاوت فرماتے۔ یہ آیات اور سورتیں عقیدہ توحید اور تردید شرک پر مشتمل ہیں۔ اس لیے بڑی اہم ہیں۔ ان میں اسلام کی بنیادی باتیں اور اسکی دعوت ہے۔

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۱۸۹

سَيَقُولُ ۲

درس تفسیر و مفت (۷۷)

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْاِهْلَةِ قُلْ هِيَ مَوَاقِيتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ
وَلَيْسَ الْبِرُّ بِاَنْ تَاْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا وَلَكِنَّ الْبِرَّ
مَنْ اتَّقَى وَآتَى الْبُيُوتَ مِنْ اَبْوَابِهَا وَاتَّقُوا اللَّهَ
لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (۱۸۹)

ترجمہ :- لوگ آپ سے پوچھتے ہیں کہ اہل بیت کی زیارت
ہیں لوگوں کے لیے اور حج کے لیے ۔ اور یہ کوئی نیکی نہیں ہے کہ تم گھروں میں پشت
کی طرف سے آؤ۔ لیکن نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈرتا ہے۔ اور گھر میں
میں ان کے دروازوں سے آؤ اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو۔ تاکہ تم فلاح پا جاؤ (۱۸۹)
قبل ازیں اللہ تعالیٰ نے رمضان کے روزوں کے احکام بیان فرمائے۔
اور اس کے بعد مال کے متعلق مسائل بیان ہوئے۔ اب اس آیت میں نئے
چاند کے متعلق سوال اور اس کا جواب دیا گیا ہے۔

رابط آیات

بظاہر یہ دو مختلف چیزیں معلوم ہوتی ہیں مگر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ چاند
کے گھٹنے بڑھنے کا رمضان کے ساتھ گہرا تعلق ہے۔ کیونکہ نیا چاند نکلنے پر ہی روزہ
شروع کیا جاتا ہے۔ اور اگلا چاند نظر آنے پر ماہ رمضان ختم ہو جاتا ہے۔ حدیث شریف
میں آتا ہے۔ اَفْطَرُوا لِرُءُوسِهِمْ وَصُومُوا لِرُءُوسِهِ چاند دیکھ کر روزہ
رکھو اور دیکھ کر افطار کرو۔ اس لیے دونوں مسائل کو یکے بعد دیگرے بیان کیا
گیا ہے کہ ان دونوں میں باہمی ربط ہے۔

در اصل یہ آیت ایک سوال کا جواب ہے، جو حضور علیہ السلام کی خدمت
میں پیش کیا گیا۔ اس کو کہ ارض کے لیے روشنی کے دو ہی ذرائع ہیں یعنی سورج

شان نزول

ربطیات

گزشتہ درس میں اہل کتاب کو اُس کلمہ توحید کی دعوت دی گئی تھی، جو مقام انبیاء علیہم السلام، تمام کتب اور تمام شرائع کا متفق علیہ مسئلہ ہے۔ یعنی خدا کے سوا کسی کی عبادت نہ کی جائے، اُس کے ساتھ کسی کو شریک نہ بنایا جائے۔ اور ہم ایک دوسرے کو رب نہ بنائیں جس طرح یہود و نصاریٰ نے اپنے اجداد اور ہر ایک کو رب بنالیا۔ اور رب بنانے سے مراد یہ ہے کہ جس چیز کو مولوی اور درویش حلال قرار دے دیں اُسے حلال سمجھ لیا جائے اور جسے حرام کہیں اس کو حرام ہی سمجھ لیں۔ گزشتہ درس میں اس بات کی وضاحت کر دی گئی تھی کہ تحلیل و تحریم اللہ تعالیٰ کی صفت مختصہ ہے۔ اس کے سوا کسی کو حلال یا حرام قرار دینے کا اختیار نہیں ہے۔ جب نبی کسی چیز کو حلال یا حرام کہتا ہے۔ تو اس کو قطعی سمجھ لینا چاہیے۔ کیونکہ نبی وہ حکم اللہ تعالیٰ کی طرف سے بیان کرتا ہے۔ آج کے درس میں بھی خطاب اہل کتاب یعنی یہود و نصاریٰ دونوں سے ہے۔ اور ان کے آپس کے اُس جھگڑے کے متعلق ہے، جو وہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کرتے تھے۔

حضرت حسن بصریؒ اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے روایت ہے کہ جب بنجران کے عیسائی حضور علیہ السلام کے ساتھ بحث و مناظرہ کرنے کے لیے مدینے آئے، تو مدینے کے یہودی بھی جمع ہو گئے۔ عیسائیوں کا لاٹ پادری بھی دفن میں شامل تھا، ادھر یہودیوں کے علماء بھی اکٹھے ہو گئے اور یہ دونوں گمروہ آپس میں جھگڑنے لگے۔ یہودی کہتے تھے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام ہمارے طریقے پر تھے۔ مگر نصاریٰ یہ بات تسلیم کرنے کو تیار نہ تھے۔ ان کا دعویٰ تھا۔ ابراہیم علیہ السلام عیسائیوں کے طریقے پر تھے۔ مگر دوسرا گمروہ طے ماننے کے لیے تیار نہ تھا۔ گویا دونوں گمروہ اپنی نسبت ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے تھے۔

یہ معاملہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں بھی پیش ہوا۔ تو اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر یہود و نصاریٰ دونوں گمروہوں کی تردید فرمائی۔ کہ دونوں فریق ابراہیم علیہ السلام

کے متعلق دریافت کیا تھا تو آپ نے نو نشانیاں بتانے کی بجائے احکام عشرہ بیان فرما دیے۔ مقصد یہ تھا کہ مسؤل نشانیاں معلوم کر لینے سے تمہیں کچھ فائدہ نہیں ہوگا۔ کہ موسیٰ علیہ السلام کو اللہ نے فلاں فلاں معجزہ فلاں فلاں نشانیاں عطا کی تھیں، بلکہ تمہارا فائدہ اس بات میں ہے کہ تمہیں احکام شریعت معلوم ہو جائیں جن پر تم عمل کر سکو۔ لہذا نو نشانیاں کی بجائے حضور علیہ السلام نے سیودلیوں کو ان کے دس احکام بتا دیے۔ بعض چیزیں خامض ہوتی ہیں ان کے پیچھے پڑنے کی کوئی ضرورت نہیں تم وہ بات معلوم کر نیکی کو کشش کرو جس میں تمہارا فائدہ ہے۔

یہ چاند کا مسئلہ بھی ایسا ہی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کے سوال کے جواب میں چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت بیان نہیں فرمائی، بلکہ اس کے فوائد بتا دیے۔ کہ اس عمل سے اوقات متعین ہوتے ہیں اور دن مہینہ و سال کا حساب ہوتا ہے۔ سورج سے اس قسم کا حساب رکھنا ایک عام سمجھ بوجھ کے انسان سے مشکل ہے کیونکہ وہ تو ہمیشہ ایک ہی حالت میں رہتا ہے۔ اگرچہ اس کی وجہ سے موسموں میں تغیر و تبدل آتا ہے، کبھی گرمی ہے، کبھی سردی ہے۔ بہار اور خزاں کے موسم آتے ہیں مگر سورج کی بظاہر شکل و صورت اور حجم میں کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوتی۔

اسی لیے فرمایا کہ تم چاند کی کمی کی حکمت کیے چکر میں نہ پڑو۔ اس کا تعلق تو علم ریاضی سے ہے، جو اس علم کو حاصل کرے گا۔ اُسے چاند کے گھٹنے بڑھنے کی حکمت معلوم ہو جائے گی کہ کس طرح سورج اور

چاند کے درمیان کمرہ ارض حاصل ہو کہ اس کا سبب بنتا ہے۔ تم اس کا فائدہ معلوم کرنے کی کو کشش کرو کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں لوگوں کو کیا فوائد حاصل ہوتے ہیں۔

ہلال پہلے دن کے چاند کو کہتے ہیں جب وہ حجم میں سب سے چھوٹا ہوتا ہے۔ عربی لغت میں ہلال سے مراد آواز بلند کرنا ہے۔ جب پہلے دن چاند نظر آتا ہے، تو لوگ اسے دیکھ کر شوق سے آواز بلند کرتے ہیں کہ وہ چاند نظر آگیا، اس لیے اسے

چاند کی مختلف صورتیں

بعد کی بات ہے۔ الغرض! عیسائیت حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے بگڑے ہوئے
دین کا نام ہے۔

ہندو دین
ہم
ہمارے ملک میں بھی دین کے ساتھ کم و بیش ایسا ہی ہوا ہے۔ آج کی بیشتر
رسوم ہندوؤں سے ماخوذ ہیں۔ خصوصاً موت کی رسوم منجملہ قیسرا، ساتوال، دسوال،
چالیسواں، برسی وغیرہ ہندوانہ رسمیں ہیں۔ آریاؤں کی آمد کے بعد برصغیر میں ہندو مذہب
اختیار کر لیا گیا۔ اور ان کی رسوم صدیوں تک اس ملک میں جاری رہیں۔ پھر جب
اسلام آیا تو یہی رسوم اسلام میں داخل ہو گئیں۔ شادی بیاہ کے سلسلہ میں گانا، سہرا، باجیا
وغیرہ سب ہندوؤں کی رسمیں ہیں۔ یہ چیزیں اسلام کے ساتھ عرب سے نہیں آئیں۔
بلکہ یہاں پر دین میں داخل کر لی گئیں۔ شب معراج اور دیگر مواقع پر چراغاں کی بیماری
مجوسیوں کے راستے سے آئی کیونکہ وہ آگ کو مقدس مانتے تھے۔ ہندو بھی اپنی
دیوالی اور دسہرے کے موقع پر چراغاں کرتے تھے۔ مسلمانوں میں بھی جاری ہو گیا
الغرض! جس طرح عیسائیوں اور یہودیوں نے غلط عقیدے اور رسوم اپنے دین
میں داخل کئے اصل دین کو بگاڑ دیا۔ اسی طرح مسلمان بھی اس کام میں اُن سے
پیچھے نہیں ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات کا نزول حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
ہزار سال بعد ہوا۔ اور انجیل کے نزول کے وقت تو دو ہزار سال سے بھی زیادہ
گزر چکا تھا۔ تو ابراہیم علیہ السلام پر ہزاروں سال بعد پیدا ہونے والی یہودیت یا نصرانیت
کیسے چپاں کی جاسکتی ہے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ اے اہل کتاب! تم
ابراہیم علیہ السلام کے متعلق کیوں جھگڑتے ہو حالانکہ وَمَا آتٰنَاكَ الْتَّوْرَةَ وَالْاِنْجِيلَ
الَّذِينَ يَتَّبِعُوهُمُ أَفْلَا تَعْقِلُونَ تو راستہ اور انجیل تو ابراہیم علیہ السلام کے
ہزاروں سال بعد نازل ہوئیں۔ تو جو کتابیں اُن کے بعد نازل ہوئیں تم ان کی نسبت
اُن کتابوں کی طرف کیسے مڑتے ہو عقل کی بات کرو۔ پھر تنبیہ کے طور پر فرمایا
هَآنَتُمْ هَؤُلَاءِ جَا جَعَلْتُمْ فِيمَا لَكُمْ بِهِ عِلْمٌ

کے لیے اوقات کا تعین ہوگا۔ اسی طرح عبادات کو لے لیں۔ نماز کی ادائیگی کے لیے اوقات مقرر ہیں۔ زکوٰۃ ادا کرنی ہو، تو سال کا تعین کرنا ہوگا، روزہ کے لیے چاند کے اوقات کی ضرورت پڑے گی کہ اس کی ابتداء اور انتہا چاند کے نکلنے پر ہی منحصر ہے۔ اور پھر ارکان اسلام میں سچ چوتھا رکُن ہے۔ یہ بھی مقررہ مہینہ کے مقررہ ایام میں ہی ادا کیا جاتا ہے حتیٰ کہ عورت کی عدت کے تعین کے لیے بھی چاند کا حساب ہی لینا پڑتا ہے اسی لیے فرمایا کہ چاند کے گھٹنے بڑھنے میں تمہارے لیے بہت سے فوائد ہیں۔

چاند کی تقویم

اہم رازئی کی طرح اہم ابو بکر جصاص رازئی بھی بڑے پائے کے عالم اور فقیہ قرآن ہوئے ہیں۔ آپ کا زمانہ چوتھی صدی تک ہے۔ آپ اہم ابو حنیفہؒ کے پیروکاروں میں سے تھے۔ انہوں نے احکام القرآن کے نام سے تفسیر لکھی ہے۔ تو یہ دونوں اہم فرماتے ہیں مسلمانوں پر واجب ہے کہ وہ تقویم چاند کے حساب سے رکھیں اگر مسلمان اس حساب کو ترک کریں گے تو گنہگار ہوں گے۔ بیشک سورج کی تقویم بھی رکھیں، اس میں ممانعت نہیں ہے۔ مگر چاند کے حساب کو بھی ضرور اپنے روز مرہ کے امور میں جاری رکھیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے چاند کا حساب رکھنے کا حکم دیا ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ اہل لہ سے مراد مہینہ لیتے ہیں۔ اور اس آیت کا معنی یوں کرتے ہیں کہ لوگ آپ سے مہینوں کے بارے میں حیرانت کرتے ہیں کہ ان کا حساب چاند سے رکھا جائے گا یا سورج سے۔ تو اللہ تعالیٰ نے حکم دیا کہ چاند کے ذریعے حساب رکھنا مقدم، بہتر اور فطری ہے۔ چاند کے حساب سے ماہ و سال کا تعین تو ان پڑھ دیہاتی بھی کر سکتا ہے۔ جب کہ سورج کی تقویم کو یاد رکھنا مشکل کام ہے۔ سورج تو ہر روز یکساں طلوع اور غروب ہوتا ہے۔ مہینہ کی ابتداء اور انتہا کا تعین ایک آدمی کے لیے مشکل ہے مگر چاند کا حساب بالکل واضح ہے۔ جس دن نیا چاند نکلے گا تو مہینہ کی ابتداء ہو جائے گی۔ لہذا چاند کی تقویم آسان ہے

شاہ صاحبؒ فرماتے ہیں کہ عبادات کے معاملہ میں چاند کی جنتری کو حق

کو تسلیم کرتا ہے۔ یہ سب حنیف کی علامتیں ہیں، تو کوئی مشرک آدمی حنیف کیسے ہو سکتا ہے۔ مشرک اور حنیف تو متضاد صفات ہیں۔

فرمایا ابراہیم علیہ السلام حنیف بھی تھے اور مسلمان بھی۔ دراصل حنیف اور مسلمان ہونا ایک ہی چیز ہے۔ اسلام کا معنی اطاعت اور فرمانبرداری ہے جب اللہ تعالیٰ نے ابراہیم علیہ السلام سے فرمایا اَسْلِمَ "فرمانبرداری ہو جاؤ اسلام قبول کرو۔" قَالَ اَسْلَمْتُ لِرَبِّ الْعَالَمِينَ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا۔ ہاں مولا کریم! میں نے تیری فرمانبرداری قبول کر لی۔ میرا تو مقصد حیات ہی تیری اطاعت ہے۔ یہ لوگ جھوٹے ہیں۔ جو کہتے ہیں کہ ابراہیم علیہ السلام یہودی یا نصرانی تھے۔ یہ اپنی نسبت غلط طور پر ابراہیم علیہ السلام کی طرف کرتے ہیں۔ وَمَا كَانَ مِنْ الْمُشْرِكِينَ ابراہیم علیہ السلام مشرکوں میں سے نہیں تھے۔

بزرگوں کی
طرف نسبت

بزرگوں کی طرف خالی نسبت کی وہ مسلمانوں میں بھی پائی جاتی ہے۔ اپنے آپ کو سلفی کہلانے والے کیا واقعی اسلاف کے طریقے پر چل رہے ہیں۔ محض دعویٰ ہے، کام اُٹھ ہیں۔ اسی طرح آج کل حنفیوں کی اکثریت امام ابو حنیفہؒ کے عقیدے سے بالکل مختلف عقیدہ رکھتی ہے۔ قادری اپنی نسبت شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی طرف کرتے ہیں مگر اُن کا معاملہ آپ کے ساتھ ایسا ہی ہے جیسے یہود و نصاریٰ کا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ تھا۔ شیخ جیلانیؒ کا عقیدہ پاک تھا، اُن کا عمل پاکیزہ تھا، اعلیٰ درجے کی روحانیت کے مالک تھے مگر اُن کی طرف نسبت رکھنے والے مشرک و بدعت کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ یہی حال نقشبندیوں اور چشتیوں کا ہے۔ آج کل چشتی لگانے بجانے والے کو سمجھا جاتا ہے۔ کیا خواجہ معین الدین اجمیریؒ کی یہی تعلیم تھی۔ خواجہ فرید الدین گنج شکرؒ کا دروازہ سال کے بعد کھولو۔ لاکھ دو لاکھ آدمی اس میں سے گزر گئے تو چشتی اور جفتی ہو گئے۔ العیاذ باللہ یہ بزرگ اعلیٰ درجے کی روحانیت کے مالک تھے۔ بچے تو حید پرست اور متبع سنت تھے۔ حضرت مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ چشتیوں کی طرف

جان بھیلی پر رکھ کر نکلنا پڑتا ہے۔ اور اس کے ساتھ مال بھی خرچ کرنا ہوتا ہے کیونکہ اس میں یہ دونوں عمل شامل ہیں۔ وَجَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ یعنی مال اور جان دونوں چیزوں کے ساتھ جہاد کرو۔

رسوئے باطلہ

حج کا ذکر آیا تو اس میں بعض رسومات باطلہ کا رد بھی پایا جاتا ہے۔ زمانہ جاہلیت میں عربوں کا یہ دستور تھا کہ جب کسی سفر پر نکلتے، خواہ وہ حج کا سفر ہی کیوں نہ ہو۔ اور گھر میں کوئی چیز بھول جاتے تو پھر واپس آ کر مکان کے دروازے سے داخل نہیں ہوتے تھے۔ بلکہ اُس کے پیچھے سے آتے تھے، خواہ انہیں دیوار توڑنی پڑے یا پھلانگنی پڑے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی چیز سے منع فرمایا ہے۔ ارشاد ہوا وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا كَمَا تَفْعَلُونَ لَمَّا خَلَّيْتُمْ وَلَقَدْ كُنْتُمْ مِنْ أَفْجَىٰ الْيَدِ لِمَا كُنْتُمْ تَعْمَلُونَ۔ فرمایا کہ نہ ان کی پیچھے سے آؤ۔ بلکہ اگر واپس آنے کی ضرورت پیش آہی جائے تو وَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ أُمُومِهَا تو دروازے کے رستے سے اندر داخل ہونا چاہیے۔ فرمایا کہ نہ ان کی پیچھے سے۔ کہ تم دیوار پھلانگتے پھر دو۔ وَلَكِنْ الْبِرُّ مَنِ اتَّقَىٰ۔ بلکہ نیکی تو اس شخص کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے ڈر گیا اپنے اندر خوف خدا پیدا کر کے اُس کے احکام کی پیروی کرو۔ یہی اصل نیکی ہے۔ جاہلیت کی رسوم باطلہ کہ ترک کر دو۔ مفسرین کہہ رہے ہیں کہ یہاں پر رسومات باطلہ کی تردید کر کے اللہ تعالیٰ نے ایک بڑا اصول بیان فرمادیا ہے کہ اہل نیکی تو تقویٰ ہے۔ جب تقویٰ پیدا ہو جائے گا تو تمام معاملات درست ہو جائیں گے۔ رسومات باطلہ خود بخود ختم ہو جائیں گی شرک، بدعت اور دیگر رسوم پر عمل کرنے سے نیکی نہیں آ سکتی۔ نیکی تو تقویٰ کو اختیار کرنے سے آئیگی، لہذا اس کے لیے کوشش کرو۔

صراطِ مستقیم

حصولِ نیکی کے متعلق ایک مسئلہ اصول یہ ہے کہ شریعت کے اصول پر چل کر ہی آدمی کامیاب ہو سکتا ہے۔ صراطِ مستقیم وہی ہے۔ جو شریعت نے قائم کیا ہے۔ اگر اس راستہ کو اختیار نہیں کرو گے تو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ کام کوئی بھی ہو، خواہ اس کا تعلق عبادت سے ہو یا معاملات سے، ٹرسٹ سے ہو یا نظام حکومت

حضرت مجدد الف ثانیؒ کا حال دیکھو۔ اُن کے ماننے والوں نے عرس منانے پر ہی اکتفا کر لیا ہے۔ اور سمجھتے ہیں کہ وہ دنیا میں مجددیت کو ترقی دے رہے ہیں۔ یہ سب غلط نسبتیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ یہودیت یا نصرانیت کی محض ابراہیم علیہ السلام کی طرف نسبت کچھ فائدہ نہیں دیگی۔ ان تمام بزرگوں کی طرف نسبت اُسی وقت مفید ہو سکتی ہے۔ جب اُن کا عقیدہ اور عمل بھی اپنایا جائے۔ آج کل تو محض مزار بنانا، اس پر عمارت بنا کر قوالی کرا لینا اور عرس منالینا ہی کافی سمجھ لیا گیا ہے۔ عقیدے اور عمل کو کون جانچتا ہے۔ یہاں گوجرانوالہ میں ایک پگل یافتر العقل کا مزار بنا دیا گیا ہے۔ کسی نے نہیں روکا کہ کیا کمر ہے ہو۔ اتنے مقدس شہر میں اُس دیوانے کی قبر پر چڑھا دے چڑھنے لگے ہیں۔ وہ بیمارہ مخمور تھا یا مجذوب تھا، بہر حال غیر مکلف تھا۔ اُس کو خدا کا ولی بنا کر لو چا پاٹ شروع کر دی۔ کیا ایمان اور توحید اسی چیز کا نام ہے؟

حضرت ابراہیم
کے متبعین

فرمایا اور دیکھو! إِنَّ أَوَّلَ الْبَشَرِ إِبْرَاهِيمَ لَکَذِیْنَ
اتَّبَعُوْهُ بِشَکِّ ابراہیم علیہ السلام کے زیادہ قریب وہ لوگ ہیں جنہوں نے
اُن کے دور میں اُن کا صحیح اتباع کیا۔ ایسے ہی لوگوں کی نسبت آپ کے ساتھ
درست ہے۔ اُن کے علاوہ وَهَٰذَا النَّبِيُّ وَالَّذِیْنَ آمَنُوا
یہ خاتم النبیین اور آپ پر ایمان لانے والے جو حقیقت ابراہیم علیہ السلام کے
متبع ہیں، یہ بھی اُن سے مناسبت رکھتے ہیں۔ ان کو یہ حق پہنچتا ہے کہ اپنی نسبت
ابراہیم علیہ السلام کی طرف کریں۔ یہود و نصاریٰ کو یہ حق قطعاً نہیں پہنچتا۔ فَسَمَّیَا
وَاللّٰهُ وَلَیْسَ الْمَوْحِدُ مِنَ اللّٰهِ ہی مؤمنوں کا کار ساز ہے۔ ولی کا معنی
رفیق، سرپرست، دوست اور کار ساز ہے۔ جو کوئی اللہ پر ایمان لائے پھر وہ
اُس کا کار ساز بن جاتا ہے۔ پھر اُسے کسی دوسرے دروازے پر جانے کی ضرورت
باقی نہیں رہتی۔

وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ الَّذِينَ يُقَاتِلُونَكُمْ وَلَا تَعْتَدُوا
إِنَّ اللَّهَ لَا يُحِبُّ الْمُعْتَدِينَ ﴿١٩٠﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَيْثُ
ثَقِفْتُمُوهُمْ وَأَخْرِجُوهُمْ مِنْ حَيْثُ أَخْرَجُوكُمْ
وَالْفِتْنَةُ أَشَدُّ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا تُقَاتِلُوهُمْ عِنْدَ الْمَسْجِدِ
الْحَرَامِ حَتَّى يُقَاتِلَوكُمْ فِيهِ فَإِنْ قَاتَلُوكُمْ فَاقْتُلُوهُمْ
كَذَلِكَ جَزَاءُ الْكَافِرِينَ ﴿١٩١﴾ فَإِنْ أَنْتَهُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَحِيمٌ
﴿١٩٢﴾ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّى لَا تَكُونَ فِتْنَةٌ وَيَكُونَ الدِّينُ

لِلَّهِ فَإِنْ أَنْتَهُوَ فَلَا عُذْوَانَ إِلَّا عَلَى الظَّالِمِينَ ﴿١٩٣﴾

ترجمہ :- اور اللہ کی راہ میں اُن لوگوں سے لڑو جو تم سے لڑتے ہیں۔ اور زیادتی نہ کرو بیشک اللہ تعالیٰ زیادتی کرنے والوں کو پسند نہیں کرتا (۱۹۰) اور انہیں جہاں بھی پاؤ قتل کرو، اور اُن کو نکالو جہاں سے انہوں نے تمہیں نکالا ہے۔ اور فتنہ مار ڈالنے سے زیادہ سخت ہے۔ اور مسجد حرام کے پاس اُن سے مت لڑو۔ یہاں تک کہ وہ خود تم سے اُس میں لڑیں۔ اور اگر وہ لڑیں تم سے پس مارو اُن کو۔ اس طرح بدلو ہے کفر کرنے والوں کا (۱۹۱) اور اگر وہ باز آجائیں۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور نہایت ہی مہربان ہے (۱۹۲) اور لڑو اُن سے یہاں تک کہ فتنہ باقی نہ رہے۔ اور اطاعت اللہ ہی کے لیے ہو جائے۔ پس اگر یہ باز آجائیں

پس تمہیں زیادتی محکمہ ان لوگوں پر جو ظلم کرنے والے ہیں (۱۹۳)

اسلام کے چار ارکان کا بیان سابقہ دروس میں آچکا ہے۔ اب یہاں سے
جہاد کا بیان شروع ہو رہا ہے۔ لفظ جہاد ایک عام لفظ ہے اور یہ وسیع تر معانی میں

جہاد کی قسمیں

تورات اور انجیل کی بگڑی ہوئی شکل کا نام ہے۔ اہل کتاب نے تورات و انجیل میں تحریف
 کمر کے اصل دین کو بگاڑ دیا۔ کفر اور شرک دونوں گروہوں میں قدر مشترک ہے۔
 دوسری طرف مشرکین بھی اپنا تعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام سے جوڑنے کا دعویٰ
 کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کے مختلف مقامات پر ان کے دعوے
 کی بھی تردید فرمائی ہے۔ نیز یہ بھی واضح فرمایا کہ ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ نسبت
 وہ لوگ رکھتے ہیں جنہوں نے آپ کے دور میں آپ کا اتباع کیا۔ اور اس دور
 میں خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا اتباع کیا۔ اور جو حقیقی معنوں میں اسلام میں داخل ہوئے۔
 اب اہل کتاب کے پیٹرواؤں کی گمراہی کا ذکر ہو رہا ہے۔ یہ لوگ بھٹک
 کر ایسے دور نکل گئے ہیں اور ان کے دل ضلالت میں اس قدر سخت ہو چکے ہیں
 کہ اب یہ کفر کے امام بنے ہوئے ہیں۔ یعنی جو شخص ایمان قبول کر کے صحیح
 راستے پر چلتا ہے۔ یہ لوگ اُسے گمراہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ چنانچہ
 اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَذَرْتُ طَائِفَةً مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ الْأُولَىٰ
 کا ایک گروہ آرزو کرتا ہے۔ لَوْ يُضِلُّوكُمْ عَنْ آلِهَتِكُمْ ۖ فَزَلُّوا ۚ کہ وہ کسی نہ کسی طرح تم کو
 گمراہ کریں۔ گذشتہ چودہ سو سال کے عرصہ میں اہل کتاب یہی کچھ کرتے آئے
 ہیں۔ کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے دین سے متنفر کر دیں۔ دوسرے مقام پر
 فرمایا کہ یہ لوگ خواہش کرتے ہیں کہ تم گمراہ ہو کر ان کے ساتھ برابر ہو جاؤ۔
 فَتَكُونُوا مِثْلَهُمْ ۚ کہ الفاظ آتے ہیں۔ مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے
 ہیں۔ کہ عیسائیوں نے ہمیشہ یہ کوشش کی ہے۔ کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے
 مرکزی نقطہ سے ہٹا دیا جائے۔ تاکہ وہ بھی گمراہ ہو کر ان ہی کے ساتھ آئیں۔ اگرچہ
 ان کو جبروی کامیابی ہوئی ہے۔ مگر مجموعی طور پر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں
 ہو سکے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں وعدہ کر رکھا ہے۔ کہ سچا دین ہمیشہ
 قائم رہے گا۔ اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب ممکن قرآن پاک کی تعلیمات
 پر عمل پیرا رہیں۔ حضرت عثمان غنیؓ کے زمانے تک مسلمان اپنے دین پر بالکل متفق

اہل کتاب
 کا منصوبہ

قبول فرماتے ہیں۔ اور اس کو بہت اعلیٰ مقام حاصل ہوتا ہے۔ یہ جہاد بالسیف ہے جس کی تعریف میں خود اللہ تعالیٰ ارشاد فرماتے ہیں **فَيَقْتُلُونَ وَيُقْتَلُونَ** یعنی کبھی مومن کافر کو مار ڈالتا ہے۔ اور کبھی خود شہید ہو جاتا ہے۔

جہاد پر اعتراض

مسلمانوں کے مسئلہ جہاد پر بعض بے دین قسم کے لوگوں خصوصاً عیسائیوں نے اعتراض کیا ہے۔ کہ لوگوں کو تلوار کے ذریعے مرعوب کر کے دین میں داخل کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ تاہم اگر تعصب کی عینک اتار کر دیکھا جائے تو محسوس ہو گا کہ جہاد کا حکم فطرت کے عین مطابق ہے۔ بلکہ بعض اوقات یہ لازم ہو جاتا ہے جب دنیا میں فتنہ و فساد کا بازار گرم ہو جائے، کسی کی جان و مال محفوظ نہ رہے تو پھر ایسے لوگوں کے خلاف جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ اگر دنیا کے متمدن لوگ اس بات کو تسلیم کرتے ہیں کہ عوام کی جان و مال اور عزت و آبرو کی حفاظت ہونی چاہیے۔ تو پھر انہیں فلسفہ جہاد کو بھی تسلیم کرنا پڑے گا، کیونکہ اس کے بغیر ظلم و ستم کی سیخ کنی ممکن ہی نہیں۔

اقدامی اور دفاعی جہاد

جہاد دو قسم کا ہے اقدامی یعنی جارحانہ اور دفاعی یعنی مدافعتی مسلمان کے لیے عام حکم یہی ہے۔ کہ وہ جنگ میں پہل نہ کرے۔ بلکہ اگر دشمن حملہ آور ہو جائے تو اپنا دفاع کرے۔ مگر بعض اوقات اقدامی جہاد بھی ضروری ہو جاتا ہے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں۔ کہ بعض نفوس شر پسند ہوتے ہیں، وہ ہمیشہ دوسروں کے مال و جان کے نقصان کی تاک میں رہتے ہیں۔ اور معاشرے کے امن و امان کو تباہ کرتے رہتے ہیں۔ بنی نوع انسان کے امن کی خاطر لوگوں کے جان و مال اور عزت و ناموس کی خاطر بعض اوقات جہاد میں جارحانہ انداز بھی اختیار کرنا پڑتا ہے۔ تاکہ اس شر و فساد کا قلع قمع کیا جاسکے جس نے معاشرے کے امن و امان کو تہ و بالا کر رکھا ہے۔ شاہ صاحبؒ نے حجۃ اللہ البالغہ میں ایسے شخص کی مثال خطرناک پھوٹے سے دی ہے جس طرح انسانی جسم کی حفاظت کے لیے جسم کے گلے سڑے حصے کو کاٹ دینا ہی بہتر ہے یا جس طرح کسی پھوٹے کا آپریشن کر دینا مریض کی صحت کے

شامل ہو گئی ہیں۔ اس لیے آپ کو اتنا لمبا مقدمہ لکھنا پڑا۔ آپ نے پورے عالم اسلام کی سیاسی، اقتصادی، تمدنی حالت پر سیر حاصل بحث کی۔ اور تمام ممالک اسلامیہ کی مردم شماری بھی پیش کی۔ پہلی اور دوسری جنگ عظیم گرمیانی عرصہ میں یہ بڑی اہم کتاب تصور کی جاتی تھی۔ مجموعی حالات کے لحاظ سے عالم اسلام پر اس سے بہتر اور کوئی کتاب نہ تھی۔ آپ نے ایک مقام پر لکھا ہے۔ کہ یورپ کے یہودی اور عیسائیوں نے گزشتہ زمانے میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کم و بیش چھوٹی بڑی چھ لاکھ کتابیں لکھی ہیں۔ ظاہر ہے کہ ان کتابوں میں ان لوگوں نے مسلمانوں اور ان کے پیغمبر اعظم صلی اللہ علیہ وسلم کے خلاف کس قدر طوفان اٹھایا ہوگا۔

مشرقی علوم کے ماہر انگریز اور یورپین لوگ مشرق کھلاتے ہیں۔ یہ لوگ اسلام کے ہمدرد بن کر اسلامی علوم کا مطالعہ کرتے ہیں۔ اور پھر اسے بدنام کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ جنرل ایوب کے زمانے میں فضل الرحمن اسی قبیل سے تھا۔ وہ بھی مستشرقین کا شاگرد ہی تھا جس نے کہا تھا کہ قرآن پاک کا کچھ حصہ اللہ تعالیٰ کا کلام ہے اور کچھ حصہ میں حضور علیہ السلام کے اقوال بھی ہیں۔ اس نے بظاہر خدمت اسلام کے جذبہ سے کتاب لکھی مگر اس میں اس قسم کا طوفان باندھا۔ پاکستان میں اس کے خلاف شور برپا ہوا تو فضل الرحمن کو اس کے سہارے سے ہٹا دیا گیا۔ یہ اور اس قسم کے دوسرے لوگ مسلمانوں کو دین سے بظن کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ یہ یہود و نصاریٰ اور مستشرقین کا مشترکہ نصب العین ہے ان کی خواہش اور کوشش یہ ہوتی ہے کہ کسی طرح مسلمان اللہ تعالیٰ، اس کے رسول اور قرآن پاک سے متنفر ہو جائیں۔ یہ لوگ ایسے ایسے اعتراضات اٹھاتے ہیں کہ بعض لوگ شک میں پڑ جاتے ہیں۔ ان کے حملہ سے بچنے کا ایک ہی طریقہ ہے۔ کہ مسلمان اپنے سرکھنی عقیدہ اور قرآن کے ساتھ اپنے تعلق کو مضبوط رکھیں۔ اگر مسلمان ان دو چیزوں کا دامن چھوڑ دیں تو پھر گمراہی کے سوا کچھ حاصل نہ ہوگا۔

دیکھو مسلمانوں کے ساتھ پہلی تین جنگیں کہاں لڑی گئیں۔ پہلی جنگ بدر کے مقام پر ہوئی جو مکہ سے سینکڑوں میل دُور ہے۔ جب کہ مدینہ سے قریب، پھر دوسری جنگ احد کے میدان میں ہوئی، وہ بالکل ہی مدینہ کے مضافات کا واقعہ ہے۔ کفار نے اتنی دُور سے مدینہ پر چڑھائی کی۔ اور تیسری بڑی لڑائی جنگ خندق ہے۔ اس میں بھی کفار تین سو میل کا سفر طے کر کے حملہ آور ہوئے مگر اہل اسلام نے مدینہ کے اندر رہ کر اپنا دفاع کیا۔ لہذا مسلمانوں پر یہ الزام لگانا قطعاً ناروا ہے۔ کہ اُن کا دین تلوار کے فیعلے پھیلا۔

فرمایا جو تم سے لڑتے ہیں تمہیں بھی اُن سے لڑنے کی اجازت ہے۔ وَلَا تَقْتُلُوا مَنكُمُ الزَّيَادَتِي نہ کرو۔ زیادتی نہ کرنے کا ایک مطلب تو یہ ہے کہ جو کوئی تم سے لڑائی نہیں کرتا، تم اُس سے مت لڑو اور بے گناہوں کو قتل نہ کرو۔ مقصد یہ کہ تم سے تو لڑنے کے لیے میدان جنگ میں نوجوان آتے ہیں۔ تم اُن کو مار دو مگر اُن کے بچوں، اُن کے بوڑھوں اور اُن کی عورتوں پر ہاتھ نہ اٹھاؤ۔ ایک جنگ کے دوران حضور علیہ السلام نے دیکھا کہ ایک عورت مری پڑی ہے۔ آپ بہت ناراض ہوئے اور نَهَى عَنْ قَتْلِ النِّسَاءِ وَالصِّبْيَانِ عورتوں اور بچوں کے قتل سے منع فرمایا کہ یہ زیادتی ہے۔ اسی طرح کوئی بہت بوڑھا ہے، معذور ہے، ہتھیار بھی نہیں اٹھا سکتا، یا اصحاب الصلوات میں سے ہے۔ کہ کٹیا میں بیٹھا رہتا ہے۔ دنیا سے کنارہ کش ہو کر عبادت میں مصروف رہتا ہے۔ ایسے شخص پر ہتھیار اٹھانا تعدی کی بات ہے۔ ایسا نہیں کرنا چاہیے۔

زیادتی کی
ممانعت

خلفائے راشدین نے بھی اپنے اپنے عہد میں حکم دیا اَعَزُّوْا فِي سَبِيلِ اللّٰهِ اللہ کے راستے میں جہاد کرو، مگر کسی بوڑھے کو قتل نہ کرنا، کسی بچے پر ہاتھ نہ اٹھانا، کسی عورت کو تکلیف نہ پہنچانا اور جو لوگ دنیا سے الگ تھلاک کر دیا گیا میں جاگزیں ہو گئے ہیں اُن کو بھی قتل نہ کرنا جو کوئی تمہارے مقابلے پر لڑنے کے لیے آتا ہے اس سے لڑائی کرو، اور اس کو قتل کرو، بے گناہ پر زیادتی مت کرو۔ حضرت ابو بکر صدیق رضی اللہ عنہ نے تو یہاں تک وصیت فرمائی تھی کہ کسی پھل دار درخت کو نہ کاٹنا، سوائے

کا علاج قرآن و سنت پر استقامت میں ہے۔ مگر اس دور میں دنیا بھر کے مسلمان
یہودیت اور نصرانیت کا شکار ہیں۔

مشرقی
اداروں
کا جال

دنیا بھر میں پھیلے ہوئے عیسائیوں کے مشنری ادارے بھی مسلمانوں کو ان
کے دین سے گمراہ کرنے کا "فریضہ" ادا کر رہے ہیں۔ گرجے، سکول، ہسپتال سب
گمراہی کے اڈے ہیں۔ ہسپتالوں میں مریضوں کو انجیل کا سبق پڑھایا جاتا ہے جب
مریض تندرست ہو کر باہر نکلتا ہے۔ تو اُدھا عیسائی ہو چکا ہوتا ہے۔ یہی حال مشنری
سکولوں کا ہے۔ جہاں بائبل کی تعلیم لازمی ہے۔ ان مشنری اداروں کو چلانے والے
امریکہ، کینیڈا، برطانیہ اور جرمنی کے عیسائی ہیں۔ انہوں نے مشرقی ممالک پر مغرب کی
ہوتی ہے تاکہ مسلمان اپنے اسلام سے بیگانہ ہو کر ان کے مشن کو اپنائیں۔ آج کی
دنیا میں عالمی خبریں تمام کی تمام یہود و نصاریٰ کے توسط سے آتی ہیں اور وہ انہیں
اپنی مرضی کے مطابق توڑ موڑ کر اخبارات میں پیش کرتے ہیں۔ تاکہ مسلمانوں کے
خلاف یہود و نصاریٰ کو تقویت حاصل ہو۔ پوری دنیا میں کوئی مسلمان خبر کچھنی
نہیں جو ان تک صحیح خبریں پہنچائے۔ لوگ غلط غلط خبریں پڑھ کر یقین کر لیتے ہیں
حالانکہ ان میں بیشتر من گھڑت ہوتی ہیں، ان کا مقصد محض یہ ہے کہ تمہیں اپنے
اصل نظریات سے متنفر کر کے باطل نظریات کی طرف راغب کریں تاکہ قرآن
کے ساتھ تمہارا تعلق منقطع کر دیں۔

فرمایا حقیقت یہ ہے کہ اگر مسلمان اپنے سرکزی عقیدہ اور قرآن پر قائم رہیں
گے تو وَمَا يُضِلُّوْنَ اِلَّا اَنْفُسَهُمْ نہیں گمراہ کر سکیں گے مگر اپنی ہی
جانوں کو۔ ان کی پھیلانی ہوئی گمراہی کا وبال انہیں پڑے گا بشرطیکہ مسلمان اپنے
صحیح عقیدہ پر قائم رہیں۔ آگے قیامت کا محاسبہ آئیوالا ہے۔ ان کو معلوم ہو
جائے گا کہ گمراہی پھیلانے کا کیا نتیجہ نکلتا ہے۔ وَمَا يَشْعُرُوْنَ وہ اس
وقت نہیں سمجھتے۔

تکفیریات

اللہ تعالیٰ نے فرمایا يٰۤاَهْلَ الْكِتٰبِ لِمَ تَكْفُرُوْنَ

میں رکاوٹ بن جائیں تو یہ قتل سے بھی زیادہ گلیں جرم ہے۔ البتہ ایک اصول یاد رکھو
 وَلَا تَقْتُلُوهُمْ عَنْكَ الْمَسْجِدَ الْحَرَامَ انہیں مسجد الحرام کے پاس قتل کرو
 یہ حرم پاک کے تقدس کا تقاضا ہے۔ حَتَّى يُقْتَلَ لَكُمْ فِيهِ يَٰۤاَيُّهَا تَحٰكُمُ
 وہ خود تم سے مسجد حرام میں جنگ کریں۔ فَإِنْ قُتِلَ لَكُمْ اَگہ وہ تم سے لڑائی کریں۔
 فَاقْتُلُوهُمْ تو تم بھی ان سے جہاد کرو۔ مقصد یہ کہ مسجد حرام کی حرمت و عظمت
 کا تقاضا ہے۔ کہ تمھاری طرف سے پہل نہ ہو۔ اور اگر وہ باز نہ آئیں، تو پھر تمہیں
 بھی دفاع کی اجازت ہے۔

جب سے اللہ تعالیٰ نے زمین و آسمان کو پیدا فرمایا ہے اس خطے کو محترم بنایا
 ہے۔ حتیٰ کہ یہاں کے درخت کاٹنا بھی جائز نہیں، خود دروگھاس نہیں کاٹی جاسکتی
 کسی جانور کو ایذا نہیں پہنچائی جاسکتی۔ شکار نہیں کیا جاسکتا بلکہ شکار کو چھپڑنا بھی جائز نہیں۔
 یہاں پر لڑائی تو بالکل ہی حرام ہے۔ یہاں تک کہ کوئی دوسرا تم پر حملہ آور ہو۔ حضور علیہ السلام
 نے فرمایا کہ فِجْ مَكَّةَ کے دن اللہ تعالیٰ نے دن کے کچھ حصہ کے لیے میرے واسطے
 حرم میں لڑائی کو حلال قرار دیا تھا اور وہ بھی اس صورت میں کہ مشرک آمادہ جنگ ہوں
 اس کے بعد قیامت تک کے لیے اس خطہ پاک پر لڑائی کو حرام کر دیا گیا۔ اللہ تعالیٰ
 کا واضح ارشاد ہے مَنْ دَخَلَهُ كَانَ اَمِنًا یعنی جو کوئی حرم میں داخل ہو گیا
 اسے امن مل گیا۔

الغرض فرمایا کہ مسجد حرام کے پاس اگر مشرک لڑائی کی ابتدائی کریں تو تمہیں بھی
 جواب دینے کی اجازت ہے۔ تم بھی انہیں قتل کرو۔ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ فِرْعٰوْنَ
 کفار کا یہی بدلہ ہے۔ فَإِنْ اَنْتُمْ هُمْ۔ اور اگر وہ لڑائی سے باز آجائیں اور صلح کر
 لیں۔ تو لڑائی کو طول دینے کی ضرورت نہیں۔ اور اگر وہ ایمان قبول کر لیں تو معاملہ
 بالکل ہی صاف ہو گیا۔ فَإِنَّ اللّٰهَ عَفُوٌّ رَّحِيْمٌ اللہ تعالیٰ بخشنے والا
 مہربان ہے۔ اُن کے تمام سابقہ گناہ معاف ہو جائیں گے۔

اب آگے جہاد کی حکمت بھی بیان فرمادی۔ وَقَاتِلُوهُمْ حَتَّىٰ

فنتہ و فساد
 سمجھ گنجی

تھے۔ اُن کے پاس کوئی کتاب نہیں تھی، مگر تم جان بوجھ کر گمراہی میں پڑے ہوئے ہو تمہارا کوئی علاج ممکن نہیں، جب یہ لوگ مکے میں آتے تو مشرکین ان سے دریافت کرتے کہ ہمارا مذہب اچھا ہے یا مسلمانوں کا تو کہتے تمہارا دین صحیح ہے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک میں ارشاد فرمایا کہ یہ جان بوجھ کر ایسا کرتے ہیں تاکہ مسلمانوں کے خلاف نفرت پیدا ہو۔ یہ اہل کتاب ہیں۔ انبیاء کی تاریخ سے واقف ہیں مگر اپنی ہٹ دھرمی کی وجہ سے مسلمانوں کو ذلیل کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اس وقت ساری دنیا میں یہود و نصاریٰ کی سازش پھیلی ہوئی ہے۔ مگر بہت تھوڑے مسلمان اس سازش کو پہچانتے ہیں۔ اور اپنے دین پر قائم ہیں۔ ورنہ اکثریت ان کے جال میں پھنس چکی ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ ترقی یافتہ لوگ ہیں جو کچھ کہتے ہیں، درست کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ حق و باطل کی پہچان کی توفیق عطا فرمائے۔

سَيَقُولُ ۲

البقرة ۲

درس ہفتاد و نہ (۷۹)

آیت ۱۹۴ تا ۱۹۵

الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ وَالْحُرُمَتُ قِصَاصٌ فَمَنِ
 اَعْتَدَىٰ عَلَيْكُمْ فَاعْتَدُوا عَلَيْهِ بِمِثْلِ مَا عَتَدَا
 عَلَيْكُمْ ۖ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ ﴿۱۹۴﴾
 وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَلَا تُلْقُوا بِأَيْدِيكُمْ إِلَى التَّهْلُكَةِ
 وَأَحْسِنُوا ۗ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ ﴿۱۹۵﴾

مع

ترجمہ: حرمت کا مینہ حرمت کے معنی کے مقابل ہے۔ اور تمام حرمتوں کا بدلہ ہے۔

پس جس شخص نے تم پر زیادتی کی، تم بھی اُس پر زیادتی کرو جیسی کہ اُس نے زیادتی کی ہے تم پر اور اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہو، اور جان لو کہ بے شک اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے ﴿۱۹۴﴾ اور اللہ کی راہ میں خرچ کرو اور اپنی جانوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔

اور احسان کرو بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے ﴿۱۹۵﴾

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے جہاد اور قتال کا حکم دیا تھا، اور اس کی وجہ بھی بیان فرمائی کہ مشرکین کے برپا کردہ فتنہ و فساد کو فرو کرنے اور ظلم و زیادتی کو ختم کرنے کے لیے جہاد ضروری قرار دیا گیا ہے، یہ بھی وضاحت کی گئی ہے۔ کہ عام طور پر جہاد اپنے دفاع کے لیے کیا جائے، البتہ اگر انبیاء کے ظلم و ستم کی بنا پر مخلوق خدا کی جان و مال اور عزت و ناموس خطرے میں ہو تو جنگ میں پہل بھی کی جاسکتی ہے، حرمت والے چار مہینوں کا ذکر بھی اجمالاً آچکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے تخلیق ارض و

گزشتہ پیوتر

سما کے وقت سے ہی بارہ مہینوں کی تقویم مقرر کر رکھی ہے۔ جس میں سے چار مہینے حرمت والے ہیں۔ تکت ابڑ بھی میں یہ امر مسلم ہے۔ کہ ان چار مہینوں میں مشرک بھی لڑائی نہیں کرتے تھے۔ بلکہ عام راہزن بھی کسی کا مال نہیں لوٹتے تھے اور تجارتی

کے برے خصائل کا تذکرہ ہے۔ ان آیات کا مصداق مہینے کے ارد گرد بسنے والے یہودی خاص طور پر ہیں۔ اب تک اہل کتاب کی دینی خیانت کا تذکرہ ہو رہا ہے۔ آج کا درس بھی اسی سلسلہ کی کڑی ہے۔ تاہم آئندہ آنے والے درس سے اہل کتاب کی دنیوی خیانت کا بیان ہوگا۔ حقیقت یہ ہے کہ یہ لوگ دینی طور پر بھی خائن ہیں اور دنیوی طور پر بھی ایسے ہی ہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ درس میں یہ بیان ہوا تھا کہ اہل کتاب کی خواہش اور کوشش یہ ہے کہ کسی طرح مسلمانوں کو ان کے دین سے پھیر دیں۔ اس سلسلہ میں وہ ہر حیل اختیار کرنے پر کمر بستہ رہتے ہیں آج کے درس میں ان کی ایک تدبیر کا تذکرہ ہے۔ اور وہ یہ کہ ان میں سے کچھ لوگ صبح کے وقت ایمان لے آئیں۔ اور شام کو انکار کر دیں۔ تاکہ اس طریقہ سے ان لوگوں کو دین سے بظن کھرے جو پہلے ہی ایمان لے چکے ہیں۔

سورۃ بقرہ میں تحویل قبلہ کا ذکر ہو چکا ہے۔ جب وہ آیات نازل ہوئیں **قَدْ نَدَى ثَقَلَبَ وَجْهَكَ فِي السَّمَاءِ** اور مسلمانوں نے اپنا قبلہ بیت المقدس کی بجائے بیت اللہ کو مقرر کر لیا، تو مدینہ کے یہودی بہت سیخ پا ہوئے۔ انہوں نے آپس میں مشورہ کیا۔ کہ کسی طرح اسلام کے بڑھتے ہوئے سیلاب کے سامنے بند باندھا جائے۔ اس مقصد کے لیے انہوں نے یہ تدبیر بنائی کہ ان میں سے کچھ لوگ دن کے پہلے حصے میں اوپر سے دل سے اسلام قبول کر لیں اور آخری حصے میں اسلام سے باہر آجائیں۔ اس طرح کمزور ایمان یا ناواقف لوگ یہ سوچنے پر مجبور ہو جائیں گے کہ اگر اسلام سچا مذہب ہوتا تو یہ پڑھے لکھے یہودی اسے قبول کر کے منصرف کیوں ہو جاتے ہیں۔ اس طرح اسلام میں نئے آنے والے رک جائیں گے۔ اور جو ایمان لے چکے ہیں، ان کے ایمان متزلزل ہو جائیں گے۔

یہودی کی اسی تدبیر کا ذکر کرتے ہوئے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے **وَقَالَتْ طَائِفَةٌ مِّنْ أَهْلِ الْكِتَابِ آمِنُوا بِالَّذِي أُنْزِلَ**

درگزر سے کام لیا گیا۔ اب اگر ایسا کریں تو تمہیں لڑائی کی اجازت ہے۔ اُن سے پورا پورا مقابلہ کیا جائے اور انہیں ترکی بہ ترکی جواب دیا جائے گا۔ اس سال پھر ذی قعدہ کا حرمیت والا مہینہ تھا۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اگر اب انہوں نے اس مہینہ کا احترام نہ کیا اور آمادہ جنگ ہوئے، تو تم پر بھی ایسا کرنے میں کوئی گناہ نہیں۔

اے کا بدلہ

فرمایا الشَّهْرُ الْحَرَامُ بِالشَّهْرِ الْحَرَامِ حُرْمَتُ الْأَمِينَةِ حُرْمَتُ دَائِمِ مَعِينِ کے مقابل ہے۔ وَالْحُرْمَةُ قِصَاصٌ اور تمام ادب والی چیزوں کا بدلہ ہے۔ حرمت والی چیزوں میں بیت اللہ شریف، مسجد الحرام تمام مساجد اور حرم کا پورا خط شامل ہے۔ لہذا ان تمام چیزوں کا احترام کرنا چاہیے۔ ان میں جنگ و جدال اور فتنہ و فساد برپا نہیں ہونا چاہیے۔ مسلمان تو بہر حال ان کا احترام کرتے ہیں۔ البتہ اگر مشرکین ان کے ادب کو ملحوظ نہ رکھیں اور لڑائی پر آمادہ ہوں تو پھر مسلمانوں کو بھی اجازت ہے کہ ان کا بدلہ چکائیں۔ مطلب یہ کہ فَهَمَنْ اعْتَدَى عَلَيْنَا كَعَدَا عَلَيْنَا جو کوئی تم پر زیادتی کرے، فَاعْتَدُوا عَلَيْنَا جِمْثًا مِثْلَ مَا اعْتَدَى عَلَيْنَا تو تم بھی اُس پر اُسی طرح زیادتی کرو، جس طرح اُس نے تم پر کی ہے۔ یہی قانون اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں بھی بیان فرمایا ہے۔ اگر اُن کی تعدی کے عوض میں مخاف کرو، تو تمہیں بڑا اجر ملیگا۔ اور اگر بدلہ لینا ہے۔ تو پھر انہیں اُسی قدر ایذا پہنچاؤ، جس قدر انہوں نے تمہیں پہنچائی ہے۔ اُن سے زیادتی نہ کرو۔

خوف خدا

وَاتَّقُوا اللَّهَ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ کہ اُس کے قانون کی خلاف ورزی نہ ہونے پائے اور اگر تم خوف خدا کو دل میں جگہ دو گے تو پھر تمہیں خوشخبری ہو کہ وَالْعَلَىٰ أَنَّ اللَّهَ مَعَ الْمُتَّقِينَ اور جان لو کہ اللہ تعالیٰ متقیوں کے ساتھ ہے۔ یعنی اُس کی رضا اور خوشنودی بھی ایسے ہی لوگوں کے حق میں ہوتی ہے، نہ کہ کافروں اور ظالموں کے ساتھ۔ بہر حال مسلمانوں کو حکم دیا کہ لڑائی میں تم ابتداء نہ کرو اور حرمت والے مہینوں کا پورا پورا احترام کرو۔ البتہ اگر مشرکین اس بات کی پروا نہیں کرتے تو پھر تمہیں بھی اپنا دفاع کرنا بھی اجازت ہے۔ مگر وہ بھی اس حد تک جس حد تک

عارضی طور پر دین کے اول حصہ میں بظاہر ایمان بھی لے آؤ، تو تصدیق صرف اُسی چیز کی کرنا جو تمہارے دین میں شامل ہے۔ کسی دوسری بات کی تصدیق نہ کرنا۔ کیونکہ سچا دین صرف تمہارا ہی ہے۔ اور اسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے سورۃ بقرہ میں اُن کا یہ قول نقل فرمایا ہے۔ **وَقَالُوا لَنْ يَدْخُلَ الْجَنَّةَ اِلَّا مَنْ كَانَ هُودًا اَوْ نَصْرٰی** یعنی جنت کا داخلہ صرف یہودیوں اور نصاریٰوں کے لیے مخصوص ہے۔ کوئی دوسرا شخص جنت میں نہیں جاسکتا۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، اے پیغمبر! صلی اللہ علیہ وسلم قُلْ اِنَّ الْهُدٰی **هُدٰی اللہ** ان سے کہ دیں، ہدایت تو وہی ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کی طرف سے آتی ہے۔ کسی پارٹی کا باطل پر پختہ ہونا حق کی دلیل نہیں بن سکتا۔ ہدایت یافتہ وہ ہے جو ہدایت من جانب اللہ پر عمل کرتا ہے۔ یہودیت اللہ کی جانب سے نہیں ہے۔ یہ اصل دین کی منسوخ شدہ صورت ہے اور اس میں کفر اور شرک کی آمیزش ہے۔ اگر صحیح ہدایت کی تلاش ہے، تو وہ ہدایت ایسی ہے۔ جو اللہ کے نبیوں پر نازل ہوئی۔ اور جس کی آخری کڑی قرآن پاک ہے **اَنَّ یُؤْتٰی** **اَحَدٌ مِّثْلَ مَا اُوْتِیْتُ** یہ کہ کسی دوسرے کو بھی ایسی ہی چیز دی گئی ہے جو تم کو دی گئی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ آیت کے اس حصے کا تعلق گذشتہ حصہ **وَلَا تُوْهِنُوْا اِلَّا لِمَنْ تَبِیْعَ دِیْنَکُمْ** کے ساتھ ہے۔ یعنی یہودی اپنے ہی دینی بھائی ہندوؤں کو کہہ رہے ہیں۔ کہ اپنے سوا کسی دوسرے کی تصدیق نہ کرنا، کیونکہ یہ کیسے ہو سکتا ہے کہ کسی دوسرے کو بھی ویسی ہی فضیلت، برتری یا کتاب دے دی جائے جیسی تم کو دی گئی ہے تمہارا دین ہی برتر اور افضل ہے۔ لہذا اسی پر قائم رہنا۔ اور اختیار کی عدم تصدیق کی دوسری حکمت یہ ہے۔ کہ **اَوْ یُحَاجُّوْکُمْ عَنْ دِیْنِکُمْ** یا وہ تمہارے ساتھ تمہارے رب کے پاس جھگڑا کریں۔ اس کے درمطلب ہو سکتے ہیں۔ کہ اگر تم نے اہل ایمان کی تصدیق کر دی تو پھر بحث مباحثہ میں تم پر غالب

تھے۔ پھر جب دجال کا زمانہ قریب آئے گا تو اس علاقہ پر عیسائیوں کا قبضہ ہو جائے گا اس کے بعد پھر مسلمان غالب آجائیں گے۔

الغرض اس جہاد کی کمان مشہور سپہ سالار خالد بن ولید کے بھائی عبدالرحمن بن ولید کو سہ تھے۔ میدان جنگ کا نقشہ کچھ یوں تھا کہ سامنے دشمن تھا۔ اور مسلمانوں کے پیچھے دیوار تھی، گو یہ مسلمان گھسے ہوئے تھے۔ ایک مسلمان جذبہ جہاد میں کفار کی صفوں میں گھس گیا، بڑے زور شور سے حملہ کیا۔ بالکل اسی طرح جس طرح یرموک کی لڑائی میں حضرت زبیرؓ لاکھ سو لاکھ کفار کی صفوں پر تنہا حملہ آور ہوئے تھے۔ اسی طرح یہ گھوڑ سوار صحابی دشمن کی صفوں کو چیرتے ہوئے دوسری طرف نکل گئے اور پھر اُدھر سے حملہ آور ہو کر واپس آئے۔ اس موقع پر ایک شخص نے یہ آیت پڑھی وَلَا تَمُوتُوا بِأَيِّدٍ كُفْرًا إِلَى التَّهْلُكَةِ یعنی اپنے آپ کو ہلاکت میں مت ڈالو تنہا اتنے بڑے لشکر میں گھس جانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

حضرت ابوالدب النصار ہی وہاں موجود تھے، کہنے لگے بھئی اس کا یہ مطلب نہیں جو تم سمجھ رہے ہو۔ یہ آیت تو ہمارے یعنی النصار مدینہ کے باغ میں نازل ہوئی تھی۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جہاد کو ترک کر کے اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ یعنی اگر تم نے جہاد سے منہ موڑ لیا۔ تو من حیث القوم زندہ نہیں رہ سکو گے۔ فرماتے ہیں کہ اسلام کے ابتدائی دور میں ہم نے مہاجرین کی مینز بانی کی، پھر اسلام کی خاطر جنگیں بھی لڑیں، پھر جب دین کو کافی حد تک غلبہ حاصل ہو گیا۔ تو ہم انصار نے خیال کیا کہ ہم مالی لحاظ بہت پیچھے رہ گئے ہیں لہذا اب ہمیں اپنے کاروبار اور زمینوں کی طرف توجہ دینی چاہیے۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی اور اللہ تعالیٰ نے بات سمجھا دی کہ کاروبار میں مصروف ہو کر جہاد اور انفاق فی سبیل اللہ کو ترک نہ کر بیٹھنا۔ اگر ایسا کیا تو ذلیل و خوار ہو جاؤ گے، ہلاکت میں پڑ جاؤ گے۔ لہذا جہاد کے لیے ہر آن اور ہر لمحہ کمر بستہ رہو۔ مطلب یہ ہے کہ دشمن کی صفوں میں گھس جانا

اہم محمدؐ نے سیر کبیر اور سیر صغیر دو مشہور کتابیں لکھی ہیں ان میں سیر کبیر اسلام کے قانون صلح و جنگ کے متعلق ہے۔ اسلام کے اس قانون کو سمجھنے کے لیے اس سے بڑھ کر اور کوئی کتاب نہیں۔ اس میں احادیث رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم آثار صحابہ کرامؓ اور خلفائے راشدینؓ کے فیصلوں کی روشنی میں مسائل صلح و جنگ کو حل کیا گیا ہے۔ ان کے سامنے بھی یہ مسئلہ پیش ہوا کہ اگر کفار کی کثیر تعداد سامنے موجود ہو، تو اس کے ساتھ ایک تنہا مسلمان کو جنگ کرنا کس حد تک درست ہے۔ جب کہ اس کی جان تلف ہو جانے کا غالب گمان ہو۔ اہم صاحب فرماتے ہیں کہ اگر ایسا کمنے سے دشمن کو نقصان پہنچ سکتا ہو، جس کا بحیثیت مجموعی مسلمانوں کو فائدہ ہو، تو اس قسم کی قربانی پیش کرنا روا ہے۔ اور اگر ایسا کرنے سے نہ کفار کو نقصان پہنچ سکتا ہو، اور نہ ہی اسلام کو فائدہ ہو، تو پھر محض جان کا ضیاع ہے۔ ایسا نہیں چاہیے۔

بیان پر مطلق حکم ہے۔ **وَأَنْفِقُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ** یعنی اللہ کے راستے میں خرچ کرو۔ اللہ کا راستہ کون سا ہے۔ قرآن پاک میں اس کی مختلف مدت بیان کی گئی ہیں۔ **مِمَّا رَزَقْنَاهُمْ يُنْفِقُوا** میں بھی یہی بات ہے خرچ کریں مگر کہاں۔ تو اس کی تشریح پہلے آچکی ہے۔ سب سے پہلے زکوٰۃ ادا کرو پھر حج و عمرہ کا خرچہ ہے۔ غزبار و مساکین پر خرچ کرو۔ اس کے بعد دفاع ہے اور اسی میں جہاد فی سبیل اللہ بھی آتا ہے۔ اور پھر اللہ کے راستے کی آگے کئی شاخیں ہیں۔ جیسے دین کی تعلیم کا شعبہ ہے تصنیف و تالیف کی مدد ہے، مجاہدین کی اعانت ہے۔ ان سب امور پر خرچ کرنے کا حکم ہے۔ جیسا کہ پہلے بیان ہو چکا ہے، محض زکوٰۃ ادا کر دینے سے سارے مالی حقوق ادا نہیں ہو جاتے بلکہ **إِنِّي فِي الْمَالِ حَقٌّ** سَوَى الزَّكَاةِ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا زکوٰۃ کے علاوہ بھی مال میں حق باقی ہے۔ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس کے بعد صدقہ فطر واجب ہے۔ قربانی بھی واجب ہے۔ اسی طرح اعزہ و اقارب پر خرچ کرنا ہے۔ اس کے علاوہ بہت سے اخراجات سنت اور مستحب ہیں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْاِعْمَارِ ۲

درس بست و پنج ۲۵

آیت ۴۵، ۴۶

وَمِنْ أَهْلِ الْكِتَابِ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِقِنطَارٍ
يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ ۚ وَمِنْهُمْ مَنْ إِنْ تَأْمَنَهُ بِدِينَارٍ
لَا يُؤَدِّهِ إِلَيْكَ إِلَّا مَا دُمْتَ عَلَيْهِ قَائِمًا ۚ ذَٰلِكَ
بِأَنَّهُمْ قَالُوا لَيْسَ عَلَيْنَا فِي الْأُمِّينَ سَبِيلٌ ۚ
وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكَذِبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۴۵﴾
بَلَىٰ مَنْ أَوْفَىٰ بِعَهْدِهِ وَاتَّقَىٰ فَإِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُتَّقِينَ ﴿۴۶﴾

ترجمہ: پ اور اہل کتاب میں سے بعض ایسے ہیں کہ اگر آپ اُن کے پاس ایک خزانہ
امانت رکھیں۔ تو وہ اس کو تمہاری طرف لوٹائے گا۔ اور ان میں سے بعض ایسے ہیں
کہ اگر آپ اُن کے پاس ایک دینار امانت رکھیں، تو اُسے آپ کی طرف واپس
نہیں کرے گا، جب تک کہ آپ اُس پر قائم نہ رہیں۔ یہ اس وجہ سے کہ وہ کہتے ہیں
کہ ہم نے اُپر اُمّی لوگوں کے حق میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور یہ لوگ اللہ پر جھوٹ
کہتے ہیں۔ اور وہ جانتے ہیں ﴿۴۵﴾ کیوں نہیں۔ جو شخص اپنے عہد کو پورا کرے گا
اور ڈرتا ہے گا۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے۔ ڈرنے والے اور تقویٰ
اختیار کرنے والوں کو ﴿۴۶﴾

گزشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے اہل کتاب کی دینی خیانت کا
ذکر فرمایا تھا کہ اہل اسلام کو گمراہ کرنے کے لیے کیسی کیسی تدبیریں اختیار کرتے
ہیں۔ اس کے علاوہ تبلیغ کا ذکر تھا۔ کہ یہ لوگ حق کو باطل کے ساتھ خلط ملط کر
دیتے ہیں اور حق کو چھپاتے ہیں۔ یہ بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ اہل کتاب باطل

زیادہ حیثیت رکھتے تھے۔ یہ وظیفہ محض علم دین کی تحصیل کے لیے دیا گیا تھا اور وہ لوگ نوازہ کی کسی پالیسی کے پابند نہیں تھے۔ جیسا کہ آجکل بیوروکریسی کا شیوہ ہے کہ کسی کو چند لکے دیکر اُس کا دین ایمان تک خرید لیا۔ ایسا نہیں تھا۔

آج مسلمان تبلیغ دین کے لیے کتنی رقم خرچ کر رہے ہیں۔ عیسائیت کا راستہ بند کرنے کے لیے کیا تدبیریں اختیار کی جا رہی ہیں۔ امریکہ اور برطانیہ عیسائیت کی تبلیغ کے لیے اربوں روپیہ خرچ کر رہا ہے۔ کہیں سکول کے نام پر، کہیں کسی ہسپتال کی آرٹیں اور کہیں کسی اور رفاہی ادارہ کی صورت میں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ مگر سچے دین کا داعی مسلمان ٹس سے مس نہیں ہوتا۔ خدا کا فرمان ہے خرچ کرو اور اپنے ہاتھوں کو ہلاکت میں نہ ڈالو۔ مگر ہم پر کوئی اثر نہیں۔ ایسی صورت حال میں دشمن غلبہ حاصل نہیں کرے گا، تو اور کیا ہو گا۔

احسان کرو

فرمایا، وَاصْبِرْ صَبْرًا یعنی مستحقین کے ساتھ احسان کرو۔ قرابت داروں، غریبوں، مسکینوں، یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ الْمُحْسِنِينَ بے شک اللہ تعالیٰ احسان کرنے والوں کو پسند کرتا ہے۔ اگر اللہ کی رضا چاہتے ہو تو اللہ کے راستے میں خرچ کرو کہ احسان جیسے اہم اصول پر عمل کرو۔ وگرنہ اللہ تعالیٰ ظلم و زیادتی کرنے والوں، کفر و شرک اور بدعات کے مرتکبین کو کبھی پسند نہیں فرماتا۔

کے پاس ۱۲ سواؤنس چاندی امانت رکھی۔ ایک
 اونس چالیس درہم کے برابر ہوتا ہے۔ جب اُس شخص نے اپنی امانت طلب
 کی تو عبداللہؓ نے کوئی پس و پیش نہ کی اور امانت اس کے حوالے کر دی۔ ایک
 دوسرا یہودی عالم فحماص بن عازر دانتا، اس کا حال یہ تھا کہ قریش خاندان کا کوئی مسافر
 مدینہ آیا۔ تو فحماص کو شکل و صورت سے بڑا بزرگ شخص خیال کر کے ایک دینار
 اس کے پاس امانت رکھ دیا۔ مگر جب اپنی امانت واپس لینا چاہی تو فحماص نے
 انکار کر دیا۔ کہ میں نے تمہاری کوئی امانت نہیں رکھی۔ یہاں سے چلے جاؤ۔ پاس ہی
 اس کا شاگرد تھا۔ اُس نے کہا، کہ حضرت اس شخص کی امانت آپ کے پاس موجود ہے
 اُسے واپس کر دیں۔ کہنے لگا، ٹھیک ہے میں نے ایک دینار اس سے لیا تھا۔
 مگر یہ اُمّی (آن پڑھ) لوگ ہیں، ان کا مال ہضم کر جانے میں کوئی گناہ نہیں۔ یہ ہمارے
 لیے جائز ہے۔ کیونکہ ہم اللہ کے محبوب ہیں مُحَمَّدٌ رَسُوْلُ اللّٰهِ وَاجِبُ اَمْرِهِ
 یہ لوگ ہمارے مرید ہیں۔ ان کا مال ہمارے لیے حلال ہے۔ آخر ہم نے علم حاصل کیا
 ہے۔ اس کے لیے محنت کی ہے، خرچ کیا ہے، وہ ان سے پورا نہیں کرینگے،
 تو اور کس سے کریں گے۔ جب وہ مسافر مایوس ہو گیا۔ تو ایک دوسرا یہودی نے
 اُسے یہ ترکیب بتائی کہ تم امانت دار سے یوں کہو کہ میں نے تمہیں نیک آدمی سمجھ کر تمہارے
 پاس امانت رکھی تھی۔ اگر میری امانت واپس نہ کی تو میں مدینے میں یہ اعلان کروں
 گا کہ فلاں شخص میری امانت کھا گیا ہے اور تم بدنام ہو جاؤ گے، چنانچہ اس بدنامی سے
 ڈرتے ہوئے فحماص نے وہ ایک دینار واپس کر دیا۔ غرضیکہ ان واقعات کے
 پس منظر میں اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی کہ اہل کتاب میں سے بعض ایسے
 ہیں کہ ڈھیروں مال امانت کے طور پر ان کے پاس رکھو، تو وہ عند الطلب لوٹا
 دیتے ہیں۔ اور اس میں ذرہ بھر خیانت نہیں کرتے اور بعض ایسے بھی ہیں کہ ایک
 دینار امانت رکھ کر مکہ جاتے ہیں۔

اُس زمانے میں دینار سونے کا سکہ ہوتا تھا، جس کا وزن چار شے ہوتا تھا۔ اور

خاص طور پر حج کے اوقات معلوم کرنے کا ذریعہ ہے۔ لہذا قمری مہینے کی تقویم ضروری ہے۔ حج اور اس کے ساتھ جہاد کا بیان بھی آگیا ہے۔ قتال فی سبیل اللہ کی غرض و غایت بھی آگئی ہے کہ اس سے مقصود فتنہ و فساد کی بیج کنی ہے۔ جہاد ہی کے ضمن میں انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر بھی آچکا ہے۔ اس کے بغیر جہاد کی تکمیل ممکن نہیں۔ اور اگر جہاد کا جذبہ ختم ہو جائے گا تو دشمن غالب آجائے گا۔ حرمت وائے مہینوں کا بیان بھی آچکا ہے۔ کہ یہ کون کون سے مہینے ہیں۔ اور پھر ان میں قتال کے کیا احکام ہیں مسلمانوں کو ان مہینوں کا پورا پورا احترام کرنے کا حکم دیا گیا، تاہم اگر کفار لڑائی سے باز نہ آئیں تو پھر مسلمانوں کو بھی اس کا جواب دینے کی اجازت دی گئی ہے۔

حج اور عمرہ

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے حج اور عمرہ کو پورا کرنے کا حکم دیا ہے اور اس سفر کے دوران اگر احصار پیدا ہو جائے یعنی رکاوٹ کھڑی ہو جائے اور کوئی شخص حج و عمرہ کی تکمیل نہ کر سکے، تو اسے کیا کرنا چاہیے۔ یہ مسائل بیان ہوئے ہیں حج اور عمرہ کے ارکان ملتے جلتے ہیں، تاہم ان کی ادائیگی کے اوقات مختلف ہیں۔ عمرہ کو حج اصغر بھی کہتے ہیں اور یہ سال بھر کے تمام ایام میں ہو سکتا ہے۔ حج مخصوص ایام یعنی ذی الحجہ کی آٹھویں تا تیرھویں تاریخ کو ہی ادا کیا جاسکتا ہے۔ ان ایام کے علاوہ کسی اور تاریخ پر حج ادا نہیں ہو سکتا۔ حج عمر بھر میں صاحب استطاعت کے لیے ایک دفعہ فرض ہے، البتہ عمرہ سنت ہے ہاں اگر ایک دفعہ اس کی نیت کر لے تو پھر واجب ہو جاتا ہے۔ یعنی اگر عمرہ کا احرام باندھ لیا ہے، تو پھر لازماً اس کو پورا کرنا پڑے گا۔ اگر سفر کے دوران کوئی رکاوٹ پڑ جائے اور انسان عمرہ مکمل نہ کر سکے۔ تو اسے بہر حال قضا کرنا ہوگا اب اس کو ترک نہیں کیا جاسکتا۔ خود حضور علیہ السلام کا عمل موجود ہے۔ آپ نے صحابہ کرامؓ کے ہمراہ لڑنے میں عمرہ کا سفر اختیار کیا مگر مدینہ کے محاصرہ پر کفار نے روک دیا اور بغیر عمرہ ادا کیے واپس جانا پڑا۔

کوئی حق نہیں دیا۔ اللہ جل جلالہ نے جاہلیت کی تمام باتیں (رسومات) میرے پاؤں کے نیچے روند دی ہیں۔ ان کا پورا کرنا ضروری نہیں ہے۔ اِلَّا الْاَمَانَةُ سوائے امانت کے کیونکہ اِنَّهَا تَوْفِيقُ الْحَبِیبِ وَالْفَاجِرِ امانت خواہ نیک آدمی کی ہو یا بُرے شخص کی، اسکا ادا کرنا ضروری ہے۔ اس میں دوستی اور دشمنی کو کوئی دخل نہیں۔ کوئی شخص کسی مذہب کے تعلق رکھتا ہو، جاہل ہو یا عالم، امانت بہر حال واجب الادا ہوتی ہے۔ دھوکہ دہی، چوری، خیانت وغیرہ کا مال قطعاً حرام ہے ہاں اگر کوئی اپنی خوشی سے کسی کو کچھ دے دے تو لینے والے کے لیے جائز ہے۔ وگرنہ امانت کی ادائیگی ہر ایک کے لیے لازم ہے۔

تقسیم ہند کے موقع پر لوگوں نے ایک دوسرے کا مال کھلے عام کھایا خوب لوٹ مار کی۔ یہ قطعاً حرام ہے۔ اس کا حساب قیامت کو دینا پڑے گا۔ ہندو تو فیسے ہی کافر ہے۔ اگر کسی مسلمان نے ہندو کا مال کھایا ہے۔ تو وہ بھی معاف نہیں ہوگا۔ کسی نے حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے کہا کہ ہم جہاد کے لیے جاتے ہیں، ذمیوں کے علاقے سے گزرتے ہوئے کوئی بیضر بکری یا مرغی وغیرہ مل جائے تو ہم کھا لیتے ہیں۔ آخر ہم غازی ہیں ذمیوں کا مال کھانے میں کوئی حرج نہیں سمجھتے۔ حضرت ابن عباسؓ ناراض ہوئے اور فرمایا یہ تو وہی بات ہے جو یہودیوں نے کی تھی۔ لَیْسَ عَلَیْکُمْ فِی الْاَیْمَانِ سَبِیْلٌ یعنی امیوں کا مال کھا جانے میں کوئی حرج نہیں۔ فرمایا جب ذمی لوگ مسلمانوں کو جزیہ ادا کرتے ہیں تو پھر ان کے مال و جان کی حفاظت ہم پر لازم آتی ہے۔ ان کے مال کو اٹکی رضامندی کے بغیر کھانا حرام ہے۔

فرمایا بعض اہل کتاب ایسے ہیں کہ اگر آپ اس کے پاس کثیر مال بطور امانت رکھیں، تو وہ لوٹا دے گا۔ اور بعض ایسے ہیں کہ اگر ایک دینار بھی امانت رکھیں، تو وہ واپس نہیں کرے گا۔ ہاں امانت کی واپسی کی ایک صورت ہے اِلَّا هَادُمَتْ عَلَیْہِ قَائِمًا کہ تو اس کے سر پر سوار ہے۔ یعنی وقتاً فوقتاً مطالبہ کرتا ہے۔ ام ابو حنیفہؒ نے اسی سے یہ اخذ کیا ہے۔ کہ قرض خواہ اپنے قرض کا چھپا کر رکھتا ہے۔

امانت کی واپسی پر اصرار

یہی کچھ ہوتا ہے حاجی کو ہاروں اور اب خاص طور پر کہ نسبی نوکلوں کے ہاروں سے
لاوا جاتا ہے۔ اور اگر ہار ہرنانے والا کوئی نہیں پہنچا تو اپنے پاس سے ہار نکال کر
گلے میں ڈال لیا جاتا ہے کہ حاجی کی پہچان ہو۔ یہ سب فخریہ چیزیں ہیں۔ ان کی وجہ سے
رضا خالص اللہ کی نہیں رہتی بلکہ اس فعل میں دو کسر لوگوں کی رضا کو بھی شامل کرنے
کی کوشش ہوتی ہے۔ اور یہی چیز لفظ اللہ کے مفہوم کے خلاف ہے۔

احصار کے
مائل

فرمایا حج اور عمرہ کو اللہ کی رضا کے لیے پورا کر دینا اُحْصِیْہُ پھر اگر
تم روک دیے گئے۔ یعنی تم نے احرام باندھ کر حج یا عمرہ کا سفر شروع کر دیا ہے۔
اور راستے میں کوئی رکاوٹ پیدا ہو گئی تو ~~احصار~~ احصار کہتے ہیں۔ احصار کی تعریف
کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہم شافعی کے نزدیک شرعی
احصار صرف ایسی صورت میں شمار ہوتا ہے۔ جب حج و عمرہ کی ادائیگی میں رکاوٹ
بن جائے۔ اس کی مثال سترہ میں حضور علیہ السلام اور صحابہ کا واقعہ ہے۔ جب ان
کو مدینہ کے مقام پر روک دیا گیا اور آپ بغیر عمرہ کیے مدینہ طیبہ کو لوٹ گئے۔
اہم ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق دشمن کی رکاوٹ کے علاوہ بیماری یا حادثہ
بھی احصار کا سبب بن سکتا ہے۔ کوئی ایسی بیماری لاحق ہو گئی ہے جس کی
وجہ سے عازم حج سفر نہیں کر سکتا یا کوئی ایسا حادثہ پیش آ گیا ہے، سخت زخمی ہو
گیا ہے، ٹانگ زخمی ہو گئی ہے کہ چلنے پھرنے سے معذور ہو گیا ہے۔ کسی دینے
نے راستہ روک رکھا ہے۔ سیلاب آ گیا ہے یا کسی اور وجہ سے راستہ
رُک گیا ہے۔ یہ بھی شرعی احصار کی تعریف میں آئے گا۔

اس قسم کی صورت حال کے متعلق ارشاد فرمایا فَمَا اسْتَيْسَرَ مِنَ الْهَاجِ

جو میسر ہو قربانی کر دو۔ احرام باندھ کر حج و عمرہ سے محروم ہونے کی صورت میں
قربانی واجب ہو جاتی ہے۔ ایک بکری یا گائے یا اونٹ جو بھی میسر ہو، قربانی کر
دے اور احرام کھول دے۔ یہ قربانی کس مقام پر کئے، اس مسئلہ میں بھی اختلاف ہے۔
اہم شافعی فرماتے ہیں کہ جس مقام پر کوئی رُک جائے، وہیں قربانی کر کے احرام

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْاِعْمَرَانِ ۳

درس سبست و شش ۲۶

آیت « تا ۸۸ »

إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا
 قَلِيلًا أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ وَلَا يَكِلَهُمُ
 اللَّهُ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ وَلَا يُزَكِّيهِمْ
 وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ ﴿۸۸﴾ وَلَٰنَّ مِنْهُمْ لَفَرِيقًا
 يَلُونِ السِّنَّةَ بِالْكِتَابِ لِتَحْسَبُوهُ مِنَ
 الْكِتَابِ وَمَا هُوَ مِنَ الْكِتَابِ وَيَقُولُونَ هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَمَا
 هُوَ مِنْ عِنْدِ اللَّهِ وَيَقُولُونَ عَلَى اللَّهِ الْكُذْبَ وَهُمْ يَعْلَمُونَ ﴿۸۹﴾

ترجمہ: ہر بیشک جو لوگ اللہ کے عہد اور اپنی قسموں کے بدلے تھوڑی سی قیمت خریدتے
 ہیں۔ یہی لوگ ہیں کہ ان کے لیے آخرت میں کچھ حصہ نہیں اور اللہ ان سے کلام نہیں کہے
 گا۔ اور نہ ان کی طرف نگاہ کرے گا قیامت کے دن۔ اور نہ ان کو پاک کرے گا۔
 اور ان کے لیے دردناک عذاب ﴿۸۸﴾ اور بیشک ان اہل کتاب میں سے ایک گروہ
 ایسا ہے جو موڑتے ہیں اپنی زبانوں کو کتاب کے ساتھ، تاکہ تم اُسے کتاب سے
 گمان کرو۔ حالانکہ وہ کتاب سے نہیں ہے۔ اور وہ کہتے ہیں کہ یہ اللہ کی جانب
 سے ہے حالانکہ وہ اللہ کی جانب سے نہیں ہے اور یہ اللہ پر جھوٹ کہتے ہیں اور یہ جانتے ہیں ﴿۸۹﴾

اس سے پیشتر اہل کتاب کی دینی اور مالی خیانت کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ آج کی
 آیات بھی اسی سلسلہ کی کٹھی میں ہیں اور ان میں اہل کتاب کی تیسری بڑی خیانت کا ذکر ہے
 یہ لوگ ان پیش گوئیوں کو چھپا لیتے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ نے سابقہ کتب میں قرآن مجید اور
 حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق نازل فرمائی تھیں۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے

نہیں کاٹ سکتا۔ بیوی کے پاس نہیں جاسکتا وغیرہ وغیرہ۔ اور اگر مجبور کسی پابندی کو توڑنا پڑے۔ تو پھر اس کے عوض میں فدیہ دینا پڑتا ہے۔ یہاں پر اسی مسئلہ کو بیان کیا گیا ہے۔ فَمَنْ كَانَ مِنْكُمْ مَّرِيضًا تم میں سے جو کوئی بیمار ہو۔ أَوْ بَلًا أَذَى مِنْ رَأْسِهِ یا اس کے سر میں کوئی تکلیف ہو فقہ ذیكہ مَنْ صِيَامَ أَوْ صَدَقَةً پس فدیہ ہے روزے سے یا صدقہ ہے یا قربانی ہے۔ یعنی عذر کے ساتھ احرام کی پابندی توڑنے کی صورت میں ان تین چیزوں میں سے کوئی ایک ادا کرنی ہوگی۔ تین روزے رکھنے یا صدقہ میں تین صاع گندم ادا کرے یا کم از کم ایک بھیترا بجری ذبح کرے۔ صدقہ کی صورت میں چھ مساکین کو نصف صاع گندم فی کس ادا کرنا ہوگا۔

حضرت کعب بن عجرؓ نے احرام باندھا ہوا تھا۔ ٹاٹھی پکانے کے لیے آگ جلا رہے تھے اور آپ کے سر سے جوئیں شے گھر رہی تھیں جنور علیہ السلام کا گزیر ہوا تو فرمایا تمہارے سر کے جانور تمہیں بہت سنااتے ہیں؟ عرض کیا حضور! واقعی بہت سنااتے ہیں مگر میں نے احرام باندھا ہوا ہے، کیا کر سکتا ہوں حکم ہوا اگر سر منڈوانا ہے۔ تو ایک بھیترا بجری کا دم دیدے یا چھ مساکین کو صدقہ دے یا تین دن کے روزے رکھ لے، اس جنابیت کی تلافی ہو جائے گی۔

حج کی تین قسمیں ہیں یعنی افراد، قرآن اور تمتع۔ افراد حج یہ ہے کہ میقات سے صرف حج کا احرام باندھے اور حج کمرہ کے احرام کھول دے۔ اس میں عمرہ شامل نہیں ہوتا۔ دوسری صورت قرآن ہے کہ کوئی شخص میقات سے عمرہ اور حج کا مشترکہ احرام باندھے۔ عمرہ ادا کرنے کے بعد احرام نہ کھولے بلکہ اُسی احرام سے ایام حج میں حج کرنے کے بعد یعنی دس تاریخ کو احرام کھول دے۔ حضور نبی کریم علیہ السلام نے حجتہ الوداع کے موقع پر یہی طریقہ اختیار کیا تھا۔ امام ابن قیمؒ فرماتے ہیں کہ صحیح بات یہی ہے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن کیا تھا کیونکہ احرام میں واضح طور پر آتا ہے کہ آپ تیسہ میں کہتے تھے لَبَّيْكَ يَحْيَا وَعُمْرَةٌ

حج کی اقسام

وہ اللہ تعالیٰ سے اس حالت میں ملاقات کرے گا کہ اللہ تعالیٰ اس پر غضبناک ہوگا۔ آپ نے یہ آیت بھی تلاوت فرمائی۔ "إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ" حضرت اشعث بن قیسؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیت ہمارے بارے میں ہی نازل ہوئی ہے۔

ارشاد ربانی ہے "إِنَّ الَّذِينَ يَشْتَرُونَ بِعَهْدِ اللَّهِ وَأَيْمَانِهِمْ ثَمَنًا قَلِيلًا جَوَلُوا فِي الْأَرْضِ" اپنے عہد اور قسم کے بدلے دنیا کا حقیر مال خریدتے ہیں "أُولَٰئِكَ لَا خَلَاقَ لَهُمْ فِي الْآخِرَةِ" ان کے لیے آخرت میں کچھ نہیں۔ دنیا کا مال جس قدر بھی زیادہ ہو۔ آخرت کے مقابلے میں بالکل حقیر ہے۔ مَا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا إِلَّا مَتَاعٌ یہ دنیا کی زندگی تو تھوڑا سا بہتے کا سامان ہے "قُلْ مَتَاعُ الدُّنْيَا قَلِيلٌ" آپ کہ دیں دنیا کا سارا مال اسباب آخرت کے مقابلے میں بالکل قلیل ہے۔ لہذا دنیا کے حقیر مال کو ناجائز ذرائع سے حاصل کرنے والوں کو آخرت میں کچھ حاصل نہیں ہوگا۔ وَلَا يَكْلَمُهُمُ اللَّهُ اور اللہ ان سے شفقت و مہربانی کے ساتھ کلام نہیں کرے گا۔ غصے اور باز پرس کی صورت میں تو ضرور کلام کرے گا۔ مگر لطف و کرم کے ساتھ گفتگو نہیں فرمائے گا۔ وَلَا يَنْظُرُ إِلَيْهِمْ يَوْمَ الْقِيَمَةِ اور نہ نگاہ شفقت سے ایسے لوگوں کی طرف دیکھے گا۔ وَلَا يُزَكِّيهِمْ اور ان کو پاک بھی نہیں کرے گا۔ یہ ہمیشہ سجاستوں میں لت پت رہیں گے۔ وَلَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ اور وہ عذاب الیم کا شکار ہوں گے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہودیوں سے عہد لیا تھا کہ ہر نبی برحق کی حمایت کرنا اس پر ایمان لانا اور اس طرح خدا تعالیٰ کے عہد کی پابندی کرنا۔ مگر ان لوگوں نے عہد کو توڑ دیا۔ انبیاء کی تکذیب کی اور اللہ کے احکام کو چھپایا۔ کلام الہی میں تحریف کی۔ جھوٹی قسم کھا کر دنیا کا مال حاصل کیا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے عہد کی پابندی کی سخت تاکید کی تھی، قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے "وَكَانَ عَهْدُ اللَّهِ مَسْئُولًا" اللہ کے عہد کے متعلق باز پرس ہوگی۔ اس سلسلے میں اللہ تعالیٰ

اہل کتاب کی پیمبری

سکتا ہے۔ البتہ ایسی قربانی کو حدود حرم کے اندر ذبح کرنا ضروری ہے۔

بعض صورتیں ایسی بھی پیش آسکتی ہیں کہ انسان قربانی کرنے کی پوزیشن میں نہ ہو۔ ایسے ہی حالات کے متعلق فرمایا فَمَنْ لَمْ يَجِدْ جو کوئی قربانی نہ پائے فَصِيَامُ ثَلَاثَةِ أَيَّامٍ فِي الْحَجِّ تو وہ ایام حج میں تین روزے رکھے وَسَبْعَةٍ إِذَا رَجَعْتُمْ اور سات اس وقت جب تم واپس لوٹ جاؤ تِلْكَ عَشْرَةٌ كَامِلَةٌ یہ پورے دس ہوں گے۔ یعنی جو شخص حج قرآن یا حج تمتع ادا کرے اور قربانی کرنے کے لیے اس کے پاس مال نہ ہو یا جانور نہ مل سکے، تو اس قربانی کا نعم البدل دس روزے ہیں۔ تین روزے تو واضح ہیں کہ ایام حج میں رکھے جائیں گے یعنی ذی الحج کی سات، آٹھ اور نو کو رکھے جائیں۔ کیونکہ دس تاریخ کو روزہ رکھنا منع ہے۔ البتہ سات روزوں کے متعلق اختلاف ہے، امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ واپس لوٹنے سے مراد حاجی کا اپنے وطن پہنچنا ہے۔ اور یہ روزے اُسے اپنے گھر آکر رکھنا چاہئیں۔ مگر امام صاحبؒ فرماتے ہیں کہ واپس لوٹنے سے مراد حج سے واپسی ہے۔ جب ایام حج ختم ہو جائیں تو یہ سات روزے اگر قیام ہو تو حرم میں رکھے جاسکتے ہیں۔ یا راستے میں یا گھر واپس آکر ہر طرح درست ہے۔ دس روزے پورے کرنے سے قربانی کی تلافی ہو جائے گی۔ اور حاجی کا قرآن یا تمتع درست ہو جائے گا۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ ایام حج میں تین روزے لازمی ہیں۔ اگر یہ چھوٹ گئے تو پھر باقی سات رکھنے کی ضرورت نہیں۔ اُسے بہر حال دم دینا پڑے گا۔

تمتع کی شرط

فرمایا حج تمتع اور قربانی کے مسائل کے متعلق شرط یہ ہے ذَلِكَ لِمَنْ لَمْ يَكُنْ أَهْلًا حَاضِرِي الْمَسْجِدِ الْحَرَامِ مگر تمتع کرنے والے کا گھر بار مسجد حرام کے پاس نہ ہو۔ یعنی حج تمتع اس شخص کے لیے روا ہے جو حدود حرم کا پہننے والا نہ ہو بلکہ آفاقی ہو۔ حدود حرم کے پہننے والے اور محلی تو جب چاہیں عمرہ کر سکتے ہیں۔ حدود حرم سے باہر جا کر احرام باندھیں اور مکہ مکرمہ آکر

بیہیچ اعادیت میں آتا ہے۔ کہ تین قسم کے آدمی اس زمرہ میں آتے ہیں اَلْمُسْبِلُ وہ شخص جو اپنے پاجامے یا تہبند۔ پتلون کو ٹخنوں سے نیچے ٹکاتا ہے۔ مردوں کے لیے مکروہ تحریمی ہے۔ البتہ عورتیں مستثنیٰ ہیں۔

دوسرا شخص وَالْمَنْفِقُ سلحتہ جو جھوٹی قسم اٹھا کر سودا بیچتا ہے۔ گاہک کو جھوٹا یقین دلاتا ہے۔ اور تیسرا شخص الْمَنَانُ ہے۔ جو کسی پر احسان کر کے جلاتا ہے اس کا نہ صرف احسان ضائع ہوا۔ بلکہ وہ بھی بمرضِ گمروہ میں شامل ہو گیا۔ ایک حدیث میں منور نبی کریم کا ارشاد ہے تین شخص ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ انہیں رکھتا ہے پہلا شخص

الْتَّاجِرُ الْخَلَّافُ یعنی قسمیں

کھالے والا تاجر ہے۔ وَالْفَقِيرُ الْمُحْتَالُ دوسرا شخص وہ ہے جو محتاج ہو کر غرور کرے۔ وَالْبَخِيلُ الْمَنَّانُ اور تیسرا شخص احسان جلالنے والا بخیل ہے ان تینوں اقسام کے آدمیوں سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے۔

پھر فرمایا تین قسم کے لوگ ایسے ہیں جن سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے پہلا محبوب لوگ شخص وہ ہے جو دشمن کے مقابلے میں جہاد کرتا ہے۔ پھر یا تو فتح تک پہنچتا ہے یا شہید ہو جاتا ہے۔ فرمایا دوسرا محبوب آدمی وہ ہے۔ جو کسی قافلے میں شامل ہو کر سفر پر جاتا ہے۔ پڑاؤ کے مقام پر قافلے والے سو جاتے ہیں اور وہ خدا کے حضور کھڑا ہو کر نماز پڑھتا ہے اللہ کے سامنے اپنی مناجات پیش کرتا ہے۔ پھر جب نماز فجر کا وقت ہو جاتا ہے۔ تو اپنے ساتھیوں کو بیدار کر دیتا ہے۔ فرمایا تیسرا محبوب خدا وہ شخص ہے۔ جو پڑوسی کی تکالیف پر صبر کرتا ہے۔ یاں تک کہ اُسے موت آجائے یا وہاں سے علیحدگی اختیار کرے۔ ان اقسام کے لوگوں سے اللہ تعالیٰ محبت کرتا ہے۔

آیت زیرِ درس میں یہودیوں کا ذکر اُس گمروہ میں کیا گیا ہے۔ جن سے اللہ تعالیٰ نفرت کرتا ہے۔ وہ بنو نضیر لوگ ہیں۔ انہوں نے اپنے عہد کو توڑا اور جھوٹی قسمیں کھائیں

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس ہشاد ویک (۸۱)

آیت ۱۹۷ تا ۱۹۸ تقریباً نصف

الْحَجَّ أَشْهُرٌ مَّعْلُومَةٌ ۖ فَسَنَ فَرَضَ فِيهِنَّ الْحَجَّ فَلَا رَفَثَ وَلَا فُسُوقَ وَلَا جِدَالَ فِي الْحَجِّ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ يَّعْلَمُهُ اللَّهُ ۚ وَتَزُودُوا فَإِنَّ خَيْرَ الزَّادِ التَّقْوَىٰ ۚ وَاتَّقُونِ يَا أُولِيَ الْأَلْبَابِ ۚ لَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَبْتَغُوا فَضْلًا مِّن رَّبِّكُمْ ۚ

وَقُلْنَا لِلَّذِينَ اتَّخَذُوا مِنْ دُونِهِ آلِهَةً لَّا تَسْمَعُ وَلَا تَبْصُرُ وَلَا أَعْلَمُ شَيْئًا بِالْعِلْمِ

ترجمہ: حج کے چند مہینے ہیں، جو معلوم ہیں۔ پس جس شخص نے حج کو لازم کر لیا ان مہینوں میں، پس عورتوں کے ساتھ بے حجاب ہونا جائز نہیں ہے اور نہ گناہ کی بات اور نہ حج میں جھگڑا کرنا۔ اور جو کچھ کرو تم نیکی سے اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے اور توشہ بنا کر۔ بیشک بستر توشہ تقویٰ ہے۔ اور مجھ سے ڈرو، اے عقل مند (۱۹۷) تم پر کوئی گناہ نہیں ہے اس بات میں کہ تم اپنے رب کا فضل تلاش کرو

ربط آیات

اس سے پہلے حجاب اور حج کا مشترک حکم بیان ہوا پھر احصار کا مسئلہ بیان ہوا۔ کہ حج یا عمرہ کا احرام باندھنے کے بعد اگر کوئی رکاوٹ پیدا ہو جائے یعنی بیماری لاحق ہو جائے یا دشمن کی وجہ سے راستہ غیر محفوظ ہو جائے تو اس صورت میں کیا کرنا چاہیے۔ اس ضمن میں احصار کا مسئلہ بیان ہوا۔ اس کے بعد تمتع اور قرآن کا بیان آیا کہ جتنے حج اور عمرہ نصیب ہو جائے یہ اللہ تعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ ایسے شخص کو دم یعنی قربانی دینا ہوگی۔ اگر قربانی کی استطاعت نہیں ہے۔ تو دس روزے رکھے۔ یہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرنے کا ایک طریقہ ہے۔

ان آیات میں بھی حج کے مختلف احکام بیان ہوئے ہیں۔ اس کے علاوہ مشرکین کی اس تحریف کا رد ہے جو انہوں نے حج سے متعلق زمانہ جاہلیت

انجیل میں موجود لفظ فارقیط کی جگہ مدوکار یا شفیع لکھ دیا۔ اور دس ہزار کی بجائے لاکھوں لکھ دیا۔ اور اس طرح لفظی تحریف کی۔ اللہ تعالیٰ نے قرآن مجید میں فرمایا ہے کہ اُس نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا کیا۔ آگے فرمایا مَا مَسْنَانٌ لِّغُوبٍ یہ اس لیے فرمایا کہ ان بد بختوں نے تورات میں بھی رد و بدل کیا، تورات میں بھی موجود ہے کہ اللہ نے زمین و آسمان کو چھ دن میں پیدا فرمایا۔ مگر ان لوگوں نے آگے لکھ دیا فاسطاح (پھر اس نے آرام کیا) اللہ نے فرمایا یہ تو کفر کا کلمہ ہے۔ کیا خدا تعالیٰ تھک گیا تھا، جو آرام کی ضرورت پڑی۔ اللہ کے ساتھ ایسی بات منسوب کرنا صریح کفر ہے۔ مگر ان لوگوں نے محض ساتویں دن کی چھٹی ثابت کرنے کے لیے یہ لفظ بڑھا دیا۔ یہ بھی تحریف لفظی کی ایک مثال ہے۔ انہوں نے نہ صرف الفاظ کو تبدیل کیا، بلکہ معنوی طور پر بھی مطلب کچھ کا کچھ کر دیا۔

تحریف معنوی

مسلمانوں میں سے اہل بدعت بھی اس بیماری کا شکار ہیں۔ یہ قرآن پاک کے الفاظ تو تبدیل نہیں کر سکے مگر مطلب سارا الٹ پلٹ کر دیا ہے۔ جس آیت سے چاہتے ہیں، اپنے مطلب کی بات نکال لیتے ہیں۔ دیکھیے میلاد کا موسم آتا ہے۔ پہاڑیاں بنائی جاتی ہیں۔ پوچھو بھائی یہ پہاڑیاں کیسی ہیں، کہتے ہیں قرآن میں صفا و صرہ پہاڑیوں کا ذکر آیا ہے اِنَّ الصَّفَا وَالْمُدَوَّةَ مِنْ شَعَابِ اللّٰهِ کہ یہ پہاڑیاں اللہ کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس قسم کی باتیں قرآن پاک میں صریح تحریف ہے۔ قطعاً ناجائز اور گمراہی کا باعث ہے۔

بہت سے واعظین اور خود ساختہ مفسرین بھی اسی ڈگر پر چل رہے ہیں۔ ایک صاحب نے بسم اللہ کی تفسیر لکھی ہے۔ اس میں لکھا ہے کہ اسم اللہ سے مراد حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔ حالانکہ اسم اللہ سے اللہ کا نام مراد ہے۔ اور اللہ کا نام لیکن ہی شروع کرنا چاہیے۔ مگر انہوں نے اس کا معنی تبدیل کر دیا۔ خود پر و فیسر ہیں، معلم ہیں، مگر تفسیر یہ کی ہے کہ مرزا قادیانی نے بھی تو یہی کہا۔ کہ میرا نام سورۃ فتح میں محمد رکھا گیا ہے اور رسول اللہ بھی لکھا ہے (اعیاذ باللہ) یعنی لفظ

بطور دم قربان کرنا ہوگی۔ اسی طرح احرام کی حالت میں کوئی مرد سلا ہوا کپڑا حتیٰ کہ موزہ پہن نہیں پہن سکتا۔ خوشبو نہیں لگا سکتا۔ سر اور منہ کو ڈھانپ نہیں سکتا۔ عورتیں پہلے ہوئے کپڑے پہن سکتی ہیں مگر خوشبو نہیں لگا سکتیں۔ سر کو ڈھانپ لیں گی مگر چہرہ کھلا رہیگا۔ اسپر کپڑا نہیں آنا چاہیے۔ اگر کوئی عورت پردہ کرنا چاہے تو چہرہ پر کوئی لکڑی وغیرہ رکھ کر اُد پر نقاب ڈال سکتی ہے۔ جس سے کپڑا چہرے کو نہ لگے۔ احرام کی حالت میں شکار کرنا بھی منع ہے اس کے متعلق واضح حکم ہے۔ "حُرِّمَ عَلَيْكَ صَيْدُ الْبَرِّ مَا دُمْتَ حُرًّا" جب تک تم احرام میں ہو، اچھی کا شکار نہیں کر سکتے بلکہ کسی جانور کو ذبح بھی نہیں کر سکتے۔ اگر کر گئے تو وہ حلال نہیں ہوگا۔ لہذا اس کو کوئی دوسرا شخص بھی نہیں کھا سکتا گویا یہ سب چیزیں احرام کی حالت میں ممنوع ہیں۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا، جب تم میں سے کوئی اپنے اور پرچ کو لازم کھائے، تو فَلَا رَفَثَ حج میں رفث نہیں ہے۔ لفظ رفث عام ہے۔ اس کا اطلاق معمولی بے پردگی سے لے کر مباشرت تک ہوتا ہے۔ عورت کے ساتھ بوس و کنار شہوانی باتیں اور مباشرت سب رفث میں آجاتا ہے غیر عورت کے ساتھ تو یہ چیزیں قہر حرام ہیں مگر احرام کی حالت میں یہ افعال اپنی بیوی کے ساتھ بھی جائز نہیں ہوتے۔

وَلَا فُسُوقَ احرام کی حالت میں فسق بھی جائز نہیں۔ اس سے مراد اطاعت سے باہر نکل جانا یا نافرانی ہے۔ اگرچہ یہ چیزیں عام حالت میں بھی منع ہیں مگر جب کوئی حج یا عمرہ کی نیت سے احرام باندھ لیتا ہے۔ تو ان کی ممانعت میں شدت پیدا ہو جاتی ہے۔ بالکل اسی طرح جیسے حرم کے اندر کوئی گناہ کرنا عام جگہ کی نسبت زیادہ جرم ہے۔ یا جس طرح حرمت کے میدانوں میں کسی گناہ کا ارتکاب دیگر میدانوں کی نسبت زیادہ باعث وبال ہے۔ الغرض احرام کی حالت میں نافرانی کرنا بہت بڑا گناہ ہے۔ فسق کا لفظ نفاق اور اعتقاد پر بھی بولا جاتا ہے۔ عمل پر بھی اس کا اطلاق ہوتا ہے۔ کافروں، منافقوں اور عام گناہگار مومنوں کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا

بے حجابی

نافرانی

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْاِعْمَارُ ۳

درس بہت و ہفت ۲۷

آیت ۷۹، ۸۰ تا

مَا كَانَ لِبَشَرٍ أَنْ يُؤْتِيَهُ اللَّهُ الْكِتَابَ وَالْحُكْمَ
وَالنَّبُوءَةَ ثُمَّ يَقُولَ لِلنَّاسِ كُونُوا عِبَادًا لِي
مِنْ دُونِ اللَّهِ وَلَكِنْ كُونُوا رَبَّيْنَ بِمَا
كُنْتُمْ تُعَلِّمُونَ الْكِتَابَ وَبِمَا كُنْتُمْ
تَدْرُسُونَ ۷۹ وَلَا يَأْمُرُكُمْ أَنْ تَتَّخِذُوا
الْمَلَائِكَةَ وَالنَّبِيِّينَ أَرْبَابًا أَيَأْمُرُكُمْ
بِالْكُفْرِ بَعْدَ إِذْ أَنْتُمْ مُسْلِمُونَ ۸۰

۷۹ تا ۸۰

ترجمہ: کسی انسان کے لیے یہ بات (ماسب) نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ اُس کو کتاب، حکم اور نبوت عطا فرمائے۔ پھر وہ شخص لوگوں سے کہے کہ ہو جاؤ تم میرے بندے اللہ کے سوا۔ لیکن وہ یوں کہے گا کہ ہو جاؤ رب والے۔ اس وجہ سے کہ تم کتاب سیکھاتے ہو، اور اس وجہ سے تم اس کو پڑھتے ہو ۷۹ اور وہ تم کو اس بات کا حکم نہیں دیگا، کہ تم اللہ کے فرشتوں اور نبیوں کو رب بناؤ۔ کیا وہ تم کو کفر کا حکم دیگا، بعد اس کے کہ تم فرمانبردار ہو چکے ہو ۸۰

اہل کتاب کی مختلف خیانتوں کا تذکرہ ہو چکا ہے۔ یہ لوگ دینی، دنیوی اور مالی ربطیات لحاظ سے خائن تھے۔ جھوٹ بولتے تھے۔ اللہ کی کتاب کے احکام کو تبدیل کرتے اور حق کو چھپاتے تھے۔ الفاظ و معانی میں تحریف کے مرتکب ہوتے تھے، خود مسائل گھڑ کر انہیں اللہ کی طرف منسوب کرتے اور کہتے کہ یہ کتاب کا حصہ ہے حالانکہ ایسا نہیں ہوتا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے بارے میں صریح جھوٹ بولتے آخری

نہیں ہوتا۔ حالانکہ حدیث شریف میں صریح الفاظ آئے ہیں۔ کسی نے ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہؓ سے حضور علیہ السلام کے اخلاق کے متعلق سوال کیا۔ تو انہوں نے کہا كَانَ رَسُولُ اللَّهِ بَشَرًا مِّثْلَنَا یعنی حضور علیہ السلام انسانوں میں سے ایک انسان تھے۔ پوچھنے والے نے دریافت کیا تھا۔ کہ حضور علیہ السلام کی گھر میں زندگی کیسی ہے۔ آپ کا اخلاق کیسا ہے۔ آپ گھر میں کیا کیا کام کرتے ہیں تو جواب یہی تھا۔ کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم انسانوں میں سے ایک انسان ہیں۔ جو کام عام آدمی گھر میں کرتے ہیں، وہ کام اللہ کا بھی کرتا ہے۔ حدیث شریف میں بَشَرًا مِثْلَنَا البَشَرُ کا لفظ آتا ہے۔ نُونٌ مِّنْ نُورِ اللَّهِ نہیں آتا۔ یہ تو عیسائیوں والا عقیدہ ہے۔ انہوں نے بھی مسیح علیہ السلام کو خدا کا جزو بنا دیا۔ اور آج کے مسلمان بھی یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ الغرض! حضرت عائشہ صدیقہؓ نے فرمایا، آنحضرت علیہ السلام گھر میں بکری کا دودھ دودھ پیتے، اپنے کپڑے صاف کر لیتے۔ جوتے کاٹنا کنگا لگنا لیتے، گویا اپنا کام اپنے دست مبارک سے انجام دے لیتے تھے۔

بخاری، مسلم، ترمذی اور دیگر کتب احادیث میں یہ حدیث موجود ہے۔ کہ کچھ لوگ آپ کی خدمت میں ایک مقدمہ لائے تاکہ آپ اس کا فیصلہ فرمائیں۔ حضور علیہ السلام نے اُن سے فرمایا اِنَّمَا اَنَا بَشَرٌ مِّثْلُكُمْ! میں ایک انسان ہوں اور انسان عالم الغیب نہیں ہوتا۔ میں ظاہر میں تمہارا معاملہ سنوں گا۔ اور اس کے مطابق فیصلہ دوں گا۔ ہو سکتا ہے ایک فریق اپنا مقدمہ پیش کرنے میں بڑا چرب زبان ہو اور دوسرا فریق اتنا فصیح نہ ہو۔ فرمایا فَلَعَلَّكُمْ بَعْضُكُمْ لَمِنَ بَعْضِكُمْ کہیں ایسا نہ ہو کہ میں اس کی دلیل سن کر اس کے حق میں فیصلہ دے دوں۔ یاد رکھو! جو شخص کسی چیز کا مستحق نہیں ہے۔ وہ اس چیز کو مست لے۔ کیونکہ اُس کے حق میں وہ دوزخ کی آگ کا ٹکڑا ہو گا۔ فرمایا میں انسان ہوں۔ باطنی حالات تو اللہ تعالیٰ کے علم میں ہیں۔ جب وحی نازل ہوتی ہے۔ مالک الملک کی جانب سے علم دیا جاتا ہے۔ تو معلوم ہو جاتا ہے۔ فرمایا تمام انبیاء علیہم السلام انسان ہیں اور انسانیت کے بلند ترین مقام پر فائز ہیں۔

اسی لیے فرمایا وَتَذَوُّوا زَادِ رَہ لے لیا کرو۔ تو شہ بنائے کہ حج کا سفر اختیار کرو آدمی کو چاہیے کہ وہ برائی اور سوال سے بچے۔ تو شہ بنانا اور اس کے لیے جائز ذرائع اختیار کرنا بالکل درست ہے۔ اسباب کو ترک کرنا درست نہیں۔ البتہ ان ذرائع اور اسباب پر بھروسہ رکھنا توکل کے خلاف ہے۔ بھروسہ صرف اللہ کی ذات پر ہونا چاہیے۔ وہی ان اسباب میں تاثیر پیدا کرنے والا ہے۔ بیماری کی صورت میں علاج کرنا درست ہے مگر ڈاکٹر پر بھروسہ کرنا جائز نہیں۔ کیونکہ شفا تو من جانب اللہ ہے۔ اگر اللہ چاہے گا تو دوائی میں تاثیر پیدا کر دے گا اور مریض صحت یاب ہو جائے گا، ورنہ لاکھ دوائیں استعمال کمری کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ اللہ چاہے تو پانی میں پیاس بجھانے کی تاثیر پیدا کر دے، اور اگر وہ نہ چاہے تو پوری نہر کا پانی پی کر بھی استفادہ کے مریض کی پیاس نہ بجھے۔ یہ اُس کے قبضہ قدرت میں ہے معلوم ہوا کہ اسباب پر کنٹرول ذاتِ خداوندی کا ہے مگر اسباب کو ترک کرنا روا نہیں ہے۔ لہذا حج کا ارادہ کیا ہے۔ تو ساری کا انتظام کرو، سامان ساتھ لو اخراجات کے لیے روپیہ پیسہ لے لو اور پھر توکل بخدا روا ہو جاوے بغیر زادِ راہ سفر پر نکلنا تو ایسے ہی عزت نفس اور شرافت کے خلاف ہے۔ اس میں قباحتیں پیدا ہوتی ہیں انسان دوسروں پر بوجھ بنتا ہے جو کہ بالکل جائز نہیں۔ لہذا فرمایا کہ زَادِ رَہ لے لیا کرو۔

گدگداری حرام ہے

جو شخص خالی ہاتھ سفر پر روانہ ہوگا، ظاہر ہے کہ اُسے ضروریات زندگی کے لیے ہاتھ پھیلانا پڑے گا۔ حالانکہ گدگداری اسلام میں حرام ہے اس میں شک نہیں کہ آج آدمی دنیا کے مسلمان دوسروں کے آگے ہاتھ پھیلا رہے ہیں۔ مگر یہ گدگداری بہر حال حرام ہے شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ چوری، ڈاکہ وغیرہ کی طرح گدگداری بھی ایک مضر پیشہ ہے اور حرام ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہی آدمی کو سوال کرنا دانا نہیں، سوائے خاص پریشانی کی حالت میں۔ آپ نے چند آدمیوں کو کچھ وقت کے لیے سوال کرنے کی اجازت دی مگر اُس وقت تک جب تک اُن کی حالت درست ہو

نبی کا فہم، عقل اور ذکاوت تمام انسانوں سے بڑھ کر ہوتی ہے۔ نبی عقل انسان ہوتا ہے۔ وہ سب سے زیادہ ذکی ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس میں کمال درجے کی صلاحیت، فریادیت کرتا ہے۔ آگے فرمایا وَالْمُتَّبِعُونَ یعنی ایسا شخص جسے اللہ تعالیٰ کتاب اور حکم کے علاوہ نبوت بھی عطا فرمائے۔ اس کی یہ شان نہیں ہے ثُمَّ يَقُولُ لِلنَّاسِ کہ وہ لوگوں سے کہے کو لگو عِبَادِ اِلٰی مِنْ دُونِ اللّٰهِ، اللہ کے علاوہ میرے بندے بن جاؤ۔ یہ بات ناممکن ہے کہ اللہ تعالیٰ تو نبوت اور رسالت عطا فرمائے اور وہ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کی طرف بلانے کی بجائے اپنی بندگی کی طرف دعوت دے، یا کسی دوسرے انسان یا کسی بھی مخلوق کی عبادت کی تلقین کرے۔ یہ نہیں ہو سکتا اگر ایسی بات ہو جائے تو اس کا مطلب یہ ہو گا کہ نعوذ باللہ، اللہ کا انتخاب ہی درست نہیں تھا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ پر جہالت لازم آئے گی (نعوذ باللہ) کہ اُس نے ایسے شخص کو نبی بنایا جو اس نبوت کا اہل نہیں تھا۔ نبی کا منصب تو یہ ہے کہ وہ خود بھی اللہ تعالیٰ کی وحدانیت پر کار بند ہو اور دوسروں کو بھی اسی کی دعوت دے۔ دنیا کے معاملات میں بھی جب کسی شخص کو وزارت یا گورنری کے عہدہ پر فائز کیا جاتا ہے۔ تو اس سے توقع ہوتی ہے کہ وہ حکومت کی پالیسی کے مطابق کام کرے گا۔ اگر کوئی شخص خلاف کرے تو اسے ایک منسٹ کے لیے کسی اعلیٰ عہدے پر برداشت نہیں کیا جاتا۔ اللہ کا نبی تو اللہ کا کامل وفادار ہوتا ہے۔ دنیا میں منشا ئے ایزدی کی تکمیل اُس کا فرض ہوتا ہے۔ وہ اللہ کے علاوہ اپنی یا کسی دوسری مخلوق کی عبادت کی دعوت کیسے دے سکتا ہے۔

انبیاء کی ایک خصوصیت یہ بھی ہوتی ہے کہ اُن میں موجود بشریت کے تمام تعلق سے بہترین طور پر سنور جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اُن کی تربیت ہی ایسی کرتا ہے۔ جس سے اُن کے تمام قویٰ درجہ کمال کو پہنچ جاتے ہیں۔ اُن سے ایسی بات کا سرزد ہونا جو منشا ئے الہی کے خلاف ہو، ناممکن ہے۔ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا، ہم نے تم پر احسان کیا۔ تمہاری پرورش ہماری آنکھوں کے سامنے ہوتی

ہونی چاہیئے۔ وہاں جا کر ضروریات کی اشیاء خرید لے تو منع نہیں۔ اور اگر نیت
 ہی خرید و فروخت کی ہو تو پھر ایسا کرنا جائز نہیں۔ بعض لوگ جاتے ہی سامان خریدنے
 کے لیے ہیں۔ بعض سیر و تفریح کی غرض سے جاتے ہیں بعض لوگوں سے سنا
 کہ بھائی اس سال لندن جانا ہے۔ یا اس سال حجاز کی سیر کرنی ہے۔ یہ باطل نظر رکھتے
 ہیں۔ جب نیت ہی سامان خریدنے کی ہے تو پھر سونا بھی خریدیں گے اور کپڑے
 پہننے کے لیے طرح طرح کے چیلے پہننے بھی بنائیں گے اور اس طرح گناہ پر گناہ
 کے مرتکب ہوں گے۔ اگر حج کہنا ہے۔ تو نیت خالص حج کی ہونی چاہیئے
 اس کے باوجود اگر ضرورت کی چیزیں خرید لی ہیں تو کوئی ممانعت نہیں۔
 اس ضمن میں قرآن پاک نے دو اصطلاحیں پیش کی ہیں۔ ایک اصطلاح
 ”رضوان“ ہے۔ جس سے مراد امور آخرت کی طلب ہے۔ اور دوسری اصطلاح
 ”فضل“ ہے جس سے مقصود رزق حلال ہے۔ یہ دونوں چیزیں جائز ہیں۔

ہوں گے وہ خدا سے ڈرنے والے ہوں گے۔

فرمایا اللہ کا نبی تو کہے گا، اللہ والے ہو جاؤ، رب والے ہو جاؤ، وَمَا كُنْتُمْ
لَعَلَّكُمْ وَالْكِتَابِ اس وجہ سے کہ تم کتاب کھلاتے ہو۔ اور کتاب کھلانے والے
کی لازماً اصلاح ہونی چاہیے۔ اس میں خالص توحید اور جذبہ عبادت ہونا چاہیے۔
بلکہ اُسے دوسروں کی اصلاح بھی کرنی چاہیے۔ وَمَا كُنْتُمْ تَدْرُسُونَ
اور اس وجہ سے کہ تم خدا کی کتاب پڑھتے ہو۔ اس کا بھی تقاضا ہے کہ تم اللہ والے
بن جاؤ۔

عبادت
کی غلط
نہایت

کل ذکر کیا تھا کہ کتاب اللہ میں لفظی یا معنوی تحریف کرنا اہل کتاب کا کام تھا
مگر اس زمانے میں یہ کام خود مسلمان بھی انجام دے رہے ہیں۔ بلکہ یہ تو اُن سے بھی
بدتر کام کر رہے ہیں۔ کلام اللہ کے ایسے غلط معانی و مطالب بیان کرتے ہیں جو نہ
اللہ کی مراد ہے اور نہ رسول اللہ کی تشریح ہے۔ نہ خلفائے راشدین نے ایسے معنی
کیے اور نہ ائمہ دین نے یہ مطلب سمجھا مگر آج کا پیر ویز اور مرزا قادیانی عجیب و غریب
تاویلات کرتے ہیں۔ اب دیکھئے مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی نے اس
آیت قُلْ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا عَلٰى اَنْفُسِكُمْ سے کیا مطلب نکالا
ہے۔ اللہ تعالیٰ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے فرما رہے ہیں آپ اپنی طرف سے کہہ دیں
اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر ظلم کیا ہے۔ گویا حضور علیہ السلام اپنی امت
کو میرے بندو کہہ مخاطب کر رہے ہیں (نعوذ باللہ) اسی سے مولوی احمد رضا خان
یہ نکالتے ہیں کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف نسبت کر کے نام رکھنا جائز ہے۔
جیسے عبدالرسول، عبدالمصطفیٰ، عبدالنبی وغیرہ، حالانکہ یہ مطلب ہرگز نہیں نکلتا۔ آیت کا
مطلب یہ ہے کہ اے نبی! آپ اللہ کی طرف سے کہہ دیں یعنی اللہ تعالیٰ یوں فرماتا
ہے کہ اے میرے بندو! جنہوں نے اپنی جانوں پر زیادتی کی ہے، اللہ کی رحمت
سے مایوس نہ ہوں۔ اللہ تعالیٰ ہر گناہ کو معاف فرمادے گا، اس کی مثال سورۃ مریم میں موجود
ہے۔ اللہ تعالیٰ نے جبرائیل علیہ السلام کو حضرت مریمؑ کی طرف یہ آیت دے کر بھیجا۔

ارشاد گرامی ہے الْحُجَّ عَرَفَةَ حج دراصل نام ہی وقوف عرفہ کا ہے۔ لہذا جو شخص
 نوزی الحج کو بعد از زوال سے لے کر دس تاریخ کی صبح صادق طلوع ہونے تک ایک
 لمحہ کے لیے بھی میدان عرفات پہنچ گیا اُس نے حج کو پایا۔ اور جو شخص ان اوقات
 میں وہاں نہیں پہنچ سکا۔ وہ حج سے محروم رہا۔ اُسے اگلے سال قضاء دینا ہوگا۔ کیونکہ
 وقوف عرفہ کا کوئی بدل نہیں۔ حج کے دیگر ارکان مثلاً طواف، قربانی، رمی جمرات
 وغیرہ میں تاخیر بھی ہو سکتی ہے اور کوئی چھوٹ بھی سکتا ہے۔ پھر اسکی تلافی دم، صدقہ
 یا روزے کے ذریعے ہو سکتی ہے۔ مگر وقوف عرفہ ایک ایسا اہم رکن ہے جس کی
 کوئی تلافی نہیں۔ میدان عرفات مکہ مکرمہ سے نو دس میل کے فاصلے پر ہے۔ یہ میدان
 تین اطراف سے پہاڑیوں سے گھرا ہوا ہے۔ اس کے اندر جبل رحمت نامی پہاڑ ہے
 جس کے دامن میں حضور علیہ السلام نے حجۃ الوداع کے موقع پر وقوف فرمایا تھا۔ تاہم آپ
 نے واضح فرمادیا کہ وَقَفْتُ هَهُنَا وَكُلُّ عَرَفَةَ مَوْقِفٌ یعنی میں نے یہاں
 قیام کیا ہے۔ مگر سارا عرفات موقوف ہے۔ جہاں کسی کو جگہ ملے وقوف کر سکتا ہے
 سوائے بطن عرند کے جو مسجد غمرہ کی پچھلی طرف ہے، وہاں وقوف جائز نہیں۔ چنانچہ
 آجکل پورا میدان عرفات حاجیوں سے بھر جاتا ہے۔ وقوف عرفہ حضرت ابراہیم علیہ
 السلام کے زمانہ سے حج کا رکن چلا آرہا ہے۔ اسی طرح واپسی پر مزدلفہ کا وقوف اور
 پھر منیٰ میں ٹھہرنا سب حج کے لوازمات ہیں۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔
 قِفُوا عَلَى مَثَاقِدِكُمْ اپنے مشاعر پر ٹھہرو۔ اور پھر بتائے گئے طریقے کے مطابق
 اللہ کا ذکر کرو فَإِنَّكُمْ تَرْتُّ مِنْ أَرْضِ آبَائِكُمْ اَبْدُھِمْ کیونکہ یہ تمہارے
 باپ حضرت ابراہیم علیہ السلام کی وراثت میں سے ایک ورثہ ہے۔

وقوف عرفات کے لیے آدمی کا احرام میں ہونا لازمی ہے۔ اگر بغیر احرام کے
 وقوف کیا ہے۔ تو وہ وقوف نہیں ہوگا اور حج باطل ہو جائے گا۔ احرام کی تعریف
 میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض اُسے رکن کہتے ہیں اور بعض شرط کہتے ہیں۔
 بہر حال جس طرح وضو نماز کے لیے شرط ہے۔ اور اس کے بغیر نماز نہیں ہوتی۔

متراوت ہے۔ کسی کو سجدہ کیا جائے، اندر نیاز پیش کی جائے، حاضر و ناظر سمجھا جائے،
 علیم کل سمجھا جائے، مافوق الاسباب، حاجت روا اور مشکل کشا سمجھا جائے، یہی شرک
 ہے۔ اس قسم کا جو بھی عقیدہ اللہ کے علاوہ غیر کی طرف منسوب کیا جائے گا شرک ہوگا،
 فرمایا پیغمبر کبھی یہ حکم نہیں دے گا کہ تم فرشتوں یا انبیاء کو رب بناؤ۔ اَیَا مَرْکُمْ
 بِاللّٰہِ فُرِّ کیا وہ تمہیں کفر کا حکم دے سکتا ہے؟ بَعْدَ اَزْدٍ اَنْتُمْ
 مُّسْلِمُوْنَ باوجود اس کے کہ تم فرمانبرداری اختیار کر چکے ہو۔ اللہ کی وحدانیت
 کو اپنا چکے ہو۔ جب تم اندھیروں سے نکل کر روشنی میں آچکے ہو تو پھر وہ تمہیں
 ایسا حکم کیسے دیکھا جس سے تم پھر کفر و شرک کی تاریکیوں میں غرق ہو جاؤ ایسا نہیں ہو
 سکتا۔ اللہ کے نبی سے یہ توقع ہرگز نہیں ہو سکتی۔

اہل کتاب نے نبی علیہ السلام سے کہا تھا کہ کیا آپ یہ چاہتے ہیں کہ لوگ
 آپ کی عبادت کرنے لگیں تو اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں یہ قانون بتلادیا
 کہ اللہ کا نبی نہ اپنی عبدیت کی طرف دعوت دیتا ہے اور نہ کسی غیر اللہ کی۔
 مسیح علیہ السلام نے بھی ربوبیت کی نسبت اللہ ہی کی طرف کرتے ہوئے
 فرمایا تَحَارَّاتِ اللّٰہَ رَجِیْتُ وَرَبِّکُمْ مِّمَّ اَیُّہَا سَبَّ کَارِب

اللہ ہے۔ میں بھی اسی کی عبادت کرتا ہوتا تم بھی اُسی کی عبادت کرو اللہ کا ہر نبی
 یہی دعوت دے گا کہ اللہ والے بن جاؤ۔ رب والے بن جاؤ۔ اس کے سوا کسی
 انسان کی پوجا نہ کرو۔

لیے ہی کیا جاتا ہے۔ اس لیے اس مقام کو عرفہ کہا جاتا ہے۔

میدان عرفات ایک سنان میدان ہے۔ جو سارا سال غیر آباد رہتا ہے۔ تاہم ذی الحجہ کی نویں تاریخ کو سائے سال کی کسر نکل جاتی ہے۔ جب پورا میدان چروں سے بھر جاتا ہے۔ ہر طرف مخلوق خدا نظر آتی ہے۔ عجیب منظر ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ شیطان جس قدر عرفہ کے درن ذلیل ہوتا ہے۔ اور کسی دین نہیں ہوتا یہ اس لیے کہ وہ اللہ تعالیٰ کی باران رحمت کو اترتے ہوئے اپنی آنکھوں سے دیکھتا ہے۔

یوم عرفہ کی بعض خصوصیات ہیں۔ کہ ذی الحجہ کی نویں تاریخ ہو اور انسانی احرام کی حالت میں ہو۔ ام حرج کے پیچھے ظہر اور عصر کی نمازیں اکٹھی ظہر کے وقت میں ادا کی جاتی ہیں زوال کے فوراً بعد ام حرج کا خطبہ دیتا ہے۔ اس کے بعد اذان ہوتی ہے۔ پھر اقامت ہوتی ہے۔ اور ظہر کے دو فرض ادا کئے جاتے ہیں۔ پھر اقامت ہوتی ہے اور عصر کی نماز دو رکعت ادا کی جاتی ہے۔ دونوں نمازوں کے درمیان کوئی وقفہ نہیں ہوتا۔ نیز دو دو فرض الفرض کے علاوہ سنن نوافل وغیرہ بھی ادا نہیں کیے جاتے اس کے بعد جل رحمت کے قریب وقوف ہوتا ہے۔ یہ بڑا قیمتی وقت ہوتا ہے غروب آفتاب تک انسان کھڑے ہو کر دعائیں کرتے ہیں۔ ذکر و تلاوت میں مشغول رہتے ہیں۔ روبرو کہ اللہ مالک الملک سے اپنے گناہوں کی بخشش طلب کرتے ہیں۔ یہ وقوف عرفات ہے۔ پھر غروب آفتاب کے بعد یہاں سے نکل جانے کا حکم ہے۔

_____ مغرب سے پہلے میدان سے نکل جانا درست نہیں

_____ مشرکین مکہ کی بعض خرابیوں میں سے ایک یہ بھی تھی کہ سورج ابھی کھڑا ہوتا تھا اور وہ عرفات سے نکل جاتے تھے۔ اس سے منع فرمایا گیا ہے۔ اس کے علاوہ میدان عرفات یا مزدلفہ کے راستہ میں نماز مغرب ادا کرنے کا حکم نہیں ہے بلکہ مزدلفہ پہنچ کر مغرب اور عشاء کی نمازیں ایک ساتھ ادا کی جاتی ہیں۔ خواہ رات کا آخری حصہ ہی کیوں نہ ہو۔

الغرض! میدان عرفات سے حاجیوں کی دلچسپی بعد غروب شمس مزدلفہ

کہ ہم لوگ آپ کی پرستش شروع کریں۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اہمیت نازل فرمائی کہ اللہ تعالیٰ جس انسان کو نبوت سے سرفراز فرمائے، اس کی یہ شان نہیں ہے۔ کہ وہ اللہ کی بجائے لوگوں کو اپنی عبادت کی طرف بلائے یہ اہل بات ہے کہ نبی ہمیشہ خدا تعالیٰ کی عبادت کی دعوت دیتا ہے۔ وہ تو کہتا ہے۔ کہ اللہ فرمائے ہو جاؤ۔ وہ ملائکہ یا انبیاء کی عبادت کا حکم نہیں دیتا۔ اس معاملہ میں انبیاء کی برکت واضح کمر نے کے بعد آمدہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے میثاق النبیین کا تذکرہ فرمایا ہے۔ یعنی اُس عہد کا ذکر ہے جو اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی جماعت سے لیا تھا۔ کہ جب تمہارے پاس اللہ کا رسول آجائے۔ جو تمہارے پاس موجود چیز کی تصدیق کرے، تو اُس پر ایمان لانا اور اس کی مدد کرنا۔

میثاقِ است

قرآن پاک میں مختلف میثاقوں کا ذکر ہے۔ منجملہ ان کے میثاقِ الست ہے یہ وہ عہد ہے۔ جو اللہ تعالیٰ نے تمام بنی نوع انسان سے لیا تھا۔ اس کا ذکر سورۃ اعراف میں موجود ہے۔ قُلْ اِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ اَبْنٰی اٰدَمَ مِنْ ظُهُورِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰی اَنْفُسِهِمْ اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ قَالُوْا بَلٰی اللہ تعالیٰ نے قیامت تک پیدا ہونے والی نسلِ آدم کو عالم ارواح میں متمثل فرما کر ان سے سوال کیا تھا کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں، گویا یہ عہد اللہ نے اپنی الوہیت اور ربوبیت کے اقرار کے لیے اس دنیا میں آنے سے پہلے لیا تھا۔ پھر جوں جوں بنی آدم کو پیدا فرمایا اس عہد کی یاد دہانی کے لیے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ اور کتابیں نازل فرمائیں۔ دوسرا عہد میثاقِ انبیاء ہے جس کا ذکر آیت زیر درس میں آیا ہے۔ یہ عہد اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء سے لیا۔ اس میثاق کی تشریح میں دو قول ہیں۔ پہلا قول حضرت علیؑ کا ہے جسے ام ابن جریجؓ نے اپنی تفسیر طبری میں اور سیّد محمود الوسی نے روح المعانی میں نقل کیا ہے۔ دوسرا قول امام طائوسؒ کا ہے۔ آپ تابعین میں سے ہیں اور مفسرِ قرآن حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے شاگردوں میں سے ہیں۔ آپ بلند پایہ فقیہ اور محدث تھے۔ امام صاحب کا یہ قول مصنف عبداللہ زقاق میں درج ہے۔ جو کہ علم حدیث کی معتبر کتاب

تمام انبیاء سے میثاق

ہے۔ کہ رات مزدلفہ میں قیام کریں۔ فجر کی نماز وہیں ادا کریں۔ اور پھر ذکر الہی میں مصروف ہو جائیں۔ اس کے بعد طلوع آفتاب سے قبل ہی منیٰ کو روانہ ہو جائیں۔ اہم البو حنیفہ کے مطابق جو شخص مزدلفہ میں وقوف نہیں کرے گا اسے دم دینا ہوگا۔ کیونکہ یہ واجب کا درجہ رکھتا ہے۔ البتہ بیمار اور ضعیف حاجیوں کو اجازت ہے۔ کہ وہ مزدلفہ میں تھوڑی دیر قیام کے بعد رات کو ہی منیٰ کو چلے جائیں۔ اور صبح کی نماز منیٰ میں جا کر ادا کر لیں۔ حضور علیہ السلام نے حضرت سودہؓ جو بیمار تھیں ان کو اور بعض دوسرے ضعیف اہل خاندان اور بچوں کو اجازت دیدی تھی۔ کہ وہ مزدلفہ میں رات کے وقت تھوڑی دیر وقوف کریں دعائیں کریں اور پھر منیٰ کے لیے روانہ ہو جائیں۔ تاکہ وہ عام لوگوں کے پہنچنے سے پہلے پہلے آسانی کے ساتھ رمی کر لیں کیونکہ رمی کرنا بھی بہت کھٹن کام ہے آپ نے ضعیف اور بیماروں کو اول وقت میں رمی کی اجازت مرحمت فرمادی۔

بہر حال حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ مزدلفہ کے اُٹھا موقوف یعنی سارا مزدلفہ موقف ہے۔ جہاں کسی کو جگہ میسر آئے ٹھہر جائے البتہ وادی محسر جو منیٰ کی طرف ہے۔ وہاں نہیں ٹھہرنا چاہیے۔ باقی ہر جگہ قیام کر سکتا ہے۔

ذکر الہی

فرمایا شعر الاحرام کے پاس اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو کَمَا هَذَا کُمْ جس طرح اُس نے تمہیں ہدایت دی۔ لفظ کَمَا مشبہ بھی بن سکتا ہے اور تعلیلیہ بھی۔ اور زائد بھی بن سکتا ہے۔ جیسے یاد کرو واللہ کہ لَا تَهُ هَذَا کُمْ اس لیے کہ اس نے تمہیں ہدایت دی ہے۔ یہ کَمَا تعلیلیہ ہے۔ اللہ نے تمہیں ایمان کی دولت بخشی ہے اس لیے اُس کو یاد کرو۔ اسی قسم کا کاف تعلیلیہ حضور علیہ السلام کی لعنت کے ضمن میں پہلے گزر چکا ہے۔ نیا کپڑا پہننے کی دُعا بھی حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسی ہی سکھائی ہے اللہُمَّ لَكَ الْحَمْدُ کَمَا كَسَوْتَنِي اے اللہ میں تیری حمد بیان کرتا ہوں اس لیے کہ تو نے مجھے کپڑا پہنایا ہے۔ تیری عطا کردہ اس نعمت پر تیرا شکر ادا کرتا ہوں۔ اسی طرح یہاں بھی کاف علت استعمال ہوا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو، اس لیے کہ اُس نے تمہیں ہدایت بخشی ہے۔

مگر حضور علیہ السلام کے متعلق اس سے عمدہ یا لَئِنْ بُعِثَ وَهُوَ حَيٌّ كَيْتُومٌ مِنْ يَدِهِ
وَلَكِنْ نَصِيصٌ تَلَّہُ اگھر تمہاری زندگی میں نبی آخر الزمان آجائیں تو ان پر ایمان لاؤ گے اور
اُن کی مدد کرو گے۔ لہذا یہ عمدہ خاص طور پر حضور ختم المرسلین صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق
تھا۔ یہ قول بھی صحیح ہے۔

حضور علیہ السلام کے متعلق اس خاص عمدہ سے آپ کی ختم نبوت کا اظہار ہوتا
ہے۔ یہ بات تو واضح ہے کہ کسی نبی نے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا زمانہ نہیں پایا،
جو اس میثاق کی رو سے آپ پر ایمان لاتے اور آپ کی مدد کرتے۔ البتہ حضرت
علی علیہ السلام جب قرب قیامت میں نازل ہوں گے تو حضور صلی اللہ علیہ وسلم
کا زمانہ پائیں گے۔ اُس وقت وہ حضور علیہ السلام کے نائب کی حیثیت سے جلوہ افروز
ہوں گے اور آپ کی شریعت کے مطابق دنیا میں قرآن و سنت کا نظام جاری
کریں گے۔ اس عمدہ سے حضور علیہ السلام کی خاص فضیلت کا بھی اظہار ہوتا ہے۔
اسی بنا پر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ شہب مہراج میں اللہ نے تمام انبیاء کو ہریت المقدس
میں جمع کیا۔ قَامَحَمَّتْهُمْ حضرت جبرائیل علیہ السلام نے آپ کا ہاتھ پکڑ کر
آگے کھد دیا اور آپ نے تمام انبیاء کو نماز پڑھائی۔

سید اوسى بغدادی جنہوں نے حضرت علیؑ کا یہ قول نقل کیا ہے، بلند پایہ

مفسر قرآن ہوئے ہیں۔ آپ تیرہ سو صدی ہجری میں ہوئے ہیں ۱۲۰۰ھ میں
آپ کی وفات ہوئی جتنی مسلک رکھتے تھے۔ آپ نے تین جلدوں میں قرآن پاک
کی تفسیر لکھی ہے۔ ہر پائے کی الگ جلد ہے۔ اور کمال یہ ہے کہ تفسیر آپ نے
آغاز جوانی میں لکھی۔ اس تفسیر میں تمام علوم منجملہ صرف السخو، علم عقائد اور قرأت وغیرہ
موجود ہیں۔

دیگر مفسرین کی طرح آپ نے بھی اپنے زمانے کی ضروریات کو مد نظر رکھتے
ہوئے قرآن پاک کی عظیم تفسیر کی ہے۔

میثاق انبیاء کا تذکرہ کر کے امتیوں کو بات سمجھائی جا رہی ہے کہ جس چیز
یہودیوں کی خلاف ورزی

مولانا شاہ اشرف علی تھانوی فرماتے ہیں کہ چونکہ ایک نبی دوسرے کی تصدیق کرتا ہے۔ اس لیے انبیاء کے متبعین کا فرض ہے کہ اپنے نبی کے اتباع میں وہ بھی دوسرے راہنما کی تصدیق کریں۔ اس سے شاہ صاحب یہ بھی اخذ کرتے ہیں کہ مشائخ کو مشائخ سے یہی معاملہ کرنا چاہیے۔ کوئی شیخ وقت، نیک بندہ یا درویش اپنے برابر بڑے شیخ یا اپنے سے اپنے درجے والے کی تصدیق کرے۔ اس سے دغا کرانے اور اس کی حمایت کرنے سے گریز نہ کرے۔ شاہ رفیع الدین تو یوں فرماتے ہیں کہ اللہ کے نیک بندے اور اولیاء ایک دوسرے کی کبھی مخالفت نہیں کرتے۔ اَلْفُقَرَاءُ وَ اَوَّلُ كَنَفُسٍ وَ اَحَدٌ مَدَّةٌ تَمَامٌ فَقَرَارُ كِي مِثَالِ اِيَكِ جَسَدٍ وَ اَحَدٌ كِي هِيَ۔ یہی وجہ ہے کہ آج تک کسی بزرگ نے دوسرے کی تکذیب نہیں کی کہ فلاں غلط ہے یا جھوٹا ہے۔ بلکہ اس کی تصدیق کی ہے۔ یہ انبیاء کی تعلیم کا نتیجہ ہے جس طرح ایک نبی دوسرے نبی کی تفتیش نہیں کرتا اسی طرح ایک اللہ والا دوسرے ولی اللہ کو اپنی تنقید کا نشانہ نہیں بناتا بلکہ اس کی حمایت کرتا ہے۔ مگر اس وقت جو ایک دوسرے کی مخالفت کی جا رہی ہے۔ یہ نہ تو درویشی اور نہ فقرار کا سلسلہ ہے۔ یہ کچھ اور ہی ہے۔ بزرگی محض قبریں بنا لینے، ان پر گنبد کھڑے کر لینے اور بدعات، جاری کرنے کا نام نہیں ہے۔ اصل بزرگوں کا ہرگز یہ مشن نہیں ہو سکتا۔ جو اللہ کے نیک بندے ہیں وہ ہمیشہ نیکی کا حکم کرتے ہیں۔

حضرت بیچی امنیریؒ، حضرت خواجہ نظام الدین اولیاء کے مرید اور بڑے بزرگ مرد تھے۔ مشرقی ہندوستان میں قیام تھا۔ لوگوں نے ان کے لیے خانقاہ تیار کی اور لاکھ روپے بٹھادیا۔ فرمانے لگے اُدوستو! بڑا افسوس ہے، تم نے میرے لیے ایک مندر سا بنا دیا۔ ہمارے ساتھ تو اس کا تعلق ہی قائم نہیں ہوتا۔ خواجہ فرید الدینؒ کو بادشاہ وقت فیروز تغلق نے جاگیر کی پیشکش کی۔ آپ نے فرمایا کہ میرا اور میرے بزرگوں کا یہ طریقہ نہیں ہے۔ اس جاگیر کو مستحقین میں تقسیم کر دو۔ یہی بات حضرت مولانا حسین احمد مدنیؒ نے صدر ہند راجندر پرشاد کو کہی تھی۔ حکومت نے

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس ہفتاد و سہ (۸۳)

آیت ۲۰، ۲۱، ۲۲

فَإِذَا قُضِيَتْكُمْ مَنَاسِكُكُمْ فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ
 أَوْ أَشَدَّ ذِكْرًا ۖ فَمِنَ النَّاسِ مَن يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا
 وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَاقٍ ۚ وَمِنْهُمْ مَّن يَقُولُ رَبَّنَا
 آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا
 عَذَابَ النَّارِ ۚ ۞ أُولَٰئِكَ لَهُمْ نَصِيبٌ مِّمَّا كَسَبُوا
 وَاللَّهُ سَرِيعُ الْحِسَابِ ۚ ۞ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ
 فَمَن تَعَجَّلَ فِي يَوْمَيْنِ فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ وَمَن تَأَخَّرَ
 فَلَا إِثْمَ عَلَيْهِ ۚ لِمَنِ اتَّقَىٰ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّكُمْ
 إِلَيْهِ تَحْشَرُونَ ۚ ۞

ترجمہ :- جب تم ارکان حج کو پورا کر چکو، پس یاد کرو اللہ تعالیٰ کو جیسا کہ تم یاد کرتے
 ہو اپنے باپ دادا کو۔ بلکہ اس سے زیادہ یاد کرنا چاہیے۔ پس لوگوں میں سے
 بعض وہ ہیں جو کہتے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! دے دے ہم کو اس دنیا کی زندگی
 میں۔ اور اُن کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہے ۚ ۞ اور بعض وہ ہیں جو کہتے
 ہیں، اے ہمارے پروردگار! ہم کو دنیا میں بھلائی دے دے اور آخرت میں بھلائی دے
 دے۔ اور ہم کو دوزخ کے عذاب سے بچا ۚ ۞ (۲۰) یہی وہ لوگ ہیں جن کے لیے
 حصہ ہے اُس سے جو انہوں نے کمائی کی ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت جلد حساب
 لینے والا ہے۔ (۲۱) اور یاد کرو اللہ تعالیٰ کو گنتی کے چند دنوں میں۔ پس جس
 شخص نے دو دنوں میں جلدی کی، اُس پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ اور جس نے آخر کی

تھا۔ اس نے تورات میں سے کچھ اچھی اچھی باتیں لکھ کر آپ کو دیں حضرت عمرؓ وہ لے کر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس آئے۔ اور عرض کیا کہ میرے ایک یہودی دوست نے تورات کی بعض اچھی چیزیں لکھ کر دی ہیں۔ کیا میں ان کو پڑھ لیا کروں۔ یہ سن کر ناراضگی کی وجہ سے حضور علیہ السلام کا چہرہ مبارک سرخ ہو گیا۔ فرمایا اَنَّهُوْكَتُمْ كَمَا تَهْوٰكُمُ الْيَهُودُ وَالنَّصَارَىٰ کیا تم بھی اسی طرح سرگردان ہونا چاہتے ہو جس طرح یہود و نصاریٰ ہوئے ہیں۔ آپ نے یہ بھی فرمایا، قسم ہے اس ذات پاک کی جس کے قبضے میں میری جان ہے۔ یہ تو تم تحریر شدہ تورات کا ورق لائے ہو اگر موسیٰ علیہ السلام بنفس نفیس آ جلتے اور تم مجھے چھوڑ کر اُن کا اتباع کرتے تو تم گمراہ ہو جاتے اَنَا آخِرُ النَّبِيِّينَ میں آخری نبی ہوں جو تمہارے حصے میں آیا ہوں۔ لہذا تم پر میری ہی اطاعت لازم ہے۔ اس پر حضرت عمرؓ نے کہا۔ رَضِيتُ بِاللّٰهِ رَبًّا وَبِالْاِسْلَامِ دِيْنًا وَبِمُحَمَّدٍ نَّبِيًّا وَرَسُوْلًا میں راضی ہو گیا اللہ کے رب ہونے پر، اسلام کے دین ہونے پر اور محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے نبی اور رسول ہونے پر۔ اس پر حضور علیہ السلام کا غصہ ٹھنڈا ہو گیا۔

الغرض جب تمام انبیاء نے اپنے عہد کا اقرار کر لیا۔ قَالَ تَوَلَّی اللّٰهُ قَالَ نے فرمایا فَاشْهَدُوْا اَنَا مَعَكُمْ مِنَ الشَّاهِدِيْنَ گواہ بن جاؤ۔ کہ تم نے یہ اقرار کر لیا ہے۔ تم نے وعدہ کیا ہے۔ کہ جب نبی آخر الزمان علیہ السلام آئے گا تو اس پر ایمان لاؤ گے اور اس کی تائید کرو گے۔ اور دیکھو! میں بھی تمہارے ساتھ اس بات پر گواہ ہوں۔

فرمایا کہ پختہ عہد کرنے کے بعد فَمَنْ تَوَلَّی بَعْدَ ذٰلِكَ جس نے اعراض کیا اس کے بعد یعنی عہد کی پابندی نہ کی۔ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْفٰسِقُوْنَ تو ایسے لوگ فاسق اور نافرمان ہوں گے۔ فاسق نافرمان، منافق اور کافر کو بھی کہا گیا ہے۔ اگر کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی توحید کا انکاری ہے تو یہ بنیادی فسق ہے۔ اِنَّا كٰفِرٌ

تمام حاجی وہیں پر قربانی کرتے ہیں۔ یہ وہی مقام ہے۔ جہاں پر حضرت ابراہیم علیہ السلام نے قربانی کی تھی۔ آج کل وہاں پر ہر قسم کے قربانی کے جانور بل جاتے ہیں۔ لوگ وہیں سے جانور خریدتے ہیں اور وہیں ذبح کر دیتے ہیں۔ تو انا آدمی قربان گاہ پہنچ جاتے ہیں۔ اور ضعیف حاجی اور عورتیں اس کام کے لیے دوسروں کو مامور کر دیتے ہیں۔

قربانی کے بعد اگلا کام حجامت بنوانا ہے۔ رش کی وجہ سے یہ کام بھی بڑی مشکل سے انجام پاتا ہے۔ بال منڈانے یا کترانے جاتے ہیں۔ اور پھر احرام کھول دیا جاتا ہے (لیکن عورت کے پاس جانا منع ہوتا ہے طواف تک)

طواف زیارت

حج کا اگلا رکن بیت اللہ شریف کا طواف ہے۔ اسے طواف زیارت کہا جاتا ہے اور یہ فرض ہے۔ اسی طواف کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اِنَّہٗ لَیَقْضُوْا لَہُمْ وَلَیُؤَفِّیْوْا اِنَّہٗ لَفَرَضٌ اَلْحَقِیْقُ۔ پھر چاہیے کہ اپنا میل کچل صاف کریں، اپنی نذریں پوری کریں اور تہیم گھر (بیت اللہ شریف) کا طواف کریں۔ یہ طواف بھی دس تاریخ کو ہی کیا جاتا ہے اگر کسی وجہ سے کوئی شخص آج کے دن طواف زیارت کے لیے مکہ مکرمہ نہ جاسکے تو گیارہ تاریخ کو کہے۔ اسے بارہ تاریخ تک بھی بوجہ مؤخر کیا جاسکتا ہے۔ اگر بارہ تاریخ کے بعد طواف کریگا تو اسے ساتھ دم دینا پڑے گا۔ اور یہ فرض ادا ہو جائے گا یہ طواف چونکہ عازمین حج نے مقرر اوقات میں لازمی کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے اس موقع پر بھی بڑا سخت ہجوم ہوتا ہے۔ طواف کے بعد صفاد مردہ کی سعی بھی ہے۔ اس کے بعد مکہ میں ٹھہرنے کی اجازت نہیں بلکہ واپس منیٰ اہنا ہوتا ہے۔ گیارہ بارہ اور تیرہ ذی الحجہ ایام منیٰ کہلاتے ہیں۔ ان ایام میں منیٰ میں قیام کیا جاتا ہے۔ البتہ معذور لوگوں کو استثناء حاصل ہوتا ہے۔ یہ ہیں وہ تمام مناسک حج جو مختلف مقامات پر پورے کمرے ہوئے ہیں

خانہ ذی تقاضہ

زمانہ جاہلیت میں ایام منیٰ کے دوران بہت بڑی منڈی یا میلہ لگتا تھا جس میں خرید و فروخت کے علاوہ مختلف قبیلے اپنے اپنے خاندان کی مدح سرائی کرتے اپنی اپنی خوبیاں بیان کرتے، بڑوں کے کارنامے دہراتے اور اس طرح اپنے

أَفَتَدِينُ اللّٰهُ يَكْفُرُونَ وَلَهُ أَسْلَمَ مَنْ
 فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ طَوْعًا وَكَرْهًا وَّالِيْهِ يُرْجَعُونَ ﴿۸۳﴾
 قُلْ اٰمَنَّا بِاللّٰهِ وَمَا اُنْزِلَ عَلَيْنَا وَمَا اُنْزِلَ عَلٰى
 اِبْرٰهِيْمَ وَاِسْمٰعِيْلَ وَاِسْحٰقَ وَيَعْقُوْبَ
 وَالْاَسْبَاطِ وَمَا اُوْتِيَ مُوسٰى وَعِيسٰى وَالنَّبِيُّوْنَ
 مِنْ رَبِّهِمْ لَا نُفَرِّقُ بَيْنَ اَحَدٍ مِّنْهُمْ
 وَنَحْنُ لَهُ مُسْلِمُوْنَ ﴿۸۴﴾ وَمَنْ يَّبْتَغِ
 غَيْرَ الْاِسْلَامِ دِيْنًا فَلَنْ يُّقْبَلَ مِنْهُ ۚ وَهُوَ
 فِي الْاٰخِرَةِ مِنَ الْخٰسِرِيْنَ ﴿۸۵﴾

ترجمہ: یہ کیا یہ لوگ اللہ کے دین کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرتے ہیں، حالانکہ اسی اللہ کے لیے فرمانبرداری کرتے ہیں وہ جو آسمانوں میں ہیں۔ اور جو زمین میں ہیں خوشی اور خوشی سے۔ اور اسی کی طرف سب لوٹانے جائیں گے ﴿۸۳﴾ اے پیغمبر (علیہ السلام) آپ کو دیکھئے، ہم ایمان لائے ہیں اللہ پر اور اُس چیز پر جو اتاری گئی ہے۔ ہمارے اوپر اور اُس چیز پر جو اتاری گئی ہے، حضرت ابراہیم، اسماعیل، اسحاق، یعقوب علیہم السلام اور ان کی اولاد پر اور جو چیز دی گئی ہے۔ موسیٰ اور عیسیٰ علیہم السلام کو اور جو چیز دی گئی ہے سب نبیوں کو ان کے رب کی طرف سے۔ ہم تفریق نہیں کرتے کسی ایک کے درمیان۔ اور ہم اسی اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں ﴿۸۴﴾ اور جو شخص اسلام کے سوا کسی اور دین کو تلاش کرے گا۔ پس اُس سے ہر گز نہ قبول کیا جائیگا اور وہ شخص آخرت میں نقصان اٹھانے والوں میں سے ہوگا۔ ﴿۸۵﴾

بیک اللہم لیک تو ذکر الہی کا بہت بڑا ذریعہ ہیں۔

آگے اللہ تعالیٰ نے دو قسم کے لوگوں کا ذکر فرمایا۔ پہلی قسم ان لوگوں کی ہے جو اللہ تعالیٰ سے صرف دنیا کی خواہش رکھتے ہیں فَحَنِ النَّاسِ مَنْ يَقُولُ رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا بعض لوگ کہتے ہیں کہ اے اللہ! ہمیں جو کچھ دینا ہے دنیا میں ہی عطا کر دے۔ ایسے لوگ آخرت کے طلبگار نہیں ہوتے۔ دوسرے مقام پر اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمایا کہ وہ کہتے ہیں عَجِّلْ لَنَا قِطْعًا قَبْلَ يُقِيمَ الْحُكْمَ یعنی جو کچھ ہمارا حصہ ہے وہ ہمیں یوم حساب سے پہلے ہی مل جائے۔ ہمیں آخرت کی کوئی فکر نہیں۔ مطلب یہ کہ ہمیں دنیا کا مال و دولت جاہ و مرتبہ، آرام و آسائش، صحت اور تندرستی حاصل ہو جائے تو کافی ہے۔ اس قسم کے لوگ آج بھی موجود ہیں۔ جو حج پر جا کر بھی دنیا ہی طلب کرتے ہیں۔ بیماری سے نجات، قحط سالی سے پناہ، اولاد اور کاروبار ہی چاہتے ہیں۔ اور آخرت کی کوئی پروا نہیں کرتے۔

فرمایا وَمَا لَهُ فِي الْآخِرَةِ مِنْ خَلَقٍ دنیا کے طالبوں کے لیے آخرت میں کوئی حصہ نہیں ہوگا۔ وہ لوگ جنت کی نعمتوں سے محروم رہیں گے۔ کیونکہ انہوں نے آخرت کی خواہش ہی نہیں کی۔

فرمایا وَمَنْ يَمْشِمْ اُنْهِیْ مِنْ بَعْضِ اِیْسے بھی ہیں مَنْ يَقُولُ جو کہتے ہیں رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً اے ہمارے پروردگار ہمیں دنیا میں بھی بھلائی عطا کر وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً اور ہمیں آخرت میں بھی بھلائی نصیب فرما۔ اور پھر دوزخ سے پناہ بھی مانگتے ہیں۔ وَقَدْ اَعْدَّ النَّارُ اور ہمیں دوزخ کے عذاب سے بچالے۔ دوزخ سے بچنے کا مطلب یہ ہے۔ دنیا میں گناہ اور بُرائی سے بچ جائے۔ اگر اس مقصد میں کامیاب ہو گیا تو آخرت میں دوزخ سے بھی بچ جائے گا۔ غرضیکہ جو نیک لوگ ہیں وہ اللہ تعالیٰ سے دنیا اور آخرت دونوں کے طلبگار ہوتے ہیں۔

دنیا کی خواہش

دنیا اور آخرت

کھڑو شرک والے ادیان کو تسلیم کریں۔ اللہ کے علاوہ کوئی ذات ہے۔ جس کی اطاعت تمام مخلوق پر لازم ہو۔ اللہ تعالیٰ نے تو خود فرمایا وَلَکُمْ اَسْکَرُ مِنْ فِی السَّمٰوٰتِ وَلَا دُخٰنٍ اَسْمٰوٍ وَزَمِیْنِ کی ہر مخلوق اُسی خدا نے وحدہ لا شریک کی فرمانبرداری کرتی ہے۔ ہاں! طَوْعًا وَکَرْهًا کچھ لوگ اس کی اطاعت خوشی سے کرتے ہیں اور بعض دوسرے مجبوری اور لاچارگی کی تباہی پر کرتے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کے احکام دو قسم کے ہیں۔ تکوینی احکام وہ احکام ہیں جو انسان کو اپنی خواہش اور اختیار کے بغیر کھڑے پڑتے ہیں۔ جیسے زندگی، موت، بیماری، حادثات، بارش، خشک سالی، سیلاب، زلزلہ وغیرہ ایسی چیزیں ہیں، جو انسان پر بغیر خواہش اور بغیر اختیار کے وارد ہوتی ہیں۔ انسان کو ان احکام پر مجبوراً عمل پیرا ہونا پڑتا ہے۔ یہ تکوینی احکام ہیں۔ دوسری قسم کے احکام شرعی احکام کہلاتے ہیں۔ یہ احکام اللہ تعالیٰ انبیاء کے ذریعے انسانوں تک پہنچاتا ہے۔ ان پر عمل ان ان اپنی خواہش اور اختیار سے کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کی کتنی مخلوق ہے۔ جو ان احکام کو احکام الہی سمجھ کر خوشی سے تسلیم کرتی ہے۔ اور بعض بد بخت ایسے بھی ہیں، جو انہیں ماننے کے لیے تیار نہیں۔ تو فرمایا کہ ایسی ہستی جس کے تمام تکوینی اور شرعی احکام ماننے جائیں وہ صرف خدا کی ذات ہے۔ اور ماننے والے آسمان میں بھی ہیں۔ اور زمین میں بھی ہیں۔ آسمانی مخلوق میں فرشتے ہیں۔ یہ اللہ کی مطیع اور فرمانبردار مخلوق ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ آسمان میں چار بالشت بھی ایسی جگہ نہیں ہے جہاں کوئی فرشتہ اپنے مالک کی عبادت میں مصروف نہ ہو۔ زمینی مخلوق میں انسانوں کے علاوہ شجر، جگر، چرند، پرند، نباتات، جمادات سب اللہ کے تکوینی احکام کی تعمیل کرتے ہیں۔ یہ انسان تو ان میں بہت سے ایسے ہیں۔ جو اللہ تعالیٰ کے شرعی احکام قبول کرتے ہیں۔ اللہ کی اطاعت اور فرمانبرداری اختیار کرتے ہیں "وَكٰثِرٍ حَقَّ عَلَیْهِ الْعَذَابُ" اور بہت سے ایسے بھی ہیں جن پر اللہ تعالیٰ کی سزا ثابت ہو چکی ہے۔ تکوینی احکام تو وہ بھی مجبوراً مانتے ہیں مگر شرعی

سے سعادت مندی ہے۔ منداحمد کی روایت میں ہے کہ اچھی بیوی، اچھی ساری، اچھا مکان دنیا کے اعتبار سے انسان کی نیک نیت بنتی ہے۔ انسان کے لیے صحت بھی ضروری ہے کہ عبادت اور دیگر امور کا مدار اسی پر ہے۔ یہ سب چیزیں حسنہ ہیں۔ مگر بالاتباع مقصود بالذات ایمان باللہ، خدا کی عبادت اور اعمال صالحہ ہیں جو چیز ان کے تابع ہو کر آئیگی وہ حسنہ ہی کہلائے گی۔

ذخیره اخوت

فرمایا اُولٰٓئِكَ لَهُمْ ذٰصِیْبٌ مِّمَّا كَسَبُوا اِنْ لَّوْكَوْلَیْ اِس
چیز میں سے حصہ ہے۔ جو انہوں نے کمایا۔ دنیا کی کھائی کے متعلق تو دوسرے مقام
پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے ”ذٰلِكَ مَبْلَغُهُمْ مِّنَ الْعِلْمِ اِنَّ كَافِرِیْہِ
تو دنیا میں ہی ختم ہو گیا، آگے اُن کے لیے کچھ نہیں۔ اور جو لوگ آخرت پر ایمان رکھتے
ہیں، اُن کے اعمال آخرت کا ذخیرہ بنتے ہیں فرمایا اُن کے لیے حصہ ہے۔ جو
انہوں نے کمایا، وَاللّٰهُ سَرِیْعُ الْحِسَابِ اور اللہ تعالیٰ جلد حساب لینے والا ہے
جب قیامت برپا ہوگی۔ حساب کی منزل شروع ہو جائے گی تو اللہ تعالیٰ اس کو
ٹلے کر دیں گے۔

ایام تشریق

منیٰ کے احکام کے ساتھ فرمایا تھا فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَذِكْرِكُمْ آبَاءَكُمْ ۚ
اپنے آبا و اجداد کی طرح اللہ تعالیٰ کا ذکر کرو۔ اور غرور و تکبر کو چھوڑ دو۔ اب آگے
ارشاد ہوتا ہے۔ وَاذْكُرُوا اللَّهَ فِي أَيَّامٍ مَّعْدُودَاتٍ ۚ اللہ تعالیٰ کو یاد کرو چند
گنتی کے دنوں میں۔ ان چند ایام سے مُراد ایام تشریق ہیں اور یہ چار دن ہوتے ہیں
یعنی ذی الحجہ کی دسویں تا تیرہویں تاریخ۔ تشریق کا لفظی معنی گوشت کو خشک کرنا ہے
ان ایام میں قربانی کا گوشت دافر مقدار میں میسر آتا ہے۔ اور لوگ آئندہ استعمال کے
لیے خشک کر کے رکھ لیتے ہیں۔ اس لیے ان دنوں کو ایام تشریق کہتے ہیں۔
سورۃ حج میں فِي أَيَّامٍ مَّعْلُوظَاتٍ آیا ہے۔ اور اس سے مُراد قربانی
کے تین دن یعنی ذی الحجہ کی دسویں، گیارہویں اور بارہویں تاریخ ہیں۔ حضرت
علیؑ، ابن عباسؓ، ابن عمرؓ وغیرہم سے منقول ہے کہ یہ دن یَوْمُ النَّحْرِ وَ

نازل کی گئی ہے۔ لوگوں کے سامنے اس کی تشریح بیان کرے۔ تاہم یہ تشریح بھی
مخائب اللہ ہوتی ہے۔ قرآن پاک وحی جلی ہے اور جو تشریح پیغمبر کی زبان سے
ہوتی ہے۔ وہ وحی خفی ہے مسلم شریعت کی روایت میں ہے حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام
نے فرمایا کہ ایمان وہ چیز ہے ماحضت بلہ جو کچھ میں لے کر آیا ہوں۔ یعنی جو بھی
چیز اللہ کی طرف سے نبی لایا ہے، اس پر ہم ایمان لائے ہیں۔

فرمایا وَمَا أُنْزِلَ عَلَیْ اِبْرٰهٖمَ ہم اُس چیز پر بھی ایمان لائے
ابراہیم علیہ السلام پر اتاری گئی ہے۔ قرآن میں موجود ہے کہ اللہ جل جلالہ نے حضرت
ابراہیم علیہ السلام پر صحیفے نازل فرمائے۔ جیسا کہ سورۃ اعلیٰ میں آتا ہے صُحُفٍ اِبْرٰهٖمَ
وَمُوسٰی اللہ تعالیٰ نے ان کو دین دیا، شریعت دی، احکام دیے اور تمام مخلوق کا امام
بنایا۔ فرمایا وَلَا سَمْعٰیؑ لَکَ فَاَسْمِعْ وَاَعْقُوبَ وَاٰلَ سَبَاطِہٖم اُس
چیز پر بھی ایمان لائے جو حضرت اسماعیل علیہ السلام، حضرت اسحاق علیہ السلام،
حضرت یعقوب علیہ السلام اور ان کی اولاد پر اتاری گئی۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے
دو بیٹے حضرت اسماعیل علیہ السلام اور حضرت اسحاق علیہ السلام ہیں۔ پہلے حضرت
حاجرہؑ کے بطن سے اور دوسرے حضرت سارہؑ سے۔ دونوں اللہ کے نبی اور رسول
ہیں۔ اللہ نے ان کو مستقل شریعت دی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام حضرت ابراہیم
کے پوتے اور حضرت اسحاق علیہ السلام کے بیٹے ہیں۔ وہ بھی اللہ کے صاحب شریعت
نبی ہیں۔ اور پھر حضرت یعقوب علیہ السلام کی اسباط یعنی اولاد ہے۔ اُس میں سے
اللہ نے جس کو نبوت دی، ان پر وحی نازل فرمائی اور ان کو شریعت بھی دی۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد میں سے اللہ نے
چار ہزار نبی اور رسول مبعوث فرمائے۔ یہ اتنا عظیم خاندان ہے۔ اسباط سے یہی
انبیاء اور رسل مراد ہیں جن میں حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام جیسے
عظیم پیغمبر مبعوث ہوئے۔ حضرت الیاس علیہ السلام بھی آپ کی اولاد میں سے ہیں
تاہم بعض انبیاء کا ذکر قرآن میں موجود ہے، اکثر کا نام ذکر نہیں کیا گیا۔ ان تمام

قانون خداوندی کی کس حد تک پابندی کرتا ہے۔ قانون شکن کبھی کامیاب نہیں ہو سکتا اسی لیے فرمایا کہ جس عازم حج میں تقویٰ یعنی قانون کی پابندی کا جذبہ پیدا ہو گیا۔ وہ دو دن ٹھہر کر بھی چلا جائے۔ لڑا سا حج صحیح ہے۔ اس میں کوئی عرج نہیں۔

تقویٰ کیا ہے

فرمایا **وَاقْفُوا لِلّٰہِ اللّٰہَ سے ڈرتے رہو۔** چھوٹی چھوٹی لغزشوں کو بھی خاطر میں لاؤ، کہیں ایسا نہ ہو کہ امتحان میں خیل ہو جاؤ۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ تقویٰ وہ ہے جو کفر، شرک اور عصیت سے بچ جائے حتیٰ کہ چھوٹے چھوٹے گناہوں سے بھی پرہیز کرے۔ اللہ کے چھوٹی چھوٹی باتوں کا بھی فکر کرتے ہیں کہ کیسے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی نہ ہو جائے۔ **وَاعْلَمُوا اَنَّكُمْ مَعَالِیْہِ تَحْشَرُونَ۔** یاد رکھو! ایک وقت آنے والا ہے۔ جب تم سب اللہ تعالیٰ کے سامنے اکٹھے جاؤ گے بخاری شریعت کی روایت میں آتا ہے کہ ایک دن انسان کو اپنے رب کے حضور حاضر ہو کر جواب دینا ہے۔ اُس وقت حالت یہ ہوگی کہ **مَا یَسْئَلُہِ وَبِیْنَہُ** تہ جہان اللہ اور بندے کے درمیان کوئی ترجمان بھی نہیں ہوگا۔ **تَأْتِیْ کُلُّ نَفْسٍ بِجُودِلٍّ** ہر شخص کو اپنی طرف سے اللہ کے سامنے براہ راست جواب دینا پڑے گا۔ یہاں تک اللہ تعالیٰ نے حج کے احکام بیان فرمادیئے ہیں اس کے بعد منافقین کا تذکرہ اور بعض دوسری باتیں آئیں گی۔ حج کے تمام ضروری اجزاء اسی درکوع میں مکمل طور پر بیان کر دیئے گئے ہیں۔

کی گئی ہے۔ وہاں پر عَلَيْنَا کی جگہ اَلَيْسَا اور وَالنَّبِيُّونَ سے پہلے وَمَا
اَوْفَقَ کے الفاظ زیادہ ہیں بمقصد یہی ہے کہ جو کچھ اللہ نے نبیوں پر نازل
کیا ہے وہ حق ہے اور ان سب پر ہمارا ایمان ہے۔ گویا۔ اس اصل ہدایت
پر ہمارا مکمل ایمان ہے اگرچہ بعد میں آنے والوں نے اس میں تغیر و تبدل کر دیا
تاکہ ہم اس کے لیے وہ خود ذمہ دار ہیں اور اللہ کے ہاں جواب دہ ہیں۔

ایمان
باللہ
اور آخر میں تمام انبیاء پر ایمان لانے کی وضاحت، اس طرح فرمائی
لَا تَفْصِقُ بَيْنَ أَحَدٍ مِنْهُمْ ہم انبیاء اور رسل میں کسی کے
درمیان تفریق نہیں کرتے، تفریق کرنے کا معنی یہ ہے کہ یہودیوں کی طرح
بعض انبیاء پر ایمان لائے اور بعض پر نہ لائے۔ اس قسم کی تفریق صریح کفر ہے
کیونکہ تمام انبیاء پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حضرت آدم علیہ السلام سے لے
کر حضور خاتم النبیین علیہ السلام تک جتنے بھی نبی اور رسول آئے ہیں۔ وہ سب
اللہ کے کامل بندے اور برحق نبی ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے دور میں مخلوق خدا
کو حق کا پیغام پہنچایا۔ اللہ نے اپنے انبیاء کو کتابیں اور شرائع عطا فرمائیں۔ ان سب
پر ہمارا ایمان ہے۔ مگر یہود و نصاریٰ اللہ کے تمام انبیاء پر ایمان نہیں رکھتے۔
مثال کے طور پر دونوں گمراہ حضور خاتم المرسلین علیہ السلام پر ایمان نہیں رکھتے۔
لہذا یہ تفریق بین الرسل کے مرتکب ہو کر کافر ٹھہرے۔ اسی طرح یہودی مسیح علیہ السلام
کو نہیں مانتے۔ بلکہ انہیں دجال کہتے ہیں اور ان کی تزییل و تحقیر کرتے ہیں۔ مگر ہم
بحیثیت مسلمان کسی نبی کے درمیان تفریق نہیں کرتے وَفَوَحْشٌ لَهُ مُسْلِمُونَ
ہم اللہ کی فرمانبرداری کرنے والے ہیں۔ یہی اسلام ہے۔ یہی حقیقت ہے اور
یہی ملتِ ابراہیمی ہے جسکی تعلیم سائے نبی جیتے آئے ہیں۔

غیر اقوام کی
سازشیں
ارشاد ہوتا ہے۔ یادرکھو! وَمَنْ يَبْتَغِ غَيْرَ الْإِسْلَامِ دِينًا
جو کوئی اسلام کے علاوہ کوئی دوسرا دین تلاش کرے گا۔ اور یہ سمجھے گا۔ کہ ایسا
کفر کے وہ کامیابی حاصل کر سکتا ہے فَكَانَ يُقْبَلُ مِنْهُ اس سے

جو کچھ دینا ہے، اس دنیا میں ہی عطا کر دے۔ یہ لوگ یقیناً کافر ہیں۔ کیونکہ آخرت پر یہ ایمان ہی نہیں رکھتے۔ دوسرا گمراہ اُن لوگوں کا ہے جو دنیا اور آخرت ہر دو کے طالب ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ اُن کی دُنیوی زندگی بھی خوشحالی میں بسر ہو، اور آخرت میں بھی نجات حاصل ہو جائے۔ اسی لیے وہ اللہ تعالیٰ سے یوں سوال کرتے ہیں۔ "رَبَّنَا آتِنَا فِي الدُّنْيَا حَسَنَةً وَفِي الْآخِرَةِ حَسَنَةً وَقِنَا عَذَابَ النَّارِ"۔ یہ ایماندار لوگ ہیں۔ گذشتہ آیات میں ان دو قسم کے لوگوں کا بیان آیا۔

مخلص اور منافق

اب ان آیات میں بھی دو قسم کے لوگوں کا تذکرہ ہے۔ یہاں پر مومن اور کافر کا تقابل نہیں، بلکہ مخلص اور منافق کا حال ہے۔ بظاہر یہ دونوں گمراہ ایماندار ہیں۔ مگر ان کی بھی دو قسمیں ہیں۔ مخلص وہ لوگ ہیں جو انتہائی درجے کے پکے سچے اور مخلص ہیں اور دوسرے وہ ہیں جو ظاہر میں تو ایمان والے ہیں مگر اُن کے باطن میں کفر بھرا ہوا ہے۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق ارشاد ہوتا ہے۔ وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يَعْجِبُكَ قَوْلُهُ فِي الْحَيَاةِ الدُّنْيَا یعنی بعض لوگ ایسے ہیں جن کی بات دنیوی زندگی میں آپ کو پسند آتی ہے۔ جب بات کرتے ہیں تو بڑے پتے کی ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اونچے درجے کے لوگ ہیں۔ مگر حقیقت میں یہ اُن کی چرب زبانی اور مکاری ہوتی ہے۔ محض زبان سے آپ کے روبرو سیٹھی میٹھی اور آپ کے لیے خوش کُن باتیں کرتے ہیں۔ اور آپ کو وفاداری کا یقین دلاتے ہیں۔ وَيُشْهِدُ اللَّهُ عَلَى مَا فِي قُلُوبِهِمْ اور جو کچھ اُس کے دل میں ہے، اُس پر اللہ کو گواہ بناتا ہے۔ اور قسمیں کھا کر کہتا ہے۔ خدا گواہ ہے کہ مجھے آپ کے ساتھ بڑی محبت ہے۔ مگر حقیقت یہ ہے۔ وَهُوَ الَّذِي الْخَصَّ بِهِ کہ وہ سخت جھگڑا کرنے والا ہے ایسے ہی لوگوں کے متعلق حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے۔ الْبُغْضُ الرَّجَالِ إِلَى اللَّهِ اَللّٰهُ الْخَصُّ یعنی اللہ تعالیٰ کے نزدیک بغض ترین وہ لوگ ہیں جو سخت جھگڑا کرتے ہیں۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہ آیت اغنس بن شریق کے متعلق نازل

پتچانے کی فکر میں رہتے ہیں۔ لہذا اسلام کے علاوہ کسی دوسرے دین کو تلاش نہ کرو۔ جو ایسا کمرے گا، اُس کا دین ہرگز قبول نہیں کیا جائے گا۔ وَهُوَ فِي الْآخِرَةِ مِنَ الْخَاسِرِينَ ایسا شخص آخرت میں نقصان میں پڑے گا۔ اسلام کے علاوہ کوئی دین بھی کامیابی کی طرف نہیں لے جائے گا۔ بلکہ اُس کے متبعین سراسر خسارے کا سودا کریں گے۔

مسلمانوں کی
بہ قسمتی

یہود و نصاریٰ کی اسلام دشمنی تو قابلِ فہم ہے، وہ تو دوسرے دین ہی تلاش کریں گے۔ مگر بہ قسمتی یہ ہے۔ کہ آج کا مسلمان بھی اپنے دین پر اعتقاد نہیں کرتا۔ آج کے مسلمان بھی یہی سمجھتے ہیں۔ کہ جب تک غیر اقوام کی شاگردی اختیار نہیں کریں گے، ترقی نصیب نہیں ہوگی۔ انہیں معلوم ہونا چاہیے۔ کہ جب مسلمان اپنے دین پر یقین کرتے تھے، ہر عروج کی بلندیوں پر تھے۔ کوئی قوم ان کا مقابلہ نہ کر سکتی تھی۔ مگر اب خود مسلمان انگریزوں سے مرعوب ہیں۔ ان کی تہذیب اختیار کر رہے ہیں۔ انہی کے لہو و لعب میں مشغول ہیں اور اسی میں اپنی کامیابی سمجھتے ہیں۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے۔ کہ پیر و ان اسلام کے سوا کسی کو فلاح نصیب نہیں ہو سکتی۔ آخرت میں تو سخت نقصان اٹھانے والوں میں ہوں گے

اسلامی
قوانین

تہذیب و تمدن کے علاوہ آج کا مسلمان اسلامی قوانین سے بھی مطمئن نظر نہیں آتا۔ اسی لیے وہ غیر اسلامی قوانین کی طرف دیکھ رہا ہے۔ وہ سمجھتا ہے کہ اسلام ایک فرسودہ دین بن چکا ہے۔ لہذا وہ اقتصادی نظام کے لیے روس، جرمنی، امریکہ اور فرانس کی طرف دیکھ رہا ہے۔ حالانکہ ان کے پاس تعزیرات کا کوئی قانون موجود نہیں ان کے تمام قوانین بناوٹی ہیں۔ برخلاف اس کے کہ اسلام کے پاس اپنے قوانین موجود ہیں۔ صحابہ کرامؓ کا دستور العمل مشعلِ راہ ہے۔ مگر اب قوانین اُس مجلسِ شوریٰ سے بنوائے جا رہے ہیں جس میں ہندو اور عیسائی بھی شامل ہیں۔ کیا اسلام کا قانون یہ لوگ بنائیں گے؟ ممبرانِ شوریٰ کے لیے تو خصوصی اہلیت مقرر ہونی چاہیے تھی۔ جس سے پتہ چلتا کہ واقعی یہ لوگ اسلامی قانون سازی کے قابل ہیں۔ حضرت عمرؓ

اور فساد سے مراد مسلمانوں کے خلاف سازش کرنا اور انہیں مالی و جانی نقصان پہنچانا ہے۔ مزید برآں یہ شخص وَيُفْلِكَ الْخَوَاصَّ کھیتی کو ہلاک کرتا ہے۔ اور وَالنَّسْلَ اور نسل کو ضائع کرتا ہے۔ کھیتی کو ہلاک کرنے کی صورت یہ ہے کہ مسلمانوں کی تیار فصل کو نقصان پہنچایا جائے۔ پکی ہوئی کھیتی کو آگ لگا دی جائے۔ درختوں کا پھل ضائع کر دیا جائے۔ یا سرے سے درخت ہی کاٹ دیے جائیں۔ اور نسل کشی سے مراد مطلق نسل کشی بھی ہے جیسا کہ منافقین کا طریقہ ہے۔ اور اس سے مراد مویشی بھی ہو سکتے ہیں۔ جنہیں ہلاک کر دیا جائے یا انہیں معذور بنا دیا جائے۔

فساد اصلاح کے مقابلے میں آتا ہے۔ اصلاح کا معنی درستگی اور فساد سے مراد بگاڑ ہے۔ اس کا بیان پہلے بھی آچکا ہے۔ وَإِذَا قِيلَ لَهُمْ لَا تُفْسِدُوا فِي الْأَرْضِ جب منافقوں سے کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو تو جواب دیتے ہیں إِنَّمَا نَحْنُ مُصْلِحُونَ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں ہم کافروں سے محض اس لیے ملتے ہیں تاکہ صلح صفائی کا پہلو نکل سکے مگر اللہ تعالیٰ نے فرمایا وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ الْفُسَادَ مجھے فساد بالکل پسند نہیں۔ یہ منافق تو ادھر کی بات ادھر اور ادھر کی بات ادھر کر کے آپس میں فساد برپا کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔ ان کا مقصد تو لڑائی جھگڑا کرنا ہے۔

فساد کی ایک اور صورت لوگوں کو مسلمانوں کے خلاف بظن کرنا ہے۔ اور سب سے بڑا فساد شرک اور کفر ہے۔ جو ان کے دلوں میں موجود ہے کفر اور شرک سے بگاڑ پیدا ہوتا ہے جب کہ ایمان اور نیکی سے اصلاح کا پہلو نکلتا ہے۔ شرک و بدعات اور منکرات کے ذریعے ضمیر کی اصلاح ممکن نہیں ہے۔ شرائع الہیہ کو توڑنا فساد ہے۔ لوگوں کو غلط باتوں کی تلقین کرنا فساد ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ یہ سب چیزیں فساد ہی کا حصہ ہیں اور اللہ تعالیٰ کو ہرگز پسند نہیں۔

حضرت شاہ ولی اللہؒ اور شاہ عبدالعزیزؒ محدث دہلویؒ اور بعض دوسرے مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ تولی کا ایک معنی پشت پھیرنا ہے۔ اور دوسرا معنی والی یعنی حاکم بن جانا بھی ہے۔ اگر یہ معنی لیا جائے۔ تو مطلب ہوگا کہ جب منافق آدمی حاکم بن

تولی بمعنی حاکم

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْاِعْمُرَانِ ۳

درس سی ۳۰

آیت ۸۶ تا ۹۱

كَيْفَ يَهْدِي اللَّهُ قَوْمًا كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ
وَشَهِدُوا أَنَّ الرُّسُولَ حَقٌّ وَجَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ
وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٨٦﴾ أُولَٰئِكَ
جَزَاؤُهُمْ أَنَّ عَلَيْهِمُ لَعْنَةُ اللَّهِ وَالْمَلَائِكَةِ
وَالنَّاسِ أَجْمَعِينَ ﴿٨٧﴾ خَالِدِينَ فِيهَا لَا يُخَفَّفُ عَنْهُمْ
الْعَذَابُ وَلَا هُمْ يُنْظَرُونَ ﴿٨٨﴾ إِلَّا الَّذِينَ تَابُوا
مِّنْ بَعْدِ ذَلِكَ وَأَصْلَحُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ رَّحِيمٌ ﴿٨٩﴾
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا بَعْدَ إِيمَانِهِمْ ثُمَّ أَزْدَادُوا

كُفْرًا لَّنْ تَقْبَلَ تَوْبَتَهُمْ ۚ وَأُولَٰئِكَ هُمُ الضَّالُّونَ ﴿٩٠﴾
إِنَّ الَّذِينَ كَفَرُوا وَمَاتُوا وَهُمْ كُفَّارًا فَلَنْ يُّقْبَلَ
مِنْ أَحَدِهِمْ مِّمَّا لَأَرِضْ ذَهَبًا وَلَوْ افْتُدِيَ
بِهِ أُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ أَلِيمٌ وَمَا لَهُمْ
مِّنْ نَّصِيرِينَ ﴿٩١﴾

ترجمہ :- اللہ کس طرح راہ بتلانے کا اس قوم کو جنہوں نے کفر کیا ایمان کے پیچھے ۔

اور انہوں نے گواہی دی کہ بیشک رسول برحق ہے ۔ اور اُن کے پاس کھلی نشانیاں

آئیں اور اللہ نہیں دیکھاتا اس قوم کو جو ظلم کرنے والی ہو ﴿۸۶﴾ یہی لوگ ہیں جن کا بدلہ

یہ ہے کہ بیشک اُن پر اللہ کی لعنت ہے اور فرشتوں کی اور سب لوگوں کی ﴿۸۷﴾

منکوحہ عورت کے متعلق اللہ نے فرمایا۔ **فَمَنْ حَزَّ لَكُمْ تَمَارِي**
 عورتیں تمہاری کھیتیاں ہیں۔ انہیں سے فصل یعنی اولاد پیدا ہوتی ہے۔ اور جب زنا کیا
 جاتا ہے۔ تو کھیتی کو ضائع کرنے کے مترادف ہے۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے کسی
 شخص کو اپنی منکوحہ بیوی یا نوٹھی کے علاوہ کسی دوسری عورت سے تمتع کی اجازت
 نہیں دی۔ اس قانون کی خلاف ورزی کرنے والوں کے متعلق فرمایا **أُولَٰئِكَ هُمُ
 الْعَدُوْنَ** یہ لوگ زیادتی کا ارتکاب کرتے ہیں۔ لہذا اعلیٰ سے ہر لحاظ سے ناپسندیدہ
 فعل قرار دیا گیا ہے۔ باقی **رَبِّ يَهْدِيكَ الشَّعْلَ** تو اس سے مراد لواطت (SODOMY)
 بھی ہو سکتی ہے۔ جس سے نسل ضائع ہوتی ہے۔ ایسا فعل جانوروں سے بھی حرام ہے
 حتیٰ کہ جلیق (MASTURBATION) کو بھی ملعون فعل قرار دیا گیا ہے۔ یہی وہ چیزیں ہیں جو
 دین اخلاق اور ہر چیز کو تباہ کر دیتی ہیں۔

برطانیہ میں زنا کی وہ صورت حرام ہے جو باجبر (RAPE) کیا گیا ہو۔ اور
 اگر کوئی مرد اور عورت باہمی رضامندی سے اس فعل کا ارتکاب کرتے ہیں۔ تو قانون کی
 نظر میں کوئی جرم نہیں۔ ایسے امور میں پولیس کو مداخلت کرنے کا کوئی حق نہیں۔
 اسی طرح امریکہ میں بدمعز رقص بھی جائز ہے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ جب منافی برائت
 آئیں گے۔ تو یہی کچھ ہوگا۔ اسی کو فساد فی الارض سے تعبیر کیا گیا ہے۔ اور یہ اللہ تعالیٰ
 کو ہرگز پسند نہیں۔

آگے ارشاد فرمایا **وَإِذَا قِيلَ لَهُ اتَّقِ اللَّهَ** اور جب ایسے منافق کو کہا جائے
 کہ اللہ سے ڈر جاؤ، ایسی باتیں نہ کرو، کسی کو ناحق قتل نہ کرو۔ گندے قانون جاری
 نہ کرو۔ جس سے لوگوں کے اخلاق بگڑتے ہوں تو اس کا جواب یہ دیتے ہیں۔
أَخَذْتَهُ الْغَدَّةُ بِأَلَةٍ تو اسی گناہ پر تکبر کرتے ہیں۔ اتراتے ہیں۔ کہتے
 ہیں۔ ہمارا تو قانون ہی یہ ہے۔ اور فخر یہ انداز میں کہتے ہیں۔ کہ ہم تو اس قانون کی
 خلاف ورزی نہیں کر سکتے۔ یہ ہماری اسمبلی کا ہماری اکثریت کا بنایا ہوا قانون ہے
 فرمایا ایسے لوگوں کا حال یہ ہوگا **فَحَسْبُ بَعْثِهِمْ جَهَنَّمَ** کہ ان کے لیے جہنم کافی

تکبر و گناہ

بدلہ لے گا۔ اس کے بعد روزہ آئے گا۔ اور عرض کرے گا۔ اَنَا الصَّكُومُ لِعِ اللّٰهِ!
 میں روزہ ہوں۔ اللہ فرمائے گا۔ تم بھی بہتری پہ ہو۔ پھر اسلام آئے گا اور عرض کرے گا۔
 اَنْتَ السَّلَامُ وَاَنَا الْاِسْلَامُ تو سلام یعنی سلامتی والا یا سلامتی دینے
 والا ہے (یہ اللہ تعالیٰ کا اسم پاک ہے) اور میں اسلام ہوں یعنی مجسم فرمانبرداری ہوں
 میں اطاعت ہوں۔ اللہ تعالیٰ فرمائے گا، ہاں ٹھیک ہے۔ بِكَ اَعْطِي وَبِكَ اُخْذُ
 آج میں تیری وجہ سے ہی دوں گا اور تیری وجہ سے موانعہ کو رد کر دوں گا۔ آج سارا
 دار و مدار اس بات پر ہے کہ جس نے اسلام قبول کیا ہے، اس کو اچھا بدلہ ملے گا۔ اور
 جس نے اسلام سے روگردانی کی، اُس کا موانعہ ہو گا۔ کہ تم نے اسلام کو کیوں رد قبول کیا
 ان آیات کی شانِ نزول میں مختلف روایات آتی ہیں حضرت عبداللہ بن
 عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ انصارِ مدینہ میں سے کوئی شخص اسلام قبول کرنے
 کے بعد پھر گیا۔ مگر بعد میں اس پر نادم ہوا تاہم بعض شخص ایسے بھی تھے جو اسلام کو
 ترک کرنے کے بعد کفر پر اڑنے لگے، منجملہ اُن کے بُشَیْنِ منافق کا ذکر آتا ہے
 جو مرتد ہو کر مشرکین مکہ سے جا ملا۔ یہ شخص اسلام اور اہل اسلام کی سخت مخالفت کرتا رہا
 اسی طرح ابن خطل کے متعلق آتا ہے کہ اسلام لانے کے بعد اس کو حضور علیہ السلام
 نے صدقات کی وصولی کے لیے کسی جگہ بھیجا۔ راستے میں خدمت کے لیے ایک
 خادم بھی ہمراہ بھیجا۔ دورانِ سفر اس خادم نے کھانا تیار کرنے میں دیر کر دی تو اس
 ظالم نے اُس کو قتل کر دیا۔ ظاہر ہے کہ قتل ناحق کے جرم میں اُس کے خلاف مقدمہ
 قائم ہوتا، پھر یا تو وہ قصاص میں قتل کیا جاتا یا دیت پر فیصلہ ہو جاتا اور آخرت کی
 سزا سے بچ جاتا۔ مگر اُس نے دنیا کی سزا قبول کرنے کی بجائے اسلام کو ترک کر دیا اور
 مرتد ہو کر کفار مکہ سے جا ملا۔ وہاں پر اُس نے عیش و عشرت کی زندگی گزارنا شروع کر
 دی۔ اُس کے پاس لونڈیاں تھیں۔ رقص و سرود کی مٹھلیں گرم ہوتیں جن میں اسلام
 کی توہین اور اللہ کے رسول کی شان میں گستاخی کی جاتی۔ حضور علیہ السلام نے ابن خطل
 سمیت چار آدمیوں کے متعلق حکم دے رکھا تھا کہ یہ جہاں بھی ملیں قتل کر دیے جائیں۔

اللہ اور لوگوں میں ایسا شخص بھی ہے۔ جو رضائے الہی کی تلاش میں اپنی جان کو بیچتا ہے
 ضرار کا معنی بیچنا اور خریدنا دونوں طرح آتا ہے۔ مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ اس آیت کریمہ
 میں حضرت صہیب رومیؓ کی طرف اشارہ ہے آپ جب ہجرت پر روانہ ہونے لگے
 تو مشرکین نے راستہ روک لیا۔ آپ نے کمان کو درست کیا۔ ترکش سے تیر نکالے اور
 فرمانے لگے۔ اے قریش! تم مجھ سے واقف ہو کہ میں تیر انداز ہوں۔ جب تک میرے
 پاس ایک بھی تیر ہے۔ تم میرے قریب نہیں آ سکتے۔ اور تلوار بھی میرے پاس موجود
 ہے۔ میں تمہارا ڈٹ کہ مقابلہ کروں گا۔ بہتر ہے کہ تم میرا راستہ نہ روکو۔ میرا اتنا مال فدا
 جگہ موجود ہے۔ جاؤ وہ لے لو، تمہارے لیے مباح کر رہا ہوں۔ چنانچہ مشرکین نے
 اس پر اکتفا نہ کرتے ہوئے راستہ چھوڑ دیا۔ جب مدینہ پہنچے تو حضور علیہ السلام نے
 فرمایا اے ابو بکر! تیری تجارت نفع مند ہے۔ وہ لوگ نہ مال کی پروا کرتے تھے۔
 نہ جان کی۔ انہیں تو اللہ تعالیٰ کی رضا مطلوب تھی۔ کہ کسی طرح ایمان بچ جائے۔ یہی وہ
 لوگ تھے جو اللہ تعالیٰ کی رضا کی تلاش میں اپنی جان کو بیچتے تھے۔

اسلام کے ابتدائی دور میں مسلمان ضعفائے بڑی بڑی تکالیف برداشت کیں۔
 عمارؓ کی والدہ سمیٹھ نے ایک عورت ذات ہوتے ہوئے اتنی بڑی قربانی دی عمارؓ
 کا باپ یا سرؓ بھی شہید ہوا۔ اور مال بھی ٹھیک نہ ہوئی۔ ظالم ابوجہل نے حضرت سمیٹھ کی دونوں
 ٹانگیں مختلف اونٹوں سے باندھ کر مخالف سمتوں میں چلا دیا اور اس طرح انہیں بے رحمی
 سے شہید کیا۔ حضرت خباب بن ارتؓ، حضرت بلالؓ اور اس قسم کے کتنے ضعفائے
 جہنم نے بڑی سے بڑی تکلیفیں اٹھائیں۔ جان اور مال قربان کر دیے۔ مگر ایمان کو
 بچا لگے تاکہ اللہ کی خوشنودی حاصل ہو جائے۔

فرمایا واللہ رَعُوْفٌ بِالْعِبَادِ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں کے ساتھ شفقت
 کرنے والا ہے۔ جو لوگ اپنا مال اور جان اللہ کی رضا کی تلاش میں صرف کر دیتے ہیں
 تو اللہ بھی ان کو بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گا۔ وہ تو بڑا ہی مہربان ہے۔ یہ بھی اُس
 کی خاص مہربانی ہے کہ اُن کے دلوں کو نیکی کی طرف پھیر دیا۔ اور وہ ہر قربانی

کے لیے تیار ہو گئے۔ چنانچہ ان کے حق میں فتنہ بھی خوب ہی مچا گا۔ وہ لوگ
یقیناً مرتب عالیہ پر فائز ہو گئے۔ اللہ تعالیٰ خاص مہربانی کرنے والا ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَآفَّةً ۖ وَلَا تَتَّبِعُوا
خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ ۚ إِنَّهُ لَكُمْ عَدُوٌّ مُبِينٌ ﴿۲۰۸﴾ فَإِنْ
زَلْتُمْ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْكُمْ الْبَيِّنَاتُ فَأَعْلَمُوا أَنَّ
اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۰۹﴾ هَلْ يَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ يَأْتِيَهُمُ
اللَّهُ فِي ظُلُمٍ مِّنَ اللَّيْلِ وَالنَّهَارِ وَالسَّكِينِ وَقَضَى الْأَمْرُ
وَلِلَّهِ تَرْجَعُ الْأُمُورُ ﴿۲۱۰﴾

۲۵
۶۹

ترجمہ :- اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ اور شیطان کے قدموں کی پڑی
نہ کرو۔ بیشک وہ تمہارے لیے کھلا دشمن ہے ﴿۲۰۸﴾ پس اگر تم پھسل گئے بعد اس کے
کہ تمہارے پاس واضح باتیں آگئی ہیں۔ پس جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ زبردست
اور حکمت والا ہے ﴿۲۰۹﴾ یہ لوگ نہیں انتظار کر رہے مگر اس بات کا کہ آئے اللہ
تعالیٰ ان کے پاس آئے بادلوں کے سائبانوں میں اور فرشتے بھی۔ اور فیصلہ
کر دیا جائے معاملے کا۔ اور اللہ ہی کی طرف لوٹنے جائیں گے سب کام ﴿۲۱۰﴾

گذشتہ آیات میں منافقین کی مذمت اور مخلص ایمان والوں کی تعریف بیان کی گئی تھی
کہ وہ اپنی جان اور مال ہر چیز اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے لیے قربان کرنے کو تیار ہوتے
ہیں۔ اب ان مخلص مومنین سے خطاب ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ادْخُلُوا
فِي السِّلْمِ كَآفَّةً اے ایمان والو! اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔
کافہ کا معنی 'جميعاً' ہوتا ہے۔ یعنی انسان اپنے جسم کے لحاظ سے اور
اور احکام شریعت کے لحاظ سے پورے کے پورے اسلام میں داخل ہو جائیں۔
وفاداری صرف اور صرف اسلام سے ہو، باقی تمام ادیان، ابدعات، رسومات باطلہ

مکمل اسلام

وغیرہ سے مکمل طور پر علیحدگی ہو۔ کیونکہ یہ چیزیں اسلام کے منافی ہیں۔ اگر اسلام کے ساتھ ساتھ ایسی قبیح چیزوں کے ساتھ بھی تعلق قائم رکھیگا، تو اس کا مطلب یہ ہوگا۔ کہ ایسا شخص مکمل طور پر اسلام میں داخل نہیں ہوا۔ کافہ کا دوسرا معنی یہ بھی ہے کہ انسان کے ظاہر و باطن اور عقیدے اور عمل میں کسی قسم کا تضاد نہ ہو۔ جو کچھ دل کے اندر ہے زبان پر بھی وہی آنا چاہیے۔ اور جو عقیدہ ہے عمل بھی اُس کے مطابق ہو۔ زبانی دعویٰ کچھ ہو۔ اور عملی طور پر اُسکی تردید ہوتی ہو۔ تو یہ اسلام میں مکمل طور پر داخلہ نہیں ہوگا۔ اگر عقیدہ توحید کا ہو اور عمل میں بشرک پایا جائے۔ زبان پر اتباع سنت کا دعویٰ ہو مگر رواج بدعت کو دیا جا رہا ہے۔ تو یہ چیز کافہ کے منافی ہوگی۔

شیخ الحداد
ترجمہ قرآن

حضرت مولانا شیخ الحداد محمود الحسن برصغیر کے بلند پایہ مفسر قرآن ہوئے ہیں انہوں نے حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ کے ترجمہ قرآن پاک کو آسان بنایا۔ اُن کے زمانے میں جو الفاظ متروک زبان ہو چکے تھے انہیں آسان اور عام فہم الفاظ کے ساتھ بدل دیا۔ یہ بامعاوضہ ترجمہ آپسے امیری کے دوران مالٹا جیل میں مکمل کیا۔ اور ساتھ دو سورتوں کا حاشیہ بھی لکھا مگر زندگی نے وفانہ کی۔ چنانچہ بقیہ قرآن پاک کا حاشیہ آپسے شاگرد شیخ الاسلام حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ نے مکمل کیا۔ اس وقت برصغیر میں اردو زبان کا سب سے بہتر حاشیہ یہی ہے۔ جو مختصر اور صحیح ہے۔ تفسیریں اور حاشیے تو اور بھی بہت سے ہیں۔ کوئی لمبا کوئی مختصر عربی اور فارسی زبانوں میں بھی بے شمار حواشی موجود ہیں مگر یہ ترجمہ اور حاشیہ سب سے بہتر ہے۔ جو تمام عالمانہ خصوصیات کا حامل ہے۔ اس میں بدعات کا خاص طور پر رد کیا گیا ہے۔

کہتے ہیں کہ جب شیخ الحداد مالٹا سے بذریعہ بحری جہاز واپس آئے تھے۔ تو سمندر میں طوفان آگیا۔ اور ایک وقت ایسا بھی آیا جب جہاز کے بچ نکلنے کی کوئی امید باقی نہ رہی۔ تو آپسے ایک شاگرد کو جو ہمراہ تھا فرمایا کہ اس ترجمہ کو اپنے سینہ سے باندھ لو۔ اگر جہاز کی تباہی کی صورت میں تیرنا بھی پڑے تو اس ترجمہ کو ساتھ لیجاؤ۔ یہ مولانا عزیز گل سنا کہ رٹ پشاور کے رہنے والے تھے۔ اور تیرنا جانتے تھے۔ حضرت

شیخ الہندؒ کے ہمراہی پانچ شاگردوں میں سے مولانا عزیز گل ماشاء اللہ آج بھی یقیناً حیات ہیں۔ سمندری طوفان کے دوران اگر آپ کو کسی چیز کی فکر لاحق ہوئی تو وہ ترجمہ قرآن پاک تھا۔ جو آپ نے نہایت عرق ریزی سے لکھا تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے مہربانی فرمائی اور جہاز صحیح سلامت طوفان سے بچ نکلا۔ الغرض حضرت شیخ الہندؒ کو اس ترجمہ قرآن پاک کی اتنی فکر تھی کہ اور کسی چیز کی پروا نہ کی۔ آپ کو صرف اسی گہر نایاب کی فکر لاحق ہوئی۔ شیخ الہندؒ بڑے خدا پرست انسان تھے۔ محدث اور فیتہ تھے۔ انگریزوں کے سخت دشمن تھے۔ انہیں ایک آنکھ دیکھنا بھی پسند نہ فرماتے آپ سمجھتے تھے کہ مسلمانوں کے دین، مذہب اور قوم کو خراب کرنے والے انگریز ہی ہیں مسئلہ کشمیر، فلسطین، قبرص، شام اور لبنان سب انگریز کے پیدا کردہ مسائل ہیں۔ یہ امریکہ تو کل کی پیداوار ہے۔ اصل فتنہ پرداز انگلینڈ والے ہیں۔ جو یہاں سے بھاگ کر امریکہ چلے گئے اور وہاں حکومت قائم کر لی۔ عیسائی خواہ امریکی ہوں یا برطانوی یا روسی انہوں نے ہمیشہ مسلمانوں کی مخالفت کی۔ انہوں نے ہندوستان میں ہندوؤں کو ساتھ ملا کر مسلمانوں کے ساتھ سازشیں کیں۔ اُن کو ذلیل و خوار کیا گیا۔ پہلی جنگ عظیم کے دوران میں سب پیروں اور مولویوں نے ترکی کے خلاف کھر کا فتویٰ دے دیا۔ یہ صرف حضرت مولانا شیخ الہندؒ تھے جنہوں نے انگریز کی ڈرٹ کو مخالفت کی۔ جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آپ کو گرفتار کر کے مالٹا میں قید کر دیا گیا۔

بتھا کی ترویج

حضرت شیخ الہندؒ نے اپنے ترجمہ قرآن میں کافہ کا معنی ایسی لکھا ہے کہ اسلام میں اس طرح داخل ہو جاؤ کہ تمہارا کوئی عمل احکام اسلام کے خلاف نہ ہو۔ اپنی عقل یا دوسرے کے کہنے سے دین میں کوئی چیز داخل نہ کرو کہ یہ بدعت ہے۔ مگر لوگ اسے اسلام کے نام کا رٹا ب سمجھ کر کرتے ہیں۔ کیونکہ بدعت نام ہی اُس عمل کا ہے۔ جسے اچھا سمجھ کر دین میں اپنی طرف سے شامل کر لیا جائے۔ حالانکہ دین کا اُس سے کوئی تعلق نہ ہو۔ فرماتے ہیں کہ اس کی مثال ایسے ہے۔ جیسے نماز اور روزہ افضل ترین عبادات میں سے ہیں۔ لیکن جب کوئی شریعت کی مقررہ نماز کے علاوہ

اب دفات پانچے ہیں۔ قیاض

اپنی طرف سے کوئی نماز ایجا دکریگا تو وہ بدعت ہوگی مثلاً عید کے روز عید گاہ میں نوافل ادا کرنا اگرچہ نماز ہے مگر اسے بدعت کہیں گے۔ کیونکہ دین میں اسکی اصل نہیں ہے۔ اسی طرح ہزار روزہ رکھنا بھی بدعت میں شمار ہوگا۔ کیونکہ اپنی طرف سے دین میں شامل کیا گیا ہے۔

ایصال ثواب کی تمام رسوم بھی اسی قبیل سے ہیں۔ قیسرا، دسوال چلم وغیرہ کار ثواب اور مرنے کے لیے باعث اجر سمجھ کر کیا جاتا ہے مگر شریعت میں اس کی کوئی اصل نہیں۔ اسی طرح حضور علیہ السلام کی مدح سرائی کے لیے نعت خوانی اور محافل میلاد منعقد کی جاتی ہیں۔ اور مختلف مقامات پر مختلف طریقے اختیار کیے جاتے ہیں۔ مگر یہ سب کچھ شریعت کی منشا اور اس کے حکم کے بغیر ہوتا ہے۔ طاعلی قارئی اور دیگر فقہائے کرام لکھتے ہیں۔ کہ نماز جنازہ کی سلام پھیرنے کے بعد دعا نہیں کہنی چاہیے۔ کیونکہ یہ جنازہ میں اپنی طرف سے اضافہ تصور ہوگا۔ یہ چیز شارع علیہ السلام سے ثابت نہیں ہے۔ اسی طرح جب اقامت صلوٰۃ کے آخری کلمات لا الہ الا اللہ کہے جاتے ہیں۔ تو دوسرے لوگ محمد رسول اللہ کہتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ بھی بہت بڑی نیکی اور ثواب کی خاطر کیا جاتا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام سے قطعاً ثابت نہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ آج کے مہمان کو حضور علیہ السلام کے طریقے پر یقین نہیں آیا۔ لہذا اس میں اضافہ کر لیا ہے۔ اذان سے پہلے درود شریف بہت بڑی سعادت سمجھ کر پڑھا جاتا ہے۔ حالانکہ حضور علیہ السلام نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ اس قسم کی بدعت کا ارتکاب محض اپنی عقل کی پیروی میں کیا جاتا ہے۔

نوافل کی ادائیگی بلاشبہ خیر کثیر ہے۔ مگر اسکی جماعت ثابت نہیں۔ فقہائے کرام نے اسے بھی بدعت سے تعبیر کیا ہے۔ ہاں جن نمازوں کی جماعت حضور علیہ السلام سے ثابت ہے، وہ درست ہے۔ ان میں نماز تراویح، صلوٰۃ کوف اور نماز استسقاء وغیرہ ہیں مگر صلوٰۃ التیسع کی جماعت کہاں سے آگئی۔ علمائے احناف اسے بھی بدعت قرار دیتے ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ کے مسلک میں درست نہیں ہے۔

حالانکہ یہ نماز ہے اور اعلیٰ درجے کی عبادت ہے۔

الغرض! خلاصہ ان آیات کا یہ ہے کہ اخلاص کے ساتھ ایمان لاؤ، اور بدعات سے بچتے رہو اور اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا واقعی بعض لوگ مکمل طور پر اسلام میں داخل نہیں ہوتے۔ اس ضمن میں اہل کتاب کی مثال موجود ہے۔ یہودی علماء میں سے حضرت عبداللہ بن سلام کو اللہ تعالیٰ نے توفیق بخشی اور وہ اسلام لائے۔ بعض دوسرے یہودی بھی مشرف بہ اسلام ہوئے حضرت شیخ الہندؒ لکھتے ہیں کہ اگرچہ وہ پورے اخلاص کے ساتھ مسلمان ہو گئے تھے۔ مگر اُن کا خیال تھا کہ قرآنی احکام کے ساتھ ساتھ تورات کے احکام کی بھی رعایت ہونی چاہیے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اُن کے اس خیال کی تردید فرمادی کہ اسلام کے ساتھ ساتھ کسی اور شریعت یا دین کی رعایت اسلام میں مکمل داخلے کی نفی ہوگی۔ لہذا باقی تمام مشرّع اور ادیان کو چھوڑ کر اسلام میں پورے پورے داخل ہو جاؤ۔

تورات میں حکم موجود ہے کہ ہفتہ کے روز سوائے عبادت الہی کے اور کوئی کام نہ کرو۔ گویا اس دن دنیوی کاروبار مکمل طور پر بند کرنے کا حکم تھا۔ حتیٰ کہ چولہا بھی گرم نہیں کیا جاسکتا تھا۔ نہ زراعت، نہ دکانداری اور نہ کوئی اور کام کرنے کی اجازت تھی۔ اسی طرح یہودیوں کے دین میں اونٹ کا گوشت کھانا اور دودھ پینا ممنوع تھا۔ تو نو مسلم یہودیوں نے خیال کیا کہ اسلام میں جمعہ کو افضل دن قرار دیا گیا ہے۔ ہم کو تسلیم کرتے ہیں۔ اور اس کے ساتھ ساتھ پُرانے طریقے پر اگر ہفتہ کی تعظیم بھی روا رکھی جائے۔ اور ممنوعات کی پابندی کی جائے تو کیا حرج ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی بات سے منع فرمادیا اور حکم دیا کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اب اسلامی احکام کے ساتھ دوسری شریعت کی پابندی روا نہیں ہے اگر اب بھی ایسا کیا جائے تو یہ فعل بدعت شمار ہوگا۔ کیونکہ شریعت محمدیؐ نے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔

ادْخُلُوا فِي السِّلَاحِ كَآفَّةً ایک جامع آیت ہے۔ اسلام میں مکمل داخلہ صرف ظاہری اعمال تک ہی موقوف نہیں۔ بلکہ باطنی طور پر بھی اسلام کے احکام

ظاہر و باطن
میں یکساں

پر پورا پورا یقین ہونا چاہیے۔ ظاہر اتمام اعضا مثلاً ہاتھ، پاؤں، کان اور آنکھ احکام اسلام پر کاربند ہوں جس طرح بعض روایات میں آتا ہے کہ روزہ صرف مجھوک اور پیاس برداشت کرنے کا نام نہیں بلکہ آنکھ، کان، زبان اور دیگر تمام اعضا و جوارح کا روزہ ہونا چاہیے اسی طرح باطن دل میں بھی پورا ایمان و یقین ہو کہ ان احکام کو پورے خلوص نیت کے ساتھ انجام دینا ہے۔ اگر ایسی کیفیت پیدا ہو جائے، تو سمجھ لیجئے کہ آپ نے کَافَّةً کا مضموم پایا ہے۔ اور اگر ایسا نہیں ہے۔ ظاہر و باطن میں تضاد پایا جاتا ہے۔ کچھ حصہ اسلام کا لے لیا۔ اور کچھ بدعات کو بھی اپنا لیا۔ یا کوئی عبادت اسلام سے لے لی اور کچھ چیزیں کسی اور شریعت یا مقامی رسم و رواج سے حاصل کر لیں تو اسلام میں مکمل داخلہ تصور نہیں ہوگا۔ آپ کو یاد ہے سابقہ حکومت نے نعرہ لگایا تھا کہ دین تو ہمارا اسلام ہے مگر معیشت ہماری سوشلزم اور سیاست ہماری جمہوریت ہوگی۔ تو بتائیے یہ اسلام کی مکمل اتباع کیونکر ہوگی یہ تو تثلیث بنا کر رکھ دی۔ یقیناً یہ اس آیت کریمہ کی نفی ہے۔ اللہ تعالیٰ تو حکم دیتا ہے کہ اسلام میں پورے کے پورے داخل ہو جاؤ۔ اور یہ کہتے ہیں کہ ہم ایک تہائی اسلام کا لیں گے اور باقی دو تہائی کے لیے دوسروں کے دروازے پر جائیں گے، ہم نے اُسی وقت کہ دیا تھا۔ کہ یہ نعرہ اسلام کے سرسرنافی ہے۔ اگر دین اسلام ہے تو پھر معیشت اور سیاست بھی اسلام ہی سے کرنا ہوگی۔ ورنہ یہ قول و فعل میں تضاد اور ظاہر و باطن میں عدم یکسانیت ہوگی۔

محور علیہ الصلوٰۃ والسلام کے ارشاد عالیہ کتب احادیث بخاری و مسلم وغیرہ میں مرتب شکل میں دستیاب ہیں ان میں نظام حکومت کا مکمل خاکہ موجود ہے۔ خلفاء راشدین کے نظام حکومت کی تفصیلات موجود ہیں۔ شاہ ولی اللہؒ کی ازالۃ الخفاء اور دیگر کتب میں دستور مملکت موجود ہے۔ مگر آپ اس کو چھوڑ کر غیروں کے نظام تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ افسوس سے کہنا پڑتا ہے۔ کہ اتنا عرصہ گزرنے کے باوجود اسلام کے نام پر قائم ہونے والے کسی پاکستان میں ابھی تک نظریہ کاتالون

نافذ ہے۔ قوانین دیوانی و فوجداری، تجارت و محنت وغیرہ سب انگریزی قانون میں انگریز کے زمانہ میں ان قوانین کو قبول کرنا تو ہماری مجبوری تھی، اب کیا تکلیف ہے ہم اسلامی نظام کیونکر نہیں کر سکتے۔ کیا کارپورڈن حکومت کو اسلام کے قوانین و نظریات پر اعتماد نہیں ہے۔ اگر اعتماد ہوتا تو انگریزی قوانین پہلے دن سے تبدیل کر دیے جاتے۔

اسلام انقلابی
مذہب ہے

اصل بات یہ ہے کہ اس وقت اسلام کو انقلابی مذہب ہم خود اور ہمارے حکمران تسلیم نہیں کرتے۔ اسی لیے وہ اسلام کا نفاذ بتدریج چاہتے ہیں نتیجہ یہ ہو گا کہ جس طرح پہلے حکمران نفاذ اسلام کے بغیر چلے گئے۔ اسی طرح موجودہ حکومت بھی رخصت ہو جائیگی مگر اسلام نافذ نہیں ہو گا۔ اور اس کے بعد میسر آجائے گا وہ اپنا طور طریقہ اپنائیگا۔ ہر کہ آمد عمارت نو ساخت مگر لوگ اسلام کی برکات سے محروم ہی رہیں گے۔ جب تک اسلام کو انقلابی اقدام کے طور پر نافذ نہیں کیا جائے گا، کامیابی حاصل نہیں ہو سکتی۔ اس ضمن میں حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا طریقہ دیکھئے۔ فتح مکہ کے روز حضور نے انقلابی اعلان فرمایا تھا کہ جاہلیت کی ہر رسم کج میرے پاؤں کے نیچے روند دی گئی ہے آج کے بعد کسی شرک کو برہنہ حالت میں طواف کعبہ کی اجازت نہیں ہوگی۔ کسی غیر مسلم کو مکہ مکرمہ میں داخل نہیں ہونے دیا جائے گا۔ آج کے بعد تمام سودی کاروبار بند کیے جاتے ہیں۔ یہ سب انقلابی مذہب کے انقلابی پروگرام تھے جو غلط پروگرام کی جگہ فی الفور نافذ کر دیے گئے۔ مقصد یہ کہ اگر تختہ اسلام کا ہے۔ تو پھر قوانین بھی اسلامی نافذ ہونے چاہئیں۔ جو ہر شعبہ زندگی پر حاوی ہوں۔ ملکی مسائل معاشی ہوں یا معاشرتی یا عبادات ہوں یا رسم و رواج ہر معاملہ میں اسلام سے رہنمائی حاصل کرنا ہوگا۔ ادھاتیر اور ادھابٹیر سے کام نہیں چلے گا۔ ہمارے پاس ہر ہر شعبہ کے لیے قوانین موجود ہیں، ضرورت صرف عمل کی ہے۔ اسلام کی عملداری میں انگریز کی جمہوریت چلے گی، نہ سوشلزم کی اقتصادیات ہوں گی اور نہ کالر مارکس کی اشتراکیت کا کوئی حصہ ہوگا۔ بلکہ پورے کا پورا نظام اسلامی ہوگا۔ حتیٰ کہ دیوانی اور فوجداری قوانین

بھی وہی نافذ ہوں گے جو اسلام نے عطا کیے ہیں۔ حق دار کی حق رسی انہی قوانین کے ذریعے ممکن ہے۔ اور ظالم کو ظلم کا بدلہ یہی قوانین دلا سکتے ہیں۔ یہی وہ قوانین ہیں جن کے ذریعے دنیا میں امن و امان قائم ہو سکتا ہے۔ اَدْخُلُوا فِي السِّلْمِ كَافَّةً کا یہی مطلب ہے۔

شیطان کے
نقش قدم

یہودیوں میں بھی یہی خصلت پائی جاتی ہے۔ کہ وہ بھی اپنی کتاب پر مکمل ایمان نہیں رکھتے تھے۔ کسی حکم کو مانتے تھے اور کسی کا انکار کر دیتے تھے۔ جبھی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں بتلایا **اَفْتَوْهُمْ مَنْ يَبْعُضُ الْكِتَابِ وَتَكْفُرُونَ بِبَعْضٍ** کیا تم کتاب کے کسی حصے کے ساتھ ایمان لاتے ہو اور کسی حصے کو نہیں مانتے۔ یہ تمہارا ایمان کیا ہے۔ یہ تو سرسراہٹ ہے۔ اس روش کو چھوڑ کر پورے کے پورے ایمان میں داخل ہو جاؤ **وَلَا تَتَّبِعُوا خُطُوَاتِ الشَّيْطَانِ** اور شیطان کے نقش قدم پر نہ چلو۔ گویا بدعات پر چلنا شیطان کے نقش قدم پر چلنا ہے۔ **اِنَّهُ لَكُوْ**
عَدُوٌّ مُّبِينٌ۔ وہ تمہارا کھلا دشمن ہے اس کے بہکاوے میں نہ آجانا۔ مطلب یہ کہ جو کوئی دین اسلام کا راستہ چھوڑ کر ہندو اور زعم و رواج کو اپنائے گا۔ انگریزوں اور اشتراکیوں کا قانون اختیار کرے گا۔ وہ شیطان کے نقش قدم پر چلے گا۔ اور ظاہر ہے کہ دشمن ہمیشہ دشمنی کرتا ہے۔ وہ کبھی خیر خواہی کی بات نہیں کرتا۔ وہ تمہیں پستی کی طرف لے جائے گا۔ شیطان کا تو کام ہی یہ ہے۔ **يَدْعُوْا حِزْبًا لِّكَوْذٍ اَمِنْ اَصْحَابِ السَّعِيْرِ** وہ تو اپنا بڑے سے بڑا گروہ لے کر جہنم کی طرف رواں ہے۔ اور اپنے نقش قدم پر چلنے والوں کو اسکی طرف دعوت دے رہا ہے۔

در عید خدای

اللہ تعالیٰ نے اسلام کے مکمل نفاذ کی ترغیب دینے کے بعد اس سے روگردانی کرنے والوں کو وعید بھی سنائی ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ فَإِنْ زَلَّكُمْ مِنَ الْبَعْدِ مَا جَاءَكُمْ بِالنَّبِيِّ اور اگر تم پھسل گئے بعد اس کے کہ تمہارے پاس نشانیاں آگئیں۔ فَاعْلَمُوا أَنَّمَا اللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ

بیشک اللہ تعالیٰ زبردست ہے۔ اور حکمت والا ہے وہ کمال قدرت کا مالک ہے اس کی سزا سے بچ نہیں سکتے۔ اسکی حکمت کے مطابق دیکھ ہو سکتی ہے بھگت گرفت سے بچاؤ ممکن نہیں۔ وہ تمہارے کئے کا ضرور بدلے گا۔ دوسرے مقام پر فرمایا **قَدْ تَبَيَّنَ مِنَ الرُّشْدِ مِنَ الْغَيِّ نَبِيٌّ** اور بدی کی واضح نشان دہی ہو چکی۔ اب تمہارا کوئی عذر قبول نہیں کیا جائے گا۔ ان واضح ہدایات کے بعد نبی یا بدی کا اختیار کرنا تمہارے بس میں ہے۔ اور اس پر جزایا سزا دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ کے فہم ہے اللہ تعالیٰ کے احکام نہ ماننے والوں کے متعلق یہ ارشاد ہوتا ہے کہ **إِنَّ لَوَگُلٍ كُؤِکِیَا هُؤِکِیَا**۔ وہ کیوں ایمان نہیں لاتے۔ انہیں کس چیز کا انتظار ہے۔ جسے دیکھ کر ایمان لائیں گے۔ **هَلْ یَنْظُرُونَ إِلَّا أَنْ یَأْتِیَهُمُ السَّعْرُ اللّٰهُ فِیْ ظُلُمٍ مِّنَ الْغَمَامِ وَالْمَلَائِکَةُ** یہ لوگ محض اس بات کا انتظار کر رہے ہیں کہ اللہ تعالیٰ اور اس کے فرشتے ان کے پاس بادلوں کے سائے میں آئیں مطلب یہ کہ منکرین کی خواہش یہ ہے کہ جو چیز قیامت کو ظاہر ہونے والی ہے۔ وہ آج ہی ہو جائے۔ بادلوں کے سائبانوں میں نزول اجلال تو قیامت کے روز ہو گا جب اللہ تعالیٰ خود نزول اجلال فرمائیں گے اور سائبان جو ہوں گے، وہ نار، نور اور پانی کے ہوں گے۔ ستر ہزار حجاب میں اللہ تعالیٰ نزول اجلال فرمائے گا۔ ارد گرد فرشتے بیسج پڑھ رہے ہوں گے۔ اس وقت عدالت قائم ہوگی اور اللہ تعالیٰ ہر ایک کا فیصلہ فرمائیں گے۔ یہ لوگ چاہتے ہیں کہ یہ سب کچھ آج ہی ہو جائے۔ بھلا قبل از وقت یہ کیسے ممکن ہے۔ دوسری جگہ فرمایا **قَدْ یَحْذَرُ الْکَافِرُ أَنْ یُؤْمِنُوا** قرآن پاک اللہ کی آخری کتاب ہے۔ اس کے آجانے کے بعد یہ اور کس کتاب کے منتظر ہیں۔ جس پر ایمان لائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کے آخری پیغمبر خاتم النبیین تشریف لاپچکے۔ اب ان کی راہنمائی کے لیے اور کون سا نبی آئے گا۔ جس کا یہ لوگ انتظار کر رہے ہیں اب کوئی شریعت، کوئی پروردگار نہیں جو باقی ہے۔ اور جس کا انتظار کیا جائے۔

اللہ تعالیٰ
کا فیصلہ

الغرض فرمایا کہ اللہ تعالیٰ کا بادلوں کے سائبانوں میں نزول اجلال تو قیامت

کے روز ہوگا۔ اللہ تعالیٰ کی تجلی ستر ہزار پڑوں کے اندر ظاہر ہوگی۔ کائنات کی ہر چیز درہم بہرہم ہو جائے گی۔ اور سخت ناراضگی کا ظہور ہوگا۔ چنانچہ اس وقت وَقَضِيَ الْأَمْرُ فیصلہ کر دیا جائے گا مگر یاد رکھو وَاللّٰهُ تَوَجَّعَ الْأُمُورِ تمام کام اللہ ہی کی طرف لوٹائے جائیں گے۔ اللہ تعالیٰ کا قانون اٹل ہے۔ اس کا مقرر کردہ ہر کام وقت پر ہوگا۔ اُسی کے قانون کے مطابق انسانوں کو اس دنیا پر مِلّت دی جاتی ہے۔ مگر آخری فیصلہ اور نزولِ اجلال قیامت کے روز ہی ہوں گے۔ یہ چیزیں قبل از وقت وقوع پذیر نہیں ہوں گی۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۱۱ تا ۲۱۴

درس ہفتاد و شش (۸۶)

سَلْ بَنِي إِسْرَءِيلَ كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِّنْ آيَةٍ بَيِّنَةٍ ط
وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ فَإِنَّ اللَّهَ
شَدِيدُ الْعِقَابِ ۲۱۱ زَيْنَ الَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيَاةُ الدُّنْيَا
وَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ اتَّقَوْا فَوْقَهُمْ

يَوْمَ الْقِيَمَةِ ط وَاللَّهُ يَرْزُقُ مَنْ يَشَاءُ بِغَيْرِ حِسَابٍ ۲۱۲

ترجمہ: آپ بنی اسرائیل سے پوچھیں کہ ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں دیں۔ اور جو
کوئی اللہ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ اس کے بعد کہ وہ نعمت اُس کے پاس پہنچ
چکی۔ پس بیشک اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے ۲۱۱ مزین کی گئی ہے۔ دنیا کی
زندگی ان لوگوں کے لیے جنہوں نے کفر کیا۔ اور وہ ٹھٹھا کرتے ہیں ان لوگوں کے ساتھ
جو ایمان لائے۔ اور وہ لوگ جو بڑھتے رہے۔ وہ ان کے اوپر (بلنہ) ہوں گے قیامت

کے دن۔ اور اللہ تعالیٰ جسے چاہے بغیر حساب کے روزی دیتا ہے ۲۱۲

گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے متنبہ کیا تھا کہ اُس کے واضح احکامات آجانے
کے بعد ان کی خلاف ورزی نہیں کرنی چاہیے۔ بلکہ احکام الہی کی تعمیل ہونی چاہیے
واضح نشانات کے بعد بھی اگر کوئی شخص پھسل جائے۔ تو وہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں
آسکتا ہے۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے بطور مثال ارشاد فرمایا ہے۔ سَلْ بَنِي
إِسْرَءِيلَ، آپ ذرا بنی اسرائیل سے دریافت تو کریں كَمَا آتَيْنَاهُمْ مِّنْ
آيَةٍ بَيِّنَةٍ ہم نے ان کو کتنی واضح نشانیاں عطا کیں۔ واضح یا کھلی نشانوں میں تعلیم
بھی آتی ہے۔ اور معجزات بھی آتے ہیں مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ نے موسیٰ علیہ السلام
کے توسط سے تمہیں کس قدر واضح معجزات عطا کیے۔ ان کی تفصیل پہلے اچھی ہے

منجملہ اُن کے ابر کا سایہ کرنا، پتھروں سے بارہ چشمے جاری کر کے بنی اسرائیل کو سیراب کرنا، اُن کے لیے من و سلوٰی کی خوراک مہیا کرنا، دشمن کو آنکھوں کے سامنے ہلاک کرنا، بنی اسرائیل کے لیے سمندر میں راستے بنادینا وغیرہ وغیرہ ایسے واضح نشان اور معجزات ہیں جو بنی اسرائیل کو عطا کیے گئے۔ مگر اس کے باوجود انہوں نے اللہ تعالیٰ کے احکامات کا انکار کیا۔ اور پے پے غلطیاں اور کوتاہیاں کیں جن کا ذکر اس سورۃ مبارکہ میں آچکا ہے۔ اور جن کی تعدد و کم و بیش چالیس ہے مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہر بار معاف فرمایا۔ بنی اسرائیل بہت بڑی قوم تھی۔ دنیا میں جاہ و وقار کی مالک تھی۔ حضرت یعقوب علیہ السلام کی اولاد کو اللہ نے علم و حکمت اور بادشاہی عطا کی۔ تمام دنیوی نعمتوں سے مالا مال کیا مگر اس کے باوجود جب ان کی سرکشی حد سے تجاوز کر گئی تو اللہ تعالیٰ نے ذلیل و خوار کر کے عذاب میں مبتلا کر دیا کیونکہ اللہ تعالیٰ کا قانون یہ ہے۔

وَمَنْ يُبَدِّلْ نِعْمَةَ اللَّهِ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَتْهُ اللَّهُ تَعَالَىٰ فِي نِعْمَتِ كَيْفَ يَبْدُلُ اللَّهُ مَا يَشَاءُ اللَّهُ شَدِيدُ الْعِقَابِ تَوَلَّى اللَّهُ تَعَالَىٰ
سخت سزا دینے والا ہے۔

انبیاء علیہم السلام کا وجود بھی خدا تعالیٰ کی نشانیوں میں سے ایک نشانی ہوتا ہے۔ اور عام لوگوں کے لیے معیار اور نمونہ ہوتا ہے۔ جسے دیکھ کر لوگ اپنے ظاہر و باطن کو درست کر سکتے ہیں۔ انبیاء کا وجود انسانوں کے لیے ایک بہت بڑی نعمت ہے چنانچہ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کو اسی نعمت سے تعبیر کیا ہے۔ اَلَّذِينَ آمَنُوا وَبَدَّلُوا نِعْمَةَ اللَّهِ كُفْرًا كَمَا قَامَ فِي مِثْلِهِمْ لَقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ كَفَرُوا فِي مِثْلِ الَّذِي كَفَرُوا
جنہوں نے اللہ کی نعمت کے ساتھ کفر کیا۔ اس نعمت سے مراد حضور پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی ذات مبارکہ ہے۔ آپ پر ایمان لانے اور آپ کا اسوہ اختیار کرنے سے اعراض کیا۔ لہذا خود بھی جہنم میں گئے اور قوم کو بھی جہنم رسید کیا۔

علم اور عمل انسان کے لیے لازمی چیزیں ہیں۔ ان کے بغیر کامیابی ممکن نہیں علم اللہ تعالیٰ کی جانب سے بذریعہ وحی حاصل ہوتا ہے۔ اور عمل انبیاء سے ملتا

انبیاء نعمت
الہی ہیں

ہے۔ انبیاء معیار ہوتے ہیں انہیں دیکھ کر اعمال درست کیے جاتے ہیں۔ قرآن پاک نے فرمایا کَفَدُ كَانَ لَكُمُ فِي رَسُولِ اللَّهِ أُسْوَةٌ حَسَنَةٌ اللہ کے رسول تمہارے لیے اسوہ حسنہ ہیں۔ زندگی کے ہر موڑ پر اس اسوہ کی ضرورت ہے۔ خوشی کا موقع ہو یا غمی کا، صلح کی حالت ہو یا جنگ کی، نبی کی ذات ہر حالت میں نمونہ ہوتی ہے۔ اور یہ بہت بڑی نعمت ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ سخت سزا دینے والا ہے اس لیے شخص کو اپنا انجام دیکھ لینا چاہیے۔

انعامات کی
ناقدری

جس طرح پیغمبر علیہ السلام کی ذات بابرکات انعام خداوندی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک بھی اللہ تعالیٰ کا بہت بڑا انعام ہے مگر افسوس کہ مسلمانوں نے اس نعمت کی بھی قدر نہیں کی۔ آپ ہر خطبہ میں سنتے ہیں حَيْذُ الْكَلَامِ كَلَامُ اللَّهِ تمام کلاموں میں اللہ تعالیٰ کا کلام ہے وَحَيْثُ الْهَدْيِ هَدْيُ مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہ علیہ وسلم اور بہترین طریقہ حضور علیہ السلام کا طریقہ ہے۔ مگر آج کو ن بے۔ جو ان دونوں انعامات سے مستفیض ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ یہ دونوں چیزیں ہمارے لیے راہ ہدایت ہیں۔ بلکہ جب کسی خوشی غمی، قومی و ملکی، سیاسی و معاشرتی معاملات میں راہنمائی کی ضرورت پیش آتی ہے، تو ان سے راہنمائی حاصل کرنے کی بجائے رسم و رواج کا سہارا لیتے ہیں۔ یا دوسرے غیر اسلام انہماک کی طرف دیکھتے ہیں۔ کیا یہ انعامات کی ناقدری نہیں۔

گزشتہ چوبیس سال میں ہمارے پاس صرف ایک آدمی آیا ہے جس نے طلاق کے مسئلہ میں صحیح راستہ تلاش کرنے کی کوشش کی ہے کہنے لگا کہ ہمارے بچے اور بیوی میں تنازعہ ہے۔ دو سال سے مصاحبت کی کوشش کر رہے ہیں مگر کامیابی کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ فوجیت طلاق تک پہنچ چکی ہے۔ لہذا آپ ہمیں طلاق کا شرعی طریقہ بتائیں تاکہ ہم عنہ اللہ ماخوذ نہ ہوں۔ اس ایک کیس کے علاوہ ہمیشہ یوں ہوا ہے۔ کہ از خود تین طلاقیں دے دیں اس کے بعد جب ملامت

ہوئی تو ہمارے پاس آگئے کہ جلد ہی میں طلاق دیدی ہے۔ اب کوئی ایسا طریقہ بتائیں جس سے مطلقہ دوبارہ حلال ہو جائے۔ اللہ کے بندو! بغیر سوچے سمجھے، بغیر مسئلہ دریافت کیے ایسا کام کیوں کرتے ہو، جس سے خود تمہیں تکلیف ہو، اور جو تمہارے والدین اور پورے خاندان کے لیے باعثِ اذیت ہو چاروں مذاہب میں تیسری طلاق کے بعد بیوی حرام ہو جاتی ہے۔ اگر زبردستی حلال کرنے کی کوشش کرو گے، تو حلال نہیں ہوگی۔ اولاد بھی مشکوک اور حرام ہوگی۔ پھر جا کر شیعوں اور اہل حدیثوں سے مسئلہ دریافت کرتے ہیں کہ کسی طرح حلت کا فتویٰ مل جائے۔ یہ سب انعاماتِ خداوندی کی ناقدری ہے۔ اس نعمت کو ہر وقت استعمال کرنا چاہیے۔ اور شیطان کے نقش قدم پر نہیں چلنا چاہیے۔ جس قوم کے پاس قرآن و حدیث جیسی نعمت موجود ہو، اُسے کس چیز کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ کبھی امرِ بیکہ کی طرف دوڑتے ہیں کبھی برطانیہ اور فرانس کی طرف دیکھتے ہیں کہ ہمیں یکم دور کوئی ایڈوائزر بھیجو۔ جو ہماری راہنمائی کرے یہ کس قدر کفرانِ نعمت کی بات ہے فکر اور عقیدہ فاسد ہے۔ جس کی وجہ سے راہِ راست میسر نہیں آ رہا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جو کوئی اللہ تعالیٰ کی نعمت کو تبدیل کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ اس کو سخت سزا دینے والا ہے۔ اس کی نعمتوں سے روگردانی کر کے، قرآن و سنت کا دامن چھوڑ کر عزت کہاں نصیب ہو سکتی ہے۔ ایسی صورت میں تو عذاب و سزا کے لیے تیار رہنا چاہیے۔ اپنے ارد گرد نظر مار کر دیکھ لیں، کوئی قوم تسلط کے چھن جانے کے عذاب میں مبتلا ہے کہیں بدعات اور رسوم باطلہ کا دور دورہ ہے۔ محتاجی ہے۔ دین مجبوس ہو گیا ہے۔ نیکی سے محرومی ہے۔ بدی کا چرچا ہے۔ یہ سب اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کی ناقدری کی سزا ہے۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا، جس بادیر میں جس کنویں پر تین آدمی موجود ہوں اور وہ نماز باجماعت ادا نہ کریں۔ اس کو خود علیہ السلام الشیطان ان پر شیطان قابو پالیتا ہے۔ مقصد یہ کہ جب بھی کوئی قوم اسلام کے خلاف چلے گی، اُس پر شیطان قابو پائے گا۔ اور یہی عذاب ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے انعامات کی قدر کرنا چاہیے۔ بنی اسرائیل نے ان

نعمتوں کی قدر نہ کی معجزات کو ٹھکرایا نتیجہ یہ نکلا کہ اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آئے اپنی سازشی، تخریبی اور گندی ذہنیت کی بنیاد پر بدترین قوم بن کر رہ گئے۔ اسی طرح جو بھی قوم اللہ تعالیٰ کے انعامات کی ناقدری کریگی ذلیل و خوار ہوگی۔ اللہ تعالیٰ نے آخری نبی کو مبعوث فرمایا۔ آپ کے ساتھ ایک معیاری جماعت کو پیدا کیا، خلفائے راشدینؓ اور دیگر صحابہ کرامؓ آنے والی نسلوں کے لیے نمونہ تھے۔ ان کی پیروی کرنے والے دنیا اور آخرت میں سرخرو ہوئے۔ دنیا میں عروج حاصل ہوا فتوحات نصیب ہوئیں اور آخرت میں بھی بہترین اجر و ثواب کے مستحق ہوئے۔

حُبِّ دُنْیَا

اس کے بعد دنیا کی حقیقت کو واضح فرمایا۔ کہ کفار کے نزدیک دنیا کی کیشیت ہے۔ اور اہل ایمان کی حالت دنیا میں کیا ہے۔ اور آخرت میں ان کے لیے کون سے انعامات تیار کیے گئے ہیں۔ فرمایا زَيْنَ لِلَّذِينَ كَفَرُوا الْحَيٰوةُ الدُّنْيَا جن لوگوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا، ان کے لیے دنیا کی زندگی مزیں کی گئی ہے۔ اور یہی وہ چیز ہے جو سارے شر و فساد کی جڑ ہے۔ جب کوئی شخص دنیا کی محبت میں اس قدر غرق ہو جائے کہ صرف اسی کو اپنا مقصد حیات بنائے تو پھر طرح طرح کی خرابیاں پیدا ہونے لگتی ہیں۔ دوسروں کی حق تلفی، قتل و غارت، عیش و عشرت یہ سب دنیا سے غیر معمولی محبت کا ثمرہ ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ حُبُّ الدُّنْيَا رَأْسُ كُلِّ خَطِيئَةٍ دُنْيَا کی محبت ہر برائی کی جڑ ہے۔ محبت سے مراد ایسی محبت ہے۔ جس سے آخرت بھی فراموش ہو جائے۔ دین ختم ہو جائے عبادت رہ جائے خدا پرستی کے طور طریقے ناپید ہو جائیں، اور حالت یہ ہو جائے کہ يَعْلَمُونَ ظَاهِرًا مِّنَ الْحَيٰوةِ الدُّنْيَا وہ دنیا کی تمام ظاہری چیزوں کو جانتے ہیں وَهُمْ عَنِ الْآخِرَةِ غٰفِلُونَ مگر آخرت کے بارے میں بالکل غافل ہیں، کچھ نہیں جانتے بظاہر بڑے عقل و دانش کے مالک ہیں مگر معاد کے متعلق ذرہ بھر بصیرت نہیں رکھتے۔ اسی کا نام گمراہی ہے انسان جس قدر دنیوی محبت میں گرفتار ہوگا نیکی سے دور ہوتا چلا جائے گا۔ اسی کے متعلق فرمایا کہ کافروں کے لیے دنیا کی زندگی کو مزیں

کیا گیا ہے۔

فرمایا جو لوگ دنیا کی زندگی کو پسند کرتے ہیں۔ اُن کی ایک قبیح حرکت یہ ہے۔ کہ
 وَلَيَسْخَرُونَ مِنَ الَّذِينَ آمَنُوا وَهَلْ يَمُنُ إِلَّا أَمَانٌ عَرَفَ اٰیْمَانِ اٰیْمَانِ
 والوں کی ظاہری کمزوری، اُن کا فقر و فاقہ دنیا داروں کے لیے محض طعن بن جانا ہے اُن
 پر آوازے کستے ہیں۔ دوسری جگہ فرمایا وَ اِذَا مَكَرُوْا فَلْيَنْصَرِفْ عَنْهُمْ يَتَغَامَسُ زُنُوْنٌ
 کافر لوگ غریب مسلمانوں کو دیکھ کر اِشائے کرتے ہیں کہ دیکھو یہ جنت کے وارث جا
 ہے ہیں۔ پھٹے پڑنے کی طرح اُنہیں زمین نہ باغات، نہ ہنسنے کو مکان، مگر دعویٰ جنت
 کا ہے۔ ظاہر ہے کہ جن کے دل میں محض دنیا کی محبت گھر کھچی ہے۔ اُن کے
 لیے دنیا کے لوازمات اور آسائش ہی معیار ہے۔ اُن کے نزدیک ایسا شخص حقیر
 ہے جس کے پاس دنیا کا مال و دولت نہیں ہے اور اس ساری خبرانی کی بنیادی
 وجہ یہی ہے۔

فرمایا اہل دنیا کے برخلاف وَالَّذِيْنَ اتَّقَوْا جُورُ لُوكِ اٰہلِ تَقْوٰی اٰہلِ تَقْوٰی
 سے بے رغبت اور آخرت پر نظر رکھتے ہیں۔ فَوْقَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ
 وہ قیامت کے دن اہل دنیا سے بلند تر درجات پر فائز ہوں گے۔ تقویٰ۔ کفر
 شرک اور معصیت سے پرہیز گاری کا نام ہے یعنی اتَّقُوا عَنِ الشِّرْكِ وَالْكَفْرِ
 وَالنِّفَاقِ وَالْعِصْيَانِ غرضیکہ عقائد و اعمال کی ہر بُرائی سے بچ جانا ہی تقویٰ ہے
 شیخ عبدالقادر جیلانیؒ آیت پاک "اِنَّ اللّٰهَ يَ اْهْرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ"
 کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ متقی وہ لوگ ہیں جو عدل و انصاف پر قائم ہیں۔ اور جو لوگ
 ظالم ہیں، عدل و انصاف سے عاری ہیں۔ وہ متقی نہیں ہو سکتے۔

الغرض! فرمایا کہ دنیا میں تو یہ لوگ اہل ایمان سے ٹھٹھا کرتے ہیں مگر قیامت
 کے دن اہل ایمان ان سے بالا ہوں گے۔ حضرت علیؑ کی روایت میں آتا ہے۔ کہ
 جو شخص کسی مومن سے اُس کی ناداری کی بنا پر ٹھٹھا کرے گا تو اللہ تعالیٰ قیامت
 کے دن ایسے شخص کو تمام اولین اور آخرین کے سامنے ذلیل و رسوا کرے گا جو کوئی

شخص کسی مومن پر ایسا عیب لگاتا ہے۔ جو اس میں نہیں پایا جاتا، تو قیامت کے روز عیب لگانے والے کو آگ کے ٹیلے پر کھڑا کیا جائیگا اور کہا جائے گا کہ سب سے خود اپنی تکذیب کرو۔ میں نے اس پر جھوٹ کہا تھا۔ درحقیقت اس مرد مومن میں یہ عیب نہیں پایا جاتا تھا۔ آج تو یہ لوگ طرح طرح کے مذاق کرتے ہیں، عیب جوئی کرتے ہیں اور بہتان لگاتے ہیں۔ مگر انہیں قیامت کے دن پتہ چلے گا۔ جب دنیوی زندگی میں کمزور ناتواں مومن ان پر حاوی ہوں گے اور بلند مراتب پر فائز ہوں گے۔ یہ مہتمم انہیں تقویٰ کی وجہ سے حاصل ہوگا۔

قرآن پاک میں متقین کا ذکر بار بار ہے۔ جیسے ھُذٰی لَئِنْ مَتَّقْتُمْ سُوْرَةَ بَقَرہ کی ابتداء میں ہے۔ کہ یہ قرآن پاک، یہ ہدایت متقینوں کے لیے ہے۔ دوسری جگہ فرمایا اُولٰٓئِكَ الَّذِیْنَ صَدَقُوْا وَاُولٰٓئِكَ ھُمْ الْمُتَّقُوْنَ یعنی جن لوگوں کا ایمان اعمال، اور اخلاق اچھا ہے۔ جن میں تہذیب نفس پایا جاتا ہے، وہی لوگ سچے ہیں اور ایسے ہی لوگ متقی ہیں۔ دوسری بات یہ کہ دنیا میں اگر ظاہری اسباب کے لحاظ سے کوئی شخص نادار اور کمزور ہے تو اس کو حقیر نہیں سمجھنا چاہیے۔ کیونکہ ہر کار دولت مندی اور ناداری نہیں، بلکہ ایمان، تقویٰ اور نیکی ہے۔ کیونکہ اِنْ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰیہُمْ اللّٰہ کے نزدیک قدر و منزلت کا معیار تقویٰ ہے۔ ایک مزدور بڑی محنت و مشقت سے اپنی روزی کھاتا ہے۔ اس کا عقیدہ بھی درست ہے۔ فرائض کو ادا کرتا ہے، تو ایک بڑے سے بڑا دولت مند اس کے خاک پا کے برابر بھی نہیں۔ چہ جائیکہ ایک مالدار ایک مزدور کو حقیر سمجھے۔ یہ تو باعث لعنت ہے ایسا شخص عذاب کا مستحق ہے۔

فرمایا واللّٰہُ یَذْرِقُ مَنْ یَّشَآءُ بِغَیْرِ حِسَابٍ اللّٰہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے بغیر حساب کے رزق دیتا ہے۔ مقصد یہ ہے کہ رزق کی فراوانی اللّٰہ تعالیٰ کے مقرب ہونے کی دلیل نہیں۔ اور نہ ہی یہ اللّٰہ کی رضا کا معیار ہے۔ رزق کا بہت و کثاد مالک الملک کی مصلحت پر موقوف ہے۔ اللّٰہُ یَبْسُطُ الرِّزْقَ

رزق کی فراوانی

مگر اس کو معبود بنا کر اس کی پرستش شروع کر دینا۔ اور اس کی وجہ سے فرائض اور
 امور آخرت سے غافل ہو جانا یا عیش و بال ہے۔

سَيَقُولُ ۲

درس ہفتاد و نعت (۸۷)

الْبَقَّةُ ۲

آیت ۲۱۳

كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِينَ مُبَشِّرِينَ
وَمُنْذِرِينَ ۖ وَانزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لِيَحْكُمَ
بَيْنَ النَّاسِ فِي مَا اخْتَلَفُوا فِيهِ ۚ وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ
إِلَّا الَّذِينَ أُوتُوهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَ تَهُمُ الْبَيِّنَاتُ بَغْيًا
أَبَيْنَهُمْ ۚ فَهَدَى اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ
مِنَ الْحَقِّ بِإِذْنِهِ ۚ وَاللَّهُ يَهْدِي مَنْ يَشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ
مُسْتَقِيمٍ ﴿۲۱۳﴾

ترجمہ: سب لوگ ایک ہی امت (دین ملت) پر تھے۔ پس اللہ تعالیٰ نے نبی بھیجے۔
خوشخبری مانے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان نبیوں کے ساتھ سچی کتاب اتاری تاکہ
وہ لوگوں کے درمیان اُس بات میں فیصلہ کریں، جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ اور
نہیں اختلاف کیا اس میں مگر ان لوگوں نے جنہیں کتاب دی گئی بعد اس کے کہ ان کے
پاس واضح باتیں اچکی تھیں (یہ اختلاف کیا انہوں نے) آپس میں سرکشی کرتے ہوئے۔
پس اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کو ہدایت دی اپنے حکم سے جو ایمان لائے اُس بات میں
جس میں وہ اختلاف کرتے تھے حق سے، اور اللہ تعالیٰ جس کو چاہے سیدھے راستے

کی ہدایت دیتا ہے ﴿۲۱۳﴾

گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے تنبیہ فرمائی تھی، کہ جو شخص نعمت الہی کے حصول کے
بعد اسکی تکذیب کرتا ہے، وہ سزا کا مستحق ہوتا ہے۔ اللہ جل جلالہ نے بنی اسرائیل
کا بطور مثال ذکر فرمایا کہ ہم نے انہیں بہت سی نعمتوں سے نوازا مگر اس قوم نے

شاہکار گزاری کی اور طرح طرح کی مصیبتوں میں گرفتار ہوئی۔ گویا اللہ تعالیٰ کی ناراضگی کا سبب بنی گذشتہ درس میں یہ بھی بیان ہو چکا ہے۔ کہ فتنہ و فساد کی اصل جڑ طعنت، دنیا ہے۔ دنیا کی محبت میں گرفتار کفار اہل ایمان سے ٹھٹھا کرتے ہیں اور ان کو حقیر جانتے ہیں۔ حالانکہ کامیابی کا اصل دار و مدار مال و دولت پر نہیں بلکہ تقویٰ و پرہیزگاری پر ہے۔ اہل تقویٰ قیامت کے دن اہل دنیا پر برتری حاصل کر لیں گے۔

امتِ عالم

آیتِ زیرہ درس میں اللہ تعالیٰ نے دین و ملت کی وحدت کا تذکرہ فرمایا ہے ارشاد ہوتا ہے **كَانَ النَّاسُ أُمَّةً وَاحِدَةً** سب لوگ ایک ہی ملت پر تھے۔ ملت اُس جماعت کو کہتے ہیں جس کے افراد کے افکار و خیالات ایک جیسے ہوں۔ ملت حق بھی ہوتی ہے اور ملت باطل بھی۔ مگر اس آیت میں جس ملت کا ذکر ہو رہا ہے اُس سے مراد ملت حق ہے۔

تمام لوگ ایک ہی ملت پر کب تھے۔ اس کے متعلق مختلف اقوال ہیں۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا تعلق عالمِ اربعہ سے ہے۔ جب اللہ تعالیٰ نے تمام ارواح کو حاضر کمر کے اُن سے سوال کیا تھا۔ **أَلَسْتُ بِرَبِّكَ** کیا میں تمہارا رب نہیں ہوں؟ تو سب نے یک زبان ہو کر کہا تھا۔ **قَالُوا بَلَىٰ** اے مولا کریم! کیوں نہیں، تو ہی ہمارا رب ہے۔ اُس وقت تمام لوگ امتِ واحدہ تھے یعنی ایک ہی ملت پر قائم تھے۔ اس قسم کے اشارات سورۃ اعراف اور بعض دوسری سورتوں میں بھی ملتے ہیں مقصد یہ کہ اُس وقت تمام روحوں نے ملتِ واحدہ پر ہونے کا اقرار کیا تھا تو اس دنیا میں اس سے انکار کی کیا وجہ ہے۔ یہ تو بڑی نا انصافی کی بات ہے۔

اس ضمن میں مشہور تہ تشریح جو اکثر مفسرین کرام نے بیان فرمائی ہے۔ وہ یہ ہے کہ ملتِ واحدہ کا زمانہ حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ابراہیم علیہ السلام تک کا ہے اس عرصہ میں تمام لوگ ایک ہی امت تھے اور وہ ملتِ واحدہ پر قائم تھے۔ اُن کا دین بعینہ وہی تھا جو حضرت آدم علیہ السلام کا تھا۔ ان میں کوئی اختلاف نہ تھا۔ اس کے بعد اختلافات پیدا ہونے لگے اور حضرت نوح علیہ السلام کے زمانے تک ان کا دائرہ

بہت وسیع ہو گیا۔ یہی وجہ ہے کہ آپ کے زمانے میں لوگوں کی وسیع پیمانے پر تطہیر ہوئی ان کی اکثریت ہلاک ہوئی اور صرف گنتی کے وہ افراد بچ گئے جو دینِ حق پر قائم تھے۔ کہ کشتی میں سوار ہو کر نچ جانے والوں میں حضرت نوح علیہ السلام کی بیوی اور بیٹا تک شامل نہیں تھے، کیونکہ وہ دینِ حق سے روگردانی کر چکے تھے۔ کشتی کے ذریعے ہلاکت سے محفوظ رہنے والے لوگ کافی عرصہ تک دینِ توحید اور ایمان خالص پر کاربند رہے۔ حتیٰ کہ ایک زمانہ ایسا آیا، جب اختلاف، نے پھر زور پکڑ لیا اور امت میں غلط مطلق عقیدے پیدا ہو گئے۔ بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ امتِ واحدہ کا زمانہ حضرت اسماعیل علیہ السلام کے بعد کا زمانہ ہے۔ آپ کے بعد کوئی چھ ہزار سال تک لوگ حضرت ابراہیم اور حضرت اسماعیل علیہما السلام کے سچے دین پر قائم رہے۔ تا آنکہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت مبارکہ سے تقریباً ساڑھے چار سو سال پہلے عمر و بن لُحی جسے عمر و ابنِ قَیمَہ بھی کہتے ہیں۔ اُس نے عربوں میں بت پرستی کو رواج دیا۔ اس کے بعد چند صدیوں میں بت پرستی کو اس قدر عروج حاصل ہوا کہ اللہ کا پاک گھر بیت اللہ شریف بھی اس سے محفوظ نہ رہ سکا جب نبی کریم نے مکہ کو فتح کیا۔ تو اس پاک گھر کو بتوں سے پاک کیا۔ اور پھر حضور علیہ السلام کی حیات مبارکہ ہی میں عرب کا ہر حصہ کفر و شرک کی نجاست سے پاک ہو گیا۔ یہ سب تفسیریں ملتی ہیں مگر زیادہ مشہور تفسیر وہ ہے۔ جس میں حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضرت ادریس علیہ السلام تک کا زمانہ بیان کیا جاتا ہے۔

امتِ واحدہ کے تذکرے کے بعد فرمایا فَبَعَثَ اللَّهُ النَّبِيِّينَ پس اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ اب آیت کے ان دونوں حصوں کا ترجمہ یوں ہو گا کہ تمام لوگ ایک ہی ملت پر تھے، پھر اللہ نے انبیاء کو مبعوث فرمایا۔ یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے۔ کہ ملت کا دینِ حق پر کاربند ہونا بعثت کی علت نہیں بنتا۔ اس سلسلہ میں مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ کہ آیت کے ان دو جملوں کے درمیان لفظ فَاخْتَلَفُوا محذوف ہے اس لفظ کو درمیان میں لانے سے اشکال دور ہو جائے گا کیونکہ اب پورا جملہ اس طرح ہو گا۔ کہ سب لوگ ایک ہی دینِ حق پر تھے۔ پھر ان میں اختلاف پیدا ہوا، تو اللہ تعالیٰ

نے انبیاء کو وقتاً فوقتاً مبعوث فرمایا۔ جب لوگ اختلاف کی بنا پر دین سے ہٹ جاتے تھے تو اصل دین کی تائید ہی کے لیے انبیاء کو بھیجا گیا۔ وہ لوگوں کو بتاتے تھے کہ تم اصل دین سے ہٹ چکے ہو، صحیح راستہ یہ ہے، اس کی طرف آؤ۔ اس بات کی مزید وضاحت سورۃ انبیاء میں موجود ہے۔ اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء علیہم السلام سے فرمایا اِنَّ هٰذِهِ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً وَاَنَا رَبُّكُمْ اے محمد وہ انبیاء تم سب کی ایک ہی جماعت ہو جو سچا دین بتلانے والی ہے۔ اور میں تم سب کا رب ہوں۔ شبِ معراج میں جب بنی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمام انبیاء سے دریافت فرمایا کہ آپ کی بعثت کا مقصد کیا ہے۔ تو سب نے یہی جواب دیا۔ بُعِثْنَا بِالْتَّوْحِيدِ ہمیں توحید کی اشاعت کے لیے بھیجا گیا ہے تاکہ لوگوں کی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کر سکیں۔

فرمایا ان تمام انبیاء کی ایک صفت یہ ہے مَبَشِّرٌ لِّرَبِّهِمْ بِمَبَشَرَاتٍ ہیں۔ ایمان اور نیکی کا راستہ اختیار کرنے والوں کو جنت کی خوش خبری دیتے ہیں۔ انہیں بتاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں تم اعلیٰ مقام پر فائز کیسے جاؤ گے۔ خدا تعالیٰ تم پر راضی ہو گا اور پھر ہمیشہ ہمیشہ کے لیے آرام و سکون حاصل ہو جائے گا۔ برخلاف اس کے جو لوگ کفر و شرک اور حصیت کا راستہ پکڑیں گے۔ ان کے لیے یہی پیغمبر مُنذِرین ہیں ان کو اللہ تعالیٰ کی ناراضگی اور اس کے دوزخ کے عذاب سے ڈراتے ہیں سورۃ مدثر میں اللہ تعالیٰ نے یہی حکم حضور خاتم النبیین کو دیا قُمْ فَانذِرْ، آپ کھڑے ہو جائیں اور ان کفار و مشرکین کو ان کے برے انجام سے ڈرائیں۔ ان کو اچھی طرح خبردار کر دیں تاکہ کل کو یہ عذرِ شش نہ کر سکیں کہ ہمارے پاس کوئی بشر یا نذیر نہیں آیا۔ بلکہ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کو بھیج کر یہ حجت پوری کر دی ہے۔ لَوْلَا يَكُونُ لِلنَّاسِ عَلَى اللَّهِ حُجَّةٌ بَعْدَ الرُّسُلِ انبیاء کے آنے کے بعد یہ عذر باقی نہیں رہا کہ ہمارے پاس کوئی خوشخبری دینے والا اور ڈرانے والا نہیں آیا۔ بنی کافر حق منصبی ہی رہے۔ کہ وہ اللہ تعالیٰ کے احکام امت تک پہنچا دے۔ علمِ عقائد والوں نے نبی کی تعریف یوں کی ہے۔

هو انسان بعثه الله لتبليغ ما اوحاه الله اليه۔ یعنی نبی ایک انسان

ہوتا ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ شرعی احکام کی تبلیغ کے لیے مبعوث فرماتا ہے۔ مطلب یہ کہ چونکہ تبلیغ انسانوں کو کرنا مقصود ہوتی ہے۔ لہذا نبی بھی انسانوں میں سے بھیجا جاتا ہے کوئی فرشتہ یا کسی دوسری نوع سے نہیں ہوتا۔ تاہم نبی کا یہ بہت بڑا اعزاز ہے کہ اللہ تعالیٰ نزول وحی کے لیے اُسے منتخب فرماتا ہے۔ بنی معصوم عن الخطای علی خطاؤں سے پاک ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ خود اس کی حفاظت کرتا ہے۔

فرمایا انبیاء کی بعثت کے علاوہ وَأَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتَابَ بِالْحَقِّ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُونَ کتب کا وہ سچی کتاب بھی نازل فرمائی۔ اہم شافعی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے کم و بیش ایک لاکھ چوبیس ہزار نبی اور پیغمبر بھیجے اور ایک سو چار کتابیں نازل فرمائیں۔ ان میں چار بڑی کتابیں ہیں۔ زبور، تورات، انجیل، اور قرآن پاک اور ایک سو چھوٹے چھوٹے صحیفے ہیں جو مختلف انبیاء میں نازل ہوئے۔ تاہم تمام کتب سماویہ کا موضوع ایک ہی تھا یعنی سچے دین کی تبلیغ اور لوگوں کو ان کی غلطیوں پر آگاہ کرنا۔ جیسے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام پر تورات انارمی اور پھر آپ کے پیچھے آنے والے کئی ہزار پیغمبر اس کی تبلیغ و تبلیغ کرتے رہے۔ انبیاء کے ساتھ کتابوں کے نزول کی وجہ یہ ہے کہ نبی تو انسان ہوتا ہے، جسے دوام حاصل نہیں۔ لہذا جب نبی اپنا کام ختم کر کے اس دنیا سے رخصت ہو جاتا ہے تو اس کے بعد اس کی لائی ہوئی کتاب آنے والی نسلوں کی رہنمائی کرتی رہتی ہے۔ نبی کا لایا ہوا علم اور اس کی شریعت کتاب کی صورت میں موجود رہتا ہے۔

فرمایا انبیاء کے ساتھ کتابیں نازل کرنے کا مقصد یہ ہے لِيُخَوِّدَكُمْ بَيْنَ النَّاسِ فِيمَا اخْتَفَوْا فِيهِ تاکہ وہ لوگوں کے درمیان اُس بات کا فیصلہ کریں جس میں وہ اختلاف کرتے ہیں۔ دیگر کتب سماویہ کی طرح قرآن پاک کے نزول کا مقصد بھی یہی بیان کیا گیا ہے۔ لِيُخَوِّدَكُمْ بَيْنَ النَّاسِ بَعْدَ ذَلِكَ اللَّهُ جَوَازِ اللہ تعالیٰ نے آپ کو سمجھائی ہے اس کے مطابق فیصلہ کریں۔ گویا نبی کتاب کے ذریعے اللہ کی وحی کے مطابق فیصلہ کرتا ہے۔

آگے اس امر کی وضاحت کی جا رہی ہے۔ کہ اہل کتاب میں اختلاف کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں ہوا تھا۔ بلکہ یہ احکام الہی سے بغاوت اور سرکشی کی وجہ سے تھا۔ ارشاد ہوتا ہے وَمَا اخْتَلَفَ فِيهِ اُولَٰئِكَ الَّذِينَ اَوَّلَتْهُ مِنْ بَعْدِ مَا جَاءَهُمْ مِنَ الْبَيِّنَاتِ بَغْيًا بَيْنَهُمْ۔ اور اس میں صرف انہی لوگوں نے اختلاف کیا جنہیں کتاب دی گئی اور ان کے پاس واضح نشانات آپکے تھے اور پھر وہ آپس میں سرکشی کرتے ہوئے۔

آئندہ یہ اختلاف ہوئے اور اس کی وجہ ان کی خود غرضی، ضد اور حسد تھا۔ جیسا کہ یہود کے متعلق پہلے بھی آچکا ہے۔ يَخْرِفُونَ كَمَا يَخْرِفُونَ اَبْنَاءُ هُمْ یہ لوگ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کو اپنی اولاد کی طرح پہچانتے تھے۔ مگر آپ سے اختلاف کی وجہ حَسَدٌ مِّنْ عِنْدِ اَنْفُسِهِمْ شخص حسد تھا کہ نبوت بنو اسماعیل میں کیوں منتقل ہو گئی ہے۔ یہ لوگ اپنی برتری کو قائم و دائم دیکھنا چاہتے تھے اور کسی صورت اقتدار کو ہاتھ نہ دینا چاہتے تھے۔ مگر یہ تو مشیت ایزدی تھی۔ کہ ختم نبوت کا تاج حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کے سر پر رکھا گیا۔

حدیث شریف میں موجود ہے کہ قیصر روم نے زبان سے اقرار کیا تھا کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اللہ کے آخری نبی ہیں جن کا ذکر سابق کتابوں میں موجود ہے مگر وہ ایمان کی دولت سے محض اس لیے محروم رہا۔ کہ اس کی زد اس کے جاہ و مال اور حکومت و اقتدار پر پڑتی تھی۔ ایمان لا کر وہ اپنی بادشاہت اور مطلق العنانی کو قائم نہیں رکھ سکتا تھا۔ لہذا وہ کفر پر اڑا رہا۔ مقصد یہ کہ حق سے اختلاف کی وجہ اکثر و بیشتر حسد، بغض، عناد، خود غرضی وغیرہ ہی ہوتی ہے۔ اگرچہ بعض اوقات غلط فہمی کی بنا پر بھی ایسا ہو سکتا ہے۔ مگر یہ شاذ و نادر ہی ہوتا ہے۔ اصل وجہ اختلاف وہی ہے جس کی نشاندہی کر دی گئی ہے۔ اس ضمن میں یہود و نصاریٰ کی واضح مثالیں موجود ہیں۔

کفر و شرک، بغض و حسد، اور حسد مال و جاہ کے اندھیروں میں کیسے کیسے شمع ہدایت بھی نظر آتی ہے۔ اور یہ مالک الملک کا خاص کرم ہوتا ہے فَهَذَا الَّذِي اَلَّذِينَ اٰمَنُوا لِمَا اخْتَلَفُوا فِيهِ مِنَ الْحَقِّ بِادْنَاهُ اٰمَنُوا اَللّٰهُ

اہل ایمان کو اپنے حکم سے حق سے مختلف فیہ امور میں ہدایت بخشی۔ اختلافی معاملات میں ہدایت کی تلاش حضور نبی کریم رُوف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم کا ہمیشہ طرہ امتیاز رہا ہے۔ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نوافل کے دوران سجدے کی حالت میں دُعا فرماتے تھے اَللّٰهُمَّ قَابِلُ السَّمَوَاتِ وَالْاَرْضِ مِنَ عَالَمِ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ اَنْتَ تَحْكُمُ بَيْنَ عِبَادِكَ فِيمَا كَانُوا فِيهِ يَخْتَلِفُوْنَ ۝ اِهْدِنِي لِمَا اخْتَلَفَ فِيْهِ مِنَ الْحَقِّ بِاِذْنِكَ اِنَّكَ تَهْدِيْ مَنْ تَشَاءُ اِلَى صِرَاطٍ مُسْتَقِيْمٍ ۝

اے خالق ارض و سما، اے عالم ظاہر و باطن! تو ہی مختلف فیہ امور میں اپنے بندوں کے درمیان فیصلہ کرتا ہے۔ حق سے اختلافی معاملات میں اپنے حکم سے میری راہنمائی فرما۔ تو جسے چاہتا ہے، راہِ راست کی طرف راہنمائی فرماتا ہے۔ ایک دُعا میں یہ الفاظ بھی منقول ہیں اَللّٰهُمَّ اَرِنَا الْحَقَّ حَقًّا ۝ اے اللہ! ہمیں حق بات سچ کر کے دکھا اور اس کا اتہاع بھی نصیب فرما۔ وَالْبَاطِلَ لِيْ بَاطِلٌ ۝ اور باطل کو باطل کی صورت میں ہی دکھا۔ وَاَنْزِلْ رُفْقًا رَّجُوًّا ۝ اور جیسے اس سے اجتناب کرنے کی توفیق بھی عطا کر۔ وَلَا تَجْعَلْهُ مُلْتَبِسًا ۝ اور اُسے خطا طعن بنا کر کہیں ہمارے لیے حق و باطل کی تمیز ہی نہ اُٹھ جائے۔

حضرت مولانا شیخ الہندؒ نے یہاں پر بڑا عمدہ نوٹ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ حضرت آدم علیہ السلام کے بعد ایک مدت تک ایک ہی سچا دین یعنی دینِ توحید قائم رہا۔ اس کے بعد لوگوں نے اس میں اختلاف پیدا کیا تو اللہ تعالیٰ نے انبیاء علیہم السلام کو بھیجا، جو اہل ایمان کو اطاعت اور ثواب کی بشارت دیتے تھے۔ اور اہل کفر و باطل کو عذاب سے ڈراتے تھے۔ اُن انبیاء کے ساتھ کچی کتاب بھی نازل فرمائی تاکہ لوگوں کے درمیان پیدا ہونے والا نزاع دور ہو سکے۔ اہل کتاب یہود و نصاریٰ محض ضد اور حسد کی بنا پر اختلاف کیا۔ حالانکہ وہ حق کو ابھی طرح سمجھتے تھے۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل سے اہل حق کی راہنمائی فرمائی اور انہیں گمراہی اور اختلاف سے بچایا جیسا کہ آپ کی امت کو عہدہ و عمل میں امر حق کی تعلیم فرمائی اور اہل کتاب جیسی لوہڑاؤ

تفریط سے محفوظ رکھا۔

آپ فرماتے ہیں کہ اس آیت مبارکہ سے دو باتیں معلوم ہوئیں۔ پہلی بات یہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے جو متعدد دینی اور کتابیں بھیجیں تو ان کا مقصد لوگوں کو ہر نبی کے علیحدہ علیحدہ فرقہ میں تبدیل کرنا نہیں تھا۔ بلکہ ایک ہی راستہ کی طرف راہنمائی کرنا مقصود رہا ہے جب لوگ اصل دین کو چھوڑ کر گمراہی کی طرف راغب ہوتے۔ تو اللہ تعالیٰ ایک اور نبی اور کتاب بھیج کر اصل راستہ کی پہچان کر دیتا تاکہ لوگ اسی صراطِ مستقیم کی طرف لوٹ آئیں۔ اس کی مثال آپ اس طرح بیان کرتے ہیں کہ انسانی جسم کے لیے صحت فقط ایک چیز ہے مگر بیماریاں لاتعداد ہیں۔ جب کسی انسان کے جسم میں کوئی ایک بیماری پیدا ہوتی ہے۔ تو معالج اُس بیماری کے مطابق دوائی اور پھر تجویز کرتا ہے۔ پھر دوسرا مرض پیدا ہوتا ہے تو اس کے مطابق دوسرا علاج اور پھر تجویز کیا جاتا ہے۔ یہی حال امتوں کا ہے۔ جب کسی قوم میں کوئی روحانی بیماری پیدا ہوتی۔ اللہ تعالیٰ نے پیغمبر اور کتاب بھیج کر اس بیماری کا علاج کیا۔ پھر دوسری بیماری پیدا ہوتی تو اس کے حسبِ حال نبی اور کتاب آئی۔ اور پھر آخر میں نبی آخر الزماں اور آخری کتاب قرآن پاک بھیج کر تمام روحانی بیماریوں کا شافی علاج کر دیا۔ تاکہ لوگ قیامت تک پیدا ہونے والی بیماریوں سے محفوظ رہ سکیں۔

صبرِ امت

حضرت مولانا شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ اس آیت سے دوسری بات یہ معلوم ہوئی۔ کہ اہل حق کو صبر کا دامن نہیں چھوڑنا چاہیے۔ یہ سنت اللہ۔ ابتداء سے جاری ہے۔ کہ ہر نبی اور ہر کتاب آسمانی کی مخالفت بڑے لوگ کرتے ہیں۔ کیونکہ حق کو تسلیم کر لینے کی زد ان ہی کے اقتدار پر پڑتی ہے نبی اور کتاب اللہ کی مخالفت ہمیشہ انہی لوگوں کا شیوہ رہا ہے۔ لہذا اہل ایمان کو تسلی دی گئی ہے۔ کہ ان لوگوں کے ٹھٹھا کرنے، بدسلوکی اور ایذا رسانی سے گھبرائیں نہیں۔ بلکہ صبر و استقامت سے ہر تکلیف کا مقابلہ کرنا چاہیے۔

ہدایت یحییٰ

فرمایا انبیاء علیہم السلام اور کتابوں کو بھیجنے کے باوجود ہدایت اللہ تعالیٰ کے ہاتھ

میں ہے۔ وَاللّٰهُ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ إِلَى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيمٍ وہ جسے چاہتا ہے
 راہِ راست کی طرف راہنمائی فرمادیتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ہدایت اُسی کو نصیب کرتا
 ہے جس کے اندر حصول ہدایت کی طلب اور صلاحیت ہوتی ہے۔ اور جو کوئی ظلم و جفا
 پر اڑا رہتا ہے اسی کے متعلق درجہ مقام پر فرمایا وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ
 ایسے لوگوں کی قسمت میں ہدایت نہیں ہوتی۔ نہر حال لِمَنْ يَّشَاءُ سے واضح ہے
 کہ ہدایت ہر ایک کے حصہ میں نہیں آتی بلکہ اللہ تعالیٰ کی یہ رحمت اہل حق کو ہی حاصل
 ہوتی ہے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ

آیت ۲۱۵ تا ۲۱۴

درس ہشتاد و ہشت (۸۸)

أَوْ حَسِبْتُمْ أَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ
 الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ مَسَّتْهُمُ الْبَأْسَاءُ وَالضَّرَاءُ
 وَزُلْزِلُوا حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى
 نَصُرُ اللَّهُ ۚ أَلَا إِنَّ نَصْرَ اللَّهِ قَرِيبٌ ﴿۲۱۴﴾ يَسْأَلُونَكَ مَاذَا
 يُنفِقُونَ ۚ قُلْ مَا أَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ فَلِلَّهِ وَالَّذِينَ
 وَالْيَتَامَىٰ وَالْمَسْكِينِ وَابْنِ السَّبِيلِ ۚ وَمَا تَفْعَلُوا
 مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ﴿۲۱۵﴾

ترجمہ: کیا تم گمان کرتے ہو کہ تم جنت میں داخل ہو جاؤ گے حالانکہ تمہارے پاس
 پہلے لوگوں کے سے حالات نہیں آئے۔ ان کو سختی اور تکلیف پہنچی اور وہ متزلزل
 کیے گئے، یہاں تک کہ اللہ کے رسول اور اس پر ایمان لانے والے کہنے لگے، اللہ
 کی مدد کب آئے گی۔ فرمایا اگاہ ہو بیشک اللہ کی مدد قریب ہے ﴿۲۱۴﴾ آپ سے
 لوگ پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔ آپ کہہ دیجئے کہ تم جو کچھ بھی مال سے خرچ کرو۔ پس
 والدین کے لیے، قرابت داروں کے لیے یتیموں اور مسکینوں کے لیے اور مسافروں
 کے لیے۔ اور تم جو کچھ بھی بھلائی کرو گے بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جاننے

والا ہے۔ ﴿۲۱۵﴾

گذشتہ آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا کہ ابتداء میں سب لوگ ایک
 ہی مذہب و ملت پر تھے۔ پھر جب انہوں نے دین حق سے اختلاف کیا، تو اللہ تعالیٰ
 نے سچا دین واضح کرنے کے لیے انبیاء علیہم السلام کو مبعوث فرمایا۔ اور یہ اختلاف

گذشتہ سورتہ

کسی غلط فہمی کی بنا پر نہیں تھا۔ بلکہ واضح دلائل آنے کے بعد محض حسد، خود غرضی اور مفاد پرستی کی وجہ سے تھا۔ تاہم اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کی راہ حق کی طرف راہنمائی فرمادی اور اُن پر حق واضح کر دیا۔ کیونکہ صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی اللہ تعالیٰ اپنی مشیت کے جسے چاہتے ہیں کرتے ہیں

اس سے پہلی آیت میں فرمایا تھا کہ کافر لوگ دنیا کی محبت اور غرور کی وجہ سے کمزور و ناتواں مسلمانوں کو استہزاء کا نشانہ بناتے ہیں جس کی وجہ سے انہیں تکلیف پہنچتی ہے۔ ان دونوں آیات کا آیت زیر درس کے ساتھ ربط ہے۔ ان کو ذہن میں رکھتے سے اس آیت کا مفہوم سمجھنے میں آسانی ہوگی۔

مشکلات
کا سامنا

اہل ایمان کو پیش آنے والی مشکلات کی طرف اشارہ کر کے ارشاد ہو رہا ہے
 اَوْ حَسِبْتُمْ اَنْ تَدْخُلُوا الْجَنَّةَ كَمَا تَمْنَوْنَ كُنْتُمْ بِغَيْرِ كُنْهِ كُنْهِ
 اٹھائے اور بغیر کسی تکلیف کے تم جنت میں پہنچ جاؤ گے۔ مسلمانوں کو یاد دہونا چاہیے کہ اُن کو اندرونی اور بیرونی دشمنوں سے واسطہ ہے منافقین ہر حالت میں اُن کے نقصان کے درپے ہیں۔ اُن پر آوازے کئے جاتے ہیں، جہاں تک تکلیف دی جاتی ہے مسلمان فقر و افلاس کے شکار ہیں۔ امراض اور دیگر پریشانیوں میں مبتلا ہیں فرمایا جو کوئی اِن تمام مشکلات کو عبور کر کے اپنے ایمان کو سلامت لے مکھن میں کامیاب ہوگا۔ وہی جنت میں داخلے کا حق دار ہوگا محض کلمہ پڑھ لینے سے کوئی جنت میں داخل نہیں ہوگا، بلکہ اُس پر طرح طرح کی آزمائشیں آئیں گی، جن پر اُسے پورا اتمہ ہوگا۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ تَنْبَلُوكُم بِالْأَشْيَاءِ وَالْخَيْرِ فَتَنْتَهُم خَيْرٌ اَوْ تَرْتَدُّوْنَ عَنْهَا
 ذریعہ تمہیں آزمائیں گے ایک اور مقام پر فرمایا وَلَنْبَلُوكُم بِأَشْيَاءٍ مِّنَ الْخَوْفِ وَالْجُوعِ وَنَقْصٍ مِّنَ الْأَمْوَالِ وَالْأَنْفُسِ وَالشَّمْرِ ۚ تَمْتَلِكُمْ ہر طرح سے آزمائیں گے یعنی خوف، بھوک، جان و مال اور پھلوں میں کمی کر کے آزمائش کریں گے۔ کہ ہمارا بندہ کس حد تک مشکلات کو برداشت کر سکتا ہے۔

حدیث شریفین میں آتا ہے حضور علیہ السلام کا فرمان ہے حَقَّتِ الْجَنَّةُ

بالمعاری یعنی جنت کی باطنی مشکلات ہیں۔ ان کو عبور کر کے ہی کوئی شخص جنت میں پہنچ سکتا ہے۔ **خَفَّتِ النَّارُ بِالشَّهَوَاتِ** جنم کی باطنی خواہشات ہیں۔ خواہشات کی تکمیل کے لیے لوگ دوڑ دوڑ کر ان کی طرف جاتے ہیں۔ اور انہیں عبور کر کے جنم میں داخل ہو جاتے ہیں۔ الغرض اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے لوگو! کیا تم سمجھتے ہو کہ بغیر کسی مشقت کے آسانی کے ساتھ جنت میں مقام حاصل کر لو گے۔ ایسا نہیں ہے۔

سابقہ کی
مشائیں

اس حقیقت کی مزید وضاحت کے لیے اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا ہے -
وَلَمَّا يَأْتِكُمْ مَثَلُ الَّذِينَ خَلَوْا مِنْ قَبْلِكُمْ کیا تم تک پہلے لوگوں کے حالات نہیں پہنچے۔ اگر نہیں پہنچے تو ذرا ان کے حالات معلوم کر لو۔ تاکہ تمہیں پتہ چل جائے کہ مَثَلُهُمُ الْمُبَاسَّاءُ وَالضُّكَّاءُ وَزَلْزَلُوا اُن پر کیسی کیسی سختیاں اور تکلیفیں آئیں اور وہ ہلا دیے گئے۔ ان کو ایسے مصائب کا سامنا کرنا پڑا کہ تم گمان بھی نہیں کر سکتے۔ ان تمام تر دشواریوں کو برداشت کرنے کے بعد وہ جنت کے حقدار ہوئے مثلاً حضرت جناب بن ادرتؓ کی تکالیف کو دیکھو۔ بخاری شریف اور دیگر کتب احادیث میں موجود ہے کہ حضرت جنابؓ نے ان مشکلات کو کس طرح برداشت کیا۔ اور پھر کفار مکہ کی ان سزاؤں سے تنگ آکر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کیا۔ حضور! اَلَا تَدْعُو لَنَا کیا آپ ہمارے لیے دعائیں فرماتے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہمیں ان مصائب سے نجات دلائے حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا افسوس کا مقام ہے۔ کہ تم بے صبری کا مظاہرہ کر رہے ہو۔ حالانکہ تم سے پہلے اہل ایمان بھی گئے ہیں جن کے سروں پر آدھ رکھ کبیر دیا گیا۔ مگر وہ اپنے دین پر قائم رہے۔ پھر ایسے لوگ بھی تھے جنہیں لوہے کے کنگھوں سے نوچ دیا گیا مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ میں تم کو بتلادینا چاہتا ہوں۔ وَاللّٰهِ لَيُتِمَّنَّ هَذَا لَكُمْ اللہ کی قسم یہ معاملہ پورا ہو کر رہے گا۔ تب اسلام کو غلبہ حاصل ہوگا۔ اور پھر امن و امان کا وہ دور دورہ ہوگا۔ کہ ایک عورت صغاعہؓ سے تنہا حضرت محمدؐ کی بیوی ہو گئی۔ مگر اُسے سوائے خدا تعالیٰ کے کسی چیز کا خوف نہیں ہوگا۔ انسان تو گنہگار

کسی بھی طرح کو بھی یہ جرات نہ ہوگی کہ کسی بھی طرح کو کھا جائے۔

بائس آدمی سے مراد سختی ہے۔ اور یہ اندرونی اور بیرونی ہر دو طریقے سے ہو سکتی ہے۔ جیسے تجارت میں نقصان ہو گیا۔ فقر و فاقہ کی نوبت آگئی۔ اس کی تفصیل آگے آئیگی اور ضحاکؒ و جہانمیؒ تکلیف کو کہتے ہیں جیسے بیماری آگئی۔ کوئی حادثہ پیش آگیا نہ لڑنا کا معنی ملائیے گئے ہے۔ یعنی پریشانی کے عالم میں اُن پر لرزہ طاری ہو گیا۔ گجھڑا ہٹ پیدا ہو گئی یا اُن کی عزت نفس کو متزلزل کر دیا گیا، یہ سب آزمائش کی مختلف قسمیں ہیں۔ جن سے پہلے لوگوں کو گزرنا پڑا۔ یہاں تک کہ اللہ کے رسولؐ اور اہل ایمان پکار اٹھے۔ حَتَّى يَقُولَ الرَّسُولُ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ مَتَى نَصُرَ اللَّهُ کہ اللہ کی مدد کب آئیگی۔

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ بشریت کے تقاضے اللہ کے کامل بندوں پر بھی وارد ہوتے ہیں۔ اُن پر بھی دشواریاں آتی ہیں، اُن پر بھی اضطرابی حالت آتی ہے مگر یہ چیز اُن کے مرتبہ کمال کے منافی نہیں ہے۔ بعض اوقات انبار بھی پکار اٹھتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے مدد کب آئیگی۔ تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اعلان ہوتا ہے اَلَا اِنَّ نَصْرَ اللّٰهِ قَرِیْبٌ اے میرے بند و فکر نہ کرو، اللہ کی مدد بالکل قریب ہے اور وہ پہنچنے ہی والی ہے۔ تاہم اہل ایمان کی شان یہ ہے کہ وہ ہر آزمائش میں ثابت قدم ہے۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ صف میں اہل ایمان کو خطاب فرمایا کہ اللہ کے عذاب کے خلاصی حاصل نہ کرنا چاہتے ہو تو تَوَّابُونَ بِاللّٰهِ وَرَسُولِهِ اللہ اور اس کے رسولؐ پر ایمان لاؤ و تَجَاهِدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ بِاَمْوَالِكُمْ وَاَنْفُسِكُمْ اللہ تعالیٰ کی راہ میں مال و جان کے ساتھ جہاد کرو، تو اللہ تعالیٰ تمہیں بہترین نعمتوں والی جنت میں داخل کر دے گا۔ وَاٰخِرُیْ حُجُوْبُهَا اس کے علاوہ تمہاری پسندیدہ ایک اور نعمت عطا کر دے گا، وہ کیا؟ نَصْرٌ مِّنَ اللّٰهِ وَفَتْحٌ قَرِیْبٌ وہ اللہ کی مدد اور قریبی فتح ہوگی، جس سے تم نوازے جاؤ گے۔ غرضیکہ اللہ کی یہی وہ مدد ہے جس کے لیے اللہ کے رسولؐ بھی ہاتھ پھیلا دیتے ہیں اور اللہ کا ارشاد ہوتا

کہ اس کی مدد قریب ہے۔

اشاعت دین

جہاد کی مختلف اقسام میں سے معروف قسم جہاد بانسان یعنی تلوار و تیر کے ساتھ جہاد ہے۔ آج کے زمانہ میں ترقی یافتہ آلات حرب ہندوق، پستول، بم، میزائل، ٹینک توپ وغیرہ اسی قبیل سے ہیں۔ جن کے ذریعے دشمن سے جنگ کی جاتی ہے۔ تاہم جہاد کی ایک نہایت اعلیٰ قسم اشاعت دین ہے۔ جسے ”جَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادٌ كَبِيْرًا“ سے تعبیر کیا گیا ہے۔ کہ ان کے ساتھ بڑا جہاد کرو۔ اور وہ جہاد شیخی کو پھیلا اور بُرائی کو روکنا ہے۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اشاعت دین جیسے اہم فریضہ جہاد پر مامور کیا ہے۔ جس کے لیے میں شب و روز مصروف کار ہوں۔

اشاعت علم دین کی کئی ایک صورتیں ہیں۔ ان میں ایک معروف صورت تالیف و تصنیف ہے۔ ائمہ دین نے اس سلسلہ میں بڑی کوشش اور محنت کی ہے۔ اہم بخاریؒ نے اپنی کتاب صحیح کی تدوین پر سولہ سال صرف کر کے جہاد فی اشاعت علم کا حق ادا کر دیا۔ اہم مسلمؒ نے پندرہ سال کے عرصہ میں ذخیرہ حدیث میں صحیح مسلم کو جمع کیا۔ مفسرین کرام نے قرآن پاک کی تفاسیر لکھ کر جہاد میں حصہ لیا۔ اہم ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ نے اپنے اپنے شعبہ میں دین کی خدمت انجام دی۔ الغرض تبلیغ دین کے کسی بھی شعبہ کو حقیر نہیں جانا چاہیے۔ اشاعت دین کے ہر کارکن کی حوصلہ افزائی ہونی چاہیے اہل ایمان کے لیے تبلیغ دین نہایت اہم فریضہ ہے۔ چنانچہ ارشاد باری تعالیٰ ہے۔ ”كُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَنَهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ“ تم میں ایک جماعت ایسی ہونی چاہیے جو تبلیغ دین کا کام کرے، لوگوں کو نیکی کا حکم کرے اور بُرائی سے روکے خود حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کو حکم ہوتا ہے۔ ”بَلِّغْ مَا أُنْزِلَ إِلَيْكَ مِنْ رَبِّكَ“ اللہ تعالیٰ کی طرف سے نازل کردہ حکم آپ آگے پہنچا دیں۔ ”فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلْ فَمَا يَلْعَنُ رِسَالَتَهُ“ اور اگر آپ نے ایسا نہ کیا، تو سمجھا جائے گا

کہ آپ نے حق رسالت ادا نہیں کیا۔

ساتویں صدی ہجری تک کا زمانہ مسلمانوں کا سنہری زمانہ شمار ہوتا ہے۔ تبلیغ دین، فتوحات، سیاسیات، معاشیات سب کچھ مسلمانوں کے ہاتھ میں رہا۔ علمی کام جس قدر انجام پایا ہے۔ اسی زمانے سے تعلق رکھتا ہے۔ اس عرصہ میں بڑے بڑے محدثین، مفسرین، حفاظ اور فقہ پدید ہوئے۔ جنہوں نے اشاعتِ دین میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اس کے بعد مسلمانوں پر انحطاط کا دور شروع ہو گیا۔ اور اب تک جاری ہے۔ اس عرصہ میں خال خال ہی لوگ پیدا ہوئے ہیں۔ جنہوں نے کما حقہ اشاعتِ دین کا کام کیا۔ لہذا اس زمانے میں اس طرف زیادہ سے زیادہ توجہ کی ضرورت ہے۔

جانی اور
مالی جہاد

جہاد میں مال اور جان دونوں چیزیں لگنا پڑتی ہیں۔ پہلے ذکر آچکا ہے کہ اللہ کے راستے میں جہاد کرو **يَا مَعْزِلُ كُفْرًا وَكَافُؤًا** ہم نیت اصلاح کی ہونی چاہیے۔ آگے اصلاح کے دو پہلو ہیں یعنی اصلاحِ نفس اور اصلاحِ عالم۔ اپنے نفس کی اصلاح اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر انسان خطیۃ القدس کا ممبر بن کر علیت میں نہیں پہنچ سکتا۔ اور اصلاحِ عالم بدیں وجہ لازم ہے کہ اس کے بغیر فتنہ و فساد کو ختم نہیں کیا جاسکتا؟ لہذا یہ دونوں چیزیں ضروری ہیں۔

مال کا ایک بہترین مصرف اشاعتِ اسلام ہے۔ انحطاط کے اس زمانہ میں اہل ثروت اس میں کتنا خرچ کر رہے ہیں۔ اس کام کے لیے جس قدر سرمایہ کی ضرورت ہے۔ اس کا ایک فیصد بھی کہیں نظر نہیں آتا۔ مسلمانوں کی دولت آج عیش پرستی پر خرچ ہو رہی ہے۔ حضور علیہ السلام نے ممانعت فرمائی ہے۔ فرمایا **فَانِزِعْ عِبَادَ اللَّهِ لِيُنْزِلُوا بِالْمُتَعَجِّجِينَ** یعنی اللہ کے بندے عیش پسند نہیں ہو سکتے۔ عیش پرستی تو کفار کا شیوہ ہے۔ مسلمان کی دولت تو امور خیر پر خرچ ہونی چاہیے۔ مگر افسوس کا مقام ہے۔ آج مسلمان عمارات اور ان کی تزئین پر بے دریغ روپیہ صرف کر رہا ہے۔ کھیل تماشے اور لہو و لعب کو اولیت دی جا رہی ہے۔ مگر جہاد کی مدت سے صرف نظر کیا جا رہا ہے۔ اشاعتِ دین کا تھوڑا بہت کام جو

ہو رہا ہے۔ وہ بزرگانِ دین کے غلوں کا نتیجہ ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے اُسے قبول کر لیا ہے۔ ورنہ موجودہ زمانے میں کتنے لوگ ہیں جو اس طرف توجہ نہ دے رہے ہیں اَللّٰہُمَّ شَاءَ اللّٰہ۔

مجاہد ضروری

بعض احادیث سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اللہ کے بعض بندے ایسے بھی ہوں گے، جنہیں بغیر حساب کتاب کے بخش دیا جائے گا۔ تو یہاں پر اشکال پیدا ہوتا ہے کہ ایسی صورت میں آزمائشوں میں پورا اثر ناکس حد تک ضروری رہ جاتا ہے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ مجاہدہ کے بغیر بخشش نہیں ہے۔ البتہ اعلیٰ درجہ حاصل کرنے کے لیے تو مجاہدہ اور بھی ضروری ہے۔ انبیاء علیہم السلام اور ان کے قریب تر سب لوگوں کو امتحانات سے گزرنا پڑا، تب ان کو بلند مراتب حاصل ہوئے۔ مگر کوئی عام مسلمان بھی مجاہدہ سے خالی نہیں ہے۔ کوئی ادنیٰ سے ادنیٰ آدمی بھی جب ایمان لاتا ہے، تو اُسے کم از کم اپنے نفس اور شیطان کے خلاف تو مجاہدہ کرنا ہی پڑتا ہے۔ کیونکہ ایمان کا تقاضا ہے کہ نیکی کی طرف راغب ہو اور بُرائی سے اجتناب کرے۔ اور یہی چیز شیطان پر شانی گزرتی ہے۔ جب شیطان اُس مومن کی نیکی میں آڑے آتا ہے۔ تو اُس کے خلاف جہاد کرنا پڑتا ہے "وَلِكُلِّ دَرَجَةٍ مِّمَّا عَمِلُوا" ہر شخص کے لیے اُس کے عمل کے مطابق درجات ہیں۔ مگر مجاہدہ سے ہر کوئی بھی نہیں محضو علیہ السلام نے فرمایا کہ وضو کرنے اور نماز ادا کرنے کے لیے بھی تکلیف اٹھانا پڑتی ہے، یہی مجاہدہ ہے۔ پھر جتنا بڑا مجاہدہ کوئی کرے گا، اتنا بڑا اعزاز پائے گا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ مومن یہ نہ سمجھیں کہ بغیر آزمائش کے جنت میں چلے جائیں گے حالانکہ پہلے لوگوں کو بڑی بڑی مصیبتیں برداشت کرنا پڑیں تب جا کر وہ جنت کے حقدار ہوں گے۔

خریج کی مدد
۱۱) والدین

یہاں پر دوسرا مسئلہ خریج کی مختلف مدت کے متعلق ہے۔ یہ مسئلہ قرآن پاک میں کئی ایک مقامات پر بیان ہوا ہے۔ اور اپنی نوعیت کے مطابق ایک ہی سوال کے مختلف جوابات دیے گئے ہیں۔ یہاں پر بھی سوال عام نوعیت کا ہے

يَسْأَلُونَكَ مَاذَا يُنفِقُونَ اے نبی علیہ السلام! یہ لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کیا چیز خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ خود ہی اس بات کا جواب دیتے ہیں قُلْ اَبِ سَمِعُوا فَيُحِبُّ، مَا اَنْفَقْتُمْ مِنْ خَيْرٍ تَمَّ جَوْكُكُمْ بَعْدَ اَمْنٍ مَالٍ سَمِعْتُمْ خَيْرًا كَرِهْتُمْ فَلَوْلَ الْبَیِّنِ یہ تمہارے والدین کے لیے ہے۔ خیر کا لفظ نیکی اور بھلائی پر بھی بولا جاتا ہے اور یہاں اس سے مراد مال ہے۔ جیسا دوسری جگہ فرمایا اِنَّهُ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيدٌ انسان مال کی محبت میں بہت سخت ہوتا ہے۔ قرآن و سنت میں والدین کے ساتھ حسن سلوک کی بہت تاکید آئی ہے۔ ترمذی شریف کی روایت میں ہے کہ کسی پوچھنے والے نے پوچھا، یا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم مَنْ اَبَرُّمْ کَسْ کے ساتھ نیکی کروں۔ رحمت العلمین نے فرمایا اُمَّكَ یعنی اپنی ماں کے ساتھ بہتر سلوک کرو۔ سوال کرنے والے نے تین دفعہ دریافت کیا اور آپ نے ہر بار یہی جواب دیا جو تھی دفعہ پوچھنے پر فرمایا اَبَاكَ یعنی اپنے باپ کے ساتھ حسن سلوک کرو۔ مقصد یہ کہ مال خرچ کرنے کے معاملہ میں والدین کو اولیت دو۔ ان کی خدمت کرو۔ وہ سب سے زیادہ مستحق ہیں۔ ہاں یہ بات ذہن میں رہے کہ زکوٰۃ کا مال نہ اولاد والدین پر خرچ کر سکتی ہے۔ اور نہ والدین اولاد کو دے سکتے ہیں۔ یہ مسئلہ الگ ہے۔ اس کے علاوہ جو مال ہے۔ اس کے سب سے زیادہ مستحق والدین ہیں۔ البتہ یہ استحقاق مشروط ہے۔ اگر والدین محتاج ہیں۔ تو پھر ان پر خرچ کرنا فرض ہو جاتا ہے۔ اور اگر وہ خود صاحب مال ہیں۔ تو پھر مالی خدمت فرض نہیں رہتی۔ البتہ ان کی جانی خدمت کرے۔ مٹھی چا پی کے ذریعے الکی کو راحت پہنچائے یا اچھی بات کر کے ان کا دل بہلائے۔ تمام سابقہ شرائع اور خود ہماری شریعت مطہرہ کا قانون یہی ہے کہ بِالْوَالِدَيْنِ اِحْسَانًا والدین کے ساتھ احسان کرو

خرچ کی دوسری مد فرمایا وَالْاَقْرَبٰی قَرَابَتٍ داروں پر خرچ کرو۔ اگر کسی صاحب ثروت آدمی کے قریبی عزیز رشتہ دار امداد کے مستحق ہیں، تو ان کی اعانت کرنا ضروری ہے۔ دوسری جگہ فرمایا وَالْاَقْرَبٰی حَقُّهُ اپنے قریب داروں

کو اُن کا حق ادا کرو۔ اس کا فلسفہ یہ بیان فرمایا اَتَوْهُم مِّنْ مَّالِ اللّٰهِ الَّذِیْ اَنۡكَرُ
جو مال تمہیں اللہ نے عطا کیا ہے۔ اُس میں سے دو۔ اور یہ اسی طرح مختلف ذرائع سے حاصل
ہو آ رہا ہے۔ ایسے کسی کو وراثت میں حصہ مل گیا۔ کسی کو تجارت میں نفع حاصل ہوا، کسی کا
ذریعہ ملازمت بن گیا۔ کسی کو کھیتی باڑی، کسی کو محنت مزدوری کے ذریعے مال حاصل ہوا۔ تو
اللہ تعالیٰ نے مختلف ذرائع سے جو مال تمہیں دیا ہے۔ اس میں سے اپنے قربت داروں
پر خرچ کرو۔ اتفاق مال کی یہ بھی ایک مد ہے۔

(۳)
یتیم و یمسکین

وَالۡیَتِیۡمٰی وَالۡمَسۡکِیۡنِ اُوْرِیۡتُمُوۡہُمۡ مِّنۡ مَّوۡدِعِیۡکُمۡ مِّنۡ دُوۡرِیۡکُمۡ مِّنۡ دُوۡرِیۡکُمۡ مِّنۡ دُوۡرِیۡکُمۡ مِّنۡ دُوۡرِیۡکُمۡ
جس کے سر پر اس کا سر پرست نہ ہو۔ والد فوت ہو جائے ذرائع آمدن نہ ہوں اُن بے سہارا ہو جائے ایسے
فرد کی دیکھری ضروری ہے اور یمسکین وہ ہے جو محنت اور کوشش کے باوجود اپنے ضروری اخراجات
پورے کرنے کے قابل نہ ہو۔ ایسے شخص زکوٰۃ کے حقدار بھی ہیں۔ اِنَّہٗمُ الصَّدَقَتُ
لِلْفُقَرَاۤءِ وَالْمَسۡکِیۡنِ۔ لہذا صدقات و خیرات کا حقدار وہ شخص ہے، جو محنت
مزدوری کرنے کے باوجود اپنے بچوں کی بنیادی ضروریات بھی پوری نہیں کر سکتا۔
وہ پیچھے مناسب لباس اور معقول خوراک سے محروم ہیں۔ اُن کی صحت اور تعلیم کی
ضروریات ہیں۔ سر چھپانے کے لیے انہیں بھی مکان درکار ہے۔ مگر اُن کا سر پرست
یہ ضروریات کما حقہ پوری نہیں کر پاتا۔ اللہ اور اس کے رسول کی قائم کردہ یہی وہ
بنیادی ضروریات ہیں۔ جن کو پیش کرتے ہیں لیورپ و امریکہ والے فخر کھتے
ہیں۔ اور ان کی حمایت کا دم بھرتے ہیں۔ دراصل یہ چار ٹہر تو قرآن و سنت کا مقرر
کردہ ہے۔ حقوق اللہ اور حقوق العباد کی تعلیم تو یہاں سے ملتی ہے۔ یہ منسٹر ہمیں
بتاتا ہے کہ ہر انسان کو کم از کم اتنی تعلیم تو حاصل ہونی چاہیے جس کے ذریعے وہ اپنے
حقوق و فرائض سے واقف ہو سکے اور پھر اُن کی ادائیگی کے لیے کوشش کرے
وَابۡنِیۡ السَّبۡیۡلِ اُوْرِیۡتُمُوۡہُمۡ مِّنۡ دُوۡرِیۡکُمۡ مِّنۡ دُوۡرِیۡکُمۡ مِّنۡ دُوۡرِیۡکُمۡ مِّنۡ دُوۡرِیۡکُمۡ
مسافروں پر خرچ کرنا بھی تمہارے مال کے مصارف میں ایک سے یہاں پر یہ بات اچھی طرح جان لی جا چکی
کہ اس معاملہ میں کسی پارٹی یا گروہ کی تخصیص نہیں ہے۔ کہ یہ ہماری پارٹی کا ہے۔

(۴)
مسافر

اور وہ تمہارے گروہ کا ہے بلکہ ہمارا تو شمار یہ ہے۔ مَنْ كَانَ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ فَلْيُكْرِمْ صَنِيفَةً جو شخص اللہ پر ایمان رکھتا ہے۔ اُسے چاہیے کہ اپنے مہمان کی عزت کرے۔ اور مسافر مہمان ہوتا ہے۔ اور مہمان کے متعلق حکم ہے کہ ایک دن تک اسکی خوب خاطر تواضع کرو۔ اور تین دن تک ضیافت۔ اگر تین دن کے بعد بھی اسکی خدمت کرو گے تو وہ صدقہ میں شمار ہوگا۔

اسلامی معاشرہ

الغرض! اسلامی معاشرہ کی تعمیر کے لیے ضروری ہے کہ کمزوروں اور محتاجوں کی اعانت کی جائے تاکہ وہ سوسائٹی میں باعزت مقام حاصل کر سکیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان مدت پر مال صرف کرنے کا حکم دیا ہے۔ برخلاف اس کے غیر ضروری اور ناجائز کاموں پر خرچ کرنے سے منع فرمایا ہے۔ اور اُسے اسراف سے تعبیر کیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے دیواروں پر پرے لٹکانے اور تصاویر اور نذرانے کا حکم تو نہیں دیا۔ بابے گاہنے اور عیاشی و فحاشی سے منع فرمایا ہے۔ بلکہ محتاج و ناقواں کی دست گیری کا حکم دیا ہے۔ صحابہ کرامؓ اور سلف صالحین کے دور کا مطالعہ کریں کہ وہ غریب طبقوں کی کس طرح مدد کرتے تھے۔ اُن کی عزت نفس کا خیال رکھتے تھے۔ اُن کے احساس تک کو مجروح ہونے سے بچاتے تھے۔ اُن کی ضرورت خفیہ طریقے سے اُن کے گھروں پر پہنچا دیتے تھے۔ اسلامی سوسائٹی کا معیار تو یہ ہے۔ انسانیت کا مقام تو اس طرح بلند ہوتا ہے مگر آج ہمارا شیوہ یہ ہے کہ گمراہ پڑے کو اٹھانے کی بجائے اُسے بالکل ختم کرنے کے فیصلے ہیں۔ امیر سے امیر تر اور غریب سے غریب تر ہو رہا ہے۔ یہ اسلامی سوسائٹی کے اصولوں سے لاعلمی ہے۔ کفر و شرک اور بدعات پر خرچ کیا جا رہا ہے۔ ہسٹل رسومات پر بے دریغ صرف ہو رہا ہے۔ اپنے عیش و آرام کی خاطر دوسروں کا خون چوسا جا رہا ہے۔ مگر اسلامی سوسائٹی کی تعمیر کے لیے مستحقین کی طرف توجہ نہیں دی جا رہی ہے والدین کو گھر سے نکالا جا رہا ہے۔ قرابت داروں سے عناد ہے۔ پڑوسی بھوکا ہے تو کوئی پروا نہیں انٹر نیشنل میں داخلہ دے رہے ہیں۔ غریب کے پاس دوائی لانے کے لیے پیسے نہیں مگر امیر بلا ضرورت اپنے نفس پر خرچ کر رہا ہے۔

فرمایا وَمَا تَفْعَلُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ تم نیکی کا جو کام بھی
 کرو، اللہ تعالیٰ اس سے خوب واقف ہے۔ وہ تمہاری نیت تک کو جانتا ہے۔
 لہذا وہ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ بلکہ اس کا پورا پورا اجر عطا کرتا ہے۔ لہذا لازم ہے
 کہ اسی کے عطا کردہ مال کو اس کی رضا کی خاطر خرچ کر کے اس کی خوشنودی حاصل کر لو۔
 اس سے بہتر سودا کیا ہو سکتا ہے۔

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ وَعَسَى أَنْ
تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَعَسَى أَنْ
تُحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ
لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢١٦﴾ يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيهِ
قُلْ قِتَالٌ فِيهِ كَبِيرٌ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَكُفْرٌ
بِالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ وَإِخْرَاجُ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ
وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ وَلَا يَزَالُونَ يُقَاتِلُونَكُمْ حَتَّى
يَرُدُّوكُمْ عَنْ دِينِكُمْ إِنِ اسْتَطَاعُوا وَمَنْ يَرْتَدِدْ
مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ فَيَمُتْ وَهُوَ كَافِرٌ فَأُولَئِكَ
حَبِطَتْ أَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ وَأُولَئِكَ أَصْحَابُ
النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢١٧﴾ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا وَالَّذِينَ
هَاجَرُوا وَجَاهَدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ أُولَئِكَ يَرْجُونَ
رَحْمَتَ اللَّهِ وَاللَّهُ غَفُورٌ رَحِيمٌ ﴿٢١٨﴾

ترجمہ: تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے۔ اور وہ تمہیں ناگوار گزرتی ہے۔ اور شاید کہ
تم کسی چیز کو ناگوار سمجھو اور وہ تمہارے حق میں بہتر ہو۔ اور شاید کہ تم کسی چیز کو پسند کرو،
اور وہ تمہارے لیے بُری ہو۔ اور اللہ تعالیٰ جانتا ہے اور تم نہیں جانتے ﴿۲۱۶﴾
آپ سے حرمت والے مہینے میں لڑائی سے متعلق سوال کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیجئے
حرمت کے مہینے میں لڑائی لڑنا بڑا گناہ ہے اور اللہ تعالیٰ کے راستے سے
روکنا اور اُس کے ساتھ کفر کرنا، اور مسجد حرام سے روکنا۔ اور اُس کے اہل کو

دہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک بڑا گناہ ہے۔ اور فتنہ قتل سے زیادہ بڑا ہے۔ یہ کافر لوگ ہمیشہ تمہارے ساتھ لڑتے رہیں گے حتیٰ کہ تمہیں تمہارے دین سے پھیر دیں اگر ان کو طاقت ہو۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا اور پھر مر جائے گا، اس حال میں کہ وہ کفر کرنے والا ہے۔ پس یہی لوگ ہیں جن کے اعمال دنیا اور آخرت میں ضائع ہو گئے۔ اور یہی لوگ دوزخ والے ہیں۔ اس میں ہمیشہ رہیں گے (۲۱۷) بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے ہجرت کی اور جہاد کیا اللہ کے راستے میں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اللہ کی رحمت کی امید رکھتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا مہربان ہے۔ (۲۱۸)

گزشتہ سے
پیوستہ

گزشتہ دروس میں مال کے مصارف کا بیان تھا۔ حضور علیہ السلام سے سوال ہوا کہ لوگ اپنا مال کن امور پر خرچ کریں۔ اللہ تعالیٰ نے اس کا جواب بھیجا کہ مال خرچ کرتے وقت سب سے پہلے والدین، پھر قرابت داروں پھر یتیموں اور مسکینوں اور اس کے بعد مسافروں کو پیش نظر رکھیں۔ تاہم کلیہ کے طور پر اس بات کی وضاحت فرمادی کہ نیکی کا جو بھی کام انجام دیا جائے، اللہ تعالیٰ اسکو جانتا ہے اگر کوئی شخص صاحب نصاب ہے تو اسے سب سے پہلے زکوٰۃ ادا کرنی چاہیے۔ پھر صدقات واجبہ کا حکم آتا ہے۔ اس کے بعد فضلی صدقات پر خرچ کئے جسکے لیے صاحب نصاب ہونا ضروری نہیں۔ البتہ اجر و ثواب کی خاطر اچھی سے اچھی چیز خرچ کرنا چاہیے۔ جیسا کہ ارشاد باری تعالیٰ ہے لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوا مِمَّا تُحِبُّونَ۔ جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز راہ خدا میں صرف نہ کرو نیکی کا اعلیٰ درجہ حاصل نہیں کر سکتے۔

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ اتفاق فی سبیل اللہ سے دو باتیں مقصود ہوتی ہیں۔ پہلی بات یہ ہے کہ انسان کو تہذیب نفس حاصل ہوتی ہے۔ انسان کا نفس بخل جیسی رذیل خصلت سے پاک ہوتا ہے۔ اور یہ شخص بارگاہ رب العزت میں پیش ہونے کے قابل ہو جاتا ہے اور اس

ہے اسی طرح یہاں پر ہے کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ تَمَّ بِرِ قِتَالِ فِرْضِ کِی
 گیا ہے۔ مگر قرآن پاک کے بعض دوسرے مقامات سے اور خود حضور علیہ السلام
 کے ارشادات سے واضح ہوتا ہے۔ کہ جہاد اور قتال کے فرض ہونے کی دو صورتیں
 ہیں یعنی فرض عین اور فرض کفایہ۔ فرض عین، فرض کی وہ صورت ہوتی ہے۔ جس سے
 کوئی مسلمان مرد و زن مستثنیٰ نہ ہو۔ یہ حالات و واقعات پر منحصر ہے اگر دشمن کا اس
 قدر غلبہ ہو کہ ہر مرد، عورت، چھوٹے بڑے، آزاد اور غلام کی خدمات کی ضرورت
 ہے۔ تو پھر ہر ایک پر جہاد فرض عین ہو جاتا ہے۔ سب کو شامل ہونا ہو گا۔ اگر کوئی
 اعراض کرے گا، تو گنہگار ہو گا۔ ایسی حالت میں اولاد کے لیے والدین کی اجازت
 کی ضرورت بھی نہیں ہے۔ ہر فرد بلاچون و چرا جنگ میں کود پڑے گا۔ البتہ عام
 حالات میں قتال کا فریضہ فرض کفایہ کے طور پر ادا کیا جاتا ہے۔ جب جنگ
 کے لیے فوجی جوان کافی ہوں۔ اور وہ اپنا دفاع کر سکتے ہوں اور بوقت ضرورت
 دشمن پر کاری ضرب لگا سکتے ہوں۔ تو ایسی صورت میں صرف ان خاص مجاہدین
 کا شریک جنگ ہونا ہی تمام مسلمانوں کے لیے کفایت کرے گا۔ اور یہ فرض
 کفایہ ہو گا۔ ہر ایک کا قتال میں شامل ہونا ضروری نہیں ہو گا۔ بالکل اسی طرح جس
 طرح میت کا جنازہ پڑھنا فرض کفایہ ہے۔ جب بعض لوگ جنازے میں شامل
 ہو جائیں۔ تو باقیوں سے فرض ساقط ہو جاتا ہے۔ البتہ اگر کوئی بھی شریک نہ
 ب کے سب لوگ گنہگار ہوں گے۔

عام حالات میں اگر جہاد کے لیے جانا ہو، تو والدین کی اجازت ضروری
 ہے۔ کیونکہ بعض اوقات ماں باپ کی خدمت کرنا فرض عین ہوتا ہے جبکہ
 جہاد میں شمولیت فرض کفایہ ہوتا ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ ایک
 شخص حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہوا۔ حضور! میں جہاد میں شریک ہونا
 چاہتا ہوں۔ آپ نے ارشاد فرمایا، کیا تیرے ماں باپ موجود ہیں۔ عرض کی ہاں
 فرمایا پھر والدین کی خدمت کرو۔ تمہیں جہاد کا ثواب مل جائے گا۔ یاد رہے کہ

والدین کی خدمت اُس وقت فرض عین ہو جاتی ہے۔ جب کوئی دوسرا اُن کی دیکھ بھال کرنے والا موجود نہ ہو۔

یہاں پر ارشاد ہوتا ہے۔ کُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ تم پر لڑائی فرض کی گئی ہے وَهُوَ كُرْهُ لَكُمْ اور وہ تمہیں ناگوار گذرتی ہے۔ یہاں پر ناگوار گزرنے یا بُرے لگنے سے مراد طبعاً بُرا لگنا ہے۔ کیونکہ عقلاً تو کسی بھی حکم الہی کو کوئی مومن بُرا نہیں کہہ سکتا۔ البتہ طبیعت کے لحاظ سے ایسا ہو سکتا ہے کہ انسان کو کوئی چیز اچھی محسوس نہ ہو کیونکہ خَلَقَ الْإِنْسَانَ ضَعِيفًا انسان پیدا ہی کمزور کیا گیا ہے۔ اور یہ بعض بوجہ برداشت نہیں کر سکتا۔ عقل کے لحاظ سے ہر مسلمان ہر حکم الہی پر اہمیت وَصَدَّقْنَا ہی کہے گا۔ چاہے اُس کا فائدہ ہو یا نقصان۔ کُرْہ مشقت والی چیز کو کہتے ہیں جو شاق گزے۔ دوسرے مقام پر عورت کے حمل کے متعلق آتا ہے۔ حَمَلَتُ أُمَّةٌ كُرْهًا وَوَضَعَتْهُ كُرْهًا ماں بچے کو پیٹ میں بڑی شفقت سے اٹھاتی ہے۔ اور پھر اُسے بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ جنم دیتی ہے۔ اسی لیے تو اللہ نے ماں کا بڑا حق رکھا ہے۔

فرمایا بعض چیزوں کا ناگوار گزرنا انسان کی ظاہر اُطبیعت پر منحصر ہے۔ مگر حقیقت اللہ ہی کے علم میں ہے۔ کیونکہ وَعَسَى أَنْ تَكْرَهُوا شَيْئًا وَهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ شاید کہ تم کسی چیز کو ناگوار جانو مگر وہ تمہارے لیے بہتر ہو وَعَسَى أَنْ تَحِبُّوا شَيْئًا وَهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ اور شاید کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمہارے لیے بُری ہو۔

جان کی بازی لگا کر دشمن کے ساتھ جنگ لڑنا کوئی معمولی بات نہیں اور اس کا طبیعت پر ناگوار گزرنا بھی طبعی ہے۔ مگر اس کے نتائج و عواقب پر غور کرنے سے معلوم ہوگا جو قویں اتنی آرام طلب ہو جائیں کہ وہ اپنا دفاع بھی نہ کر سکیں، وہ جلد یا بدیر مغلوب ہو جاتی ہیں ظاہر ہے کہ دشمن غالب آئے گا اور پھر جان مال، عزت و اکبر و ہر چیز چھین جائے گی۔ حتیٰ کہ زن و فرزند کی

غالب اور
مغلوب

یہ سب مٹی تک ہوگی۔ ظاہر ہے کہ اس قسم کا نتیجہ بہت ہی بڑا ہوگا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے جہاد فرض کر کے مسلمان کو مشقت میں نہیں ڈالا۔ بلکہ اسے بہترین نتائج سے بچا لیتا، تاریخ شاہد ہے کہ جب کوئی قوم غالب آتی ہے۔ تو مغلوب قوم کو کس طرح پامال کرتی ہے۔ جب تاتاری غالب آئے تو انہوں نے ایک کروڑ مسلمانوں کو تیغ کر دیا۔ تمام کتب خانے جلادیے، عورتوں اور بچوں تک کو معاف نہیں کیا۔ اسی طرح جب انگریزوں نے ہندوستان پر قبضہ کیا، تو کون سا ظلم ہے جو یہاں کے باشندوں پر نہیں کیا۔ جی ٹی روڈ پر ہزاروں کی تعداد میں نعشوں کو درختوں پر لٹکایا گیا۔ ان میں غالب اکثریت مسلمانوں کی تھی۔ جب عیسائیوں نے اندلس (سپین) پر حملہ کیا تو وہاں دو کروڑ کی تعداد میں مسلمان تھے۔ مگر جب وہ غالب آئے تو مسلمانوں کی تعداد صرف گیارہ ہزار رہ گئی تھی۔ باقیوں کو یا تو قتل کر دیا گیا تھا۔ یا مرد کر لیا گیا۔ یہ بلخ اور بخارا کا زمانہ تو قریب کا زمانہ ہے۔ صرف بخارا شہر میں چار سو مسجدیں تھیں۔ بے شمار دینی مدارس تھے۔ مگر اب وہاں کچھ بھی نظر نہیں آتا۔ فرمایا جنگ کے حکم کو خوش دلی سے قبول کرو۔ تمہاری نظر صرف ظاہر پر ہے۔ مگر درحقیقت **وَاللّٰهُ يَفْلَحُ وَأَنْتُمْ لَا تَفْلَحُونَ** اللہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ ہر کام کے نتیجے سے وہی واقف ہے تم اس کی اصلیت کو نہیں جانتے۔ یہ بات تو واضح ہو گئی کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں پر لڑائی فرض کی ہے۔ مگر اگلی آیت میں **حُرْمَتُ دَائِمِيْنَ** کے دوران جنگ کے جواز یا عدم جواز کا سوال اٹھایا گیا ہے۔ **يَسْأَلُونَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ** یعنی اے نبی علیہ السلام! یہ لوگ آپ سے حرمت دائمہ میں جنگ کرنے کے متعلق دریافت کرتے ہیں کہ **اِنَّ مِثْمُوْنَ** میں جنگ کرنا کیسا ہے۔ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ دیتے ہیں۔ **فَقَاتِلْ فِيْهِ كَبَيْدٍ** یعنی ان مہینوں میں لڑائی کرنا بڑا سخت گناہ ہے۔ اب پہلا سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ حرمت دائمہ میں کون سے ہیں جن کے دوران لڑائی ممنوع ہے۔ اس ضمن میں سورۃ توبہ میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد

حرمت دائمہ
میلنے

فرمایا ہے۔ ”اِنَّ عِدَّةَ الشُّهُورِ عِنْدَ اللّٰهِ اَشْأَعَشْرَ شَهْرًا يَعْنِي اللّٰهِ کے ہاں مہینوں کی تعداد بارہ ہے مِّنْهَا اَرْبَعَةٌ حُرُمٌ“ ان میں چار مہینے حرمت لئے ہیں۔ اور وہ یہ ہیں، رجب، ذی قعد، ذی الحج اور محرم۔ ملت ابراہیمی میں یہ بات مسلم تھی کہ ان چار مہینوں میں لڑائی قطعاً جائز نہیں۔ زمانہ جاہلیت میں مشرکین بھی اس کی پابندی کرتے تھے۔ چنانچہ وہ ان مہینوں میں ہتھیار ڈال دیتے تھے کوئی لڑائی نہیں کرتے تھے۔ کسی قافلے کو نہیں لوٹتے تھے۔ بعض کہتے ہیں کہ حضور علیہ السلام کی شریعت میں یہ حکم منسوخ ہو چکا ہے۔ اور بعض اصحاب کہتے ہیں کہ یہ حکم مطلقاً منسوخ نہیں ہوا۔ بلکہ اس کی تاکید میں کبھی ہو گئی ہے۔ اور اس کی صورت یہ ہے کہ ان مہینوں میں مسلمان خود لڑائی کی ابتداء نہ کریں اور اگر دشمن جنگ شروع کرے، تو پھر اس کا جواب دیا جائے۔

شانِ نزول

دوسرے سوال شانِ نزول کا ہے۔ کہ یہ آیت کس موقع پر نازل ہوئی۔ اور لوگوں نے یہ سوال کیوں اٹھایا۔ محمد بن اسحاقؒ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے غزوہ بدر سے پہلے حضرت عبداللہ بن جحشؓ کی سرکردگی میں کفار کے ایک تجارتی قافلے کو پکڑنے کے لیے ایک جماعت کو بھیجا۔ آپ نے امیر جماعت کو ایک خط لکھ دیا۔ اور ساتھ حکم دیا کہ مسلسل دو دن سفر کرنے کے بعد اس خط کو کھول کر پڑھنا اور پھر اس میں مذکور ہدایت کے مطابق عمل کرنا۔ اس حکم کی تعمیل میں دو دن بعد جب خط کھول کر پڑھا گیا۔ تو اس میں لکھا تھا کہ فلاں قافلہ کو گرفتار کر لو۔ اس کو کسی صورت میں جانے نہیں دینا۔ یہ دن جمادی الاخریٰ کے آخری دن تھا۔ امیر لشکر نے فیصلہ کیا کہ چونکہ رجب حرمت والا مہینہ شروع ہونے والا ہے لہذا اس سے پہلے پہلے قافلے کو پکڑ لینا چاہیے۔ چنانچہ اپنے حساب سے انہوں نے جمادی الاخریٰ کی تیس تاریخ کو کفار کے قافلے پر حملہ کر دیا۔ ایک آدمی مارا گیا۔ باقی قیدی ہوئے۔ سامان بھی ہاتھ آگیا۔ لہذا لشکر واپس آگیا۔

درحقیقت حملہ کرنے کی تاریخ جہادی الاخری کی تیسری تاریخ نہیں تھی۔ بلکہ جب کی پہلی تھی، جو کہ حرمت والا مہینہ ہے۔ لہذا مشرکوں کو بات کرنے کا موقع مل گیا۔ کہ دیکھو مسلمانوں کے پیغمبر اپنے آپ کو ملت ابراہیم کے متبع کہتے ہیں۔ مگر حرمت والے مہینہ کا بھی خیال نہیں کیا۔ قتلے پر حملہ کیا ہے۔ آدمی مارا گیا ہے اور قافلے کو جمع سامان گرفتار کر لیا ہے۔ یہ تھا وہ واقعہ جس کی وجہ سے حرمت والے مہینوں کے متعلق سوال پیدا ہوا کہ ان مہینوں میں لڑائی کرنا کیسا ہے۔

حرام فعل اس سوال کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ کہ یہ لوگ آپ سے حرمت والے مہینوں کے متعلق پوچھتے ہیں۔ تو آپ فرمادیکھئے کہ ان مہینوں میں لڑائی کرنا بڑا گناہ ہے۔ تاہم جس واقعہ کو بنیاد بنا کر یہ سوال کیا گیا تھا۔ وہ تو غلطی سے ہوا تھا۔ مسلمان سمجھے کہ ابھی رجب کا مہینہ شروع نہیں ہوا۔ لہذا حملہ آور ہوئے۔ تو اللہ تعالیٰ نے اس کا نتیجہ جواب یہ دیا۔ کہ مسلمانوں سے تو یہ خلاف ورزی خطا ہوئی مگر کفار و مشرکین اپنے گریبان میں منہ ڈال کر نہیں دیکھتے کہ وہ خود کیا کچھ کر رہے ہیں۔ فرمایا بے شک حرمت والے مہینوں میں لڑائی حرام ہے مگر وَصَدَّ عَنْ سَبِيلِ اللَّهِ وَلَقَدْ بَايَ اللَّهَ كُتَيْبُ بْنُ لُحَيْظٍ سے روکنا اور اس کے ساتھ کفر کرنا بھی تو سخت گناہ ہے وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ اور مسجد حرام سے روکنا بھی بڑا گناہ ہے۔ وَإِخْرَاجِ أَهْلِهِ مِنْهُ أَكْبَرُ عِنْدَ اللَّهِ اور وہاں کے رہنے والوں کو مسجد حرام سے نکالنا بھی اللہ کے نزدیک بہت بڑا گناہ ہے فرمایا اے کفار و مشرکین تم یہ لوگ مسلمانوں سے کہتے ہو کیا یہ کوئی کم گناہ ہے جو تم جان بوجھ کر کر رہے ہو تم جس مسجد سے مسلمانوں کو نکال رہے ہو تم خود اس کے اہل نہیں ہو إِنَّ أَوْلَىٰ آلِهِ لِلْأَمْتِ اس کے اہل تو صرف متقی ہیں اور وہ مسلمان ہیں فرمایا دِرْكَوْا وَالْفِتْنَةُ أَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ یہ فتنہ بڑا کٹر قتل سے بھی بڑا گناہ ہے مسلمانوں سے تو جھول کر ایک غلطی سرزد ہو گئی ہے مگر تم انہیں بیت اللہ شریف سے روک کر اور انہیں ہجرت پر مجبور کر کے فتنہ پیدا کر رہے ہو تمہارا کفر اور شرک پر اڑے رہنا بجائے خود ایک بہت بڑا فتنہ ہے۔ اور اس کے مقابلے میں مسلمانوں کی غلطی معمولی چیز ہے

مرتا اور اس
کی سزا

اس کے بعد فرمایا کہ مسلمانوں کا یہ واقعہ تو کفار کو بہانہ کے طور پر مل گیا حقیقت یہ ہے کہ وَلَا يَزَالُونَ يَقَاتِلُونَكُمْ یہ لوگ ہمیشہ تم سے لڑتے رہیں گے حتیٰ يُكْفِرُكُمْ عَنْ دِينِكُمْ اِنْ اسْتَطَاعُوا اِيْهَا تَحٰكُمُ كَرِهَ اَللّٰهُ لِمَنِ اسْتَطَاعَتْ رَحْمَتُ رَحْمٰتِ رَبِّهِمْ تَمَّ بَارِئُ دِيْنِ بَسْ پھر دیں۔ اُن کا مقصد تمہیں اپنے سابقہ دین پر واپس لانا ہے۔ یہود و نصاریٰ کے متعلق بھی دو کے مقام پر فرمایا کہ اُن کا بھی یہی مقصد ہے وَلَنْ تَرْضٰ عَنْكَ الْيَهُودُ وَلَا النَّصَارَىٰ یہود و نصاریٰ آپ سے ہرگز راضی نہیں ہوں گے حتیٰ تَتَّبِعَ مِلَّتَهُمْ جب تک کہ آپ کا دین اختیار نہ کر لیں (معاذ اللہ) گویا کفار و مشرکین اور یہود و نصاریٰ مسلمانوں کو مرتد بنانا چاہتے ہیں مگر یاد رکھو۔ وَمَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِينِهِ تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھر جائے گا۔ فَيَمُوتْ وَهُوَ كَافِرٌ اور کفر کی حالت میں مر جائے گا فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَالْآٰخِرَةِ سو ایسے لوگوں کے اعمال دنیا و آخرت دونوں جگہ پر ضائع ہو جائیں گے جو کوئی سچے دین اسلام کو چھوڑ کر یہودی یا عیسائی ہو گیا۔ کافر یا مرتد بن جائے گا۔ اس کی دنیا اور آخرت دونوں خراب ہو گئیں۔

دنیا میں اعمال ضائع ہونے کا مطلب یہ ہے کہ اہم ابو حنیفہ کے نزدیک مرتد شخص کی سابقہ نمازیں، روزے، زکوٰۃ، حج وغیرہ سب ضائع ہو گئے۔ اسے ان ٹیکوں کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا سب ضائع ہو گئیں۔ جب تک کہ وہ دوبارہ ایمان نہ لے آئے۔ علاوہ ازیں مرتد آدمی قوم و ملت کا غدار ہے۔ اور غدار کی سزا قتل ہے حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے مَنْ كَبَدَ لِدِيْنًا فَاَقْتُلُوْهُ جو دین تبدیل کرے تا ہے۔ وہ واجب القتل ہے۔ البتہ اس کا طریق کار یہ ہے۔ کہ تین دن تک اس کے شکوک و شبہات دور کرنے کی کوشش کی جائے اور اس سے توبہ کرنے کی کوشش کی جائے۔ اور اگر یہ کوشش بار آور نہ ہو سکے۔ اور مرتد دوبارہ مسلمان ہونے پر آمادہ نہ ہو۔ تو اسے سزائے موت دے دی جائے یہ شخص دین کی توہین کا مرتکب ہوا ہے۔ اور معافی کا حقدار نہیں۔

اشتر کی ممالک میں اُن کے آئین کی توہین کرنے والا شخص موت کی سزا پاتا ہے۔ برطانوی قانون کے مطابق جیب ایمری کے بیٹے نے جنگ کے دوران غدار کی تو اسے سولی پر لٹکا دیا گیا تھا۔ کسی نے اولاد نہیں اٹھائی کہ اُن کے وزیر کے بیٹے کو سزائے موت کیوں دی گئی۔

موت کے بعد مرتد کی سزا یہ ہے۔ کہ نہ اُس کا جنازہ پڑھا جائے اور نہ اُسے مسلمانوں کے قبرستان میں دفن کیا جائے۔ مرتد اپنے مسلمان مورث کی وراثت کے حق سے محروم ہو جاتا ہے۔ یہ تو دنیا میں اس کے اعمال کا ضیاع ہے۔ اور آخرت کا معاملہ یہ ہے کہ وہ ابدی جہنمی ہے۔ اُسے کبھی دوزخ سے رہائی نہیں ہوگی مرتد اصل کافر سے بھی بڑا مجرم ہے۔ کافر سے تو جزیہ قبول کر لیا جاتا ہے مگر مرتد سے جزیہ بھی نہیں لیا جاتا۔ اہم اعظم کے فتویٰ کے مطابق اگر عورت مرتد ہو جائے تو اُسے قتل نہیں کیا جائے گا۔ بلکہ تاسرگ قید میں ڈال دیا جائے گا۔ _____ اگر مرتد کمرے تو آزاد ہو جائے گی۔ ایسے ہی لوگوں کے متعلق فرمایا۔ وَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ۔ یہ لوگ جہنمی ہیں۔ اور هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ اُن کی رہائی کی کوئی صورت نہیں ہے۔

کفار و مشرکین اور مرتدین کی مذمت کے بعد اہل ایمان کو خوشخبری دی جا رہی ہے۔ إِنَّ الَّذِينَ آمَنُوا جو لوگ ایمان لے آئے وَالَّذِينَ هَاجَرُوا اور جنہوں نے اللہ کی رضا کی خاطر ہجرت کی۔ نہ صرف وطن کو چھوڑا بلکہ مَنْ هَاجَرَ مَا نَهَى اللَّهُ عَنْهُ بلکہ اللہ تعالیٰ کی ممنوعہ چیزوں سے منہ موڑ لیا کہ یہ ہجرت بہت بڑا عمل ہے۔ إِنَّ شَانَ الْهَاجِرَةِ لَعَظِيمٌ ہجرت کا معاملہ بڑا دشوار ہے دین کی خاطر سب کچھ چھوڑنا پڑتا ہے جس نے ایسا کر لیا وَجَهْدُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور وہ لوگ جنہوں نے اللہ کے راستے میں جہاد کیا أُولَٰئِكَ يَرْجُونَ رَحْمَةَ اللَّهِ یہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔ وَاللَّهُ عَفْوٌ رَّحِيمٌ اللہ تعالیٰ بڑا بخشنے والا مہربان ہے وہ نیکو کاروں کو پورا پورا اجر دیگا۔

اہل ایمان کے
لیے خوشخبری

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس نور (۹۰)

آیت ۲۱۹ تا ۲۲۰

يَسْأَلُونَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَالْمَيْسِرِ قُلْ فِيهِمَا اثْمٌ كَبِيرٌ وَ
مَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَإِثْمُهُمَا أَكْبَرُ مِّنْ نَّفْعِهِمَا ط وَكَسَلُوكَ
مَا ذَا يُنْفِقُونَ ه قُلِ الْعَفْوَ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ
الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ ط

ترجمہ: لوگ آپ سے سوال کرتے ہیں شراب اور جوئے کے بارے میں آپ کہ دیجئے
ان دونوں میں بڑا گناہ ہے۔ اور لوگوں کے لیے کچھ فائدے بھی ہیں اور ان کا گناہ
ان کے فائدے سے بہت بڑا ہے اور وہ آپ سے پوچھتے ہیں کہ کیا خرچ کریں۔
آپ کہ دیجئے، جو زائد ہو اسی طرح اللہ تعالیٰ تمہارے لیے آیات بیان کرتا ہے۔ تاکہ
تم فکرمکر ﴿۲۱۹﴾ دنیا اور آخرت کے بارے میں

گذشتہ درس میں جہاد کی مشروعیت اور اس کی حکمت بیان کی گئی تھی۔ حرمت
والے مہینوں میں لڑائی سے منع کیا گیا تھا۔ کفار کی خصلت بیان ہوئی۔ کہ وہ مسلمانوں کو
بہکا کر دین اسلام سے پھیرنے کی کوشش کرتے رہیں گے نیز فرمایا کہ جو شخص مرتد
ہو گیا، اس کی دنیا اور آخرت ہر دو برباد ہو گئیں۔ اس کے بعد ایمان، ہجرت اور
جہاد فی سبیل اللہ کی تعلیم دی گئی کہ ایسے ہی لوگ اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں۔
اور ان کی غلطیوں کو اللہ تعالیٰ معاف فرمادیں گے۔

اُس سے پہلے درس میں مال خرچ کرنے کا قانون بیان ہوا تھا۔ اور اتفاق
کی اہمیت بیان ہوئی تھی۔ اس کا بیان آگے بھی آئے گا۔ گویا یہ حصول مال کے
ذرائع اور خرچ کی ہدایت کا مفصل تذکرہ ہے۔

اس آیت میں شراب اور جوئے کے فوائد و نقصانات اور ان کی حرمت کا
موضوع آیات

کم تر خیال کرتے تھے۔ غرضیکہ شراب اور جوا عام تھے۔ کوئی خال خال ہی ان سے بچتا تھا۔ مگر نہ جس طرح اونٹ، گھوڑا، تلوار، لٹائی عربوں کی گھٹی میں پڑے تھے اسی طرح شراب اور جوا بھی ان کا عام مشغلہ تھا۔

میسر، جوا یا قمار بازی کو کہتے ہیں۔ اس کا مادہ میسر ہے اور میسر آسانی کو کہتے ہیں۔ قمار بازی کے ذریعے کوئی شخص بغیر محنت و مشقت، صنعت و تجارت یا مزد دہری و ملازمت دوسرے کے مال پر قبضہ کر لیتا، اس لیے اس کو میسر کہتے ہیں جوئے کی یہی خباثت ہے۔ کہ اس میں ایک دوسرے کی حق تلفی ہوتی ہے۔ جس شخص کا دوا چل گیا۔ اُسے بغیر کچھ کیے کرائے مال حاصل ہو گیا۔ اور دوسرا شخص بیٹھ بٹھائے بلا وجہ محروم ہو گیا پھر جس شخص کو مال مل جاتا ہے۔ وہ اس کی قدر نہیں کرتا۔ اور اُسے عیش و عشرت اور برائی کے کاموں میں صرف کر دیتا ہے۔ جس کی وجہ سے معصیت کا شکار ہوتا ہے۔ دولت بھی ضائع کرتا ہے۔ اور گنہگار بھی ہوتا ہے۔ عربوں میں باقی خباثت کی طرح جوئے کی وبا بھی عام تھی۔ وہ قمار بازی کو اچھا فعل سمجھتے تھے۔ خاص طور پر قحط کے زمانے میں جوئے میں شدت پیدا ہو جاتی تھی۔ اور قمار بازی سے حاصل کردہ مال غریبوں میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔

نزول قرآن کے زمانہ میں قمار بازی اس قدر عروج پر تھی۔ کہ خانہ کعبہ میں رکھے ہوئے حضرت ابراہیم علیہ السلام اور حضرت اسماعیل علیہ السلام کے مجسموں کے ہاتھوں میں جوئے کے تیر پچڑائے ہوئے تھے۔ جس سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ یہ جلیل القدر پیغمبر بھی جوا کھیل کر تے تھے (العیاذ باللہ) بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام ان مجسموں کے قریب سے گزے تو فرمایا، ان لوگوں پر خدا کی لعنت ہو، اللہ کے پاک بندوں کی نسبت کیسی ناپاک چیزوں کی طرف کرتے ہیں۔ حضرات ابراہیم اور اسماعیل علیہما السلام کو ایسے شیعہ کام سے کیا سروکار۔

جوئے کے مختلف طریقے رائج تھے۔ قحط کے زمانے میں عموماً یہ طریقہ

اختیار کرتے تھے۔ کہ دس آدمی مل کر مساوی حصہ سے ایک اونٹ خرید لیتے تھے اُن کے پاس دس تیر ہوتے تھے۔ جن پر ایک سے لے کر سات تک نمبر لکھے ہوتے تھے۔ اور باقی تین تیر خالی ہوتے تھے۔ اب اُن دس تیروں میں سے کسی ایک حصہ دار کے نام سے تیر نکالتے تھے۔ اور پھر جن نمبر والا تیر اُس نام پر نکلتا تھا۔ اونٹ کے گوشت کے اتنے ہی حصے وہ اکیلا لے جاتا تھا۔ اُس کے بعد حسب ضرورت دوسرا اور تیسرا تیر نکالا جاتا، حتیٰ کہ اونٹ کا سارا گوشت ختم ہو جاتا۔ اور جو حصے دار باقی بچ جاتے وہ اپنے حصے سے محروم رہ جاتے۔ اسی طرح اگر ابتدا میں کسی کے نام خالی تیر نکل آتا، تو وہ بھی اپنے حصے سے محروم رہ جاتا اور اگلے نمبر والا اپنا حصہ وصول کرنا اعلیٰٰ ہذا القیاس۔ جب ایک اونٹ کا گوشت تقسیم ہو جاتا تو محروم ہونے والے دعوت دیتے کہ ایک اور اونٹ خریداجائے اور اس کے پھر اسی طرح حصے بخرے کر لیے جاتے۔ یہ گوشت چونکہ غربائیں تقسیم کیا جاتا تھا اس لیے اس قمار بازی کو بھی وہ لوگ باعث فضیلت سمجھتے۔ موجودہ زمانے میں گھڑ دوڑ لائٹھی، انعامی یکیمیں وغیرہ سب جوئے کی مختلف اقسام ہیں۔ جو مختلف ناموں سے معاشرے میں پھیلی ہوئی ہیں۔ حالانکہ ہر قسم کی قمار بازی حرام ہے۔

حرمت شراب
کے مراحل

شراب بیک حکم حرام نہیں ہوئی۔ بلکہ اس کی حرمت آہستہ آہستہ بتدریج ہوئی ہے۔ اس کے احکام مختلف مواقع پر نازل ہوتے ہیں، حتیٰ کہ چوتھے مرحلہ پر اس کو قطعی حرام قرار دے دیا گیا ابتداءً اللہ تعالیٰ نے سورۃ نحل میں اشارتاً پھلوں کا ذکر کیا اور فرمایا تَتَجَذَّوْنَ مِنْهُ سَكَنًا وَرِزْقًا حَسَنًا تم ان سے نشہ آور اشیاء مثلاً شراب وغیرہ نہ لیتے ہو اور اچھا رزق یعنی چٹنی، لپار، مربے وغیرہ بھی بنا لیتے ہو۔ یہاں پر حلت و حرمت کا ذکر تو نہیں ہے۔ مگر نشہ آور اشیاء کو رِزْقًا حَسَنًا (اچھی روزی) سے علیحدہ کر کے اُسے کم تر قرار دیا۔

دوسرے نمبر پر اس درس والی آیت نازل ہوئی۔ کہ آپ سے شراب اور

جوتے کے متعلق دریافت کرتے ہیں۔ آپ کہہ دیں کہ ان میں بڑا گناہ ہے اور لوگوں کے لیے فائدہ بھی ہیں۔ مگر ان کا گناہ ان کے فائدے سے بڑا ہے۔ یہاں پر حرمت شراب کا قطعی حکم نہیں ہے۔ بلکہ اس حقیقت کو واضح کر دیا گیا ہے۔ کہ فائدہ کی نسبت اس کا نقصان بہت بڑا ہے۔ ابو علی ابن سینا کے قول کے مطابق شراب میں نقصان اس کے فائدے سے ڈبل ہے۔ یعنی اس کے ذریعے فائدہ تو ایک حصہ ہوتا ہے۔ مگر نقصان دوحصے کے برابر ہے۔

حرمت شراب سے متعلق تیسرے حکم کے پس منظر میں ایک واقعہ پیش آیا ایک انصاری کے ہاں بعض صحابہ کرام کی دعوت تھی۔ ان میں حضرت سعد بھی تھے۔ جو عشرہ مبشرہ میں شامل تھے۔ صحابہ نے کھانا کھایا۔ چونکہ اس وقت تک شراب قطعی حرام نہیں ہوئی تھی، لہذا اس کا دور بھی چلا۔ آپس میں کسی موضوع پر گفتگو ہو رہی تھی ایک گروہ کا نظریہ تھا کہ انصار زیادہ اچھے ہیں۔ دوسرا گروہ مہاجرین کے حق میں تھا۔ آپس میں دوست اور رشتیق تھے، محض ایک دوسرے کی بدترہی کا ذکر ہو رہا تھا۔ اتنے میں ایک نوجوان کو غصہ آیا، اس نے طیش میں آکر ایک جہڑا حضرت سعد کے سر پر مارا، جس سے وہ زخمی ہو گئے۔

ترمذی شریف کی روایت میں ایک اور واقعہ کا ذکر بھی آتا ہے۔ کہ ایک دعوت میں جلیل القدر صحابہ کرام موجود تھے۔ جن میں حضرت علیؓ اور حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ بھی شامل تھے۔ چونکہ ابھی تک شراب قطعی حرام نہیں ہوئی تھی۔ اس لیے اکثر لوگ پیتے تھے، مگر بعض نہیں بھی پیتے تھے۔ جیسے حضور علیہ السلام نے کبھی شراب نہیں پی۔ حضرت صدیق اکبرؓ اور عثمانؓ بھی اس کے قریب نہیں جاتے تھے، ایسے اصحاب اسے وفار کے منافی سمجھتے تھے۔ اسے استعمال کرنے والوں میں حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ وغیرہم تھے۔ کہ ایک چیز مباح ہے لہذا استعمال کرنے میں کوئی حرج نہیں۔ نماز کا وقت ہو گیا۔ لوگوں نے شراب پی رکھی تھی۔ ایک صحابی کو امامت کے لیے آگے کر دیا گیا۔ نشے کی حالت میں

قرآن پاک غلط پڑھا۔ اسی طرح مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ صبح کی نماز کا وقت تھا۔ حضرت عثمانؓ کے سامنے حضرت ولیدؓ امامت کراہے تھے۔ نشے کا زور تھا۔ دو رکعت پڑھا کہ کہنے لگے اور پڑھا دوں۔ ایسے ہی واقعات کے پیش نظر سورۃ ناز کی آیت نازل ہوئی۔ "يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَقْرَبُوا الصَّلَاةَ وَأَنْتُمْ سُكَارَىٰ حَتَّىٰ تَعْلَمُوا مَا تَقُولُونَ" یعنی اے اہل ایمان نشے کی حالت میں نماز کے قریب نہ جاؤ ایمان تک کہ تمہارے ہوش و حواس بحال ہو جائیں کہ تم کیا کہہ رہے ہو۔ گویا تیسرے نمبر پر نشے کی حالت میں نماز سے روک دیا گیا۔

روایات میں آتا ہے۔ کہ حضرت عمرؓ کو اس محلے میں اکثر تشویش رہتی تھی۔ اور وہ دعا کیا کرتے تھے۔ اَللّٰهُمَّ بَيِّنْ لَنَا فِي الْخَمْرِ بَيِّنَاتًا شَرَفِيًّا یعنی اے مولا کہیم! اشارے کنایے سے تو شراب کی قباحیت محسوس ہو رہی ہے۔ مگر ہمارے لیے کوئی واضح حکم نازل فرما، چنانچہ اب جو تھے مرحلے میں سورۃ مادہ کی یہ آیت نازل ہوئی، جس میں شراب اور بعض دیگر اشیا کو قطعی حرام قرار دیدیا گیا۔ اِنَّمَّا الْخَمْرُ وَالْمَيْسِرُ وَالْاَنْصَابُ وَالْاَزْلَامُ رِجْسٌ مِّنْ عَمَلِ الشَّيْطٰنِ فَاجْتَنِبُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَفْلَحُوْنَ۔ اے ایمان والو! بیشک شراب، جوا، تھان اور پانے شیطان کے ناپاک کام ہیں۔ ان سے بچ جاؤ تاکہ تم کامیاب ہو جاؤ۔ اس کے بعد شراب قطعی حرام ہو گئی تو یہ چار مراحل تھے۔ جن کے ذریعے شراب کو بتدریج حرام قرار دیا گیا۔

بعض نئی روشنی کے لوگ شراب کی حرمت کا انکار کرتے ہیں۔ وہ کہتے ہیں کہ بعض دوسری حرام چیزوں کی طرح اس پر حرمت کا واضح حکم نہیں لگایا گیا۔ جیسے مردار، خون وغیرہ کے متعلق فرمایا۔ "حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ اَلْمَيْتَةُ وَالدَّمُ" مگر اس آیت میں لفظ "فَاجْتَنِبُوْهُ" آیا ہے۔ یعنی اس سے اجتناب کرو، بچ جاؤ حالانکہ اگلی ہی آیت میں مزید وضاحت کر دی گئی ہے۔ کہ شیطان شراب اور جوئے کے ذریعے تمہارے درمیان دشمنی

حرمت شراب
پر تاویلیں

اور بغض و ادا چاہتا ہے۔ فَانْتَهَوْا اِلٰی اَنْ حٰیزُوْا سَے باز آ جاؤ۔ لہذا یہ بھی قطعی حرمت کا حکم ہے۔

بعض لوگ کہتے ہیں کہ شراب اور خمر دو مختلف چیزیں ہیں۔ شراب ہر پینے والی چیز پر بولا جاتا ہے۔ سورۃ دھر میں موجود ہے "وَسَفْهُوْا ثَمٰوُ شَرَابًا طٰهَرًا خَمْرًا" جنتیوں کو ان کا رب پاک شراب پلائے گا۔ مگر وہ نشہ سے خالی ہوگی اور خمر نشہ آور چیز کہتے ہیں۔ اور وہ حرام ہے۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے۔ "كُلُّ مُسْكِرٍ خَمْرٌ" ہر نشہ آور چیز شراب کے زمرے میں آتی ہے۔ "وَكُلُّ مُسْكِرٍ حَرَامٌ" اور ہر نشہ آور چیز حرام ہے۔ اس لحاظ سے بھنگ، چرس، الگنجا اور شراب کی تمام اقسام حرام ہیں۔ خواہ وہ معمولی درجہ کی ہوں یا اعلیٰ درجہ کی۔ انجور سے کشید کردہ ہوں یا کھجور سے۔ شہد سے بنی ہوں یا گندم یا جو سے وہ بہر حال حرام ہیں۔

صاحب تفسیر روح المعانی علامہ سیّد محمود آلوسی بغدادی شاہ عبدالعزیز کے ہم عصر ہیں۔ انہوں نے تین جلدوں میں قرآن پاک کی تفسیر لکھی ہے۔ وہ اپنے زمانے کا جہاں سمجھتے ہیں کہ لوگوں نے عجیب روش اختیار کر لی۔ شراب کو مختلف ناموں سے پکار کر استعمال کر رہے ہیں حالانکہ اس کی اصلیت میں کوئی فرق نہیں۔ کسی نے عرق اکیر نام رکھ لیا ہے۔ اور کوئی طے آب جو کہتا ہے۔ مگر نام بدلنے سے ایک حرام چیز حلال نہیں ہو سکتی۔

اس بات کو انگریزوں نے بھی تسلیم کیا ہے کہ حرمت شراب کے متعلق اگر کسی کو کامیابی نصیب ہوتی ہے۔ تو وہ صرف مذہب اسلام ہے۔ سر ولیم مور ہندوستان میں صوبجات متحدہ کا گورنر رہا ہے۔ بڑا متعصب عیسائی پادری تھا اس نے دو جلدوں میں حضور علیہ السلام کی سوانح حیات لکھی ہے۔ جس کا نام ہے لائف آف محمد (LIFE OF MUHAMMAD) مسلمانوں کے خلاف تعصب کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے۔ کہ دو چیزیں انسانیت کی دشمن ہیں۔ ایک محمد کی تلوار

اور دوسرے محمد کا قرآن۔ مگر اس کو تسلیم کرنا پڑا۔ کہ شراب کی حرمت کے متعلق اسلام کے
سوا کوئی مذہب کامیاب نہیں ہو سکا۔ وہ کہتا ہے۔ کہ اسلام اور مسلمانوں کے لیے
باعث فخر ہے کہ انہوں نے شراب جیسی قبیح چیز کو واضح طور پر حرام قرار دیا اور بڑی
حد تک اس سے محفوظ ہے۔

حرام چیز کی
تجارت بھی
حرام ہے

بہر حال سورۃ مائدہ کی مذکورہ آیت نازل ہونے پر شراب حرام ہو گئی۔ اور صحابہ کرام
نے کلی طور پر اس کو ترک کر دیا۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ کہ
لَعَنَ اللَّهُ مَنْ شَرِبَ الْخَمْرَ وَأَمْسَرَهَا اَلَا يَعْلَمُ شَرَابُ پینے والا،
پلانے والا، نخوڑنے والا، بنانے والا، اٹھا کر لے جانے والا، اس کو نیچنے والا
اور اس کی کھائی کھانے والا سب لعنتی ہیں۔ پھر آپ نے فتح مکہ کے دن اعلان
کیا۔ کہ جس خداوند تعالیٰ نے شراب پینے سے منع فرمایا ہے۔ اُسی خدا نے اس
کی تجارت سے بھی منع کر دی ہے گویا ہر حرام شے کی تجارت بھی حرام ہے۔ یہود
حرام ہے، اس کی لین دین بھی حرام ہے۔ اسی طرح بتوں کی تجارت حرام ہے
مردار کی چربی کا بھی یہی حکم ہے۔ مگر اس زمانے میں سوائے سعودی عرب کے تمام
اسلامی ممالک میں شراب استعمال ہوتی ہے۔ اس کی تجارت ہوتی ہے۔ لائسنس
جاری ہوتے ہیں۔ جہاں کہیں پابندی کا نام سنتے ہیں۔ وہ بھی زبانی حکم تک ہے
عملی طور پر مختلف جیلوں بہانوں سے اس کے استعمال کی اجازت ہے۔

خرچ کی
مقدار

آگے خرچ کے متعلق سوال اور اس کا جواب ہے وَ يَسْأَلُونَكَ
مَاذَا يُنْفِقُونَ آپ سے سوال کرتے ہیں کہ کس قدر خرچ کریں۔ یہ سوال
گذشتہ سے پیوستہ درس میں بھی آچکا ہے۔ وہاں پر اس کا جواب دیا گیا تھا۔ کہ
فَلَا فُلَانٌ مَدَّ يَدَهُ خَرَجَ کریں۔ مگر اس آیت کے جواب میں ہے۔ قُلِ الْعَفْوَ
آپ کہ دیجئے، جو اپنی ضرورت سے زائد ہے، وہ خرچ کر دیں۔ گویا اس سوال
کا متعلق خرچ کی مقدار سے ہے۔ یہاں یہ ضمنی سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ حاجت
سے زائد سب کچھ خرچ کر دینا فرض، واجب وغیرہ کی کس مد میں آئے گا۔ تو

اس کا جواب یہ ہے کہ خرچ جس حد کے لیے کیا جائے گا، اس کا شمار اسی میں ہوگا مثلاً اگر زکوٰۃ ادا کی گئی ہے، تو اس حد کا خرچ فرض ہوگا۔ اگر صدقہ فطر ادا کیا ہے یا کسی اور واجب پر خرچ کیا ہوگا۔ تو واجب شمار ہوگا۔ اسی طرح نفلی امور کا خرچ نفل شمار ہوگا۔ اگر کسی مباح کام میں خرچ کیا گیا ہے تو ایسا خرچ بھی مباح ہوگا، اگر محض ثواب کی نیت ہے، تو خرچ کنندہ کو ثواب حاصل ہوگا۔ برخلاف اس کے اگر کسی معصیت والے کام پر خرچ کر دیا ہے، تو ایسا خرچ حرام شمار ہوگا۔ اگر کسی مباح کام پر خرچ کیا ہے مگر ثواب کی نیت نہیں کی، تو ایسا خرچ جائز تصور ہوگا۔

چونکہ اس آیت میں ضرورت سے زائد چیز خرچ کرنے کا حکم ہے، اس سے محسوس ہوتا ہے کہ یہ فرض واجب کے متعلق نہیں کیونکہ زکوٰۃ وغیرہ کی مقدار تو مقرر ہے۔ مگر یہاں ہر زائد چیز کے خرچ کرنے کا حکم ہے تو اس سے مراد صدقہ خیرات اور دیگر نفلی اخراجات ہیں۔ بہر حال اس آیت سے ایک بات کی وضاحت ہوتی ہے کہ اپنی ضرورت کو مقدم رکھتے ہوئے اس سے زائد مال کو خرچ کرو۔ اگر خود اپنے لیے، اپنے بال بچوں کی جائز ضروریات موجود ہیں۔ اور ان ضروریات کو پورا کرنے کے بعد کچھ نہیں بچتا، تو مت خرچ کرو۔ پہلے اپنی ضروریات پوری کرو، اپنی ضروریات کو پس پشت ڈال کر حق تلفی نہ کرو۔ ہاں بعض خاص شخصیات ہیں۔ جیسے حضرت صدیق اکبرؓ جن میں صبر کا مادہ بذریعہ قائم موجود ہے تو ایسے شخص اللہ کی راہ میں سب کچھ قربان کر سکتے ہیں۔ مگر جو شخص صبر کے اس مرتبہ پر نہ ہو، اُسے اپنی ضروریات کو مقدم رکھ کر خرچ کرنا ہوگا۔

ذخیرہ اندوزی
کی ممانعت

مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ بات بھی اخذ ہوتی ہے کہ ذخیرہ اندوزی درست نہیں ہے مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ یا بَنِ اٰدَمَ اِنَّ تَمَسِدَ شَيْئًا لَّكَ لَے اَدَمَ کے بیٹے، اگر چیز کو روک رکھو گے تو یہ تمہارے لیے شر ہوگا۔ اور اگر زائد حصہ کو خرچ کر دو گے، تو یہ تمہارے لیے بستر ہوگا۔ وَلَا تَلَامُ عَلٰی كِفَافٍ اور اگر آمد و خرچ برابر ہیں۔ تو بچہ زائد نہ

خرج کرنے پر کوئی ملاصقت نہیں ہے۔ اگر کوئی شخص فرائض ادا نہیں کرتا تو وہ عند اللہ
ماخوذ ہوگا، اور اگر فرض کی ادائیگی کے بعد روک رکھا ہے۔ تو ثواب سے محروم ہو
گیا۔ اگر ضرورت سے زائد موجود ہے مگر خرچ نہیں کرتا، تو بخل کا مادہ پیدا ہوگا،
ثواب سے محروم ہوگا۔ اور شر بہر حال ہوگا۔

عز و فخر
کی دعوت

فرمایا كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ اس طرح اللہ تعالیٰ تمہارے
لیے احکام بیان کرتا ہے۔ یہاں پر آیات سے مراد احکام ہیں كَذَلِكَ
تَتَفَكَّرُونَ فَلَمَّا تَمَّ عَزْر و فخر کرو، فِي الدُّنْيَا وَالْآخِرَةِ دنیا اور آخرت
کے بارے میں۔ دنیا محل حوائج ہے۔ یہاں پر رہ کر انسان ضرورتوں اور حاجتوں پر
درماندہ ہوتا ہے۔ اس کا بھی لحاظ رکھو۔ اور آخرت تو ثواب دائمی کا محل ہے
اس کا بھی خیال رکھو۔ مقصد یہ ہے کہ دنیوی اور آخرتی دونوں ضروریات کو
ذہن میں رکھو۔ نہ یہاں محروم رہو اور نہ وہاں، بلکہ ہر دو مقامات کے لیے لوازمات
مہیا کرو۔ سورۃ بنی اسرائیل میں آتا ہے کہ نہ ہاتھ کو زیادہ کھلا رکھو کہ خود محتاج ہو
جاؤ اور نہ اتنا سیکڑ کر رکھو کہ بخل شمار ہو۔ بلکہ اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ اپنی جائز ضروریات
پوری کرو، اور اس کے بعد مال کو روک کر نہ رکھو۔ بلکہ غریبوں اور محتاجوں کو بھی انکاحی ادا کرو۔
جائز ضروریات میں انسان کے بنیادی اخراجات ہیں، جیسے کھانا، پینا، لباس
صحت، تعلیم، رہائش وغیرہ ہیں۔ ان چیزوں پر خرچ کرنے پر کوئی پابندی نہیں۔ البتہ اگر
ریڈیو، ٹیلیوژن، کھیل تماشہ کو بھی بنیادی ضروریات میں شمار کر لیا جائے، تو پھر انسان
کے پاس کبھی کچھ نہیں بچے گا۔ یہ سامان تعیش ہے اور اس کی کوئی حد نہیں۔ اس زمانہ
میں مکانات کی بلا ضرورت زیبائش، ان میں قیمتی سے قیمتی فرنیچر، پڑے، قالین، فرج
وغیرہ سب بلا ضرورت ہیں۔ اور ان اشیاء پر خرچ کرنا بلا جواز اور محتاجوں کی حق تلفی
کے مترادف ہے۔ اور اگر اس دنیا میں سب کچھ اپنی ذات پر ہی خرچ کر جاؤ، تو پھر آخرت
میں محرومی کا منہ دیکھنا پڑے گا۔ اسی لیے فرمایا کہ دنیا و آخرت ہر دو مقامات کا خیال رکھو
یہاں پر بھی جائز ضروریات سے محروم نہ رہو، اور آخرت کے لیے بھی توشہ تیار کرو۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ

درس نو دویک (۹۱)

آیت ۲۲۰ بقیہ

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ قُلْ إِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ وَأَنْ
تُخَالِطُوهُمْ فَإِخْوَانُكُمْ وَاللَّهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ
وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ لَا غَنَتُكُمْ عَنْهُ إِنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۲۲۰

ترجمہ :- اور لوگ آپ سے یتیموں کے متعلق سوال کرتے ہیں، آپ کہہ دیجئے، انکی اصلاح کرنی ان کے حق میں بہتر ہے۔ اور اگر تم ان کو اپنے ساتھ ملا لو، تو وہ تمہارا بھائی ہیں۔ اور اللہ جانتا ہے خرابی پیدا کرنے والے کو سنوارنے والے سے۔ اور اگر اللہ چاہتا، تو ہمیں مشقت میں ڈال دیتا۔ بیشک اللہ کمال قوت کا مالک اور حکمت والا ہے۔ (۲۲۰)

گزشتہ
پرست

اس سے پہلی آیات میں شراب اور جوئے نیز خرچ کے متعلق سوالات اور ان کے جوابات تھے۔ پورے قرآن پاک میں کل بارہ یا تیرہ مقامات ایسے ہیں جن میں اس قسم کے سوالات کا ذکر ہے۔ یعنی لوگ آپ سے فلاں سوال کرتے ہیں۔ اور ایسے لوگ بالعموم اہل ایمان ہیں۔ حضرت عبداللہ ابن عباسؓ کی روایت میں آتا ہے کہ آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ سے بہتر کوئی انسان نہیں ہے۔ وہ لوگ حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے بہت کم سوال کرتے تھے۔ بکثرت سوال کرنے کی بجائے اصحاب رسول آپ کی بات کو نہایت غور سے سنتے تھے اور پھر اس پر عمل شروع کرتے تھے۔ حضور علیہ السلام دین کی ضروری باتیں خود بخود بیان فرما دیا کرتے تھے۔ اس لیے اس قسم کے سوالات کی بہت کم ضرورت پڑتی تھی۔

گزشتہ درس میں شراب کی حرمت کے مختلف مراحل کا تذکرہ ہو چکا ہے

کے قریب نہ جاؤ۔ دوسری جگہ فرمایا اِنَّ الَّذِيْنَ يَأْكُلُوْنَ اَمْْوَالَ الْيَتٰمٰى ظُلْمًا اِنَّهُمْ يَأْكُلُوْنَ فِيْ بُطُوْنِهِمْ نَارًا تَنْبِيْءُ سُوْرَةُ اِلٰہِیْنَ جہنم کے ذریعے یتیموں کا مال کھاتے ہیں، دراصل وہ اپنے پیٹوں میں آگ کھاتے ہیں۔

ان آیات کے نزول پر صحابہ کرام یتیموں کے مال کے متعلق بڑے محتاط ہو گئے۔ چنانچہ انہوں نے ان کی آمدنی اور خرچ اپنے سے بالکل علیحدہ کر دیا۔ مقصد یہ تھا کہ ملا کر کھانے پینے سے کہیں یتیم کے مال کا کوئی لقمہ سو ابھی ہمارے پیٹ میں نہ چلا جائے جس کی وجہ سے قابل مؤاخذہ ٹھہریں۔ ایسا کرنے سے وقت پیش آئی کہ بعض اوقات یتیم کا مال ضائع ہو جاتا تھا مثلاً یتیم کے لیے علیحدہ سالن روٹی وغیرہ لپکائی گئی ہے

اُس نے پورا کھانا

نہیں کھایا اور وہ بچ گیا ہے۔ تو یتیم کا بچا ہوا کھانا وعید خداوندی کے پیش نظر خود نہیں کھاتے تھے۔ اس لیے وہ خراب ہو کر ضائع ہو جاتا تھا ایسی صورت میں صحابہ کرامؓ یہ سوال کرنے پر مجبور ہو گئے جو اس درس میں بیان ہوا ہے۔

یتیم کی سرپرستی

یہ عابدِ مسلم یا کون سے پجور ہرگز نہیں ہیں۔
يَسْئَلُونَكَ عَنِ الْيَتَامَىٰ ۖ يَا اُدُوهُ بِالْكُلِّ اَلَا
کرتے ہیں کہ ان کا مال آپس میں ملا کر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ یادو بالکل الگ
ٹھک رہنے دیا جائے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کے جواب میں فرمایا قَدْ اَبَدْنَا
بِحُكْمٍ اَصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ اُنْ کے متعلق اصلاح کا کام ہی بہر حال بہتر ہے
یعنی یتیموں کی بھلائی ہر حالت میں مقصود رہونی چاہیے۔ اگر اُن کا آمد و خرچ بالکل علیحدہ
رکھنا اُن کے لیے بہتر ہے۔ تو ایسا کر لو۔ اور اگر اپنے ساتھ ملا لینا اُن کے حق میں
جاتا ہے۔ تو انہیں ساتھ ملانے کی بھی اجازت ہے۔ اس میں سہولت یہ ہوگی۔ کہ
اگر کسی یتیم نے کسی ایک وقت میں مشترکہ کھانے میں سے کھانا استعمال نہیں
کیا۔ تو وہ اس کے سر پرست استعمال کر لیں گے۔ اور اگلے دن یتیم اپنے سرپرست
کا کھانا کھا لے گا۔ اور اس طرح یتیم کا مال ضائع نہیں ہوگا۔

اس ضمن میں مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ گلنے سڑنے والی یا خراب ہو جانے والی چیز کو یتیم کے مال کے ساتھ ملا لینا چاہیے۔ تاکہ اُس کا نقصان نہ ہو۔ اور جس چیز کے خراب ہونے کا احتمال نہیں۔ یتیم کی وہ چیز علیحدہ ہی رہنے دی جائے اسی لیے فرمایا کہ اگر کوئی چیز ملا لینے میں یتیم کی بہتری ہے۔ وَ اِنْ تَخَا۟لَفُوْهُۥۤ اَع۟رَضُوْا عَنْهُۥۚ وَ اِلٰی رَبِّکُمْ مَّر۟جِعُکُمْ۔ اور اگر ایسی صورت ہو کہ یتیم تمہارا دینی بھائی نہیں ہے۔ کسی غیر مسلم کا بیٹا ہے۔ تو اس صورت میں بھی اس آیت کی رو سے اس کے ساتھ وہی معاملہ کرنا ہوگا، جو اس کے حق میں بہتر ہے اور اس کے ساتھ وہی سلوک ہوگا، جو ایک مسلمان کے ساتھ ہوتا ہے۔

یتیموں سے متعلق اسلام کے اس زریں اصول کو غیر مسلم انگریزوں نے بھی سراہا ہے ایک انگریز مصنف (باسو تھمٹھ) لکھتا ہے کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم یتیموں پر خاص نظر شفقت رکھتے تھے۔ کیونکہ آپ خود بھی یتیمی کے دور سے گزر چکے تھے۔ اسی لیے تو اللہ تعالیٰ نے آپ کو یاد دلایا اَللّٰهُ یَجِدُکَ یَتِیْمًا فَاَوِّیْ کَیَا۟ہِمۡ نَآ۟یۡۤا اور پھر ٹھکانا دیا کیا۔ فَاَمَّا اِلَیۡہِۡمَ فَاَسَلَا۟ تَقۡصُرُ لَہُمۡ لَیۡتِیۡمٌ کُوۡرٌ اِنۡہِیۡ جَہِیۡۤا۟یۡۤا۔ بلکہ فرمایا ان کے حق میں اصلاح بہتر ہے۔ اس سے مفسرین کرام نے یہ مسئلہ اخذ کیا ہے کہ اگر یتیم کی تعلیم و تربیت کے لیے اُس کو

ڈانٹ بھی دیا جائے

تو جائز ہے کیونکہ اس کی اصلاح کے لیے ہے۔ البتہ یتیم کو مارنے یا دوسری ایذا پہنچانے سے نبی علیہ السلام نے سخت منع فرمایا ہے۔ آپ کا ارشاد ہے کہ جب یتیم روتا ہے۔ تو خدا تعالیٰ کا عرش کانپ جاتا ہے۔ لہذا اُن کو مارنا پٹینا درست نہیں۔ البتہ ان کی اصلاح کی خاطر ڈانٹ ڈپٹ جائز ہے۔

ایک اسم کی مصنف رائٹس نے اپنی کتاب سوشل لاز آف دی قسٹن
 SOCIAL LAWS OF THE QUR'AN میں لکھا ہے کہ دیکھو حضرت محمد صلی
 اللہ علیہ وسلم کی تعلیمات میں یتیموں کی پرورش، ان کی نگرانی اور رعایت، کا کس قدر
 خیال رکھا گیا ہے۔ یہ اسلامی تعلیمات

کی برتری کا ثبوت ہے۔ کمزوروں کی لدرسی کی تاکید جن قدر اسلام نے کی ہے
 کسی اور مذہب نے نہیں کی۔ اسلام نے یتیم، مسکین، مسافر، یتیم، وغیرہ کے ساتھ
 حسن سلوک اور ان کی خدمت کا زبردست حکم دیا ہے بلکہ اس سوسائٹی کو ملعون قرار
 دیا ہے جس سوسائٹی میں کمزور، بطعقول، پر غلام و زباندی کی جاتی ہو۔ جو لوگ بے کسوں
 کی دستگیری کرتے ہیں۔ وہ اللہ کی رحمت کو اپنی طرف کھینچنے والے ہوتے ہیں
 فرمایا یتیموں کی ہر حالت میں خیر خواہی چاہو۔ اور اس مقصد کے حصول کے
 لیے انہیں الگ رکھو یا ساتھ ملاؤ، یہ تم پر منحصر ہے۔ البتہ ایک بات یاد رکھو کہ تم جو
 بھی فیصلہ کرو گے، اللہ تعالیٰ تمہاری یتیموں کو جانتا ہے۔ کہ تم نے یہ فیصلہ نیک نیتی
 سے کیا ہے۔ یا بد نیتی سے۔ اس فیصلہ سے فائدہ اڑو یا اصلاح کا پیو۔ واللہ

يَذْكُرُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ اللہ تعالیٰ فائدوں اور اصلاح کنندگان سب
 کو اچھی طرح جانتا ہے۔ اُسے علم ہے کہ تم جو بھی یتیموں کے متعلق فیصلہ کرتے
 ہو۔ وہ کس نیت کے ساتھ کرتے ہو بصورتِ علیہ السلام کا فرمان ہے۔ لے مولا کیرم
 اِنَّكَ تَقْلَعُ خَائِبَةً الْاَعْيُنَ وَمَا تُخْفِي الصُّدُورُ تو آنکھوں کی خیانت
 کو بھی جانتا ہے اور دلوں کے پوشیدہ رازوں سے بھی واقف ہے۔ جو کوئی
 یتیموں کے متعلق بُری نیت سے معاملہ کرے گا، اللہ تعالیٰ اسے محنتی نہیں ہے
 ایسا شخص اللہ کے مذاق سے بچ نہیں سکتا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ نے یہ حکم تمہاری آسانی کے لیے دیا ہے۔ کہ چاہو تو الگ
 رکھو یا چاہو تو ساتھ ملاؤ۔ وَلَوْ شَاءَ اللّٰهُ لَاعْتَدْتُمْ لَكُمْ دُكْرًا اللہ جانتا تو تمہیں
 مشقت میں ڈال دیتا۔ اور حکم دیتا کہ یتیموں کا خرچ لازم علیہ رکھو، پھر تمہارے

مفسد اور
 مصلح

لیے معیار پر پورا اترنا مشکل ہو جاتا اب اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے آسانی پیدا فرما
 دی ہے۔ کہ وہ کام کرو جس میں یتیموں کی بھلائی مقصود ہو۔ اِنَّ اللہَ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ
 بیشک اللہ تعالیٰ زبردست اور کمال قوت کا مالک ہے۔ وہ حکیم ہے۔ وہ
 انسانوں کی مصلحت کے مطابق حکم دیتا ہے۔ اس کا کوئی حکم ایسا نہیں ہے جو
 انسانوں کی مصلحت کے خلاف ہو۔ لہذا اس کے احکام کی پیروی کرتے ہوئے یتیموں
 کے ساتھ بہتر سلوک روا رکھو۔

وَلَا تَتَكْبَحُوا الْمَشْرِكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَ الْيَوْمَ وَلَا مَنَّهُ مُؤْمِنَةً
 خَيْرٌ مِّنْ مَّشْرِكَةٍ وَلَوْ أَعْجَبَتْكُمْ وَلَا تَتَكْبَحُوا الْمَشْرِكِينَ
 حَتَّىٰ يَأْتِيَ الْيَوْمَ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مَّشْرِكٍ وَلَوْ أَعْجَبَكُمْ
 أُولَٰئِكَ يَدْعُونَ إِلَى النَّارِ وَاللَّهُ يَدْعُو إِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ
 بِإِذْنِهِ وَيُبَيِّنُ آيَاتِهِ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ ۚ (۲۲۱)

ترجمہ: اور مشرک عورتوں کے ساتھ نکاح نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں
 البتہ ایک ایماندار لونڈی مشرک عورت سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو کتنی اچھی معلوم
 ہو۔ اور نہ نکاح کرو مسلمان عورتوں کا مشرکوں کے ساتھ، یہاں تک کہ وہ ایمان لے
 آئیں۔ البتہ ایک ایماندار غلام مشرک سے بہتر ہے، چاہے وہ تم کو اچھا معلوم ہو
 یہ لوگ (مشرک) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ جنت
 اور بخشش کی طرف اپنے حکم سے اور بیان کرتا ہے اپنے احکام لوگوں کے
 لیے، تاکہ وہ نصیحت قبول کر لیں (۲۲۱)

گزشتہ آیت میں یتیموں کے ساتھ حسن سلوک کا بیان تھا کہ اُن کے
 ساتھ وہ معاملہ کرنا چاہیے، جو ان کے حق میں بہتر ہو۔ اور اُن کی اصلاح مقصود
 ہو، اُن کو کھانے میں شریک کیا جاسکتا ہے۔ البتہ اللہ تعالیٰ نے تنبیہ کے طور
 پر فرمایا کہ اللہ تعالیٰ تمہاری نیتوں سے واقف ہے۔ وہ جانتا ہے کہ یتیموں
 کے متعلق تمہارا فیصلہ اصلاح پر مبنی ہے یا فساد پر۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یتیموں
 کو اپنے ساتھ ملانے کی اجازت دے کر تم پر مہربانی فرمائی ہے ورنہ تم مشقت
 میں پڑ جاتے۔

اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے نکاح جیسے اہم مسئلہ کی طرف توجہ دلائی ہے۔ اور حکم دیا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُوْمِنُوْا مَشْرُک عورتوں سے نکاح نہ کرو یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ نکاح محبت اور رافت کا معاملہ ہے۔ اللہ تعالیٰ نے میاں اور بیوی کے درمیان شفقت و محبت کو پیدا فرمایا ہے اگرچہ نفسانی تقاضے بھی پورے ہوتے ہیں مگر اصل جوہر الفت و محبت ہے۔ جیسا کہ دوسری جگہ فرمایا **وَجَعَلَ بَيْنَكُم مَّوَدَّةً وَرَحْمَةً** ہم نے ان کے درمیان رافت و رحمت کے جذبے کو پیدا کیا۔ لہذا اس پاکیزہ رشتے کو قائم رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ میاں بیوی ہم عقیدہ و ہم خیال ہوں ورنہ اس رشتہ کا قائم رکھنا ممکن نہیں۔ اسی لیے فرمایا مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو۔ یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ اور پھر دلیل کے طور پر فرمایا **وَلَا مِمَّا مَلَٰكَتْهُنَّ خَيْرٍ مِّنْ مَّشْرِكَةٍ** ایک مومنہ لونڈی مشرکہ آزاد عورت سے بہتر ہے۔ **وَلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ** اگرچہ مشرکہ عورت تمہیں کتنی اچھی لگے۔ معاشرے میں لونڈی کی حیثیت آزاد عورت کی نسبت کم تر ہے۔ مشرکہ اگرچہ آزاد ہو، مالدار ہو، حسن و جمال میں بھی خوب ہو، اس کے باوجود ایک مومنہ لونڈی اللہ کے ہاں بہتر ہے۔ اگرچہ اس کے پاس مال و دولت اور حسن بھی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ جب مشرکہ کا دین الگ ہوگا، عقیدہ غلط ہوگا، تو میاں بیوی کی راہیں جدا جدا ہوں گی اور ان میں رافت و محبت کا وہ رشتہ قائم نہیں ہو سکے گا۔ جو نکاح کی غرض و غایت ہے۔ لہذا امومنز کو منع فرمادیا کہ مشرکہ عورتوں سے نکاح نہ کریں۔

آگے مومنہ عورتوں کے لیے حکم دیا جا رہا ہے۔ وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكِينَ حَتَّىٰ يُوْمِنُوْا ان کے نکاح مشرک مردوں سے نہ کرو، یہاں تک کہ وہ ایمان لے آئیں۔ جس طرح مومن مردوں سے مشرکہ عورتوں کا نکاح جائز نہیں، اسی طرح مومن عورتوں کا مشرک مردوں سے نکاح درست نہیں۔ آگے دلیل کے طور پر فرمایا **وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ** ایک مومن غلام مشرک

آزاد مرد سے بہتر ہے۔ وَلَوْ اَعْجَبَكُمْ اَلْاِگَر چہ تمہیں مشرک بھلا معلوم ہو۔ یعنی مالدار ہو، صحت مند ہو، اور شکل و صورت میں بھی پسندیدہ ہو، مگر مشرک ہونے کی وجہ سے اس کے ساتھ نکاح جائز نہیں کیونکہ عقیدے کی خرابی کی وجہ سے یہاں بیوی کا نباہ ممکن نہیں نیز قرآن پاک نے فیصلہ کر دیا اَلْاِنْفَا الْمَشْرِکُوْنَ یَحْسَبُ یَشْکُ مَشْرِکِیْنَ نَآپَاکِیْ کیونکہ ان کا عقیدہ غلط ہے مشرک کی غلاطی اُس کے دل و دماغ میں سرایت کر چکی ہے، جو کہ میاں بیوی کے مقدس رشتہ کے منافی ہے۔ لہذا نکاح کے لیے ایمان دار مرد کو تلاش کر دو، جس کا عقیدہ درست ہو، اگرچہ وہ کم تر حیثیت کا مالک ہو۔

مولانا شیخ الہندؒ لکھتے ہیں۔ اور احادیث سے بھی معلوم ہوتا ہے۔ کہ پہلی امتوں میں مومن مرد اور مشرک عورت یا مومنہ عورت اور مشرک مرد کا نکاح جائز تھا۔ نکاح کے معاملہ میں مسلم اور غیر مسلم میں کوئی امتیاز نہیں تھا۔ جیسا کہ حضرت نوح علیہ السلام اور حضرت لوط علیہ السلام کی بیویاں مشرک اور کافرہ تھیں۔ خود قرآن پاک نے گواہی دی ہے "کَانَتْ اَخْتُ عَبْدِ ذِیْنِ وہ دونیک بندوں کے نکاح میں تھیں، مگر اُن کا عقیدہ فاسد تھا۔ اب شریعت محمدیہ میں اللہ تعالیٰ نے حکم نازل فرما دیا۔ کہ نہ مومن مرد مشرک عورت سے نکاح کرے اور نہ مومنہ عورت مشرک مرد کے عقد میں جائے یہاں تک کہ مشرکین ایمان لے آئیں۔ ایسی صورت میں نکاح جائز ہوگا۔

اردو ناقض
نکاح ہے

یہاں پر ایک سوال پیدا ہوتا ہے کہ نکاح کے بعد اگر کوئی مرد یا عورت مشرک ہو جائے یا مرتد ہو جائے۔ تو اس نکاح کی کیا حیثیت ہوگی جو بحیثیت مومن مرد اور مومنہ عورت ہوا تھا۔ اس کا جواب یہی ہے کہ نکاح ٹوٹ جائے گا۔ اگر مرد مشرک ہو گیا ہے یا دہریہ ہو گیا ہے۔ تو عورت اُس کے مرتد ہونے کے وقت سے آزاد ہو جائیگی۔ البتہ نکاح ثانی کے لیے اُسے عدت گزارنا ہوگی۔ اگر عورت کہ حیض آتے ہیں تو اسکی عدت تین حیض ہیں۔ اگر حیض نہیں آتے تو تین ماہ عدت گزارے گی اور اگر حاملہ ہے تو اس کی عدت وضع حمل ہے۔ عدت پوری کرنے کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔

مشرک کی ہے

مشرک کی تعریف میں شاہ عبدالقادر دہلویؒ اور شیخ الہند مولانا محمود الحسنؒ فرماتے

ہیں شرک یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت یا اسکی کسی خاص صفت میں کسی دوسرے کو شریک کیا جائے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ علم محیط کا مالک ہے سو کائن اللہ بِکُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ یعنی اس کا علم ہر چیز کو گھیرنے والا ہے۔ اب اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ تعالیٰ کے علاوہ کسی ہستی کا علم بھی ہر شے پر محیط ہے۔ اور وہ ہر چیز کو جانتا ہے۔ تو ایسا عقیدہ رکھنے والا مشرک ہو گیا۔ کیونکہ کائنات کے ذرہ ذرہ کا عالم ہونا اللہ کی صفت مختصہ ہے۔ اور اس میں غیر اللہ کی شرکت شرک ہے۔ اس زمانہ میں یہ عام عقیدہ ہے کہ ہمارے پیر یا فلاں بزرگ یا پیغمبر علیہ السلام کو ذرہ ذرہ کا علم ہے۔ یہی شرک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی ایک اور صفت خاصہ قادر مطلق ہونا ہے۔ "وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ" گو یا اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ لہذا وہ جو چاہے کر سکتا ہے اب اگر یہی صفت کسی غیر اللہ میں ثابت کی جائے کہ فلاں بھی جو چاہے کر سکتا ہے تو ایسا اعتقاد رکھنے والا مشرک ہو گیا۔ کیونکہ اُس نے اللہ تعالیٰ کی خاص صفت اُس کے علاوہ کسی دوسرے کے لیے ثابت کی۔ اسی طرح "وَاللَّهُ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ شَهِيدٌ" ہے۔ ہر چیز اللہ کی نگہبانی میں ہے اور وہ ہر چیز پر گواہ ہے۔ اگر یہی صفت کسی دوسرے میں مانی جائے تو شرک کا ارتکاب ہو گیا۔ کسی چیز کو حلال یا حرام قرار دینا بھی اللہ تعالیٰ کی خصوصی صفت میں ہے۔ اگر کوئی شخص یہ عقیدہ رکھے کہ اللہ کے علاوہ کوئی اور ہستی بھی حلال و حرام کرنے کی مجاز ہے۔ تو ایسا شخص بھی خدا تعالیٰ کی صفت مختصہ میں شرک کا مرتکب ہوا۔ اس کی مثال اہل کتاب کی ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ کہ اہل کتاب کے علماء جس چیز کو حلال قرار دیں وہ اُن کے نزدیک حلال ہے۔ اور جس کو حرام کہ دیں، اس کو حرام مان لیتے ہیں۔ یہ بھی اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک ہے۔ اسی طرح جو تعظیم خدا تعالیٰ کے ساتھ مخصوص ہے۔ جیسا سجدہ کرنا، اگر ایسی ہی تعظیم یا سجدہ کسی غیر اللہ کے لیے کیا جائے، تو شرک میں داخل ہو گا۔ مولانا شیخ السبزواری فرماتے ہیں کہ علم یا قدرت یا کسی دیگر صفت خداوندی میں

کسی غیر کو خدا کا مائل سمجھنا، خدا کے مثل کسی کی تعظیم کرنا، یا کسی کو خدا سمجھ کر اس سے حاجت طلب کرنا، ان تمام صورتوں میں الیا تعظیمہ سمجھنے والا یا الیا مثل کرنے والا شرک تصور ہو گا۔ زمانہ جاہلیت میں مشرکین الیا ہی کرتے تھے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مشرک کے متعلق فیصلہ کر دیا۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ جب ہم شرک سے دل سے توبہ نہ کرے، یہ گناہ معاف نہیں ہو گا۔ اسی لیے میاں یا بیوی میں کوئی ایک بھی شرک کا مرتکب ہو گا تو ان کا نکاح ٹوٹ جائے گا۔

اہل کتاب عورتوں سے نکاح جائز ہے

البتہ ایک اور مسئلہ یہاں پر قابل بیان ہے بعض دوسری آیات سے ثابت ہے کہ یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح درست ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس کی اجازت دی ہے۔ وَالْمُحْصَنَاتُ مِنَ الَّذِينَ اَوْفَوْا بِالْكِتَابِ مِنْ قَبْلِكُمْ اهل کتاب کی پاک دامن عورتوں سے مسلمان نکاح کر سکتا ہے۔ جب کہ زوجین اپنے اپنے دین پر قائم رہیں۔ اگرچہ یہ پسندیدہ کام نہیں ہے۔ تاہم اس کی اجازت دی گئی ہے۔ حضرت عثمانؓ نے عیسائی عورت نامہ تعبیر سے نکاح کیا تھا بعد میں اللہ تعالیٰ نے اسے توفیق بخشی اور وہ اسلام لے آئی۔ حضرت عذیرہؓ نے ایک یہودی عورت سے نکاح کیا تھا۔ حضرت عمرؓ کو عظم مولاؓ کو انہوں نے ناراضگی کا اظہار کیا۔ حضرت عذیرہؓ نے پوچھا کیا یہ نکاح ناجائز ہے۔ فرمایا، ناجائز تو نہیں مگر خطرناک ضرور ہے۔ ہو سکتا ہے کہ تمہارے نکاح میں بدکار عورتیں آجائیں اور تمہارا اخلاق بگڑ جائے۔ اور یہ بھی خطرہ ہے کہ وہ تم پر اس قدر اثر انداز ہوں کہ تمہارے دین میں بگاڑ پیدا ہو جائے۔ نکاح میں بیاد و محبت کو بڑا دخل ہے، اور محبت میں اگر انسان بہت کچھ کر بیٹھتا ہے۔ لہذا حضرت عمرؓ نے حکم دیا کہ اس بی بی کو حد کر دو یہ پسندیدہ فعل نہیں ہے۔ بہر حال یہود و نصاریٰ کی عورتوں سے نکاح جائز ہے، بشرطیکہ وہ اپنے دین پر قائم رہیں۔ اس سے مراد یہ ہے کہ وہ حضرت موسیٰ علیہ السلام یا حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو ماننے والی ہوں اگرچہ وہ شرک بھی کرتے ہیں۔ مگر محمدؐ اور دہریہ نہ ہوں، جیسا کہ آج کل اکثر نصاریٰ ہیں۔ عام طور پر تمام انگریزوں کو عیسائی سمجھا جاتا ہے۔ حالانکہ ان میں بہت سے

دہریہ ہوتے ہیں، جو نہ کسی کتاب کو مانستے ہیں۔ اور نہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ان کا ایمان ہے۔ ایسی عورتوں سے نکاح جائز نہیں۔

نکاح کی طرح اہل کتاب کے ذبیحہ کو بھی حلال قرار دیا گیا ہے۔ بشرطیکہ وہ اللہ کا نام لے کر ذبح کریں۔ اگر حضرت موسیٰ علیہ السلام یا عیسیٰ علیہ السلام کا نام لے کر ذبح کریں گے۔ تو جانور حلال نہیں ہوگا۔ حضرت مولانا شیخ الحدیث صاحب مالٹا میں نظر بند دسیر تھے تو وہ عیسائیوں کا ذبیحہ نہیں کھاتے تھے انہوں نے مطالبہ کیا کہ انہیں زندہ جانور مہیا کیا جائے، سچے وہ خود ذبح کریں گے آپ فرماتے تھے کہ اُن کی پچی ہوئی روٹی تو کھالیں گے مگر ان کا ذبیحہ نہیں کھائیں گے، کیونکہ ہماری تحقیق کے مطابق یہ لوگ عیسائی نہیں، بلکہ دہریہ ہیں۔ بہر حال کافی تک دو کے بعد انگریزوں نے حضرت شیخ الحدیث کا مطالبہ تسلیم کر لیا۔

الغرض اس آیت کا خلاصہ یہ ہوا کہ مسلمان مرد و نکاح مشرک عورت سے درست نہیں تا وقتیکہ مسلمان نہ ہو جائے۔ اور اس آواز مشرک سے ایک لوندی بہتر ہے گویا ایک ادنیٰ سے ادنیٰ مسلمان، اعلیٰ سے اعلیٰ مشرک سے بہتر ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ اَلْمُؤْمِنُ الْقَوِيُّ خَيْرٌ مِّنْ الْمُؤْمِنِ الْفَاقِرِ بِهٖ وَفِي كُلِّ خَيْرٍ اَوْ پھر ہر ایک میں بہتری ہے جو کافر اور مشرکین نہیں، یعنی کمزور مسلمان طاقتور مشرک سے بہتر ہے۔ مشرکین سے جس قدر محبت کی جائیگی، اُسی قدر کفر و شرک سے نفرت میں کمی واقع ہو جائے گی اور یہ چیز اصل دین کو ضائع کرنے کا سبب بن سکتی ہے۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس کی وجہ یہ ہے۔ اُولَٰئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى النَّارِ کفار و مشرکین دوزخ کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ یعنی اپنے کام کرتے ہیں۔ جو دوزخ میں لے جانے کا سبب بنتے ہیں۔ ان کی تحریف، باطل رسومات شرک وغیرہ ایسے افعال ہیں جن کی وجہ سے دوزخ لازم ہو جاتا ہے۔ البتہ وَاللّٰهُ يَدْعُوْا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِ اللّٰهِ تعالیٰ اپنے حکم سے جنت اور مغفرت کی طرف دعوت دیتے ہیں۔ نیکی اور توحید کی طرف بلاتے

دوزخ اور
جنت کی طرف
دعوت

ہیں۔ اور اس طرف آجاؤ اور شکرِ افعال سے بچ جاؤ۔ فرمایا وَيُبَيِّنُ إِلَيْهِمُ الْآيَاتِ لِلنَّاسِ
اللَّهِ تَعَالَى اپنے احکام لوگوں کے پاس کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُونَ
 تاکہ وہ نصیحت پکڑ لیں، راہِ راست پر آجائیں اور دوزخ کے عذاب سے بچ جائیں۔

وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ قُلْ هُوَ أَذًى لَا فَاعِلٌ لِّلنِّسَاءِ فِي
 الْمَحِيضِ وَلَا تَقْرُبُوهُنَّ حَتَّىٰ يَطْهُرْنَ فَإِذَا تَطَهَّرْنَ
 فَأَتْوهُنَّ مِنْ حَيْثُ أَمَرَكُمُ اللَّهُ إِنَّ اللَّهَ يُحِبُّ التَّوَّابِينَ
 وَيُحِبُّ الْمُتَطَهِّرِينَ ﴿٢٢٢﴾ نَسِئُكُمْ حَرَّتْ لَكُمْ فَاتُوا
 حَرَّتْكُمْ إِلَىٰ شَعْتُمْ وَقَدْ مَوْلَا نَفْسَكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا
 أَنَّكُمْ مُّكَلَّفُونَ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِينَ ﴿٢٢٣﴾

ترجمہ: اور لوگ آپ سے حیض کا حکم پوچھتے ہیں۔ آپ کہ دیجئے وہ گندگی ہے۔ پس الگ
 رہو عورتوں سے حیض کے دوران۔ اور اُن کے قریب مت جاؤ، یہاں تک کہ وہ
 پاک ہو جائیں۔ جب وہ خوب اچھی طرح پاک ہو جائیں۔ پس جاؤ اُن کے پاس جہاں سے
 اللہ نے تمہیں حکم دیا ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ پسند کرتا ہے تو بہ کرنے والوں کو اور
 پسند کرتا ہے طہارت حاصل کرنے والوں کو ﴿۲۲۲﴾ تمہاری عورتیں تمہاری کھیتی
 ہیں۔ تو جاؤ اپنی کھیتی میں جس طرح تم چاہتے ہو۔ اور آگے بھیجو اپنے نفوس کے لیے
 اور ڈرو اللہ تعالیٰ سے اور جان لو کہ بیشک تم اس سے ملنے والے ہو۔ اور
 خوشخبری سنائے ایمان والوں کو ﴿۲۲۳﴾

رابط آیات

پچھلے رکوع میں مختلف مسائل کا ذکر تھا۔ اور سوالات کے جوابات تھے۔ خصوصاً
 شراب اور جوئے سے متعلق سوال کا جواب تھا۔ پھر شراب اور جوئے کی قباحت
 کا ذکر ہوا۔ پھر مال میں سے خرچ کرنے کے متعلق سوال آیا۔ اس کے جواب میں
 بنیادی قانون سمجھایا گیا۔ کہ اپنی بنیادی ضروریات کی تکمیل کے بعد خرچ کرنا چاہیے۔ پھر
 یتیموں کی اصلاح اور اُن کے خرچ کو اپنے ساتھ ملانے کے بارے میں سوال کیا گیا۔

اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے اجازت دی۔ کہ یتیموں کے حق میں جو چیز بہتر ہو، وہ ہونی چاہیے۔ ان کی اصلاح اور ان کے مال کی حفاظت بہر صورت پیش نظر رہنی چاہیے۔ یتیموں کا مال کھانا، جوئے کی کمانی کھانا، شراب کو استعمال کرنا یا اس کا کاروبار کرنا، کسی کا حق ناجائز طور پر کھانا۔ یہ سب چیزیں حرام ہیں۔ اسی طرح مومن مرد کا مشترکہ عورت کے ساتھ اور مومنہ عورت کا مشترکہ مرد کے ساتھ نکاح حرام قرار دیا گیا۔ ان تمام ناپاک افعال سے منع کیا گیا ہے۔ نکاح ہی کے ضمن میں عورتوں کے ایام ماہواری کا سوال پیدا ہوا۔ جس کا جواب اس آیت زیرہ درس میں دیا گیا ہے فقہائے کرام فرماتے ہیں **الدماء المختصة بالنساء ثلاثہ** عورتوں کے مخصوص خون تین قسم ہیں۔ اُن میں سے پہلی قسم حیض کا خون ہے، جو تندرست عورت کے رحم سے ہر ماہ چند دن تک خارج ہوتا ہے۔ اس کا اخراج لازمی ہے۔ اگر کسی وجہ سے یہ خون بند ہو جائے۔ تو عورت طرح طرح کی بیماریوں میں مبتلا ہو جاتی ہے۔ گویا یہ خون عورت کی تندرستی کی علامت ہے۔ جب تک عورت بالغ نہیں ہوتی۔ یہ خون شروع نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد جب حمل ٹھہر جاتا ہے۔ تو یہی خون بچکے کی خوراک بنتا ہے۔ لہذا حمل کے دوران بھی خارج نہیں ہوتا۔ اس کے بعد جب تک بچہ دودھ پیتا ہے۔ عموماً یہ خون رکھا رہتا ہے۔ اور پھر جب عورت کبر سن میں پہنچ جاتی ہے۔ یعنی تقریباً پچاس سال کی عمر میں جا کہ یہ یہ خون ہمیشہ کے لیے بند ہو جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ حجۃ الوداع کے سفر میں حضرت عائشہ صدیقہؓ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے ہمراہ تھیں۔ جب آپ کا قافلہ مکہ معظمہ کے قریب سرف کے مقام پر پہنچا، تو حضرت عائشہؓ کے ایام ماہواری شروع ہو گئے۔ ایام حج قریب تھے۔ اور آپ کو خدشہ پیدا ہوا کہ اس حالت کی وجہ سے وہ حج سے محروم نہ ہو جائیں۔ لہذا فرط غم سے رونے لگیں۔ حضور علیہ السلام تشریف لائے۔ تو فرمایا گھبراؤ نہیں ہذا شیء کتبہ اللہ علی بناتِ آدم یہ ایک فطری چیز ہے

عورتوں کے
خون مختصہ

جسے اللہ تعالیٰ نے آدم کی بیٹیوں کے لیے مکھ دیا ہے۔ فرمایا حج کے ضیاع کا فحہ نہ کرو۔ تم احرام باندھ لو، حج کے تمام ارکان ادا کرو، سوائے اس کے کہ طواف کو مؤخر کر دو، کیونکہ اس کے لیے مسجد الحرام میں جانا ضروری ہے۔ اور وہاں ایسی حالت میں نہیں جاسکتیں۔

عورت کے خون مختص کی دوسری قسم نفاس ہے یہ زچگی کے دوران آتا ہے۔ بچے کی پیدائش کے بعد کم و بیش چالیس روز تک رہتا ہے۔ اس کے بعد اسے نفاس نہیں شمار کیا جاتا۔ عموماً یہ خون دس بیس دن یا عینہ تک ختم ہو جاتا ہے۔ حیض اور نفاس کے خون کے احکام مشترک ہیں۔ البتہ تیسری قسم کا خون استحاضہ کہلاتا ہے۔ یہ بیماری کی وجہ سے آتا ہے۔ عورت کے رحم میں کوئی باریک سی رگ پھٹنے سے خون رستا رہتا ہے۔ اس کا حکم الگ ہے۔

حیض

حیض کی مدت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل ابو حنیفہ امام سفیان ثوری، امام محمد، اور اہل البویہ کہتے ہیں کہ حیض کی مدت کم سے کم تین دن اور زیادہ سے زیادہ دس دن ہے۔ اگر تین دن سے کم خون آکر ختم ہو گیا۔ تو وہ حیض شمار نہیں ہوگا، بلکہ کسی بیماری وغیرہ کا اثر ہوگا۔ اسی طرح اگر دس دن سے زیادہ عرصہ تک خون آتا رہا، تو وہ بھی حیض کے زمرہ میں نہیں آئے گا۔ بلکہ استحاضہ ہوگا، برخلاف اس کے امام شافعی فرماتے ہیں کہ حیض کی مدت ایک دن سے لے کر پندرہ دن تک ہے۔ اور ان ایام میں حیض ہی کے احکام لاگو ہوں گے۔ عورت نماز نہیں پڑھ سکے گی۔ اہل ابو حنیفہ کے مسلک کے مطابق تین دن سے دس دن تک کی مدت کے علاوہ بھی اگر خون آتا ہے۔ تو عورت کو غسل کر کے نماز پڑھنا ہوگی۔ ہندو مذہب میں بھی حیض کی مدت پندرہ دن تک ہے۔ البیرونی نے کتاب الهند میں لکھا ہے۔ کہ ہندو لوگ بھی پندرہ دن تک حیض شمار کرتے ہیں۔

اس مسئلہ میں دیگر مذاہب میں افراط و تفریط پائی جاتی ہے۔ مثلاً عیسائی حیض کی حالت میں عورت سے جماع کر لیتے تھے۔ برخلاف اس کے یہودی، مجوس

افراط و تفریط

اور ہندومت والے عائضہ سے اس قدر نفرت کرتے تھے۔ کہ اُسے گھر سے نکال دیتے۔ نہ وہ کسی چیز کو ہاتھ لگا سکتی اور نہ کھانا پکا سکتی۔ بلکہ یہودیوں کی خود ساختہ تورات میں موجود ہے۔ کہ اگر عائضہ عورت کسی شخص کے کپڑے کو ہاتھ لگا دے۔ تو وہ شخص چوبیس گھنٹے کے لیے ناپاک ہو جائے گا۔ جو کوئی ایسے کپڑے کو دھوئے گا وہ بھی پورے دن کے لیے پید ہو جائے گا۔

سوال جواب

افراط و تفریط کے اس دور میں صحابہ کرامؓ کو حیض کے متعلق احکام الہی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ چنانچہ انہوں نے حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا۔ اسی سوال کے متعلق فرمایا وَيَسْأَلُونَكَ عَنِ الْمَحِيضِ اے پیغمبر علیہ السلام یہ لوگ آپ سے حیض کے متعلق سوال کرتے ہیں۔ کہ آیا ان ایام میں عورت کے قریب جانا چاہیے یا نہیں۔ یا اس سے تعلق بالکل ہی قطع کر لیا چاہیے۔ اس کے جواب میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا قُلْ یعنی اے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم! ان سے کہہ دیں، هُوَ أَذْيٌ یہ گندگی ہے۔ أَذْيٌ اس گندگی کو کہتے ہیں۔ جو تکلیف دہ ہو یعنی یہ سخت ناپاکی کی حالت ہے فَاعْتَزِلُوا النِّسَاءَ فِي الْمَحِيضِ لہذا حیض کی حالت میں عورت کے قریب نہ جاؤ۔ مطلب یہ کہ ان ایام میں مباشرت کرنا حرام ہے۔ فقہائے کرامؓ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص حیض کی حالت میں عورت سے جماع کرتا ہے اور اسے حلال بھی جانتا ہے تو وہ کافر ہو گیا۔ کیونکہ اس نے اللہ تعالیٰ کے قطعی حکم کو توڑ دیا ہے۔ اور اگر نفسانی اور شیطانی غلبہ سے یہ کام کیا ہے۔ تو گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ ایسی غلطی کرنے والے کو توبہ کرنی چاہیے۔ استغفار کرے اور ایک دینار یا نصف دینار صدقہ دے۔

طبی لحاظ سے بھی حیض کے دوران جماع کرنا میاں بیوی کے لیے مضر صحت ہے۔ یہ خون بعض اوقات بدبودار بھی ہوتا ہے۔ اس کی رنگت بھی بے اوقات یا ہی مائل یا سٹیلی ہوتی ہے۔ لہذا اس حالت میں عورت سے پرہیز

کرنا چاہیے۔ البتہ یہودیوں کی طرح یہ بھی نہیں ہونا چاہیے۔ کہ عورت کو بالکل ہی گھر سے الگ کر دیا جائے۔ کہ کسی چیز کو ہاتھ بھی نہ لگا سکے۔ اسلام میں ایسا نہیں ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ اس آیت میں عورتوں سے الگ رہنے کا مطلب یہ ہے اُن سے مباشرت نہ کرو۔ اس کے علاوہ عورتیں کھانا پکا سکتی ہیں۔ تم اُن کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھا سکتے ہو۔ ایک چارپائی پر لیٹ سکتے ہو، ان سے دیگر خدمات لے سکتے ہو۔ تاہم نافرمانی سے لیکر گھٹنے تک کے حصہ کو نہ ہاتھ لگا سکتے ہو اور نہ دیکھ سکتے ہو۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ حیض کی حالت میں ام المؤمنین حضور علیہ السلام کا سر مبارک دھو ڈالتی تھیں۔ الغرض! اسلام نے اس معاملہ میں افراتوہ فراط سے بچنے کے لئے بہتر اور درمیانہ راستہ اختیار کیا ہے۔

حائضہ کے احکام

حیض والی عورت کے لیے حکم یہ ہے۔ کہ وہ اس حالت میں نماز نہیں پڑھ سکتی، اُس کے لیے حرام ہے۔ اسی طرح روزہ بھی نہیں رکھ سکتی۔ اس کے لیے نماز کی قضا بھی نہیں ہے۔ البتہ روزے کی قضا لازم ہے۔ حائضہ عورت کا مسجد میں داخلہ منع ہے اسی لیے طواف بھی نہیں کر سکتی۔ قرآن کریم کو ہاتھ نہیں لگا سکتی کیونکہ ناپاک ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ حیض و نفاس والی عورت یا جنابت والی عورت یا مرد قرآن پاک نہ چھو سکتے ہیں اور نہ اس کی تلاوت کر سکتے ہیں۔ البتہ درود شریف پڑھ سکتے ہیں۔ دیگر وظائف استغفار بسم اللہ وغیرہ کا درود کر سکتے ہیں۔ فرمایا وَلَا تَقْرَءُوا حَتَّى يَطْهَرُوا ان کے قریب نہ جاؤ جب تک کہ وہ پاک نہ ہو جائیں فَإِذَا طَهَرُوا اور جب وہ اچھی طرح پاکیزگی حاصل کر لیں۔ یہ مبالغہ کا صیغہ ہے یعنی خوب طہارت حاصل کر لیں۔ غسل جنابت کے سلسلہ میں بھی یہی صیغہ استعمال ہوا ہے فَاطْهَرُوا یعنی خوب اچھی طرح غسل کیا جائے۔ حتیٰ کہ بال برابر جبکہ بھی خشک نہ رہے۔ حیض و نفاس سے طہارت کا مطلب بھی یہی ہے۔ کہ خوب اچھی طرح غسل کیا جائے۔ کیونکہ حضور نے فرمایا کہ ہر بال کے نیچے جنابت ہوتی ہے۔ لہذا خوب مل کر بڑے اہتمام سے غسل کرنا چاہیے۔ جب یہ چیز حاصل ہو جائے۔

امتوں کے مشترکہ اصول ہیں۔

شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ پاکیزگی کے اصول میں عقیدہ کی پاکیزگی کو خاص اہمیت حاصل ہے۔ سورۃ مدثر میں آتا ہے وَالرَّحْبَ فَاَهْجُرْ یعنی دل و دماغ سے کفر و شرک اور بدعت کی گندگی کو نکال باہر کرو۔ جب تک عقیدہ پاک نہیں ہو گا، نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ کچھ کام نہ آئے گا۔ لہذا اس طرف خصوصی توجہ دینی چاہیے ایک اور اہم طہارت مال کی طہارت ہے جس مال سے انسان خوراک کھاتا ہے لباس پہنتا ہے، مکان بناتا ہے۔ وہ مال بھی پاک ہونا چاہیے۔ چوری، خیانت، رشوت، اور بلیک کمال اللہ تعالیٰ کو ہرگز نہ پسند نہیں۔ اسی طرح جس مال سے زکوٰۃ نہیں نکالی گئی وہ مال بھی پاک نہیں ہے۔ ایسے مال سے اللہ تعالیٰ صدقہ قبول نہیں کرتا ایسے شخص کی عبادت قبول نہیں کرتا۔ ایسا شخص مر گیا تو اپنے پیچھے جہنم کے راستہ کا ترشہ چھوڑ گیا۔

عورت بمنزلہ
کھیتی

آگے ایک اور مسئلہ بیان فرمایا۔ عورت کو کھیتی کے ساتھ تشبیہ دیتے ہوئے ارشاد ہوا۔ رَسَاؤُكُمْ حَرْثُكُمْ تمہاری عورتیں تمہارے لیے بمنزلہ کھیتی کے ہیں فَاَنْتُمْ اَحْرَثُكُمْ اُن کی شیشٹوں پس جاؤ اپنی کھیتوں میں جس طرح چاہو۔ اس مقام پر عورت کو کھیتی کہہ کر اللہ تعالیٰ نے یہ بات سمجھا دی کہ مرد کا نطفہ بمنزلہ تخم کے ہے اور اولاد بمنزلہ پیداوار کے ہے۔ جس طرح زمین میں بیج ڈالا جاتا ہے اور اس سے فصل پیدا ہوتی ہے۔ اسی طرح مرد کا یہ قطرہ آب عورت کے رحم میں جا کر بچے کی پیدائش کا سبب بنتا ہے۔ اب ظاہر ہے کہ اولاد جمی ہوگی جب نطفہ اصل مقام میں جائے گا۔ لہذا دوسرے مقام میں مباشرت کو حرام قرار دیا گیا ہے۔ اور اس کے متعلق سخت وعید آئی ہے۔ فَرَمَا مِنْ اَنِّ اَهْرَاةً فِي ذَوْبِهَا فَفَعْدُ كَفَرٌ بِمَا نَزَّلَ عَلٰی مُحَمَّدٍ صَلَّی اللہُ عَلَیْہِ وَاٰلِہٖ وَسَلَّم یعنی جس شخص نے عورت کے ساتھ پیچٹ کے راستے مباشرت کی اس نے محمد کی شریعت کا انکار کر دیا۔ وہ باغی اور مجرم ٹھہرا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ اَنِّ رَسَاؤُكُمْ

سے جماع کی کیفیت مراد ہے۔ یعنی تم جس طرح بھی پسند کرو مثلاً لیٹ کر یا بیٹھ کر یا کھڑے کے بل یا پیچھے سے ہو کر۔ مگر شرط یہ ہے کہ فی حکام واجد مقام ایک ہی ہو۔ دوسرے مقام کے استعمال کی اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے یہاں پر کھینچی کا لفظ لا کر ان سب باتوں کی وضاحت فرمادی۔

نیک اولاد
صدقہ جاریہ

فرمایا وَقَدْ مَوْلَا نَفْسِكُمْ اپنے نفسوں کے لیے کچھ آگے بھی بھجو یعنی اگلے جہاں کے لیے بھی نیکی کا کچھ فکر کرو۔ نیت صحیح ہونی چاہیے۔ مباشرت سے مقصود محض شہوت رانی ہی نہ ہو، اگرچہ یہ بھی روا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد اولاد کی پیدائش ہونا چاہیے۔ اگر صالح اولاد ہوگی۔ تو وہ تمہارے پیچھے صدقہ جاریہ ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اَوْ وَلَدٌ مَّصَالِحٌ يَدْعُوْا لَكَ نیک اولاد ہوگی تو تمہارے لیے دعا کرے گی، جو تمہارے لیے ذخیرہ آخرت ہوگا۔ وَ اتَّقُوا اللَّهَ اور اللہ سے ڈرو۔ کہیں اس کے قانون کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھنا۔ اس نے طہارت اور مباشرت تک کے قانون واضح کر دیے ہیں اب اُن سے روگردانی نہ کرنا۔ ایام حیض میں مباشرت سے نہ صرف اخلاق بگڑ جائے گا۔ بلکہ طرح طرح کی بیماریاں بھی لاحق ہو سکتی ہیں وَ اعْلَمُوا اَنَّكُمْ مَمْلُوقُوْهُ اور یاد رکھو، ایک نہ ایک دن تمہیں اللہ تعالیٰ سے ملاقات کرنی ہے۔ اس کے حضور پیش ہونا ہے۔ وہ ایسا دن ہوگا یَقُوْتَا تِي كُلِّ نَفْسٍ مُّجَادِلٌ عَنْ نَفْسِهَا جب ہر شخص خود اپنے نفس سے سوال و جواب کرے گا۔ درمیان میں کوئی ترجمان نہیں ہوگا۔ نہ کوئی وکیل ہوگا۔ اور نہ کوئی ساتھی۔ اپنی جوابدہی آپ ہی کرنا پڑے گی۔ اور آخری جملہ فرمایا وَ بَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ جو اہل ایمان ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اور قیامت کے دن پر یقین رکھتے ہیں پیغمبر پر ان کا ایمان ہے۔ احکام الہی پر یقین رکھتے ہیں۔ اس کے قانون کی پابندی کرتے ہیں۔ انہیں خوشخبری مٹا دیں کہ اللہ کے نزدیک ان کے لیے فلاح و کامیابی کے دروازے کھلے ہیں۔

سَيَقُولُ ۲

درس نور و چہار (۹۳)

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۲۴ تا ۲۲۷

وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ أَنْ تَبَرُّوا وَتَتَّقُوا
وَتُصْلِحُوا بَيْنَ النَّاسِ وَاللَّهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۲۴﴾ لَا يُؤَاخِذُكُمُ
اللَّهُ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ وَلَكِنْ يُؤَاخِذُكُمْ بِمَا كَسَبَتْ
قُلُوبُكُمْ وَاللَّهُ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۲۲۵﴾ لِلَّذِينَ يُؤْلُونَ مِنْ
نِسَائِهِمْ تَرَبُّصُ أَرْبَعَةِ أَشْهُرٍ فَإِنْ فَاءُوا فَإِنَّ اللَّهَ غَفُورٌ
رَحِيمٌ ﴿۲۲۶﴾ وَإِنْ عَزَمُوا الطَّلَاقَ فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ
عَلِيمٌ ﴿۲۲۷﴾

ترجمہ: اور اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ کہ تم نجی نہیں کرو
گے۔ پرہیزگار می اختیار نہیں کرو گے اور یہ کہ تم لوگوں کے درمیان صلح نہیں کرو
گے۔ بیشک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۴﴾ اللہ تعالیٰ تمہیں
تمہاری بیہودہ قسموں میں نہیں پکڑے گا۔ لیکن ان قسموں پر پکڑے گا۔ جن پر تمہارے
دل قصد کرتے ہیں۔ اور اللہ تعالیٰ بخشنے والا بربد بار ہے ﴿۲۲۵﴾ ان لوگوں کے لیے
جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی قسم کھا لیتے ہیں، چار ماہ کی مہلت ہے۔ اگر
وہ اس دوران میں لوٹ آئیں، تو بیشک اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے ﴿۲۲۶﴾
اگر وہ طلاق کا پختہ ارادہ کر لیں تو بے شک اللہ تعالیٰ سننے والا اور جاننے والا ہے ﴿۲۲۷﴾

اس سے پہلی آیات میں اللہ تعالیٰ نے مسئلہ حیض کی وضاحت فرمائی
کہ ایسی حالت میں عورت سے مباشرت حرام ہے۔ تاہم طہارت حاصل کر لینے
کے بعد عورتوں کے پاس جانے کی اجازت ہے۔ اس سے گذشتہ آیت میں منکر

ربط آیات

مرد اور مشرک عورتوں سے نکاح کی ممانعت فرمائی تھی۔ اُس سے پہلے یتیموں کے مال سے متعلق مسائل تھے۔ اور انہیں ساتھ ملائے کی اجازت دی تاہم فرمایا کہ ہر حال میں یتیموں کی اصلاح پیش نظر ہونی چاہیئے۔ محتاجوں کی اعانت کے متعلق بھی حکم آچکا ہے کہ اپنی جائز ضرورت سے زائد مال مستحقین پر خرچ کر دو۔ ضرورت سے زیادہ مال رکھنا شرکاً باعث ہے۔ اس سے پہلے شراب اور جوئے کی حرمت کا بیان بھی آچکا ہے۔ کہ یہ سب ناپاک چیزیں ہیں۔ اور ہر برائی کی جڑ ہیں۔

گزشتہ دروس کی آیات میں متذکرہ قبیح چیزوں کے بعد اللہ تعالیٰ نے اس قسم کی آیات میں لوگوں میں پائی جانے والی ایک اور بری بات کا ذکر فرمایا ہے اور وہ ہے کسی کا کام نہ منے پر اللہ کی قسم اٹھانا۔ قسم کے متعلق احکام مختلف سورتوں میں بیان ہوئے ہیں۔ منجملہ ان کے یہ آیات اور سورۃ مادہ کی آیات ہیں۔ قرآن وحدیث کے مطالعہ سے معلوم ہوتا ہے کہ قسم اٹھانا کوئی اچھی بات نہیں ہے۔ اگر کوئی سچا ہو اور قسم اٹھائے بغیر چارہ بھی نہ ہو، تو ایسی صورت میں قسم اٹھانے کی اجازت ہے۔ اور اس میں شرط یہ ہے کہ قسم اللہ کے کسی نام یا اس کی صفت کے ساتھ اٹھائی جائے، کسی انسان، جن، نبی یا کسی اور چیز کی قسم نہیں اٹھانی چاہیئے۔ کیونکہ مَنْ أَقْسَمَ بِغَيْرِ اللَّهِ فَقَدْ أَشْرَكَ، جس نے غیر اللہ کی قسم اٹھائی اس نے شرک کا ارتکاب کیا۔ اور اگر ایسی قسم اٹھانے والا شخص اُس غیر اللہ کی ایسی ہی تعظیم کرتا ہے جیسی اللہ کی کہنی چاہیئے یا اس کی صفت کو ویسی ہی جانتا ہے۔ جیسی اللہ کی صفت، تو پھر ایسے شخص نے حقیقتاً شرک کیا۔ اور مشرک یا کافر ہو گیا۔ اور اگر حقیقی تعظیم غیر اللہ مرد نہ ہو پھر بھی غیر اللہ کی تعظیم میں شبہ ہوگا، اس کے مناسب نہیں کہ کسی حال میں کبھی غیر اللہ کی قسم اٹھائی جائے اور مطلقاً بھی قسم اچھی نہیں لہذا بہتر یہی ہے کہ حتی الامکان قسم اٹھانے سے گریز کیا جائے۔ اہم شافعیؒ فرماتے ہیں کہ میں نے پوری زندگی میں کبھی قسم نہیں اٹھائی اس آیت مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جائزہ امور میں تو قسم اٹھانے کی اجازت ہے مگر بُری باتوں میں قسم مت اٹھاؤ۔ وَلَا تَجْعَلُوا اللَّهَ عُرْضَةً لِأَيْمَانِكُمْ

اللہ تعالیٰ کے پاک ناموں کو اپنی قسموں کا نشانہ نہ بناؤ۔ ان امور میں اَنْ تَسْبِقُوْا وَ اَوْ تَسْتَقْبِلُوْا وَ تَصْلِحُوْا بَيْنَ النَّاسِ کہ تم نیکی نہیں کرو گے، پرہیزگاری اختیار نہیں کرو گے یا لوگوں کے درمیان صلح نہیں کرو گے۔ فرمایا یہ تو بہت بُری حرکت ہے کہ ایک اچھائی کے کام میں اللہ کی قسم کھاتے ہو کہ ہم یہ نیکی کا کام نہیں کریں گے۔ یہ تو بہت ہی بُری بات ہے، مثلاً کوئی اس بات کی قسم اٹھائے کہ میں والدین سے کلام نہیں کروں گا۔ یا کسی محتاج کی اُغت نہیں کروں گا یا کوئی فرض ادا نہیں کروں گا تو فرمایا ایا نہ کرو۔ وَاللّٰهُ سَمِیْعٌ الشَّهَادَاتِ سُنَّے والا ہے۔ لہذا کوئی ایسی بات زبان پر نہ لاؤ جو قابلِ مواخذہ ہو۔ اور وہ عَلَیْكُمْ بھی ہے۔ جو دلوں کے رازوں کو بھی جانتا ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ وہ تمہاری نیتوں سے بھی واقف ہے کہ کوئی کام تم اچھی نیت سے کر رہے ہو یا بُری نیت سے۔ لہذا اپنا دل قابو میں رکھو۔ اور اس میں کوئی بُرا خیال نہ آنے دو۔ زبان پر کنٹرول ہونا چاہیے۔ زبان سے کوئی بُری بات نہ نکلے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ سُنَّے والا اور جاننے والا ہے۔ تم اس کی پچڑ سے بچ نہیں سکتے۔

قسم کی تین قسمیں

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ قسم کی تین قسمیں ہیں۔ پہلی قسم یمن لغو ہے۔ جو بغیر ارادے کے زبان سے نکل جائے۔ ایسی قسم پر کوئی مواخذہ نہیں اور نہ ہی کفارہ ادا کرنا پڑتا ہے۔ اس پر آخرت میں بھی کوئی گرفت نہیں۔ ہاں اگر دل کے ارادے سے قسم اٹھائی جائے بِمَا كَسَبَتْ فَلَوْ بَكْتُمْ ایسی قسم پر یقیناً مواخذہ ہوگا۔

دوسری قسم یمن غموس ہے۔ غم کا معنی کسی گناہ میں غوطہ مارنا ہے۔ اگر کوئی شخص کسی گزشتہ واقعہ کے متعلق دیدہ و دانستہ غلط قسم اٹھاتا ہے۔ مثلاً یہ کہ فلاں شخص میرے پاس آیا تھا۔ مگر حقیقت میں وہ نہیں آیا تھا تو ایسی قسم غموس کہلاتی ہے۔ اس میں اگرچہ کفارہ نہیں ہے۔ مگر قسم اٹھانے والا گنہگار ہوتا ہے۔ اور آخرت میں قابلِ مواخذہ ہے۔

قسم کی تیسری قسم یمن منعقدہ ہے یعنی کوئی شخص آنے والے زمانہ کے لیے

قسم اٹھائے کہ میں فلاں کام کروں گا یا فلاں کام نہیں کروں۔ اگر ایسی قسم جائزہ کام سے متعلق ہے اور اس نے قسم کو پورا بھی کر دیا، تو وہ بُدی ہو گیا۔ اگر اس نے قسم کو توڑ دیا ہے۔ تو کفارہ دینا پڑے گا۔ اور قسم کسی ناجائزہ کام سے متعلق اٹھائی ہے تو قسم کو توڑ کر کفارہ ادا کرنا چاہیے۔

قسم کا کفارہ

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام کا ارشاد گرامی ہے کہ جب میں کسی بات پر قسم کھا لیتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ دوسری بات زیادہ بہتر ہے۔ تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دیتا ہوں۔ ایک موقع پر مشہور صحابی حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ نے عرض کیا، حضور! ہم جہاد پر جانا چاہتے ہیں، ہمارے لیے سواری کا انتظام فرمادیں۔ آپ نے فرمایا وَاللّٰہِ لَا اَحْصِیْہٖ حُرَّ اللّٰہِ کی قسم میں تم کو کسی سواری پر سوار نہیں کرے گا۔ صحابی خاموش ہو کر چلے گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو بلا کر اونٹ ان کے حوالے کر دیے۔ انہوں نے عرض کیا حضور آپ نے تو قسم کھائی تھی کہ آپ ہمیں سوار نہیں کریں گے۔ اور میں نے اپنے ساتھیوں سے بھی کہ دیا کہ آپ نے یہ قسم اٹھالی ہے۔ حضور! اگر اب میں اونٹ لے گیا تو اپنے ساتھیوں میں جھوٹا ثابت ہوں گا۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا۔ جب میں کسی معاملے میں قسم اٹھا لیتا ہوں اور پھر دیکھتا ہوں کہ دوسری بات بہتر ہے۔ تو قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دیتا ہوں۔ ایک دوسری روایت میں آتا ہے کہ حضور نے فرمایا تم میں سے کوئی شخص ایک بات پر اصرار نہ کرے جب کہ دوسری بات بہتر ہو۔ اس کو چاہیے کہ ایسی قسم توڑ کر کفارہ ادا کر دے۔ اللہ تعالیٰ کی رضا اسی میں ہے۔

قسم کا کفارہ سورۃ مادہ میں مذکور ہے قسم توڑنے والا ایک غلام آزاد کرے۔ غلامی کا رواج اب ختم ہو چکا ہے۔ لہذا یہ کفارہ تو اب ادا نہیں کیا جاسکتا۔ البتہ یہ کہ دس مسکینوں کو اتنا کھیر اپنا دیا جائے جیسے وہ نماز ادا کر سکیں۔ یا دس مسکین کو دو وقت اوسط درجے کا کھانا کھلایا جائے۔ نہ زیادہ اچھا ہو اور نہ بُرا ہو۔ سادہ گوشت روٹی کھلا دینا کافی ہو گا۔ اگر اتنی استطاعت بھی نہ ہو، تو پھر تین دن

کے مسلسل روزے رکھے۔ ان چاروں صورتوں سے قسم کا کفارہ ادا ہوتا ہے۔

الغرض! فرمایا لَا يُؤْخَذُ كُفْرُ اللَّهِ بِاللَّغْوِ فِي أَيْمَانِكُمْ اللَّهُ تَعَالٰی تمہاری لغو قسموں پر مؤاخذہ نہیں کرتا وَلَكِنْ يُؤْخَذُ كُفْرُ بِمَا كَسَبَتْ قُلُوبُكُمْ بلکہ ان قسموں پر مؤاخذہ کرتا ہے جو تم دل کے ارادے سے اٹھاتے ہو۔ لہذا اکثر سے قسمیں نہیں اٹھانا چاہئیں جو کوئی ایسا کرے گا، اُسے ان احکام کی پابندی کرنا ہوگی۔ ہاں! اگر کوئی شخص ایسی کوتاہی کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگے اور مذکورہ احکام کے تحت کفارہ ادا کر دے تو واللہ عَفْوٌ وَحَلِيمٌ اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور بردبار ہے مگر ایک بات یاد رہے کہ اللہ تعالیٰ کی بخشش اور اس کی بردباری سے انسان کی حوصلہ افزائی نہیں ہونی چاہیے۔ بلکہ ہمیشہ اللہ تعالیٰ سے ڈرتے رہنا چاہیے۔ کہ کہیں اس کی گرفت میں نہ آجائے۔

مذللہ

اس سے پیشتر حیض کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ حیض کے دوران عورت کے قریب جانا حرام ہے۔ اب اسی نوعیت کا ایک اور مسئلہ بیان ہو رہا ہے جسے ایلاہ کہتے ہیں۔ ایلاہ کا لغوی معنی قسم اٹھانا ہے اور مراد اس سے یہ ہے کہ کوئی شخص اس امر کی قسم اٹھالے کہ وہ اپنی عورت کے قریب نہیں جائیگا۔ اس کی چار صورتیں ہو سکتی ہیں۔

(۱) مطلقاً قسم اٹھانا کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

(۲) چار ماہ کی مدت مقرر کرے کہ اتنا عرصہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

(۳) چار ماہ سے زیادہ مثلاً پانچ، چھ، آٹھ ماہ کے لیے قسم کھائے کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

(۴) چار ماہ سے کم مدت ایک، دو، تین ماہ تک کے لیے قسم کھائے کہ عورت کے قریب نہیں جاؤں گا۔

چوتھی صورت یعنی چار ماہ سے کم مدت کے ایلاہ کو شرعی ایلاہ نہیں کہا جاتا اگر مقررہ مدت تک ایسا شخص عورت کے قریب نہیں گیا تو قسم سے بری ہو جائے گا۔

اور اگر اس دوران عورت سے مقاربت کر لی۔ تو قسم توڑنے کا کفارہ ادا کرنا ہوگا۔ باقی تین صورتوں میں حکم یہ ہے۔ کہ ایسے شخص کو قسم توڑ دینی چاہیے اور اس کا کفارہ ادا کرنا چاہیے۔ اور اگر چار ماہ کا عرصہ گزر گیا۔ اور قسم کھانے والا شخص عورت کے پاس نہیں گیا، تو پھر ایلاہ مؤثر ہو گیا۔ البتہ اس کے حکم میں فقہائے کرام کے مختلف اقوال ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ اور بعض دوسرے ائمہ کا قول ہے۔ کہ ایسی صورت میں ایک طلاق بائن واقع ہو جائے گی۔ اب اگر مرد دوبارہ رجوع کرنا چاہے تو اُسے نئے حق مہر کے ساتھ دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔ اگر رجوع کا کوئی ارادہ نہیں تو عورت آزاد ہے، عدت گزرنے کے بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔

البتہ ائمہ ثلاثہ امام مالکؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ چار ماہ کی مدت گزرنے کے بعد طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی، بلکہ حاکم وقت اُس شخص کو عدالت میں طلب کر کے اُسے مجبور کریگا۔ کہ یا تو وہ رجوع کر لے یا طلاق لے لے دوںوں صورتوں میں جو بھی فیصلہ ہوگا۔ اُس کے مطابق عمل ہوگا۔

اس مقام پر یہ بات قابل ذکر ہے۔ کہ شرعی ایلاہ اُس صورت میں قائم ہوگا جب عورت کے پاس نہ جانے کی قسم کھائی گئی ہو۔ اگر قسم نہیں کھائی دیے ہی کہ دیا کہ بیوی کے پاس نہیں جاؤں گا۔ تو یہ ایلاہ شمار نہیں ہوگا۔ بعض مفسرین (جیسا صاحب تفسیر القرآن کو مغالطہ ہوا ہے اور اس نے غلط مسئلہ لکھا ہے) کو مغالطہ ہوا ہے۔ جو کہتے ہیں کہ بغیر قسم کے بھی ایلاہ ہو جاتا ہے۔ حالانکہ حضرت علیؓ اور دوسرے صحابہ کرامؓ سے ثابت ہے۔ کہ ایلاہ کے لیے قسم اٹھانا ضروری ہے۔ کیونکہ اگر کوئی شخص جیسے ہی ایک دو سال کے لیے علیحدہ رہے تو ایلاہ قائم نہیں ہوگا۔ لغوی اعتبار سے بھی قسم ضروری ہے کیونکہ ایلاہ کا معنی ہی قسم ہے۔ البتہ قسم کے بغیر ایسی بات کرنے سے انسان گنہگار ضرور ہوتا ہے۔ ایسی چیزوں سے اجتناب کرنا چاہیے اس سے عورت کو تنگ کرنا مقصود ہے جو کہ ناروا ہے۔ جس طرح میاں بیوی کے دیگر حقوق ہیں۔ اسی طرح نفسانی خواہش کی تکمیل بھی دونوں کا حق ہے۔ اور کسی

فریق کر اس کے حق سے محروم کرنا محسن نہیں ہے۔ بلکہ بُری بات ہے۔

فَرَمَا لِلَّذِينَ يُقُولُونَ مِنْ نِسَاءِ بِهِمْ تُرْبِكُمْ أَرْبَعَةَ أَشْهُبٍ

اُن لوگوں کے لیے چار ماہ کی مہلت ہے۔ جو اپنی بیویوں کے پاس نہ جانے کی
قسم کھاتے ہیں۔ فَإِنْ فَاءُوا وَاپس اگر وہ اس دوران لوٹ آئیں۔ فَإِنَّ اللَّهَ عَفُورٌ

رَحِيمٌ تو اللہ تعالیٰ بخشنے والا اور مہربان ہے غلطی کو تاہی معاف ہو جائے گی

وَلَنْ عَزِمُوا الطَّلَاقَ اور اگر انہوں نے طلاق یا تفریق کا پختہ ارادہ کر لیا ہے۔

فَإِنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ۔ تو اللہ تعالیٰ سُننے والا اور جاننے والا ہے۔ وہ

انکی ہر ہر ظاہر بات کو سنتا ہے۔ نیز اُن کی نیت اور ارادے تک کو جانتا ہے۔

البقرة ۲

آیت ۲۲۸

سَيَقُولُ ۲

درس نور و پنج (۹۵)

وَالْمُطَلَّاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ وَلَا يَحِلُّ
لَهُنَّ أَنْ يَكْتُمْنَ مَا خَلَقَ اللَّهُ فِي أَرْحَامِهِنَّ إِنْ كُنَّ يُؤْمِنَنَّ بِاللَّهِ
وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ وَبَعُولَتُهُنَّ أَحَقُّ بِرَدِّهِنَّ فِي ذَلِكَ إِنْ أَرَادُوا
إِصْلَاحًا وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ
وَلِلرِّجَالِ عَلَيْهِنَّ دَرَجَةٌ ۚ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۲۸﴾

۲۲۸

ترجمہ: اور مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ اور ان کے لیے
حلال نہیں ہے کہ وہ اُس چیز کو چھپائیں، جو اللہ نے ان کے رحموں میں پیدا کی ہے۔ اگر
وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتی ہیں۔ اور ان کے خاوند زیادہ حق رکھتے ہیں۔ انہیں
اس مدت میں لوٹانے کا۔ اگر وہ اصطلاح کا ارادہ کریں۔ اور ان عورتوں کے لیے بھی
اُسی طرح حق ہے جس طرح عورتوں پر مردوں کا حق ہے۔ دستور کے مطابق۔ اور
مردوں کو عورتوں پر ایک گونہ فضیلت ہے اور اللہ تعالیٰ عزیز ہے اور حکمت والا ﴿۲۲۸﴾

گذشتہ درس میں قسم کے متعلق بیان تھا۔ اور اُس کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے ایلاہ کا مکمل بیان فرمایا اور
سے مرد و عورت سے عدم مقاربت کی قسم کھانا ہے۔ اور اس کی مدت زیادہ سے زیادہ
چار ماہ رکھی گئی ہے۔ اگر خاوند اس دوران رجوع کر لے تو قسم کا کفارہ ادا کر دے۔ اور
اگر چار ماہ کی مدت پوری ہو گئی۔ تو عورت پر ایک طلاق بائن پڑ جائیگی۔ تاہم بعض فقہائے
کرام فرماتے ہیں کہ طلاق خود بخود واقع نہیں ہوگی بلکہ ایلاہ کرنے والے کو عدالت میں
طلب کر کے رجوع یا طلاق کا فیصلہ کیا جائے گا۔

نکاح اور طلاق

نکاح اور طلاق کے مسائل اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی مختلف سورتوں میں بیان
فرمائے ہیں، خصوصاً سورۃ احزاب، طلاق اور اس سورۃ البقرۃ میں یہ مسائل آئے ہیں

نکاح میاں بیوی کے درمیان ایک دائمی اور اجتماعی معاہدہ ہے۔ جسے مرنے تک نبھانے کا ارادہ کیا جاتا ہے۔ جب تک نکاح کا معاہدہ طے نہیں پاتا، اس معاہدہ کے فریقین یعنی مرد اور عورت کے اخلاق کی چھان بین کی جاتی ہے۔ کہ وہ ایک دوسرے کو کس حد تک قابل قبول ہیں پھر جب نکاح طے پا جاتا ہے۔ تو زوجین پر معاہدہ نکاح کی قانونی پابندی عاید ہو جاتی ہے۔ جسے پورا کرنے کے وہ پابند ہوتے ہیں۔ شریعت نے مرد اور عورت دونوں کو اپنے اپنے دائرہ کار میں کچھ حقوق دیے ہیں اور کچھ فرائض سونپے ہیں۔ اگر فریقین ان کی پابندی کرتے ہیں تو ان کی ازدواجی زندگی نہایت پرسکون گزرتی ہے۔ تاہم بعض اوقات اس قسم کے حالات پیدا ہو جاتے ہیں جن میں اس معاہدہ کا منسلک فریقین کا نباہ ممکن نہیں رہتا، تو ایسی صورت میں شریعت نے ان میں تفریق کا قانون بھی نافذ کر دیا ہے۔ تاکہ وہ ساری عمر کھٹن زندگی گزارنے کی بجائے اپنے لیے کوئی دوسرا بہتر ذریعہ تلاش کر سکیں۔

دوسرے مذاہب سے تقابل

اس مسئلہ میں اسلام کے علاوہ دیگر مذاہب افراط و تفریط کا شکار ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ ان کے معاشروں میں طرح طرح کی قباحتیں پیدا ہو رہی ہیں۔ مثلاً بائبل کے باب استثنائیں میں موجود ہے کہ اگر خاوند اپنی بیوی پر کسی وجہ سے ناراض ہو جائے تو فوراً طلاق نامہ عورت کے ہاتھ میں دے کر گھر سے نکال دے، اس سلسلہ میں صفائی وغیرہ کی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ اُدھر مطلقہ کو حق حاصل ہے کہ طلاق کے فوراً بعد دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہے۔ یہ تو یہودی مذہب ہے اب عیسائیوں کو لیجئے۔ ان میں طلاق کا تصور ہی نہیں ہے۔ جب ایک دفعہ نکاح ہو گیا۔ تو ساری عمر کے لیے میاں بیوی ایک دوسرے کے پابند ہو گئے۔ اب ان کو موت ہی علیحدہ کر سکتی ہے۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ جب کسی جوڑے کا میلان طبع ایک ساتھ ہوا اور ان میں ناچاقی پیدا ہوئی تو ساری عمر عذاب میں بسر کرنا پڑی۔ البتہ عیسائیوں کا دوسرا فرقہ جو صدیوں کی پیدوار ہے اُس نے عدالت کے ذریعے طلاق کو قانونی شکل دے دی ہے۔ اس کا طریق کاریہ ہے کہ عدالت مجاز فریقین کو طلب کرے گی۔ اور اس بات کی تحقیق کرے گی، کہ

فریقین میں سے کسی نے دوسرے پر ظلم کیا ہے۔ یا کسی ایک نے زنا کا ارتکاب کیا ہے اگر کوئی ایسا جرم ثابت ہو جائے۔ تو عدالت اُن کے درمیان تفریق ڈال دے گی۔ اور اس طرح طلاق واقع ہو جائے گی۔ اسی طرح ہندومت میں بھی طلاق کا کوئی تصور نہیں مہرتے دم تک میاں بیوی میں علیحدگی نہیں ہو سکتی۔ رومیوں اور کونانیوں میں بھی طلاق نامی کوئی چیز نہیں پائی جاتی تھی جس کی وجہ سے ان مذاہب میں معاشرتی برائیاں جنم لیتی ہیں۔

اسلام میں
نظر طلاق

اسلام نے افراط و تفریط سے ہٹ کر اعتدال کی راہ اختیار کی ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ نکاح اس لیے نہیں کیا جاتا کہ زوجین میں تفریق ڈال دی جائے۔ اس معاہدہ (AGREEMENT) کو نبہنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ اس کے باوجود اگر میاں بیوی کے لیے اکٹھے زندگی گزارنا ممکن نہ ہو، تو پھر اسلام نے طلاق کے ذریعے ان کی علیحدگی کا انتظام بھی کر دیا ہے۔ اگرچہ طلاق پسندیدہ چیز نہیں ہے۔ اور حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ اَبْغَضُ الْمُبَاحَاتِ اِلَى اللّٰهِ الطَّلَاقُ یعنی مباح اشیا میں سے سب سے ناپسندیدہ چیز اللہ کے نزدیک طلاق ہے۔ تاہم ضرورت کے تحت اس کی اجازت ہے۔ طلاق کی صورت میں اسلام نے ایک اور ضروری قانون عدت کا دیا ہے۔ جو دوسرے مذاہب میں نہیں ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ طلاق کے بعد عورت ایک خاص مدت تک دوسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ اس کا مقصد تحفظِ نسب ہے تاکہ پیدا ہونے والی اولاد کا نسب شکوک نہ ہو جائے۔ طلاق کے بعد اگر عورت فوراً دوسرا نکاح کر لے۔ تو بچے کے نسب پر شبہ ہو سکتا ہے۔ کہ پہلے خاوند کا ہے یا دوسرے کا۔ اور اس طرح کئی پیچیدگیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے اسلام نے عورت کے دونوں حوالوں کے درمیان مختلف صورتوں میں مختلف مدتیں مقرر کر دی ہیں۔ تاکہ اس بات کی وضاحت ہو جائے کہ آئندہ پیدا ہونے والا بچہ کس باپ کا ہے۔ نیز پہلے نکاح کے احترام کا تقاضا بھی ہے۔ کہ دوسرا نکاح سے پہلے کچھ وقفہ ہونا چاہیے۔

عدت اُس کم از کم مدت کا نام ہے۔ جو طلاق کی تاریخ یا شوہر کی فوتیگی کی تاریخ عدت سے لیکر نکاح ثانی تک کے لیے مقرر ہے۔ اس عرصہ میں عورت دوسرا نکاح نہیں

کر سکتی۔ عدت مختلف صورتوں کے اعتبار سے مختلف ہوتی ہے۔ مثلاً فوتیدگی کی صورت میں عدت تاریخ وفات سے چار ماہ دس دن ہے۔ اتنے عرصہ میں پتہ چل جاتا ہے۔ کہ عورت حاملہ تو نہیں ہے۔ اگر حاملہ نہیں ہے۔ تو چار ماہ دس دن کی عدت گزار کر عورت نکاح کر سکتی ہے۔ اور اگر حاملہ ہے تو اُس کی عدت وضع حمل ہے۔ جس دن بچہ جنے گی اُس کے بعد نکاح کر سکتی ہے۔ بیوگی سے لے کر وضع حمل تک کی مدت کا کوئی تعین نہیں ہے۔ یہ عرصہ خواہ ایک دن کا ہو یا پورے نو ماہ کا۔ حاملہ کی عدت وضع حمل ہے۔ لہذا بچہ جب بھی پیدا ہو، عورت نکاح کر سکتی ہے۔ حجتہ الوداع کے سفر میں ایک صحابی اونٹنی سے گر کر فوت ہو گئے۔ اُن کی بیوی حاملہ تھی۔ ٹھیک بائیس دن بعد اُس کے ہاں بچہ پیدا ہو گیا، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ یہ جب چاہے نکاح ثانی کر سکتی ہے۔

اگر عورت عاقل، بالغ اور آزاد ہے، اور اُسے حیض آتے ہیں۔ کسی وجہ سے طلاق ہو گئی ہے۔ تو اس کی عدت تین حیض ہوگی۔ یہ تین حیض خواہ دو ماہ میں آجائیں یا ۱۹ ماہ میں، اُسے ہر حال تین حیض تک انتظار کرنا ہوگا۔ عام طور پر حیض ماہ بمابہ آتے ہیں۔ اس لیے ایسی عورت کے حیض کم و بیش تین ماہ میں پورے ہو جاتے ہیں۔ جس کے بعد اُسے نکاح کی اجازت ہوتی ہے۔

پاکستان میں نافذ عالمی قوانین میں ایسی عورت کی عدت نوے دن مقرر کی گئی ہے۔ جو کہ درست نہیں ہے۔ حیض والی عورت کو تین حیض کی عدت پوری کرنا ہوگی۔ خواہ اس میں کتنا عرصہ لگے۔ البتہ ایسی عورت جو ابھی بالغ نہیں ہوئی یا جو کبیرگی میں پہنچ چکی ہے اور اُس کے حیض بند ہو چکے ہیں۔ ایسی عورتوں کی عدت تین ماہ یا ۹۰ دن درست ہے۔ اس کی تفصیلات سورۃ احزاب میں موجود ہیں۔ ایک اور صورت بھی ہو سکتی ہے۔ کہ نکاح ہو گیا۔ مگر میاں بیوی کی خلوت صحیحہ نہیں ہوئی، انہیں مباشرت کا موقع نہیں ملا۔ ایسی صورت میں اگر طلاق واقع ہو جائے، تو فرمایا

فَمَا لَكُمْ عَلَيْهِنَّ مِنْ عِدَّةٍ تَعْتَدُونَهَا اِیْسَى عورتوں کے لیے کوئی عدت

نہیں۔ وہ جب چاہیں دوسرا نکاح کر سکتی ہیں۔ اس معاملہ میں بھی عائلی قوانین درست نہیں کیونکہ وہاں سب کے لیے نوے دن کی عدت مقرر ہے حالانکہ یہاں کوئی عدت نہیں ہے ایسا ہی عدت کا ایک مسئلہ ہمارے نوٹس میں آیا تھا۔ کہوٹہ کے رہنے والے ایک شخص نے بتایا کہ کسی عورت کو طلاق ہو گئی۔ اُس کو حیض دیر سے آتا ہے۔ اور نوے دن میں اس کے تین حیض مکمل نہیں ہوئے۔ مگر یونین کونسل والوں نے نوے دن کے بعد اس کا نکاح کر دیا۔ حالانکہ یہ نکاح ہوا ہی نہیں ہے۔ کیونکہ عدت کے دوران نکاح ہونا نہیں سکتا۔ تو اس قسم کی خرابیاں ہیں۔ جو عائلی قوانین میں خامی کی وجہ سے پیدا ہوتی ہیں۔ اس قسم کے نکاح قرآن و سنت کے خلاف ہیں۔ اور اس کے ذمہ دار وہ لوگ ہیں جو ایسا حکم دیتے ہیں۔

الغرض فرمایا وَالْمُطَلَّقَاتُ يَتَرَبَّصْنَ بِأَنْفُسِهِنَّ ثَلَاثَةَ قُرُوءٍ ط حیض یا طہر
مطلقہ عورتیں اپنے آپ کو تین حیض تک انتظار میں رکھیں۔ قُرُوءِ قمر کی جمع ہے اور اس لفظ کے معانی میں فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ اہل لغت بھی اس کے مختلف معانی بتاتے ہیں۔ دراصل یہ لفظ دو معانی میں مشترک ہے یعنی اس کا معنی حیض بھی آتا ہے اور طہر بھی۔ طہر اُس وقفہ یا مدت کو کہتے ہیں۔ جو دو حیضوں کے درمیان ہوتا ہے۔ اہم ابو حنیفہؒ قرآن کا معنی حیض بتاتے ہیں۔ اسی لیے اُن کے نزدیک بالغ مطلقہ عورت کی عدت تین حیض ہے۔ وہ البدل و بدشریت کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ کہ ایک عورت نے حضور علیہ السلام سے استخاضہ کے متعلق مسئلہ پوچھا، تو آپ نے فرمایا تَدْعُ الصَّلَاةَ اَيَّامَ اَقْرَابِہَا یعنی حیض کے دنوں میں نماز نہ پڑھے البتہ جب حیض کے عام ایام گزر جائیں تو پھر غسل کر کے نماز ادا کرے کیونکہ اب یہ حیض نہیں رہا، بلکہ استخاضہ کا خون شمار ہوگا۔ مقصد یہ کہ اس حدیث سے قرآن کا معنی حیض نکلتا ہے۔ البتہ اہم شافعی قرآن سے مراد طہر لیتے ہیں۔ ان کا مسلک یہ ہے۔ کہ طلاق کے بعد عورت تین طہر گزرنے تک دوسرا نکاح نہ کرے۔ اللہ تعالیٰ نے اس معاملہ میں عورتوں کو متنبہ فرمایا ہے وَلَا يَحِلُّ لَهَا

اور اگر تینوں طلاقیں دے دی ہیں تو پھر کسی صورت رجوع نہیں ہو سکتا۔ عورت عدت پوری کرنے کے بعد نکاح ثانی کھنسنے کی مجاز ہوگی، تو فرمایا کہ رجعی طلاق میں غارِ عدت کا زیادہ حق ہے۔ کہ وہ رجوع کر لیں بشرطیکہ اُن کا ارادہ اصلاح کا ہو، محض تنگ کمر نہ مقصود نہ ہو۔ جیسا کہ زمانہ جاہلیت میں ہوتا تھا۔ کہ عورت کو تنگ کمر کی غرض سے کبھی طلاق دے دی کبھی رجوع کر لیا۔ تاکہ وہ دوسری جگہ بھی نہ جاسکے یہ بات جائز نہیں ہے۔

آگے اللہ تعالیٰ نے مرد و زن کے حقوق کا تذکرہ فرمایا ہے۔ وَلَهُنَّ مِثْلُ الَّذِي عَلَيْهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ دستور کے مطابق عورتوں کا مردوں پر اُسی طرح حق ہے جس طرح مردوں کا عورتوں پر ہے۔ مطلب یہ ہے کہ نہ وہیں کے اپنے اپنے دائرہ کار میں کچھ حقوق ہیں۔ لہذا اُن کی پاسداری ہونی چاہیے۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے کہ مرد کو اپنے حقوق زبردستی عورت سے وصول کرے۔ مگر عورت کو اُس کا حق نہ دے۔ مثلاً اللہ تعالیٰ نے عورت کا وراثت میں حق رکھا ہے۔ لہذا مرد پر لازم ہے کہ اُسے یہ حق ادا کیا جائے۔ زمانہ جاہلیت میں عورت کو وراثت میں حصہ دار نہیں سمجھا جاتا تھا۔ یہ بیماری عام معاشرتی حقوق سے بھی محروم تھی۔ جو کہ سرسبز زیادتی ہے۔ رومی اور یونانی بھی عورت کو ذلیل سمجھتے تھے اور اس کا حق تسلیم نہیں کرتے تھے۔ عیسائی بھی اسی قسم کے تاثر کا شکار ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے مردو! جس طرح تمہارے کچھ حقوق ہیں، اسی طرح عورتوں کے بھی حقوق ہیں۔ انہیں ان سے محروم نہ کرو ویر تو اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے۔ کہ اُس نے کس فرد کو کس مقام پر رکھا ہے۔ خَلَقَ مِنْهُمْ زَوْجَهَا وَبَثَّ مِنْهُمَا رِجَالًا كَثِيرًا وَنِسَاءً یعنی اللہ تعالیٰ نے ایک فرد سے سب کو پیدا کیا۔ پھر اُسی میں سے اس کا جوڑا پیدا کیا اور پھر بیشمار مرد و زن کچھیر دیے۔ یہ اُس کی حکمت ہے کہ کسی کو مرد بنادیا اور کسی کو عورت بنادیا۔ اب تمہارا فرض یہ ہے۔ کہ ایک دوسرے کے حقوق کا خیال رکھو۔ دوسرے کو حقیر نہ سمجھو۔ اور دستور کے مطابق ایک دوسرے کے ساتھ اچھا معاملہ کرو۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد یہ ہے۔ کہ اپنے اپنے دائرہ عمل میں حقوق و فرائض کو بجالاؤ اور کسی دوسرے

کا حق غصب نہ کرو حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ تم پر یہ حق ہے۔ کہ بیوی کے لیے بھی ویسی ہی خوراک کا بندوبست کرو۔ جیسا کہ اپنے لیے کرتے ہو۔ جس معیار کا لباس پسند کرتے ہو، عورت کو بھی عیا کر دو۔ اُس کو بھی معقول ٹھکانہ بنا کر دو۔ اس کا حق مہر ادا کرو اور اُسے آزادی دو کہ اپنی مرضی سے جہاں چاہے اس رقم کو خرچ کر سکے یہ اُس کے حقوق ہیں۔ اُسے بلا وجہ مارنا پیٹنا بھی جائز نہیں۔ ہاں اگر کسی جائز ضرورت کی بنا پر تنبیہ مقصود ہو۔ تو اتنی خفیف ضربات لگاؤ کہ ہڈی پل نہ ٹوٹے۔ اس کی اجازت ہے فَاضْرِبُوْهُنَّ۔ تا جائز مار پیٹ درست نہیں۔ اُس سے قطع تعلقی بھی نہیں کرنی چاہیئے عورت پر بھی حق ہے۔ کہ وہ عاوند کی مرضی کے بغیر گھر سے باہر نہ جائے۔ سینما وغیرہ کے لیے جانا تو فیسے ہی حرام ہے۔ جائز امور کے لیے بھی اجازت لینا چاہیئے۔ اس کی تفصیلات آگے سورۃ نسا میں آئیں گی۔

مرد کی فضیلت

فرمایا اِنَّ حَقَّكَ بِالَّذِيْنَ جَاءَكَ عَلَيْهِمْ دَرَجَةًؕ مردوں کو عورتوں پر برتری حاصل ہے۔ ایک درجہ کی فضیلت حاصل ہے۔ اسی موضوع کو سورۃ نسا میں یوں بیان کیا ہے اَلرِّجَالُ قَوَّامُونَ عَلَى النِّسَاءِؕ مرد عورتوں پر نگران ہیں یا ان کے محافظ ہیں ان سے برتر ہیں اور یہ ایک فطرتی امر ہے جس سے انکار ممکن نہیں۔ اور پھر مردوں کی برتری کی دلیل بھی بیان فرمائی۔ وَبِمَا آفَقُوا مِنْ اَمْوَالِهِمْؕ کہ مرد اپنی کمائی عورتوں پر خرچ کرتے ہیں۔ ان کے کفیل ہیں۔ اللہ نے انہیں برتری دی ہے۔ اور مشقت کے کام مرد کے سپرد کیے ہیں۔ کمانا اس کے ذمہ ہے۔ عورت کا کام گھر کی ذمہ داریاں پوری کرنا ہیں۔ انہیں کم مشقت برداشت کرنا پڑتی ہے۔ لہذا مرد کو برتری حاصل ہے اس کی مثال موجودہ دور میں بھی ملتی ہے کہ دنیا کی ڈیڑھ سو سے زیادہ اقوام میں سے صرف امریکہ، روس، برطانیہ، فرانس اور چین کو ویٹو پاور حاصل ہے ان میں سے کوئی ایک ملک باقی پوری دنیا کے متفقہ فیصلے کو رد کر سکتا ہے۔ کہ اس کو یہ طاقت حاصل ہے۔ اسی طرح گھر کی چار دیواری میں مرد کو ویٹو پاور حاصل ہے۔ یہ پاور عورت کو یا بچوں کو حاصل نہیں ایک باپ اپنے سارے بیٹوں کے متفقہ مطالبہ

کو رد کر سکتا ہے۔

اسی طرح طلاق کا حق بھی اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔ عورت اس سے محروم ہے اس میں بھی مصلحت ہے "بِیَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ" نکاح کی گمراہ چونکہ مرد کے ہاتھ میں ہے۔ اس لیے اس گمراہ کو کھولنے کا اختیار بھی مرد کو حاصل ہے۔ مگر قدرت کے اس قانون کے خلاف جب برطانیہ میں عورت کو طلاق کا حق مل گیا تو اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ اب وہاں سچا سچ فیصد سے زیادہ طلاقیں ہونے لگیں ہیں۔ ہر عورت دعویٰ کر سکتی ہے کہ اُسے طلاق ملنی چاہیے؟ محض اس لیے کہ اس کا خاوند سوتے میں خراٹے لیتا ہے۔ اور اس کی عیند خراب ہوتی ہے۔ دوسری کہتی ہے کہ میرا خاوند میرے کبوتر یا میرے کتے سے محبت نہیں کرتا۔ میں اس سے چھٹکارا حاصل کرنا چاہتی ہوں۔ ایسی ایسی معمولی باتوں پر طلاق روزمرہ کا کھیل بن کر رہ گیا ہے۔ جب یہ ہے کہ انہوں نے اللہ تعالیٰ کے قانون کے خلاف اپنا قانون جاری کیا ہے۔ یہ اس مساوات کا نتیجہ ہے۔ جو عورت کو مرد کے برابر قرار دیا گیا ہے۔ حالانکہ قرآن پاک کہتا ہے۔ کہ مرد کو عورت پر فضیلت حاصل ہے۔ اب اس مساوات کی بنا پر دفتروں میں، فوج میں ہر جگہ عورتیں ملازمت کر رہی ہیں، حالانکہ فوجی خدمات عورت کے فرائض سے بالکل باہر ہیں۔ اسی غلط ملط کی وجہ سے طرح طرح کی معاشرتی برائیاں پیدا ہو رہی ہیں۔ اکثر اداے بدکاری کے اڈے بنے ہوئے ہیں۔ کوئی صحیح نسل قائم نہیں رہ سکی۔ گزشتہ صدی میں ایک انگریز مصنف ڈاکٹر لکھتا ہے کہ یورپ کی پینتالیس کروڑ کی آبادی میں سے پینتالیس آدمی بھی ایسے نہیں نکالے جاسکتے جن کو یقین کے ساتھ نطفہ حلال تسلیم کیا جائے یہ اس کی اپنے قانون کے متعلق رائے ہے کہ اتنا گندہ قانون وضع کیا گیا ہے جب شاپنگ کے لیے عورتوں کو آزادی ہوگی اور غیر مردوں کے ساتھ میل جول کریں گی۔ آئہ ہوٹس بن کر ساری دنیا کا سفر بغیر محرم کے کر بیگی، دفتروں میں مردوں کے ماتحت کام کریں گی، تو پھر اچھے نتائج کی توقع — کیسے کی جاسکتی ہے جہاں ایک فوجی خدمات کا متعلق ہے صرف غیر معمولی (AB NORMAL) حالات میں

عورت کو حصہ لینے کی اجازت ہے، وگرنہ عام حالات (NORMAL) میں عورت کو مردوں کے دوش بدوش کام کرنے کی قطعاً اجازت نہیں، کیونکہ مرد کا دائرہ کار اور ہے عورت کا اور ہے۔ یہاں تک کہ اللہ تعالیٰ نے عورت پر جمعہ فرض نہیں کیا۔ اس کی نماز گھر میں بہتر ہے۔ تاہم وہ خاوند کی اجازت سے نماز کے لیے مسجد میں جا سکتی ہے۔ بہر حال فرمایا کہ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ کی فضیلت ہے۔ اس کی تفصیل سورۃ نسا میں آئیگی۔ وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ۔ اللہ تعالیٰ کمال قوت کا مالک اور حکیم ہے۔ اس کا ہر حکم حکمت پر مبنی ہے۔ لہذا اس کے احکام پر عمل درآمد کرنا چاہیے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

آیت ۲۲۹

درس نووٹش (۹۶)

الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ ۚ فَاِمْسَاكُكُمْ بِمَعْرُوفٍ اَوْ تَسْرِيحُكُمْ بِاِحْسَانٍ ط
وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اَنْ تَاْخُذُوْهُمَّ اَتَيْتُمْوْهُنَّ شَيْئًا اِلَّا
اَنْ يَّخَافَا اَلَّا يُقِيْمَا حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَاِنْ خِفْتُمْ اَلَّا يُقِيْمَا
حُدُوْدَ اللّٰهِ ۚ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهٖ ط تِلْكَ
حُدُوْدُ اللّٰهِ ۚ فَلَا تَعْتَدُوْهَا ۚ وَمَنْ يَّتَعَدَّ حُدُوْدَ اللّٰهِ
فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ﴿۲۲۹﴾

ترجمہ: ۲ طلاق تہی دومرتبہ ہے۔ پھر اس کے بعد یا تو روک رکھنا ہے اس کو دستور
کے مطابق یا اسکو آزاد کر دینا ہے سچی کے ساتھ۔ اور تمہارے لیے حلال نہیں ہے
کہ تم ان عورتوں سے اس چیز میں سے کچھ لے لو جو تم نے ان کو دی ہے۔ سوائے
اس صورت کے کہ وہ دونوں (میاں بیوی) اس بات سے خوف کھاتے ہوں کہ وہ
اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ پس اگر تمہیں خطرہ ہو کہ وہ دونوں اللہ کی
حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں کہ وہ عورت
اپنی جان چھڑائی کا ذریعہ ہے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدیں ہیں۔ پس ان سے آگے نہ
بڑھو۔ اور جو شخص بھی اللہ کی حدود سے آگے بڑھیں گا۔ پس وہی لوگ ظالم ہیں ﴿۲۲۹﴾

رابطیات

گزشتہ آیت کریمہ میں عدت کا منکر بیان ہوا تھا جس کا مقصد یہ ہے۔ کہ
طلاق اور دوسرے نکاح کے درمیان عورت وقفہ کرے۔ تاکہ معلوم ہو سکے کہ وہ امید
سے ہے یا نہیں۔ پھر اگر امید سے ہے تو وضع حمل تک نکاح ثانی نہ کرے
اور امید سے نہیں تو تین حیض تک اپنے آپ کو روکے رکھے۔ کم سن اور عمر عورتوں
کی عدت تین ماہ مقرر کی گئی ہے۔ اور بیوہ کے لیے چار ماہ دس دن عدت ہے

یہ بھی گذشتہ درس میں بیان ہو چکا ہے کہ مرد کو عورت پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے وہ ان کے نگران اور کفیل ہیں۔ باقی حقوق میں مساوات ہے۔ کچھ حقوق مرد کے ہیں اور کچھ عورت کے، اپنے اپنے دائرہ کار میں زوجین حقوق و فرائض کے ذمہ دار ہیں۔ آج کے درس میں طلاق کی تعداد اور ان سے متعلق احکام کا ذکر ہے رکن بیان کیا تھا کہ نکاح مرد و عورت کے درمیان ایک معاہدہ ہوتا ہے جس کی پابندی فریقین کے لیے ضروری ہے۔ تاہم عام معاہدات اور نکاح کے معاہدہ میں قدرے فرق ہے کسی دو پارٹیوں کے درمیان لین دین کے سلسلہ میں، کاروبار میں، یا شراکت کے متعلق معاہدہ ہوتا ہے۔ یہ معاہدہ محض معاملہ کی حد تک ہوتا ہے۔ مگر نکاح کے معاہدہ میں معاملہ کے علاوہ عبادت اور سنت کا معنی بھی پایا جاتا ہے۔ آپ اکثر نکاح کے موقع پر خطبہ سنتے ہیں اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي فَمَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي یعنی نکاح کرنا میری سنت ہے، جو اس سے اعراض کئے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ ایک اور حدیث میں حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا اَلنِّكَاحُ مِنْ سُنَّتِي اَلْبَنِيَاہِ نکاح سائے نبیوں کی سنت ہے قرآن پاک میں بھی انبیاء علیہم السلام کی حیثیت کے متعلق آتا ہے کہ سب نبیوں کی بیویاں تھیں اور بچے تھے۔ ان میں سے ایسا کوئی نہیں جو کھانا پیتا نہ ہو۔ اور معاملہ نہ کرتا ہو۔ اس کو نکاح وغیرہ سے واسطہ نہ پڑتا ہو۔ البتہ حضرت یحییٰ علیہ السلام جو ہر وقت عبادت میں مصروف رہتے تھے ان کو نکاح کا موقعہ نہیں مل سکا اور عیسیٰ علیہ السلام بھی اس سے مستثنیٰ ہیں۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ عیسیٰ علیہ السلام نے نکاح نہیں کیا۔ البتہ جب وہ قرب قیامت میں دوبارہ دنیا میں تشریف لائیں گے تو پھر نکاح بھی کریں گے اور ان کی اولاد بھی ہوگی، اس کے بعد ان کی طبعی وفات بھی ہوگی اور وہ دفن بھی ہونگے بہر حال نکاح تمام انبیاء کی سنت ہے۔

نکاح اگرچہ ایک اجتماعی معاہدہ ہے مگر اس کی بھی کچھ حدود اور قیود ہیں۔ شریعت مطہرہ نے کوئی سے مرد و زن کے درمیان نکاح کو جائز قرار نہیں دیا۔ بلکہ

شرائط نکاح

بعض صورتوں کو حرام قرار دیدیا ہے۔ آگے سورۃ نسا میں آئے گا، حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ
 اَمْهَاتُكُمْ، تمہارے لیے تمہاری مائیں، بہنیں، بیٹیاں، بھتیجیاں، بھانجیاں
 اور خوش دامن وغیرہ حرام کر دی گئی ہیں۔ ان کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا، اسی طرح ایک
 منکوحہ عورت کا نکاح دوسری جگہ نہیں ہو سکتا۔ جب تک کہ پہلے نکاح کی طلاق نہ ہو۔
 اس کے علاوہ رضاعی ماں بہن سے بھی نکاح نہیں ہو سکتا۔ یہ سب محرمات ہیں۔ فرمایا:
 ”وَاحِلَ لَكُمْ مَا وَاَرَاءَ ذٰلِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ اَنْتُمْ اَوْ اُولَآئِكَ عَدِلْتُمْ“
 جائز ہے۔ وہ تمہارے لیے حلال ہیں۔

نکاح کے لیے گواہان بھی لازمی ہیں۔ کسی دیگر معاملہ میں گواہ کے بغیر بھی معاہدہ ہو
 سکتا ہے۔ مگر نکاح کا معاہدہ ایک ایسا معاہدہ ہے کہ گواہوں کے بغیر پایہ تکمیل کو نہیں
 پہنچتا۔ پھر نکاح کے لیے حق مقرر ہو نا بھی اس کی شرائط میں سے ہے۔ مہر دنیا پرے
 گا مال خرچ کرنا ہو گا۔ اس کے بغیر نکاح درست نہیں۔

نکاح کے معاہدہ میں بعض حقوق کا تعین بھی ہے عورت اپنے حقوق طلب
 کر سکتی ہے، کھانا، کپڑا، رہائش عورت کے حقوق ہیں۔ جو مرد کے ذمے ہیں۔ البتہ
 عورت کو چاہیے کہ وہ خاوند کی حیثیت کے مطابق ان چیزوں کا مطالبہ کرے۔ اسکی
 حیثیت سے زیادہ طلب کر کے اُسے مشکل میں نہ ڈالے۔ پھر یہ بھی نکاح کی شرط
 ہے کہ اگر کسی وجہ سے میاں بیوی کا گزارہ نہ ہو سکے، تو خاص شرائط کے تحت اس
 معاہدہ کو ختم بھی کیا جاسکتا ہے۔ طلاق اور خلع کا قانون بھی شریعت میں موجود ہے
 زوجین کے درمیان تنازعہ کی صورت میں پہلے خود اسے حل کرنے کی کوشش کرو
 اگر ایسا نہیں ہو سکا۔ تو مرد و عورت کے خاندانوں میں سے ایک ایک نمائندہ لے
 لو، جو صلح و صفائی کی کوشش کریں۔ اگر پھر بھی مصالحت نہ ہو سکے۔ تو پھر
 معروف طریقے سے میاں بیوی میں جدائی کر دو کہ اب اس کے بغیر کوئی اور چارہ کار
 نہیں رہا۔ لہذا دونوں کی بھلائی اس میں ہے کہ ان میں تفریق ڈال دی جائے۔ یہ
 سب نکاح کے اصول و قواعد ہیں۔

میاں بیوی میں جدائی کے لیے شریعت نے طلاق کا طریق کار مقرر کیا ہے۔
فہمائے کرام فرماتے ہیں کہ طلاق کی تین قسمیں ہیں۔

یعنی احسن، سنت اور بدعت۔ طلاق احسن سے مراد اچھی اور بہتر طلاق ہے اور یہ اس طلاق کو کہتے ہیں۔ جو عورت کو اس طہر میں دی جائے۔ جس میں میاں بیوی کا ملاپ نہ ہوا ہو۔ اور ایک وقت میں ایک ہی طلاق ہو۔ ایسی طلاق کی صورت میں عدت کے اندر خاوند دوبارہ عورت سے رجوع کر سکتا ہے۔ اور رجوع کے لیے نکلج کی ضرورت نہیں۔ اگر عدت گزر جائے تو عورت آزاد ہو جائے گی۔ ہاں اگر کوئی شخص اب بھی رجوع کرنا چاہے۔ تو دوبارہ نکلج کر کے عورت کو گھر لاسکتا ہے۔ عدت کے بعد عورت کسی دوسری جگہ نکلج کرنے کی بھی مجاز ہے۔

اگر کوئی شخص ایک سے زیادہ یعنی دو یا زیادہ سے زیادہ تین طلاقیں دینا چاہتا ہے یعنی اس نے ارادہ کر لیا ہے۔ کہ عورت کو کسی صورت میں بھی نہیں رکھنا۔ تو پھر اس کا طریقہ یہ ہے۔ کہ ہر طہر میں ایک طلاق دے۔ اس کا فائدہ یہ ہے۔ کہ پہلی اور دوسری طلاق کے بعد اگر خاوند رجوع کرنا چاہے تو کر سکتا ہے۔ اور اگر تیسری طلاق دے دی تو پھر یہ طلاق مغفلہ ہو جائے گی، اب رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ اس طلاق کو طلاق سنت کہتے ہیں۔ کہ یہ سنت کے مطابق ہے۔

تیسری قسم طلاق، طلاق بدعت کہلاتی ہے۔ اور یہ ایسی ہے کہ یا تو طہر کی بجائے حیض کے دوران طلاق دے دے یا تینوں طلاقیں بیک وقت دیدے۔ اس طرح طلاق تو واقع ہو جائے گی مگر مینے والا گنہگار ہو گا۔ کیونکہ اس نے صحیح طریقہ اختیار نہیں کیا

اس آیت میں فرمایا الطَّلَاقُ مَثَلَتَيْنِ یعنی جمعی طلاقیں دو ہیں۔ ایک طلاق مینے کے بعد رجوع ہو سکتا ہے۔ اس کے بعد اگر دوسری طلاق دے دی تو پھر بھی رجوع کی گنجائش ہے۔ البتہ تیسری طلاق کے بعد یہ سہولت ختم ہو جاتی ہے۔ ہاں طلاق رجعی میں رجوع دھورتوں میں ہو سکتا ہے۔ اگر طلاق صریح الفاظ میں دی گئی ہے۔ تو بغیر

رجعی طلاقیں
دو ہیں

نکاح کے رجوع ہو سکتا ہے۔ اور اگر اثنائے گناہ سے طلاق دی ہے۔ اور نیت قطعی علیحدگی کی ہے تو یہ طلاق بائن ہو جائے گی۔ اس میں رجوع کے لیے دوبارہ نکاح کرنا ہوگا۔ خواہ ایک طلاق کے بعد رجوع مقصود ہے یا دوسری طلاق کے بعد۔ تیسری طلاق کا ذکر تو آگے آئیگا۔ یہاں فرمایا کہ رجوع کے لیے زیادہ سے زیادہ در طلاقیں ہیں۔

علحدگی کا طریق کار

فرمایا دوسری طلاق کے بعد فَاِمْسَاكُ بِعَصْرِ يَدَيْهِ یا تو دستور کے مطابق روک لو۔ اور اس سے اچھا سلوک کرو۔ اس کا خیر چہ ادا کرو۔ بشرطیکہ ارادہ اصلاح کا ہو، تنگ کرنے کا نہ ہو۔ ایسا نہ ہو کہ نہ تو عورت کا حق ادا کیا جاوے اور نہ اس کو آزاد کیا جائے۔ بلکہ دستور کے مطابق اس سے اچھا سلوک کرنا چاہیے۔ شریعت مطہرہ نے عورت کے جو حقوق مقرر کیے ہیں، انہیں ادا کرو۔ اور اگر ایسا نہیں ہو سکتا تو پھر اَوْ تَمْرُجُ بِاِحْسَانٍ اُسے نیکی کے ساتھ جدا کرو۔ لڑائی جھگڑے میں نہ پڑو بلکہ لین دین کا جو معاملہ ہے اسے احسن طریقے سے پنٹا کر مطلقہ کو رخصت کرو۔ ہاں یاد رکھو وَلَا يَحِلُّ لَكُمْ اور تمہارے لیے یہ چیز حلال نہیں ہے اَنْ تَاْخُذُوْا مِنْهَا شَيْئًا کہ تم ان عورتوں سے کوئی چیز واپس لے لو، جو تم نے انہیں دے رکھی ہے۔ مثلاً اگر ہر ادا کر دیا تھا، تو طلاق کے وقت واپس لینے کی کوشش کی ہے یا کوئی تحفہ دیا تھا، تو اس کا مطالبہ کر دیا۔ یہ درست نہیں ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ عہلہ دے کر اس کو واپس لینا ایسا ہے۔ جیسے گناہ کے خود ہی چاٹ لیتا ہے۔ فرمایا ہمارے مسلمانوں کی مثال بُری نہیں ہونی چاہیے۔ لَيْسَ لَنَا مِثْلُ السَّوْرَةِ سورۃ نسا میں آتا ہے۔ كَرَّ وَاتَّيْتُمْ رَاٰدَ الْهَنْ قِنْطَارًا فَلَا تَاْخُذُوْا مِنْهُ شَيْئًا اگر تم نے عورتوں کو ڈھیر مال بھی دے رکھا ہے تو ان سے کوئی چیز واپس نہ لو۔ خاص طور پر کوئی بہتان لگا کر مال واپس لینا اور بھی بُرا ہے۔ یہ چیز مسلمان کے شایان نہیں ہے۔ لہذا اگر تم نے طلاق کا حتمی فیصلہ کر لیا ہے۔ تو پھر دستور کے مطابق اچھے طریقے سے رخصت کر دو۔

یہ بات گذشتہ درس میں بیان ہو چکی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے طلاق کا حق مرد کو دیا ہے۔ عورت کو نہیں دیا۔ اور اس میں بھی اس کی مصلحت کا فرما ہے۔ تجربہ شاہد ہے کہ حیض و نفاس یا حمل کے دوران عورت کے اعصاب پر خاص اثر پڑتا ہے جس کی وجہ سے وہ جلد باز واقع ہوئی ہے۔ اگر طلاق کا حق عورت کو مل جاتا تو طلاق کے معاملات کو کنٹرول کرنا مشکل ہو جاتا۔ پھر یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ جن ممالک میں عورت کو یہ حق دیا گیا ہے۔ وہاں کس قدر معاشرتی برائیاں پیدا ہوئی ہیں۔ تو بہر حال طلاق کا حق اللہ تعالیٰ نے مرد کو دیا ہے۔ اور اُسے عورت پر ایک درجہ فضیلت دی ہے۔ البتہ بعض غیر معمولی حالات سے عہدہ برا ہونے کے لیے اللہ تعالیٰ عورت کو خلع کا حق دیا ہے۔ اگر خاوند ظلم کرتا ہے۔ اور طلاق بھی نہیں دیتا۔ تو عورت کو حق حاصل ہے کہ وہ عدالت مجاز کی طرف رجوع کر کے اپنا معاملہ پیش کرے۔ عدالت فریقین کے دلائل سننے کے بعد اگر مناسب سمجھے تو میاں بیوی میں علیحدگی کر سکتی ہے اس صورت میں طلاق کی ضرورت نہ ہوگی۔ البتہ اگر فریقین رضامند ہو جائیں کہ خاوند اتنے مال کے عوض خلع پر راضی ہوگا۔ تو عورت اتنا مال مرد کو ادا کر کے خلع چل کر لے گی۔ اسی چیز کے متعلق فرمایا کہ عام حالات میں تو مرد کو حق حاصل نہیں کہ وہ ادا شدہ مال عورت سے واپس لے۔ إِلَّا أَنْ يَتَخَفَ أَلَّا يُقِيمَ حُدُودَ اللَّهِ سوائے اس صورت کے کہ ان دونوں کو خوف ہو کہ وہ اللہ کی حدود قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی ان کا نباہ مشکل ہو گیا ہے۔ اور علیحدگی ضروری ہے۔ تو جب دونوں فریق خلع کے بدلے کسی مال کی ادائیگی پر رضامند ہو جائیں، تو ایسا مال خاوند لے سکتا ہے۔

اس قسم کا واقعہ خود حضور علیہ السلام کے زمانے میں پیش آیا۔ رئیس المنافقین عبداللہ ابن ابی بنیہمیہ حبیلہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے ایک صحابی ثابت بن قیسؓ کے نکاح میں تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے۔ کہ باپ دشمن اسلام ہے۔ اور اس کا بیٹا اور بیٹی جان نثاران اسلام ہیں۔ حضرت ثابتؓ بڑے نیک آدمی تھے۔ مگر شکل و صورت کے لحاظ سے حبیلہ کو قابل قبول نہ تھے۔ انہیں احساس کمتری اس طرح پیدا ہوا کہ کسی

موقع پر حضرت جمیلہؓ کے کسی مقام پر پردہ اٹھایا تو وہاں ایک جماعت موجود تھی جن میں حضرت ثابتؓ بھی موجود تھے۔ حضرت جمیلہؓ نے محسوس کیا کہ اُن کا خاوند رنگ روپ اور شکل و صورت کے لحاظ سے سب سے کم تر ہے۔ چنانچہ اس نے اس بات کا ذکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا کہ حضور ہم دونوں بطور میاں بیوی نہیں رہ سکتے۔ آپ نے دریافت فرمایا کیا ثابتؓ میں کوئی اخلاقی کمزوری واقع ہوئی ہے جس کی وجہ سے تو متنفّر ہو گئی ہے۔ تو اُس نے عرض کیا، حضور! ایسی بات نہیں۔ وہ بڑا بااخلاق ہے۔ وَلَیْسَ بَیِّنَیْکُمَا کُفْرٌ اَلْکُفْرُ فِی الْاِسْلَامِ مِکْرٌ مِّمَّا مِیْنِ الْاِسْلَامِ میں رہ کر کفر کو پسند نہیں کرتی۔ مقصد یہ کہ وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔ میں اس سے گلو خلاصی چاہتی ہوں۔ کیوں کہ اگر میں بادلِ سخاوت اس کے ساتھ رہوں گی تو اس کی فرمانبرداری میں فرق آئے گا۔ اور یہ جیسے اسلام کی تعلیمات کے منافی ہوگی۔ لہذا آپ ہماری علیحدگی کی کوئی صورت پیدا فرما دیں۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ ثابتؓ نے آپ کو حق فہم میں یا تنہ کے طور پر جو باغ دیا تھا۔ کیا تم وہ باغ واپس کرنے کے لیے تیار ہو۔ حضرت جمیلہؓ نے کہا کہ ہاں میں ایسا کرنے پر رضا مند ہوں۔ اس کے علاوہ اگر ثابتؓ کا اور بھی مطالبہ ہو تو میں پورا کرنے کو تیار ہوں۔ چنانچہ باغ کی واپسی کی شرط پر حضور علیہ السلام نے خلع کے حکم پر عمل کرتے ہوئے اُن دونوں کی علیحدگی کرادی۔

بہر حال خلع میں طلاق کے الفاظ کہنے کی ضرورت نہیں ہوتی۔ البتہ یہ طلاقِ بائن کا قائم مقام ہوتا ہے۔ اور طلاق کی طرح اس میں بھی عورت کو عدت گزارنا ہوتی ہے۔ البتہ عدت کی مدت کے متعلق فقہائے کرام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے بعض فقہائے کرام کا خیال ہے کہ خلع میں عدت ایک حیض ہے۔ تاہم جمہور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ طلاق کی مانند خلع کی عدت بھی تین حیض یا تین ماہ ہے جیسی صورت بھی ہو۔

خلع کے علاوہ علیحدگی کی ایک اور صورت بھی ہے جسے طلاقِ بالمال کہتے ہیں۔ خاوند مال کا مطالبہ کرے کہ اتنا مال مجھے دو تو میں طلاق دیتا ہوں۔ اگر فریقین

رضا مند ہو جائیں۔ تو مقرر مال کے عوض خاوند باقاعدہ طلاق دے دیگا۔ اور وہ طلاق کے حکم میں آئے گی۔ خلع نہیں ہوگا۔

آیت کے اگلے حصے میں رِوئے سَخْنِ مُسْلِمَانٍ کی عام جماعت کی طرف ہے مگر فَإِنْ خِفْتُمْ أَلَّا يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ اے لوگو! اگر تم کو ڈر ہے۔ کہ یہ میاں بیوی اللہ کی حدود کو قائم نہیں رکھ سکیں گے۔ یعنی ان میں اختلافات کی خلیج اتنی وسیع ہو چکی ہے کہ اب ان کا میاں بیوی کی حیثیت سے گزر اوقات ممکن نہیں۔ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا فِيمَا افْتَدَتْ بِهِ تو ان دونوں پر کوئی گناہ نہیں اس چیز میں کہ وہ اپنی جان چھڑائی کا فدیہ دے۔ یعنی عورت فدیہ دے کہ مرد سے خلع حاصل کرے۔ ہاں یہ بات یاد ہے۔ کہ اگر خاوند بے قصور ہے۔ اور عورت اُس سے بلا وجہ علیحدگی چاہتی ہے۔ تو وہ گنہگار ہوگی اور اگر خاوند بلا وجہ عورت کو تنگ کر رہا ہے تو وہ گنہگار ہوگا۔ تاہم دونوں صورتوں میں خلع واقع ہو جائے گا۔

امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس قسم کا مال لینا مکروہ ہے۔ مگر بہر حال جائز ہے دوسرے فقہائے کرام کا کہنا ہے۔ کہ چونکہ اللہ تعالیٰ نے خاص حالات میں خلع کی اجازت دے دی ہے۔ اس لیے اس کے عوض مال وصول کرنا بالکل جائز ہے۔ اس میں کوئی کڑھٹ نہیں۔

فرمایا تِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ فَلَا تَقْتَدُواْ۔ یہ اللہ کی مقرر کردہ حدیں ہیں ان سے آگے نہ بڑھو۔ یہ نکاح، طلاق، ایلا، خلع وغیرہ اللہ تعالیٰ کے نافذ کردہ قوانین ہیں ان کی پاسداری کرو۔ اور ان کے خلاف کر کے اللہ کی حدود کو نہ توڑ بیٹھنا۔ رمضان المبارک میں جہاں روزوں کی فرضیت کا ذکر تھا، وہاں فرمایا کہ روزہ رکھ کر کھانا پینا اور مباشرت حرام ہے۔ یہ اللہ کی حدیں ہیں۔ فَلَا تَقْرَبُوهَا۔ اُن کے قریب بھی نہ جانا۔ اور یہاں فرمایا فَلَا تَقْتَدُواْ ان کو عبور نہ کرنا۔ ظاہر ہے۔ کہ کھانا، پینا اور مباشرت کرنا انسان کی غایت درجہ کی خواہشات ہیں۔ اور انسان کسی وقت بھی ان کو پورا کر سکتا ہے۔ اس لیے وہاں پر سخت حکم دیا۔ کہ ان حدود کے قریب بھی نہ جاؤ، کہیں پھسل کر حدود اللہ کو متاثر نہ کر بیٹھو۔ اور نکاح طلاق وغیرہ کے مسئلہ میں تنازعہ ہوتا ہے

حدود اللہ کا احترام

دو فریق ملوث ہوتے ہیں۔ اس لیے یہاں پر حدود کی خلاف ورزی کا اتنا خطرہ نہیں ہوتا۔ جتنا روزہ کے معاملہ میں ہوتا ہے۔ اس لیے یہاں پر فرمایا کہ اللہ کی حدود پار نہ کر جانا۔ ورنہ تباہ ہو جاؤ گے۔ اور یاد رکھو وَمَنْ يَتَعَدَّ حُدُودَ اللَّهِ فَأُولَٰئِكَ هُمُ الظَّالِمُونَ، جو اللہ تعالیٰ کی باندھی ہوئی حدود سے اُگے بڑھے گا۔ اس لیے ہی لوگ ظالم ہیں۔ ظاہر ہے۔ ظالم مستوجب سزا ہوتا ہے۔ اللہ کی گرفت میں آتا ہے۔ اس لیے فرمایا جو اللہ کی حدود کو توڑے گا۔ وہ ظالموں میں شمار ہو کر سزا کا مستحق ہو گا۔

فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ زَوْجًا غَيْرَهُ
 فَإِنْ طَلَّقَهَا فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا إِنْ ظَنَّا أَنْ
 يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وَتِلْكَ حُدُودُ اللَّهِ يُبَيِّنُهَا لِقَوْمٍ
 يَعْلَمُونَ (۲۳۰)

ترجمہ: پھر اگر اُس نے طلاق دیدی عورت کو (یعنی تیسری مرتبہ) پس اس کے بعد اُس
 کے لیے حلال نہیں ہے یہاں تک وہ اس کے علاوہ کسی خاوند کے ساتھ نکاح کر لے۔
 پھر اگر اُس نے بھی طلاق دیدی اس عورت کو تو کوئی گناہ نہیں ہے اُن دونوں پر کہ رجوع
 کر لیں، اگر وہ گمان کریں کہ وہ اللہ کی حدود کو قائم رکھیں گے اور یہ اللہ کی حدیں ہیں جنہیں
 اللہ تعالیٰ اُس قوم کے لیے بیان کرنا ہے جو علم رکھتے ہیں (۲۳۰)

گزشتہ درس میں طلاق کا مسئلہ بیان ہوا تھا اور اس کے بعد خلع کا بیان آیا۔ آج کی
 آیت کا تعلق بھی مسئلہ طلاق سے ہے۔ وہاں یہ بیان ہوا تھا کہ طلاق دو مرتبہ ہے جس
 کے بعد خاوند رجوع کر سکتا ہے۔ اس درس میں تیسری طلاق اور اس کے نتائج کا ذکر آ
 رہا ہے۔ فرمایا فَإِنْ طَلَّقَهَا یعنی اگر کوئی شخص اپنی بیوی کو تیسری مرتبہ طلاق دے
 دے۔ تو اب رجوع کا حق ختم ہو گیا۔ فَلَا تَحِلُّ لَهُ مِنْ بَعْدُ حَتَّى تَنْكِحَ
 زَوْجًا غَيْرَهُ اب اس مرد کے لیے عورت حلال نہیں ہے۔ جب تک
 کہ وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح نہ کر لے۔ اب یہ عورت پہلے خاوند کے لیے
 منعظہ ہو گئی۔ اگرچہ یہاں پر عدت کا ذکر نہیں ہوا۔ تاہم یہ بات پہلے آچکی ہے کہ
 طلاق یا بیوگی کے بعد عورت کے لیے عدت کا پورا کرنا ضروری ہے۔ اس کے
 بغیر نکاح ثانی نہیں کر سکتی۔ یہاں پر بھی وہی صورت ہے۔ جب کوئی شخص تیسری
 طلاق دے دے، تو پھر وہ عورت عدت کے ایام پورے کرے گی۔ اور اس کے بعد

دوسری جگہ نکاح کرنے کی مجاز ہوگی۔ فَإِنْ طَلَّقَهَا اور اگر اب دوسرا غاوند بھی اس کو طلاق دے دے یا فوت ہو جائے۔ تو عورت کو پھر دوسری عدت گزارنا ہوگی۔ اس کے بغیر تیسرا نکاح نہیں کر سکتی۔ جب یہ دوسری عدت بھی پوری ہو جائے فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا أَنْ يَتَرَاجَعَا تو پہلے غاوند اور عورت پر کوئی گناہ نہیں کہ وہ پھر رجوع کر لیں بشرطیکہ إِنْ ظَنَّا أَنْ يُقِيمَا حُدُودَ اللَّهِ وہ گمان کریں کہ اللہ کی حدود کو قائم کریں گے مطلب یہ کہ ان دونوں کو اس بات کا احساس ہو جائے۔ کہ انہوں نے علیحدگی اختیار کر کے سخت پریشانی اٹھائی ہے۔ لہذا آئندہ ایسی صورت نہیں پیدا ہونے دیں گے۔ تو وہ دوبارہ نکاح کر کے زوجین کی حیثیت سے زندگی گزار سکتے ہیں۔

طلاق کی مختلف صورتیں

جیسا کہ گذشتہ درس میں بیان آچکا ہے۔ الطَّلَاقُ مَرَّتَيْنِ طلاق دراصل دو ہی ہیں۔ جن میں رجوع کی گنجائش ہے۔ اور اس کی آخری حد تین ہے۔ جس کے بعد جدائی لازمی ہو جاتی ہے۔ اسی لیے اہم ماکنٹ تیسری طلاق کو پسند نہیں کرتے وہ کہتے ہیں۔ کہ تیسری طلاق دینی ہی نہیں چاہیے۔ تاہم طلاق کا احسن طریقہ یہ ہے۔ کہ ایسے طریقے میں ایک طلاق دی جائے جس میں مباشرت نہ کی ہو۔ جب تین حیض یا تین ماہ (جیسی بھی صورت ہو) گزر جائیں گے تو عورت آزاد ہو جائے گی۔ لہذا دوسری اور تیسری طلاق بیٹے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ ایک یا دو طلاق کی صورت میں عدت کے دوران بغیر دوبارہ نکاح کئے رجوع ہو سکتا ہے۔ اور اگر عدت گزر جائے۔ تو پھر بھی دوبارہ نکاح کر کے رجوع ہو سکتا ہے۔ اس میں کوئی دقت نہیں اور کوئی قباحت نہیں۔ اس طریقہ طلاق کے مطابق اگر ایک طلاق کے بعد رجوع کی کوئی صورت ممکن نہ ہو تو دوسرے طریقے میں دوسری طلاق دی جاسکتی ہے۔ اب بھی سوچنے سمجھنے کا موقع موجود ہے۔ انان ٹھنڈے دل سے غور کر کے متنازعہ امور کا تصفیہ کر سکتا ہے۔ اس کے بعد بھی اگر کوئی شخص تیسری طلاق ضرور ہی دینا چاہتا ہے۔ تو پھر تیسرے طریقے میں تیسری طلاق دیدے۔ بہر حال بہترین طریقہ یہ ہے۔ کہ تین طریقے میں تین طلاق دے۔ حیض کی حالت میں طلاق دینے سے اگرچہ

طلاق تو واقع ہو جاتی ہے۔ مگر انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ یہ طلاق بدعت کہلاتی ہے۔
بیک وقت تین طلاق دینا بھی بدعت ہے۔ آدمی گنہگار ہوتا ہے۔ سنت کے خلاف ہے

طلاق ثلاثہ
کی تحقیق

حیض کی حالت میں طلاق دینے، تین طلاقیں بیک وقت دینے یا ایک ہی طرہ میں
تین طلاقیں دینے کے متعلق فقہائے کرام کے تین مختلف مسلک ہیں شیعہ حضرات کے
نزدیک حیض کی حالت میں تین طلاقیں اکٹھی دینے سے طلاق واقع ہی نہیں ہوتی، مگر
ظاہر یہ جن میں اہل حدیث بھی شامل ہیں، انکا مسلک یہ ہے کہ بیک وقت تین طلاقیں ایک ہی
شمار ہوتی ہیں۔ انہیں طائوس، مقاتل، نخعی وغیرہ شامل ہیں۔ اور غیر مسلک ائمہ اربعہ کہے جے آخر صحابہؓ
اور تقریباً تمام تابعینؓ اور جمہور ائمہ کی تائید حاصل ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ تین طلاق بیک وقت دینے
کا طریقہ تو بلاشبہ غلط ہے اور ایسا کرنے والا گنہگار بھی ہوتا ہے مگر تین طلاقیں واقع ہو جاتی ہیں۔

جو حضرات تین طلاق کو ایک تصور کرتے ہیں وہ علم شریف میں منقول حضرت
عبداللہ بن عباسؓ کی حدیث سے استدلال کرتے ہیں۔ آپ فرماتے ہیں کہ حضور
علیہ السلام حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ تک تین طلاقیں ایک
ہی طلاق تصور ہوتی تھی۔ بعد میں حضرت عمرؓ نے حکم جاری کیا۔ جو شخص بیک وقت تین
طلاقیں دے گا، وہ تین ہی سمجھی جائیں گی۔ اس حدیث کے متعلق جمہور فقہاء اور ائمہ کرام
فرماتے ہیں کہ مذکورہ حدیث مرفوع نہیں بلکہ موقوف ہے۔ یہ حضرت ابن عباسؓ کا
بیان ہے کہ فلاں فلاں زمانہ میں ایسا ہوا تھا، یہ خود حضور علیہ السلام کا فرمان نہیں ہے
اس استدلال میں کمزوری یہ ہے کہ اس حدیث کے برخلاف خود حضرت عبداللہ بن عباسؓ
کا مذہب یہ ہے کہ تین طلاقیں دینے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں اور یہ اصول حدیث
کا کلیہ ہے۔ کہ جب کوئی راوی خود اپنی روایت کے خلاف فتویٰ دے یا عمل کرے تو وہ
روایت ناقابل عمل ہو جاتی ہے۔ اس کی مثال حضرت ابوہریرہؓ والی حدیث ہے جس
میں حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے کہ اگر کتا برتن میں منہ ڈال دے تو
برتن سات دفعہ دھونا چاہیئے جس میں ایک مرتبہ مٹی مل کر دھونا بھی شامل ہو۔ اب حضرت
ابوہریرہؓ کا اپنا فتویٰ یہ ہے کہ صرف تین دفعہ دھونے سے برتن پاک ہو جاتا ہے

چونکہ کتے کے دہن کا لعاب جراثیم آلود ہوتا ہے۔ اس لیے ایک دفعہ مٹی بھی مل لی جائے تو بہتر ہے۔ درنہ تین دفعہ پانی کے ساتھ دھو لینا کافی ہے۔ لہذا سات مرتبہ دھونے والی حدیث ناقابل عمل ہو گئی۔ اتنی دفعہ دھونا ضروری نہ رہا۔ بلکہ اگر احتیاطاً کوئی سات دفعہ بھی دھو لے تو وہ استحباب کے درجہ میں آئیگا، لازم نہیں رہا۔ لہذا حضرت ابن عباسؓ کی تین طلاقیں کو ایک طلاق تصور کرنے والی روایت کے استدلال میں کمزوری واقع ہو گئی۔

اگرچہ حضرت ابن عباسؓ کے اکثر شاگرد مذکورہ روایت ہی بیان کرتے ہیں۔ جس میں تین طلاقیں کو ایک تصور کیا گیا ہے۔ مگر ابو داؤد و شریفین کی روایت کے مطابق آپ کے ایک شاگرد ایک دوسری روایت بھی بیان کرتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ ایک شخص حضرت عبداللہ بن عباسؓ کے پاس آیا اور کہا کہ میں نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں بیک وقت دے دی ہیں۔ آپ نے بہتہ فرمایا عَصِیْتَ رَبِّکَ وَبَانَکَ مِنْکَ اُمُّ اَتَمَّکَ یعنی تو نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی اور تیری عورت بھی تجھ سے جدا ہو گئی۔ اس سے بھی ثابت ہوتا ہے۔ کہ خود حضرت ابن عباسؓ تین طلاقیں کو تین ہی تصور کرتے تھے۔ جبھی تو فرمایا۔ کہ اگرچہ تو گنہگار ہو ہے۔ مگر طلاق واقع ہو گئی۔ اور تیری بیوی تجھ سے علیحدہ ہو گئی۔

طحاوی شریف میں ایک اور روایت بھی حضرت عبداللہ بن عباسؓ کی طرف منسوب ہے۔ ایک شخص آپ کے پاس آیا۔ اور کہنے لگا کہ میرے چچا نے اپنی بیوی کو تین طلاقیں دے دی ہیں۔ اس کا کیا حکم ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ نے فرمایا اِنَّکَ عَصَیْتَ اللہَ تیرے چچا نے اللہ تعالیٰ کی نافرمانی کی۔ وَاَطَاعَ الشَّیْطٰنَ اور شیطان کی بات مانی۔ وَلَمْ یَجْعَلْ لَہٗ مَخْرَجًا مگر اب خلاصی کی صورت بھی باقی نہیں رہی۔ عورت کو طلاق واقع ہو گئی۔

موطا امام مالکؓ میں محمود بن لبیدؓ سے روایت منقول ہے۔ آپ چھوٹی عمر کے صحابی ہیں۔ انہوں نے بتایا کہ ایک شخص نے اپنی عورت کو تین طلاقیں اکٹھی دے دیں حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ کہ اللہ کی کتاب کو تحصیل اور شغلہ بنانا درست نہیں۔

آپ سخت ناراض ہوئے۔ اتنے میں ایک شخص نے کھڑے ہو کر عرض کی، حضور! کیا میں اس کو مار نہ ڈالوں۔ مگر آپ خاموش رہے۔ آپ نے مزید کچھ نہیں فرمایا۔ مگر ناراضگی کا اظہار کیا۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ بیک وقت طلاق ثلاثہ سے آدمی گنہگار ضرور ہوتا ہے۔ مگر طلاق واقع ہو جاتی ہے۔

موطا امام مالک میں حضرت ابن عباسؓ سے ایک اور روایت ہے۔ کہ ایک شخص نے کہا طَلَّقْتُ مَائِدَةً میں نے اپنی عورت کو سوطلاقیں دیں۔ حضرت ابن عباسؓ نے فرمایا۔ کہ تین طلاقوں کے ساتھ تو عورت علیحدہ ہو گئی، باقی ستائیس طلاقیں دیگر تم نے اللہ کی آیات کے ساتھ مذاق کیا ہے۔ معلوم ہوا کہ تین طلاقیں دینے سے تینوں واقع ہو جاتی ہیں۔

لہذا تین طلاقوں کے ایک طلاق واقع ہونے والی روایت قابل عمل نہیں رہی۔ البتہ اس کے متعلق فقہائے کرام یہ توضیح بیان کرتے ہیں۔ کہ اس کا مطلب یہ بھی ہو سکتا ہے۔ کہ حضور علیہ السلام حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ابتدائی دور تک لوگ ایک ہی طلاق دیتے ہوں۔ تین کا رواج ہی نہ تھا۔ پھر جب لوگوں نے تین طلاقیں دینا شروع کیں تو حضرت عمرؓ نے حکم صادر کیا۔ کہ جو شخص بیک وقت تین طلاقیں دے گا۔ وہ تین ہی شمار ہوں گی۔ لہذا کوئی غلط فہمی میں نہ رہے۔ کہ تین طلاق بیک وقت دینے سے ایک ہی واقع ہوگی اور وہ رجوع کر سکے گا۔ لہذا لوگ خبردار رہیں۔

البرادورد شریف میں یہ بھی آتا ہے۔ کہ تین طلاقوں کا ایک طلاق شمار کرنا اس عورت کے لیے ہے جس کا نکاح ہوا مگر خاوند سے خلوت نہیں ہوئی۔ وہ شخص اگر ایک وقت میں تین طلاق بدیں القاط دیتا ہے۔ کہ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ تجھ کو طلاق ہے۔ تو ایسی عورت پہلی طلاق پر ہی جدا ہو جائے گی۔ اس کی دوسری اور تیسری طلاقیں لغو ہیں۔ کیونکہ عورت کے غیر مدخولہ ہونے کی وجہ سے اس کے لیے ایک طلاق ہی کافی ہے۔ یہاں دوسری اور تیسری طلاق کا کوئی موقع محل نہیں ہے۔ الغرض! تین طلاقوں کو ایک تصور کرنے کے متعلق صرف حضرت عبداللہؓ

بن عباسؓ والی روایت سے استدلال کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ اور کوئی خاص روایت نہیں۔ اس روایت کے متعلق معلوم ہو گیا۔ کہ یہ استدلال کمزور ہے اور روایت مؤول ہے البتہ مسلم شریف میں حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی ایک روایت آتی ہے۔ کہ کسی شخص نے حضور صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا حضرت! اگر کوئی حیض کی حالت میں عورت کو طلاق دیدے تو اس کا کیا حکم ہے۔ فرمایا اگر کوئی ایسی بیوقوفی کر لے تو عورت تو جہاں ہو جائیگی البتہ طلاق مینے والا گنہگار ہوگا۔ کہ اُس نے غلط موقع پر طلاق دی۔ ابن حزمؒ اور بعض دوسرے ائمہ نہ سختہ بھی بیان کرتے ہیں۔ کہ پہلی آیت میں فرمایا الطَّلَاقُ مُبَرَّئٌ یعنی طلاق دوسرے ہے۔ جس میں رجوع ہو سکتا ہے۔ اس آیت میں فرمایا فَكَانَ طَلَقَهَا پس اگر اس نے (تیسری) طلاق دیدی۔ فرماتے ہیں۔ کہ یہاں پر فَكَانَ کی بجائے ثُمَّ کا لفظ بھی آ سکتا تھا۔ مگر اس میں حکمت یہ ہے۔ کہ فَاِذَا اتَّصَلَ کے لیے آتا ہے۔ جب کہ ثُمَّ میں یہ معنی نہیں پایا جاتا۔ تو یہاں پر فَكَانَ طَلَقَهَا کا معنی یہ ہوگا کہ دو طلاق کے بعد اگر متصل تیسری طلاق دیدے یعنی بیک وقت تین طلاقیں دیدے۔ تو عورت حرام ہو جائے گی۔ جب تک وہ کسی دوسرے خاوند سے نکاح کر کے طلاق چل نہ کرے۔ اس سے بھی معلوم ہوا۔ کہ متصل تین طلاقیں تین ہی تصور ہوں گی۔

اس وقت ہر وجہ حلالہ کی جو صورت ہے وہ کبیرہ گناہ کا ارتکاب ہے۔ یہ مشروط نکاح حلالہ مشروط نکاح کی صورت میں کیا جاتا ہے۔ جب دیکھتے ہیں۔ کہ اب رجوع کی کوئی صورت باقی نہیں رہی۔ تو کسی دوسرے شخص کے ساتھ اس شرط پر نکاح کر دیا۔ کہ وہ طلاق دیدے گا۔ اور پھر پہلے خاوند سے نکاح ہو سکے گا۔ اگرچہ اس طرح قانونی جواز تو پیدا ہو جاتا ہے۔ مگر اس شرط کے تحت نکاح گناہ کبیرہ ہے۔ ایسے حلالے پر لعنت کی گئی ہے۔ اَلْعَنَ اللّٰهُ الْمَحْلِلَ وَالْمَحْلِلَ لَہ۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا حلالہ کرنے والے اور جس کے لیے حلالہ کیا گیا۔ دونوں پر اللہ تعالیٰ کی لعنت ہو۔

بہر حال یہ حلال حرام کا مسئلہ ہے۔ اور اگر حلال و حرام میں اختلاف پیدا ہو جائے تو کلیہ یہ ہے کہ حرام کو ترجیح حاصل ہوتی ہے۔ لہذا اس مسئلہ میں تین طلاق پر عورت حرام ہو جائیگی، خواہ بیک وقت تین طلاق دی ہوں۔ ایک ہی طہر میں دی ہوں یا حیض کے دوران دی ہوں۔ اب عورت اس مرد کے لیے حلال نہیں ہو سکتی۔ جب تک کہ وہ دوسرے خاوند سے نکاح نہ کرے۔ پھر وہ خاوند فوت ہو جائے یا طلاق دے دے تو دوبارہ پہلے خاوند سے نکاح ہو سکتا ہے۔

فَمَا يَوَدُّكَ حَدُّهُ اللَّهُ یہ اللہ تعالیٰ کی قائم کردہ حدیں ہیں۔ يُبَيِّنُهَا لَكُمْ لَعَلَّكُمْ تَعْلَمُونَ جو کہ اہل علم قوم کے لیے بیان کی گئی ہیں۔ مسئلہ نکاح کا ہو، طلاق یا عدت کا ہو۔ ایلا یا ظہار کا ہو۔ اللہ تعالیٰ نے انسانوں کے لیے واضح حدیں مقرر کر دی ہیں۔ ان حدود کا احترام کرنا چاہیے اور ان کو عبور نہیں کرنا چاہیے۔ ورنہ انسان گنہگار ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کی گرفت میں آ جائے گا۔

وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمَّا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ
 أَوْ سَرِّحُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ وَلَا تُمْسِكُوهُنَّ ضِرَارًا لِّتَعْتَدُوا ۚ
 وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ فَقَدْ ظَلَمَ نَفْسَهُ وَلَا تَتَّخِذُوا
 آيَاتِ اللَّهِ هُزُوًا ۚ وَاذْكُرُوا نِعْمَتَ اللَّهِ عَلَيْكُمْ وَمَا
 أَنْزَلَ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ يَعِظُكُمْ بِهِ ۚ
 وَاتَّقُوا اللَّهَ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿٢٣١﴾
 وَإِذَا طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ فَلَمَّا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ فَلَا تَعْصِلُوهُنَّ
 أَنْ يَنْكِحَنَّ أَرْوَاجَهُنَّ إِذَا تَرَاضَوْا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ ۚ ذَلِكَ
 يُوعِظُ بِهِ مَنْ كَانَ مِنْكُمْ يُؤْمِنُ بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ ۚ
 ذَلِكَُمَ آتَاكُمُ لَكُمْ وَأَطَهَّرُ وَاللَّهُ يَعْلَمُ وَأَنْتُمْ
 لَا تَعْلَمُونَ ﴿٢٣٢﴾

ترجمہ :- اور جب تم عورتوں کو طلاق دو، پس وہ اپنی عدت تک پہنچیں۔ پھر ان
 کو دستور کے مطابق رد کر رکھو یا ان کو چھوڑ دو دستور کے مطابق۔ اور ان کو ضرر پہنچانے
 کے لیے نہ روکو، تاکہ تم ان پر زیادتی نہ کرو۔ اور جو شخص ایسا کرے گا۔ بیشک اس نے اپنی
 جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ کی آیتوں کو، منسی مذاق نہ بٹھاؤ۔ اور اللہ کی اس نعمت کو یاد کرو۔
 جو اس نے تم پر کی ہے۔ اور جو تم پر کتاب اور حکمت اتاری ہے۔ اللہ تعالیٰ ان باتوں
 کے ساتھ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ اور اللہ سے ڈرو اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ
 ہر چیز کو جاننے والا ہے ﴿۲۳۱﴾ اور جب تم عورتوں کو طلاق دیدو، پھر جب وہ

عدت کو پہنچیں۔ تو تم ان عورتوں کو اس بات سے نہ روکو کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح
کریں۔ جب کہ وہ آپس میں دستور کے موافق راضی ہو جائیں۔ یہ باتیں وہ ہیں کہ ان کے
ساتھ نصیحت کی جاتی ہے۔ اُس شخص کو جو تم میں سے اللہ پر اور قیامت کے دن پر یقین
رکھتا ہے۔ یہ بات تمہارے لیے زیادہ شائستہ ہے اور زیادہ پاکیزہ ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
جانتا ہے۔ اور تم نہیں جانتے (۲۳۲)

طلاق برائے
ایذارسانی

گزشتہ درس میں یہ مسئلہ بیان ہو چکا ہے کہ طلاقین اصل میں دوہی ہیں۔ جب
دوسری طلاق دیدی جائے تو پھر بغیر حلالہ کے پہلے خاوند کے ساتھ نکاح نہیں ہو سکتا
آیت زیر درس میں اللہ تعالیٰ نے نکاح و طلاق اور عدت سے متعلقہ دو اور مسائل بیان
فرمائے ہیں۔ پہلا مسئلہ یہ ہے کہ دوسری طلاق کے بعد جب عدت پوری ہو جائے
تو پھر عورتوں کو بلا وجہ تنگ نہ کرو۔ اگر انہیں روکنا ہے تو معروف طریقے سے اور
اگر رخصت ہی کرنا ہے تو بھی اچھے طریقے سے انہیں رخصت نہ کرو۔ اور دوسرا
مسئلہ یہ ہے کہ کسی مطلقہ یا بیوہ کو نکاح ثانی کرنے سے منع نہ کرو۔ یہ اچھی بات نہیں ہے
بلکہ انہیں اپنی مرضی کے مطابق نکاح کی اجازت دو۔

زمانہ جاہلیت میں ایک غلط رسم جاری ہو گئی تھی کہ عورتوں کو تنگ کرتے تھے
طلاق دے دیتے، جب عدت قریب الاختتام ہوتی تو رجوع کر لیتے۔ کچھ عرصہ بعد
پھر طلاق دے دیتے اور جب عدت پوری ہونے کو آتی تو رجوع کرتے۔ مقصد یہ
کہ نہ تو عورت کو معقول طریقے سے آباد کرتے اور نہ اُسے رخصت کرتے کہ وہ دوسری
جگہ نکاح کر سکے۔ یہ سلسلہ سال ہا سال تک جاری رہتا۔ جس کی وجہ سے بے گناہ
عورتوں کو سخت اذیت ہوتی۔ اس قسم کی قباحت کی تردید میں اللہ تعالیٰ نے ارشاد
فرمایا۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ فَبِغَضٍ أَمْ حَسَنٍ۔ جب تم عورتوں کو طلاق دیدو
اور پھر ان کی عدت پوری ہو جائے۔ فَأَمْسِكُوهُنَّ بِمَعْرُوفٍ پھر یا انہیں
دستور کے مطابق روک لو یعنی رجوع نہ کرو۔ یعنی اگر تمہیں اپنے سابقہ فعل پر واقعی
ندامت ہوئی ہے تو اپنا گھر دوبارہ آباد نہ کرو اور اس میں نیت اصلاح کی ہونی چاہیے

محض ایذا رسانی اور عورت کو حق سے محروم کرنے کے لیے ایسا مت کر دو۔ بالکل نیک نیتی سے رجوع کر لو۔ اور اگر ایسا ممکن نہ ہو۔ صلح صفائی کی صورت نظر نہ آتی ہو۔ اَوْسَرْتُ حُجُوکَ بِمَعْدُونٍ تو پھر انہیں معروف طریقے سے رخصت کر دو تاکہ وہ اپنی مرضی کے مطابق دوسرے خاندان کے ساتھ نکاح کر سکیں سُرْح کا معنی چھوڑ دینا یا آزاد کر دینا ہے جانوروں کو جنگل میں چرنے کے لیے چھوڑ دینا تسمیرح کہلاتا ہے۔ اور جب جانور شام کے وقت جنگل سے واپس پلٹتے ہیں۔ تو اس وقت تسمیرح کا لفظ استعمال ہوتا ہے۔ "حِينَ تَرْجِعُونَ وَحِينَ تَسْرَحُونَ" یعنی جب تم جانوروں کو واپس پلٹاتے ہو اور جب انہیں چرنے کے لیے بھیجتے ہو۔ کنگھی کرنے کو بھی تسمیرح کہتے ہیں۔ اس سے بالوں کی الجھن دور ہو جاتی ہے۔ بہر حال اگر علیحدگی کا حتمی فیصلہ کر ہی لیا ہے۔ تو پھر مطلقہ عورتوں کو بلا وجہ دست رو کو بلکہ انہیں احسن طریقہ سے کچھ دے دلا کر رخصت کر دو۔ انہیں طعن تشنیع کا نشانہ نہ بناؤ۔ گالی گلوچ نہ کرو۔ بلکہ خوش اسلوبی کے ساتھ علیحدہ کرو۔ فرمایا وَلَا تَقْسِرْكُوهُنَّ حَتَّىٰ يَكُنَّ فِئْتًا اور انہیں تکلیف پہنچانے کی خاطر مت روکو یہ زیادتی کی بات ہے۔ عورتوں پر زیادتی مت کرو۔ اس طریقہ سے انہیں روکنا حرام ہے اور گناہ کبیرہ کا ارتکاب ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔ وَمَنْ يَفْعَلْ ذَلِكَ جَوَالِبًا كَرِيمًا۔ فَقَدْ ظَلَمَ خُفُسَهُ اُس نے اپنی جان پر ظلم کیا۔ اور اللہ تعالیٰ ظلم کو بالکل پسند نہیں کرتے۔ دوسری جگہ واضح طور پر آتا ہے وَاللّٰهُ لَا يُحِبُّ الظَّالِمِيْنَ۔ ہاں اللہ تعالیٰ بعض اوقات ظالموں کو مہلت دے دیتا ہے مگر بالآخر وہ گرفت میں آ جاتے ہیں۔ اس کی پکڑ سے بچ نہیں سکتے۔ فرمایا کہ اللہ کے احکام کی صریحاً خلاف ورزی کر کے وَلَا تَبْتَغُوا اَيَاتِ اللّٰهِ هُنَّ اللّٰهِ کی آیات کو تمسخر کا نشانہ نہ بناؤ۔ یہ بہت بُری بات ہے تمسخر کی مثال لیے ہے جیسے کوئی شخص غلام کو کہہ دے کہ جا میں نے تجھے آزاد کیا۔ اور پھر کہے کہ یہ تو میں نے مذاقاً کہا تھا۔ میری نیت تو آزاد کرنے کی نہ تھی۔ یاد رکھو اگر کوئی دل لگی کے لیے بھی غلام کی آزادی کا اعلان کرے تو غلام آزاد ہو جائے گا۔ اسی طرح اگر کوئی ٹھٹھا

کے طور پر کہتا ہے کہ میں نے طلاق دی۔ تو بھی طلاق ہو جائے گی۔ اس لیے فرمایا کہ اللہ کی آیتوں کو ہنسی مذاق نہ بناؤ۔ بلکہ ان پر سختی سے عمل کرو۔

فرمایا وَاذْكُرُوا اِلَهَكُمْ اللّٰهُ عَلَيْهِ كُمُ اللّٰهُ تَعَالٰی کا وہ احسان یاد کرو۔ جو اُس نے تم پر کیا ہے اللہ تعالیٰ نے تمہیں ایمان کی دولت سے نوازا ہے۔ تمہارے درمیان عظیم الشان رسول مبعوث فرمایا ہے۔ جو تمہاری تربیت کرتا ہے۔ اجتماعی لحاظ سے تمہیں حکومت عطا کی ہے۔ مال و دولت دیا ہے۔ جاہ و اقتدار بخشا ہے۔ عزت و آبرو دی ہے۔ ان احسانات کو یاد کر کے اس کے شکر گزار بن جاؤ۔ اور پھر ایک خاص احسان یہ کیا وَمَا اَنْزَلْهُ عَلَيْكُمْ مِنَ الْكِتَابِ وَالْحِكْمَةِ تم پر ایک عظیم الشان کتاب نازل فرمائی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا آخری پروگرام ہے۔ جس کے بعد کوئی کتاب نہیں۔ کوئی نبی نہیں اور کوئی پروگرام نہیں۔ اور پھر اس کتاب کے ساتھ حکمت بھی نازل کی۔ قرآن پاک خود سرسر حکمت ہے۔ مگر اس کے ساتھ نبی کی زبان مبارک سے نکلے ہوئے ارشادات پُر از حکمت ہیں۔ حکمت کا لفظ حضور علیہ السلام کے ارشادات پر بھی بولا جاتا ہے۔ قرآن پاک میں دو جگہ پر موجود ہے، کہ اس انعام کو یاد کرو جو اُس نے تم پر کتاب و حکمت کی صورت میں کیا ہے۔ اہم مالک فرماتے ہیں کہ پیغمبر علیہ السلام کی سنت اور اس کا اتباع حکمت ہے۔ اور یہ نہایت بصیرت افروز اور حکمت آمیز باتیں ہیں، دانش ور کی باتیں ہیں، اسی لیے فرمایا وَمَنْ يُّؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ اَوْفَىٰ خَيْرًا كَثِيْرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی، وہ خیر کثیر یعنی بہت زیادہ بھلائی سے نوازا گیا۔ آگے اسی سورۃ میں اس کی مزید وضاحت آئیگی۔ فرمایا يَعْظُمُ عَلَيْكُمْ اللہ تعالیٰ تمہیں نصیحت کرتا ہے۔ کہ بُرے چیزوں کی طرف راغب نہ ہو۔ بلکہ وَاتَّقُوا اللّٰهَ اللّٰهُ تَعَالٰی سے ڈر جاؤ۔ کہیں اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھو۔ کسی کی حق تلفی نہ کرنا۔ اپنی نیت کو پاک صاف رکھو وَاَعْلَمُوْا اور یاد رکھو خوب اچھی طرح ذہن نشین کر لو اِنَّ اللّٰهَ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ اس کے علم سے کوئی چیز مخفی نہیں وہ تمہارے دلوں کے ارادے

اور نیتوں کو بھی جانتا ہے تم خدا کو کسی طرح دھوکہ نہیں دے سکتے۔

نکاح میں عورت
کی رضامندی

آگے دو سکر مسئلہ کا بیان ہے۔ وَإِذَا طَلَّقْتُمُ النِّسَاءَ جب تم عورتوں کو طلاق دے دو فَبَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ اور وہ اپنی عدت کو پہنچ جائیں یعنی عدت ختم ہو جائے فَلَا تَعْضُلُوهُنَّ تو انہیں اس بات سے مت روکو أَنْ يَتَّكِحْنَ أَزْوَاجَهُنَّ کہ وہ اپنے خاوندوں سے نکاح کر لیں إِذَا تَرَاصُوا بَيْنَهُمْ بِالْمَعْرُوفِ جب ان کے درمیان دستور کے مطابق راضی نامہ ہو جائے۔ ترمذی شریف کی روایت ہے کہ حضرت معقل بن یسار کی بہن کا نکاح ایک شخص سے ہوا کچھ عرصہ بعد اس شخص نے طلاق دیدی۔ صحابی رسول نے اُسے رجوع کے لیے کہا مگر وہ راضی نہ ہوا۔ اور مد پوری ہو گئی۔ تاہم یہ طلاق مغلط نہیں تھی دوبارہ نکاح ہو سکتا تھا جب عورت آزاد ہو گئی۔ تو بعض دو سکر لوگوں نے بھی نکاح کے پیغام بھیجے۔ اتنے میں اُس شخص کو اپنے کئے پر ندامت ہوئی اور اس نے بھی دوبارہ نکاح کی خواہش کا اظہار کیا۔ عورت بھی اس پر رضامند ہو گئی۔ کہ چلو کسی غیر کا منہ نہ دیکھنا پڑے گا۔ حدیث شریف میں یہ الفاظ آتے ہیں فَهَوِيَ مَا هَوَيْتَ یعنی دونوں کی خواہش تھی کہ ان کا دوبارہ نکاح ہو جائے۔ مگر حضرت معقلؓ کو یہ بات پسند نہ آئی۔ ان کا استدلال یہ تھا کہ جس شخص نے اُس کی بہن کو طلاق دی اور پھر کہنے کے باوجود رجوع نہیں کیا۔ ایسے کھینے شخص کے ساتھ دوبارہ نکاح نہیں ہونے دوں گا۔ اسی دوران یہ آیت نازل ہوئی۔ اور حضور علیہ السلام نے انہیں بلا کر اللہ تعالیٰ کا حکم سنایا کہ اگر مرد اور عورت نکاح پر رضامند ہیں۔ تو پھر ولی کو مدخلت نہیں کرنی چاہیے جب حضرت معقل بن یسار نے یہ حکم سنا تو کہا سَمِعْتُ لِرَبِّي وَطَاعَةً ہم اپنے رب کی بات سنتے ہیں اور اس پر عمل کرتے ہیں۔ اگر اللہ تعالیٰ کا یہی مشاء ہے تو میں اپنے رب کی اطاعت کروں گا۔ چنانچہ ان دونوں کا دوبارہ نکاح ہو گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر کوئی مرد اور عورت نکاح پر رضامند ہوں۔ تو بلا وجہ انہیں اس کام سے نہ روکو۔

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اس آیت سے یہ مراد نہیں ہے کہ عورت صرف

پہلے خاوند سے ہی نکاح کر سکتی ہے بلکہ آیت کا مطلب یہ ہے کہ عاقل بالغ عورت اپنی مرضی سے جہاں چاہے نکاح کر سکتی ہے۔ درمیان میں بلاوجہ رکاوٹ نہیں بننا چاہیئے۔ بشرطیکہ وہ دونوں دستور کے مطابق صحیح طریقہ سے نکاح پر رضامند ہوں۔ اگر عورت کی رضامندی کے خلاف دوسری جگہ نکاح کر دیا جائے۔ تو کئی قسم کی معاشرتی خرابیاں پیدا ہونے کا احتمال ہے۔ جن کی وجہ سے یہ گنہگار ہوں گے۔ لہذا اُسے اپنی مرضی سے نکاح کر سکتی آزادی حاصل ہونی چاہیئے۔ صرف ایک شرط ہے۔ کہ عورت کا مجوزہ خاوند اُس کا کفو (میسر) بھی ہو۔ اور اسے حق ہر بھی پورا میسر آتا ہو اور اور بھی کوئی چیز باعث تحقیر نہ ہو۔ تو انہیں نکاح کی اجازت دے دینی چاہیئے۔

مسئلہ ولایت

اس موقع پر مسئلہ ولایت کا مختصر بیان بھی ہو جائے۔ اس مسئلہ میں اہم ابوحنیفہؒ اور اہم شافعیؒ کا اختلاف ہے۔ کہ آیا عاقل بالغ عورت بغیر ولی کے نکاح کر سکتی ہے یا نہیں۔ امام ابوحنیفہؒ اس کے حق میں ہیں۔ جب کہ اہم شافعیؒ کا فتویٰ اس کے خلاف ہے دونوں طرف دلائل موجود ہیں۔ تاہم اہم عظیم کی رائے زیادہ قوی معلوم ہوتی ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ حجۃ اللہ البالغہ میں فرماتے ہیں۔ کہ نابالغ عورت کا نکاح تو بغیر ولی کے نہیں ہو سکتا۔ البتہ عاقلہ اور بالغہ عورت باکرہ ہو یا ثقیبہ بغیر ولی کے نکاح کر سکتی ہے۔ فرمایا یہ نکاح تو ہو جائے گا۔ مگر یہ ناپسندیدہ فعل ہوگا۔ اس سلسلہ میں ایک چیز کی گنجائش ہے۔ اگر عورت نے اپنی مرضی سے غیر کفو کے ساتھ نکاح کیا ہے۔ تو ولی یا سرپرست ایسے معاملہ کو عدالت میں لے جاسکتا ہے۔ اور اگر عدالت مناسب سمجھے تو نکاح فسخ کر سکتی ہے۔ شاہ صاحب کی یہ بات بڑی قیمتی ہے۔ اگر عورتیں خود بخود نکاح کرنے لگیں تو پھر تو یہ دھاندلی ہوگی۔ صحیح طریقہ یہ ہے۔ کہ نکاح سرپرست کی معرفت سے ہونا چاہیئے۔ لڑکی کا باپ ہے یا بڑا بھائی یا چچا ہے، وہ خود دیکھ بھال کر نکاح کا فیصلہ کریں۔ تاہم نکاح کے لیے عورت کی رضامندی بھی ضروری ہے۔ بہر حال اگر عورت اپنی مرضی سے نکاح کر لیتی ہے۔ تو نکاح جائز ہوگا۔ مگر یہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

پر طہارت سے مراد ظاہری اور باطنی دونوں طرح کی پاکیزگی ہے۔ نکاح کر لینے سے ان کے دل بھی مطمئن ہو کر پاک ہو جائیں گے اور ظاہر کسی گناہ میں ملوث ہونے کا احتمال بھی نہیں ہو گا۔ فرمایا واللہ یعلم وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُونَ اللہ تعالیٰ جو ایسے احکام نازل کرتا ہے۔ ان کی حکمت کو بھی وہی جانتا ہے۔ تم اس کی گہرائی سے واقف نہیں ہو۔ لہذا اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق عورت کو نکاح ثانی کی اجازت دو، اس میں رکاوٹ نہ بنو۔

وَالْوَالِدَتُ يُرْضَعْنَ أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يُتِمَّ الرَّضَاعَةَ وَعَلَى الْمَوْلُودِ لَهُ رِزْقُهُنَّ وَكِسْوَتُهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ لَا تُكَلَّفُ نَفْسٌ إِلَّا وُسْعَهَا لَا تُضَارَّ وَالِدَةٌ بِوَلَدِهَا وَلَا مَوْلُودٌ لَهُ بِوَلَدِهِ وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ فَإِنْ أَرَادَا فِصَالًا عَنْ تَرَاضٍ مِنْهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا وَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَسْتَرْضِعُوا أَوْلَادَكُمْ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِذَا سَلَّمْتُمْ مَا آتَيْتُم بِالْمَعْرُوفِ وَاتَّقُوا اللَّهَ

وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْلَمُونَ لَبِيبٌ ﴿۲۳۳﴾

ترجمہ: اور مائیں یعنی بچے والی عورتیں اپنے بچوں کو کامل دو سال تک دودھ پلائیں یہ اس شخص کے لیے ہے۔ جو دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے۔ اور والد کے ذمہ ہے۔ ان کا کھانا اور لباس دستور کے مطابق۔ نہیں تکلیف دی جائیگی کسی نفس کو مگر اس کی طاقت کے مطابق، نہیں نقصان پہنچایا جائے گا والدہ کو اس کے بچے کی وجہ سے اور نہ والد کو اس کے بچے کی وجہ سے۔ اور وارث پر بھی اسی طرح لازم ہے۔ پس اگر بچے کے والدین دودھ چھڑانے کا ارادہ کریں آپس کی رضامندی اور مشورہ سے تو اُن پر کچھ گناہ نہیں ہے۔ اور اگر تم ارادہ کرتے ہو اپنی اولادوں کو دودھ پلانے کا دوسری عورتوں سے تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جب کہ تم دیدار وہ چیز جو مقرر کی ہے دستور کے مطابق۔ اور اللہ سے ڈرو، اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ دیکھتا ہے جو کچھ تم کرتے ہو۔ ﴿۲۳۳﴾

یعنی طلاق کے بعد اگر عورت کی گود میں بچہ ہو، تو اس کی پرورش کس طرح ہوگی۔ بچے کی ذاتی دیکھ بھال کون کریگا اور اس کا خرچہ کون برداشت کریگا۔ رضاعت کا لفظی معنی 'دودھ پلانا' ہے۔ چونکہ بچہ مرد کا حق ہوتا ہے۔ اور دودھ عورت پلاتی ہے۔ اس لیے یہ سوال پیدا ہوا کہ مرد و زن کی علیحدگی کی صورت میں بچے کی پرورش کیسے ہوگی۔ جب کہ اصولاً

بچے کو مرد کی تحویل میں چلے جانا چاہیے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَالْوَالِدَتُ يُرَضِّعَنَّ
أَوْلَادَهُنَّ حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ اور مائیں دودھ پلائیں اپنی اولاد کو پورے
دو سال لِمَنْ أَرَادَ أَنْ يَتِمَّ الرِّضَاعَةَ یہ اس شخص کے لیے حکم ہے۔ جو
دودھ پلانے کی مدت کو پورا کرنا چاہتا ہے علیحدگی کی صورت میں اپنی ماں کا دودھ
پلانے میں خاص حکمت کا فرما ہے۔ اگر بچہ اپنی ماں کی بجائے کسی دوسری عورت
کا دودھ پئے گا۔ تو وہ عورت اس کی رضاعی ماں بن جائے گی۔ نکاح کے متعلق رضاعی
ماں کے بھی وہی احکام ہیں۔ جو حقیقی ماں کے ہیں۔ لہذا جب بچہ نکاح کے قابل ہو
گا، تو جس طرح اس کا نکاح حقیقی ماں کی رشتہ داری کی وجہ سے بعض عورتوں سے
حرام ہے، اسی طرح رضاعی ماں کی وجہ سے جو رشتہ دار بہن، چچی، بھتیجی، خالہ، بھانجی
وغیرہ ہوں گے۔ اُن سے بھی نکاح نہیں ہو سکے گا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اس
بات کی ترغیب دی کہ طلاق کی صورت میں جہاں تک ممکن ہو مطلقہ عورت کا بچہ
اپنی ماں کا دودھ پئے۔ لہذا اس کے لیے احکام نازل فرمائے۔ اس کی تفصیل آگے
سورۃ نسا میں آئیگی۔ حُرِّمَتْ عَلَيْكُمْ أُمَّهَاتُكُمْ۔

رضاعت یعنی دودھ پلانے کی مدت کے متعلق فقہائے کرام کے مختلف
اقوال ہیں۔ جن فقہائے کرام نے اس آیت سے استدلال کیا ہے۔ وہ رضاعت
کی مدت دو سال بتاتے ہیں حَوْلَيْنِ كَامِلَيْنِ۔ مگر اہم ماہگ دو سال
تین ماہ کے قائل ہیں۔ اہم ابو حنیفہؒ کا مسلک یہ ہے کہ رضاعت کی انتہائی مدت
اڑھائی سال ہے۔ وہ سورۃ احقاف کی آیت وَحَمْلُهُ وَفِصْلُهُ ثَلَاثُونَ
شَهْرًا یعنی حمل اور دودھ پلانے کی مدت تیس ماہ ہے جو کہ اڑھائی سال

ہتے ہیں۔ اہم صاحب فرماتے ہیں کہ اس آیت میں جو دو سال کا ذکر آیا ہے، تو یہ قانونی مدت رضاعت ہے۔ قانونی حیثیت سے دو سال تک دودھ پلانا ضروری ہے تاہم زیادہ سے زیادہ مدت لڑھائی سال ہے۔ تاہم کسی کو دو سال سے زیادہ عرصہ کے لیے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اخلاقی طور پر اگر ماں رضامند ہو تو ایسا ہو سکتا ہے

اس آیت کریمہ میں دودھ پلانے کا حکم سب سے پہلے حقیقی ماؤں کو دیا گیا وَالْوَالِدَاتُ يُرْضِعْنَ أَوْلَادَهُنَّ۔ اور حقیقی ماں کی تین صورتیں ہو سکتی ہیں۔ پہلی صورت یہ ہے کہ عورت اپنے خاوند کے نکاح میں ہے۔ دودھ بھی ٹھیک ٹھاک ہے۔ کوئی بیماری بھی لاحق نہیں۔ تو ایسی حالت میں دودھ پلانا ماں پر واجب ہے۔ اور اس کے خرچہ کی ذمہ داری باپ پر ہے۔ دوسری صورت یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہو چکی ہے مگر ابھی عدت میں ہے تو اس حالت میں بھی دودھ پلانے کی ذمہ داری ماں پر ہے۔ البتہ ماں اور بچے کا خرچہ مرد کے ذمے ہے۔ جب تک عدت ختم نہ ہو ہر قسم کا خرچہ خوراک، لباس، رہائش علاج وغیرہ سب آدمی کی ذمہ داری ہے۔ اب تیسری صورت یہ ہے کہ عورت کو طلاق ہو کر عدت ختم ہو چکی ہے۔ تو اس حالت میں عورت کی ذمہ داری ساقط ہو جاتی ہے بچے کی پرورش کی ساری ذمہ داری اس کے باپ پر عائد ہوتی ہے اگر بچے کی حقیقی ماں دودھ پلانے پر رضامند ہو تو باپ کو چاہیے کہ اسے اولیت دے اور اس کا خرچہ معمول کے مطابق برداشت کرے ہاں اگر عورت معمول سے زیادہ خرچہ طلب کرے تو پھر اسی کی خدمات حاصل کرنا ضروری نہیں۔ مرد کسی دوسری عورت کو اجرت دے کہ بچے کو دودھ پلا سکتا ہے۔ بعض اوقات حقیقی ماں کا دودھ کسی عارضہ کی وجہ سے مضر صحت ہوتا ہے۔ یا دودھ اتنا کم ہے کہ بچے کی پرورش ٹھیک طور سے نہیں ہو سکتی۔ تو ایسی صورت میں بھی باپ کی ذمہ داری ہے کہ وہ مناسب معاوضہ ادا کر کے کسی دوسری عورت سے دودھ پلا سکے۔

فَرِيَا وَعَلَى الْمُوَلَّدَةِ لَهُ وَلَدٌ قَبْلَ وَكَسُوهُنَّ بِالْمَعْرُوفِ

جب یہ طے ہو جائے کہ ماں ہی بچے کو دودھ پلائے گی تو پھر ایسی ماؤں کی خوراک اور لباس کی ذمہ داری دستور کے مطابق بچے کے باپ پر ہوگی۔ عورت خواہ مرد کے

نکاح میں ہے یا مطلقہ ہو کر عدت گزار رہی ہے۔ اُس کے اخراجات مرد برداشت کرے گا۔ اور اگر عورت عدت پوری کر کے بالکل جدا ہو چکی ہے۔ تو پھر اُس کو اُسی طرح اجرت دی جائیگی جس طرح کسی غیر عورت کو دی جاتی ہے۔ سورۃ البیعت یا معاوضہ دستور کے مطابق معقول ہونا چاہیے، نہ کم نہ زیادہ اور اس معاملہ میں لَا تُكَلِّفُ نَفْسًا وِزْرًا وَنُفْسَهَا کسی جان کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دی جائیگی۔ مثلاً عورت کو کوئی عذر ہے اور دودھ پلانے کے قابل نہیں ہے۔ یا دودھ پلانے سے اس کی صحت کو خطرہ ہے تو ایسی صورت میں اُسے دودھ پلانے پر مجبور نہیں کیا جائے گا۔ اسی طرح اگر مرد کی مالی حالت کمزور ہے۔ تو اس کی حیثیت سے زیادہ اجرت طلب نہیں کی جائیگی اسی لیے فرمایا لَا تُضَارُّ وَالِدَهُ كَمَا كُنْتَ كَالِدِكَ والدہ کو اُس کا اپنا بچہ ہونے کی بنا پر نقصان نہیں پہنچایا جائے گا۔ چونکہ اس کو بچے سے محبت ہے اور اُس کی مانتا کا تقاضا ہے۔ کہ اُسے خود دودھ پلانے تو اس کی اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر مال کو کم اجرت پر مجبور نہیں کرنا چاہیے۔ وَلَا مَوْلُودٌ لَّكَ كَمَا كُنْتَ كَالِدِكَ اور نہ باپ کو محض اس وجہ سے تکلیف دی جائیگی۔ کہ وہ بچے کا باپ ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش کرنے پر مجبور ہے۔ مگر وہ اپنی حیثیت سے زیادہ اجرت نہیں دے سکتا۔ لہذا مال کو اس کمزوری سے فائدہ اٹھا کر بچے کے باپ کو تنگ نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ یہ معاملہ افہام و تفہیم کے ذریعے دستور کے مطابق اور باپ کی مالی حالت کے پیش نظر طے کرنا چاہیے۔

اسلام میں یہ ایک عام قانون ہے۔ کہ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دینی چاہیے۔ اللہ تعالیٰ کا اپنا دستور بھی یہ ہے کہ لَا يُكَلِّفُ اللَّهُ نَفْسًا وِزْرًا وَسَعَهَا اللہ تعالیٰ کسی کو اس کی طاقت سے زیادہ تکلیف نہیں دیتا۔ عبادات میں دیکھ لیں۔ اگر کوئی شخص معذور ہے یا مجبور ہے کھڑے ہو کر نماز ادا نہیں کر سکتا تو بیٹھ جائے۔ لیٹ کر پڑھ سکتا ہے، اشاروں سے نماز ادا کر سکتا ہے۔ اسی طرح اگر بیمار ہے یا مسافر ہے تو روزہ کو قضا کر سکتا ہے۔ دودھ پلانے کے معاملہ میں بھی فرمایا کہ کوئی فریق دوسرے فریق کو تنگ نہ کرے، بلکہ معمول کے مطابق احسن طریقہ

سے یہ کام انجام دیا جائے۔

یہاں پر ایک اور سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر بچے کا باپ فوت ہو چکا ہو، تو اس کی یتیم بچے کی رضاعت کی ذمہ داری کس پر عائد ہوگی۔ فرمایا وَعَلَى الْوَارِثِ مِثْلُ ذَلِكَ جس طرح باپ بچے کی پرورش کا ذمہ دار تھا اُسی طرح اسکی عدم موجودگی میں وارث اس کی ذمہ داری قبول کرے گا۔ اب وارث سے کون سا وارث مراد ہے۔ اس ضمن میں مختلف اقوال ہیں۔ وارث اگر بطور اسم جنس لیا جائے۔ تو اس کے معنی تمام وارث ہوں گے۔ ہر وارث ترکہ سے جس قدر وارث کا حق دار ہے، اسی نسبت سے وہ یتیم بچے کی پرورش کا خرچ بھی برداشت کرے گا۔ اہم بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ وارث سے مراد باپ کے وارث ہیں اور ان میں خود بچہ بھی شامل ہے۔ اس لحاظ سے بچے کی پرورش یعنی اس کی مال کا مال نفقہ بچے کی جائیداد سے ادا کیا جائیگا۔ تفسیر روح البیان میں ہے کہ وارث سے مراد بچے کے وارث بھی ہو سکتے ہیں۔ یعنی اگر بچہ فوت ہو جائے۔ تو اس کا ترکہ کن کن وارثوں کو پہنچتا ہے اس لحاظ سے جو وارث بنتے ہیں۔ وہی رشتہ دار بحساب حصہ رسدی وراثت بچے کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ یعنی جس وارث کو بچے کی جائیداد سے آدھا حصہ مل سکتا ہے۔ وہ بچے کے نصف خرچہ کا ذمہ دار ہوگا اور جس کو ایک تہائی، چھٹا حصہ یا آٹھواں حصہ پہنچتا ہے۔ وہ اُسی قدر بچے کا خرچہ برداشت کرنے کا ذمہ دار ہوگا۔ مولانا مفتاح نوئیؒ فرماتے ہیں کہ اگر بچے کی اپنی جائیداد نہ ہو، تو پھر اُس کے مالدار عزیزوں میں سے جو اس کے وارث اور محرم ہوں وہ اس کی کفالت کے ذمہ دار ہوں گے۔ محرم سے مراد یہ ہے کہ اگر بچے اور اس کے عزیزوں میں سے ایک کو مرد اور دوسرے کو عورت فرض کر لیا جائے، تو دونوں کا نکاح درست نہ ہو اس لحاظ سے بچے کی مال پر بھی ذمہ داری آتی ہے۔ مثلاً یتیم بچے کی مال موجود ہے اور اس کا دادا بھی ہے۔ تو وراثت کے حصہ رسدی کے مطابق بچے کی کفالت ایک تہائی مال کے ذمہ اور دو تہائی دادا کے ذمہ ہوگی۔ اس لحاظ سے بچے کے بھائی، چچا، تایا وغیرہ بھی بحیثیت وارث اور محرم اس کی پرورش کے ذمہ دار ہیں

تفسیر روح البیان کے مطابق متوفی کے عصبت بھی ذمہ دار ہو سکتے ہیں۔ اس لحاظ سے بھی چچا، تایا، دادا وغیرہ کو یہ ذمہ داری قبول کرنا ہوگی۔

یہاں پر مطلق وارث کا لفظ استعمال کرنے میں یہ حکمت کار فرما ہے کہ حالات کے مطابق شرعی عدالت یتیم بچے کی پرورش کی ذمہ داری کسی بھی وارث پر ڈال سکتی ہے تاہم عدالت کو یہ بات مدنظر رکھنا ہوگی کہ سب سے پہلے یہ ذمہ داری بچے کی اپنی جائداد پر ڈالی جائے۔ پھر بچے کے قریبی وارثوں پر اور پھر متوفی کے عصبات پر کیونکہ یہ مسلمہ اصول ہے کہ حق ادا کرنے کا حق بھی اُسی پر عائد ہوتا ہے جو حق وصول کرنے کا حق رکھتا ہے ایک صورت اور بھی پیدا ہو سکتی ہے کہ نہ تو بچے کی اپنی کوئی جائداد ہو اور نہ اس کا کوئی وارث ہو۔ ایسی صورت میں بچے کی پرورش کی ذمہ داری حکومت وقت پر ہوگی۔ اگر دین سے بے بہرہ حکومت یہ ذمہ داری قبول کرنے کو تیار نہ ہو۔ تو پھر یہ ذمہ داری مسلمانوں کی عام جماعت کے سر پر ہے۔ کیونکہ اگر مناسب دیکھ بھال کے بغیر بچہ ضائع ہو گیا۔ تو مسلمانوں کی پوری جماعت عند اللہ مأخوذ ہوگی۔

مرث ضلحت
میں رعایت

فرمایا اگرچہ رضاعت کی مدت عام طور پر دو سال مقرر کی گئی ہے تاہم
فَإِنْ أَرَادَ اِفْصَالًا عَنْ تَرَاضٍ قَيْنَهُمَا وَتَشَاوُرٍ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْهِمَا
اگر بچے کے مال باپ باہمی رضامندی اور مشاورت سے بچے کا دودھ دو سال سے پہلے
چھڑانا چاہیں تو ان پر کوئی گناہ نہیں۔ بشرطیکہ بچے کی بہتری مطلوب ہو۔ اگر وہ دونوں
سمجھتے ہیں۔ کہ ایک سال بعد یا ڈیڑھ سال بعد بچہ مال کے بغیر بخیر و خوبی پرورش پاسکتا
ہے۔ تو باپ کو حق ہے کہ وہ اُسے لے جائے۔

یعنی عورتوں
سے رضاعت

فرمایا وَلَإِنْ أَرَدْتُمْ أَنْ تَضَعُوا أَوْلَادَكُمْ اِذَا كُمْ اِلَىٰ حَقِّهِ
مال کے علاوہ کسی دوسری عورت سے بچے کو دودھ پلانا چاہو۔ فَلَا جُنَاحَ
عَلَيْكُمْ تَرَا س کے لیے تم پر کوئی گناہ نہیں۔ یہ بھی جائز ہے بشرطیکہ اِذَا اسَلْتُمْ
مَّا اَلْتَيْتُمْ بِالْمَعْرُوفِ جو کچھ ان سے مقرر کیا ہے۔ اُسے دستور کے مطابق
ادا کرو۔ اس میں کسی کے ساتھ ظلم و زیادتی نہ کرو۔ جو اجرت طے کر لو، وہ ادا کرو۔

تاہم دودھ پلانے کا اولین حق ماں کو ہے۔ کیونکہ جو ماما حقیقی ماں کے دل میں ہوتی ہے۔ وہ دوسری کے دل میں پیدا نہیں ہو سکتی۔ تاہم اگرچہ خاص مجبوری کی وجہ سے حقیقی ماں سے دودھ پلانا ممکن نہ ہو، تو دوسری عورت کو مقرر کیا جاسکتا ہے مثلاً ماں بیمار ہے۔ اور اس کا دودھ مضر صحت ہے۔ یا دودھ بالکل کم ہے جس سے بچہ کی خوراک پوری نہیں ہوتی۔ تو ایسی صورت میں غیر عورتوں سے دودھ پلانا درست ہو گا۔

فرمایا اس معاملہ میں **وَاتَّقُوا اللَّهَ** اللہ سے ڈرتے رہو کہیں اس کی نافرمانی نہ کر بیٹھنا، اس کے احکام بلاوجہ نہیں ہیں۔ بلکہ اس نے یہ احکام اپنی خاص حکمت اور انسان کی بستری کے لیے دیے ہیں۔ ان کے مطابق عمل کرو۔ اور پھر یہ نہ سمجھ لینا کہ کسی ہیرا پھیری سے اللہ تعالیٰ کے احکام کو ٹال سکو گے۔ **وَأَعْلَمُوا** خوب یاد رکھو **أَنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ** تم جو کچھ بھی عمل کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اُسے دیکھ رہا ہے۔ وہ تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے۔ تم اُسے دسرا نہیں دے سکتے۔ لہذا اُس کے احکام کی نافرمانی کا ارادہ کرتے وقت اس کے عذاب کو بھی نگاہ میں رکھ لینا۔

وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا يَتَرَبَّصْنَ
 بِأَنْفُسِهِنَّ أَرْبَعَةَ أَشْهُرٍ وَعَشْرًا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ
 فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ ۚ
 وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۳۲﴾ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا
 عَرَّضْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ أَوْ أَكْنَنْتُمْ فِي أَنْفُسِكُمْ
 عِلْمَ اللَّهِ أَنْتُمْ سَتَذَكَّرُونَ وَهِنَّ وَلَكِنَّ لَا تُوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا
 إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ۚ وَلَا تَعْزِمُوا عُقْدَةَ النِّكَاحِ
 حَتَّىٰ يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي
 أَنْفُسِكُمْ فَاحْذَرُوهُ ۚ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ غَفُورٌ حَلِيمٌ ﴿۲۳۳﴾

ترجمہ اور تم میں سے جو لوگ وفات پا جاتے ہیں اور بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ
 اپنے آپ کو انتظار میں رکھیں چار ماہ اور دس دن۔ اور جب وہ اپنی مدت کو پہنچ جائیں
 تو تم پر کوئی گناہ نہیں ہے۔ جو کچھ وہ عورتیں اپنے بائے میں دستور کے مطابق کریں
 اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو، اس کی خبر رکھنے والا ہے ﴿۲۳۲﴾ تم پر اس بات میں
 کوئی گناہ نہیں ہے۔ کہ تم اشارہ کرو اس بات کے ساتھ عورتوں کے لیے پیغام
 نکاح کا، یا پوشیدہ رکھو تم اس بات کو اپنے نفوس میں۔ اللہ تعالیٰ جانتا ہے۔ کہ
 بیشک تم ان عورتوں کا ذکر کرو گے، لیکن ان سے وعدہ نہ کرو نکاح کا پوشیدہ
 طور پر مگر یہ کہ تم دستور کے مطابق بات کہو۔ اور نہ ارادہ کرو نکاح کی گھر باندھنے
 کا یہاں تک کہ کتاب اپنی مدت تک پہنچ جائے اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ
 جانتا ہے جو کچھ تمہارے نفوس میں ہے اس سے ڈرتے رہو، اور جان لو

کہ بے شک اللہ تعالیٰ بخشش کرنے والا اور بردبار ہے (۳۳۵)

گذشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے رضاعت کا مسئلہ بیان فرمایا تھا کہ اگر ماں کو طلاق ہو جائے تو بچے کو دودھ کون پلائے گی۔ رضاعت کی مدت اور دودھ پلانے والی عورت کے حق کا بیان تھا۔ یہ بھی آچکا ہے۔ کہ اگر بچے کا باپ موجود ہے۔ تو رضاعت کا خرچہ وغیرہ اس کی ذمہ داری ہے۔ اور اگر باپ نہیں ہے۔ تو یہ ذمہ داری ان لوگوں پر عاید ہوتی ہے۔ جو بچے کے وارث بن سکتے ہیں۔ اگر بچے کی اپنی ماں دودھ پلانے سے قاصر ہے، وہ خود بیمار ہے۔ یا اس کا دودھ مضر صحت ہے، تو پھر کسی دوسری عورت سے دودھ پلانے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ تاہم ایسی عورت کے ساتھ جو اجرت ملے ہو جائے اُسے دستور کے مطابق ادا کرنا ضروری ہے۔ ایک دوسرے پر زیادتی نہیں ہونی چاہیے۔ ماں کو مجبور نہیں کیا جاسکتا ہے۔ کہ وہ لازماً بچے کو دودھ پلائے، اگرچہ بغیر عذر بچے کو دودھ پلانا ماں ہی کے ذمہ واجب ہے۔ اسی طرح باپ کو بھی مجبور نہیں کیا جاسکتا کہ وہ صرف بچے کی ماں سے ہی دودھ پلوائے۔ وہ کسی اور عورت کی طرف بھی رجوع کر سکتا ہے اور بلا وجہ بچے کو ماں سے چھیننا بھی درست نہیں۔ یہ ساری باتیں سابقہ آیت میں واضح کر دی گئی ہیں۔

عزت کی مختلف اقسام

دوسرا مسئلہ عدت کا ہے۔ بعض قسم کی صورتوں کی عدت پہلے بیان ہو چکی ہے مثلاً جن مطلقہ عورتوں کو ماہواری آتی ہے۔ ان کی عدت اللہ تعالیٰ نے تین حیض مقرر فرمائی ہے اور جن کو حیض نہیں آتا۔ ابھی چھوٹی عمر ہے۔ یا کبر سن کی وجہ سے خون آنا بند ہو گیا ہے۔ ایسی عورتوں کی عدت تین مہینے ہے۔ جس عورت کا نکاح ہو گیا مگر میاں بیوی میں خلوت نہیں ہوئی اور طلاق واقع ہو گئی۔ ایسی عورت کے لیے کوئی عدت نہیں۔ اس کا بیان سورۃ احزاب میں ہے۔ ایسی عورت طلاق کے بعد فوراً نکاح کر سکتی ہے۔ سورۃ طلاق میں اللہ نے حاملہ عورتوں کی عدت بھی بیان فرمائی ہے

وَأَنَّ كُنَّ أُولَاتٍ حَمْلٍ فَأَنْفِقُوا عَلَيْهِنَّ حَتَّى يَضَعْنَ حَمْلَهُنَّ

ایسی عورت، کی عدت وضع حمل ہے۔ جب بچہ پیدا ہو گا۔ عدت ختم ہو جائے گی۔ اس

بات کا کوئی لحاظ نہیں کہ کچھ چند دن میں پیدا ہو جاتا ہے۔ یا نو دس مہینے لگ جاتے ہیں آج کے درس والی آیات میں اللہ تعالیٰ نے ان عورتوں کی عدت، بیان فرمائی ہے جن کے خاوند فوت ہو جاتے ہیں۔ متوفی عہنا زوجہا کی عدت کے بیشتر مسائل قرآن پاک میں بیان ہوئے ہیں۔ حدیث میں بھی بہت سی تفصیلات موجود ہیں۔ اب یہ وہ بھی دو قسم کی ہو سکتی ہیں۔ اگر بیوہ حاملہ ہے۔ تو اس کی عدت وضع حمل تک ہے۔ خواہ کچھ جلد ہی پیدا ہو جائے یا نو ماہ بعد، حضرت سعد ابن خولجہؓ حجۃ الوداع کے موقع پر اونٹنی سے گر کر مرشید ہو گئے تھے۔ ان کی بیوی حاملہ تھی۔ وفات کے ۲۲ دن بعد اس کے ہاں بچہ پیدا ہوا، تو حضور علیہ السلام نے فرمایا، اس کی عدت ختم ہو گئی ہے۔ اب اس کو نکاح ثانی کی اجازت ہے۔ ہاں نفاس کا گزر نا ضروری ہے (مقاربت کے لیے)

اور اگر عورت حاملہ نہیں ہے۔ تو اس کی عدت چار ماہ دس دن ہے۔ اس کے اندر مصلحت یہ ہے کہ اگر اس کو حمل ہے۔ تو اس عرصہ میں ظاہر ہو جائے گا۔ اگر معلوم ہو جائے کہ عورت حاملہ ہے۔ تو اس کی عدت جیسا کہ پہلے بیان ہوا، وضع حمل ہوگی۔ اگر حمل نہیں ہے تو اسے چار ماہ اور دس دن تک عدت پوری کرنا ہوگی۔ چنانچہ ارشاد ربانی ہے۔ وَالَّذِينَ يَتَّقُونَ مِنكُمُ وَيَذَرُونَ أَزْوَاجًا تم میں سے جن کو وفات دی جاتی ہے۔ اور وہ پیچھے بیاہیاں چھوڑ جاتے ہیں۔ يَتَّقُونَ أَنفُسَهُنَّ اَرْكَعَةَ اَشْهُدُ وَعَشْرًا وہ روکے رکھیں اپنے آپ کو چار ماہ اور دس دن۔ یہ ان کی عدت ہے

یہودیوں میں عدت کا کوئی نظریہ نہیں۔ ان کی عورتیں طلاق یا بیوگی کی صورت میں فوراً دوسری جگہ نکاح کر سکتی ہیں۔ ہندوؤں میں ایسی عورتیں ساری عمر سوگ مناتی ہیں۔ انہیں نکاح ثانی کی اجازت نہیں اول تو وہ خاوند کے ساتھ ہی زندہ جل جاتی ہیں۔ اگر ایسا نہیں کیا، تو ساری عمر یہنی بیٹھی رہیں گی۔ بہر حال یہ افراط و تفریط ہے۔ اسلام دین فطرت ہے اور افراط و تفریط سے پاک ہے۔ اس میں نکاح کے حقوق اور منصب کا لحاظ رکھا گیا ہے اسلام نے ایسے احکام جاری کیے ہیں کہ نہ تو انسان کا نسب خراب ہو۔ نہ اخلاق میں بگاڑ پیدا ہو۔ اور نہ ہی کوئی چیز حیا کے خلاف ہو۔

غیر مذہب
میں قباحتیں

جاہلیت کے زمانہ میں بوجہ سال بھر تک جنگ مٹاتی تھی، بیوہ عورت عام لوگوں کے ساتھ مکان میں نہیں رہ سکتی تھی۔ بلکہ اسے کسی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں ڈال دیا جاتا تھا۔ نہ وہ غسل کر سکتی تھی اور نہ کپڑے تبدیل کرنے کی مجاز تھی۔ اس کو منحوس خیال کیا جاتا تھا۔ وہ دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر کھانا بھی نہیں کھا سکتی تھی۔ ایک سال گزرنے کے بعد اُسے کوٹھڑی سے نکالا جاتا اور گدھے یا اونٹ پر سوار کیا جاتا مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے کہ مرغ یا کوئی دوسرا جانور ایسی عورت کو لاکر دیا جاتا ہے وہ اپنے اعضائے تناسل کے ساتھ لیتی۔ اکثر اوقات وہ جانور قلعن اور زہریلے جراثیم پیدا ہو جانے کی وجہ سے مر جاتے۔ نہ استنجانہ طہارت۔ پھر اس عورت کے ہاتھ میں اونٹ یا بکری کی مینگنیاں پکڑ دیتے، وہ اپنے ہاتھ سے مینگنیاں چینکتی، تو اس کے لواحقین کہتے کہ اب اس کی عدت پوری ہو گئی ہے۔ اب یہ نہادھو کر صاف لباس پہن سکتی ہے۔ خوشبو استعمال کر سکتی ہے۔ گویا جاہلیت کے زمانہ میں اس قسم کا بڑا دستور تھا۔

حضور علیہ السلام کے پاس ایک عورت آئی اور عرض کیا، حضور! میری بیٹی کا خاندان فوت ہو گیا ہے۔ اس کی آنکھوں میں تکلیف ہے۔ کیا وہ سرمہ لگا سکتی ہے۔ آپ نے فرمایا، بڑے افسوس کا مقام ہے کہ جاہلیت کے زمانہ میں تم سال بھر سخت مشقت اٹھاتی تھیں مگر اسلام کی عام گمراہ چار ماہ دس دن کی معمولی پابندی برداشت نہیں کر سکتی بمقصد کہ عورت عدت کے دوران سرمہ نہیں لگا سکتی۔ رنگین کپڑے نہیں پہن سکتی۔ خوشبو نہیں لگا سکتی۔ زیور نہیں پہن سکتی۔ زینت کا سامان استعمال نہیں کر سکتی۔ البتہ صاف لباس پہن سکتی ہے غسل کر سکتی ہے، نماز پڑھ سکتی ہے دوسرے لوگوں کے ساتھ ایک مکان میں رہ کر اکٹھا کھا پی سکتی ہے۔ یہ سب جائز ہے۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد مبارک ہے کہ جو عورت اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور قیامت پر ایمان رکھتی ہے وہ کسی مرنے والے پر تین دن سے زیادہ سوگ نہ منائے مگر خاندان پر چار ماہ دس دن تک سوگ منانے کا حکم ہے۔ ام المؤمنین حضرت زینبؓ اور ام حبیبہؓ کے واقعات ملتے ہیں۔ ایک کے والد فوت ہو گئے اور دوسری کے بھائی انہوں نے تین دن گزرنے کے بعد خوشبو منگائی۔ اور کچھ بچی کے سر پر لگا دی اور کچھ اپنے ہاتھوں کو مل لی۔ عورتوں کے مجمع میں فرمایا۔ مجھے خوشبو کی حاجت نہ تھی۔ مگر میں تمہیں مسئلہ سمجھانا چاہتی تھی۔ کہ

حضرت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے کہ کسی عورت کے لیے روانہ نہیں ہے کہ وہ تین دن سے زیادہ سوگ منائے سوگ منائے خاوند کی فوتیگی پر جب کہ چار ماہ دس دن تک سوگ ہے۔

نکاح کی
اجازت

فرمایا فَإِذَا بَلَغْنَ أَجَلَهُنَّ جَبَّ الْحَيُّ عِدَّتِ بِرُمَى هُوَ جَائِزٌ - فَلَمْ يَجْزَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ فِي أَنْفُسِهِنَّ بِالْمَعْرُوفِ تو اب تم پر کوئی حرج نہیں ہے کہ وہ عورتیں اپنے بائے میں دستور شریعت کے مطابق فیصلہ کریں یعنی اگر وہ نکاح کرنا چاہیں تو کر سکتی ہیں کہیں نکاح کا پیغام بھیجنا چاہیں تو کوئی حرج نہیں وہ ایسا کر سکتی ہیں کسی در سے شخص کو یہ حق نہیں پہنچتا کہ وہ ان کو اس کام سے منع کرے یا ان کے کام میں کسی قسم کی رکاوٹ ڈالے۔ فرمایا وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ جو کچھ تم کرنے ہو اللہ تعالیٰ اس کی خبر رکھتے ہیں۔

عہ میں اشارے
کنائے کی اجازت

اگر عورت مطلقہ ہے تو دورانِ عدت کسی در سے شخص کو اجازت نہیں کہ وہ اشارہ کنایہ سے بھی مطلقہ کے ساتھ بات کرے۔ صرف اس کے خاوند کو اجازت ہے وہ بھی اس صورت میں کہ طلاق مغلط نہ ہو۔ بیوہ کے لیے حکم یہ ہے کہ عدت کے دوران نکاح کا وعدہ نہ کرنا حلال نہیں ہے۔ اگر اُسے کوئی ایسا پیغام بھی ملے تو وہ کہلا بھیجے کہ عدت کے اختتام کا انتظار کر دو۔ البتہ عدت کے دوران اشارے کنائے سے بات ہو سکتی ہے جبکہ اس میں صراحت نہ ہو۔ اس قسم کا ایک واقعہ ملتا ہے ایک عورت بیوہ ہو گئی، ام جعفر صادقؑ کے فرزند نے اس سے کہا کہ تم جانتی ہو کہ میرا تعلق حضور علیہ السلام کے ساتھ کیا ہے۔ اور جو میری قرابت حضرت علیؑ سے ہے اس کو بھی جانتی ہو عام لوگوں میں میرا جو مقام ہے۔ اس سے بھی تم واقف ہو۔ اس عورت نے کہا خدا کا خوف کھاؤ میں عدت میں ہوں اور تم مجھے نکاح کا پیغام دے رہے ہو۔ انہوں نے کہا۔

میں پیغام نکاح تو نہیں دے رہا ہوں۔ میں تو صرف اپنی حیثیت واضح کر رہا ہوں کہ میرا فلاں فلاں ہستی سے کیا رشتہ ہے۔ اس کو کنایہ کہتے ہیں کہ صراحتاً نکاح کی بات نہ کرے۔ صرف اشارے سے دل کی بات

کہ مے مثلاً یوں کہ مے کہ میرا خیال ہے کہ اگر کوئی اچھی دین دار عورت مل جائے تو نکاح کر لوں۔ یا کوئی متدین اور صالح عورت مل جائے تو اس کے ساتھ نکاح کر لوں یا تیری جیسی خوش بخت کسی نصیب والے ہی کو میسر ہو سکتی ہے۔ وغیرہ وغیرہ تاہم صریح الفاظ میں نکاح کا وعدہ لینا حرام ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا عَدَّصْتُمْ بِهِ مِنْ خُطْبَةِ النِّسَاءِ تم پر کوئی گناہ نہیں ہے کہ تم عورتوں کے ساتھ پیغام نکاح کے سلسلہ میں اشارہ کرو۔ خطبہ عورتوں کے لیے نکاح کے پیغام کو کہتے ہیں مقصد یہ کہ تم اشارے کنائے سے بات کر سکتے ہو۔ ایک اور لفظ خطبہ ہے جس کا معنی خطاب کرنا ہے، وعظ نصیحت وغیرہ کرنا۔ ان دونوں لفظوں کا باب ایک ہی ہے۔ جب یہ حصہ کے طور پر آتا ہے تو اس سے مراد خطاب کرنا ہوتا ہے۔

فرمایا اشارے کنائے سے اپنا مقصد بیان کر دو۔ أَوْ أَكُنْتُمُ فِي الْفُسْكَ یا اس کو دل میں پوشیدہ رکھو۔ اس کا بھی کوئی گناہ نہیں ہے فرمایا عَلِمَ اللَّهُ أَنَّكُمْ سَتَذْكُرُونَهُنَّ اللہ تعالیٰ جانتا ہے کہ تم ان عورتوں کا ذکر کر گے۔ کیونکہ فطر نامہ کو عورت کی اور عورت کو مرد کی ضرورت ہوتی ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کی مقرر کردہ حدوں کو قائم رکھو۔ وَالَكِنْ لَّا تَوَاعِدُوهُنَّ سِرًّا اُن سے خفیہ طور پر نکاح کا وعدہ نہ لے لینا۔ یہ بالکل جائز نہیں۔ عدت کے دوران عورت سے یہ کہنا کہ عدت کے بعد میرے ساتھ ہی نکاح کرنا، کسی اور کے ساتھ نہ کرنا، یہ جائز نہیں ہے۔ اس کی قطعاً ممانعت ہے۔ إِلَّا أَنْ تَقُولُوا قَوْلًا مَعْرُوفًا ہاں اچھے طریقے سے دستور کے مطابق بات کر سکتے ہو۔ اشارے کنائے کے ذریعے مدعا بیان کر دو۔ جس میں شریعت کی خلاف ورزی نہ ہو۔ فرمایا وَلَا تَعْصِمُوا عَقْدَةَ النِّكَاحِ حَتَّى يَبْلُغَ الْكِتَابُ أَجَلَهُ جب تک عدت پوری نہ ہو جائے۔ نکاح کی گمرہ باندھنے کا ارادہ بالکل نہ کرو۔ یہاں کتاب سے مراد وہ نوشتہ عدت ہے۔ جو اللہ تعالیٰ کے قانون میں مقرر ہے۔ عدت کے اندر تو ایسے ہی نکاح نہیں ہو سکتا۔ ایسا کرنا تو زنا کا ارتکاب کرنا ہے۔ اور قطعی حرام ہے۔ فرمایا وَأَعْلَمُوا جَانِ لَوْ أَنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ مَا فِي أَنْفُسِكُمْ کہ اللہ تعالیٰ جانتا ہے

جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے۔ اگر دل میں بھی قانون کی خلاف ورزی کا خیال ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اُسے بھی جانتا ہے۔ فَاَحْذَرُوْهُ لَنْدَا اَنْتُمْ سَعٰی ڈرتے رہو۔ اس کے قانون کی خلاف ورزی نہ کر بیٹھنا۔ وَاَعْلَمُوْا اور یاد رکھو ان اللہ غَفُوْرٌ حَلِيْمٌ اللہ تعالیٰ غفور یعنی بخشنے والا بھی ہے۔ اور بردبار بھی ہے۔ تحمل کرنے والا ہے۔ بسا اوقات وہ گرفت نہیں کرتا مگر جب مجرموں کو پکڑ لے۔ تو پھر خوب پکڑ لے۔ انسان کو اللہ تعالیٰ کے تحمل کی وجہ سے لاپرواہ نہیں ہو جانا چاہیے۔ کہ ایک دفعہ بچ گیا۔ تو ہمیشہ ہی پھتا رہیگا بلکہ وہ اپنے وقت پر ضرور پکڑا جائیگا۔ اگر خدا کے قانون کو توڑ دے تو اسی گرفت سے بچ نہیں سکتے۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکم (۱۸۱)۔

آیت ۲۳۶ تا ۲۴۷

لَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ إِنْ طَلَقْتُمُ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ
تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً ۖ وَ مَتَّعُوهُنَّ عَلَى الْمَوْسِعِ
قَدَرُهُ وَعَلَى الْمُقْتَرِقِدَرُهُ ۖ مَتَاعًا بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا
عَلَى الْمُحْسِنِينَ ۖ (۲۳۶) وَإِنْ طَلَقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ
تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً فَنِصْفُ مَا
فَرَضْتُمْ إِلَّا أَنْ يَعْفُونَ أَوْ يَعْفُوا الَّذِي بِيَدِهِ عُقْدَةُ
النِّكَاحِ ۖ وَإِنْ تَعَفَّوْا أَقْرَبُ لِلتَّقْوَى ۖ وَلَا تَنْسُوا الْفَضْلَ
بَيْنَكُمْ ۚ إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ۖ (۲۳۷)

ترجمہ: تم پر کوئی گناہ نہیں اگر تم عورتوں کو طلاق دو جب کہ تم نے ان کو ہاتھ نہیں
لگایا۔ یا ان کے لیے مہر مقرر نہیں کیا۔ اور ان کو فائدہ پہنچاؤ طاقیت رکھنے والے پر اسکی طاقیت
کے مطابق اور تنگ دست پر اس کی طاقیت کے مطابق فائدہ پہنچانا دستور کے مطابق یہ
لازم ہے نیکی کرنے والوں پر (۲۳۶) اور اگر تم عورتوں کو طلاق دو قبل اس کے کہ تم نے
ان کو چھوا ہو۔ اور بیشک تم نے ان کے لیے مہر مقرر کیا ہے۔ پس آدھا مہر لازم ہوگا۔
جو تم نے مقرر کیا ہے۔ الا یہ کہ وہ عورتیں ہی درگزر کر لیں یا درگزر کرے وہ شخص جس
کے ہاتھ میں نکاح کی گمہ ہے۔ اور یہ کہ تم درگزر کرو یہ تقویٰ کے زیادہ قریب ہے
اور اس فضیلت کو نہ بھلاؤ، جو تمہارے درمیان ہے۔ بیشک اللہ تعالیٰ خوب دیکھتا
ہے جو کچھ تم کام کرتے ہو (۲۳۷)

ربطیات

گذشتہ درس میں عدت کا مسئلہ بیان ہو چکا ہے۔ اور یہ بھی کہ دران
عدت نکاح نہیں ہو سکتا۔ گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے دو بار عدت عورت سے

نکاح کا وعدہ لینے سے بھی منع فرمایا ہے۔ البتہ اثاثے کنایت سے بات کرنے کی اجازت
میں دی۔ مقصد یہ کہ جس طرح عدت میں نکاح کرنا حرام ہے اسی طرح نکاح کا وعدہ لینا بھی
حرام ہے۔ طلاق کے دوران اور اس کے بعد بچے کی رضاعت کا مسئلہ بھی بیان ہو چکا ہے
کہ طلاق کے وقت اگر دودھ پیتا بچہ ہو، تو اس کی پرورش کا ذمہ دار کون ہوگا۔ اگر بچے کا
باپ بھی نہیں ہے۔ تو پھر اس کا بار کون اٹھائے گا۔ نیز یہ کہ دودھ کس عورت سے پلانا
چاہیئے۔ یہ سب مسائل بیان ہو چکے ہیں۔

حق مہر لائق

آج کے درس میں حق مہر اور اس کی ادائیگی سے متعلق مسئلہ بیان ہوا ہے۔ حق مہر
نکاح کے لازم میں سے ہے۔ سورۃ احزاب میں ہے "قَدْ عَلِمْنَا مَا فَرَضْنَا
عَلَيْكُمْ فِي أَنْوَاجِهِمْ" ہم اُس چیز کو جانتے ہیں جو ہم نے عورتوں کے متعلق
مردوں پر ضروری قرار دی ہے۔ اس میں حق مہر اور عورت کے دیگر اخراجات، روٹی،
کپڑا، رہائش، علاج وغیرہ سب خاوند کے ذمہ ہیں۔ سورۃ نسا میں ہے "وَأَجَلَ لَكُمْ
مَّا وَرَأَىٰ ذَلِكُمْ أَنْ تَبْتَغُوا بِأَمْوَالِكُمْ" یعنی جن محرمات کا ذکر کیا گیا ہے۔ اُن
کے علاوہ تم باقی عورتوں سے مال صرف کر کے نکاح کر سکتے ہو۔ مال خرچ کرنے کے
متعلق مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ پہلے نمبر پر حق مہر آتا ہے۔ سب سے پہلے اُس کا خرچ ہے
جو مرد ادا کرے گا۔ پھر عورت کی باقی ضروریات پر اخراجات ہیں۔ وہ بھی مرد کے ذمہ ہیں۔
سورۃ نسا ہی میں مزید وضاحت کے ساتھ حکم دیا گیا ہے۔ "وَأَسْأَلُ النِّسَاءَ عَصَدُ قُتَيْبٍ
مِنْ خَلَّتْ عَوْرَتُهُنَّ" اس میں پس و پیش نہ کر دو۔ یہ اللہ تعالیٰ
نے تم پر فرض کیا ہے۔ الغرض! حق مہر نکاح کے لیے لازمی ہے۔

حضرت مولانا شاہ رفیع الدینؒ کی تفسیر ربیع میں ہے کہ مہر نکاح کا لازم جزو
ہے۔ لہذا اس کے بغیر نکاح کیسے درست ہو سکتا ہے۔ مگر نکاح کرتے وقت مہر
مقرر نہ ضروری نہیں ہے اگر اس کا اجمالی تذکرہ بھی ہو جائے تو کافی ہے۔ مثلاً
صرف اتنا کہ دیا جائے۔ کہ ہم بعد میں آپس میں طے کر لیں گے۔ اگر نکاح کرتے وقت
مہر کا تقرر مبھولے سے ہو گیا۔ تو بھی نکاح درست ہے۔ البتہ اگر کوئی شخص سرے سے

حق دہر کا انکار ہی کر دے، تو نکاح نہیں ہوگا۔

خلد ان حضرت
شاہ ولی اللہؒ

ہندوستان میں خاندان شاہ ولی اللہؒ کی دینی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ یہ آپ کا خاندان ہی ہے۔ جس نے قرآن پاک کے علم کو مقامی زبان میں پھیلایا۔ خود شاہ ولی اللہؒ نے سب سے پہلے "فتح الرحمن" کے نام سے قرآن پاک کا فارسی ترجمہ کیا۔ اور اس کے ساتھ مختصر حاشیہ بھی تحریر کیا۔ اس کے علاوہ اس کا مقدمہ بھی لکھا۔ اصول تفسیر پر آپ کی کتاب "العزرا البکیر" بے نظیر چیز ہے۔ قرآن پاک کو سمجھنے کے لیے راہنما کی حیثیت رکھتی ہے۔ اور آج بھی تمام دینی مدارس اور یونیورسٹیوں میں ایم اے (اسلامیات) کی جماعتوں کو پڑھائی جاتی ہے۔ فہم قرآن سے متعلق آپ نے نہایت بلند پایہ اصول مرتب کیے ہیں آپ کے بڑے صاحبزادے حضرت شاہ عبدالعزیزؒ نے قرآن پاک کے آخری دو پاروں اور سورۃ بقرہ کے نصف تک کی تفسیر فارسی زبان میں لکھی۔ آپ نابینا ہو گئے تھے اس لیے بولتے جاتے تھے اور آپ کے شاگردان رشید اُس کو قلمبند کرتے تھے۔ اپنی وفات تک اس سے زیادہ تفسیر کا کام نہیں کر سکے۔ آپ ہفتہ میں ایک روز قرآن پاک کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ یہ درس بھی لوگوں نے لکھے۔ آج کل طبع شدہ نسخے نہیں ملتے۔ تاہم قلمی نسخے کہیں موجود ہیں۔ واللہ اعلم

حضرت شاہ ولی اللہؒ کے در سر بیٹے شاہ رفیع الدینؒ نے قرآن پاک کا سب سے پہلا اردو ترجمہ کیا۔ یہ تحت اللفظ ترجمہ ہے۔ جو عام پڑھا جاتا ہے مختلف اشاعتی اداروں مثلاً تاج کچہنی، انجمن حمایت اسلام وغیرہ نے اس ترجمہ کے بیشمار ایڈیشن شائع کیے ہیں۔ آپ قرآن پاک کا درس بھی دیا کرتے تھے۔ جس کو آپ کے شاگردان نوٹ کر لیا کرتے تھے۔ آپ کی وفات کے چالیس پچاس سال بعد یعنی آج سے سوا سو سال پہلے صرف سورۃ بقرہ والا حصہ شائع ہوا، جو کہ تفسیر ربیعہ کہلایا۔

آپ کے تیسرے بیٹے شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن پاک کا با محاورہ اردو ترجمہ کیا ہے اس میں بعض مشکل الفاظ بھی آئے ہیں جو محاورۃ استعمال ہوئے ہیں۔ حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ صاحب بخاری فرمایا کرتے تھے کہ امیری کے دوران میں شاہ عبدالقادر

کا اردو ترجمہ پڑھ رہا تھا۔ کہ اللہ الصمد کا ترجمہ نرادرہا نظر سے گزرا۔ چونکہ یہ ہندی زبان کا لفظ ہے۔ اس لیے میں اسے سمجھ نہ سکا۔ جیل میں موجود ایک بہت بڑے پنڈت سے میں نے اس لفظ کا حنی دریافت کیا۔ تو وہ کہنے لگا۔ تم کیوں پوچھتے ہو پہلے یہ بتاؤ کہ یہ لفظ کہاں آیا ہے۔ میں نے کہا پہلے تم اس کا معنی بتاؤ۔ چنانچہ اُس پنڈت نے بتایا۔ کہ نرادرہا سنسکرت زبان کا لفظ ہے۔ اور یہ اُس ذات کے لیے بولا جاتا ہے جس کی طرف سب چیزیں محتاج ہوں اور وہ کسی کا محتاج نہ ہو۔ کہنے کا مقصد یہ ہے کہ شاہ صاحب نے ایسے ایسے عجیب و غریب مگر بالکل صحیح الفاظ اپنے ترجمہ میں استعمال کیے ہیں۔ آپ نے دہلی کی لنگ ایڈورڈ رڈ پر واقع اکبری مسجد میں بارہ سال اعتکاف کیا تھا۔ بعد میں اس مسجد کو انگریزوں نے نیست و نابود کر دیا۔ یہ ترجمہ آپ نے اسی اعتکاف کے دوران لکھا تھا، ساتھ تھوڑا محضوڑا حاشیہ بھی ہے۔ اس ترجمہ کو شیخ المنہ حضرت مولانا محمد الحسن نے نسبتاً آسان زبان میں منتقل کیا ہے۔ اور یہ کام آپ نے ماٹا جیل میں اسیری کے زمانہ میں انجام دیا۔ شاہ صاحب کے زمانہ میں اردو زبان ابھی ابتدائی مراحل سے گزر رہی تھی۔ اور اس میں بھی اتنا تسلسل نہیں تھا۔ دو سو سال کے عرصہ میں اردو زبان کافی ترقی کر چکی تھی۔ لہذا شیخ المنہ نے شاہ صاحب کے اردو ترجمہ کو آسان بنا دیا۔ اور آجکل اس کی اشاعت عام ہے۔ حضرت شاہ ولی اللہ کے سب سے چھوٹے اور چوتھے بیٹے شاہ عبدالغنی ہیں۔ آپ نے درس و تدریس کے ذریعے تو دین کی بہت خدمت کی ہے مگر آپ کی کوئی مستقل کتاب نہیں ہے۔ البتہ آپ کے صاحبزادے شاہ اسماعیل شہید نے قلم اور تلوار دونوں سے جہاد کیا۔ آپ کی کتابیں بھی موجود ہیں۔ اور اپنے انگریزوں اور سکھوں کے خلاف علمی جہاد میں بھی حصہ لیا۔ اور پھر بالاکوٹ کے مقام پر جہاد شہادت نوش فرمایا۔

شاہ ولی اللہ ۱۷۰۳ء میں پیدا ہوئے جب کہ اورنگ زیب عالمگیر ۱۷۰۷ء میں وفات پانگئے یہ اپنے خاندان کے واحد بادشاہ تھے جنہوں نے پچاس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ کابل سے لیکر برما تک کا وسیع علاقہ انکی سلطنت میں شامل تھا اورنگ زیب عالمگیر

عالمگیر کے انچاس سال تو لڑائیوں میں گزر گئے۔ انہیں صرف ایک سال امن و امان کا ملا۔ انہوں نے مغلیہ سلطنت کو مستحکم کرنے کی اذمہ کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکے۔ آپ کی وفات کے بعد یکے بعد دیگرے کئی بادشاہ تخت نشین ہوئے، حضرت شاہ ولی اللہؒ نے دس بادشاہوں کو مندر اقتدار پر آتے دیکھا، مگر ان میں سے کوئی بھی لائق تائید نہ ہوا۔ سلطنت کمزور ہوتی چلی گئی اور انگریزوں کو مداخلت کا موقع مل گیا اور آخر انہوں نے ہندوستان میں پاؤں جمالیے۔

اورنگ زیب عالمگیر بڑے متدین آدمی تھے، مگر انگریزوں نے انہیں خوب بدنام کیا۔ انہوں نے عالمگیر کو ایک ظالم بادشاہ کی حیثیت سے دینکے سامنے پیش کیا۔ اور یہاں تک مشہور کیا کہ عالمگیر اس وقت تک ناشتہ نہیں کرتا تھا جب تک ہزاروں ہندوؤں کو قتل نہیں کروا دیتا تھا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ خدا نخواستہ اگر ایسا ہوتا تو ہندوستان میں کوئی ہندو باقی نہ رہتا۔ آپ نے پچاس سال حکومت کی۔ اور ہندو دارالسلطنت دہلی میں بھی موجود تھے۔ آپ نے بعض سکھوں اور مرہٹوں کے ساتھ لڑائی کی۔ کیونکہ شورش پسند تھے مگر آپ نے کسی پر ظلم نہیں کیا۔ شریعت کا پابند پکا سچا مسلمان تھا۔ جہاں حق و انصاف کا تقاضا ہوا، اپنے بھائی تک کو معاف نہیں کیا۔ آپ کے بھائی نے شہزادگی کے زمانہ میں ایک غریب شخص کے بچے کو ناحق قتل کر دیا تھا۔ وہ شہزادہ ہونے کی وجہ سے گرفت میں نہ آسکا۔ جب عالمگیر کا دور آیا تو اس بچے کے باپ نے مقدمہ دائر کر دیا اور دادرسی چاہی۔ باقاعدہ مقدمہ چلا۔ قتل کا ثبوت فراہم ہوا۔ اور پھر قصاص میں شہزادے کو سزائے موت ہوئی۔ عالمگیر اس کردار کا آدمی تھا۔

تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ نکاح کے لیے حق ضروری ہے۔ البتہ بوقت نکاح اس کا تقرر ضروری نہیں ہے۔ یہ بعد میں بھی طے ہو سکتا ہے۔ اس آیت کے یہ میں ایسی ہی صورت کا تذکرہ ہے۔ فَمَا يَلْبِغُنَّ عَلَيْكُمْ أَنْ طَلَقْتُمْ النِّسَاءَ مَا لَمْ تَمْسُوهُنَّ أَوْ تَفْرِضُوا لَهُنَّ فَرِيضَةً تم چھ کوئی گناہ نہیں ایسی صورت میں کہ تم طلاق دے دو عورتوں کو اس حالت میں کہ تم نے ان کو چھوا

نہیں اور اُن کا مہر بھی مقرر نہیں کیا۔ فرمایا بغیر مہر مقرر کیے نکاح بھی ہو گیا تھا اور اب طلاق بھی واقع ہو گئی۔ مگر اس کا یہ مطلب نہیں کہ تم عورتوں کو اُن کے حق سے بالکل محروم کر دو۔ بلکہ وَمَتَّعُوهُنَّ اُنْ كُوفَانَهُنَّ یعنی کچھ دے دلا دو۔ مگر کس قدر فرمایا عَلَى الْمَوْسِعِ قَدْرُهُ صاحب حیثیت پر اسکی حیثیت کے مطابق۔ اگر کوئی طاقت والا ہے۔ تو وہ اس کے مطابق ادا کرے وَعَلَى الْمُقْتِسِرِ قَدْرُهُ اور اگر کوئی مالی لحاظ سے کمزور ہے۔ تنگ دست ہے۔ تو وہ اپنی حیثیت کے مطابق مطلقہ کو ادا کرے۔ اس مقام پر فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ عورت کو کم از کم ایک جوڑا کپڑے دینا ضروری ہے۔ جس میں تین کپڑے شامل ہوں ایک بڑی چادر، ایک دوپٹہ اور ایک کمرہ۔ جو جسم کو ڈھانپ لیں۔ تاہم یہ ہے کہ مالدار اچھا قیمتی جوڑے لے دے اور غریب آدمی اپنی حیثیت کے مطابق خرچ کر دے یہ تو ایسی عورت کیلئے ہے جس کا مہر مقرر نہیں ہو سکا اور طلاق واقع ہو گئی۔ البتہ جن کے مہر مقرر ہوں ان کو حق مہر تو ادا ہو گا، اس کے علاوہ کپڑے دینا بھی مستحب ہے اسی کو فرمایا مَتَاعاً بِالْمَعْرُوفِ یہ متاع دستوں کے مطابق دو مطلقہ عورت کا حق غضب نہ کر دو۔ فرمایا حَقّاً عَلَى الْمُحْسِنِينَ یہ چیز صاحب ایمان میگو کاروں پر لازم ہے۔ لہذا اس میں کوتاہی نہ کریں۔ بلکہ مطلقہ کو ضرور اس کا حق ادا کریں۔

مہر مثل

طلاق کے علاوہ ایک صورت بیوگی کی بھی ہے۔ اگر نکاح کرتے وقت مہر مقرر نہیں ہوا اور میاں بیوی کی غفلت بھی نہیں ہوئی اور خاوند مر گیا تو اب عورت کس چیز کی حقدار ہے۔ ایسی صورت میں عورت مہر مثل کی حقدار ہوگی۔ شریعت میں مہر مثل سے مراد ایسا مہر ہے۔ جو ایسی عورت کے خاندان کی دوسری عورتوں کا عام طہ پر مقرر ہوتا ہے۔ جب ایسی صورت پیش آجائے تو پھر دیکھا جائے کہ اس خاندان یا برادری میں اس حیثیت کی عورتوں کا کیا مہر مقرر ہوتا ہے۔ اس کے مطابق اس عورت کو بھی مہر ادا ہو گا۔ اس کے علاوہ یہ عورت خاوند کی وراثت کی بھی حق دار ہوگی۔ اور اسے چار ماہ دس دن کی مقررہ عدت بھی گزارنا ہوگی۔

نصف مہر

آج کے درس کی دوسری آیت کریمہ نصف مہر کے متعلق ہے۔ یہ کس حالت میں ادا کیا جاتا ہے۔ فرمایا وَإِنْ طَلَّقْتُمُوهُنَّ مِنْ قَبْلِ أَنْ تَمْسُوهُنَّ وَقَدْ فَرَضْتُمْ لَهُنَّ فَرِيضَةً لَوَافِقًا تم ایسی حالت میں عورتوں کو طلاق دو کہ ان کے قریب نہیں گئے۔ مگر نکل کرتے وقت مہر مقرر کیا تھا۔ اور وہ طلاق ہونے سے قبل ادا نہیں ہوا۔ فَنِصْفُ مَا فَرَضْتُمْ پس نصف ہے جو تم نے مقرر کیا تھا یعنی اگر بغیر مقاربت کے طلاق ہوگئی ہے تو مقررہ مہر کا نصف ادا کرنا ہوگا۔ یہ تو کم از کم ہے کہ اتنا ضرور ادا کرو۔ البتہ سلف میں ایسے واقعات بھی ملتے ہیں کہ انہوں نے واجب الاہر سے زیادہ بھی دیا مثلاً حضرت حسن بن علی بن ابی طالب کے متعلق آتا ہے کہ ان کے ساتھ ایسا معاملہ پیش آگیا۔ بغیر مجامعت کے عورت کو طلاق دے دی۔ تو ایک روایت کے مطابق انہوں نے دس ہزار درہم ادا کیے اور دوسری کے مطابق بیس ہزار درہم کی رقم حق مہر کے طور پر ادا کی مقصد یہ تھا کہ جدا ہونے والی عورت کسی پریشانی میں مبتلا نہ ہو۔ لہذا اُسے احسن طریقے سے رخصت کیا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے یہ حکم نازل کر دیا کہ اگر مہر مقرر نہ ہوا ہو اور طلاق واقع ہوگئی تو عورت کو کم از کم کپڑوں کا ایک جوڑا دے دو۔ اور اگر مہر مقرر ہوا تھا۔ تو کم از کم اس کا نصف ادا کر دو۔

معافی تقویٰ کی علامت ہے

لَا أَنْ يَعْفُوَنَّ البتہ ایک صورت میں ادا بھی مہر سے بچ سکتے ہو کہ وہ عورتیں خود مہر معاف کر دیں۔ کہ ٹھیک ہے ہم نہیں لیتیں جاؤ معاف ہے۔ یا دوسری صورت یہ ہے کہ أَوْ يَعْفُوَا الَّذِي بِيَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ یا وہ شخص معاف کر دے جس کے ہاتھ میں نکاح کی گره ہے یعنی طلاق مینے والا مرد معاف کر دے۔ مردوں کا معاف کر دینا بدین معنی ہے۔ کہ وہ نصف کی بجائے پورا حق مہر ادا کر دیں۔ یا اگر پورا ادا کر چکے ہیں۔ تو نصف واپس نہ لیں بِيَدِهِ عَقْدَةُ النِّكَاحِ سے اکثر مفسرین نے فائدہ مرد لیا ہے۔ جس کے ہاتھ میں طلاق کی گره ہے۔ یعنی طلاق مینے کا حق صرف مرد کو ہے۔ عورت تو زیادہ سے زیادہ عدالت سے خلع حاصل کر سکتی ہے مگر طلاق مرد کا ہی حق ہے۔ بعض نے اس سے مراد عورت کا ولی بھی لیا ہے۔ مگر

راج قول پہلا ہی ہے۔ فرمایا اے مردو! وَأَنْ تَعْفُوْا اگر تم معاف کرو وَأَقْرَبُ لِلتَّقْوَىٰ یہ بات تقویٰ سے قریب تر ہے لہذا اگر یہ ہیزگاری اختیار کرنا چاہتے ہیں، تو معاف ہی کر دیا کرو۔

فضیلت کی
پاسداری

پہلے گزر چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے مردوں کو عورتوں کے قوام یعنی قوی بنایا۔ نیز یہ بھی بیان ہو چکا ہے کہ لِّلرِّجَالِ عَلَيْنَهُنَّ دَرَجَةٌ مردوں کو عورتوں پر ایک درجہ فضیلت حاصل ہے۔ لہذا اے مردو! تمہاری اس فضیلت کا تقاضا ہے کہ وَلَا تَسْأَلُوا الْفَضْلَ بَيْنَكُمْ تمہارے درمیان اللہ تعالیٰ نے جو فضیلت رکھی ہے۔ اس کو مت بھولو۔ اللہ تعالیٰ نے تمہیں عورتوں پر برتری عطا کی ہے تو اس برتری کا تقاضا ہے کہ تم عورتوں پر زیادہ احسان کرو۔ اور طلاق کی صورت میں آدھے کی بجائے پورا امر ادا کرو، یا اگر پورا ادا کر چکے ہو، تو آدھا واپس نہ لو۔ بلکہ معاف کر دو۔ فرمایا إِنَّ اللَّهَ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ بیشک تمہارے سب کام اللہ تعالیٰ کی نگاہ میں ہیں۔ وہ تمہارے ہر خیر و شر کو دیکھ رہا ہے۔ لہذا اس کے احکام کی پابندی کرو گے تو اس کے مقرب بن جاؤ گے۔ اگر خلاف ورزی کرو گے، تو پھر اس کی گرفت بھی زیادہ دوزخ میں ہے۔

حَفِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ الْوُسْطَىٰ وَفُؤُومُ اللَّهِ
 قِنَتَيْنِ ۝ (۲۳۸) فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَانًا فَإِذَا
 أَمِنْتُمْ فَأَذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُم مَّا لَمْ تَكُونُوا
 تَعْلَمُونَ ۝ (۲۳۹) وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذُرُونَ
 أَزْوَاجًا ۖ وَصِيَّةً لِّأَزْوَاجِهِم مِّمَّا عَالِي الْحَوْلِ غَيْرِ
 إِخْرَاجٍ فَإِنْ خَرَجْنَ فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ فِيمَا فَعَلْنَ
 فِي أَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ ۖ وَاللَّهُ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ۝ (۲۴۰)
 وَلِلَّهِ طَلَّقَتْ مَتَاعٌ ۚ بِالْمَعْرُوفِ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ ۝ (۲۴۱)
 كَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ ۝ (۲۴۲)

۱۰۷/۲

ترجمہ: حفاظت کرو سب نمازوں کی اور خصوصاً درمیان فی نماز کی اور کھڑے ہو اللہ کے
 سامنے عاجزی سے ۝ (۲۳۸) پس اگر تم خوف کی حالت میں ہو، پس پیدل یا سواری پر نماز
 ادا کرو۔ پھر جب تم امن کی حالت میں ہو۔ پس اللہ کو یاد کرو جیسا کہ اُس نے تم کو تعلیم دی
 جو تم نہیں جانتے تھے ۝ (۲۳۹) اور وہ لوگ جو تم میں وفات پاتے ہیں۔ اور وہ اپنی
 بیویاں چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ اپنی عورتوں کے بارے میں وصیت کر جائیں ایک سال تک۔
 فائدہ اٹھانے کی بغیر نکالے۔ اور اگر وہ عورتیں خود مکمل جائیں تو تم پر کوئی گناہ نہیں اُس
 بات میں جو وہ اپنے حق میں کریں دستور کے مطابق اور اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک
 اور حکمت والا ہے ۝ (۲۴۰) اور طلاق والی عورتوں کے لیے فائدہ اٹھانا ہے۔ دستور کے
 مطابق۔ یہ بات لازم ہے متقیوں پر ۝ (۲۴۱) اسی طرح اللہ تعالیٰ اپنی آیات تمہارے

لیے بیان فرماتا ہے تاکہ تم سمجھ جاؤ (۴۳۶)

رابط آیات

گذشتہ آیات میں طلاق، عدت اور حتیٰ مهر کے مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ اب درمیان میں دو آیتیں نماز کے متعلق ہیں۔ اور اس کے بعد پھر طلاق اور عدت کے مسائل ہیں۔ بظہر ایک ہی نوعیت کے مسائل کے درمیان نماز کی یہ آیتیں بے ربط معلوم ہوتی ہیں مگر حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔

حضرت شاہ عبدالقادر محدث دہلویؒ اور بعض دیگر بزرگ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ یہاں پر یہ بات سمجھانا چاہتا ہے۔ کہ دیکھو، نکاح، طلاق، عدت کے مسائل میں مشغول ہو کر کہیں نماز سے غافل نہ ہو جانا۔ نکاح طلاق کے مسائل ہی ایسے الجھے ہوئے ہیں کہ بعض اوقات گفتگو طول پکڑ جاتی ہے۔ ایسی صورت میں تمہاری نماز نہیں چھوڑنی چاہیے۔ اس کا ہر حال میں خیال رکھو۔ اس طرح گویا نماز والی آیات دوسری آیات سے مربوط ہیں۔

حضرت مولانا عبید اللہ سندھیؒ فرماتے ہیں کہ نماز کی آیات کو دیگر آیات سے اس طور ربط ہے کہ گذشتہ اور آئندہ آیات میں نکاح، طلاق، عدت وغیرہ جیسے معاشرتی مسائل کا تذکرہ ہے۔ اور یہ مسائل تدبیر منزل کے مسائل کہلاتے ہیں۔ درحقیقت ان مسائل پر عدل کی بنیاد قائم ہوتی ہے۔ یعنی احکام کی پابندی کمزور تقویٰ اختیار کرو۔ ظلم و زیادتی نہ کرو، بچوں والی اور مطلقہ عورتوں کا حق ضائع نہ کرو۔ بیویوں کے حقوق ادا کرو اس سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے دو چیزوں کا حکم دیا ہے یعنی عدل اور احسان اِنَّ اللہَ یَاْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ یعنی معاشرے میں عدل و انصاف کو قائم کرو اور احسان بھی کرو۔ تو یہ معاشرتی مسائل عدل کے تحت آتے ہیں۔ جب کہ نماز کی ادائیگی احسان کی تعریف میں آتی ہے۔ کہ نماز ادا کرنے سے انسان محسن بنتا ہے، نیچوکاری اختیار کرتا ہے تو یہاں پر دونوں طرح کے مسائل کو اکٹھا بیان کیا گیا ہے۔ تاکہ عدل و احسان کے تقاضے بیک جا پورے کیے جا سکیں۔ اس طرح یہ آیات آپس میں مربوط ہیں۔

عدل کے مسائل تو گذشتہ کئی دروسوں میں آئے ہیں۔ اور آئندہ بھی آئیں گے۔

صلوٰۃ و طہارت

یہاں پر اللہ تعالیٰ نے احسان کا مسئلہ بیان فرمایا حَافِظُوا عَلَى الصَّلَوَاتِ وَالصَّلَاةِ
الْوُسْطَىٰ ساری نمازوں کی حفاظت کرو۔ اور خاص طور پر صلوٰۃ وسطیٰ کی۔ درمیان نماز
کے متعلق بہت سے اقوال ہیں۔ کسی نے اسے فجر کی نماز بتایا ہے۔ کسی نے ظہر کی کہی
نے مغرب کی اور بعض نے عشاء کی، مگر رائج قول یہ ہے کہ صلوٰۃ وسطیٰ سے مراد عصر کی
نماز ہے۔ اور یہ نبی علیہ السلام سے ثابت ہے۔ اس نماز کی اہمیت اس وجہ سے ہے
کہ یہ نماز دو رات کی (مغرب اور عشاء) اور دو دن کی (فجر اور ظہر) کے درمیان واقع ہے
اور یہ وقت نسبتاً زیادہ مشغولیت کا ہوتا ہے۔ کاروبار کی وجہ سے اس نماز کے ضائع
ہونے کے زیادہ مواقع ہوتے ہیں۔ اس لیے اس کی حفاظت کی زیادہ تاکید فرمائی گئی
ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ فجر کی نماز کے وقت اور پچھر عصر کی نماز کے وقت ان
فرشتوں کی ڈیوٹیاں تبدیل ہوتی ہیں۔ جو بندوں کے اعمال اللہ کی بارگاہ میں لے جاتے
ہیں۔ لہذا یہ وقت بڑا اہم ہے، ترمذی شریفین کی روایت میں آتا ہے۔ مَنْ قَاتَلَهُ
صَلَاةُ الْعَصْرِ فَكَانَ كَقَاتِلِ أَهْلِهِ وَصَالِهِ یعنی جس کی عصر کی نماز فوت ہو گئی گویا
اس کا اہل اور مال سب کچھ ہلاک کر دیا گیا۔ اسی لیے فرمایا کہ تمام نمازوں کی حفاظت کرو
مگر خاص طور پر درمیان نماز کی حفاظت کرو۔ وَقُومُوا لِلَّهِ قِدْتِينَ اور اللہ تعالیٰ کے
سامنے عاجزی کے ساتھ کھڑے ہو جاؤ۔ گویا نماز میں پوری توجہ اسی طرف لگا دو۔ ادھر
ادھر کا خیال دل میں نہ لاؤ۔ بلکہ یہ تصور کرو کہ تم احکم الحاکمین کے حضور دست بستہ کھڑے
ہو، لہذا پوری توجہ کے ساتھ نماز کو ادا کرو۔ ایسی ہی حالت کے متعلق حضور علیہ السلام نے
فرمایا تھا کہ احسان اس بات کا نام ہے۔ أَنْ تَعْبُدَ اللَّهَ كَأَنَّكَ تَرَاهُ یعنی عبادت
کے وقت تیری کیفیت یہ ہونی چاہیے گویا کہ تو اللہ تعالیٰ کو دیکھ رہا ہے۔ جب
اس کے حضور میں نماز کے لیے کھڑا ہے تو اس کو اپنی آنکھوں سے دیکھ بھی رہا
ہے۔ فرمایا اگر یہ کیفیت پیدا نہ ہو سکے۔ تو کم از کم اتنا تو ہے۔ فَإِنَّهُ يَسْمَعُ
کہ وہ تو تجھے بہر حال دیکھ رہا ہے۔ لہذا نماز کے لیے نہایت مودب طریقے سے
کھڑے ہو کہ تمہارے دل میں خشیت الہی ہو۔ اور تمہاری حرکات و سکنات سے عاجزی کا اظہار ہو۔

فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَاتٍ إِنْ كُنْتُمْ خَوْفٌ كَرِهْتُمْ خُفَّاءً أَوْ عَلَى نَعَالٍ فَإِنْ خِفْتُمْ فَرِجَالًا أَوْ رُكْبَاتٍ إِنْ كُنْتُمْ خَوْفٌ كَرِهْتُمْ خُفَّاءً أَوْ عَلَى نَعَالٍ

یا سواری پر نماز ادا کر لو۔ خوف سے سر اور دشمن کا خوف ہے۔ جب دشمن کے ساتھ حالت جنگ ہو۔ اور میدان کارزار میں نماز کا وقت آجائے تو جنگ سے فارغ ہونے تک نماز کو مؤخر نہ کرو۔ بلکہ اُس وقت اگر تم پیدل چل رہے ہو یا سواری پر ہو اور دشمن کا ہر آن خطرہ ہے۔ تو سواری کے اوپر چلتے چلتے ہی نماز ادا کر لو۔ اللہ تعالیٰ نے اجازت دی ہے وہ قبول کرے یا لا ہے۔ بغیر سواری کے پیدل امام ابو حنیفہؒ کے نزدیک نماز درست نہیں ہے عین جنگ کی حالت میں مجاہدین کے دو گروپ بنا کر نماز کی ادائیگی کا ذکر آتا ہے۔ ایک گروپ دشمن سے لڑتا ہے اور دوسرا نماز ادا کر لے۔ پھر دوسرا دشمن کے مقابلے پر ہو اور پہلا نماز ادا کر لے۔ اور اگر مجاہدین ایک ہی امام کے پیچھے نماز پڑھنا چاہیں جیسا کہ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں صحابہ کرامؓ کی خواہش ہوتی تھی۔ تو پھر دونوں گروپ آدھی آدھی نماز امام کے ساتھ پڑھیں گے اور باقی آدھی خود پوری کریں گے۔ اگر دو رکعت نماز ادا کرنا ہے تو ایک گروپ امام کے پیچھے کھڑا ہوگا اور دوسرا دشمن کے مقابلے میں رہے گا۔ جب امام کے ساتھ ایک رکعت مکمل ہو جائے گی تو پہلا گروپ پیچھے ہٹ کر سوچے سمجھا لے گا اور حفاظت پر مامور دوسرا گروپ امام کے ساتھ دوسری رکعت میں شامل ہو جائے گا۔ اس طرح دونوں گروپ ایک ایک رکعت امام کے ساتھ ادا کریں گے اور دوسری رکعت خود پوری کریں گے۔ اگر نماز چار رکعت والی ہے۔ تو ہر گروپ دو رکعت امام کے ساتھ پڑھے گا۔ اور باقی دو رکعت خود مکمل کر لے گا۔ یہ اسی صورت میں ہے کہ مجاہدین کسی خاص نیک آدمی کے ساتھ جماعت میں شامل ہونا چاہیں۔ ورنہ ہر گروپ اپنی اپنی پوری نماز بیک وقت ادا کر لے گا۔

حضور علیہ السلام نے سفر اور اقامت ہر دو حالتوں میں چھ یا دس دفعہ صحابہ کرامؓ کو صلوٰۃ الخوف پڑھائی۔ آپؐ نے سفر کی حالت میں دو رکعت اور اقامت کی حالت میں چار رکعت نماز پڑھائی۔

فَرِيًّا فَإِذَا أَمِنْتُمْ جَبْ تَمَّ امْنُ كِي مَالْتِ مِيں هُوَ خَوْفٌ دُورُ هُوَ جَائِي -

فَاذْكُرُوا اللَّهَ كَمَا عَلَّمَكُمُ اللَّهُ تِلْكَ اِلَٰهَ كُو اس طَرَحِ يَادُ كُرْ وَحَسْ طَرَحِ اس نَے
تَمِيں تَعْلِيْمِ دِي هَے - يَعْنِي رُكُوعِ، سُجُودِ، قَعْدَةِ وَغِيْرَه جَوْبُحِي شَرَطُ هِيں، فَرَاغِ، اَوَاجَاتِ بِنَنِ
اَوْرَسُجَاتِ هِيں سَبْ كِي رِعَايَتِ رُكُوعِ - اَللّٰهُ نَے تَمِيں اِيْسِي تَعْلِيْمِ دِي هَے - مَالَكُمْ
تَكُونُو تَعْلَمُوْنَ جَوْتَمَّ نِيں جَانَتِي تَحِي - يِهْ بِي اَللّٰهُ تَعَالٰى كِي خَاصِ مَرْبَانِي
هَے كِه اُس نَے اِپْنِي عِبَادَتِ كَا وَه طَرِيقِي بِي تَبْلَا دِيَا هَے - جِي وَه لِنْدِ كَر تَا هَے - اِپْسِ
اس طَرِيقِي كِي مَطَابِقِ اَللّٰهُ كَا ذِكْرُ كَر وَ -

بیواؤں پرچا

نَمَازِ كِي تَذَكُّرِ كِي كِي بَعْدِ اب پھر عورتوں كِي مَسَائِلِ كَا بَيَانِ هَے فَرْمَایَا
وَالَّذِينَ يُتَوَفَّوْنَ مِنْكُمْ وَيَذُرُونَ أَزْوَاجًا تَمَّ مِيں سَے جَو
لُوكِ وَفَاتِ جِيے جَاتِي هِيں اَوْر اِپْنِي جِيوئِيوں كِي حَقِّ مِيں وَصِيَّتِ كَر جَائِيں مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ
ذُرُوْا وَاجِهَهُمْ وَه اِپْنِي جِيوئِيوں كِي حَقِّ مِيں وَصِيَّتِ كَر جَائِيں مَتَاعًا اِلَى الْحَوْلِ
عَنْ مَخْرَاجِ كِه وَه اِيك سال تِك فَاوَدِ اُٹھَا مِيں بَغِيْرُ كُھَرِے نَكَلْنِي كِي فَكَانَ
خَرَجْنِ اَوْر اَكْر وَه خُود سِجُوْزِ نَكَلِ جَائِيں فَلَا جُنَاحَ عَلَيْكُمْ تَوَّمَّ بِرُكُوعِي كِنَا
نِيں فِي مَا فَعَلْتُمْ فِي اَنْفُسِهِنَّ مِنْ مَّعْرُوفٍ كِه جَو كُچھ وَه اِپْنِي مَعَامِلِي مِيں
دَسْتُورِ كِي مَطَابِقِ كَر نَا چَا هِيں - بِمَقْصِدِي هَے - كِه مَرْدُوں بِرِي لَازِمِ هَے - كِه عَوْرَتُوں
يَكِيئِي وَصِيَّتِ كَرِيں كِه كَم اَزْ كَم اِيك سال تِك اُن كِي كُھَرِ مِيں عَمُولِ كِي مَطَابِقِ بِيچِي رَہِيں - اُن كِي
تَمَامِ اخْرَاجَاتِ بِيچِي پُوَرِي كِيے جَائِيں - اُن اَكْر عَوْرَتِيں خُود اِپْنِي مَتَعَلَقِ كُوئی دُوسَرَا
فِيصَلَه كَر لِيں - يَعْنِي دُوسَرَا نِكَاحِ كَر نَا چَا هِيں - تَو بِيچَر وَه اِپْنِي مَرْضِي كِي مَالِكِ هِيں - تَمَّ بِرَاسِ
كَا كُچھ كِنَا نِيں - اَنِيں اِپْنَا فِيصَلَه خُود كَر نِيں دِيں - اس مِيں رُكَاوْتِ بِيچِي نَزَبِيں -

بَعْضِ مَفْسَرِيں كَر اِمْرُ فَرَمَاتِي هِيں كِه اِيك سال كِي وَصِيَّتِ كَا قَانُونِ اُس وَقْتِ
تِيك تَحَا جَب تِيك جِيوئِيوں كِي لِيے چَار مَاهِ دَس دِنِ كِي عَدَّتِ مَقْرَرِ نِيں هُوئی تَحِي
اس وَقْتِ عَوْرَتِيں سال بِيچَر خَاوندِ كِي كُھَرِ سَكْتِيں تَحِيں - پھر جَب اَللّٰهُ نَے عَدَّتِ كِي
آيَاتِ نَاذِلِ فَرَمَائِيں - تَو يِه حُكْمِ مَسْمُوعِ هُوَ گِيَا - بَعْضِ دُوسَرِي مَفْسَرِيں كَر اِمْرُ كَا قَوْلِ هَے

کہ کوئی بھی حکم منسوخ نہیں ہے۔ بلکہ اصل عدت تو چار ماہ دس دن ہی ہے۔ مگر یہ ایک سال کی وصیت عورت کے ساتھ مزید احسان ہے۔ کہ اُسے عدت کے فوراً بعد گھر سے نہ نکال دیا جائے۔ بعض اوقات عورت کے مال باپ بھی نہیں ہوتے جن کے پاس چلی جائے اور نکاح ثانی کا بھی فوری بندوبست نہیں ہو سکتا، لہذا ایک سال تک انہیں گھر سے نہیں نکالنا چاہیے۔ بلکہ جہاں تک ہو سکے اُن کے ساتھ احسان کا برتاؤ ہونا چاہیے۔ کیونکہ وہ بیوہ ہو چکی ہے وہ پہلے ہی غم و اندوہ سے نڈھال ہے۔ اس کے ساتھ مزید سختی نہایت ہی ناپسندیدہ فعل ہو گا۔

بعض فرماتے ہیں۔ کہ ایک سال بٹھرنے کی رعایت عورت کو اُس وقت تک حاصل تھی جس وقت تک وراثت کے احکام نازل نہیں ہوئے تھے۔ پھر سورۃ نسا میں مذکور تمام شتے داروں کے حصے مقرر کر دیے گئے۔ اگر خاندن مر جائے تو بیوی کا حصہ بھی مقرر ہوا۔ یعنی اگر اولاد موجود ہے تو کل وراثت کا آٹھواں حصہ اور اگر اولاد نہیں ہے تو چوتھا حصہ مقرر ہوا۔ لہذا اب سال بھر کی رعایت کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ عورت کو وراثت میں حصہ مل گیا ہے۔ فرمایا وَاللّٰهُ عَزِيزٌ حَكِيْمٌ یہ احکام خداوند تعالیٰ نازل کر رہا ہے۔ جو کمال قدرت کا مالک ہے۔ اور حکمت والا ہے۔ نہ کوئی کام اس کی قدرت سے باہر ہے۔ اور نہ ہی کوئی کام حکمت سے خالی ہے اس لیے ان احکام پر پورا پورا عمل کرنا چاہیے۔

فرمایا وَلِلْمُطَلَّقَاتِ مَتَاعٌ بِالْمَعْدُوَّتِ مطلقہ عورتوں کو فائدہ پہنچانا ہے دستور کے مطابق۔ یعنی طلاق کی مختلف صورتوں کی نسبت سے ان کے حقوق ادا کرو۔ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ ایسی عورت جسے مقاربت سے پہلے طلاق ہو گئی اور اس کا مہر بھی مقرر نہیں ہوا، اُس کو اپنی مالی حیثیت کے مطابق ایک جوڑا کپڑے دو جس میں ایک قمیص، ایک دوپٹہ اور ایک بڑی چادر ہو۔ یا ایک دوپٹہ اور دو چادریں ہوں۔ یہ واجب ہے۔ ایسی عورت جس کا مہر مقرر ہو چکا ہے۔ مگر بغیر مقاربت کے طلاق ہو گئی۔ اس کو نصف مہر ملے گا۔ یہاں پر جن عورتوں کا ذکر ہے

مطلقہ کے
حقوق

وہ عام طلاق یافتہ ہیں جو مہر مثل یا لوہے مہر کی حقدار ہیں۔ فرمایا کہ اُن کو بھی کچھ نہ کچھ فائدہ پہنچاؤ۔ یہ مستحب ہے۔ ان کو کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔ وہ طلاق کے غم میں مغموم ہیں۔ اُن کی دل جوئی ہوئی چاہیے۔ ان کے لیے بھی ایک جوڑا کپڑے تو ضرور ہونے چاہئیں۔ حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِينَ یہ بات متقیوں پر لازم ہے۔

فرمایا کَذَلِكَ يُبَيِّنُ اللَّهُ لَكُمْ آيَاتِهِ اللہ تعالیٰ اسی طرح تمہارے لیے اپنے احکام بیان کرتا ہے۔ آیت کے مختلف معانی آتے ہیں مثلاً دلیل، معجزہ، نشانی وغیرہ تاہم یہاں پر آیت سے مراد اس کے احکام ہیں۔ جنہیں اللہ تعالیٰ تمہارے لیے نازل کرتا ہے۔ لَعَلَّكُمْ تَعْقِلُونَ تاکہ تم انہیں اچھی طرح سمجھ کر ان پر عمل پیرا ہو جاؤ۔ اگر احکام پر چلتے رہو گے تو سعادتمند کی منزل پا لو گے۔

أَلَمْ تَرَ إِلَى الَّذِينَ خَرَجُوا مِنْ دِيَارِهِمْ وَهُمْ أُلُوفٌ
 حَذَرَ الْمَوْتِ ۖ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا فَقَذَّوهُمُ
 إِنَّ اللَّهَ لَهُ ذُفُّ فَلِ عَلَى النَّاسِ وَلَكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا
 يَشْكُرُونَ ﴿۲۴۲﴾ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ وَاعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ
 سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۳﴾ مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا
 حَسَنًا فَيُضْعِفَهُ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً ۖ وَاللَّهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ
 وَإِلَيْهِ تُرْجَعُونَ ﴿۲۴۴﴾

ترجمہ :- کیا نہیں دیکھا آپ نے اُن لوگوں کو جو اپنے گھروں سے نکلے اور وہ
 ہزاروں کی تعداد میں تھے موت کے ڈر سے ۔ اللہ تعالیٰ نے اُن سے فرمایا جاؤ
 پھر اُن کو زندہ کیا ۔ بیشک اللہ تعالیٰ لوگوں پر فضل کرنے والا ہے ۔ لیکن اکثر
 لوگ شکریہ ادا نہیں کرتے ﴿۲۴۲﴾ اور اللہ کے راستے میں لڑو اور جان لو کہ
 اللہ تعالیٰ سننے اور جاننے والا ہے ﴿۲۴۳﴾ کون ہے وہ شخص جو اللہ تعالیٰ
 کو قرض دے ، اچھا قرض ۔ پس اللہ تعالیٰ اس کے لیے دگن کر دے گا ۔ کئی گناہ
 اور اللہ تعالیٰ تنگی کرے گا ۔ اور کٹائش کرے گا ۔ اور تم سب اُسی کی طرف لوٹے جاؤ ﴿۲۴۴﴾

وَلَيْسَ الْبِرُّ بِأَنْ تَأْتُوا الْبُيُوتَ مِنْ ظُهُورِهَا سَلَا لَكَ اللَّهُ تَعَالَى
 نے بہت سے احکام بیان فرمائے ہیں جن کا تعلق بر یعنی نیکی کے ساتھ ہے ۔ ان میں
 نکاح ، طلاق ، عدت اور ان کے تعلقات بیان ہوئے ہیں ۔ حلت اور حرمت کا
 مسئلہ بھی آیا ہے ۔ اس کے علاوہ عبادات ، معاملات اور اخلاق سے متعلق مسائل
 کا بیان ہوا ہے ۔ اب یہاں سے جہاد بالمال اور جہاد بالنفس کا تذکرہ شروع ہو

ہو رہا ہے۔ پہلی آیت مسئلہ جہاد فی سبیل اللہ میں تمہید کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس کے بعد حاکم کے انتخاب اور اس کے تحت جہاد میں حصہ لینے کا تذکرہ ہے کسی پہلی امت کا واقعہ اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا ہے۔ کہ وہ لوگ جہاد سے بھاگ کھڑے ہوئے تھے پھر اللہ تعالیٰ نے راستے میں اُن پر موت طاری کر دی۔ پھر انہیں عجیب و غریب طریقہ سے دوبارہ زندگی نصیب ہوئی۔

اسلوب خطاب

اس واقعہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا اَلَمْ تَرَ کیا تو نے نہیں دیکھا اے مخاطب۔ تَرَ کا لفظ رویت سے مشتق ہے جس کے معنی دیکھنے کے ہیں مگر رویت بھی دو قسم کی ہے۔ ایک برویت بصری یعنی اس ظاہری آنکھ سے دیکھنا اور دوسری قسم ہے روایت قلبی یعنی علم کے ذریعے کسی چیز کو جان لینا۔ جیسے کسی کو کہا جائے اَلَمْ تَعْلَمُ کیا تو نہیں جانتا۔ تجھے یہ بات معلوم نہیں۔ دوسرے لفظوں میں تجھے یہ بات ضرور معلوم ہے۔ چنانچہ موقع محل کے مطابق بعض اوقات رویت کے معنی آنکھ سے دیکھنا ہوتا ہے اور بعض اوقات علم سے جاننا۔ مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ یہاں پر اَلَمْ تَرَ سے مراد علم کے ذریعے جاننا ہے، نہ کہ ظاہری آنکھ سے ظاہر ہے کہ اس جو واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ وہ پہلی امتوں سے تعلق رکھتا ہے۔ لہذا اس زمانہ میں اس واقعہ کو آنکھ سے دیکھنا ممکن نہیں، البتہ بعد میں اس کا علم ہوا ہے۔ یہ واقعہ حضور علیہ السلام کے زمانہ یعنی نزول قرآن سے بھی پہلے کا ہے اس لیے اُس وقت بھی یہ رویت بصری نہیں تھی۔ بلکہ رویت قلبی یا رویت علمی تھی۔ اس طرح کا اسلوب بیان بعض دوسری آیات میں بھی ملتا ہے۔ جیسے اَلَمْ تَرَ اِلٰی الَّذِیْ حَآجَّ اِیْہُمْ فِیْ رُبِّہٖ کیا تو نے اُس شخص کی طرف نہیں دیکھا۔ جس نے ابراہیم علیہ السلام سے اُس کے رب کے متعلق جھگڑا کیا۔ سورۃ فیل میں فرمایا اَلَمْ تَرَ کَیْفَ فَعَلَ رَبُّکَ بِاَصْحٰبِ الْفِیْلِ کیا تم نے نہیں دیکھا کہ تمہارے رب نے ہاتھی والوں کے ساتھ کیا سلوک کیا۔ یہ واقعات خود حضور علیہ السلام کے زمانے سے بہت پہلے کے ہیں۔ مگر لفظ اَلَمْ تَرَ ہی لایا گیا ہے مقصد یہ

کہ ہم نے علم کے ذریعے آپ کو بتا دیا ہے۔ کہ فلاں فلاں واقعہ ایسے ایسے پیش آیا۔ جب اللہ تعالیٰ نے یوسف علیہ السلام کا واقعہ بیان فرمایا۔ تو آخر میں فرمایا ذَلِكْ مِنْ اَنْبَاءِ الْغَيْبِ نُوحِيْهِ اِلَيْكَ وَمَا كُنْتَ لَدَيْهِمْ یعنی یہ غیب کی خبریں ہیں۔ جو ہم آپ کی طرف وحی کرتے ہیں۔ آپ اُس وقت اُن کے پاس نہ تھے۔ گویا یہ بات آپ کو بذریعہ علم معلوم ہوئی۔

جہاد سے فرار
اور موت

الغرض افرمایا اَلَمْ تَرَ كَيْفَ كُنَّا نَقِيصُكَ کیا آپ نے نہیں جانا اُن لوگوں کا حال اِلَى الَّذِيْنَ خَرَجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ جُوْپَانِے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے وَهُمْ اَلْمُؤْمِنُوْنَ اور وہ ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ کس وجہ سے بھاگ کھڑے ہوئے حَذَرَ الْمَوْتِ موت سے ڈر کر۔ اب سوال یہ ہے۔ کہ انہیں موت کیوں نظر آرہی تھی۔ اس ضمن میں مفسرین کے مختلف اقوال ہیں۔ تواریک کی روایتوں سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ یہ لوگ بنی اسرائیل سے تھے۔ اور انہیں ایک دوسری فلتی نامی قوم سے جہاد کا حکم ہوا تھا۔ مگر یہ لوگ جہاد پر آمادہ ہونے کی بجائے جان بچانے کے لیے بھاگ کھڑے ہوئے تاکہ دوسری جگہ چلے جائیں گے، تو موت سے بچ جائیں گے۔ بعض دوسرے مفسرین فرماتے ہیں کہ اُن لوگوں میں طاعون کی وبا پھیل گئی تھی۔ جس کی وجہ سے وہ اپنے علاقے سے بھاگ کر پہاڑوں کے دروں میں پناہ گزین ہو گئے۔ اُن کا خیال تھا۔ کہ یہاں کی آب و ہوا نسبتاً بہتر ہے۔ اور اس پر فضا ماحول میں وہ طاعون سے بچ جائیں گے۔ جہاں تک اُن کی تعداد کا تعلق ہے، مستدرک حاکم کی روایت اور حضرت عبداللہ بن عباسؓ سے منقول ہے۔ کہ وہ لوگ چار ہزار کی تعداد میں تھے۔ بعض روایتوں میں ستر ہزار تک کی تعداد کا ذکر آتا ہے۔ مگر ابن عباسؓ کی روایت زیادہ قوی ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان مبارک ہے۔ کہ جس علاقہ میں طاعون پھیل جائے وہاں سے بھاگنے کی کوشش نہ کرو۔ کیونکہ ہو سکتا ہے۔ بھاگنے والے اپنے ساتھ وبا کی لڑائی لے جائیں اور اگلے علاقے میں وبا پھوٹ پڑے۔ نیز وبا کی مرض سے باہر ہونے والے لوگوں کو فرمایا کہ وہ متاثرہ مقام پر جانے کی کوشش نہ کریں، کہیں ایسا نہ ہو کہ وہ بھی

مرض میں مبتلا ہو جائیں۔ حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ کی روایت میں بھی آتا ہے کہ حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ دہائی مرض دس خطہ سے زیادہ نکلے اور نہ وہاں جانے کی کوشش کرو۔ بہر حال یہ احتیاطی تدابیر ہیں مگر جس کی موت لکھی جا چکی ہے۔ وہ رک نہیں سکتی۔ وہ جہاں بھی ہوگا، اُس پر موت طاری ہو جائے گی۔ اور پھر یہی حال ان بھاگنے والوں کا ہوا۔ فَقَالَ لَهُمُ اللَّهُ مُوتُوا اللَّهُ تعالیٰ نے اُن سے کہا کہ مر جاؤ۔ وہ جس وجہ سے بھی بھاگ کر پہاڑوں میں پہنچے اللہ نے اُن پر وہیں موت طاری کر دی، اور ان کا اپنے گھروں سے بھاگ نکلنا کچھ کام نہ آیا۔

دوبارہ زندگی

ان لوگوں کی دوبارہ زندگی کے متعلق کئی ایک روایتیں ہیں بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ اُس زمانہ میں اللہ تعالیٰ کے نبی حزقیل علیہ السلام موجود تھے جن پہاڑی دروں میں یہ لوگ پناہ گزین ہوئے وہاں حزقیل علیہ السلام کبھی کبھی عبادت کے لیے آتے تھے ان لوگوں کی موت کے بعد جب اللہ کے نبی حسب معمول عبادت کیلئے گئے، تو یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ اُن دروں میں ہر طرف لاشیں بکھری پڑی ہیں، انہیں علم نہیں تھا کہ کونسا واقعہ پیش آیا ہے انہوں نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے اُن مردوں کو دوبارہ زندگی عطا کر دی۔ ثُمَّ أَحْيَاهُمْ پھر اللہ تعالیٰ نے اُن کو زندہ کر دیا۔

اس مقام پر یہ بات ذہن میں رہے کہ یہ دوبارہ زندگی ایک غیر معمولی واقعہ تھا اور معجزانہ طور پر عطا ہوئی وگرنہ موت بعد دوبارہ میل ملاپ کی زندگی تو قیامت کبھی یلگی تاہم اس قسم کے غیر معمولی واقعات کچھ اور بھی ملتے ہیں۔ جیسے اسی سورۃ بقرہ میں عایل کا واقعہ ہے جسے اُس کے عزیزوں نے قتل کر دیا تھا۔ اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کی معرفت اللہ تعالیٰ نے درثائے مقتول کو گلے ذبح کرنے کا حکم دیا۔ اور گوشت کا ٹکڑا امرے کو لگانے سے وہ زندہ ہو گیا۔

ربا یہ سوال کہ یہ لوگ کتنا عرصہ موت کی آغوش میں بہنے کے بعد دوبارہ زندہ ہوئے۔ اس بات میں بھی مختلف اقوال ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ اُن کی موت کے آٹھ دن بعد حضرت حزقیل علیہ السلام آئے تو انکی دعا سے اُن لوگوں کو دوبارہ زندگی

ہلی بعض دوسری روایات سے معلوم ہوتا ہے۔ کہ اُن لوگوں کو مرنے کے لئے کافی عرصہ گزر چکا تھا۔ اور ان کے جسم گل سڑ چکے تھے صرف ہڈیاں باقی رہ گئی تھیں۔ جب کہ اللہ نے انہیں زندہ کیا۔

اسی آیت کریمہ کی تفسیر میں امام ابو جبر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ عذاب قبر کا انکار کرنے والے باطل پر ہیں۔ جس طرح اس قوم کے لوگوں کو اللہ تعالیٰ نے موت کے بعد پھر زندہ کر دیا تھا۔ اسی طرح ہر مرنے والے کو برزخی زندگی عطا کرتا ہے۔ نیکو کاروں پر انعام ہوتے ہیں۔ اور گنہگار سزا کے مستحق ٹھہرتے ہیں۔ بعض دوسری آیات اور احادیث مبارکہ میں اس بات کی صراحت موجود ہے۔ کہ برزخ میں بھی لوگوں کو سزا و جزا بھگتنا پڑتی ہے۔ اگرچہ حقیقی جزا و سزا تو قیامت کو ہی ہوگی، تاہم قبر میں بھی سکون و راحت یا سزا و عذاب ہوتا ہے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے فرمایا **ثُمَّ أَحْيَاَهُمْ** پھر اللہ نے انہیں دوبارہ زندہ کیا۔ بائبل کی روایتوں سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ موت و زندگی کے ان مراحل سے گزرنے کے بعد وہ حقیقت حال کو سمجھ گئے۔ اللہ سے معافی مانگی، جہاد میں حصہ لیا فلسطینیوں کے خلاف جواں مردی کے جوہر دکھائے اور آخر اُن کو فتح حاصل ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے غلبہ عطا کیا۔

موت و حیات قبضہ قدرت میں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی کی جتنی زندگی مقرر کی ہے۔ اس سے پہلے انسان کی موت واقع نہیں ہو سکتی اور نہ اس سے زیادہ زندگی حاصل ہو سکتی ہے۔ لہذا اس خوف سے جہاد سے گم نہ کہنا کہ موت آجائیگی، یہ حرام ہے۔ حضور کا فرمان ہے **لَنْ تَمُوتَ نَفْسٌ حَتَّى تَسْكُمَلَ بِرَفْهَا** جب تک انسان اپنی روزی پوری نہیں کر لیتا، اس کی موت نہیں آتی۔ لہذا حرام روزی تلاش نہیں کرنی چاہیے۔ اسی لیے فرمایا **فَاتَّقُوا اللَّهَ وَأَجْمِلُوا إِلَيْهِ** ڈرو اور اچھے راستے پر چلو۔ چاہے کتنے بڑے حادثات پیش آجائیں موت قبل از وقت نہیں آسکتی۔ کیونکہ اس کے لیے وقت متعین ہے۔ انسان کو اپنا فرض ادا کرتے

جہاد گزیر
حرام ہے

رہنا چاہیے خواہ جہاد میں سر دھڑکی بازی لگانا پڑے۔ جب تک اللہ کو منظور ہے اُسے موت نہیں آسکتی۔ نہ دشمن اس کا کچھ بگاڑ سکتا ہے۔

حضرت خالد بن ولیدؓ کی موت بستر پر واقع ہوئی، حالانکہ آپ نے زندگی میں جی بھر کر جہاد کیا۔ بڑی بڑی جنگوں میں لشکر کی کمانڈ کی۔ آپ کہا کرتے تھے، خدا تعالیٰ بزدل کی آنکھ کو ٹھنڈا نہ کرے، میرے جسم کا کوئی حصہ ایسا نہیں، جس پر تیرا تلوار یا نیزے کا زخم نہ ہو۔ آرزو تھی کہ میدان جہاد میں شہادت نصیب ہو، مگر افسوس کہ آج بستر پر موت آ رہی ہے بخاری شریف کی روایت میں ہے کہ حضرت زبیرؓ کی ساری زندگی بھی جہاد میں گزری، اُن کے جسم کا کوئی حصہ بھی زخموں سے خالی نہ تھا۔ حتیٰ کہ اعضا مستورہ پر بھی نیزے کا زخم تھا، مگر اُن کو بھی میدان جہاد میں شہادت کی موت نہ مل سکی۔ لہذا انسان کا فرض ہے کہ موت کے خوف کو دل سے نکال دے اور فریضہ جہاد کو انجام دیتا ہے۔

فَرَمَا إِنَّ اللَّهَ لَذُو فَضْلٍ عَلَى النَّاسِ ۖ اللَّهُ تَعَالَىٰ بَرُّ الْفَضْلِ كَرَمُ الْإِلَهِ
وَلَيْكِنَّا أَكْثَرُ النَّاسِ لَا يَشْكُرُونَ ۚ مگر اکثر لوگ اس کا شکر ادا نہیں کرتے۔ یعنی اس کی قدرت پر یقین نہیں رکھتے۔

الغرض! اللہ تعالیٰ نے یہ واقعہ بیان کئے کہ موت و حیات کی حقیقت کو سمجھا دیا۔ مسند احمد کی روایت میں آتا ہے کہ شیطان لوگوں کو بہکانے کی کوشش کرتا ہے۔ اگر کوئی مال خرچ کرنا چاہے تو شیطان کہتا ہے دیکھنا تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ اور اگر کوئی جہاد میں شرکت کا ارادہ کرتا ہے۔ تو اس کے کان میں کہتا ہے سوچ سمجھ لو، تمہارے بچے یتیم ہو جائیں گے۔ حالانکہ موت و حیات ایک اٹل حقیقت ہے۔ انسان کو لازم ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے عاید کردہ فریضہ کو انجام دیتا ہے اور موت کو خاطر میں نہ لائے۔

جہاد کے اس تمہیدی طور پر ذکر کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے جان و مال کے ذریعے جہاد کا صریح حکم دیا۔ وَقَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ اور اللہ کے راستے میں جہاد کرو۔ اس کے دین کی سر بلندی کے لیے دشمن کے سامنے سینہ سپر ہو جاؤ

کیونکہ موت و حیات تو اُمّی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ وقت معین سے پہلے نہ موت آسکتی ہے اور نہ وقت معین کے بعد زندگی باقی رہ سکتی ہے۔ وَأَعْلَمُوا أَنَّ اللَّهَ سَمِيعٌ عَلِيمٌ اور خوب جان لو کہ اللہ تعالیٰ ہر بات کو سُنتا ہے۔ ہر پکارنے والے کی پکار کو سُنتا ہے۔ اور ہر چیز کو جاننے والا ہے۔ کوئی شے اس کے احاطہ علم سے باہر نہیں، لہذا اپنی جان کو اللہ کی راہ میں پیش کر دو۔ اس کا حکم ہے جَاهِدُوا بِأَمْوَالِكُمْ وَأَنْفُسِكُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ اپنی جانوں کے ساتھ جہاد کرو۔ اگر اس مالک نے جان کی قربانی قبول کر لی۔ تو اس سے اچھا سودا کیا ہو سکتا ہے۔ اُس کا تو اعلان ہے إِنَّ اللَّهَ اشْتَرَىٰ مِنَ الْمُؤْمِنِينَ أَنْفُسَهُمْ وَأَمْوَالَهُمْ بِآنَ لَهُمْ الْجَنَّةُ اُس نے تو مومنوں کے جان و مال جنت کے بدلے خرید رکھے ہیں۔

جہاد بالمال

جہاد بالمال کے متعلق فرمایا مَنْ ذِي الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا کون ہے جو اللہ تعالیٰ کو قرض دیتا ہے۔ قرض حسن۔ اللہ کو قرض دینا یہ ہے کہ اُس کے راستے میں مال کے ذریعے جہاد کیا جائے اس کو قرض حسن اس لیے کہا گیا ہے کہ انسان کو یقین کامل ہو جائے کہ جہاد میں لگائی ہوئی اُسکی رقم ضائع نہیں جائے گی۔ اس کا بدلہ اُسے بڑھا چڑھا کر مل جائے گا فَيُضْعِفَ لَهُ أَضْعَافًا كَثِيرَةً اس قرض حسن کو اللہ تعالیٰ دُگن بلکہ کئی گنا کر دے گا۔ بخاری شریف کی روایت میں آتا ہے کہ اللہ کی راہ میں خلوص کے ساتھ دیا ہوا کھجور کا ایک دانہ، اُحد پہاڑ کے برابر بڑھ کر واپس ہو گا۔ اللہ تعالیٰ اس کے اجر و ثواب کو اس قدر بڑھا دیں گے جو شخص فی سبیل اللہ ایک پیسہ خرچ کرے گا، اُس کو کم از کم دس گنا فائدہ ملیگا کہ یہ قطعی قانون ہے مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امْتِلَافٍ البتہ جہاد میں خرچ ہونے والے مال کے بدلے کی کم از کم مقدار سات سو گنا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ اسلام کی کوٹن کی بلندی جہاد میں مضمر ہے۔

جہاد کی اہمیت

جہاد بالمال اور جہاد بالنفس دونوں بڑھی اہم حیثیت کے حامل ہیں۔ اگر جہاد سے گریز ہو گا، تو نہ عزت ہو گی اور نہ دین کا غلبہ باقی رہے گا۔ بے دین اور کافر

طاہقین غالب آجائیں، حضور علیہ السلام کے ارشاد سے اور قرآن کریم کے مطابق جہاد سے گریز کرنے والے فاسق ہو جاتے ہیں یا منافق ہو جاتے ہیں۔ ابو داؤد شریف کی روایت میں ہے کہ اگر تم جہاد کو ترک کر کے تجارت، کھیتی باڑی یا دوسرے کاموں میں منہمک ہو گئے یُسَلِّطُ اللہُ عَلَیْکُمُ الذِّلَّةَ تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دیگا حَتّٰی تَرْجِعُوْا اِلٰی دِیْنِکُمْ اور جب تک دین کی طرف واپس نہیں آؤ گے۔ اللہ تعالیٰ تم سے ذلت کو دور نہیں کریں گے۔ جب تک مسلمانوں میں جذبہ جہاد موجود تھا ان کو عزت اور غلبہ حاصل تھا۔ جب جذبہ جہاد بیکسی واقع ہوئی تو نہ عزت رہی نہ غلبہ غیر اقوام کی ملی بھگت سے مسلمان آپس کی جنگ و جدال میں مصروف ہیں۔ یہ انگریز می تہذیب کا اثر ہے۔ کہ ہم اپنے اکابرین کو بھول کر غیر اقوام کے گن کا بے ہیں۔ دنیا میں چالیس سے زیادہ اسلامی سلطنتیں ہونے کے باوجود ان پر سپر پاورز کا غلبہ ہے۔ اس قسم کے تجربات گذشتہ تاریخ میں بھی ملتے ہیں۔ جب عیسائیوں نے سپین (اندلس) پر قبضہ کیا تو وہاں مسلمانوں کی آبادی دو کروڑ کے قریب تھی۔ مگر بعد میں وہاں صرف گیارہ ہزار باقی رہ گئے، کچھ مائے گئے، کچھ جبراً عیسائی بنائیے گئے۔ یہ مسلمانوں کی آپس کی نا اتفاقی ہے کہ ہر جگہ ذلیل و خوار ہو رہے ہیں۔ ایران اور عراق کئی سالوں سے دست و گریباں ہیں۔ دونوں اسلامی ملکوں کی طاقت کمزور ہو رہی ہے۔ کوئی تعجب نہیں کہ کسی غیر مسلم قوم کو موقع مل جائے۔ اور یہ دونوں ان کے قبضہ میں چلے جائیں۔ روس اور امریکہ ہمیشہ ایسے موقعوں کی تلاش میں رہتے ہیں۔ افغانستان میں کیا ہوا۔ کچھ بعد دیگرے کتنے سربراہ قتل ہوئے، ملک کمزور ہو گیا۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ روس بزرگ دشمن قبضہ کیے بیٹھا ہے۔ "فَاعْتَبِرُوا یَا اُولِی الْاَبْصَارِ"

اللہ کے راستے میں خرچ کرنے سے متعلق ان دروس میں کسی دفعہ بیان آچکا قرضِ حسن ہے۔ یہاں اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے اتفاق فی سبیل اللہ کو قرضِ حسن سے تعبیر فرمایا ہے کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا اُس کو قرضِ حسن کے مترادف ہے جو وہ کئی گنا بڑھا کر دیگا۔ اس سے پہلے اس ضمن میں آچکا ہے وَلَا تَلْقُوا بِاَیْدِیْکُمْ

إِلَى التَّهْلُكَةِ مال کو روک کر اپنے آپ کو ہلاکت میں نہ ڈالو حضرت شیخ الحدیث فرماتے ہیں کہ قرض حسن وہ قرض ہے جسکی واپسی کا تقاضا نہ کیا جائے مقرض پر احسان نہ جتایا جائے اس کو حقیقتاً سمجھا جائے اور اس سے بدلہ نہ لیا جائے۔ اللہ تعالیٰ کو قرض مینے سے مراد جہاد میں خرچ ہے۔ یا غریبوں، محتاجوں کی اعانت ہے۔ اس کا بدلہ قطعی طور پر آخرت میں کئی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائیگا۔ ایک شخص نے جہاد کے لیے ایک اونٹنی پیش کی۔ جس کے ساتھ مہار بھتی اور اس پر پالان کسا ہوا تھا۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، بہت اچھا کام ہے۔ قیامت کے روز اسے ایسی سات سو اونٹنیاں ملیں گی۔

قبض و بطن بظاہر خرچ کرنے سے مال کم ہو جاتا ہے۔ مگر انسان کو جان لینا چاہیے وَاللّٰهُ يَقْبِضُ وَيَبْصُطُ قَبْضٌ وَبَصْطٌ تو اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ جس کا چاہتا ہے مال قبض کر لیتا ہے۔ اور جس کا چاہتا ہے بڑھا دیتا ہے۔ یہ اختیار اس نے اپنے پاس رکھا ہے۔ اور وہی بہتر جانتا ہے۔ کہ کس کو کتنا مال دینا ہے۔ چنانچہ وہ اُس کے مطابق رزق میں کمی اور زیادتی کرتا ہے۔ لہذا انسان کا یہ وہم کہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے سے اس کا مال کم ہو جائیگا، کچھ حقیقت نہیں رکھتا۔ انسان بڑا ناشکر گزار ہے۔ جب اللہ تعالیٰ عطا کرتا ہے۔ تو اُسے زور بازو کا نتیجہ کہتا ہے اور جب وہ کم کر دیتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ کو گالیاں دینا شروع کر دیتا ہے اور پھر کہتا ہے۔ کہ تنگی کے لیے میں ہی رہ گیا تھا۔ خدا پر شکوہ کرتا ہے۔ مگر اپنے کرتوت کو نہیں دیکھتا۔ کہ میرے افعال کیسے ہیں فرمایا یہ بات میں ختم ہونے والی نہیں ہے۔ وَلَا لِيَدٍ تُرْجَعُونَ تم سب کو اُسی مالک الملک کی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ لہذا جہاد بالنفس اور جہاد بالمال ہر دو طریقوں سے اللہ کو راضی کرو۔

الْبَقَرَةُ

آیت ۲۴۶

سُورَةُ بَقَرَةُ ۲

درس یکصد چارہ (۱۰۴)

اَلَمْ تَرَ اِلَى الْمَلَا مِنْ بَنِي إِسْرَٰئِيلَ مِنْ اٰمَدَ مُوسٰى هٰذَا
 قَالُوْا لِنَبِيِّۖہِمْ اَلْہُمْ اَبْعَثْ لَنَا مَلٰکًا نُّقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ
 قَالَ ہَلْ عَسَیْتُمْ اَنْ کُتِبَ عَلَیْکُمْ الْقِتَالُ اَلَّا
 تُقَاتِلُوْا قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نُقَاتِلَ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ وَقَدْ
 اُخْرِجْنَا مِنْ دِیَارِنَا وَاَبْنَاۤیَہٗا فَلَ مَا کُتِبَ عَلَیْہِمْ
 الْقِتَالُ تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِیْلًا مِّنْہُمْ ط وَاللّٰہُ عَلِیْمٌ بِالظّٰلِمِیْنَ ﴿۲۴۶﴾

تو جہدہ کیا آپ نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف نہیں دیکھا، موسیٰ علیہ السلام
 کے بعد، جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ آپ ہمارے لیے ایک بادشاہ مقرر کر دیں
 تاکہ ہم اللہ کی راہ میں لڑیں۔ اُس پیغمبر نے کہا کہ اگر تم پر لڑائی فرض کر دی جائے تو شاید
 تم نہ لڑو۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں کیا ہے کہ ہم نہ لڑیں حالانکہ ہم اپنے گھروں سے نکالے
 گئے ہیں اور اپنی اولادوں سے علیحدہ کیے گئے ہیں۔ پھر جب اُن پر لڑائی فرض کر
 دی گئی تو اُن لوگوں نے روگردانی کی مگر بہت تھوڑے لوگوں نے ان میں سے۔

اور اللہ خوب جانتا ہے ظلم کرنے والوں کو ﴿۲۴۶﴾

گزشتہ درس کی آیت کریمہ جہاد کے مسئلہ میں بمنزلہ تمہید تھی۔ اس میں جہاد بالمال
 اور جہاد بالنفس کی ترغیب دی گئی تھی۔ اور اس سلسلہ میں ایک واقعہ کا ذکر بھی ہوا۔ جب کہ
 کچھ لوگ جہاد کے خوف سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے انہیں ہلاک
 کر دیا۔ اور بنی زمانہ کی دُعا سے اللہ تعالیٰ نے انہیں پھر زندہ کیا۔ اس سے ثابت
 ہوا تھا کہ لڑائی سے راو فرار اختیار نہیں کرنی چاہیے۔ کیونکہ موت و حیات تو
 قبضہ قدرت میں ہے۔ موت اپنے وقت معینہ پر ہی آتی ہے۔ اس میں تقدیم و

و تاخیر کا کوئی امکان نہیں۔ پھر اسی آیت کے اگلے حصے میں لڑائی کا واضح حکم بھی دیا۔ کیونکہ جو قوم جہاد سے جی چراتی ہے۔ وہ مغلوب ہو کر قعرِ مذلت میں جا گرتی ہے۔

آج کے درس میں جہاد ہی کے متعلق تنظیم کا تذکرہ ہے جہاد ایک اجتماعی مسئلہ ہے اور اس کے لیے تنظیم کا ہونا نہایت ضروری ہے۔ اس کے بغیر کامیابی ممکن نہیں۔ گویا یہاں سے اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کے سیاسی نظام کے اصول و قواعد بیان فرمائے ہیں اور اس کے طریق کار کی وضاحت فرمائی ہے۔

دنیا بھر کا سیاسی نظام اجتماعییت سے تعلق رکھتا ہے۔ قرآن پاک نے اسلام کے سیاسی نظام کے خلاف سورۃ اقصیٰ کے علاوہ بعض دوسری سورتوں مثلاً سورۃ صف، سورۃ حج، سورۃ انفال اور سورۃ توبہ وغیرہ میں بیان کیے ہیں بلکہ ان سورتوں کے بعض مقامات تو اس نظام کے متعلق مستقل ابواب کی حیثیت رکھتے ہیں۔ چونکہ یہ ایک اجتماعی مسئلہ ہے اس لیے اس نظام کو چلانے کے لیے حاکم یا امیر کا تقرر لازمی ہے۔ خصوصاً جہاد جیسے اجتماعی کام کے لیے امیر لشکر کا ہونا ضروری ہے۔ جس کی سرکردگی میں قوم جہاد میں حصہ لے سکے۔ بخاری، مسلم اور حدیث کی دیگر کتابوں میں امارت یا خلافت پر باب موجود ہیں۔ اور اس میں مسلمانوں کی راہنمائی کے لیے مکمل تعلیم ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے بنی اسرائیل کی ایک مثال کے ذریعے اس مسئلہ کو سمجھایا ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام کی وفات کے کافی عرصہ بعد تک بنی اسرائیل کے حالات درست رہے۔ اگرچہ اس عرصہ میں کہیں کہیں کوئی قباحت بھی پائی گئی مگر مجموعی طور پر ان کے حالات اچھے رہے۔ وہب ابن منبہ کی روایت کے مطابق بنی اسرائیل کے حالات بڑی دیر بعد بگڑنے شروع ہوئے۔ اُن میں بھی مشرک کی بیماری پیدا ہو گئی۔ انبیاء کی نافرمانی اور ان کا قتل قرآن پاک میں مذکور ہے۔ فسق و فجور بہت بڑھ گیا۔ جس طرح اس زمانہ میں مسلمانوں میں ہر قسم کی برائیاں پائی جاتی ہیں اس زمانہ میں بنی اسرائیل طرح طرح کی خرابیوں میں ملوث تھے۔ جب وہ نیکی کو چھوڑ کر بدی کی طرف راغب ہو گئے، تو ان کا زوال شروع ہو گیا۔ اُس زمانے میں عمالقہ بڑی طاقتور قوم تھی۔ انہوں نے بنی اسرائیل

اسلام کا
سیاسی نظام

بنی اسرائیل
کا زوال

کے بہت سے علاقوں پر قبضہ کر لیا۔ یہ قوم بنی اسرائیل کی قہریمی ہمسایہ تھی، لہذا وہ آسانی سے ان پر غالب آگئے اُن کے مردوں کو قتل کیا، عورتوں کو لونڈیاں بنایا۔ اسرائیلی روایات میں آتا ہے کہ عمالقہ نے تیس ہزار فوجوں کو لونڈیاں بنالیا۔

حضرت سمویل
علیہ السلام
(SAMUEL)

حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد نبوت کا سلسلہ حضرت ہارون علیہ السلام کی اولاد میں جاری رہا۔ حتیٰ کہ لاوی خاندان میں کوئی نیک آدمی باقی نہ رہا۔ تمام کے تمام مرد نالائق اور نابکار تھے۔ ایک نیک آدمی دشمنوں کے مقابلہ میں مارا گیا، اس کی بیوی اُس وقت حاملہ تھی۔ قحط الرجال کے اس زمانہ میں اُس عورت کو دعا کی کہ مولاکریم! مجھے نیک اور صالح بیٹا عطا کر۔ اتفاق کی بات کہ اللہ تعالیٰ نے اسے بیٹا عطا کر دیا۔ جبکہ نام اُس نے سمائل یا سمویل رکھا۔ یہ عبرانی زبان کا لفظ ہے جس کا معنی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے دعا کو سن لیا اور بیٹا عطا کیا گو یہ لفظ اسماعیل کا ہم معنی ہے جب یہ لڑکا بڑا ہوا، تو اللہ تعالیٰ نے اُسے بنی بنایا اس پر یہی نام ل فرمایا یہ واقعہ جریان ہوا ہے یہی بنی سمویل علیہ السلام کے زلنے کا واقعہ ہے اس کے بعد حضرت داؤد علیہ السلام مسیح علیہ السلام سے گیارہ یا تیرہ سو سال پہلے مبعوث ہوئے اس کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام تہریت لائے جو بنی اسرائیل کے آخری نبی ہیں۔ الغرض! بنی اسرائیل اپنے نبی سمویل علیہ السلام کے پاس بیت المقدس میں جمع ہوئے۔ اور اُن سے درخواست کی کہ ہمارے لیے تنظیم بنائیں ہمارا امیر مقرر کریں جس کی سرکردگی میں ہم دشمن کا مقابلہ کر کے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے سکیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔ اَلَمْ تَدَا إِلَى الْمَلِكِ مِنْ بَنِي إِسْرَءِیْلَ مَنْ جَعَلَ مَوْسٰی
کیا آپ نے بنی اسرائیل کی ایک جماعت کی طرف نہیں دیکھا۔ موسیٰ علیہ السلام کے بعد اِذْ قَالُوا لِنَبِیِّ لَہُمْ اَبْعَثْ لَنَا مَلِکًا جب انہوں نے اپنے نبی سے کہا کہ ہمارے لیے ایک امیر یا بادشاہ مقرر کر دیں جس کی سرکردگی میں لَقَاتِلْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰہِ ہم اللہ کی راہ میں جہاد کریں۔

لفظ ملک
کی تشریح

لفظ ملک وسیع معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ عربی زبان میں ملک، سردار، امیر، حاکم یا خوشحال آدمی کے لیے بولا جاتا ہے۔ جیسا کہ حضرت عبداللہ بن عمر رضی اللہ عنہما کے

پاس کچھ لوگ آئے، اپنی مالی حالت، کا تذکرہ کیا اور مدد کی درخواست کی۔ منسربانیا اگر تم چاہتے ہو تو تمہارے ملک (حاکم) کے پاس سفارش کیے دیتا ہوں، اور اگر چاہو تو تمہارے پاس بھڑو حسب توفیق ہم تمہاری خدمت کریں گے، یا اگر چاہو تو صبر کرو دیکھو صبر کا نتیجہ آخرت میں بہترین ہوگا۔ چنانچہ ان لوگوں نے سوال کرنے کی بجائے صبر کو پسند کیا۔ یہاں پر ملک بمعنی حاکم استعمال ہوا ہے۔

ایک اور شخص آیا۔ کہنے لگا میرے حالات بہت خراب ہیں۔ میری کچھ مدد کریں آپ نے فرمایا۔ کیا تمہارے پاس مکان ہے، کہا ہے۔ پھر پوچھا تمہاری بیوی ہے۔ اُس نے کہا کہ ہاں بیوی لگی ہے۔ پھر آپ نے دریافت کیا۔ تیرے پاس کوئی خادم بھی ہے تو اُس نے اس بار بھی اثبات میں جواب دیا۔ حضرت عبداللہ بن عمرؓ نے فرمایا کہ تیرے پاس مکان ہے۔ تیری بیوی موجود ہے۔ خدمت کے لیے لوکر بھی ہے۔ تو پھر تو کیسا فقیر ہے۔ اَنْتَ مِنَ الْمُلُوكِ تو تو بادشاہوں میں سے ہے۔ مطلب یہ کہ تو خوشحال آدمی ہے جس کے پاس ضروریات کی یہ چیزیں موجود ہیں۔ وہ ملک کہلانے کا مستحق ہے۔

ملوکیت کا تصور

بہر حال عربی زبان میں ملک کے مختلف معانی ہیں جن میں بادشاہ یا امیر بھی شامل ہے صاحب امر یعنی حاکم وقت بھی مراد ہے۔ مگر ملوکیت کا جو تصور اس وقت دنیا میں موجود ہے۔ اسلام ہرگز اس کی تائید نہیں کرتا۔ آج ہم سمجھتے ہیں کہ بادشاہ وہ ہے جو کسی ملک کے ہر سیاہ و سفید کا مالک ہے۔ جو چاہے حکمران اس کی زبان سے نکلا ہو ہر لفظ قانون کا درجہ رکھتا ہو۔ مگر ملوکیت کا یہ تصور غیر فطری اور اسلامی تعلیم کے سرسرمنافی ہے اور ڈکٹیٹر شپ بھی اسی حاکمیت کا نام ہے جس کی اسلام اجازت نہیں دیتا۔ اسلام نے اپنے ماننے والوں کو شورا کی نظام سیاست عطا کیا ہے۔ اسی سلسلہ میں اللہ تعالیٰ نے بہت سی آیات نازل فرمائی ہیں۔ جن کے مطالعہ سے واضح ہوتا ہے کہ اسلام کا سیاسی نظام (POLITICAL SYSTEM) کیا ہے۔ ان کا اثر کیا ہو، اس کی کیا ذمہ داریاں ہیں۔ اور وہ کن امور کا پابند ہے۔ اسی طرح مسلمانوں کی

جماعت کن اوصاف کی حامل ہونی چاہیے۔ اس کے حقوق و فرائض کیا ہونگے وغیرہ وغیرہ مگر افسوس کہ اُموی دور کے بعد مسلمانوں میں بھی غیر اسلامی تصور ملکیت سرایت کر گیا۔ اور یہ آج بھی مسلمانوں میں موجود ہے۔

ہمارے قریبی زمانہ میں چودہویں افضل حق بڑے فاضل آدمی ہوئے ہیں۔ زمین و مکانات کی صورت میں لاکھوں کی جائیداد کے مالک تھے۔ انگریزی دور میں اسمبلی کے ممبر تھے۔ سرکاری ملازمت میں انپکٹر بھی ہے۔ مگر انگریزوں کی غلامی کا طوق اتار کر ان کے خلاف جہاد میں شامل ہو گئے۔ مجلس احرار سے منسلک ہوئے۔ زمین و مکان ہر چیز اللہ کی راہ میں قربان کر دی، حتیٰ کہ ان کا جنازہ مجلس احرار کے دفتر سے اٹھایا گیا۔ آپ نے بہت سی کتابیں لکھی ہیں۔ جن میں حضور علیہ السلام کی سیرت طیبہ پر بھی ایک نہایت عمدہ کتاب ہے۔ فرقہ داریت کے خلاف کتاب لکھی، سورۃ فاتحہ کی تشریح قلبند کی۔ آپ نے ملکیت کے متعلق ایک نہایت عمدہ بات کی ہے۔ فرماتے ہیں: "افسوس کہ بنو امیہ کے بعد مسلمانوں نے اسلام کا اجتماعی اور شورائی نظام چھوڑ کر اس کی جگہ شہنشاہیت کا ٹاٹ بچھا دیا ہے۔ وہ ملکیت اور شہنشاہیت جو قصور و کسر ہی کا طرہ امتیاز تھا اور جس کو مٹانے کے لیے اللہ تعالیٰ نے اپنے آخری نبی کو مبعوث فرمایا۔ یہی نظام اپنی پوری آب و تاب کے ساتھ مسلمانوں میں پھر رائج ہے۔"

کابل کے امیر امان اللہ خان مرحوم کا باپ امیر حبیب اللہ خاں مرحوم بھی اپنے وقت کا بادشاہ تھا۔ اس کے متعلق حضرت مولانا عبد اللہ شہنشاہی لکھتے ہیں۔ کہ آخری دور میں ایسی حالت اس حد تک پہنچ چکی تھی۔ کہ متعدد بیویاں (تین صد بیویاں) رکھنے کے باوجود شریف لوگوں کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ مارا تھا۔ ایسا عیاش آدمی تھا۔ بڑی حیثیت کا مالک تھا مگر اس قسم کی حرکتیں شہنشاہیت کا خاصہ ہوتا ہے۔ آخر وہ قتل ہوا، مگر قاتل کا پتہ بھی نہ چل سکا۔ باقی نوابوں اور بادشاہوں کا بھی یہی حال ہے۔ نواب حیدر آباد جب مراٹوں کے وقت اس نے بھی تقریباً پورے دو سو عورتیں (درشتہ) اکٹھی کر رکھی تھیں۔

بہر حال بنی اسرائیل نے حضرت یسویٰؑ سے کہا کہ آپ ہمارے لیے کوئی امیر مقرر
یا ملک مقرر کر دیں، جس کی کمان میں ہم دشمن سے جنگ کر سکیں۔ اگرچہ اُس وقت اللہ
کے نبی موجود تھے مگر وہ کافی بڑھے اور کمزور ہو چکے تھے۔ اور جنگ میں نفس نفیس
شرکت سے معذور تھے۔ البتہ ہدایات دینے کے لیے وہ کافی تھے۔ لہذا انہی
قوم نے عرض کیا کہ ہمارے لیے کوئی قابل امیر مقرر کر دیں، جو جنگ میں ہماری قیادت
کر سکے۔ ظاہر ہے کہ جنگ کرنے کے لیے جماعت کی ضرورت ہوتی ہے۔
اور اسلام میں جماعت کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ جماعت کے بغیر سیاسی نظام چل
ہی نہیں سکتا۔ جیسے فرمایا لَا آسَلَامَ إِلَّا بِالْجَمَاعَةِ یعنی جماعت کے بغیر اسلام کا
کوئی تصور نہیں اور لَا جَمَاعَةَ إِلَّا بِالْأَمْرِ اور امیر کے بغیر جماعت کسی نہیں
اسی لیے فرمایا کہ سفر میں اکیلا آدمی نہ جائے۔ اس کے ساتھ جماعت ہونی چاہیے۔
ایک اور دو _____ شیطان میں بیگم تین کی تعداد
جماعت ہے۔ اور اگر چار آدمی جمع ہو جائیں تو فرمایا۔ خَيْرُ الْجَمَاعَةِ اَرْبَعَةٌ
بہتر جماعت چار آدمیوں کی ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ جب سفر پر روانہ ہونے لگو
تو اپنے میں سے ایک کو امیر مقرر کر لو، اسکی سرکردگی میں، اس کی ہدایت کے مطابق عمل کرو۔
انفرادی حالت میں شیطان کے غلبے کا خدشہ ہے۔ اس لیے سفر بھی بحیثیت جماعت
اختیار کرو۔ شیطان کے شر سے محفوظ رہو گے۔

الغرض! جب قوم نے خود نبی سے درخواست کی کہ اُن کے لیے ایک امیر
مقرر کر دیا جائے جسکی سرکردگی میں وہ جہاد کریں۔ قَالَ هَلْ عَسَيْتُمْ اِنْ كُنْتُمْ
عَلَيْكُمْ الْقِتَالُ اَلَّا تَقَاتِلُوْا تُوْنَبٰی نے کہا کہ اگر تم پر لڑائی فرض کر دی جائے
تو شاید تم نہ لڑ سکو، نبی نے اس خدشہ کا اظہار کیا۔ کہ جنگ فرض ہونے کے بعد اگر
تم نے اس میں لیت وعل کیا۔ تو اللہ تعالیٰ کی پکڑ میں آ جاؤ گے۔ لہذا فرضیت جہاد
سے پہلے خوب اچھی طرح سوچ سمجھ لو۔ قَالُوْا وَمَا لَنَا اَلَّا نَقَاتِلَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ
قوم کہنے لگی کہ ہمیں کیا ہے۔ کہ ہم لڑائی نہ کریں اللہ کے راستے میں وَقَدْ اُخْرِجْنَا

مِنْ دِيَارِهَا حَالَانِھُمْ ہمارے گھروں سے نکال دیے گئے ہیں۔ دشمن نے ہماری زمین اور ہمارے مکانات پر قبضہ کر لیا ہے وَاَبْکَدْنَا اور انہوں نے ہمیں ہماری اولادوں سے جدا کر دیا ہے۔ ہماری عورتوں کو لونڈیاں اور بچوں کو غلام بنالیا ہے۔ اب نہ لڑنے کی ہمارے پاس کوئی وجہ باقی نہیں رہی۔ لہذا ہم ضرور اپنے دشمن سے جنگ کر رہے ہیں گے۔ آپ ہمارے لیے امیر لشکر مقرر کر دیں۔

بنی اسرائیل کی روگردانی

بنی اسرائیل کے اس قدر اصرار کے بعد فَلَمَّا کَتَبَ عَلَیْھُمُ الْقِتَالَ جب اُن پر لڑائی فرض کر دی گئی، تَوَلَّوْا اِلَّا قَلِيْلًا مِّنْھُمْ تو ان میں سے ایک قلیل تعداد کے سوا سب اپنے وعدے سے پھر گئے۔ انہوں نے جہاد سے منہ موٹ لیا۔ اس کی تفصیلات اگلے رکوع میں آرہی ہیں۔ تاہم آگے وہ بیان بھی آرہا ہے۔ جس میں تھوڑے لوگوں نے ہمت اور جواغردی سے دشمن کا مقابلہ کیا اور پھر وہ غالب آئے۔

آج مسلمانوں کی حالت بھی اُس زمانے کے بنی اسرائیل سے کم خراب نہیں۔ دنیا بھر کے مسلمانوں کے حالات اس قدر بگڑے ہوئے ہیں۔ کہ اصلاح کی کوئی صورت نظر نہیں آتی۔ وجہ ایک ہی ہے کہ جہاد سے روگردانی کر رہے ہیں۔ دوسروں کے دست نگر ہیں مگر آپس میں دست و گریبان ہیں۔ ذرا غور کریں فلسطینیوں کے ساتھ کیا کچھ ہو رہا ہے۔ اُن کی ہزاروں لڑکیاں غیر مسلموں کے قبضہ میں چلی گئی ہیں۔ انہیں ہسنے کے لیے زمین پر کوئی ٹھکانہ میسر نہیں آرہا ہے۔ فِیْ اَسْنِیِّ عِیْسٰی اکثریت نے مسلمان اقلیت کا عرصہ حیات تنگ کر رکھا ہے۔ وہ مسلمانوں کو مار دینے کی ڈاکو کتے ہیں۔ حالانکہ وہ بیچارے قلیل تعداد میں ہیں مگر انہیں بھی جینے کا حق نہیں دیا جا رہا ہے۔ قبرص میں بھی مسلمانوں کا یہی حال ہو رہا ہے۔ صرف چند سال پہلے چالیس ہزار قبرصی ترکوں کو ختم کر دیا گیا۔ اب انہوں نے ایک جزیرہ میں پناہ لے رکھی ہے۔ مگر عیسائی قوتیں انہیں وہاں بھی اکٹھا نہیں دیکھ سکتیں۔ ان کی حکم پر ہے۔ کہ کسی طرح اِن کو علیحدہ علیحدہ کر کے اِن کی جمعیت کو ختم کر دیا جائے۔

فرمایا وَاللّٰہُ عَلَیْھُمْ بِالْظَلِمِیْنَ اَللّٰہ تعالیٰ ظالموں کو خوب جانتا ہے۔ ظالم اور عادل

ظالم تبدیل ہوتا ہے اور جہاد سے جی چراتا ہے۔ وہ خود بھی کوئی اچھا کام نہیں کر سکتا بلکہ برائی کی طرف رغبت رکھتا ہے۔ اُس سے اچھے نظام کی توقع نہیں کی جاسکتی۔ ہمارے لیڈر ظالم ہیں۔ اس قسم کے مولویوں، مشائخ، امیروں، تاجروں سے اچھائی کی کیا امید ہو سکتی ہے البتہ اچھائی کی امید عادل شخص سے ہو سکتی ہے۔ وہی نظام اسلام قائم کر سکتا ہے۔ وہی جہاد کر سکتا ہے۔ اور قوم کو ذلت سے نکال کر عزت و آبرو کی زندگی دے سکتا ہے۔

اس ایک جملہ **وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ** میں ان سب چیزوں کی طرف اشارہ ہے۔

اہم بیضاوی منافقین کے متعلق لکھتے ہیں۔ جب انہیں کہا جاتا ہے کہ زمین میں فساد نہ کرو، تو وہ کہتے ہیں کہ ہم تو اصلاح کرنے والے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ان کا راز فاش کرتے ہوئے فرمایا **اَلَا اَنتُمْ هُمْ الْمُفْسِدُونَ** اصل فساد ہی لوگ ہیں ان کا اصلاح کا دعویٰ محض فریب ہے۔ کفر، شرک، معصیت، حدود اللہ کو توڑنا، بدعت کا اجراء، چوری، ڈاکہ، قتل، دوسروں کے حق کا ضیاع وغیرہ سب ظلم کی مختلف شاخیں ہیں۔ ظالم سے اسی قسم کے افعال سرزد ہوں گے۔ البتہ جب عادل حاکم آئے گا، تو تمام برائیاں ختم ہو جائیں گی۔ حق و عدل کا دور دورہ ہوگا کہ عدل نظام اسلام میں سب سے بڑا ستون ہے۔ حضرت علیؓ سے روایت ہے کہ ایمان چار ستونوں پر قائم ہے یعنی صبر، عدل، جہاد اور یقین، لہذا عادل شخص کے ایمان کی گواہی دی جاتی ہے۔ اور ظالم آدمی بے ایمان اور کافر ہوتا ہے۔ اسی لیے فرمایا **وَاللّٰهُ عَلِيمٌ بِالظَّالِمِينَ** اللہ تعالیٰ ان ظالموں کو اچھی طرح جانتا ہے۔

وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ إِنَّ اللَّهَ قَدْ بَعَثَ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا
 قَالُوا أَنَّى يَكُونُ لَهُ الْمُلْكُ عَلَيْنَا وَنَحْنُ أَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ
 وَلَمْ يُؤْتَ سَعَةً مِّنَ الْمَالِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ
 وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ وَاللَّهُ يُؤْتِي مُلْكَهُ مَن
 يَّشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ﴿۲۴۸﴾ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ
 إِنَّ آيَةَ مُلْكِهِ أَن يَأْتِيَكُمُ التَّابُوتُ فِيهِ سَكِينَةٌ
 مِّن رَّبِّكُمْ وَبَقِيَّةٌ مِّمَّا تَرَكَ آلُ مُوسَىٰ وَآلُ هَارُونَ
 تَحْمِلُهَا الْمَلَائِكَةُ ۚ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لَّكُمْ إِن كُنتُمْ
 مُؤْمِنِينَ ﴿۲۴۹﴾

۴۵۹

ترجمہ: اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا: بیشک اللہ تعالیٰ نے تمہارے لیے
 طالوت کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ وہ کہنے لگے، ہم پر اُس کی حکومت کیسے ہوگی۔ اور
 ہم اُس سے حکومت کے زیادہ ستمی ہیں۔ اور وہ مال میں وسعت بھی نہیں دیا گیا۔ اُنکے
 پیغمبر نے اُن سے کہا، بیشک اللہ تعالیٰ نے اُسے تمہارے اوپر منتخب کیا ہے
 اور اس کو علم اور جسم کی فراخی کے لحاظ سے زیادہ کیا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
 جس کو چاہے بادشاہی دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا اور سب کچھ جاننے
 والا ہے ﴿۲۴۹﴾ اور اُن کے نبی نے اُن سے کہا کہ بیشک اُس کی بادشاہی کی

نشانی یہ ہے کہ تمہارے پاس ایک صندوق آئیگا۔ جس میں تمہارے رب
 کی طرف سے دل کی تسلی ہے۔ اور کچھ بھی ہوئی چیزیں ہیں۔ جن کو موسیٰ اور
 ہارون علیہما السلام کی اولاد نے چھوڑا ہے۔ اس کو فرشتے اٹھا کر لائیں گے

بیشک اس میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں اگر تم یقین رکھتے والے ہو ﴿۲۶۸﴾

گذشتہ درس میں یہ بیان ہو چکا ہے کہ حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بنی اسرائیل میں بگاڑ پیدا ہو گیا۔ وہ مغلوب ہو گئے۔ دشمن نے اُن کے بہت سے علاقے پر قبضہ کر لیا۔ اُن کے بچوں کو غلام اور عورتوں کو لونڈیاں بنالیا۔ انہوں نے بنی وقت حضرت موسیٰ علیہ السلام سے عرض کیا کہ ہمارے لیے کوئی بادشاہ مقرر کر دیں۔ جس کی سرکردگی میں ہم دشمن سے جنگ کر کے اپنے کھوئے ہوئے علاقے واپس لے سکیں اور اپنے گھر و دل کو لوٹ سکیں نیز اپنے مردوں اور عورتوں کو دشمن کی غلامی سے نجات دلائیں۔ ان کے نبی نے فرمایا کہ دیکھنا کہیں اپنے وعدے سے پھر نہ جانا۔ انہوں نے وعدہ کیا کہ ایسا نہیں ہوگا۔ ہم آپ کی طرف سے مقرر کیے گئے بادشاہ یا امیر کی اطاعت کریں گے۔ آج کے درس میں بنی اسرائیل کے لیے طاقتور بادشاہ کے تقرر اور بنی اسرائیل کے انکار کا بیان آرہا ہے۔

طاقتور بطور
بادشاہ

ارشاد ہوتا ہے۔ وَقَالَ لَهُمْ نَبِيُّهُمْ اِنَّ كَيْدَ بَشَرٍ لَّدُنَّ اللّٰهِ فَذَبْعْتُ لَكُمْ طَالُوتَ مَلِكًا بِشَاطِئِ اللّٰهِ تَعَالٰی نے تمہارے لیے طاقتور کو بادشاہ مقرر کیا ہے۔ لہذا تم اس کی سرکردگی میں اپنی تنظیم قائم کرو اور پھر دشمن سے جہاد کرو۔ مگر اُس قوم کے آسودہ حال لوگوں کو طاقتور کا انتخاب پسند نہ آیا۔ قَالُوا كُنْ اَلٰی سِكْرٍ نَّ لَكَ الْمُلْكُ عَلَيْنَا طَالُوتَ ہمارا بادشاہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ تو غریب اور کمزور حیثیت کا مالک ہے۔ وہ ہمارا بادشاہ بننے کا اہل نہیں وَنَحْنُ اَحَقُّ بِالْمُلْكِ مِنْهُ اس سے زیادہ بادشاہ بننے کا ہمارا حق ہے۔ وَلَمْ يُوْتِ سَعْدٌ مِّنَ الْمَالِ اِنَّ كَيْدَ بَشَرٍ لَّدُنَّ اللّٰهِ تَعَالٰی بھی نہیں ہے۔ وہ ہمارا سردار یا امیر بننے کے بالکل اہل نہیں ہے۔

در اصل حضرت موسیٰ علیہ السلام کے بعد بادشاہی تو زیادہ تر یہود کے خاندان میں رہی جن میں سے حضرت موسیٰ علیہ السلام بھی تھے۔ اور نبوت زیادہ تر لاوی خاندان میں رہی جس سے حضرت ہارون علیہ السلام تھے۔ یہ طاقتور بن کنش حضرت یوسف علیہ السلام

کے چھوٹے بھائی بن یامین کی اولاد سے تھا اور یہ نسبتاً چھوٹا خاندان سمجھا جاتا ہے۔ مگر حضرت سمویل علیہ السلام نے اللہ کے حکم سے اُسے بنی اسرائیل کا بادشاہ مقرر فرما دیا ان کے خاندان کو دیگر خاندانوں کی طرح عزت حاصل نہیں تھی، یہ کم تر لوگ تھے۔ خود طاووت کپڑے رنگنے کا کام کرتا تھا۔ بعض کہتے ہیں کہ نہایت ہی تھا۔ لہذا بنی اسرائیل اس کے بطور امیر مقرر پر رضا مند نہ ہوئے۔ دراصل مالی کمزوری نبوت کو تسلیم کرنے میں ہمیشہ رکاوٹ رہی ہے۔ جب بھی کسی نبی نے نبوت کا دعوے کیا۔ تو اس کی قوم نے یہی جواب دیا کہ تو تو ہماری قوم کا گھٹیا آدمی ہے۔ تیرے پاس نہ مال و دولت ہے۔ نہ زمین و مکانات ہیں۔ نہ سونا چاندی ہے۔ تو نبی کیسے ہو سکتا ہے۔ یہی چیز طاووت کو بادشاہ تسلیم کرنے میں مانع ہوئی کیونکہ وہ شخص قوم کا ایک ادنیٰ فرد سمجھا جاتا تھا۔ اور دنیاوی مال و متاع سے محروم تھا۔

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب بنی اسرائیل نے اپنے پیغمبر سے امیر مقرر کرنے کی درخواست کی، اُس وقت طاووت کی عمر تیس سال کے قریب تھی۔ یہ سب لوگ پیغمبر کے پاس جمع تھے اور اُن سے سوال و جواب کر رہے تھے طاووت کے باپ کا گدھا گم ہو گیا تھا، وہ تلاش کرتا ہوا اُس طرف جانکلا جہاں بنی اسرائیل کے لوگ جمع تھے۔ چنانچہ وہ بھی اُن کے قریب پہنچ گیا۔ اُدھر اللہ کے نبی کو وحی کے ذریعے خبر دی جا چکی تھی۔ کہ بنی اسرائیل کا بادشاہ ایسے شخص کو مقرر کیا جائے۔ جس کا قد نبی کے پاس موجود لالٹھی کے برابر ہو۔ نیز یہ کہ وہ آدمی آرم ہے اُس کے سپینچے پر نبی کے پاس خوشبودار تیل والی شیشی میں جوش پیدا ہو گا۔ لہذا جس شخص پر یہ نشانیاں صادق آجائیں اُسے امیر مقرر کر لیا جائے۔ جب طاووت اُس مجمع میں پہنچا تو تیل کی شیشی میں جوش پیدا ہو گیا۔ جب اُس کا قد پانچواں لالٹھی کے برابر نکلا، چنانچہ اللہ کے نبی نے طاووت کو بادشاہ یا امیر مقرر کر دیا مگر بنی اسرائیل نے اُسے اپنا امیر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔

ہی امارت کے لیے کافی نہیں بلکہ اس کام کے لیے اللہ تعالیٰ کے ہاں کچھ اصول مقرر ہیں جن کی بناء پر کسی شخص کو امارت کے عہدے پر فائز کیا جاتا ہے۔ سب سے پہلی بات جو پیغمبر نے کہی قَالَ إِنَّ اللَّهَ اصْطَفَاهُ عَلَيْكُمْ اس شخص کو اللہ تعالیٰ نے منتخب فرمایا ہے۔ لہذا اس میں کسی کے ذاتی اختلاف کو دخل نہیں ہونا چاہیے اور دوسری بات یہ کہ وَزَادَهُ بَسْطَةً فِي الْعِلْمِ وَالْجِسْمِ اللہ نے اُسے علم اور جسم میں وسعت دی ہے۔ یعنی اس میں یرغوبی ہے کہ وہ علم میں بھی تم سے زیادہ ہے اور جسمانی طاقت کے لحاظ سے بھی تم میں سے زیادہ قوی ہے۔ یہاں پر علم سے مراد سیاسی علم یعنی نظام حکومت چلانے کی صلاحیت ہے۔ جہاں تک دینی علم کا تعلق ہے۔ وہ تو نبی کے پاس تھا، تاہم اللہ تعالیٰ نے سیاسی علم طاوت کو عطا کیا تھا۔ امیر کے لیے جسمانی طور پر صحت مند ہونا بھی ضروری ہے۔ کیونکہ بغیر صحت مند یا بیمار اور لاغر شخص نظام حکومت کو بطریق احسن انجام نہیں دے سکتا۔ طاوت تیس سال کا وجہ نوجوان تھا۔ قدر اور اور صحت مند تھا۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے اُسے اس کام کے لیے منتخب فرمایا تھا۔ اور اس انتخاب پر کوئی اعتراض نہیں ہو سکتا تھا۔ جس طرح اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء کو نبی منتخب فرمایا۔ اسی طرح اُس نے طاوت کو بادشاہت کے لیے منتخب فرمایا۔

خلیفہ کا انتخاب

بعض اوقات اللہ تعالیٰ خلیفہ کا انتخاب بھی خود کرتا ہے جیسے دنیا میں سب سے پہلے خلیفہ آدم علیہ السلام تھے۔ إِنِّي جَاعِلٌ فِي الْأَرْضِ خَلِيفَةً میں زمین میں خلیفہ بنانے والا ہوں۔ حضرت داؤد علیہ السلام کے متعلق فرمایا يُؤَيِّدُ وَدَرَسْنَا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ اے داؤد علیہ السلام ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ بنایا۔ سلیمان علیہ السلام کی خلافت کا ذکر بھی آتا ہے۔

چونکہ اب وحی کا سلسلہ ختم ہو چکا ہے۔ اس لیے اب یہ تو ممکن نہیں کہ ملت اسلامیہ کے لیے اللہ تعالیٰ ان خود کسی کو خلیفہ منتخب فرمادے۔ اب خلیفہ کے انتخاب کے لیے کئی ایک صورتیں ہیں۔ پہلا طریقہ تو یہ ہے کہ سمجھدار، دانا اور صاحب حل و عقد مسلمان خود خلیفہ کا انتخاب کریں جس طرح حضور علیہ السلام کے

بعد لوگوں نے حضرت صدیق اکبرؓ کو منتخب کیا تھا۔ انتخاب کی دوسری صورت یہ ہے کہ خلیفہ خود اپنا جانشین مقرر کر دے۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے حضرت عمرؓ کو مقرر فرمایا تھا۔ یہ بھی درست ہے کہ خلیفہ خود مستحق ترین شخص کو اس کام کے لیے نامزد کر دے۔ اور تیسری صورت یہ ہے کہ کوئی شخص طاقت کے زور پر خود بخود اقتدار اپنے ہاتھ میں لے لے۔ اس کی مثال حضرت امیر معاویہؓ کی ہے۔ جنہوں نے غالب آکر خلافت کی باگ ڈور سنبھالی تھی۔ اس طرح مسند اقتدار پر آنے والا شخص اگر اللہ تعالیٰ کے احکام کے مطابق حکومت کا نظم و نسق چلائے۔ تو یہ صورت بھی قابل قبول ہے۔ خلافت کے معاملہ میں اہل اسلام میں مختلف نظریات پائے جاتے ہیں۔ اہل سنت والجماعت کے نزدیک مسلمانوں کی جماعت پر واجب ہے کہ وہ خلیفہ کا انتخاب کریں۔ اگر وہ اللہ اور اس کے رسول کے احکام پر عمل کرتا ہے تو ٹھیک ہے۔ ورنہ مسلمانوں کی یہی جماعت اُسے معزول بھی کر سکتی ہے۔ کیونکہ خلیفہ بھی ایک انسان ہوتا ہے اور وہ بھی غلطی کر سکتا ہے۔

بر خلاف اس کے شیعہ کا عقیدہ یہ ہے۔ خلیفہ یا امام معصوم ہوتا ہے۔ اور اُس کا انتخاب من جانب اللہ ہوتا ہے اس کی خلافت مستقل ہوتی ہے اور کوئی اُسے معزول نہیں کر سکتا۔ حالانکہ یہ عقیدہ درست نہیں ہے۔ خارجی یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حاکم صرف خدا تعالیٰ کی ذات ہے۔ خلیفہ کی ضرورت ہی نہیں ہے یہ عقیدہ بھی باطل ہے۔

خلیفہ کا انتخاب اس قدر اہم مسئلہ ہے کہ حضور علیہ السلام کی وفات کے بعد صحابہ کرامؓ نے یہ مسئلہ آپ کے کفن و دفن سے پہلے طے کر لیا۔ کیونکہ ہر جماعتی کام میں امیر کی ضرورت ہوتی ہے اور پھر تمام امور اس کے احکام کے تحت انجام دیے جاتے ہیں۔ ابو داؤد شریف کی روایت میں ہے کہ جب تین آدمی سفر پر روانہ ہوں تو اپنے میں سے ایک کو امیر بنالیں تاکہ سفر کے تمام معاملات تنظیم کے تحت حل ہوں۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ اسی آیت کی تفسیر میں فرماتے ہیں کہ جو لوگ عزت و آبرو کی زندگی بسر کرنا چاہتے ہیں۔ انہیں چاہیئے کہ ملک کا نظام ایسے ہاتھوں میں دیں، جو اللہ تعالیٰ کا قانون نافذ کر سکیں۔ اور یہ کام وہی لوگ کر سکتے جو خود ایماندار اور عادل ہوں۔ مولانا تشریح فرماتے ہیں کہ جن ممالک میں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ وہ دل سے چاہتے ہیں کہ ان کے ملک میں اسلامی نظام نافذ ہو، مگر جب حکومت منتخب کرنے کا وقت آتا ہے۔ تو ہمیشہ غلط فیصلہ کرتے ہیں۔ مولانا کا ارشاد ہے کہ اسمبلی کا ممبر اس شخص کو چن جو کتاب اللہ کا عالم اور حضور علیہ السلام کی سنت اور خلفائے راشدینؓ کے دور کو سب سے زیادہ جاننے والا ہو۔ جو شخص کتاب و سنت اور آثار صحابہ سے واقف نہیں، وہ اسلامی نظام کیسے لایکھا ممبر الیا ہونا چاہیئے۔ جو قومی مفاد پر ذاتی مفاد کو قربان کرے۔ اس کے دل میں خدا کا خوف ہو اور آخرت میں محاسبے کا ڈر ہو۔ صرف ایسے لوگ ہی اللہ کا قانون جاری کر سکتے ہیں۔ وہ جب پارلیمنٹ میں جائیں تو سربراہ بھی صحیح منتخب کریں گے۔ اور قانون بھی ٹھیک ٹھیک وضع کریں گے۔

مولانا عبید اللہ سندھیؒ

مولانا عبید اللہ سندھیؒ ہمارے اکابرین میں سے ہیں۔ آپ اجتماعیات اور اقتصادیات کے ماہر تھے۔ آپ سکھوں کے گھر میں پیدا ہوئے مگر اللہ تعالیٰ نے آپ کو کچھ اور ہی منظور تھا۔ سولہ سال کی عمر میں مٹمان ہو کر حضرت خواجہ محمد صدیقؒ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔ خواجہ صاحب نے انہیں اپنا منہ بولا بیٹا بنا لیا اس عمر میں ان کا ختنہ بھی کرایا۔ مولانا بھی اپنے آپ کو خواجہ صاحب کا روحانی فرزند کہتے ہیں۔ حضرت خواجہ محمد صدیقؒ اپنے زمانے کے اس پایہ کے بزرگ تھے۔ جس پایہ کے حضرت بنیٰ بغدادیؒ ہوئے ہیں۔ ان کے دو مرید خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ ایک مولانا غلام محمد دین پوریؒ اور دوسرے مولانا سید تاج الدین امرولیؒ۔ مولانا دین پوریؒ علم میں زیادہ وسعت نہیں رکھتے تھے تاہم حاجی امداد اللہؒ کی طرح نسبت بہت اونچی تھی۔ جنوبی پنجاب اور سندھ میں اس دور میں ان جیسا کوئی بزرگ نہیں ہوا۔ سید تاج الدین امرولیؒ میں دونوں خوبیاں پائی جاتی تھیں آپ عالم بھی تھے اور مجاہد بھی۔ آپ کے ہاتھ پر تقریباً سات ہزار ہندو کھ مٹمان

ہوئے شیخ المذہب مولانا محمود الحسنؒ کے درست اور رفیق الٰہی کی طرح انگریزوں کے سخت دشمن تھے، آپ نے قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں۔

جب مولانا عبید اللہ سندھیؒ تحصیل علم کے لیے ہندوستان جا رہے تھے۔ تو حضرت خواجہ محمد صدیقؒ نے ان کے حق میں دعا کی۔ کہ اللہ تعالیٰ ان کو کسی صحیح عالم دین کے پاس پہنچائے اللہ تعالیٰ نے دعا قبول فرمائی۔ اور چلتے چلتے مولانا سندھی دارالعلوم دیوبند پہنچ کر حضرت مولانا شیخ المذہبؒ کی خدمت میں پہنچ گئے۔ جملہ علوم آپ سے حاصل کیے۔ اور حدیث کا درس حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ سے گنگوہ میں جا کر لیا آپ مدرسہ دیوبند کے سرپرست تھے مگر قیام گنگوہ میں تھا۔ مولانا سندھیؒ کی ذہانت کا یہ عالم تھا۔ کہ خود دیکھتے ہیں کہ علم میراث کی کتاب سرجی صرف دو گھنٹے میں پڑھ لی اور صحاح کستہ میں سے ابن ماجہ اور نسائی دو دن میں ختم کر لی۔ جب آپ علم حاصل کر کے واپس اپنے پیر صاحب کے ہاں پہنچے تو معلوم ہوا کہ خواجہ صاحب وفات پا چکے ہیں۔ آپ نے آخری وقت میں اپنے دونوں شاگردان کو وصیت فرمائی تھی۔ کہ جب عبید اللہؒ واپس آئے۔ تو اُسے اپنا بیٹا سمجھنا۔ چنانچہ ان دو بزرگوں نے آپ کو باپ کی سی شفقت دی۔

مولانا سندھیؒ خود فرمایا کرتے تھے کہ اللہ تعالیٰ نے مجھ پر بڑا احسان کیا کہ تحصیل علم کے بعد میں نے اٹھارہ سال تک اپنے استاد محترم مولانا محمود الحسنؒ کی خدمت میں رہ کر اسلامی سیاست اور حکمت سیکھی۔ شیخ المذہبؒ سیاسیات کے بہت بڑے اہم تھے۔ مولانا سندھیؒ کا چھوٹا ساقی محمد اللہ تعالیٰ نے ان میں وہ صلاحیت رکھی تھی کہ انگریز جیسا جابر حکمران آپ سے بہت خائف تھا۔ آپ کے پیچھے ہر وقت جاسوس لگے ہوتے تھے۔ آپ بارہ سال تک مکہ معظمہ میں رہائش پذیر رہے۔ عرب حکومت نے بھی سیاست میں حصہ لینے پر پابندی لگا رکھی تھی۔ اس کے باوجود انگریزوں کو ہمیشہ ان کی طرف سے طوفان اٹھنے کا خطرہ رہتا تھا۔ انگریزوں نے ایک مولوی کو جاوہی کے لیے مکہ مکرمہ بھیج دیا۔ آپ کو پتہ چلا تو فرمایا کہ بڑے افسوس کا مقام ہے کہ اللہ

کے گھر میں بھی میرا بیچا کر رہے ہو۔ تقسیم ہند سے پانچ سال قبل آپ نے حکمت میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا۔ کہ میں نے انگریز کی سلطنت کی جڑیں کھوکھلی کر دی ہیں۔ اب یہ اس ملک میں نہیں رہ سکتا۔ اگر یہ زیادہ عرصہ ہندوستان میں بٹھر گیا تو میری قبر پر تھوک دینا کہ تو نے جھوٹ کہا تھا۔ مگر اس کے بعد دو سال کے اندر انگریز کو ہندوستان خالی کرنا پڑا۔

شرائط خلافت

جیسا کہ اس آیت سے واضح ہے کہ خلافت کے لیے اعلیٰ خاندان کا ہونا اور خلیفہ کے پاس مال و دولت کا ہونا کوئی شرط نہیں ہے۔ بلکہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے طاقت کی جو صفات بیان کی ہیں۔ وہ یہ ہیں کہ علم اور صحت کے لحاظ سے دوسروں سے بہتر تھا۔ اور پھر یہ کہ اللہ تعالیٰ نے خود اسے اس کام کے لیے منتخب کیا تھا۔ اسی لیے اہم البوجہ جصاص اور دیگر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ خلیفہ کے لیے خاندان قریش سے ہونا ضروری نہیں ہے۔ حدیث شریفہ **الْاَئِمَّةُ مِنْ الْقُرَیْشِ** کی تشریح میں فرماتے ہیں کہ یہ اُس زمانے کی بات ہے جب قریش کے علاوہ لوگ کسی دوسرے پر متفق نہیں ہو سکتے تھے۔ اُس وقت قریش میں خلافت کا کام انجام دینے کی پوری صلاحیت موجود تھی۔ بخاری شریف میں ہے کہ اگر دو آدمی بھی خاندان قریش سے باصلاحیت ہوں گے تو خلافت کسی اور طرف منتقل نہیں ہوگی مگر عیسیٰوں کے دور میں اس قدر بگاڑ پیدا ہو گیا کہ دو آدمی بھی باصلاحیت موجود نہ رہے۔ لہذا خلافت اُن کے ہاتھ سے نکل گئی۔ دوسری جگہ آتا ہے **مَا أَقَامُوا حَتَّىٰ يَكُونَ النِّصَافُ** پر قائم رہیں گے۔ خلافت اُن کے پاس رہیگی۔ چنانچہ ساڑھے چھ سو سال تک خلافت اسی خاندان میں رہی پھر جب

اہلیت سے محروم ہو گئے تو خلافت سے محروم ہو گئے۔ آج بھی من حیث القوم مسلمانوں میں صلاحیت ناپید ہے۔ مسلمان خود اپنا صحیح خلیفہ منتخب نہیں کر سکتے۔ آج وہ مسلمان کہاں سے پیدا ہوں جو قومی درد دیکھنے والے ہوں۔ اور اپنے ذاتی مفاد کو اجتماعی مفاد پر قربان کر سکیں۔ جب تک مسلمانوں میں یہ جذبہ پیدا نہیں ہوگا۔ یہ قوم قصر مذلت سے نہیں نکل سکتی۔

صندوق کو رکھتے تھے۔ وہاں وہاں بھٹ پڑتی اور وہ بستی تباہ ہو جاتی تھی۔ اس طرح پانچ بتیاں تباہ ہو گئیں۔ تو ان لوگوں نے فیصلہ کیا کہ اس صندوق کو کسی طرح نکال دیا جائے چنانچہ انہوں نے صندوق بیل گاڑی پر رکھ کر بیلوں کو ایک طرف ہانک دیا۔ بیل چلتے چلتے طاوت کے دروازے پر پہنچ گئے۔ اور اس طرح صندوق ان کے پاس آ گیا۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ یہ صندوق اگرچہ بظاہر بیل گاڑی پر آیا تھا مگر اللہ کے حکم کے مطابق اُسے فرشتے لائے تھے۔ جو عام لوگوں کو نظر نہیں آتے تھے۔ انہوں نے ہی بیلوں کو طاوت کے دروازے پر لاکھڑا کیا تھا فرمایا اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَاٰيَةً لِّكُمْ اس میں تمہارے لیے نشانیاں ہیں۔ اِنْ كُنْتُمْ مُّسْئِرًا اگر تمہیں یقین آیا، ان نشانیوں کو دیکھ کر بنی اسرائیل طاوت کے بادشاہ مقرر ہونے پر مطمئن ہو گئے۔ چنانچہ قوم نے ان کی سرکردگی میں جہاد کرنے کا عزم بھی کر لیا۔ اب اللہ کا بنی سمویلؑ بھی موجود تھا اور طاوت بادشاہ بھی موجود تھا۔ چنانچہ وہ دُشمن سے جنگ کے لیے نکلے جس کا ذکر اگلے درس میں آئے گا۔

سَيَقُولُ ۲

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکصد و شش (۱۰۶)

آیت ۲۴۹

فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ قَالَ إِنَّ اللَّهَ مُبْتَلِيكُمْ
 بِنَهَرٍ فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّي وَمَنْ لَمْ
 يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّي إِلَّا مَنِ اغْتَرَفَ غُرْفَةً بِيَدِهِ
 فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ
 آمَنُوا مَعَهُ قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِطَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالَ
 الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُّلِقُوا اللَّهَ لَكُمْ مِنْ فِئَةٍ قَلِيلَةٍ
 غَلَبَتْ فِئَةُ كَثِيرَةٍ ۖ يَأْذِنُ اللَّهُ وَاللَّهُ مَعَ الصَّابِرِينَ ﴿۲۴۹﴾

ترجمہ: جب طالوت اپنے لشکر کے ہمراہ باہر نکلے، تو انہوں نے کہا، بیشک
 اللہ تعالیٰ تمہیں آزمانے والا ہے ایک نہر سے۔ پس جس نے نہر سے پانی پی لیا وہ مجھ
 سے نہیں ہے۔ اور جس نے اس سے نہ چکھا بیشک وہ میرا ہے۔ ہاں جس نے ہاتھ
 سے پانی کا چلو بھریا وہ مستشار ہے۔ پس لوگوں نے اس میں سے پی لیا سوائے تھوڑے
 آدمیوں کے۔ پھر جب طالوت اور اس کے ہمراہ اہل ایمان نہر سے پار ہوئے تو کہنے
 لگے کہ آج جالوت اور اس کے لشکر سے مقابلہ کرنے کی ہمیں طاقت نہیں ہے۔ جو
 لوگ اللہ تعالیٰ سے ملاقات کا یقین رکھتے تھے، کہنے لگے کہ بہت دفعہ ایسا ہوا ہے
 کہ چھوٹی جماعتیں بڑی جماعتوں پر غالب آئی ہیں اللہ کے حکم سے۔ اور اللہ تعالیٰ
 صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے ﴿۲۴۹﴾

گزشتہ درس میں طالوت کے بطور بادشاہ تقرر کا بیان آچکا ہے۔ جب اللہ کے
 نبی نے بنی اسرائیل کی درخواست کے مطابق طالوت کو بادشاہ مقرر کیا۔ تو انہوں نے اُسے
 اپنا رہبر تسلیم کرنے سے انکار کر دیا۔ کہنے لگے کہ یہ تو ایک غریب آدمی جس کے پاس

رابطہ آیات

مال و دولت نہیں ہے۔ ہم اُسے اپنا بادشاہ کیسے تسلیم کر لیں۔ اس سے زیادہ تو بادشاہت کے ہم حقدار ہیں بلکہ اللہ کے نبی نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ نے طاہرہ کو علم اور جسمانی طاقت سے نوازا ہے۔ نیز یہ انتخاب اللہ تعالیٰ کا ہے۔ جس کو چاہے بادشاہت دے دے۔ لہذا تمہیں اس پر معترض نہیں ہونا چاہیے۔ اللہ کے پیغمبر نے فرمایا کہ دیکھو طاہرہ کے تقرر کی ایک خاص نشانی یہ ہے کہ تمہارا وہ مقدس صندوق جس میں انبیائے سابقین کے بعض تبرکات محفوظ ہیں۔ اور جسے تمہارے دشمن اٹھا کر لے گئے تھے، وہ تمہارے پاس فرشتے لے کر آئیں گے۔ چنانچہ ایسے ہی ہوا۔ وہ مقدس صندوق ایک بیل گاڑی کے ذریعے خود بخود طاہرہ کے دروازے پہنچ گیا۔ اب قوم نے طاہرہ کو بادشاہ تسلیم کر لیا۔ اور اس کی سرکردگی میں دشمن سے جنگ کے لیے تیار ہو گئے۔ آج کے درس میں لشکر طاہرہ کی دشمن کے مقابلے کے لیے روانگی اور پھر راستے میں پیش آنے والے واقعات کا تذکرہ ہے۔

لشکر طاہرہ
اور جالوت

طاہرہ بادشاہ کی سرکردگی میں فوج کی تیاری شروع ہوئی۔ عام اعلان کیا گیا کہ تمام کے تمام صحت مند جوان فوج میں بھرتی ہو جائیں۔ چنانچہ اسی ہزار کا لشکر تیار ہوا۔ دشمن بھی بڑا طاقتور تھا۔ قوم عمالقہ کا سردار جالوت تھا۔ دس فٹ قد کا یہ جوان بڑا طاقتور تھا۔ اُسے دیکھ کر دہشت آتی تھی۔ بائبل کی روایتوں میں آتا ہے کہ جالوت کی ڈھال تین من وزنی تھی۔ چہرہ چھوڑ کر اس کا باقی سارا جسم زرہ میں محبوس ہوتا تھا۔ اس کے علاوہ بھی بڑے بڑے کٹیل جوان موجود تھے مگر سب کافر اور مشرک تھے۔ لشکر طاہرہ کا ان لوگوں کے ساتھ مقابلہ تھا۔

سپاہی کے اوصاف

اس آیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی لشکر بعض مخصوص اوصاف کا حامل ہونا چاہیئے۔ تاکہ اُسے دشمن کے مقابلے میں کامیابی حاصل ہو۔ سب سے پہلی بات یہ ہے کہ کسی سپاہی میں حرص کا مادہ نہ ہو۔ اگر ان میں حرص اور لالچ پیدا ہو گیا تو وہ ناکام ہو جائیں گے۔ اس کے بجائے طبیعت میں استقلال ہونا چاہیئے۔ چھوٹی چھوٹی آزمائشوں میں گھبرانا نہیں چاہیئے۔ اسلام کے سپاہی کے لیے مستقل مزاجی ایک اچھی علامت ہے۔

اس کے علاوہ صبرِ قلم الہامی کا بہت بڑا اصول ہے۔ صبرِ شکر، اللہ کا ذکر، غمازِ محبت و توحید پر بھی عظیم شاعرانہ اثر و ماسب ایسے اصول ہیں۔ جو مملکتوں کا طرہ امتیاز ہیں۔ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام کے صبر و استقلال اور مصائب کو برداشت کرنے کے کتنے واقعات حدیث کی کتابوں میں مذکور ہیں۔ انہوں نے ٹھیک، پیاس اور ہر قسم کے ابتلا کو برداشت کیا۔ مگر جہاد سے منہ نہیں موڑا۔ ترمذی شریعت کی روایت میں آتا ہے کہ حضرت ابو سعیدؓ کی محبت میں ایک اسلامی لشکر جہاد پر روانہ ہوا۔ راستے میں راشن کی کمی واقع ہو گئی۔ اور اس کی مقدار معطی بھرنی کس رہ گئی۔ جب بالکل محفوظ رہ گیا۔ تو ایک ایک کھجور حصے میں آنے لگی۔ اور ہر وہ وقت بھی آیا جب کھجور کی گٹھلیوں کو چوس لیا جاتا اور اوپر سے پانی پی کر اللہ کا شکر ادا کیا جاتا۔ جب بالکل کھجور کا دھڑا ختم ہوا تو دشمنوں کے پتے کھانے شروع کر دیے۔ کڑے پتے کھاکر کھمبات کی باجھیں پھٹ گئیں۔ حدیث کے لفظ ہیں لَفْظَاتِ أَهْلِ هَجْرَانِ کے منہ پھٹ گئے۔ مگر اس قدر مصیبتیں جھیلنے اور تکلیفیں برداشت کرنے کے باوجود ان کے پائے استقلال میں لغزش نہ آئی۔ بلکہ دشمن کے متعلقے میں سینہ سپر رہے۔ اور اللہ تعالیٰ سے فتح و کامرانی کے لیے دعائیں کرتے رہے۔ اس کا بیان آگے آئے گا۔

شکری
انسان

بعض اوقات سالار لشکر اپنے لشکر کی آزمائش بھی کرتا ہے۔ تاکہ معلوم ہو سکے۔ کہ فوج ہر قسم کی سختیوں کو برداشت کرنے کے قابل ہے یا نہیں۔ اور بعض اوقات اس میں خاص مصلحت بھی ہوتی ہے۔ جو امیر لشکر کے ذہن میں ہوتی ہے۔ تو اس لحاظ سے امیر کو حق حاصل ہے کہ وہ حالات کے پیش نظر فوج کو کوئی حکم دے۔ جس کی بظاہر کوئی افادیت نہ ہو۔ حضور علیہ السلام کے اپنے زمانہ مبارک کا واقعہ ہے۔ حضرت عمر و ابن العاص کو امیر لشکر بنا کر روانہ کیا۔ حضرت ابوبکرؓ اور عمارؓ فوج میں بطور سپاہی شامل تھے۔ جب دشمن کے قریب پہنچے تو ایک جنگل میں ڈیرہ لگایا۔ رات سخت سرد تھی۔ مگر امیر لشکر نے حکم دیدیا کہ کوئی شخص آگ نہ جلانے۔ لوگ سخت جبران ہوئے کہ نری میں ٹھک رہے ہیں۔ مگر آگ جلانے کی بھی ممانعت کر دی گئی ہے۔ نہ آگ جلی۔ نہ کھانا پکا۔ لوگوں نے حضرت ابوبکرؓ اور عمارؓ سے گزارش کی کہ امیر لشکر کے پاس خارشن کریں۔

کہ آگ جلانے کی اجازت دیں، مگر شیخینؒ نے یہ کہہ کر سفارش کرنے سے انکار کر دیا۔ کہ اس شخص کو حضور علیہ السلام نے امیر مقرر کیا ہے۔ اس کی اطاعت ہم پر لازم ہے۔ آگ نہ جلانے میں بھی کوئی مصلحت ہوگی۔ آخر علی الصبح امیر نے دشمن پر حملہ کرنے کا حکم دیا وہ لوگ اسلامی لشکر کی آمد سے بے خبر تھے۔ اچانک حملہ ہوا۔ تو ان کے پاؤں اکھڑ گئے اور لشکر اسلام کو فتح نصیب ہوئی۔ اُس وقت لوگوں کو معلوم ہوا کہ اگر رات کو آگ روشن کرتے تو دشمن کو ہماری آمد کا پتہ چل جاتا اور وہ جنگ کے لیے تیار ہو جاتے۔

طالوت نے بھی اپنے لشکر کو اللہ کے حکم سے آزمائش میں ڈالا۔ فَلَمَّا فَصَلَ طَالُوتُ بِالْجُنُودِ جب طالوت لشکر کے ہمراہ روانہ ہوئے۔ قَالَ اِنَّ اللّٰهَ مُبْتَلِيْكُمْ بِنَهَرٍ کہا اللہ تعالیٰ تمہیں ایک نہر کے ذریعے آزمانا چاہتا ہے کہتے ہیں۔ کہ یہ ایک چھوٹی سی نہر ہے جو حیرون میں شمالاً جنوباً بہتی ہے بیچ و خم کے راستے اس کی کل لمبائی دو سو میل کے قریب ہے۔ تاہم براہ راست قریب ترین فاصلہ پنیٹھ میل بنتا ہے۔ بعض کہتے ہیں کہ اس سے مراد دریائے اردن ہے جسے عبور کر کے دشمن کے مقابلہ پر جانا تھا۔ جب لشکر اس نہر کے قریب پہنچا۔ تو امیر لشکر نے اعلان کیا۔ کہ تمہاری آزمائش کا وقت آگیا ہے۔ اگرچہ تم پیاس کی شدت میں مبتلا ہو، مگر اللہ کا حکم یہ ہے کہ یہاں سے پانی نہیں پینا فَمَنْ شَرِبَ مِنْهُ فَلَيْسَ مِنِّيْ جو کوئی اس حکم کی خلاف ورزی کرے نہر کا پانی پی لے گا۔ وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یعنی میرا اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں ہوگا۔ وَمَنْ لَّمْ يَطْعَمْهُ فَإِنَّهُ مِنِّيْ اور جس نے اس پانی کو بالکل نہ چکھا، بلاشبہ وہ مجھ سے ہے۔ یعنی وہ میرے لشکر میں شامل رہیگا۔ ہاں اتنی گنجائش ہے اَلَا مَنْ اَعْتَرَفَ عُرْفَةً پس یہ کہ جو کوئی اپنے ہاتھ سے چلو بھرے تو اس کو اجازت ہے اس سے زیادہ پانی پینے کی اجازت نہیں۔

فَلَيْسَ مِنِّيْ کے الفاظ بہت سی احادیث مبارکہ میں بھی ملتے ہیں۔ جہاں

کہیں حضور علیہ السلام نے امت کو کسی کام سے روکا، فرمایا جو ایسا کرے گا۔ فَلَيْسَ مِنِّي وہ مجھ سے نہیں ہے۔ جیسے فرمایا مَنْ رَغِبَ عَنْ سُنَّتِي فَلَيْسَ مِنِّي جو میری سنت سے اعراض کرے، وہ مجھ سے نہیں ہے۔ یا جیسے فرمایا مَنْ لَعَنَ يُكْرِمُ ضَيْفَنَا فَلَيْسَ مِنَّا جو ہم سے مہمان کی عزت، نہیں کرتا وہ ہم سے نہیں یعنی وہ ہماری عجمت سے خارج ہے ایک اور مقام پر فرمایا مَنْ حَمَلَ عَلَيْنَا السَّلَاحَ فَلَيْسَ مِنَّا جو ہم پر ہتھیار اٹھائے وہ ہم میں سے نہیں ہے۔ مَنْ عَشَنَّا فَلَيْسَ مِنَّا جو کسی مسلمان کو دھوکا دے، وہ بھی ہم میں سے نہیں ہے۔ وغیرہ وغیرہ

اکثریت
ناکامی

غرض! طالوت کے پانی سے منع کرنے کے باوجود فَشَرِبُوا مِنْهُ إِلَّا قَلِيلًا مِّنْهُمْ اسی ہزار کے لشکر میں سے اکثریت نے خوب پیٹ بھر کر پانی پیا، سوائے ایک قلیل تعداد کے جنہوں نے امیر لشکر کے حکم پر صبر استقامت کا دامن تھامے رکھا کہتے ہیں کہ اس قلیل تعداد میں سے بعض نے تو بالکل نہ پیا اور بعض نے چلو بھر پانی لے لیا۔ جس کی اجازت تھی۔ حدیث شریف میں ان کی تعداد ۳۱۳ آتی ہے۔ اور یہ تعداد بدر کے جانثاروں کی تعداد کے برابر ہے۔ بعض روایتوں میں ۳۱۹ کا ذکر بھی آتا ہے۔ اسی ہزار کے لشکر میں صرف یہ قلیل تعداد آزمائش میں پوری اترئی، باقی کی غالب اکثریت پانی پینے کے بعد سستی اور کاملی کا شکار ہو گئی۔ حتیٰ کہ وہ آگے بڑھنے سے بھی معذور ہو گئے۔ اور نہر کے اس پار ہی رُک گئے۔

فَلَمَّا جَاوَزَهُ هُوَ وَالَّذِينَ آمَنُوا مَعَهُ جَبَ طَالُوتُ، اور اس کے

ہمراہی اہل ایمان نہر سے پار پہنچے تو سامنے جالوت، کا لشکر موجود تھا۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ اور دوسرے مفسرین کرام کے حوالہ سے مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس وقت طالوت، کا لشکر تین گروہوں میں تقسیم ہو چکا تھا۔ پہلا گروہ ناقص الایمان تھا، جنہوں نے حکم کے خلاف سیر ہو کر پانی پیا اور لڑائی کے قابل نہ رہے دوسرا گروہ کامل الایمان لوگوں کا تھا جنہوں نے چلو بھر پانی پیا۔ مگر یہ گروہ اپنی قلتِ تعداد کی بنا پر دشمن کے لشکر سے خوفزدہ تھا۔ کہ اتنے بڑے لشکر سے مقابلہ کیسے

ہوگا۔ کہتے ہیں کہ تیسرا گروہ اکل الایمان تھے جن کا ایمان اتنا پختہ تھا کہ قلت و کثرت ان کے نزدیک بے معنی چیز تھی۔

غرض پہلا گروہ تو تھک ہار کر بیٹھ گیا۔ انہوں نے جنگ کی طرف منہ کرنے

کی ہمت ہی نہیں کی۔ دوسرا گروہ کہنے لگا قَالُوا لَا طَاقَةَ لَنَا الْيَوْمَ بِجَالُوتَ

وَجُنُودِهِ اپنی قلت تعداد کی وجہ سے ہم جالوت اور اس کے لشکر سے لڑنے کی

طاقت نہیں رکھتے۔ اگر لڑائی شروع کی۔ تو ہم مغلوب ہو جائیں گے۔ اسی ہزار کا لشکر

لے کر نکلے تھے مگر اب صرف ۲۱۲ باقی ہیں۔ یہ دشمن سے کیسے نبرد آزما ہوں گے

رہا تیسرا گروہ قَالَ الَّذِينَ يَظُنُّونَ أَنَّهُمْ مُلاقُوا اللَّهِ اور یہ ایسا گروہ تھا۔ جسے

یقین کامل تھا کہ انہیں ایک دین اللہ کے دربار میں حاضر ہونا ہے۔ اگر بزدلی

سے مر جائیں گے تو بھی اللہ کے ہاں پیشی ہے۔ اور اسکی رضا کے لیے سرد صبر

کی بازی لگادیں گے تو پھر بھی جانا تو وہیں ہے۔ وہ ہماری نیتوں سے واقف

ہے۔ لہذا انہوں نے لشکریوں کو تسلی دی کہ دیکھو تعداد کی قلت اور کثرت کی وجہ

سے جنگ نہیں لڑی جاتی بلکہ اس کے لیے بامقصد اور پُر خلوص جذبے کی ضرورت

ہے۔ تم اپنی ہمت کے مطابق پوری قوت کے ساتھ ٹکرا جاؤ اور نتیجہ اللہ تعالیٰ

پر چھوڑ دو۔ کیا تم تاریخی واقعات کو بھول چکے ہو۔ كَعُوْمُنْ فِيْهِ قَلِيْلَةٌ

کہتے ہی قلیل تعداد کے لشکر تھے غَلَبَتْ فِيْهِ كَثِيْرَةٌ بِالْإِذْنِ اللّٰهِ جو اللہ کے

حکم سے کثیر التعداد لشکر دل پر غالب آئے۔

صحابہ کرامؓ کے ایسے کہتے ہی واقعات تاریخ میں ملتے ہیں جن میں صحابہؓ کی

قلیل تعداد دشمن کی کثیر تعداد پر غالب آئی۔ حضرت عمرؓ کے زمانہ میں ایک جنگ

کا جو نقشہ سامنے آتا ہے۔ اس میں دشمن کا لشکر ساٹھ ہزار افراد پر مشتمل ہے۔ جب

کہ مسلمانوں کی تعداد صرف ساٹھ تھی۔ اس واقعہ کے متعلق کسی شاعر نے کیا خوب کہا۔

غَدا سِتُّونَ وَهَمْ سِتُّونَ الْفَأَ

مَعَ هَذَا قَوْلًا مُّذَبَّرًا

تاریخی واقعات

اس معرکہ میں ایک ایک مومن ایک ایک ہزار کافر کے مقابلہ میں تھا۔ مگر اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو فتح عطا کی۔ صرف دس مسلمان شہید ہوئے جب کہ کفار کے دس ہزار جہنم واصل ہوئے۔

بخاری شریف میں حضرت زبیرؓ کا واقعہ آتا ہے آپؐ اپنے دو لاکھ کفار کے لشکر میں تنہا دو دگنے اور تلوار چلاتے ہوئے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چلے گئے۔ گھوڑا دوڑاتے ہوئے پھر واپس آئے اور بیشمار کفار کو ہلاک کیا۔ جنگ احد کے متعلق طبری کی روایت ہے کہ پیغمبر خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے روبرو ایک بڑا سخت مرحلہ پیش آگیا۔ ساتھی تتر بتر ہو گئے۔ اور آپؐ اکیلے رہ گئے۔ اس نازک موقع پر انصار مدینہ میں سے حضرت ابو دجانہؓ نے حضور علیہ السلام کی حفاظت کے لیے اپنی پشت کو بطور ڈھال استعمال کیا۔ اور تلوار اور نیزے کے چوراسی زخم کھائے۔ مگر آپؐ کی حفاظت کی۔ ایک اور موقع پر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی تلوار میان سے نکالی اور فرمایا، کون ہے جو اس کا حق ادا کرے گا۔ سب خاموش تھے کہ ابو دجانہؓ بول اٹھے حضور! یہ مجھے عطا فرمائیں، میں اس کا حق ادا کروں گا۔ اور پھر آپؐ نے واقعی اس کا حق ادا کر دکھایا۔

جب میلہ کذاب نے دعویٰ نبوت کیا۔ تو اس کے پاس چالیس ہزار کا لشکر تھا جو قلعہ بند ہو چکا تھا۔ مسلمانوں کا ایک قلیل لشکر حضرت خالد بن ولیدؓ کی قیادت میں سرکوبی کیلئے پہنچا۔ مگر مضبوط قلعہ سر نہیں ہوتا تھا۔ آخر حضرت ابو دجانہؓ نے ایک تدبیر بتائی۔ کہنے لگے، مجھے ٹوکری میں ڈال کر رات کی تاریکی میں کسی طرح قلعے اندر آنا۔ دو باقی کام میں خود کہ لوں گا۔ ایسا ہی کیا گیا۔ حضرت ابو دجانہؓ نے ٹوکری سے نکل کر بے دریغ تلوار چلا کر شروع کر دی۔ دشمن میں افراتفری پیدا ہو گئی، وہ سمجھے کہ مسلمانوں کا لشکر قلعے میں داخل ہو گیا ہے۔ لہذا انہوں نے خود ہی قلعے کا دروازہ کھول دیا۔ اس معرکہ میں میلہ کے ۲۸ ہزار آدمی مارے گئے۔ کئی ہزار کفار صرف ابو دجانہؓ کی تلوار کا شکار ہوئے۔

معرض ! اُن اکل الایمان لوگوں نے باقی سپاہیوں کو حوصلہ دیا۔ کہ گھبرانے کی کوئی بات نہیں۔ اللہ ہماری قلیل تعداد کو کثیر تعداد پر غالب کرے گا۔ لہذا تم صبر و استقامت کے ساتھ جنگ میں کود جاؤ۔ وَاللّٰهُ مَعَ الصّٰبِرِیْنَ اور اللہ تعالیٰ صبر کرنے والوں کے ساتھ ہے۔ صبر ایسی ضروری چیز ہے۔ جس کے بغیر نہ نماز ادا ہو سکتی ہے نہ روزہ کی بھوک پیاس برداشت ہوتی ہے۔ نہ جہاد میں حصہ لیا جاسکتا ہے۔ اور نہ ہی تبلیغ کا کام کما حقہ ادا ہو سکتا ہے۔ صبر ملت ابراہیمی کا ایک اہم اصول ہے۔ اس کو اپنانے والے ہمیشہ کامیاب و کامران ہوتے ہیں۔

سَيَقُولُ

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکصد و غشت (۱۰۷)

آیت ۲۵۰ تا ۲۵۱

وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ قَالُوا رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا مَبِغًا
ثَبَّتْ أَقْدَامَنَا وَانصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿٢٥٠﴾ فَهَزَمُوهُمْ
بِإِذْنِ اللَّهِ قَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ وَاتَّشَهُ اللَّهُ الْمَلِكُ وَالْحِكْمَةُ
وَعَلَّمَهُ مِمَّا يَشَاءُ وَلَوْلَا دَفْعُ اللَّهِ النَّاسَ
بَعْضَهُمُ بِبَعْضٍ لَفَسَدَتِ الْأَرْضُ وَلَكِنَّ اللَّهَ ذُو فَضْلٍ
عَلَى الْعَالَمِينَ ﴿٢٥١﴾

ترجمہ: اور جب جالوت اور اس کے لشکر کے سامنے ہوئے تو کہنے لگے اے
ہمارے پروردگار! ہمارے اوپر صبر ڈال دے اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ۔ اور کافروں
کے مقابلے میں ہماری مدد فرما ﴿۲۵۰﴾ پس اہل ایمان نے اُن (کافروں) کو شکست دی اللہ
کے حکم سے اور قتل کیا حضرت داؤد علیہ السلام نے جالوت کو اور اللہ تعالیٰ نے داؤد کو
سلطنت اور حکمت دی۔ اور جو چاہا سکھایا۔ اور اگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض کے
ساتھ دفع نہ کرتا، تو زمین خراب ہو جاتی۔ مگر اللہ تعالیٰ احسان والوں پر فضل کرنے والا ﴿۲۵۱﴾

گزشتہ درس میں طالوت کے لشکر کی روانگی کا تذکرہ تھا کہ جب وہ دشمن کی طرف
پلے تو راستے میں طالوت نے اپنی فوج کو آزمایا کہ یہ لوگ کس حد تک تکالیف
برداشت کر سکتے ہیں۔ راستے میں نہر پڑتی ہے۔ اللہ کے حکم سے طالوت نے
اپنے سپاہیوں کو اس نہر سے پانی پینے سے منع کر دیا۔ اور پیاس برداشت کر نیچی
تلقین کی۔ مگر البتہ سخت شدت کی صورت میں چلو بھر پانی پی لینے کی اجازت دی
مگر لشکر کی اکثریت پیاس برداشت نہ کر سکی اور انہوں نے خوب سیر ہو کر پانی پیا
جی و بس ان میں سستی اور کاہلی پیدا ہو گئی اور وہ آگے سفر کرنے کے قابل نہ رہے

ربطیات

لہذا تھک مار کر وہیں بیٹھ گئے۔ جاووت صرف ۲۱۲ سپاہیوں کا لشکر لے کر نہر سے پار ہوئے۔ اب فوج تین گروہوں میں تقسیم ہو چکی ہے۔ جنہوں نے غوب پانی پیادہ ناقص الایمان لوگ تھے انہیں وہ ادھر رہا کر دیا گیا۔ جو نہر سے پار گئے۔ ان میں بھی دو طرح کے آدمی تھے جنہوں نے چلو بھر پانی پیا تھا وہ کمال الایمان تھے مگر ۲۱۲ کے مقابلے میں دشمن کی کثرت اور دیکھ کر خوفزدہ ہو گئے اور کہنے لگے کہ ہم جاووت کا مقابلہ نہیں کر سکیں گے۔ تیسرا گروہ جس نے بالکل پانی نہیں پیا تھا وہ اکمل الایمان لوگ تھے جنہوں نے دوسروں کو تسلی دی کہ تعداد کی کثرت اور قلت سے بہت گھبرائو۔ دنیا میں کتنے ہی واقعات پیش آچکے ہیں۔ جن میں قلت نے اکثریت کو شکست دی۔ فتح و شکست اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے لہذا تم صبر استقامت پر قائم رہ کر جہاد کرو اللہ تعالیٰ فتح دیگا۔ اور اللہ تعالیٰ ہمیشہ صابروں کے ساتھ ہوتا ہے۔ اب آیات زیر درس میں دونوں لشکروں میں جنگ کا حال بیان ہو رہا ہے۔ کہ کس طرح بنی اسرائیل نے میدان جنگ میں پہنچ کر اللہ تعالیٰ سے کامیابی کی دعا کی اور پھر اللہ تعالیٰ نے انہیں فتح سے نوازا۔

میدان جنگ
میں دعا

گذشتہ درس میں اسلامی سپاہ کے اوصاف بیان ہو چکے ہیں۔ کہ ان کے اندر حرص کا مادہ نہیں ہونا چاہیئے۔ نیز یہ لوگ صبر و استقلال کے پیکر اور اچھے اخلاق کے حامل ہونے چاہئیں۔ اور ان کا آخری وصف یہ ہے کہ وہ اللہ تعالیٰ کے حضور کامیابی کے لیے دست بدعا ہتھتے ہیں۔ آج کے درس میں سب سے پہلے اسی دعا کا ذکر ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ وَلَمَّا بَرَزُوا لِجَالُوتَ وَجُنُودِهِ جب بنی اسرائیل جاووت کے لشکر کے سامنے ہوئے قَالُوا تَوَّانُوا انہوں نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھالیے اور کہنے لگے ، رَبَّنَا أَفْرِغْ عَلَيْنَا مِائِدَكَ اے ہمارے پروردگار ! ہم پر صبر ڈال دے وَيُثَبِّتْ أَقْدَامَنَا اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ وَأَفْضِرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔

دعا ایک ایسی اعلیٰ و ارفع چیز ہے جس کے ذریعے انسان اپنے رب کے ساتھ تعلق قائم کرتا ہے۔ خاص طور پر میدان جنگ میں غیر مسلم قوتیں اپنی طاقت کے غرور

میں شراب پی کر اور گانے گاتے ہوئے جنگ کا ابتداء کرتے ہیں۔ جب کہ ایمان والے جنگ شروع کرنے سے پہلے اللہ تعالیٰ کے حضور گر گڑا کر فتح کی دعائیں کرتے ہیں کیونکہ دعا ایسی چیز ہے جو ساری عبادت کا سچوڑ ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا **الدُّعَاءُ مَعَ الْعِبَادَةِ** یعنی دعا عبادت کا مغز ہے۔ چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ حضور علیہ السلام نے تمام غزوات میں میدان جنگ میں پہنچ کر دعائیں کی ہیں۔ جنگِ بدر کے متعلق بخاری، مسلم، نسائی اور حدیث کی دوسری کتب میں مذکور ہے کہ حضور علیہ السلام نے کس قدر گر گڑا کر دعا فرمائی۔ آپ رات بھر عاجزی و انکاری کے ساتھ دعا مانگتے رہے حتیٰ کہ آپ کی چادر مبارک بھی کندھے سے سر کر گئی۔ آپ فرماتے تھے **اللَّهُمَّ إِنْ تَهَلَّلْتَ هَذِهِ الْعَصَابَةَ لَا تُبَكِّدْ فِي الْأَمْرِ** اے مولا کریم! میں نے یہ مٹھی بھر اہل ایمان تیرے نام پر جنگ میں دھکیل دیے۔ اگر یہ ہلاک ہو گئے۔ تو تُو نے زمین پر تیری عبادت کرنے والا کوئی نہیں ہے گا۔ آپ نے ایمان والوں کو حکم دیا کہ وہ جب بھی دشمن کے مقابلے میں ٹکیں تو اس طرح دعا کریں **اللَّهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ وَمُجِيبِ السَّعَاتِ** اے کتاب نازل کرنے والے اور بادلوں کو چلانے والے اللہ! اھْزِمِ الْأَحْزَابَ لشکر کفار کو شکست دے اور ہم کو فتح سے سرفراز فرما۔

حضور نے ایسی جامع دعا سکھائی کہ پہلے لفظ میں ہی اسکی حقیقت کو واضح فرما دیا۔ **اللَّهُمَّ مُنْزِلَ الْكِتَابِ** یعنی اے اللہ! جس نے کتاب نازل فرمائی ہے مقصد یہ ہے کہ ہم یہ جنگ اس لیے کر رہے ہیں کہ اُس پر وگرام پر عمل درآمد کر سکیں جو تو نے کتاب اُتار کر ہمیں دیا ہے۔ اس جنگ سے ہماری کوئی ذاتی اغراض وابستہ نہیں ہیں۔ بلکہ تیری کتاب کے احکام لوگوں تک پہنچانے مقصود ہیں۔ اور اس سلسلے میں جو رکاوٹ آئے اس کو دور کرنا مقصود ہے۔ ہمارا مقصد ہوس ملک گیری نہیں۔ ہم مال غنیمت کے لیے نہیں آئے اور نہ لوگوں کو غلام بنانے کی خاطر آئے ہیں۔ بلکہ ہم نے اعلیٰ کلمۃ الحق کے لیے اپنی جانوں کو اپنی ہتھیلیوں پر رکھا ہے۔

اللَّهُمَّ اِنْ رَوْعَاتِنَا وَاسْتَرْعَوْا رَتْنَا اے اللہ! ہمارے خدو کو مال

مے اور ہمارے عیوب پر پردہ ڈال بغضیکہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے میدان جنگ کے لیے خود دعائیں کی ہیں۔ اور صحابہؓ کو سکھائی ہیں۔ حضرت علیؓ نے دیکھا کہ بدر کے میدان میں سجدے کی حالت میں حضور صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہایت عاجزی کے ساتھ یَا قَيُّوْمُ کہہ رہے ہیں۔ اے اللہ! ہم تیری رضا کی خاطر آئے ہیں۔ ہماری زندگی اور موت تیرے ہاتھ میں ہے۔ کافروں کے مقابلے میں ہمارا غلبہ تیری مشیت پر منحصر ہے۔ یہ دیکھ کر حضرت علیؓ چلے گئے۔ میدان جنگ کا چکر لگا کر واپس آئے۔ تو دیکھا کہ حضور علیہ السلام اسی طرح سجدہ میں پڑے ہوئے ہیں اور اللہ کے حضور دعائیں کہہ رہے ہیں۔

الغرض! طاوت مٹھی بھر ساتھیوں کے ساتھ میدان میں اترا۔ اللہ کے نبی سمویلؑ بھی ان کے ہمراہ تھے۔ جاوت کا کثیر لشکر دیکھ کر دل دہل گیا۔ اُس وقت گڑگڑا کہ دُعا کی رُبَّنَا اے ہمارے پروردگار! دُعا کے ابتداء میں خدا تعالیٰ کی صفت ربوبیت کو مقدم رکھا۔ کیونکہ پالنا اور درجہ کمال تک پہنچانا صفت ربوبیت کا کرشمہ ہے۔ رُبَّنَا کے لفظ کے ساتھ اپنی عاجزی اور انکاری کا اظہار کیا۔ جیسا کہ اکثر دعاؤں کی ابتداء میں یہ لفظ آتا ہے۔ جیسے رُبَّنَا اِنْتَا فِي الدُّنْيَا يَا جِيسُ رُبَّنَا هَبْ لَنَا يَا رَبَّنَا اغْفِرْ لَنَا وَغَيْرَ، یاں پر یہ دُعا کی رُبَّنَا اَفْرِغْ عَلَيْنَا صَبْرًا جی اے اللہ! ہم پر صبر ڈال دے یا صبر انڈیل دے۔ ہمیں صبر کا مادہ پیدا ہو جائے وَثَبْتَ قَدَامَنَا اور ہمیں ثابت قدم رکھ۔ ہمارے پائے استقلال میں لغزش نہ آنے پائے۔ اور ہم دلجمعی کے _____ ساتھ دشمن کا مقابلہ کر سکیں۔ یہ ایسا موقع تھا کہ دشمن کی قوت کو دیکھ کر اہل ایمان کو سخت پریشانی لاحق تھی حتیٰ کہ بَلَّغْتَ الْقُلُوبَ الْحَتَا جِرُ اُن کے دل اچھل کر گئے تک آگئے تھے، کا منظر تھا اِس حالت میں وہ رب العزت سے دُعا کر رہے تھے کہ مولا کریم! ہمیں دشمن کے مقابلے میں صبر کی دولت عطا کر اور ہمارے قدموں کو ثابت رکھ اور پھر آخری بابت یہ کہ وَانْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ کافروں کے خلاف ہماری مدد فرما اور ان پر غلبہ عطا فرما۔ کفار کفر کے پردہ گم کے داعی ہیں۔ اور اہل ایمان حق کا کلمہ بلند کرنا چاہتے ہیں۔ نیکی، اطاعت اور تیری رضا کا پردہ گم

نافذ کرنا چاہتے ہیں۔ لہذا ان کی نصرت فرما۔

جب جالوت نے دیکھا کہ مقابلے میں معمولی سا لشکر ہے تو کہنے لگا میری ساری فوج کو لوٹنے کی ضرورت نہیں ہے۔ اس لشکر کے لیے تو میں اکیلا ہی کافی ہوں۔ اُس نے میں جنگ کا طریقہ یہ تھا کہ ابتداء میں دونوں طرفوں سے ایک ایک آدمی نکلتا اور مقابلہ کرتا۔ پھر دونوں اطراف سے ایک ایک اور سپاہی نکلتا ہے۔ حتیٰ کہ عام جنگ شروع ہو جاتی۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ میں جنگ بدر میں بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ جب کفار مکہ نے مقابلے کے لیے مسلمانوں کو لاکھ لاکھ آدمیوں کی طرف سے انصار مدینہ میں سے کچھ جاننا نہ نکالے مگر کفار نے کہا۔ کہ یہ تو مدینہ کے کاشتکار ہیں۔ ہمارے مقابلے کے لیے ہمیں ہم پلہ لوگ آئیں۔ چنانچہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حضرت علیؓ، حضرت عمرؓ اور حضرت عبیدہؓ کو میدان میں آنے کا حکم دیا۔ چنانچہ اُدھر سے حضرت عبیدہؓ شہید ہوئے اور کفار کے تین جوان جہنم واصل ہوئے۔

حضرت داؤد علیہ السلام کا کارنامہ

اہل اسلام کے لشکر میں حضرت داؤد علیہ السلام کے والد الیاس یا یسی بن عویمہ بھی شامل تھے۔ ان کے چھ بیٹے تھے جن میں داؤد علیہ السلام سب سے کم سن تھے کہتے ہیں کہ آپ کم سنی کے باعث جنگ میں شرکت کے لیے نہیں آئے تھے۔ بلکہ اپنے بڑے بھائیوں کو سامان پہنچانے کے لیے وہاں پہنچے تھے، اُدھر اللہ کے نبی کو حکم ہوا کہ جالوت کے مقابلے کے لیے داؤد کو نکالو۔ آپ نے اُن کے باپ کو جمع چھ بیٹوں کے طلب کیا۔ اور مطابق حکم الہی داؤد علیہ السلام سے پوچھا کیا وہ جالوت کا مقابلہ کریں گے انہوں نے اثبات میں جواب دیا۔ چنانچہ اللہ کے نبی نے آپ کو جالوت کے مقابلہ کے لیے نکالا۔ آپ نے تلوار، تیر یا نیزہ استعمال کرنے کی بجائے دشمن پر پتھر پھینکنے کا فیصلہ کیا۔ اگرچہ آپ کم سن تھے مگر بڑے ذہین اور پتھر چلانے میں بڑے ماہر تھے۔ چنانچہ آپ نے اپنے تھیلے سے ایک پتھر نکالا اُسے فلاخن میں ڈالا اور زور سے گھما کر جالوت کو دے مارا۔ جالوت سر تاپا لمبے میں غرق تھا، صرف اُس کا ماتھا کھلا تھا۔ پتھر وہیں پر جا کر لگا۔ اور سر کے پار نکل

گیا۔ آپ نے دوسرا درتیر ہفت چلایا تو جالوت زمین پر گر گیا۔ آخر داؤد علیہ السلام نے اس کو
 اوپر پہنچ کر اس کا کام تمام کر دیا۔ جب لشکر نے دیکھا کہ اُن کا سردار مارا گیا ہے۔ تو اس
 کی جگہ دوسرے نے لینے کی کوشش کی، مگر وہ بھی کیفر کردار کو پہنچا۔ آخر دشمن کے لشکر
 میں بھگدڑ مچ گئی۔ اہل ایمان نے ان کا تعاقب کر کے انہیں مکمل شکست سے ہمکنار
 کر دیا۔ اسی واقعہ کے متعلق یہاں ارشاد ہوا ہے۔ فَهَزَمُوهُمْ بِأَذْنِ اللَّهِ اس نے
 نے فلسطینیوں کو اللہ کے حکم سے شکست دیدی وَقَتَلَ دَاوُدُ جَالُوتَ اور حضرت
 داؤد علیہ السلام نے سالار لشکر جالوت کو قتل کر دیا۔

مناقب
 حضرت داؤد علیہ السلام

تفسیری روایات میں آتا ہے کہ جب حضرت داؤد علیہ السلام اپنے باپ اور
 بھائیوں کے پاس میدان جنگ کی طرف آئے تھے۔ تو راستے میں درختوں کے پتوں
 سے آواز آئی، اے داؤد! تمہارے قریب یہ پتھر ہیں انہیں اٹھا لو، تمہارے کام آئیں گے
 چنانچہ آپ نے ان میں سے تین پتھر اٹھا کر تھیلے میں ڈال لیے اور پھر یہی پتھر اپنے
 جالوت پر چلائے جس سے وہ ہلاک ہو گیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ آپ ایک
 دن روزہ رکھتے اور ایک دن افطار کرتے۔ آپ اتنے بہادر تھے کہ دشمن کے
 مقابلے میں کبھی پشت نہیں پھیری۔ آپ بچپن میں بجلیاں چراتے تھے۔ جب کبھی کوئی
 بھیڑ یا شیر بجہ کیوں پر حملہ کرتا تو آپ اُس کے جڑے پھاڑ دیتے۔ اللہ نے اتنی
 طاقت عطا کی تھی۔ اگرچہ قدیم آپ چھوٹے تھے۔ مگر جسم میں قوت بلا کی تھی۔
 آپ نہایت خوش الحان تھے۔ جب آپ تلاوت کرتے تو پرندے بھی آپ کی
 آواز سننے کے لیے بٹھ جاتے، اُن کا لہجہ داؤدی آج بھی محاوراً استعمال ہوتا ہے
 اللہ تعالیٰ نے لوہے کو آپ کے ہاتھ پر موم کر دیا تھا۔ جدھر چاہتے موڑ دیتے۔
 چنانچہ آپ لوہے کی زرہیں بھی بناتے تھے۔ عبادت کا یہ حال تھا کہ آپ کو عبد البشر
 کہا گیا ہے۔ یعنی آپ اپنے زمانے میں سب سے زیادہ عبادت گزار تھے۔

وَاللَّهُ اللَّهُ الْعَلَّافُ اور اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو حکومت بھی عطا
 کی تفسیری روایات میں آتا ہے کہ طالوت کے بعد آپ ان کے جانشین ہوئے

آپ کو خلیفہ اللہ کہا جاتا ہے۔ یَا دَاوُدُ إِنَّا جَعَلْنَاكَ خَلِيفَةً فِي الْأَرْضِ اے داؤد! ہم نے آپ کو زمین میں خلیفہ مقرر کیا۔ بائبل کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ کی بہادری سے متاثر ہو کر طاوت نے اپنی بیٹی کا نکاح حضرت داؤد سے کر دیا تھا۔

حکومت کے علاوہ فرمایا وَالْحُكْمَةَ اللہ تعالیٰ نے داؤد علیہ السلام کو حکمت بھی عطا کی۔ عام طور پر حکمت سے مراد غایت درجہ کی عقل مندی اور معاملہ فہمی ہوتا ہے تاہم بعض فرماتے ہیں کہ یہاں پر حکمت سے مراد نبوت ہے اللہ تعالیٰ نے آپ کو نبوت سے بھی سرفراز فرمایا۔ اس سے پہلے اسرائیلیوں میں حکومت اور نبوت دو مختلف شخصیتوں کے پاس ہوتی تھی جیسے نبی سموئیل علیہ السلام تھے اور حکومت طاوت کے پاس تھی مگر یہ دونوں چیزیں داؤد علیہ السلام پر آکر اکٹھی ہو گئیں۔ طاوت کے بعد آپ کو خلافت ملی اور حضرت سموئیل کے بعد آپ نبوت پر بھی سرفراز ہوئے۔

ایک اور خصوصیت جو اللہ تعالیٰ نے آپ کو عطا کی، وہ ہے وَعَلَّمَكَ مَا لَيْسَ آءُ اللہ تعالیٰ نے جو چاہا حضرت داؤد علیہ السلام کو سکھا دیا۔ داؤد علیہ السلام کا ذکر قرآن پاک میں سورہ مقامات پر آیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو مختلف فنون اور علوم سے نوازا۔ پہنڈوں کی بولسوں کے علم کا تذکرہ تو سورہ نمل میں موجود ہے عَلَّمَنَا مَنَطِقَ الطَّيْرِ ہمیں اڑتے جانوروں کی بولی سکھائی گئی حضرت داؤد علیہ السلام اور حضرت سلیمان علیہ السلام کے متعلق فرمایا وَلَقَدْ آتَيْنَا دَاوُدَ وَسُلَيْمَانَ عِلْمًا ہم نے داؤد اور سلیمان علیہما السلام کو علم عطا کیا۔ آپ کے بعد آپ کے بیٹے سلیمان علیہ السلام بھی نبی ہوئے اور خلیفہ ہوئے۔ یہ دور بنی اسرائیل کا سنہری دور تھا۔ خلافت اور نبوت ایک جگہ پر جمع تھیں امن اور خوشحالی کا زمانہ تھا۔ اچھائی کو غلبہ حاصل تھا۔ اور بُرائی دم توڑ چکی تھی۔

آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے جہاد کا فلسفہ بھی بیان فرمادیا۔ وَكَوَلَا دَفْعُ اللَّهِ الشَّاْسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لِّفَسَادِ الَّذِيْنَ اَرَضَ اَگر اللہ تعالیٰ بعض لوگوں کو بعض دوسروں کے ذریعے نہ ہٹاتے تو زمین میں فساد برپا رہتا۔ یعنی جب کسی گروہ نے خدا کی زمین پر بدمعنی پھیلانے کی کوشش کی تو اللہ تعالیٰ نے اس کے

مقابلے میں دوسری جماعت کو بھیج کر مفسدین کا خاتمہ کر دیا۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوا۔ جب قوم عمالہ کی زیادتیاں حد سے بڑھ گئیں تو اللہ تعالیٰ نے طاہرات کے ذریعے ان کا قلع قمع کر دیا۔ اسی لیے دشمن کے ساتھ جہاد کا حکم ہے ”حَتَّىٰ لَا تَكُونَ فِتْنَةً“ یہاں تک کہ فتنہ و فساد بالکل ختم ہو جائے کفر و شرک کی ناپاکی دور ہو جائے، اللہ تعالیٰ کی اطاعت ہونے لگے اور اسلام کے راستے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ رہے۔ یہی وہ مشن ہے جسے جمال الدین افغانیؒ نے کر اٹھے۔ اور اپنی پوری زندگی اس کام کے لیے وقف کر دی۔ آپ نے مسلمانوں کو ذہن نشین کر دیا کہ عیسائی اور یہودی انگریز اسلام کی دشمن طاقتیں ہیں۔ وہ اسلام کی شمع کو بجھانا چاہتی ہیں۔ لہذا اہل اسلام کو اس باغ کا نوٹس لینا چاہیے۔ اور اپنا دفاع کرنا چاہیے۔ شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ پہلے مرحلے میں دفاعی جہاد (DEFENSIVE) فرض ہے۔ اگر جہاد سے روگردانی کی گئی تو درندہ صفات طاقتیں دنیا میں چھائی رہیں گی۔ اور کسی کی جان، عزت و آبرو محفوظ نہ ہوگی۔ بزدلی دکھانا اپنے آپ کو ہلاکت میں ڈالنے کے مترادف ہے۔

بہر حال فرمایا کہ یہ سنت اللہ ہے کہ وہ کسی برائی کو ختم کرنے کے لیے اس سے بڑھ کر وسائل پیدا کر دیتا ہے۔ دنیا میں کتنے فرعون، ہامان اور غرہ پیدا ہوئے مگر آخر ختم ہو گئے۔ کبھی جرمنی کا طوطی بولتا تھا۔ اب امریکہ اور روس سپر پاورز ہیں مگر اللہ تعالیٰ اپنے پروگرام کے مطابق اول بدل کر رہتا ہے۔ فرمایا حقیقت یہ ہے کہ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ ذُو فَضْلٍ عَلَی الْعٰلَمِیْنَ اللہ تعالیٰ اہل جہان پر فضل کر رہا ہے۔ جب وہ کسی ظالم کی سچ کنی کرتا ہے۔ تو یہ صحیح مصلحت میں دنیا والوں پر اس کا فضل ہوتا ہے انہیں ظلم سے نجات مل جاتی ہے۔ شاہ ولی اللہؒ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کے مشن میں یہ بات بھی داخل ہے کہ دنیا میں ظلم کو ختم کریں۔ حق و انصاف کا نظام قائم کریں عقیدہ توحید کو بچتے کریں۔ چنانچہ ظلم کو مٹانے کے لیے جہاد کی ضرورت ہے۔ جہاد کی مشروعیت اگلی آیات اور کئی دوسرے مقامات پر آئیگی۔

تِلْكَ آيَاتُ اللَّهِ نَتْلُوهَا عَلَيْكَ بِالْحَقِّ وَأَنَّكَ لَمِنَ الْمُرْسَلِينَ ﴿٢٥٢﴾
 تِلْكَ الرُّسُلُ فَضَّلْنَا بَعْضَهُمْ عَلَى بَعْضٍ مِنْهُمْ مَنْ
 كَلَّمَ اللَّهُ وَرَفَعَ بَعْضَهُمْ دَرَجَاتٍ وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ
 الْبَيِّنَاتِ وَأَيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا اقْتَتَلَ
 الَّذِينَ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مِنْ بَنِي إِسْرَءِيلَ مَنْ أَبَدٍ مَا جَاءَهُمُ الْبَيِّنَاتُ وَلَكِنْ
 اخْتَلَفُوا فَمِنْهُمْ مَنْ آمَنَ وَمِنْهُمْ مَنْ كَفَرَ وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ
 مَا اقْتَتَلُوا وَلَكِنَّ اللَّهَ يَفْعَلُ مَا يُرِيدُ ﴿٢٥٣﴾

ترجمہ : یہ اللہ تعالیٰ کی آیتیں ہیں جو ہم آپ کو حق کے ساتھ سنتے ہیں۔ اور بیشک
 آپ اللہ تعالیٰ کے رسولوں میں سے ہیں (۲۵۲) یہ سب رسول ہم نے ان میں سے بعض
 کو بعض پر فضیلت بخشی ہے۔ بعض ان میں سے وہ ہیں کہ جن کے ساتھ اللہ تعالیٰ نے
 کلام کیا اور بعض کے درجات بہت بلند کیے۔ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم (علیہ السلام)
 کو واضح نشانیاں دیں۔ اور ہم نے اس کی روح القدس کے ساتھ تائید کی۔ اور اگر
 اللہ تعالیٰ چاہتا تو نہ لڑتے وہ لوگ جو ان نبیوں کے بعد آئے۔ بعد اس کے کہ ان کے
 پاس واضح باتیں آچکی تھیں۔ لیکن انہوں نے اختلاف کیا۔ اور بعض ان میں سے ایمان
 لائے۔ اور ان میں سے بعض نے کفر اختیار کیا۔ اور اگر اللہ چاہتا، تو وہ نہ لڑتے
 لیکن اللہ تعالیٰ جو چاہتا ہے کہہ تا ہے (۲۵۳)

بنی اسرائیل کے واقعات بیان کرنے کے بعد اللہ تعالیٰ نے
 حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کی نبوت کا بطور خاص اور پھر تمام انبیاء کی نبوت
 کا تذکرہ کیا ہے۔ اس سے پہلی آیت میں جہاد کی حکمت بیان فرمائی تھی۔ اور

معتزین کے اعتراض کا رد تھا۔ اور واضح کیا تھا کہ اگر جہاد فرض نہ کیا جاتا تو مفسدین زمین میں فساد برپا کر کے اس کو خراب کر دیتے۔ مگر اللہ تعالیٰ نے اپنی رحمت فرمائی۔ اور بد امنی کے خاتمے کے لیے جہاد کا حکم دیا۔ تمام انبیاء اپنے اپنے دور میں جہاد کرتے آئے ہیں۔ اسی ضمن میں طاووت کا ذکر کیا۔ جو کہ سمویل نبی کے زمانے میں ہوا ہے۔ آپ کے نام پر بائبل میں دو صحیفے بھی موجود ہیں۔ آپ خود بھی جہاد میں شریک ہوئے۔

بعثت انبیاء کا مقصد

حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انبیاء علیہم السلام کی بعثت کا مقصد لوگوں کو ایمان اور توحید کا راستہ بتانا، اور ان کے عقائد اور اعمال کی اصلاح کرنا ہے اس کے علاوہ رسومات، باطلہ کو مٹانا اور رفع تعظلم بین الناس یعنی لوگوں کے درمیان ظلم و زیادتی کو فرو کرنا ہے۔ اور ان مقاصد کے حصول کے لیے جہاد لازمی ہے۔ اس کے بغیر کامیابی نہیں ہو سکتی۔ شاہ صاحب فرماتے ہیں کہ معاشرہ میں ظلم و زیادتی برپا کرنے والے لوگوں کی مثال ایسی ہے جیسے جسم میں پھوڑا ہوتا ہے۔ جب تک اس پھوڑے کو کاٹ نہیں دیا جاتا، جسم تندرست نہیں ہو سکتا، اسی طرح جب تک فسادی لوگوں کو جڑ سے نہیں اکھاڑ دیا جاتا، معاشرے میں امن و امان قائم نہیں ہو سکتا۔ اسی آپریشن کا نام جہاد ہے۔ اس آیت کہ میر میں اللہ تعالیٰ نے حضور علیہ السلام کی نبوت و رسالت کی تصدیق فرمائی ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ بیان کیا۔ کہ وہ ہزاروں کی تعداد میں موت سے ڈر کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ مگر اللہ نے انہیں راستے میں ہی موت سے ہم کنار کر دیا۔ پھر اللہ کے نبی نے دعا کی تو اللہ تعالیٰ نے انہیں دوبارہ زندگی دی۔ اُن کی اپنی فرمائش پر اللہ تعالیٰ نے طاووت کو اُن کا امیر مقرر کیا۔ اور اس کی سرکردگی میں جہاد کا حکم دیا۔ پھر راستے میں لشکر کی آزمائش ہوئی۔ اور اُن میں سے بہت تھوڑے اس آزمائش میں پولے اترے

تصدیق رسالت

اکثریت نے بے صبری کا اظہار کیا۔ اور جہاد سے محروم رہے۔ جانثاروں کی ایک قلیل تعداد کو اللہ نے فتح سے ہم کنار کیا۔ اس موقع پر اللہ نے دعا کا فلسفہ سکھایا۔ اور پھر میدان جنگ میں دشمن کا سردار حضرت داؤد علیہ السلام کے پتھر سے ہلاک ہوا۔ طاووت کے بعد اللہ تعالیٰ نے حضرت داؤد علیہ السلام کو خلیفہ بنایا۔ یہ تمام واقعات ہیں، جنہیں

بندے ہیں اور معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ انہیں گناہ سے پاک رکھتا ہے۔ البتہ باعتبار فضائل اور خصوصیات فَضْلًا بَعْضُهُمْ عَلَى بَعْضٍ اللہ تعالیٰ نے بعض کو بعض پر فضیلت بخشی ہے یہاں پر ایک غلبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے لَا تَفْضَلُوا بَيْنَ الْأَنْبِيَاءِ یعنی نبیوں کے درمیان تفاضل نہ کرو۔ یہ مجھے بھی باقی نبیوں کے درمیان فضیلت نہ دو۔ یہ یاد رکھ لو کہ یونس ابن مثنیٰ کے مقابلہ میں کسی کو فضیلت نہ دو۔ اس کے متعلق محدثین کرام فرماتے ہیں کہ اس کا مطلب یہ ہے کہ اس معاملہ میں اپنی عقل سے بات نہ کرو کہ بعض کو بعض پر فضیلت دینے لگو اور بعض کی توہین کرنے لگو، ایسا نہ کرو، کیونکہ ایسا کرنے سے کفر لازم آجاتا ہے۔ فضیلت کا جو ذکر اللہ تعالیٰ نے فرمادیا ہے۔ اُسی پر کاربند رہو۔ چنانچہ اس امر میں اجماع اور اتفاق ہے کہ حضور علیہ السلام کو اللہ تعالیٰ نے تمام انبیاء پر فضیلت دی ہے۔ آپ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام حضرت موسیٰ علیہ السلام، حضرت عیسیٰ علیہ السلام، حضرت نوح علیہ السلام کے درجات ہیں خصوصاً حضرت ابراہیم علیہ السلام کی اہمیت عامہ کا ذکر خود قرآن میں موجود ہے رَاحِبٌ جَاعِلُكَ لِلنَّاسِ إِمَامًا یعنی میں تم کو تمام لوگوں کا امام بنانے والا ہوں۔

اس مقام پر فضائل انبیاء کے متعلق ارشاد ہے مِنْهُمْ مَنْ كَلَّمَ اللَّهُ ان میں سے بعض ایسے ہیں۔ جن کے ساتھ اللہ نے کلام کیا۔ چنانچہ موسیٰ علیہ السلام کے متعلق فرمایا۔ وَكَلَّمَ اللَّهُ مُوسَىٰ تَكْلِيمًا اور کوہ طور پر اللہ نے موسیٰ علیہ السلام سے بالمشافہ کلام فرمایا۔ معراج کے واقعہ میں آتا ہے۔ کہ حضرت ابوذر غفاریؓ نے حضور علیہ السلام سے دریافت کیا۔ کہ اَوَّلُ النَّبِيِّينَ یعنی سب سے پہلے نبی کون ہیں۔ آپ نے فرمایا آدم علیہ السلام۔ پھر عرض کیا ہے۔ حضور! کیا وہ نبی ہیں۔ فرمایا، ہاں وہ سبھی مَكَلَّمُ اللہ تعالیٰ نے اُن سے بالمشافہ کلام کیا۔ آپ سب سے پہلے نبی ہیں اور سب سے آخری نبی حضور خاتم النبیین علیہ التَّحِيَّةُ والسلام ہیں۔ فرمایا وَدَفَعَ بَعْضُهُمْ دَرَجَاتٍ اور بعض کے درجات بلند کیے۔ اس آیت میں بعض کے درجات سے مراد حضور علیہ السلام ہیں۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ نے آپ کے درجات سب نبیوں سے

زیادہ بلند کئے ہیں۔ اللہ نے آپ کو مقام محمود پر سرفراز فرمایا ہے۔ جس کا مظاہرہ قیامت کے روز ہوگا۔ آپ کو شفاعت کبریٰ عطا ہوئی ہے۔ آپ کو وسیلہ عطا ہوا ہے آپ کی امت کو اکثریت حاصل ہے آپ کی امت تمام امتوں سے افضل ہے آپ کو کتاب بھی سب سے افضل دی گئی ہے اور آپ کو اللہ نے بیشمار معجزات عطا کئے ہیں غرضیکہ آپ کے درجہ بہت بلند فرمائے ہیں۔ اسی لیے فرمایا کہ بعض کے درجات بلند کیے ہیں۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام
کے معجزات

فرمایا وَآتَيْنَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ الْبَيِّنَاتِ اور ہم نے عیسیٰ ابن مریم کو واضح نشانیاں عطا کیں۔ قرآن میں اسکی وضاحت موجود ہے۔ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے معجزات میں مردوں کو زندہ کرنا۔ کوڑھیوں کو تندرست کرنا، اللہ کے حکم سے غیب کی خبریں دینا۔ گھر سے کھا کر آنے والے کو بتا دینا کہ کیا کھایا ہے وغیرہ شامل ہیں۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا جہاں بھی قرآن میں ذکر آتا ہے۔ عیسیٰ ابن مریم کے نام سے آتا ہے۔ جس سے یہ بتانا مقصود ہے۔ کہ آپ کا باپ کوئی نہ تھا۔ اللہ نے انہیں بغیر باپ کے پیدا کیا۔ قیامت کے روز بھی آپ کو يَا عِيسَى ابْنَ مَرْيَمَ کے لقب سے پکارا جائے گا۔ اور پھر لو چھپا جائے گا۔ کہ کیا آپ نے لوگوں کو کہا تھا۔ کہ مجھے معبود بنا لو۔ آپ جواب دیں گے۔ سُبْحَانَكَ اے اللہ تو پاک ہے۔ میں ایسی بات کس طرح کہہ سکتا ہوں جس کا مجھے حق نہیں۔ میں نے تو انہیں وہی کچھ کہا جس کا تو نے مجھے حکم دیا۔ گویا عیسیٰ علیہ السلام کی الوہیت کا رد کیا گیا ہے۔ اور ایسا عقیدہ رکھنے والوں کی سزائش کی گئی ہے۔ مگر کیا کیا جائے کہ سرسید اور پرویز جیسے لوگ بھی موجود ہیں۔ جو حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا باپ بھی ثابت کرتے ہیں۔ یہ بات قرآن پاک کی تعلیم کے قطعاً خلاف ہے۔ اور ملحدانہ عقیدہ ہے۔ اللہ فرماتا ہے کہ ہم نے عیسیٰ علیہ السلام کو واضح نشانیاں دیں۔

روح القدس
سے تائید

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے متعلق ہی فرمایا وَإِيَّدْنَاهُ بِرُوحِ الْقُدُسِ ہم نے روح القدس کے ساتھ اُن کی تائید فرمائی۔ روح القدس کا معنی عام طور پر جبرائیل علیہ السلام کیا جاتا ہے۔ مطلب یہ کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام جدھر بھی جاتے تھے

ہو سکتے۔ ان میں سے ہرگز وہ اپنا پروگرام نافذ کرنا چاہے گا۔ لہذا ان کے درمیان ضرور طح ہوگی اور یہی جہاد ہے۔ جو اہل اسلام پر فرض کیا گیا ہے۔ کیونکہ جہاد کے بغیر فتنہ و فساد کا قلع قمع نہیں ہو سکتا کچھ درس میں آچکا ہے۔ کہ جہاد کے ذریعے شر و فساد کو مٹانا مقصود ہے اسی چیز کے متعلق فرمایا کہ اگر اللہ تعالیٰ بعض کو بعض کے ذریعے نہ مٹاتا تو زمین میں فساد برپا رہتا۔ لہذا جہاد لازم قرار دیا۔ اور بتا دیا کہ جہاد کو ترک کر دو گے تو یسلط اللہ ذلۃ علیکم (الہود و د) اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دے گا اور یہ ذلت ختم نہ ہوگی۔ حتیٰ تدعوا الی دینکم جب تک تم اپنے دین کی طرف پلٹ کر نہ جاؤ گے۔ فرمایا وَلَوْ شَاءَ اللَّهُ مَا أَفْتَلَوْا اَکْمَرُ اللہ چاہتا تو یہ لوگ آپس میں نہ لڑتے سب ایک ہی راستے پر ہوتے اور ان میں کوئی اختلاف رونما نہ ہوتا۔ مگر حقیقت یہ ہے کہ اللہ نے انسان کو عقل اور قوت عطا کی ہے۔ اُسے اشرف المخلوقات بنایا ہے۔ اور پھر اسے اختیار دیا ہے کہ وہ اپنے ارادے سے جو راستہ چاہے اختیار کرے۔ اَنَا هَدَيْتُهُ السَّبِيلَ اِمَّا شَاكَرًا وَّ اِمَّا كَفُورًا یہ اپنے ارادے کا خود ذمہ دار ہے جو راستہ اختیار کرے گا اس کے مطابق سزا و جزا کا مستحق ہوگا۔ اگر صحیح راستہ اختیار کرے گا تو اللہ تعالیٰ راضی ہو جائے گا۔ اور اللہ ایمان پر راضی ہوتا ہے کفر پر راضی نہیں ہوتا۔ اہل ایمان کو نجات دے گا اور ان کو فلاح حاصل ہوگی۔

فرمایا کہ یہ اللہ تعالیٰ کی قدرت میں ہے کہ وہ چاہتا تو یہ لوگ اختلاف کا شکار نہ ہوتے وَلَیْسَ بِاللَّهِ یَفْعَلُ مَا یُؤْتِیْہِ مَکْمَرُ اللہ تعالیٰ وہ کچھ کرتا ہے جو اس کا اپنا ارادہ ہوتا ہے اللہ تعالیٰ انسان کا امتحان لینا چاہتا ہے۔ اور اپنے بندوں کو آزما کر اس کے مطابق جزا یا سزا دے گا۔ اس کا منشاء یہ ہے کہ لوگ ایمان کا راستہ اختیار کریں۔ اور جو لوگ کفر کے راستے پر چل نکلیں ان کے شر و فساد کو مٹانے کے لیے ایمان دے جہاد کریں تاکہ اسلام کو غلبہ حاصل ہو۔ اور اللہ کا دین اختیار کرنے میں کوئی رکاوٹ باقی نہ ہے۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ مِنْ قَبْلِ أَنْ
يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعٌ فِيهِ وَلَا خُلَّةٌ وَلَا شَفَاعَةٌ وَالْكَافِرُونَ
هُمُ الظَّالِمُونَ ﴿٢٥٤﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اس میں سے خرچ کر دو جو ہم نے تم کو رزق دیا ہے
اس سے پیشتر کہ وہ دن آجائے۔ جس میں خرید و فروخت نہیں ہوگی۔ اور نہ دوستی ہوگی۔
اور نہ سفارش ہوگی اور جو لوگ کفر کرنے والے ہیں وہی بڑے ظالم ہیں۔

گزشتہ درس میں نبوت اور رسالت کا ذکر تھا۔ اس سے پہلے جہاد کا ذکر تھا۔
اللہ تعالیٰ نے جہاد کی حکمت بھی واضح فرمائی۔ اس آیت میں انفاق فی سبیل اللہ کا بیان ہے
اس کا تعلق اس آیت کے ساتھ ہے۔ جس میں بنی اسرائیل کا ذکر ہے۔ کہ ان کا ایک
گروہ موت کے ڈر سے بھاگ کھڑا ہوا۔ پھر اللہ نے انہیں راستہ میں موت سے دی
پھر اپنے خاص فضل سے انہیں دوبارہ زندگی عطا کی۔ وہاں پر اللہ تعالیٰ نے فرمایا
”قَاتِلُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ“ اللہ کے راستے میں دشمنانِ خدا اور دشمنانِ دین سے
ٹکھو جاؤ۔ اور پھر درمیان میں یہ بھی فرمایا ”مَنْ ذَا الَّذِي يُقْرِضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا“
کون ہے جو اللہ کو قرضِ حسنہ دے۔ اور اللہ اُسے بڑھا چڑھا کر عطا کرے گا۔ یہ مالِ حشر
کسے کی ترغیب ہو گئی۔

مفسرین کہہ ام بیان فرماتے ہیں۔ کہ سورۃ البقرہ سب سے لمبی سورۃ ہے۔ اور اس میں
مختلف الانواع مسائل ذکر ہوئے ہیں۔ اس سورۃ میں عبادات، معجزات اور معاملات
کا بیان ہے۔ خصوصاً معاملات کی بہت سی تفصیلات ہیں۔ عالمی قوانین یعنی نکاح
و طلاق کے مسائل بیان ہوئے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ احکام کی تعمیل نفس پر شاق
گزرتی ہے۔ انسان کا نفس اور اس کی سوچ بوجھل ہو جاتی ہے۔ خصوصاً جان و مال کی

قربانی پیش کرتے وقت بڑی دشواری پیش آتی ہے لہذا اللہ تعالیٰ نے اس قربانی کے لیے خاص تاکید فرمائی ہے۔ اور اکثر لوگ جان و مال کی وجہ سے ہی معصیت میں مبتلا ہوتے ہیں۔ محبت کسی نفس کی ہو یا مال کی، یہ انسان کو قانون کی خلاف ورزی پر ابھارتی ہے اسی لیے اللہ تعالیٰ نے ایک موقع پر جان کو کھپانے کا حکم دیا ہے۔ اور دوسری جگہ مال خرچ کرنے کی ترغیب دی ہے۔ بعض لوگ ایسے بھی ہوتے ہیں۔ جو جان کو لگا دینا نسبتاً آسان سمجھتے ہیں۔ مگر مال کے خرچ کرنے میں نکیل واقع ہوتے ہیں یہ ایک روحانی بیماری ہے۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد ہے اُمّی دَاۤءٍ اَدُوٌّ مِّنَ الْبَخْلِ بخل سے بڑی بیماری کون سی ہے۔ کسی نے خوب کہا ہے۔

مگر جان طلبی مذاقتہ نیست
مگر زر طلبی سخن میں جاہست

یعنی اگر جان کا مطالبہ ہے۔ تو اس میں کوئی مذاقتہ نہیں، جان حاضر ہے۔ اور اگر مال چاہتے ہو۔ تو یہ بات نہیں بن سکے گی۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے مال خرچ کرنے کے متعلق خصوصی احکام دیے ہیں۔ مال پر بہت سی عبادات موقوف ہیں۔ اگر مال خرچ نہیں کیا جائے گا۔ تو جہاد بھی نہیں ہو سکتا۔ زکوٰۃ ادا نہیں ہوتی، حج نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اگلے رکوع میں اتفاق فی سبیل اللہ کا تذکرہ بالتفصیل آئے گا۔

اتفاق فی سبیل اللہ

چنانچہ یہاں پر بھی ارشاد ہوتا ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اے ایمان والو اَنْفِقُوْا مِمَّا رَزَقْنٰكُمْ خَرِجْ کَر داس میں سے جو ہم نے تم کو عطا کیا ہے۔ مراد اللہ کے راستے میں خرچ کرنا ہے۔ یہاں پر رَزَقْنٰكُمْ خصوصاً توجہ طلب ہے۔ اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں۔ جو کچھ تمہارے پاس ہے۔ یہ ہمارا عطا کردہ ہے۔ ہم نے ہی اسباب و وسائل مہیا کیے تو تمہارے پاس مال آیا و مگر نہ انسان اگر اپنی ذاتی کاوش کی بنا پر کچھ حاصل کرنا چاہتا، تو اُسے کچھ نہ ملتا۔ یہ مال ہم نے ہی تمہیں دیا ہے۔ جس سے خرچ کرنے کا حکم دے رہے ہیں۔ لہذا اس میں کسی قسم کی حیل و حجت نہیں ہونی چاہیے۔ اسی موضوع کو سورۃ نور میں بھی بیان فرمایا۔ جہاں غلاموں کو آزاد کرنے کی ترغیب دی گئی ہے

وَمَا مِنْ فَرَمَاءٍ وَاتَّوَهُهُم مِّن مَّالِ اللَّهِ الَّذِي آتَاكَ اللَّهُ كَيْفَ يُرِيدُ مَالٍ مِنْهُ
 اُن کو دو، تاکہ وہ مکاتبت کرے اپنی جان چھڑا سکیں۔ یہاں پر یہ نظریہ واضح کر
 دیا گیا کہ ایماندار اپنے مال کو اپنی ذاتی چیز نہیں سمجھتا بلکہ اللہ کا انعام سمجھتا ہے۔ جو اس
 نے مہربانی فرما کر عطا کیا۔ کبھی کوئی اسباب پیدا کر دے۔ کہیں مزدوری مل گئی۔ نوکری
 میسر آگئی، کاروبار میں برکت ڈال دی۔ وراثت سے حصہ مل گیا، کوئی تحفہ مل گیا۔ یہ سب
 مالک الملک کے پیدا کردہ اسباب ہیں۔ اس لیے انسان کو جو بھی مال میسر آتا ہے
 وہ خدا تعالیٰ کی جانب سے ملتا ہے لہذا اس کے رستے میں خیرات، صدقات،
 زکوٰۃ وغیرہ پر خرچ کرنا کوئی اپنا ذاتی کارنامہ نہیں سمجھنا چاہیے۔ بلکہ اس کو فقیہ پرست
 کا شکر ادا کرنا چاہیے کہ اُس کا دیا ہوا مال اُس کے حکم کے مطابق خرچ ہوا۔

اب سوال یہ ہے کہ جو مال خرچ کیا جا رہا ہے وہ آیا کہاں سے ہے۔ کھائی
 حلال کی ہے یا حرام کی۔ ناجائز طریقے سے مال حاصل کرنا کی بھی سخت وعید ہے۔
 ”وَلَا تَأْكُلُوا أَمْوَالَكُمْ بَيْنَكُمْ بِالْبَاطِلِ“ ایک دوسرے کا مال ناجائز طریقے
 سے مت کھاؤ۔ ”وَاجْمَعُوا فِي الطَّلَبِ“ طلب کرنے میں اچھا طریقہ اختیار کرو۔
 حرام کی کھائی سے اجتناب کرو۔ حرام کی کھائی کھانے والے کی نہ عبادت قبول ہوتی ہے
 نہ صدقہ کسی کام آتا ہے۔ اور یہی چیز مرنے کے بعد جہنم کا توشہ بنے گی۔

اب خرچ کرنے کے متعلق بھی اصول و قواعد ہیں۔ ہر شخص کو من مانی کرنے کی
 اجازت نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جگہ جگہ فرمایا ”وَلَا تُسْرِفُوا“ اسراف نہ کرو ”وَلَا تُبْذِرُوا“
 فضول خرچی سے بچ جاؤ۔ اللہ کے دیے ہوئے انعام کو صحیح طریقے سے خرچ کرو
 ہمارے دیے ہوئے مال میں سے اپنی جائز ضرورتیں بھی پوری کرو۔ اور پھر حقوق و فرائض
 اور واجبات کا خیال بھی رکھو۔ جہاد کے لیے خرچ کرو۔ اقامتِ دین اور تبلیغِ دین
 پر خرچ کرو۔ غریب و مسکین کی اعانت کرو۔ مقروض کا قرضہ ادا کرو۔ تاہم اپنی ذاتی
 ضرورتیں مقدم ہیں۔ اُن کو پہلے پورا کرو۔ یہ بات مستحسن نہیں۔ کہ آدمی سارا مال خرچ کر دے
 اور خود محتاج ہو کر بیٹھ جائے۔ اس کے لیے تو صدیق اکبرؑ جیسا صبر و کار ہے

خرچ میں
اعتدال کی راہ

ایک صحابی کو کچھ سونا حاصل ہوا، لاکر حضور صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پیش کر دیا کہ اے اللہ کے رسول میں یہ مال صدقہ کرتا ہوں، آپ نے فرمایا ایسا مت کر و پہلے اپنی ضروریات پورا کرو۔ اس کے بعد صدقہ کرو۔ خود محتاج ہو کر بیٹھ جاؤ گے تو پھر شکوہ کرو گے۔ خاص طور پر جب کہ برداشت کا مادہ بھی نہ ہو۔ لہذا ہر کام میں اعتدال کی راہ اختیار کرو۔ پورے کا پورا مال خرچ نہ کر دو۔ بلکہ اپنی جائز ضروریات کیلئے بھی رکھ لو۔

فرمایا اللہ کے لئے میں خرچ کو فرماؤں قَبْلَ أَنْ يَأْتِيَ يَوْمٌ لَا بَيْعَ فِيهِ پشتر اس کے کہ وہ دن آجائے جب کوئی خرید و فروخت نہیں ہو سکیگی۔ اس سے مراد قیامت کا دن ہے۔ اُس دن اگر کوئی شخص کوئی قیمتی سے قیمتی چیز دیکھ بھی ایمان یا کوئی نیکی خریدنا چاہے گا تو یہ ممکن نہ ہو گا۔ اول تو کسی کے پاس دنیا کا مال و دولت ہو گا ہی نہیں جس سے کوئی چیز خریدی جا سکے۔ دوسرے وہاں کوئی بازار نہیں لگے گا جہاں خرید و فروخت ہو سکے۔ یہ دنیا عمل کی دنیا ہے۔ یہاں پر انسان اچھے اعمال کے ذریعے عبادات کے ذریعے مال خرچ کر کے آخرت کا توشہ خرید سکتا ہے۔ مگر وہاں قیامت کے دن ایسی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔ کہ کوئی شخص اپنے اعمال کی کمی کو خرید و فروخت کے ذریعے پورا کر سکے۔ وہاں خرید و فروخت قطعاً ناممکن ہوگی۔ وہاں نیکی حاصل کر نیکی کوئی صورت نہیں ہوگی۔ اس دارالعمل میں النان وَالْبَقِيَّةُ الصَّالِحَاتُ خَيْرٌ عِنْدَ رَبِّكَ مِمَّا كَسَبْتُمْ آخرت کے لیے ذخیرہ بنا سکتا ہے۔ وہ تو دارالجزا ہو گا۔ قیامت کے دن تو کردہ اعمال کا بدلہ ملے گا۔ وہاں نئے سے نئے عمل کر نیکی اجازت نہیں ہوگی۔ نہ وہاں خرید و فروخت ہوگی۔

فرمایا وَلَا تَحْلُكُوا دُہْلَیْ پرم عام دوستی بھی کام نہیں آئے گی۔ جس طرح اس دنیا میں اقربا پروری اور تعلقات کام آتے ہیں وہاں پر ایسا نہیں ہو گا۔ وہاں تو لوگ ایک دوسرے کے دشمن ہونگے اَلْاَعْدَاءُ یَوْمَئِذٍ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ عَدُوٌّ مِثْلَ شَأْنِ اَمْسٍ جس کی بنیاد نیکی اور تقویٰ تہ ہوگی اِلَّا الْمُصْتَفِیْنَ اہل ایمان کی دوستی وہاں پرفتلم ہے گی۔ مگر فاسق و فاجر اور لہو و لعب والی دوستیاں ختم ہو جائیں گی۔ ہر ایسا دوست

روز قیامت
خرید و فروخت
نہ ہوگی

دوستی کام
نہ آئے گی

دوسرے سے نفرت کریگا۔

عام سفارش
نہیں ہوگی

فرمایا جس طرح خرید و فروخت اور عام دوستی نہیں ہوگی۔ قیامت کے دن وَلَا شَفَاعَةٌ عام سفارش بھی نہیں چلے گی۔ اس دُنیا کا دستور ہے کہ بڑے لوگ سفارش کے ذریعے بڑے بڑے مجرموں کو بھی چھڑا لیتے ہیں۔ مگر قیامت کے دن ایسا نہیں ہوگا۔ وہاں سفارش ہوگی مگر اس شخص کے لیے جس کے لیے اللہ تعالیٰ اجازتِ محنت فرمائیں گے آگے آیت الکہفی آرہی ہے۔ جسے اعظم آیت فی القرآن کہا گیا ہے۔ اس میں مسئلہ سفارش کو واضح کیا گیا ہے۔ مشرک لوگ جو سمجھتے ہیں کہ ہمارے معبود ہماری سفارش کر کے ہمیں چھڑا لیں گے اور ہمیں درجات بھی دلائیں گے۔ اس قسم کی سفارش قطعاً باطل ہے۔ کیونکہ وہاں پر شفاعت مشروط ہوگی۔ دوسرے مقام پر آتا ہے۔ لَا يَشْفَعُ لَكُمْ إِلَّا مَنْ أَذِنَ لَهُ الرَّحْمَنُ وَقَالَ صَوَابًا۔ اس دِن تو کوئی کلام بھی نہ کر سکے گا سوائے اس کے کہ جسے اللہ تعالیٰ اجازت دیں گے۔ اور وہ بھی اس شرط پر کہ اُس کی بات ٹھیک ٹھیک ہو۔ غلط بات کہہ نہی تو اجازت ہی نہیں ہوگی۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا میری شفاعت اُس شخص تک پہنچے گی لِمَنْ لَا يَشْرِكُ بِاللّٰهِ شَيْئًا جو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرک میں ملوث نہ ہوا ہو۔ مشرک یا دہریہ یا کسی اور بدعتیہ کے لیے سفارش کی کوئی گنجائش نہ ہوگی۔

اسی لیے فرمایا کہ اللہ کی راہ میں مال خرچ کرو، جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لو۔ آج یہ موقع ہے۔ یہ عمل کی دنیا ہے۔ اس میں جو کچھ کر سکتے ہو کہہ لو۔ کل کو دارالجزا میں جا کر یہ موقع ہاتھ نہیں آئے گا۔ وہاں تو بدلہ دیا جائے گا۔ اُس روز نہ کوئی شخص نیکی خرید سکے گا۔ نہ کوئی دوستی کام آئیگی اور نہ کوئی سفارش کام آئے گی یہ سب کچھ بتلا دیا۔ مزید شرائط اگلی آیت میں آئیں گی۔

فرمایا وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ کہ فر کرنے والے ہی سب سے بڑے ظالم ہیں انہوں نے اللہ کے احکام، اس کی کتاب اور اس کے انبیاء کا انکار کیا۔ یہ انسان کے بدبخت ہونے کی واضح نشانی ہے۔ مشرک کے بارے میں واضح حکم ہے اَنَّ الشِّرْكَ

کفار ظالم ہیں

لَظُلْمٌ عَظِيمٌ شُرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اس سے بچ جاؤ۔ اگر شرک جیسے ظلم سے باز نہیں آؤ گے تو پھر اللہ نے جہاد کا حکم بھی دیا ہے اس کے ذریعے کفر و شرک کی بنیخ کنی کی جائے گی۔ اور اس کام کے لیے جہاں جان کی قربانی دینی پڑتی ہے وہاں مال بھی لگانا پڑتا ہے۔ اور یہی اتفاق فی سبیل اللہ ہے۔ آگے دور کوع کے دوران اتفاق فی سبیل اللہ کا ذکر مزید تفصیل کے ساتھ آئے گا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

الْبَقَرَةُ ۲

درس پچھدہ (۱۱۰)

آیت ۲۵۵

اللَّهُ لَا إِلَهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ لَا تَأْخُذُهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ ۚ
 لَهُ مَا فِي السَّمُوتِ وَمَا فِي الْأَرْضِ ۚ مَنْ ذَا الَّذِي يَشْفَعُ عِنْدَهُ
 إِلَّا بِإِذْنِهِ ۚ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ ۚ وَلَا
 يُحِيطُونَ بِشَيْءٍ مِّنْ عِلْمِهِ إِلَّا بِمَا شَاءَ ۚ وَسِعَ كُرْسِيُّهُ
 السَّمُوتِ وَالْأَرْضَ ۚ وَلَا يَئُودُهُ حِفْظُهُمَا ۚ وَهُوَ الْعَلِيُّ الْعَظِيمُ ﴿۲۵۵﴾

ترجمہ: اللہ کے سوا کوئی معبود نہیں، مگر وہی ہے۔ وہ زندہ ہے۔ قائم
 رکھنے والا ہے۔ نہیں پگھلتی اس کو اونگھ اور نہ نیند، اُسی کا ہے، جو کچھ آسمانوں میں ہے
 اور جو کچھ زمین میں ہے۔ کون ہے۔ جو اس کے سامنے سفارش کر سکے بغیر اس کی
 اجازت کے، جانتا ہے جو کچھ ان کے سامنے ہے اور جو کچھ ان کے پیچھے ہے
 اور نہیں احاطہ کر لے کسی چیز کا اس کے علم میں سے مگر جتنا وہ چاہے وسیع ہے
 اس کی کرسی آسمانوں اور زمین سے اور نہیں تھکاتی اس کو حفاظت ان کی اور وہ بلند تر

اور عظمت والا ہے ﴿۲۵۵﴾

پہلے دو رکوع میں اللہ تعالیٰ نے نظام خلافت کا ذکر فرمایا ہے۔ بنی اسرائیل کا واقعہ
 بیان کر کے جہاد کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ اور پھر نظام اسلام کی نشان دہی کی ہے۔ کہ امیر کیسا
 ہونا چاہیئے۔ سپاہی اور لشکر کی صفات کیا ہوں جہاد ہی کے سلسلہ میں جان و مال کی قربانی
 کا خصوصی ذکر فرمایا ہے۔ پھر اس اعتراض کا جواب دیا ہے۔ کہ جہاد کرنا نبیوں کا کام
 نہیں۔ فلسفہ جہاد بیان کیا ہے۔ کہ اگر جہاد کا حکم نہ ہو، تو فسادِ لوگ زمین میں فسادِ بپا
 کریں گے۔ لہذا سو ساری کو درندہ صفت لوگوں سے محفوظ کرنے کے لیے
 جہاد ضروری ہے۔

ربط آیات

اب اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایمان اور توحید کا مسئلہ بیان کیا ہے۔ اور اس کا ربط پہلی آیتوں کے ساتھ مختلف طریقوں سے ہے جہاد کے سلسلہ میں جان و مال کھپانے کا ذکر ہو چکا ہے۔ مگر ان دو چیزوں کی قربانی اسی وقت قبول ہوگی جب ایمان صحیح ہو اور انسان کا عقیدہ توحید پر ہو۔ اعمال کا دار و مدار عقیدہ پر ہے۔ اگر عقیدہ درست نہیں ہوگا، تو کوئی عمل قابل قبول نہیں۔ عقیدہ توحید کے بغیر ہر بات جتنے اعمال بھی بے سود محض ہوں گے۔ ان کی حیثیت راکھ اور غبار سے زیادہ نہیں ہوگی۔ لہذا مسئلہ توحید کو مسئلہ جہاد کے ساتھ یہ ربط ہے۔

پیشتر ازیں بنی اسرائیل کے واقعہ کے ضمن میں نظام خلافت بھی سمجھا دیا گیا ہے اور اس بات کی وضاحت کر دی گئی ہے کہ اقتدار کا حقیقی مالک خلیفہ نہیں ہوتا جو اپنی من مانی کہہ تا پھرے، بلکہ اقتدار کا مالک اللہ ہوتا ہے۔ خلیفہ تو اللہ کا بندہ ہوتا ہے جو نظام خلافت کو چلاتا ہے۔ اس سورۃ کے آخری حصہ میں بھی یہی بات سمجھائی گئی ہے کہ خلیفہ اقتدار کا مالک نہیں ہوتا، بلکہ وہ تو امین ہوتا ہے۔ اور دین اور شریعت کو جاری کرتا ہے۔ اس کے ساتھ ایک جماعت ہوتی ہے جو نفاذ شریعت میں اس کی مدد کرتی ہے۔ اُسے مجلس شورٰی کہیں یا کچھ اور۔ وہ بہر حال وَاَمْرُهُمْ شُورٰی بَيْنَهُمْ کے تابع ہوتی ہے۔ تو گویا نظام خلافت کا صحیح طور پر قائم کرنا بھی عقیدہ توحید پر موقوف ہے لہذا اس لحاظ سے بھی آیت زیر درس کو سابقہ آیات کے ساتھ ربط ہے۔

یہ آیت ایک لمبی آیت ہے اور آیت النہم سی کہلاتی ہے کیونکہ اس میں اللہ تعالیٰ کی گھر سی کا ذکر ہے۔ وَبِيعَ كُدَيْسِيَّتُهُ السَّطَوَاتِ وَالْأَرْضُ۔ حدیث شریف میں اس آیت پاک کی بڑی فضیلت آئی ہے حضرت ابی ابن کعبؓ کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے اُن سے پوچھا کہ قرآن پاک میں سب سے بڑی آیت کون سی ہے۔ تو حضرت ابی ابن کعبؓ نے نہایت ادب سے عرض کیا اللہ ورسولہ اعلیٰ یعنی اللہ اور اس کا رسول ہی بہتر جانتے ہیں۔ پھر حضور علیہ السلام نے پوچھا۔ اچھا یہ بتاؤ، قرآن پاک میں بہتر آیت کون سی ہے۔ انہوں نے پھر عرض کیا۔ اللہ اور اس کا

آیت النہم سی
کی فضیلت

رسول ہی بہتر جانتا ہے۔ پھر بنی کریم نے حضرت ابی ہریرہؓ سے سنا کہ یہ بات تھ مار کر وہی سوال کیا۔ تو انہوں نے جواب دیا حضور! اعظم آیت فی القرآن اللہ لا اله الا هو جل جلالہ یعنی قرآن پاک کی سب سے بڑی آیت یہ آیت الکرسی ہے تاہم اس آیت کا یہ اعزاز الفاظ یا کلمات کے اعتبار سے نہیں بلکہ فضیلت کے اعتبار سے اسے سب سے بڑی آیت ہونے کا شرف حاصل ہے۔

ایک دوسری روایت میں آتا ہے۔ جو شخص فرض نماز کے بعد اخلاص کے ساتھ آیت الکرسی پڑھیں گا، وہ اگلی نماز تک اللہ تعالیٰ کی حفاظت میں ہوگا۔ حضور بنی کریم روف الرحیم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بھی ارشاد فرمایا۔ جو کوئی فرض نماز کے بعد اخلاص کے ساتھ آیت الکرسی پڑھیں گا۔ موت کے سوا اس کے دخول جنت میں کوئی چیز مانع نہیں ہوگی۔ یعنی جنت میں داخلے کے لیے صرف موت ہی درمیان میں رکاوٹ ہے۔ جو نہی اس کی موت واقع ہوگی، وہ شخص جنت میں داخل ہو جائیگا۔ گویا یہ آیت کرمیہ تلاوت کرنے والا جنت کا مستحق ہو گیا۔

ایک اور حدیث میں اس آیت اور سورہ مومن کی چند ابتدائی آیات کی مزید فضیلت آئی ہے۔ یہ چھوٹی چھوٹی آیتیں ہیں مگر فضیلت کے لحاظ سے ان کو کمال درجہ حاصل ہے۔ ﴿تَنْزِيلُ الْكِتَابِ مِنَ اللَّهِ الْعَزِيزِ الْعَلِيمِ غَافِرِ الذَّنْبِ وَقَابِلِ التَّوْبِ شَدِيدِ الْعِقَابِ ذِي الطَّوْلِ﴾ لَئِلاَّ يُكَلِّفَ الْإِنْسَانُ إِلَهًا شَيْئًا إِنَّ إِلَهًا لَّهُ الْغَنِيُّ إِنَّ يَوْمَ تَكُونُ السَّاعَةُ لَفِئَةٌ رَاغِبَةٌ ﴿الَّذِينَ هُمْ عَنْ صَلَاتِهِمْ سَاهُونَ﴾ اُولَٰئِكَ هُمُ الْمُتَكِبُونَ حضور نے فرمایا جو شخص آیت الکرسی اور سورہ مومن یا غافر کی یہ تین آیتیں رات کے وقت تلاوت کرے گا۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے صبح تک اس کی حفاظت ہوتی رہے گی۔ اور جو کوئی صبح کے وقت یہ آیتیں تلاوت کرے گا، وہ رات تک اللہ کی امان میں ہوگا۔

ایک اور حدیث میں آتا ہے۔ کہ حضور بنی علیہ السلام نے فرمایا کہ سورہ بقرہ میں ایک ایسی آیت ہے۔ جو فضیلت کے لحاظ سے سب سے بڑی آیت ہے جس گھر میں یہ آیت پڑھی جاتی ہے۔ وہاں شیطان نہیں ٹھہر سکتا۔ بلکہ وہاں سے

بھاگ جاتا ہے۔ اس آیت کا اتنا عظیم اثر ہے صحیحین میں صدقہ الفطر کے اناج کی حفاظت والی حدیث آتی ہے کہ اُس اناج کی حفاظت حضرت ابوہریرہؓ کے ذمہ تھی۔ آپ رات کو پہرہ پر تھے کہ شیطان نے اس اناج میں سے کچھ لینا چاہا مگر صحابی رسولؐ نے اسے پکڑ لیا مگر اس کے منت خوشامد کہہ نے پھپھوڑ دیا۔ پھر دوسری رات اُئی۔ تو یہی واقعہ پیش آیا آپ نے شیطان کو دبوچ لیا۔ اُس نے وعدہ کیا کہ اس دفعہ چھوڑ دیا جائے پھر نہیں آئیگا آپ نے پھر اس کو چھوڑ دیا مگر وہ کم نحت تیسری رات پھر آگیا۔ حضرت ابوہریرہؓ نے پھر اُس کو پکڑ لیا۔ اور فرمایا میں آج تجھے ہرگز نہیں چھوڑوں گا۔ بلکہ حضور کے پاس لے چلوں گا۔ شیطان نے پھر منت سماجت کی اور کہا کہ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو۔ میں تمہیں ایک ایسی بات بتاتا ہوں جس کا تمہیں بہت فائدہ ہوگا۔ پوچھا کیا بات ہے۔ کہنے لگا کہ اگر تم آیت الکرسی پڑھ لیا کرو تو شیطان تمہارے قریب نہیں آسکے گا۔ تمہاری حفاظت ہوگی۔ حضرت ابوہریرہؓ نے تیسری رات بھی شیطان کو چھوڑ دیا۔ اور صبح کو سلام معاملہ انحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں عرض کر دیا۔ آپ نے فرمایا اے ابوہریرہؓ! شیطان ہے تو جھوٹا، مگر بات اس نے ٹھیک کہی ہے۔ اگر کوئی شخص ایمان کے ساتھ اس آیت کی تلاوت کرے گا تو اللہ تعالیٰ اس کا محافظ و نگہبان ہوگا۔

الغرض! اس آیت پاک کو بہت بڑی فضیلت حاصل ہے۔ لہذا ہر مسلمان کو اسے در و زبان بنالینا چاہیے۔ ہر نماز کے بعد اس کی تلاوت کی جائے۔ صبح و شام کو اسے پڑھا جائے۔ تو اللہ تعالیٰ ہر مصیبت سے مامون فرمائے گا اور آخرت میں جنت میں داخلے کی ضمانت ہوگی۔ تاہم مفسرین اور محدثین کرام فرماتے ہیں کہ ہر دُعا اور ذکر کی قبولیت کے لیے بعض شرائط ہیں۔ ہر دُعا اور ہر ذکر محض پڑھ لینے سے درجہ قبولیت تک نہیں پہنچ جاتی۔ قبولیت دُعا کے لیے ضروری ہے کہ دُعا کو فرائض سے خالی نہ ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر نماز، روزہ، فحش کیا ہے۔ تو ان کا تارک نہ ہو۔ بلکہ انہیں پورا کرے تاہو۔ اور پھر اس کا رزق بھی جلالی ہو۔ اس کا کھانا، پینا اور پہننا حرام سے پاک ہو۔ اور یہ بھی قبولیت کی شرط ہے کہ انسان حتی الامکان امر بالمعروف

اور نہی عن المنکر پر عمل کرتا ہو۔ ترمذی شریف کی حدیث — میں آتا ہے۔ اِنَّ اللّٰهَ لَا يَقْبَلُ دُعَاءَ عَنِ قَلْبٍ غَافِلٍ۔ اللہ تعالیٰ غافل دل کی دعا قبول نہیں کرتا۔ جب کوئی دعا کرے۔ تو نہایت خشوع و خضوع کے ساتھ دعا کرنے کی چاہیے۔ خدا کی بارگاہ میں ایسی دعا قبول نہیں۔ جو دل کی گہرائیوں سے نکلنے کی بجائے محض زبان کی حرکت تک محدود ہو۔

یہ آیت پاک پچاس الفاظ پر مشتمل ہے اور اس میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت کے گیارہ دلائل موجود ہیں۔ یہ آیت گویا مجموعہ دلائل ہے۔ اس آیت کی فضیلت ان معانی میں ہے۔ کہ کسی چیز کا علم یا اس کا ذکر اس کے معلوم یا مذکور کے تابع ہوتا ہے۔ یعنی جو درجہ اور فضیلت کسی مذکور معلوم کو حاصل ہوگا، وہی اس کے علم یا ذکر کو حاصل ہوگا۔ اب قرآن پاک میں تو تمام چیزوں کا ذکر ہے۔ کہیں خود قرآن پاک کے متعلق آتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے۔ اور یہ ہدایت ہے۔ کہیں اللہ کے نبیوں کا ذکر ہے۔ کہیں بڑے آدمیوں کا ذکر ہے۔ کہیں فرعون و قارون کا واقعہ بیان ہوا ہے کہیں صاحبین کا ذکر ہے۔ کہیں احکام ہیں کہیں نواہی ہیں۔ انسان کی تہذیب کی بیان ہے۔ اس کے نفس اور روح کی کیفیت کا ذکر ہے۔ اسی طرح قرآن میں خود خدا تعالیٰ کی ذات اور اسکی توحید کا ذکر ہے، کہیں اس کی صفات کمال اور کہیں صفات جلال و جمال کا ذکر ہے۔ تو یہ جو اللہ کا ذاتی ذکر ہے۔ یہ تمام اذکار سے افضل ہے۔ لہذا جن آیات اور جملوں میں ان چیزوں کا ذکر ہوگا، وہ آیات باقی آیات سے افضل ہوں گی۔ اس لحاظ سے چونکہ آیت الکرسی میں اللہ تعالیٰ کی ذات اور اسکی صفات کا ذکر ہے۔ لہذا یہ آیت پاک بھی باقی آیات سے افضل ہے۔

اس عظیم آیت میں ارشاد ہوتا ہے۔ اللّٰهُ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ اللّٰهُ وہی ہے۔ کہ اس کے سوا کوئی معبود نہیں، نہ کوئی چھوٹا نہ بڑا، نہ عارضی نہ مستقل، نہ باپ نہ بیٹا کوئی بھی معبود نہیں۔ معبود وہی اور صرف وہی ہے۔ جو کوئی اللہ کے علاوہ کسی اور کو بھی معبود مانتا ہے، تو اس کا عقیدہ قطعاً باطل ہے۔ وہ تو ایسی ذات ہے الٰہی جو

توحید باری تعالیٰ

زندہ ہے۔ اس کی حیات ابدی اور سرمدی ہے۔ اس کے علاوہ جتنی بھی زندگیاں ہیں، سب جزوی اور عارضی ہیں۔ کسی کو دائمی حیات حاصل نہیں۔ زندگی کا سرچشمہ خدا کی ذات وعدہ لا شریک ہے۔ یہ اُس کی مشیت ہے۔ جس کو جتنی زندگی چاہے دے دے اور جب چاہے واپس لے لے۔

وہ الْقَيُّومُ بھی ہے۔ یعنی خود قائم ہے۔ اور کائنات کی باقی چیزوں کو قائم رکھنے والا ہے وہ عالم بالا سے لے کر ذرہ ذرہ تک کا محافظ اور نگہبان ہے۔ وہی پیدا کر نیوالا ہے وہی جتنا عرصہ چاہے قائم رکھنے والا ہے اور پھر وہی فنا کرنے والا بھی ہے لوگوں نے کئی قسم کے باطل عقیدے بنا رکھے ہیں۔ عیسائیوں نے باپ، بیٹا اور روح القدس کا نظریہ قائم کیا ہوا ہے۔ تین خدا ہیں۔ کیا ایک خدا کافی نہیں ہے۔ ہندوؤں کے عقیدے کے مطابق پیدا کرنے والا برہما ہے۔ تھامنے والا کوشنو ہے اور فنا کرنے والا شواجی مہاراج ہے۔ ان کے بھی تین خدا ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے ایسے باطل نظریات کی تردید فرمائی۔ اور یہ بات واضح کر دی کہ الْحَيُّ الْقَيُّومُ وہی ہے۔ پیدا بھی وہی کرتا ہے۔ پرورش بھی وہی کرتا ہے قائم بھی وہی رکھتا ہے اور پھر فنا بھی وہی کرتا ہے۔ اس کے علاوہ جتنے عقیدے ہیں سب باطل ہیں۔

اور پھر اُس مالک الملک کی ہر چیز پر نگرانی اور حفاظت بھی اس طور ہے کہ لَا تَأْخُذْهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ نہ اُسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند۔ اونگھ اور نیند تو غفلت کی علامت ہے اور اُس کو آتی ہے جس کو تھکاوٹ ہو جائے اور آرام کی ضرورت ہو مگر اللہ کی ذات تو پاک ہے نہ وہ تھکتا ہے اور نہ اُسے آرام کی ضرورت ہے۔ یہ تو نا تو ال انسان ہے جو کچھ مشقت کرنے کے بعد تھک جاتا ہے۔ اور پھر اُسے آرام کی ضرورت محسوس ہوتی ہے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے نیند جیسی نعمت تیار کی ہے۔

اللہ نے اس کو سُبَّانَا کہا ہے یعنی نیند انسان کے

لیے آرام کا ذریعہ تاکہ جب محنت کرنے کے بعد تھک جاوے تو کچھ دیر آرام کر کے پھر سے تازہ دم ہو جائے۔ اور دوبارہ کام کاج اور عبادت میں مصروف ہو جائے۔ یہ تھکان، کمزوری اور پھر آرام کی ضرورت اللہ تعالیٰ کی شان کے شایان نہیں ہے۔ وہ ان چیزوں سے پاک اور منزہ ہے۔ بلکہ درحقیقت لہ ما فی السموات وما فی الارض زمین و آسمان کی ہر شے اسی کی پیدا کردہ ہے۔ اسی کے قبضہ قدرت میں ہے۔ اور اُس کی مطیع ہے، ہر چیز پر اُسی کا تصرف ہے۔ اور اس میں اس کا کوئی شریک نہیں وہ ذات ہے جو یُصَوِّرُ الْمَرَكَّ کَیْفَ یَشَاءُ جس طرح چاہے تصرف کرتا ہے۔ کسی چیز کا گھٹانا، بڑھانا، بلندی، پستی، زندہ کرنا اور مارنا سب اُس کے اختیار میں ہے ہر چیز پر اُسی کا حکم چلتا ہے۔

فرمایا جب قادر مطلق وہ ذات ہے۔ تَوَمَّنْ ذَا الَّذِیْ یَشْفَعُ عِنْدَہٗ اِلَّا بِاِذْنِہٖ کون ہے جو اُس کے سامنے سفارش کرنے کا دم مار سکے بغیر اس کی اجازت کے۔ مشرکوں کا عقیدہ یہ ہے کہ اُن کے معبودان کی سفارش کریں گے، اللہ تعالیٰ خواہ رُغْمِ ہویا ناراض یہ ہماری سفارش کر کے خدا کو ضرور ہی منالیں گے۔ یہودیوں اور نصرانیوں کا بھی اسی قسم کا عقیدہ ہے۔ حالانکہ جبری اور قبری سفارش کا تو وجود ہی نہیں ہے۔ اس سے پہلی آیت میں آپکا ہے کہ اس دن نہ خرید و فروخت ہوگی، نہ دوستی کام آئیگی وَلَا تَشْفَعُ اور نہ کوئی سفارش ہوگی۔ ہاں اللہ تعالیٰ کی اجازت کے ساتھ سفارش کرنی کی اجازت ہوگی۔ اشرف المخلوقات میں سب سے افضل انسان حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا قیامت کے دن میں رب الحکیم کے سامنے آؤں گا اور اللہ تعالیٰ کے حضور لمبا سجدہ کروں گا پھر حکم ہو گا یا محمد ارفع راسک، اے محمد! آپ اپنا سر اٹھائیں۔ آپ بات کریں آپ کی بات سنی جائے گی۔ آپ سفارش کریں، آپ کی سفارش قبول کی جائے گی۔ بعض روایات میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کا یہ سجدہ دس برس کے وقفہ کے برابر لمبا ہوگا۔ اس کے بعد اللہ تعالیٰ شفاعت کی اجازت دیں گے۔ بغیر اجازت کے کوئی سفارش نہیں ہوگی اور اجازت بھی اس شخص کے

لیے دی جائیگی جس کا عقیدہ توحید پر ہوگا۔ اور اللہ تعالیٰ کو پسند ہوگا۔ وَلَا يَخْشَىٰ لِبِئَارِهِ
 الْكَفْرَ اللہ تعالیٰ کفر والے عقیدہ، شرک والے عقیدہ کو پسند نہیں کرتا۔ وہ کفر کرنے کی توفیق
 تو مے دیتا ہے۔ کافر کی رسی تو دراز کر دیتا ہے۔ مگر ان سے ناراض ہوتا ہے۔ کیونکہ اس
 کے نزدیک وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ کافر لوگ ہی اصل ظالم ہیں۔ نیز یہ کہ
 إِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ لہذا قیامت کے دن
 سفارش دوشطروں سے مشروط ہوگی۔ اور سچی سفارش ایسا شخص ہوگا۔ مَنْ لَا يُشْرِكْ
 بِاللَّهِ شَيْئًا جو اللہ کے ساتھ شرک کرنے والا نہ ہو۔ اور پھر یہ کہ بغیر اجازت کے
 سفارش نہ ہوگی۔ جب اجازت ہوگی تو انبیاء ملائکہ، اولیاء شہداء اور مومن سفارش کریں گے
 صحیحین کی حدیث میں ہے۔ کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم بار بار سجدہ ریز ہوں گے۔ اور
 اللہ تعالیٰ بار بار سفارش کی اجازت دیں گے۔ یہ سفارش مختلف قسم کے لوگوں کے لیے
 ہوگی۔ ایک دفعہ اجازت ہوگی کہ اس قسم کے لوگوں کے متعلق سفارش کریں۔ آپ
 سفارش کر کے اُن لوگوں کو دوزخ سے نکال لیں گے۔ پھر سجدہ کریں گے پھر اجازت
 ہوگی، اب ایسے لوگوں کی سفارش کریں۔ آپ اُن لوگوں کو بھی دوزخ سے نجات
 دلوائیں گے اور اس طرح آپ بار بار سجدہ کریں گے اور اللہ بار بار سفارش کی اجازت
 دیں گے۔ دُعا کریں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں حضور علیہ السلام کی شفاعت نصیب فرمائے۔

علم غیب خاصہ خداوندی

جس طرح اللہ تعالیٰ مختار مطلق اور قادر مطلق ہے اور جس طرح وہ البرہ حق ہے
 اسی طرح وہ علیم کل بھی ہے۔ چنانچہ یہ اس کی صفت خاصہ ہے۔ يَعْلَمُ مَا بَيْنَ
 أَيْدِيهِمْ وَمَا خَلْفَهُمْ وہ ماضی کو بھی جانتا ہے اور مستقبل سے بھی واقف
 ہے۔ اس دنیا کے تمام امور کا بھی مکمل طور پر عالم ہے اور آخرت کے جہان یعنی برزخ
 اور قیامت کے حال کے ذرہ ذرہ سے بھی واقف ہے۔ یہ ماضی حال مستقبل
 وغیرہ انسانوں کی نسبت سے ہے وگرنہ اللہ تعالیٰ کے نزدیک تو کوئی چیز غائب
 نہیں وَمَا يُعْذِبُ عَنْ رَبِّكَ مِنْ مِّثْقَالِ ذَرَّةٍ تیرے رب کے کوئی ذرہ
 برابر چیز بھی غائب نہیں۔ وہ ہر شے کو جانتا ہے۔ وَلَا يَخِیْطُونَ بِشَيْءٍ مِنْ

عِلْمُهُ إِلَّا بِمَا شَاءَ مخلوق میں سے خواہ انسان، جن یا فرشتے یا کوئی اور مخلوق ہو کوئی بھی خدا تعالیٰ کے علم کا احاطہ نہیں کر سکتا۔ ہاں جس قدر اللہ تعالیٰ چاہے، وہ کسی کو اتنا علم عطا کر دیتا ہے۔ خدا کا علم غیر محدود ہے۔ اور غیر متناہی ہے۔ اس کی کوئی حد نہیں مگر مخلوق کا علم محدود ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السلام اور حضرت خضر علیہ السلام کے متعلق بخاری شریف کی روایت موجود ہے۔ کہ ایک چڑیا نے پانی میں چونچ ماری اور جتنا پانی لے سکتی تھی لے لیا۔ حضرت خضر علیہ السلام نے فرمایا، اے موسیٰ! تیرا اور میرا علم خدا تعالیٰ کے علم کے مقابلے میں اس چڑیا کی چونچ کی مانند ہے۔ ہم نے تو اللہ تعالیٰ کے علم میں سے اتنا حصہ بھی حاصل نہیں کیا۔ جتنا اس چڑیا نے سمندر سے پانی لیا ہے۔ تم کہتے ہو کہ میں بڑا عالم ہوں۔ بھلا ہمارے علم اور اللہ تعالیٰ کے علم میں کیا نسبت ہے۔ تاہم یہ ایک مثال ہے۔ وگرنہ اللہ کا علم قدرت تو اس سے بھی زیادہ وسیع ہیں۔ حتیٰ کہ انسان اس کا تصور بھی نہیں کر سکتا۔ اب جو لوگ دوسروں کے متعلق گمان رکھتے ہیں کہ وہ بھی ہر چیز کو جانتے ہیں انکو کیا کہا جائے۔ بعض لوگ اولیاء اللہ اور بعض انبیاء کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ہمارے سب باتوں کو جانتے ہیں۔ بھائی! یہ شرکیہ عقیدہ ہے۔ ہر چیز کا جاننے والا اللہ کے سوا کوئی نہیں۔ ہاں إِلَّا بِمَا شَاءَ جس قدر اللہ تبارک و تعالیٰ چاہے، اتنا ہی جانتے ہیں۔ یہ معبود برحق ہی جانتا ہے کہ کسی کو کیا دکھ اور کیا تکلیف ہے۔ دوسرا کوئی نہیں جانتا اور نہ اس کو رفع کرنے پر قادر ہے۔ وہ جب تک چاہتا ہے کسی کو مشکل میں ڈالے رکھتا ہے اور جب چاہتا ہے۔ مصیبت اور پریشانی کو دور کر دیتا ہے۔ آج کی دنیا میں بیچارے فلسطینی کن حالات سے گزر رہے ہیں۔ فلپائن مسلمان کس مشکل میں گرفتار ہیں۔ افغانوں پر کیا بیت مہی ہے۔ ہندوستان کا مسلمان کتھ بے بس ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ کے سوا کون ہے جو مسلمانوں کے حالات کو درست فرمائے۔ کون ہے۔ جو ان کو مشکلات سے نکالے۔ ان کی کشتی کو گرداب سے نکالے تو درکار اللہ کے سوا کون ہے جو ان کے حال سے بھی واقف ہو۔

تمام انسانی برادری میں سے انبیاء علیہم السلام سب سے زیادہ جاننے والے ہوتے ہیں۔ مگر ان کا علم بھی محدود ہوتا ہے، وہ عالم الغیب نہیں ہوتے عالم الغیب والہ شہادت صرف ذات خداوندی ہے۔ اُسی کا علم ہر چیز پر محیط ہے۔ وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ مُّحِيطٌ اس کے علاوہ کسی اور کا علم ہر شے پر محیط نہیں ہے۔

عرش اور کرسی

وَسِعَ كُرْسِيُّهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ اس کی کرسی آسمان و زمین سے وسیع ہے عرش اور کرسی کا ذکر قرآن پاک میں جگہ جگہ موجود ہے۔ مگر اس کی کیفیت کو ہم نہیں جانتے ہمارے لیے اتنا ہی کافی ہے کہ ان اشیاء کی موجودگی پر ایمان لے آئیں۔ عرش اور کرسی کا حجم کیا ہے۔ ان کی ساخت کیا ہے۔ یہ چیزیں ہمارے احاطہ علم میں نہیں آسکتیں۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے کہ ساتوں زمینیں اور آسمان کرسی کے مقابلے میں ایسے ہیں۔ جیسے کسی بہت بڑے میدان میں کھڑا سا ہو۔ اسی طرح عرش کے مقابلے میں کرسی کی ایسی ہی نسبت ہے۔ عرش اتنا بڑا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے عرش کو عرشِ عظیم فرمایا ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ کرسی سے مراد علم اور قدرت ہے جو ہر چیز پر وسیع ہے اَلرَّحْمٰنُ عَلٰی الْعَرْشِ اُسْتَوٰی اللہ تعالیٰ عرش پر مستوی ہے۔ کس کیفیت کے ساتھ، جیسا اسکی شان کے لائق ہے۔ یہ بات ہمارے فہم و فراست میں نہیں آسکتی۔ اور نہ ہم اپنے ذہن سے اس کا تصور کر سکتے ہیں۔ بس ان چیزوں پر ایمان لانا ہی کافی ہے۔

وَلَا يُوَدُّهٗ حِفْظُهُمَا اِن چیزوں کی حفاظت اللہ تعالیٰ کو تھکا نہیں دیتی۔ انسان تو مسلسل کچھ عرصہ کام کر کے تھک جا کر بیٹھ جاتا ہے اور پھر آرام چاہتا ہے مگر اللہ تعالیٰ تمام کائنات کی مسلسل نگرانی کے باوجود تھکتا نہیں۔ وہ ازل سے لے کر ابہ اور ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اپنے کام میں مصروف ہے۔ نہ وہ تھکتا ہے، نہ اُسے اونگھ آتی ہے اور نہ نیند آتی ہے اور نہ کوئی چیز اس کے احاطہ قدرت سے باہر ہوتی ہے۔

وَهُوَ الْعَلِیُّ اور وہ باعبار ذات بہت بلند ہے۔ وہ ہمارے تصور و ہم

اور خیال سے بلند تر ہے۔ اس کے علاوہ وہ العظیم بھی ہے۔ یعنی اس کی صفات بہت عظمت والی ہیں۔ وہ کمال عظمت کا مالک ہے۔ وہ ذات کے لحاظ سے بلند ہے تو صفات کے لحاظ سے عظیم ہے۔

ہر شخص کو چاہیے کہ اس بلند مرتبہ آیت کو در زبان بنائے تاکہ حضور علیہ السلام کے فرمان کے مطابق یہ آیت اس کے لئے بخشش و مغفرت کا ذریعہ بن جائے۔

لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ وَيُؤْمِنْ بِاللّٰهِ فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ لَا انْفِصَامَ لَهَا وَاللّٰهُ سَمِيعٌ عَلِيمٌ ﴿٢٥٦﴾ اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِينَ اٰمَنُوا لَا يُخْرِجُهُم مِّنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ وَالَّذِينَ كَفَرُوا اَوْلِيَٰهُمُ الطَّاغُوتُ يُخْرِجُوْنَهُم مِّنَ النُّوْرِ اِلَى الظُّلُمَاتِ ۗ اُولٰٓئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿٢٥٧﴾

ترجمہ :- دین کے معاملہ میں زبردستی نہیں تحقیق ہدایت گمراہی سے واضح ہو چکی ہے پس جو شخص طاغوت کے ساتھ کفر کرے گا اور اللہ پر ایمان لائے گا پس اس نے مضبوط کمرہ پکڑ لیا ہے جس کے لیے ٹوٹنا نہیں ہے اللہ تعالیٰ سب کچھ سنتا ہے اور جانتا ہے ﴿۲۵۶﴾ اللہ تعالیٰ اُن لوگوں کا کلام ساز ہے جو ایمان لائے، اُن کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے، اور وہ لوگ جنہوں نے کفر کو اختیار کیا۔ اُن کے دوست اور ساتھی طاغوت ہیں۔ وہ اُن کو روشنیوں سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ یہی لوگ دوزخ میں رہنے والے ہیں وہ اس کے اندر ہمیشہ ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۵۷﴾

گدشتہ درس میں آیت الکہسی کا ذکر تھا۔ اور اس کی فضیلت بیان ہوئی تھی۔ یہ آیت ربطِ ایت فضیلت کے اعتبار سے قرآن حکیم میں سب سے بڑی آیت ہے۔ کیونکہ اس کا تعلق توحید باری تعالیٰ سے ہے۔ حضور علیہ السلام کا وعدہ ہے کہ جو شخص غلوں نیت کے ساتھ آیت الکہسی کی تلاوت کرے گا، اللہ تعالیٰ اس کو جنت میں مقام عطا فرمائیں گے۔ آج کے درس میں اسی موضوع کے آگے چلایا گیا ہے کہ دین اسلام کی قبولیت اور پھر اس میں غلوں نیت انسان کا اپنا فعل ہے۔ جس قسم کا عقیدہ اور عمل ہو گا اس کے مطابق

جزا و سزا ہوگی۔ دین میں زبردستی نہیں ہے۔ بلکہ یہ انسان کا اپنا انتخاب ہے

فرمایا لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ دین کے معاملہ میں جبر نہیں ہے۔ کسی کو زبردستی دین میں داخل کر نیکی قطعاً اجازت نہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قَدْ تَبَيَّنَ الرُّشْدُ مِنَ الْغَيِّ ۖ ہدایت گمراہی سے بالکل واضح ہو چکی ہے۔ اب کوئی اشتباہ باقی نہیں رہا۔ نیکی اور بدی کا امتیاز کھل کر سامنے آ گیا ہے لہذا جو شخص اپنی مرضی سے اسلام میں داخل ہونا چاہے، بلا جھجکا اسلام قبول کر لے۔ اور جس کا دل نہیں مانتا۔ وہ ایمان نہیں لانا تو جھجک نہ لائے۔ اُسے زبردستی دین میں داخل نہیں کیا جائیگا۔

اس آیت کی تفسیر میں شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں ”جبر نیست بے دین“ یعنی دین اسلام میں داخلے کے لیے کسی شخص پر جبر ردائیں ہے تاہم اسلام میں فی الجملہ جبر موجود ہے۔ اور اس سے مراد وہ تمام احکام ہیں جن کے ذریعے کسی پر سختی کی جاتی ہے۔ مثلاً جہاد کا تعلق جبر سے ہے۔ جبر کے بغیر جہاد نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح حدود کا قیام ہے کوئی مجرم غوثی سے سزا قبول نہیں کرتا، اُسے اس کے کردہ گناہ کی سزا جبراً دینا پڑتی ہے زانی کو سنگ سار کیا جاتا ہے، چور کا ہاتھ کاٹا جاتا ہے۔ شرابی کو کوڑے مارے جاتے ہیں وغیرہ وغیرہ جبر کی اقسام سے ہیں اور یہ جبر بالکل جائز اور ضروری ہے۔ البتہ کسی غیر مسلم کو طاقت کے ذریعے اسلام قبول کرنے پر مجبور کیا جائے۔ یہ اسلامی تعلیم کے منافی ہے۔ اسی لیے فرمایا لَا إِكْرَاهَ فِي الدِّينِ ۖ

امیر المؤمنین حضرت عمر فاروقؓ کے زمانے کا ایک واقعہ ہے۔ ایک عیسائی بڑھیا عقی۔ امیر المؤمنین نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ کہ اس عورت کو کہو۔ کہ اسلام قبول کر لے جب اس کو یہ پیغام ملا، تو کہنے لگی، میری عمر کا بیشتر حصہ عیسائی مذہب پر گزر رہا ہے عمر کے اس آخری حصہ میں میرا دل نہیں چاہتا۔ کہ اُس مذہب کو چھوڑ دوں جس پر زندگی گزاری ہے۔ مجھے یہ بڑا دشوار نظر آتا ہے۔ حضرت عمرؓ نے فرمایا۔ اس بڑھیا کو اس کے حال پر چھوڑ دو۔ کیونکہ دین میں جبر نہیں ہے۔

امام ابو بکر جصاصؒ نے ”احکام القرآن“ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ نے ”ازالۃ الخفا“

میں یہ واقعہ نقل کیا ہے کہ حضرت عمرؓ کا وثیق نامی رومی غلام تھا۔ مدت تک آپ کی خدمت کرتا رہا۔ اُس نے آخر عمر تک اسلام قبول نہ کیا۔ حضرت عمرؓ نے غلام کو بلا کر کہا کہ تو بڑا قابل آدمی ہے۔ خاص طور پر حساب کتاب میں بڑا ماہر تھا۔ فرمایا اگر اسلام میں جبر وادھوت تو میں تمہیں زبردستی مسلمان بنا لیتا۔ مگر میں ایسا نہیں کر سکتا۔ اگر تم مسلمان ہو جاتے تو تمہاری قابلیت کی بنا پر کوئی اچھا عہدہ دیتا۔ اب میں یہی کرتا ہوں کہ تجھے آزاد کر دیتا ہوں۔ تم جہاں چاہو جا سکتے ہو۔

تاریخ آل عثمان کا یہ واقعہ مشہور ہے کہ تہ کی کے سلطان سلیم خان کے زمانہ میں یہودی اور عیسائی بڑی سازشیں کرتے تھے۔ خلیفۃ المسلمین اُن سے بڑے تنگ آئے اور آخر حکم جاری کر دیا۔ کہ جو بھی عیسائی اور یہودی ملے اُسے زبردستی اسلام میں داخل کر لیا جائے۔ جب یہ خبر اُس زمانے کے شیخ الاسلام کو پہنچی۔ تو وہ فوراً سلطان کی طرف متوجہ ہوئے۔ اور فرمایا کہ میں نے سنا ہے تم نے کوئی ایسا حکم جاری کیا ہے سلطان نے اقرار کیا۔ کہ ہاں میں نے ایسا سرکلر جاری کیا ہے۔ کہ تمام عیسائی اور یہودیوں کو زبردستی مسلمان بنالیا جائے۔ ان کے عبادت خانے موقوف کر دیے جائیں، کیونکہ انہوں نے اپنی سازشوں کی وجہ سے سلطنت میں فتنہ برپا کر رکھا ہے۔ شیخ الاسلام نے فرمایا اے خلیفہ! آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ کا حکم ہے لَا اِکْرَاهَ فِی الدِّیْنِ دین میں جبر نہیں ہے۔ آپ ایسا حکم جاری کرنے کے مجاز نہیں ہیں۔ چنانچہ خلیفہ نے فوری طور پر یہ حکم واپس لے لیا۔

اوزنگ زیب عالمگیر کے متعلق انگریزوں نے بڑا پراپیگنڈا کیا۔ کہ وہ ہندوؤں کو زبردستی مسلمان بنانا تھا۔ مگر یہ جھوٹ کا پلندہ ہے۔ اورنگ زیبؒ نے پچاس سال تک ہندوستان پر حکومت کی۔ اگر وہ واقعی زبردستی اسلام میں داخل کرتا، تو کم از کم دہلی کے گرد و نواح میں کوئی غیر مسلم باقی نہ رہتا۔ مسلمانوں کی پوری تاریخ اٹھا کر دیکھ لیں۔ کہیں بھی غیر مسلموں کے ساتھ جبر کا ثبوت نہیں ملتا۔ اسلام ایک زندہ حقیقت ہے اور اس کا فروغ تبلیغ کے ذریعے ہوا ہے، تلوار کے ذریعے نہیں ہوا۔ برصغیر میں مسلمان

اٹھ سو سال تک حکمران رہے ہیں مگر کسی کو جبراً مسلمان نہیں بنایا اسلام کے پاکیزہ اصولوں کی ترجمانی ضرور کی ہے۔ مسلمان بادشاہوں کے درباروں میں کتنے غیر مسلم رہا کرتے تھے مگر کسی کے ساتھ زیادتی نہیں کی۔ کسی کو زبردستی دین میں داخل کیا جائے یہ اسلام کی تعلیم کے منافی ہے۔ کیونکہ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ دین میں جبر نہیں ہے۔

شان نزول

احضور علیہ السلام کے درودِ مدینہ سے پہلے مدینہ طیبہ میں دو قسم کے لوگ تھے ایک تو یہودی تھے۔ جو پڑھے لکھے اور مالدار لوگ تھے۔ دوسرے عرب تھے۔ جو عام طور پر ان پڑھ اور غریب لوگ تھے۔ اسلام لانے کے بعد یہی لوگ انصارِ مدینہ کہلائے۔ چونکہ یہ لوگ پس ماندہ تھے۔ اس لیے یہ اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت کیلئے انہیں یہودیوں کے پاس چھوڑ دیتے تھے۔ چنانچہ اسلام آنے کے بعد جب یہودی قبائل بنو نضیر اور بنو قینقاع کو مدینہ سے نکالا گیا۔ تو اس وقت ایک انصاری ابو حصین کے دو بیٹے یہودیوں کی تحویل میں تھے۔ اور انہوں نے یہودی مذہب اختیار کر لیا تھا۔ جب وہ مدینہ سے جانے لگے تو انصاری نے چاہا کہ اپنے بیٹوں کو زبردستی اسلام میں داخل کر کے انہیں اپنے پاس رکھ لے۔ اس موقع پر اللہ تعالیٰ نے یہ آیت نازل فرمائی۔ لَا اِكْرَاهَ فِي الدِّينِ دین میں جبر نہیں ہے۔ لڑکے جوان ہیں۔ انہوں نے یہودیت اختیار کر رکھی ہے۔ اب اگر وہ اپنی مرضی سے جا رہے ہیں تو مسلمانوں کو ان کے روکنے کا کوئی حق نہیں پہنچتا۔

ابوداؤد اور دیگر کتبِ احادیث میں عبداللہ بن عباسؓ کی روایت ہے جسے امام ابن کثیرؒ نے بھی نقل کیا ہے۔ اور جس کا خلاصہ یہ ہے کہ قبل از اسلام انصارِ مدینہ کی عورتیں اولاد کی تمنا کرتیں تو یہ منت مانیتیں کہ اگر اللہ نلے انہیں لڑکا عطا کیا۔ تو وہ اُسے یہودی کر دیں گی۔ چنانچہ وہ ایسا ہی کرتیں، جس کی وجہ سے کئی بچے یہودیوں کی تحویل میں چلے گئے۔ جب اسلام آیا تو اس وقت کچھ بچے بنو نضیر کی تحویل میں تھے جب انہیں مدینہ بدر کیا گیا۔ تو وہ لڑکے بھی ان کے ساتھ جا رہے تھے۔ اُس وقت انصارِ مدینہ کی خواہش ہوئی۔ کہ اپنے بچوں کو اسلام میں داخل کر کے یہودیوں کے ساتھ

جانے سے روک لیں۔ اس موقع پر یہ آیت نازل ہوئی کہ کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جاسکتا۔ کیونکہ حق اور باطل واضح ہو چکے اب جس کا جی چاہے حق کو قبول کرے۔ اور جو چاہے باطل پر اڑے۔

مضبوط کڑا

حق اور باطل کو واضح کرنے کے بعد فرمایا فَمَنْ يَكْفُرْ بِالطَّاغُوتِ جس نے طاغوت کا انکار کیا۔ وَيُؤْمِنْ بِاللَّهِ اور اللہ پر ایمان لایا فَقَدْ اسْتَمْسَكَ بِالْعُرْوَةِ الْوُثْقَىٰ اس نے مضبوط کڑا پکڑ لیا۔ لَا انْفِصَامَ لَهَا جو ٹوٹ نہیں سکتا مطلب یہ ہے کہ جس شخص نے اسلام کا دامن مضبوطی کے ساتھ تھام لیا۔ اس کا ہاتھ گویا ایسی مضبوط جگہ پر پہنچ گیا۔ جہاں پر وہ محفوظ ہو گیا۔ اب اس کو کسی قسم کا خطرہ باقی نہیں رہا۔ اور یہ ایسا مضبوط مقام ہے۔ جو کمزور ہو کر ٹوٹ بھی نہیں سکتا بلکہ یہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔

قرآن پاک میں طاغوت کا لفظ (آٹھ مرتبہ) استعمال ہوا ہے۔ یہ لفظ طغیان اور طغوان کے مادہ سے ہے جسے سرکشی پر محمول کرتے ہیں۔ عام طور پر اس کا ترجمہ شیطان کیا جاتا ہے۔ مگر شاہ عبدالقادرؒ نے اس کا ترجمہ ”ہڑدنکا“ کیا ہے۔ اعْبُدُوا اللَّهَ وَاجْتَنِبُوا الطَّاغُوتَ یعنی اللہ کی عبادت کرو اور طاغوت کی پرستش چھوڑ دو۔ ہڑدنکا کا لفظ اُس پر بولا جاتا ہے۔ جو بزدل سردار بن جائے اور لوگوں سے زبردستی اطاعت کر لے۔

چونکہ شیطان کا بھی یہی کام ہے۔ لہذا اُس پر بھی یہ لفظ بولا جاتا ہے۔ امام جعفر صادقؑ نے بھی یہی تفسیر کی ہے۔ كُلُّ مَا يَشْغَلُكَ عَنِ الْحَقِّ فَهُوَ طَّاغُوتٌ جو کوئی چیز تمہیں حق سے مشغول کرنے والی ہے۔ وہ تمہارے لیے طاغوت ہے۔ گویا حق سے ہٹانے والا شیطان ہو یا انسان، مال ہو یا اولاد سب طاغوت کی تعریف میں آئیں گے۔ باطل راستے پر چلانے والے مال باپ اور غلط طرف لیجانے والے پیر بھی اسی زمرہ میں آتے ہیں۔ غرضیکہ جو بھی کسی کو حق سے باز رکھنے کی کوشش کرے گا، وہ اس کے لیے طاغوت ہے۔

عزودہ کا معنی کھڑا اور دلفنی کا معنی مضبوط ہے۔ حضرت عبداللہ بن سلامؓ نے خواب میں دیکھا کہ وہ ایک اونچے ستون پر چڑھ گئے۔ اُس کے آخری سر پر ایک کڑا لگا ہوا تھا۔ جسے آپؐ نے مضبوطی سے پکڑ لیا۔ صبح اُٹھے اور حضور علیہ السلام کی خدمت میں حاضر ہو کر خواب بیان کیا۔ آپؐ نے ارشاد فرمایا۔ اس خواب کی تعبیر یہ ہے۔ اَنْتَ تَمُوتُ عَلَى الْاِسْلَامِ تمہاری موت اسلام پر آئیگی۔ یعنی تم تے دم تک تم اسلام کا دامن پکڑے رکھو گے۔ لَا اِنْصَامَ لَهَا کا یہی مطلب ہے کہ وہ مضبوط کڑا ہے۔ جو ٹوٹ نہیں سکتا۔ یہ کڑا ہاتھ سے چھوٹ کر سکتا ہے۔ مثلاً آدمی گھڑا ہو جائے اور اسلام کا دامن چھوڑ دے۔ مگر یہ حلقہ ٹوٹ نہیں سکتا۔ اور اس کو نقصانے والا آدمی محفوظ ہو جائے۔ فرمایا وَاللّٰهُ سَجِيحٌ عَلَيَّكَ اللّٰهُ تعالیٰ ہر شے کو سننا اور جاننا ہے۔ وہ انسان کے ارادے تک سے واقف ہے۔ کہ وہ کوئی کام نیک نیتی سے کر رہا ہے یا بد نیتی سے۔ وہ ہر ایک کی پکار کر سننا ہے۔

رُؤْیَا ظِلَّت

آگے اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان کو سننے والے انعام کا تذکرہ فرمایا ہے۔ جو شخص دین اسلام کے ساتھ وابستہ ہو گیا اللہ تعالیٰ اُس سے راضی ہو گیا۔ اللّٰهُ وَلِيُّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا اللّٰهُ تعالیٰ اُن لوگوں کا دوست، رفیق، کارساز، مددگار و ولی ہے۔ جو ایمان لائے۔ لفظ ولی میں یہ سب معنی پائے جاتے ہیں جیسے فرمایا اَنْتَ وَلِيَّتُنَا فِي الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةِ دنیا اور آخرت میں تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ جب اللہ تعالیٰ فرشتوں سے پوچھیں گے۔ کیا تم نے لوگوں سے کہا تھا۔ کہ ہماری پرستش کرو۔ تو وہ جواب دیں گے۔ اے مولیٰ کریم! اَنْتَ وَلِيَّتُنَا تو ہی ہمارا کارساز ہے۔ ہم لوگوں کو کیسے کہہ سکتے ہیں۔ کہ ہماری پرستش کرو۔ انہوں نے تو خواہ مخواہ شیطان کی بات مانی ہے۔ بہر حال فرمایا، اللّٰهُ تعالیٰ ہی مومنوں کا مددگار ہے اور وہ اُن کی مدد اس طریقہ سے کرے گا کہ اُسے يُخْرِجُهُمْ مِنَ الظُّلُمَاتِ اِلَى النُّوْرِ ان کو اندھیروں سے روشنی کی طرف نکالتا ہے۔ یہاں پر لُور کو مفرد استعمال کیا ہے۔ اور ظلمات جمع ہے۔ بمعنی یہ ہے۔ کہ لُور اور

ایمان تو ایک ہی چیز ہے۔ جب کہ کفر اور شرک بہت سے ہیں۔ کوئی ساروں کو پونج رہا ہے۔ کوئی انسانوں کی پرستش کرتا ہے۔ کوئی جنات کو حاجت روا — سمجھتا ہے اور کوئی بتوں کے آگے سجدہ رہتا ہے۔ یہ سب ظلمت کی قیمیں ہیں۔ الغرض کہیں کفر شرک کی ظلمت ہے۔ کہیں گناہ اور نفاق کی ظلمت ہے اور کوئی شک کی ظلمت میں مبتلا ہے مگر ان سب کے مقابلے ایمان اور توحید واحد نظریہ ہے۔ لہذا یہاں پہلے صیغہ واحد کے طور پر استعمال کیا ہے۔

اب سوال پیدا ہوتا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ مومنوں کو کس طرح اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ تو اس نے اپنے نبی بھیجے ہیں۔ کتابیں بھیجی ہیں۔ جن کے ذریعے اہل ایمان کے دلوں کو منور کرتا ہے۔ دوسری جگہ فرمایا: **أَفَمَنْ شَرَحَ اللَّهُ صَدْرَهُ لِلْإِسْلَامِ** اللہ تعالیٰ جس کے سینے کو اسلام کے لیے کھول دیتا ہے **فَهُوَ عَلَى نُورٍ مِّنْ رَبِّهِ** وہ اپنے رب کی طرف سے روشنی پر ہے۔ اور اس کے برخلاف دوسرے لوگ اندھیروں میں بھٹک رہے ہیں۔ ان کے پاس کوئی واضح راستہ نہیں ہے۔ ایک اور مقام پر فرمایا: **إِنْ تَتَّقُوا اللَّهَ يَجْعَلْ لَكُمْ فُرْقَانًا** اگر اللہ سے ڈرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے لیے ہر تاریکی میں راستہ پیدا کر دیگا۔ تمہارے راستے کو روشن کر دیگا۔ مشکلات کو حل کر دیگا۔ اور تمہارے تمام امور میں آسانی پیدا کر دیگا۔ ایک اور جگہ فرمایا کہ اہل ایمان دوسرے لوگوں کے درمیان روشنی میں چلے گا۔ جس نے ایمان کا راستہ نہیں پکڑا وہ اندھیروں میں بھٹک گیا۔ اس کے لیے تمام معاملات میں اندھیری اندھیرا ہے۔ مگر اہل ایمان ایسی روشنی سے منور ہے۔ جو اسے ہر نزع میں بھی کام آئیگی۔ اور اس کی قبر بھی روشن ہو جائیگی۔ حضور نے فرمایا نماز مومن کے لیے قبر میں روشنی پیدا کرے گی۔ اسی لیے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ ایمان والوں کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔

طاغوت کی
دستی

فرمایا **وَالَّذِينَ كَفَرُوا** جنہوں نے کفر کا راستہ اختیار کیا **أُولَٰئِكَ لَهُمُ الطَّاغُوتُ** ان کے سامنے طاغوت ہیں۔ اور ان کا کام کیا ہے **يُخْرِجُوهُمْ مِّنَ النُّورِ**

رَالِی الظُّلُمَاتِ وہ انہیں روشنی سے اندھیروں کی طرف نکالتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب شیاطین کے ہتھے چڑھ جاتے ہیں۔ تو کوئی انہیں کفر کی طرف لے جاتا ہے کوئی شرک کی طرف اور کوئی بدعت کی طرف۔ اور کوئی ترغیب دلا کر معصیت کی طرف لے جاتا ہے۔ ایسے لوگ بہر حال دین و ایمان کی روشنی سے نکل کر اندھیروں کی طرف ہی جاتے ہیں۔ یہ تو پہلے واضح کیا جا چکا ہے۔ کہ دین میں جبر نہیں۔ اب ایمان اور کفر کا تقابلی جائزہ بھی پیش کر دیا گیا ہے۔

فرمایا جو لوگ روشنی سے نکل کر اندھیرے کی طرف جائیں گے۔ ان کا انجام یہ ہے۔ کہ اُولَئِكَ اَصْحَابُ النَّارِ یہی لوگ اہل دوزخ ہیں۔ هُم فِيهَا خَالِدُونَ یہ ہمیشہ ہمیشہ دوزخ کی آگ میں ہی جلتے رہیں گے۔ وہاں سے نکلنے کی کوئی امید ہوگی كَلَّمَا ارَادُوْا اَنْ يَخْرُجُوْا مِنْهَا اُعِيْدُوْا فِيْهَا جب کبھی وہاں سے نکلا چاہیں گے واپس دھکیل دیے جائیں گے۔ ان کے مقابلے میں جو اہل ایمان ہیں، وہ کامیاب ہو جائیں گے۔ ان کا ٹھکانہ ہمیشہ کے لیے جنت ہوگا۔ وہ دائمی عیش و راحت میں ہوں گے۔ کیونکہ انہوں نے دین اسلام کے مضبوط کھڑے کو پکڑ لیا۔ اور پھر اس گرفت کو کمزور نہیں ہونے دیا۔

أَمْ تَرَىٰ الَّذِي حَاجَّ إِبْرَاهِيمَ فِي رَبِّهِ أَنْ آتَاهُ اللَّهُ الْمُلْكَ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّيَ الَّذِي يُحْيِي وَيُمِيتُ قَالَ أَنَا أُحْيِي وَأُمِيتُ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ يَأْتِي بِالشَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ فَأْتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ ﴿٢٥٨﴾

ترجمہ: کیا آپ نے اس شخص کی طرف نہیں دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ساتھ جھگڑا کیا تھا۔ اُس کے رب کے بارے میں اس وجہ سے کہ اللہ تعالیٰ نے اس کو بادشاہی دی تھی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے کہا میں پروردگار وہ ہے۔ جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تو وہ شخص کہنے لگا، میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ ابراہیم نے کہا بیشک اللہ تعالیٰ سورج کو مشرق کی جانب سے لاتا ہے۔ تم اس کو مغرب کی جانب سے لاؤ۔ پس وہ شخص حیران ہو گیا جس نے کفر کیا تھا۔ اور اللہ تعالیٰ ظلم کرنے والی قوم کو راہ نہیں دکھاتا ﴿۲۵۸﴾

اس سے پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اہل ایمان اور کفار کا ذکر فرمایا تھا کہ اللہ ایمان والوں کا کار ساز ہے۔ اُن کو اندھیروں سے نکال کر روشنی کی طرف لاتا ہے۔ اور جنہوں نے کفر اختیار کر رکھا ہے۔ ان کے ساتھی طاغوت یا شیطان ہیں، جو انہیں ایمان کی روشنی سے نکال کر کفر کے اندھیروں کی طرف لے جاتے ہیں۔ گویا دو قسم کے گردہوں کا ذکر ہوا۔ ایک اولیاء الرحمن یعنی وہ لوگ جن کا ولی اللہ تعالیٰ خود ہے۔ وہ رحمن کے دوست ہیں۔ اور دوسرا گمراہ اولیاء الشیطان کا ہے۔ جنہوں نے طاغوت کو اپنا دوست بنا رکھا ہے۔

آج کے درس سے شروع ہونے والے کچھ عرصے میں بھی اللہ جل جلالہ نے

انہیں دو قسم کے گروہوں کے متعلق بات کی وضاحت کے لیے تین مثالیں بیان فرمائی ہیں۔ جن میں مسئلہ توحید، اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ اور حیات بعد الممات کا مسئلہ اچھی طرح سے سمجھایا ہے۔ پہلی آیت میں اللہ نے اپنی قدرت اور صنعت کو سمجھایا ہے۔ اور ساتھ توحید خالص کی وضاحت فرمائی ہے۔ دوسری اور تیسری آیت میں مرنے کے بعد دوبارہ زندگی کا مسئلہ بیان فرمایا ہے۔ اور توحید کا ذکر کیا ہے۔ اس طرح ان آیات کو پہلی آیات کے ساتھ ربط ہے۔

ابراہیم علیہ السلام اور
نمرود میں منظرہ

آج کے درس میں حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس مناظرے کا ذکر ہے، جو انہوں نے بادشاہ وقت نمرود کے ساتھ کیا تھا۔ اور جس میں آپ نے توحید باری تعالیٰ کے متعلق دلائل دیے تھے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ اَلْحَقُّ تَحْتَ الْاَلْوَانِ الَّذِي حَاجَّ اِبْرَاهِيْمَ فِي رَبِّهِمْ کیا آپ نے اُس شخص کو نہیں دیکھا جس نے حضرت ابراہیم علیہ السلام سے اُن کے رب کے متعلق جھگڑا کیا۔

اَلْحَقُّ تَحْتَ اِس سے پہلے بنی اسرائیل کے واقعے میں بھی آچکا ہے مفسرین کو فرماتے ہیں کہ روایت دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک بصری اور دوسری قلبی یا علمی۔ روایت بصری وہ ہے۔ جسے آنکھوں سے دیکھا جائے۔ اور پھر واقعہ بیان کیا جائے۔ اور روایت علمی وہ ہے۔ جو علم کے ذریعے حاصل ہو۔ کسی واقعہ کو آنکھوں سے نہ دیکھا ہو۔ ابراہیم علیہ السلام اور نمرود کا یہ واقعہ بھی حضور علیہ السلام کی بعثت سے تقریباً اڑھائی ہزار سال پہلے پیش آیا۔ اس لیے روایت بصری کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا البتہ اللہ تعالیٰ نے اس واقعہ کا مشاہدہ علم کے ذریعہ کرایا۔ اور اس کو اس طرح یاد کرایا۔ اَلْحَقُّ تَحْتَ الْاَلْوَانِ آپ نے نہیں دیکھا یا آپ کو نہیں معلوم۔ مطلب یہ کہ آپ کو اچھی طرح اس واقعہ کا علم ہے کہ کس طرح اُس شخص نے اللہ تعالیٰ کے متعلق ابراہیم علیہ السلام سے مکالمہ کیا۔ اور وہ شخص کون تھا۔ اَنْ اَتْتَهُ الْمَلٰٓئِكَةُ جسے اللہ تعالیٰ نے ملک یعنی حکومت عطا کی ہوئی تھی۔ وہ وقت کا بادشاہ تھا۔

اس شخص کے متعلق مختلف تفاسیر اور تاریخ کی کتابوں میں آتا ہے۔ کہ اُس کا نام

نمرود کا
شجرہ نسب

نمرد تھا۔ اُس کے باپ کا نام کنعان بن کوثر تھا۔ لہذا وہ نمرد ابن کنعان کہلاتا تھا۔ بعض اوقات اسے اپنے دادا کی طرف منسوب کر کے نمرد بن کوثر بھی کہا جاتا ہے۔ بہر حال یہ شخص حضرت نوح علیہ السلام کے تین بیٹوں عام، سام اور یافت میں عام کی نسل میں سے تھا۔ اور اس کا پایہ تخت عراق میں بابل کے مقام پر تھا۔ اس زمانے میں یہ بڑا مشہور و معروف شہر تھا۔ جو موجودہ بغداد سے ستر یا سو میل کے فاصلے پر تھا اس شہر سے بہت سی تہذیبیں وابستہ ہیں۔ نمرد، کلدانی خاندان کا بادشاہ تھا۔ اس خاندان نے چار سو سال تک حکومت کی تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ نسل کے اعتبار سے یہ شخص ٹھیک نہیں تھا۔ تاہم یہ وہ شخص ہے جس نے سب سے پہلے سر پر تاج شاہی رکھا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ چار شخص ایسے گنہگار ہیں جن کی پوری دنیا پر حکمرانی تھی۔ ان میں سے دو مسلمان تھے اور دو کافر۔ مسلمانوں میں حضرت سلیمان علیہ السلام اور ذوالقرنینؑ ہیں۔ جن کا واقعہ سورۃ کہف میں ملتا ہے۔ کفار میں ایک نمرد اور دوسرا بخت نصر تھا۔ جس کا ذکر سورۃ بنی اسرائیل میں آیا ہے۔ اس شخص نے بنی اسرائیل کو بالکل بے باور و ذلیل کر دیا تھا۔

اس بات میں اختلاف ہے کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کا نمرد کے ساتھ مناظرہ منظرہ کب ہوا ان کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے ہوا یا اس کے بعد۔ بعض مفسرین کہہ فرماتے ہیں کہ یہ واقعہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے آگ میں ڈالے جانے سے پہلے کا ہے جو بنی ابراہیم علیہ السلام جو ان ہوئے۔ انہوں نے اللہ تعالیٰ کی توحید کی تبلیغ شروع کر دی۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کو اوائلی عمر سے ہی رشد و ہدایت عطا کی تھی۔ قرآن پاک میں موجود ہے وَلَقَدْ آتَيْنَا إِبْرَاهِيمَ رُشْدَهُ مِنْ قَبْلُ ۖ هُمْ فِيهِ يَسْتَكْبِرُونَ ابراہیم علیہ السلام کو ابتداء سے ہی رشد و ہدایت دی۔ آپ کے والد آذر سرکاری ملازم تھے۔ اس کے علاوہ وہ اُس بڑے بت خانے کے اسچارج تھے، جسے بادشاہ کے حکم سے قائم کیا گیا تھا۔ یہ مناظرہ اس وقت ہوا۔ اس کے بعد آپ کو آگ میں ڈال دیا۔ بعض دوسرے مفسرین کی تحقیق یہ ہے کہ مذکورہ مناظرہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تفسیر ابن کثیر ص ۲۱۳ و قرطبی ص ۲۸۶ کے تفسیر کبیرہ ص ۲۳ (فیاض)

کے اگلے جانے کے بعد تمنا ابراہیم علیہ السلام کے آگ سے زبردستی جانے کا حجزہ دیکھ کر بھی مدہ
 آپ پر ایمان لائے۔ **فَإِنَّ اللَّهَ لَوَلِيٌّ لَّخَيْرٍ** حضرت لوط علیہ السلام کے سوکھی نے آپ کی نصیحت کی البتہ گھر میں آپ کی
 بیوی سارہ تھی۔ جسے ایمان کی دولت حاصل تھی۔ ان ایام میں یہ مناظرہ ہوا۔ آخر وہ وقت
 بھی آیا جب ابراہیم علیہ السلام کو اپنا وطن بابل بھی چھوڑنا پڑا۔ اس سفر میں آپ کے ہمراہ
 حضرت لوط اور آپ کی بیوی تھے۔ آپ عراق سے چل کر فلسطین پہنچے۔ وہاں اپنے
 بھتیجے حضرت لوط علیہ السلام کو تبلیغی مشن پر بحر لوط کے کنارے متعین کیا۔ پھر آپ مصر
 پہنچے۔ وہاں سے مکہ مکرمہ پہنچ کر بیت اللہ شریف کی تعمیر کی۔ اور اپنے فرزند اسماعیل
 کو وہاں چھوڑا۔ آپ واپس فلسطین آگئے۔ اور وہیں آپ کا انتقال ہوا۔ آپ کے دو سر
 بیٹے حضرت اسحاق علیہ السلام نے وہاں کے تبلیغی فرائض سنبھالے۔

منظر کا
 پس منظر

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور غرود کے درمیان بحث و مباحثہ کی نوبت
 کیوں پیش آئی۔ اس کے متعلق مولانا شیخ الحداد اور شاہ عبدالقادر نے اپنی تفاسیر
 میں مختصر نوٹ لکھا ہے۔ فرماتے ہیں۔ کہ اس سے پہلی آیت میں اہل ایمان اور اہل کفر
 کا تذکرہ تھا۔ ان کے نور اور ظلمت کا بیان تھا۔ اور اب اس آیت میں اسی سلسلہ
 میں بعض نظریں پیش کی گئی ہیں اور اس پہلی نظیر میں غرود اور حضرت ابراہیم کا ذکر ہے
 کہ جو کوئی شخص غرود کے دربار میں جاتا تھا۔ وہ سب سے پہلے اُسے سجدہ کرتا تھا جب
 ابراہیم علیہ السلام دربار غرود میں پہنچے۔ تو آپ سے بھی سجدہ کرنے کی توقع کی گئی
 مگر آپ نے غرود کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا۔ جس پر مناظرے کی مذکورہ صورت
 پیش آئی۔

غرود کا واقعہ تاریخ کی تمام پڑائی کتابوں میں ملتا ہے مگر محض تاریخی روایات
 پر انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ تاریخ میں ہر قسم کے واقعات بلا تحقیق نقل کر دیے
 جاتے ہیں۔ پرانے مؤرخین میں ابن خلدون کو اور کچھ مقام حاصل ہے۔ یہ آٹھویں صدی
 ہجری میں ہوئے ہیں۔ اور تاریخ کے اہم تصور کیے جاتے ہیں۔ انہوں نے
 تاریخ کا ایک ضخیم مقدمہ قبلہ کیا ہے جس میں تاریخ کے مختلف موضوعات

بیر حاصل بحث کی ہے۔ اس نے پوری دنیا کو تاریخ کا فلسفہ سکھا دیا ہے۔ یورپ اور ایشیا کے تمام مؤرخین ابن خلدون کے شاگرد ہیں۔ خود قاضی بھی تھے۔ مگر تاریخی روایات کی صحت کے متعلق ان پر بھی مکمل انحصار نہیں کیا جاسکتا۔ طبری کی تاریخ میں بھی صحیح اور غلط ہر قسم کے واقعات ملتے ہیں۔ تاریخ دان کسی واقعہ کی پوری تحقیق نہیں کرتے۔ یہ تو محدثین کو شرف حاصل ہے۔ کہ کسی واقعہ کو نقل کرنے سے پہلے راولوں کی جانچ پڑتال کی جاتی ہے۔ ہر غلط ملط واقعہ درج نہیں کیا جاتا۔ البتہ امام ابن کثیرؒ نے اس ضمن میں کافی پیش رفت کی ہے۔ آپ کا زمانہ آٹھویں صدی ہجری ہے۔ امام ابن تیمیہؒ کے شاگردوں میں ہیں۔ آپ نے واقعات کی جانچ پڑتال کی کوشش کی ہے۔ روایات پر صحیح یا غلط ہونے کے متعلق جرح بھی کی ہے۔ آپ کی تاریخ کی کتاب البیہ والنبایہ سولہ جلدوں میں ہے۔ جس میں آدم علیہ السلام سے لے کر اپنے زمانے تک کے واقعات تفصیل کے ساتھ قلمبند کیے ہیں۔ یہ سب سے زیادہ مستند تاریخ تسلیم کی جاتی ہے۔ بہر حال انہوں نے واقعات کی صحت کا کسی حد تک خیال رکھا ہے۔ اپنے قرآن پاک کی تفسیر ابن کثیرؒ لکھی ہے۔ جو اعلیٰ درجے کی تفسیر تسلیم کی جاتی ہے۔

تاریخی روایات کی صحت کی جانچ پڑتال میں امام مسعود لغویؒ کا نام سرفہرست ہے۔ آپ امام رازیؒ سے بھی

پہلے پانچویں صدی میں ہوئے ہیں۔ آپ کا وطن خراسان میں بغات ہے۔ آپ اعلیٰ پائے کے محدث تھے۔ آپ کی حدیث کی کتاب "مصابیح" کے نام سے موجود ہے۔ جو علم حدیث کی بلند پایہ کتاب ہے۔ جسے صاحب مشکوٰۃ نے مزید شرح کے ساتھ قلمبند کیا ہے۔ آپ مفسر قرآن بھی ہیں۔ آپ کی تفسیر "معالم التنزیل" کے نام سے موجود ہے، جو چار جلدوں میں ہے۔ اور اُس دور کی معتبر تفسیروں میں شمار ہوتی ہے۔ بہر حال انہوں نے تاریخی واقعات میں صحت کا کسی قدر زیادہ التزام کیا ہے۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام اور غرود کے واقعہ کے متعلق امام ابن کثیرؒ اور امام لغویؒ فرماتے ہیں کہ یہ اُس زمانے کا واقعہ ہے۔ جب کہ ملک میں قحط پڑ گیا اور لوگ بھوکوں

مرنے لگے، اس وقت غمزدہ کے پاس غلے کا ذخیرہ موجود تھا۔ لوگ اُس کے پاس غلے لینے کے لیے جاتے تھے۔ اور دربار میں پہنچ کر سب سے پہلے سجدہ کرتے اور پھر اپنا مدعا بیان کرتے۔

اصل مناظرہ

حضرت ابراہیم علیہ السلام بھی غمزدہ کے دربار میں پہنچے مگر آپ نے اُسے سجدہ نہ کیا۔ اُس نے وجہ دریافت کی تو اپنے فرمایا۔ کہ میں اپنے رب کے سوا کسی دوسرے کو سجدہ نہیں کرتا۔ غمزدہ نے کہا۔ کہ رب تو میں ہوں لہذا مجھے سجدہ کر دو۔ ابراہیم علیہ السلام نے جواب دیا۔ تم تو محض حاکم وقت ہو، رب نہیں ہو۔ رب وہ ذات ہے۔ جو زندہ کرتا ہے اور مارتا ہے۔ تمہارے اختیار میں یہ چیز نہیں ہے۔ لہذا تم رب نہیں ہو سکتے۔ اس آیت پاک میں یہی بات بیان کی گئی ہے۔ إِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّیُّ الَّذِیْ یُعِیْ وَیُمِیْتُ یعنی میرا رب ہے۔ جو زندگی بخشتا ہے اور مارتا ہے غمزدہ فوراً بولا فَاکْأَنّیْ وَأُمِیْتُ میں بھی زندہ کرتا ہوں اور مارتا ہوں۔ چنانچہ اپنی طاقت کے مظاہرہ کے لیے اس نے دو قیدی منگوائے۔ جو بے گناہ تھا اُس کو قتل کر دیا۔ اور جو مجرم تھا اُسے آزاد کر دیا۔ اور کہنے لگا۔ دیکھو میں نے جس کو چاہا زندگی دے دی اور جسے چاہا موت کے حوالے کر دیا۔ ابراہیم علیہ السلام نے محسوس کیا کہ یہ شخص عقل کا ایسا اندھا ہے۔ کہ موت و حیات کے مضمون کو نہیں سمجھ سکا۔ یہ گنہگار کو چھوڑ دینے اور بے گناہ کو قتل کر دینے کو زندگی اور موت سمجھ رہا ہے۔ حالانکہ زندگی کا مالک تو وہ ہے جو بے جان چیزیں جان ڈال دے اور جاندار کی جان اپنے اختیار سے قبض کر لے اور یہ صرف اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔

ابراہیم علیہ السلام نے غمزدہ کو بیوقوف سمجھتے ہوئے اس نکتہ پر مزید بحث نہ کی۔ بلکہ ایک دوسری دلیل سے سمجھایا۔ قَالَ إِبْرَاهِيمُ فَإِنَّ اللَّهَ یَأْتِ بِالسَّمْسِ مِنَ الْمَشْرِقِ میرا رب سورج کو مشرق سے نکالتا ہے فَأَتِ بِهَا مِنَ الْمَغْرِبِ تو اُسے مغرب سے نکال کر دکھا۔ اب اُس کے حواس درست ہوئے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے ایسا سوال کیا ہے جس کا اس کے پاس کوئی جواب

نہ تھا۔ نتیجہ یہ ہوا۔ فَبُهِتَ الَّذِي كَفَرَؕ فرود حیران ہو گیا کہ آیا اللہ نے اس کی مستی مار دی۔ وہ لاجواب ہو گیا۔ چنانچہ اُس نے مزید بحث نہ کی۔ وہ سمجھ گیا کہ اگر ابراہیم علیہ السلام سے مزید مناظرہ کیا۔ تو بات بالکل بگڑ جائیگی اور وہ جھوٹا ثابت ہو جائے گا۔ لہذا وہ خاموش ہو گیا۔

مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں۔ کہ اس مقام پر مزید بحث و تمحیص ہو سکتی تھی فرض کرو اگر فرود سورج کے طلوع و غروب کے متعلق ابراہیم علیہ السلام کو یہ جواب دیتا کہ سورج کو مشرق سے ترمیں طلوع کہتا ہوں تم اپنے رب کے کہو کہ مغرب نکالے تو ایسی صورت میں اللہ تعالیٰ یقیناً ابراہیم علیہ السلام کو سچا کہہ دکھاتا اور سورج کو مغرب سے طلوع کر دیتا۔ مگر فرود کو اپنی شکست کا یقین ہو گیا۔ لہذا اُس نے خاموشی اختیار کرنے میں جی صلیت جانی۔

غیر اللہ کو سجدہ کرنے کا دور ربہ غیر پاک و ہند میں بھی پیش آیا تھا۔ مغل بادشاہ جہانگیر بھی اپنے آپ کو سجدہ کرتا تھا۔ حالانکہ یہ اللہ تعالیٰ کی شان ہے کہ اس کے سامنے سجدہ کیا جائے۔ مخلوق میں سے کسی کے لائق نہیں کہ اُسے سجدہ کیا جائے۔ چنانچہ جہانگیر کے زمانے میں حضرت مجدد الف ثانیؒ نے سجدہ کی علی الاعلان مخالفت کی۔ بہر حال یہ آپ کی کوشش کا نتیجہ تھا۔ کہ جہانگیر جیسا اکھڑ مزاج بادشاہ بھی اس فعل سے تائب ہو گیا۔ اور اس کا عقیدہ درست ہو گیا۔ البتہ اسکی بیوی رافضیہ تھی۔ مگر وہ رافضیوں کا طر فدار نہیں بنا۔ اور صحیح دین اسلام پر قائم رہا۔ اس کا اثر یہ ہوا۔ کہ جہانگیر کے بعد شاہ جہان مزید دین کی طرف راغب ہوا۔ اور پھر اورنگ زیب عالمگیر جیسا خوف خدا رکھنے والا بادشاہ بھی پیدا ہوا جس نے اگلی پچھلی ساری کسر نکال دی۔

بہر حال جب حضرت ابراہیم علیہ السلام نے فرود کو سجدہ کرنے سے انکار کر دیا تو اُس نے آپ کو غلہ سینے سے انکار کر دیا۔

اور آپ کو خالی داپس آنا پڑا۔ واپسی پر دل میں خیال آیا۔ کہ گھر والوں کو خالی لٹٹنے کا کیا جواب دوں گا۔ آپ نے راستے میں اپنا تھیلہ ریت سے بھر لیا۔ تاکہ گھر والوں

کو معلوم ہو کہ خالی ہاتھ واپس نہیں آئے۔ گھر پہنچ کر تحصیل گھر میں کھا اور خود سونے کی بیوی نے سمجھا کہ آٹے آئے ہیں چنانچہ وہ اٹھی تاکہ خیلے میں سے آٹا لیکر روٹی تیار کرے خیلے کو کھولا تو اس میں واقعی آٹا تھا کیا تیار کرنے کے بعد ابراہیم علیہ السلام کو جگایا کہ کھانا کھالیں آپ نے پوچھا روٹی کس چیز سے پکائی ہے۔ بیوی نے عرض کیا، اُس آٹے سے جو آپ لائے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام سمجھ گئے کہ اللہ تعالیٰ نے خاص مہربانی کی ہے۔ اور ریت کا آٹا بن جانا ایک معجزہ ہے۔ امام رازی فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کی صفت کو سمجھنا بڑا مشکل کام ہے۔ وہ کمال قدرت کا مالک ہے۔ اس کی صفت اس کے فعل سے سمجھ میں آتی ہے۔ جب کوئی عجیب و غریب فعل سرزد ہوتا ہے۔ تو پھر پتہ چلتا ہے کہ یہ کام صرف اللہ تعالیٰ کا ہے۔ اور کوئی نہیں کر سکتا۔ اور حجب یہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ تو پھر اس کی توصیف کی پہچان ہوتی ہے۔ کہ ایسی صفت کا مالک اور کمال قدرت اور کمال صفت کا مالک صرف اور صرف اللہ وحدہ لا شریک ہے۔ گویا اس سارے واقعہ سے یہ بات نکلی کہ موت و حیات کا مالک اور نظام شمسی کو چلانے والا فقط اللہ تعالیٰ ہے۔ وہ چاہے قمر بڑے سے بڑے سرکش کو لا جواب کر دے۔ اور چاہے توریت کو غلہ میں تبدیل کر دے۔ یہ سب اس کی کمال قدرت کے کمر شے ہیں۔ جو اس کی وحدانیت پر دلالت کرتے ہیں۔

ظالم ہدایت
سے محروم ہیں

فرمایا اللہ تعالیٰ کی صفات کو کھلی آنکھوں سے دیکھ کر بھی اگر کوئی شخص ایمان نہیں لاتا، تو پھر وہ پرے درجے کا ظالم ہے۔ اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون ہے۔ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الظَّالِمِينَ۔ اللہ تعالیٰ ظالم قوم کو ہدایت نہیں دیتا یعنی ان کی رہنمائی نہیں کرتا پہلی آیت میں بھی آپکا ہے۔ وَالْكَافِرُونَ هُمُ الظَّالِمُونَ۔ کہ کافر لوگ ہی ظالم ہیں جو اللہ تعالیٰ کی توحید پر ایمان نہیں لاتے۔ وہ مشرک ہیں اور شرک کی حقیقت یہ ہے۔ اِنَّ الشِّرْكَ لَظُلْمٌ عَظِيمٌ۔ شرک بہت بڑا ظلم ہے۔ اور اس کے مترتب ظالم لوگ ہیں۔ جو لوگ شرک جیسے ظلم عظیم میں پھنس جاتے ہیں۔ اللہ ان کو راہ راست کی طرف رہنمائی نہیں کرتا۔ یہ اللہ کا عام قانون ہے۔ کہ جب تک کوئی

ظلم سے ناسب نہیں ہوگا، اُسے ہدایت نصیب نہیں ہو سکتی۔

الغرض گذشتہ درس میں بیان ہونے والے اولیاء اللہ اور اولیاء الشیطن کی مثال اس درس میں آگئی۔ غرور و طاغوت کا پرستار تھا۔ اور ابراہیم علیہ السلام حق پر قائم تھے۔ اللہ تعالیٰ نے حق کو فتح نصیب فرمائی۔ اور اپنی صفت کے ذریعے اپنی ذات کی پہچان کرائی۔

أَوْ كَالَّذِي مَرَّ عَلَى قَرْيَةٍ وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَى عُرُوشِهَا
 قَالَ أَلِي يَأْتِي هَٰذَا اللَّهُ بَعْدَ مَوْتِنَا؟ فَأَمَاتَهُ اللَّهُ مِائَةَ
 عَامٍ ثُمَّ بَثَّهٗ ۖ قَالَ كَمْ لَبِثْتُ؟ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا أَوْ بَعْضَ يَوْمٍ
 قَالَ بَل لَّبِثْتُ مِائَةَ عَامٍ ۖ فَانْظُرْ إِلَى طَعَامِكَ وَشَرَابِكَ
 لَمْ يَسْنَخْهُ ۖ وَانْظُرْ إِلَى حِمَارِكَ وَلِنَجْعَلَ آيَةً لِّلنَّاسِ ۖ وَانْظُرْ
 إِلَى الْعِظَامِ كَيْفَ نُنْشِزُهَا ثُمَّ نَكْسُوهُمَا الْحَمِإَ ۚ فَلَمَّا
 تَبَيَّنَ لَهُ ۖ قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ ﴿۲۵۹﴾

ترجمہ :- (کیا نہیں دیکھا آپ نے اس شخص کو جو ایک بستی پر گزرا، جو کہ اپنے
 چھتروں پر گھری ہوئی تھی۔ اُس شخص نے کہا کہ اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے زندہ کرے گا۔
 اس کے دیران ہونے کے بعد، پس اللہ تعالیٰ نے اُس شخص پر موت طاری کر دی
 سو سال تک۔ پھر اُسے اٹھایا۔ اور کہا کہ تو یہاں کتنی دیر تک رہا ہے۔ اُس نے
 کہا، میں یہاں ایک دن یا ایک دن سے کچھ کم رہا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا
 نہیں بلکہ تو سو سال بٹھا رہے۔ پس دیکھ اپنے کھانے اور مشروب کی طرف، وہ متغیر نہیں
 ہوا۔ اور دیکھ اپنی سواری کے گدھے کی طرف اور تاکہ ہم تجھے لوگوں کے لیے ایک نشانی
 بنادیں۔ اور دیکھ ٹھیلوں کی طرف، اُس طرح ہم ان کو اعبا رہتے ہیں۔ پھر ان کو گوشت پہنتے
 ہیں۔ جب اُس شخص پر بات واضح ہو گئی، تو وہ کہنے لگا، میں جانتا ہوں کہ بیشک اللہ تعالیٰ

ہر چیز پر قدرت رکھنے والا ہے۔ ﴿۲۵۹﴾

گزشتہ آیت میں اللہ تعالیٰ نے اولیاء الرحمن اور اولیاء الشیطان کی مثال بیان فرمائی۔
 ایک طرف حضرت ابراہیم علیہ السلام اولیاء الرحمن کا نمونہ ہیں۔ اور دوسری طرف سرور

اولیاء الشیطان کی مثال ہے دونوں کا مناظرہ و مباحثہ اور پھر حضرت ابراہیم علیہ السلام کا دلائل و براہین کی رو سے غالب آجانا اور کافر کا حیلان و پریشان ہو جانا یہ سب بیان ہو چکا ہے۔ اس واقعہ سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ اللہ تعالیٰ نے کس طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام کی دشگیری فرمائی اور اس بات کو ثابت کر دیا کہ اللہ ولی المؤمنین اھمق یعنی اللہ تعالیٰ اہل ایمان کا کارساز ہے۔ اس مثال سے شیطان کی شیطنت بھی سمجھ میں آئی کہ فرود کو اللہ تعالیٰ نے بادشاہی عطا کی تھی مگر اس انعام کا شکر گزار ہونے کی بجائے وہ شیطان کے پیچھے لگ گیا اور خود خدائی کا دعویدار بن گیا۔ اس نے انعام الہی سے غلط فائدہ اٹھایا اور سرکشی اختیار کی۔ جب ابراہیم علیہ السلام نے اسے صراط مستقیم دکھانا چاہا تو اس نے جھگڑا شروع کر دیا۔

آج کے درس والی آیت میں اللہ تعالیٰ نے ایک اور مثال کے ذریعے اپنی قدرت کاملہ اور حیات بعد الممات کا مسئلہ سمجھایا ہے۔ یہ مثال بیان کر کے اللہ تعالیٰ نے قیامت کے دن دوبارہ زندہ ہونے کو ثابت کیا ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ اس قسم کے واقعات معارف الہیہ میں شمار ہوتے ہیں۔ اور ان کو دیکھ کر انسان کا روز قیامت پر یقین پختہ ہوتا ہے۔ لہذا خلیفہ وقت کا فرض ہے کہ وہ ایسے واقعات کی تشریح کرے تاکہ لوگوں کے دلوں میں دوبارہ حیات اٹھنے کے متعلق کوئی شک و شبہ باقی نہ رہے۔

متعلقہ شخص
کون تھا

اس آیت کی ابتداء آف کا لفظ ذی سے کی گئی ہے یعنی اُس شخص کا واقعہ جس کا گزرا ایک تباہ شدہ بستی پہ ہوا۔ اور اس نے دل میں سوچا کہ اللہ تعالیٰ ایسی پامال شدہ بستی کو کیسے دوبارہ آباد کرے گا۔ یہاں پہ اُس شخص کا تعارف نہیں کر لیا گیا۔ جس کے ساتھ یہ واقعہ پیش آیا۔ حدیث پاک میں بھی اس کی کوئی تصریح نہیں ملتی۔ البتہ بائبل تفسیری روایات اور تاریخ سے اُس شخص کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ مفسرین کے اقوال میں سے ایک قول تو یہ ہے کہ یہ شخص سکرے سے مسلمان ہی نہیں تھا۔ بلکہ حیات بعد الممات کا منکر تھا۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اُسے اپنی آنکھوں سے دوبارہ حیات اٹھنے کا مشاہدہ کر لیا۔ دوسرا قول یہ ہے کہ یہ شخص نہ صرف

مومن تھا بلکہ اللہ کا نبی تھا۔ اب رہا یہ سوال کہ کون سا نبی تھا، تو بعض مفسرین فرماتے ہیں۔ کہ یہ یرمیاہ نبی تھے جن کا ذکر تورات میں موجود ہے۔ اور زیادہ مشہور قول یہ ہے۔ کہ آپ عزیر علیہ السلام تھے۔ اور اسی عجیب و غریب واقعہ کی بنا پر اسرائیلی آپ کو خدا کا بیٹا کہنے لگے۔ جیسا کہ قرآن پاک میں موجود ہے وَقَالَتِ الْيَهُودُ مَوْصًى ابْنُ اللَّهِ یعنی یہودیوں نے کہا۔ کہ عزیر اللہ کا بیٹا ہے۔

تاریخی
پس منظر

یہ واقعہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کی ولادت باسعادت سے پانچ سو سال پہلے پیش آیا۔ جب بنی اسرائیل میں سرکشی پیدا ہو گئی۔ اور وہ مختلف قسم کی برائیوں میں مبتلا ہو گئے۔ تو اس وقت بابل پر بخت نصر جیسا جابر و ظالم بادشاہ حکمران تھا۔ کہتے ہیں۔ کہ مردود کی طرح بخت نصر نے بھی پوری دنیا پر حکومت کی۔ چنانچہ اس نے شام و فلسطین پر حملہ کر کے تباہ و برباد کر دیا۔ اور یروشلم اور بیت المقدس کی اینٹ سے اینٹ بجا دی۔ بنی اسرائیلیوں کو قتل کر دیا۔ اور لاتعداد لوگوں کو غلام اور لونڈیاں بنا کر اپنے ساتھ عراق لے گیا۔ بنی اسرائیل کی تمام کتابیں تورات سمیت جلا ڈالیں۔ حتیٰ کہ تورات کا ایک نسخہ بھی سلاکت نہ بچا۔ تاریخی واقعات سے پتہ چلتا ہے۔ کہ قید ہونے والوں میں حضرت عزیر علیہ السلام بھی شامل تھے۔ کچھ عرصہ بعد جب آپ قید سے رہا ہو کر واپس اپنے وطن آئے تھے تو یہ واقعہ راستے میں پیش آیا۔ اس وقوعہ کے مقام کے متعلق اختلاف پایا جاتا ہے بعض لوگوں کا خیال ہے۔ کہ راستے میں کوئی شہر یا بستی تھی۔ بعض دوسرے کہتے ہیں کہ یہ خود یروشلم کا شہر تھا۔ بہر حال اس کی حالت یہ تھی۔ کہ مکانات کی چھتیں اور دیواریں زمین بوس ہو چکی تھیں اور وہاں کوئی شخص زندہ سلامت موجود نہیں تھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا۔ کہ کسی زمانے میں یہ ایک پُر رونق اور آباد شہر تھا۔ مگر اس وقت کھنڈرات کا ڈھیر بن چکا تھا

واقعہ پر
سطح نظر

کہتے ہیں۔ کہ حضرت عزیر علیہ السلام گدھے پر سوار آئے تھے۔ آپ کے پاس کھانے پینے کا کچھ سامان بھی تھا۔ ایک برتن میں مچھلوں کا کچھ شیرہ تھا۔ اور ایک ٹوکری میں ابخیر تھے۔ یہ دونوں چیزیں ایسی ہیں جو جلد خراب ہو جاتی ہیں۔ بہر حال آپ کا اس

اجڑے ہوئے شہر پر گزر رہا۔ کھنڈرات کو عبور کرتے ہوئے ایک مقام پر ان کے دل میں خیال پیدا ہوا کہ کیا یہ اجڑا ہوا شہر بھی کبھی آباد ہوگا؟ اسی سوچ و بچار میں کھنڈرات کے درمیان ایک مقام پر اترے، نگدھے کو بانڈھا، کھانے کا کچھ حصہ کھایا اور باقی پاس رکھ لیا۔ تھکے ہوئے تو تھے ہی، ذرا آرام کرنے کے لیے لیٹ گئے۔ اور پھر ایسے سوئے کہ اللہ تعالیٰ نے سو سال تک سلائے رکھا۔ جس وقت سوئے تھے تو دن کا ابتدائی حصہ تھا اور جب بیدار ہوئے تو ابھی سورج غروب نہیں ہوا تھا۔ اٹھنے کے بعد ان سے سوال و جواب ہوئے کہ کتنا عرصہ سوئے۔ انہوں نے کہا کہ ایک دن یا دن کا کچھ حصہ۔ مگر اللہ تعالیٰ نے بتایا کہ وہ سو سال تک سوتے رہے ہیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے اپنی قدرت کاملہ کے کرشمہ کے طور پر انہیں دکھایا کہ اس سو سال کے عرصہ میں ان کا کھانا بالکل تازہ و تازہ تھا خراب نہیں ہوا تھا۔ البتہ ان کا گدھامر چکا تھا اور اس کی ہڈیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ پھر اللہ تعالیٰ نے آپ کے سامنے نگدھے کو زندہ کیا۔

جب عزیر علیہ السلام موت کی نیند سو رہے تھے۔ تو اس دوران بخت نصر گیا، ایران کے بادشاہ خسرو نے فلسطین پر حملہ کر کے اسے اپنے زیر نگین کر لیا، اور بنی اسرائیلیوں کو آزاد کر دیا۔ اور انہیں فلسطین کو دوبارہ آباد کرنے کی اجازت دے دی۔ چنانچہ انہوں نے تیس سال کے مختصر عرصہ میں اس اجڑے ہوئے شہر کو دوبارہ آباد کر لیا۔ اور پھر ایسا محسوس ہوتا تھا کہ یہ شہر کبھی دیران ہوا ہی نہیں۔ بلکہ پہلے سے بھی زیادہ پر رونق ہو گیا۔ دنیا کی تاریخ میں آبادی اور بربادی کی ایسی کئی مثالیں ملتی ہیں۔ پہلی جنگ عظیم میں جرمنی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی گئی تھی۔ مگر جنگ کے خاتمہ سے چند سال کے اندر اندر جرمنی اس طرح آباد ہو گیا۔ کہ گویا وہاں کوئی حادثہ پیش ہی نہیں آیا۔ بڑی بڑی بلڈنگیں۔ فیکٹریاں، کاروباری مراکز پہلے سے بھی زیادہ شان و شوکت کے ساتھ معرض وجود میں آ گئے۔

اسی طرح تیس سال کے عرصہ میں وہ شہر لپری آب و تاب کے ساتھ دوبارہ آباد ہو گیا۔ اور جب عزیر علیہ السلام اپنی موت کے سو سال پورے ہونے

پر دوبارہ اٹھائے گئے تو وہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ کہ میلوں تک پھلے ہوئے کھنڈرات ہنستے بستے شہر میں تبدیل ہو چکے تھے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے بطور غور نہ دکھا دیا۔ کہ مرنے کے بعد دوبارہ زندہ کر دینا اللہ تعالیٰ کی قدرت کاملہ کا طور ہے۔

تباہ شدہ
بستی

ارشاد ہوتا ہے۔ اَوَكَلَّا الَّذِي هَمَّ عَلٰی قَرْيَةٍ كَيْفَ كَيَا اَبَی كَیْلَی کہ وہ شخص جو ایک بستی پر گزرا۔ یہ بستی پر شتم تھا یا کوئی اور نگرہی تھی۔

وہی خاور ویکہ علی عروشا اور اس بستی کی حالت یہ تھی کہ اپنی چھتوں پر گرہی پڑی تھی۔ تباہ و برباد ہو چکی تھی۔ نہ کوئی دیوار سالم تھی اور نہ کسی مکان کی چھت باقی تھی بلکہ پوری بستی طے کا ڈھیر بن چکی تھی۔ وہاں کوئی زندہ سلامت آدمی موجود نہیں تھا۔ اگرچہ عام خیال یہی ہے۔ کہ یہ بستی نجات نصیب بادشاہ نے تباہ کر دی تھی مگر کہتے ہیں۔ کہ یہ کسی حادثہ کا نتیجہ بھی ہو سکتا ہے۔ جب زبردست قسم کا زلزلہ آتا ہے۔ تو

سینکڑوں میل تک تباہی پھیل جاتی ہے۔ بذریعہ کی بستی میں زلزلے نے وہ تباہی مچائی کہ رات کے محو طے سے حصہ میں دس بارہ ہزار کی آبادی میں سے کوئی بھی زندہ نہ بچا۔ ۱۹۲۳ء میں جاپان میں بہت بڑا زلزلہ آیا تھا۔ ہزاروں میل زمین میں لمبے لمبے شکاف پڑ گئے تھے۔ ڈیڑھ لاکھ آدمی ہلاکت کے منہ میں چلے گئے تھے۔ قیامت

صغریٰ کا نمونہ تھا۔ ۱۹۳۵ء میں کوئٹہ جیسا آباد شہر آنا فانا طے میں تبدیل ہو گیا تھا ہزاروں جانیں تلف ہو گئی تھیں۔ بہر حال اللہ کے نبی نے بستی کی بربادی کو دیکھ کر تعجب کے ساتھ کہا قَالَ اَلَيْسَ هٰذَا اللّٰهُ بَعْدَ مَوْتِهَا اس قدر تباہی کے بعد اللہ تعالیٰ اس بستی کو کیسے زندہ کرے گا۔ یہاں پر حیات اور موت کا لفظ استعمال کیا گیا ہے۔ اگر

ہذا سے مراد وہ بستی ہے۔ تو اس کا معنی ہو گا کہ اللہ تعالیٰ اس اجڑی ہوئی بستی کو دوبارہ کیسے آباد کرے گا۔ اور اگر اس سے مراد اس بستی کے لوگ ہیں جو بستی کی تباہی کے ساتھ ہی موت کی آغوش میں چلے گئے تھے تو اس کا معنی یہ ہو گا کہ اللہ تعالیٰ قیامت کے دن ان کو کیسے زندہ کرے گا، جب کہ ان پر موت طاری ہو چکی ہے

موت و حیات
کا منظر

حضرت عزیز علیہ السلام کے اس تعجب خیز سوال کا جواب اللہ تعالیٰ نے

اس طرح دیا کہ فَاَمَاتَهُ اللّٰهُ مِائَتَةَ عَامٍ آپ پر سو سال تک کے لیے موت طاری کر دی۔ ثُمَّ بَعَثْنَاهُ پھر آپ کو اٹھایا۔ اور کہا قَالَ كَمْ لَبِثْتُمْ مَتًی دیر بٹھڑے یعنی اس حالت میں کتنا عرصہ ہے، ذرا بتاؤ تو سہی۔ قَالَ لَبِثْتُ يَوْمًا اَوْ بَعْضَ يَوْمٍ ط عرض کیا، ایک دن یا دن سے کچھ کم بٹھرا ہوں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا۔ قَالَ بَلْ لَبِثْتَ مِائَتَةَ عَامٍ بلکہ تم ایک سو سال تک بٹھڑے اور آپ کو باور کرانے کے لیے فرمایا فَاَنْظُرْ اِلَى طَعَامِكَ وَشَرِبِكَ لَمْ يَتَسَنَّهْ ذرا اپنے کھانے اور مشروب کی طرف دیکھو، وہ متغیر نہیں ہوا یعنی اتنا عرصہ گزرنے کے بعد گل سٹر کر خراب نہیں ہوا نہ اس کی شکل تبدیل ہوئی ہے۔ نہ ذائقہ اور نہ رنگ۔ یہ اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت ہے۔ کہ جلد خراب ہو جانے والی چیز کو اتنے لمبے عرصے تک محفوظ رکھا۔ اور دوسری طرف خود عزیر علیہ السلام ہیں۔ ان کا جسم سو سال تک کھنڈرات کے درمیان پڑا رہا مگر بالکل صحیح سلامت اس میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ نہ اس کا گوشت گلا سٹرا اور نہ ہڈیاں علیحدہ ہوئیں۔ جس طرح اُس مالک الملک نے اصحاب کھٹ کو تین سو نو سال تک ایک غار میں محفوظ رکھا، اسی طرح حضرت عزیر علیہ السلام کے جسم کو ایک سو سال تک آنچ نہ آنے دی۔ اللہ تعالیٰ جب چاہے اپنی حکمت کے ساتھ ایسی چیزیں ظاہر کرتا ہے۔ پورا شہر آباد ہو گیا۔ مگر جس جگہ عزیر علیہ السلام آرام فرماتھے، وہاں تک کسی کی رسائی نہیں ہوئی۔ آج لوگ اعتراض کرتے ہیں کہ دجال کہاں مقید ہے۔ آج دنیا کا کوئی حصہ نظروں سے اوجھل نہیں رہا۔ آخر وہ کہاں چھپا ہوا ہے۔ بھائی! اللہ تعالیٰ نے اُسے لوگوں کی نظروں سے مخفی کر دیا ہے۔ جب اُس کا حکم ہو گا، ظاہر ہو جائے گا۔ یا جوج ماجوج کی قوم بھی ایسی ہی ہے۔ وہ بھی کسی کو نظر نہیں آتے۔ انگریزوں نے دعویٰ کیا کہ انہوں نے پوری دنیا کا کونہ کونہ چھان مارا ہے مگر یا جوج ماجوج کہیں نظر نہیں آئے۔ مگر یاد رکھو! اللہ تعالیٰ نے انہیں اپنی حکمت سے چھپا رکھا ہے۔ قرآن پاک میں موجود ہے۔ جب اس کا حکم ہو گا، یہ قوم پہاڑوں سے نکل کر ظاہر ہو جائے گی۔

حضرت عزیر علیہ السلام کے خود اپنے ساتھ اور کھانے کے ساتھ تو یہ معاملہ ہوا۔ اب انکے گدھے کا انجام دیکھئے۔ ہمارے ہاں تو گدھے کی سواری کو مستحق نہیں سمجھا جاتا، مگر اس زمانے میں یہ ایک علیحدہ سواری شمار ہوتی تھی۔ بڑے خوبصورت اور طاقتور گدھے ہوتے تھے، خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے گدھے کی سواری کی ہے۔ آپ بالکل تکلف نہیں فرماتے تھے۔ جو سواری میسر آئے، استعمال میں لے آتے تھے جب آپ بنو قریظہ سے جنگ کے لیے تشریف لے گئے۔ تو آپ کے پاس ہی سواری تھی۔ اور اسپرہ پالان بھی نہیں تھا۔ مگر آپ نے اسی حالت میں اُس پر سفر کیا۔ آپ نے اونٹ اور گھوڑے پر بھی سفر کیا، اور اگر کوئی سواری نہیں ملی تو پیدل ہی چل دیئے، حضرت جابرؓ بیمار ہو گئے۔ آپ کا گھر مدینہ طیبہ سے تین میل کے فاصلے پر تھا۔ حضور علیہ السلام بیمار پرسی کے لیے جانا چاہتے تھے، کوئی سواری نہیں ملی تو پیدل ہی چل دیئے۔ حضرت جابرؓ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضور تشریف لائے۔ تو آپ پر گھر دو غبار پڑا ہوا تھا۔ بہر حال گدھے کی سواری کو محبوب نہیں سمجھا جاتا تھا۔

اللہ تعالیٰ نے عزیر علیہ السلام کو مخاطب کر کے فرمایا۔ وَانْظُرْ إِلَىٰ حِمَارِكَ ذرا اپنے گدھے کی طرف دیکھو۔ کہ اُس کا کیا حشر ہوا ہے۔ فرمایا یہ سب واقعات پیش کرنے کا کوئی مقصد ہے۔ وَلِنَجْعَلَكَ آيَةً لِّلنَّاسِ تاکہ ہم آپ کو لوگوں کے لیے نمونہ بنا دیں۔ کہ دیکھو! اللہ تعالیٰ نے موت طاری کرنے کے بعد پھر کس طرح زندہ کر دیا۔ اب دیکھو گدھ کس طرح زندہ ہوتا ہے۔ فرمایا وَانْظُرْ إِلَىٰ الْعِظَامِ۔ ان ہڈیوں کی طرف نگاہ کرو۔ گدھام چکا ہے۔ گوشت گل ٹپک کر ختم ہو چکا تھا۔ اور اس کی ہڈیاں ادھر ادھر بکھری پڑی تھیں۔ فرمایا ان کی طرف دیکھو كَيْفَ نُنْشِئُهَا ہم کس طرح ان کا ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ نشتر کا معنی ہوتا ہے، ابھارنا، اٹھانا وغیرہ۔ ناشترہ اس عورت کو کہتے ہیں، جو خاوند کی نافرمان ہو اور مقابلے میں اٹھ کھڑی ہو۔ فرمایا دیکھو! ہم ان ہڈیوں کو جوڑ کر ڈھانچہ تیار کرتے ہیں۔ ثُمَّ نَكْسُوْهَا لَحْمًا پھر ان پر گوشت چڑھاتے ہیں۔ چنانچہ حضرت عزیر علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے ہڈیاں

ابھریں، ان کا ڈھانچہ تیار ہوا۔ پھر ان پر گوشت چڑھا۔ گدھے کی شکل و صورت بنی اور پھر وہ زندہ ہو کر لوہے لئے لگا۔

ہر ذی جان کا جسم ہڈیوں پر قائم ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا، جب انسان مر جاتا ہے۔ تو اس کے جسم کی تمام کثافتیں گل سٹر جاتی ہیں۔ صرف دم کی ہڈی کسی نہ کسی صورت میں باقی رہتی ہے۔ قیامت کے دن اسی ہڈی سے پورا ڈھانچہ اور پھر پورا جسم اٹھایا جائے گا۔ اسی چیز کو اللہ تعالیٰ نے گدھے پر وار د کیا اور پھر حضرت عزیر علیہ السلام کی آنکھوں کے سامنے جیتے جاگتے گدھے کی صورت میں کھڑا کر دیا۔

دارد ہونے والی موت کے اس سو سالہ عرصہ کو عالم برزخ سے تعبیر کیا جاسکتا ہے جب کوئی انسان مر جاتا ہے۔ تو اس کا تعلق اس دنیا سے کٹ جاتا ہے۔ اور قیامت کے روز دوبارہ جی اٹھنے تک برزخی زندگی کھلاتی ہے۔ اس عرصہ میں انسان کو قوت کا احساس نہیں ہوتا۔ کہ وہ کتنا عرصہ برزخ میں رہا ہے جیسا کہ سورۃ یٰسین میں آتا ہے کہ جب لوگ قبروں سے اٹھیں گے، تو کہیں گے "مَنْ لُبَحَثْنَا مِنْ مَقْتٍ قَدْ نَا هَذَا" ہمیں ہماری خواب گاہوں سے کس نے اٹھایا۔ ان کو ایسا ہی محسوس ہوگا جیسے کوئی شخص رات کو یا دن کے وقت کچھ دیر کے لیے سوتا ہے۔ اور پھر اٹھ بیٹھتا ہے۔ یہی چیز حضرت عزیر علیہ السلام کے ساتھ پیش آئی۔ انہیں احساس ہی نہیں ہوا کہ وہ سو سال تک سوئے ہوئے ہیں۔ وہ یہی سمجھ رہے تھے۔ کہ دن کا کچھ حصہ سوئے ہیں عالم برزخ میں وقت کا احساس تو نہیں ہوتا۔ مگر راحت اور تکلیف کا احساس ضرور ہوتا ہے۔ جیسا کہ حدیث میں آتا ہے۔ کہ جب کسی شخص کو دفن کر دیا جاتا ہے تو پھر منکر نکیر اس سے سوال و جواب کرتے ہیں اس ابتدائی امتحان میں اگر وہ شخص کامیاب ہوا ہے۔ تو اس کو میٹھی نیند سلا دیا جاتا ہے اور اس کے لیے راحت کا سامان مہیا کر دیا جاتا ہے۔ برخلاف اس کے اگر وہ ناکام ہو گیا ہے۔ سوالات کا جواب نہیں دے سکا۔ تو پھر قیامت تک کے لیے اسے تکلیف میں مبتلا کر دیا جاتا ہے۔ اس طرح اسے تکلیف کا احساس تو ہوتا ہے مگر وقت کا احساس نہیں ہوتا۔

مرنے کے بعد ایک عام انسان کے جسم کی حفاظت کی کوئی گارنٹی نہیں۔ قانون قدرت کے مطابق مردہ جسم گل سڑ کر ختم ہو جاتے ہیں۔ قبروں کی کھدائی کے دوران بعض اوقات چھوٹی موٹی ہڈیاں ملتی ہیں۔ اور بعض اوقات وہ بھی نہیں ملتیں۔ البتہ اس امر پر اتفاق ہے کہ انبیاء علیہم السلام کے اجسام قبر میں بھی محفوظ رہتے ہیں **إِنَّ اللَّهَ حَرَّمَ عَلَى الْفَرِصِ أَنْ تَأْكُلَ أَجْسَادَ الْأَنْبِيَاءِ** یعنی اللہ تعالیٰ نے زمین پر حرام کر دیا۔ کہ وہ بیہوشوں کے جسموں کو کھا سکے۔ ہاں شہداء کے متعلق مشاہدہ سے معلوم ہوا ہے کہ بعض شہداء کے جسم بھی قبروں میں محفوظ رہتے ہیں۔ بخاری شریف میں روایت موجود ہے کہ بعض شہداء کو شہید ہونے پینتالیس سال گزر چکے تھے۔ بارش اور سیلاب کی وجہ سے ان کی قبروں میں شگاف پڑ گئے، تو لوگوں نے دیکھا کہ ان کے جسم میلے ہی محفوظ تھے جیسا وہ دفن کیے گئے۔ ابھی پچھلے دنوں اس بات کا احوال ہوا ہے۔ کہ جو لوگ چھ سو سال پہلے تاتاریوں کے علاقے میں کفار سے لڑ کر شہید ہوئے تھے، ان کے جسم بالکل محفوظ برآمد ہوئے تھے۔

یقین کے
تین مدارج

فَلَمَّا تَبَيَّنَ لَكَ جب یہ تمام چیزیں حضرت عزیر علیہ السلام پر واضح ہو گئیں ان کے سوال کا جواب مل گیا۔ انہوں نے حیرانگی کے انداز میں سوال کیا تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ اس اجڑی ہوئی بستی کو کیسے دوبارہ زندہ کرے گا۔ تو اللہ تعالیٰ نے انہیں ان کی آنکھوں سے دکھا دیا۔ کہ اُس نے نہ صرف پورے شہر کو آباد کر دیا بلکہ خود ان کو اور ان کے گھر سے کو سو سال کے بعد پھر زندہ کر دیا۔ تو عزیر علیہ السلام نے کہا **قَالَ أَعْلَمُ أَنَّ اللَّهَ عَلَى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ** میں جان گیا ہوں اور مجھے علم ہو گیا ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ جو چاہے کر سکتا ہے۔ آباد کو برباد اور اجڑے دیار کو پھر سے آباد کر سکتا ہے۔ زندہ کو مردہ اور مردہ کو زندہ کرنے پر قادر ہے۔

کسی چیز کو تسلیم کر لینے یا اس پر یقین کر لینے کے تین درجے ہیں۔ اگر کسی چیز کا علم کسی دوسرے ثقہ شخص کی معرفت ہو تو اسے علم الیقین کہتے ہیں۔ کیونکہ ایسی چیز کا ادراک علم کے ذریعے ہوا ہے۔ اور اگر کوئی شخص خود اپنی آنکھوں سے کوئی واقعہ

دیکھ لے۔ تو اُسے عین الیقین کہتے ہیں۔ اور یقین کا تیسرا درجہ حق الیقین ہے۔ اور یہ اس صورت میں ہوتا ہے۔ کہ جب کوئی واقعہ خود اپنے ساتھ پیش آئے۔ ظاہر ہے کہ جو چیز خود اپنے اوپر وارد ہوئی ہو۔ اور اس کی کیفیت خود اپنے اوپر طاری ہوئی ہو۔ اس سے انکار کرنے کی کوئی گنجائش نہیں رہتی اور یہ کسی چیز کو تسلیم کر لینے کا آخری درجہ یعنی حق الیقین ہے۔

حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ عین الیقین بھی ہے اور حق الیقین بھی عین الیقین اس لحاظ سے کہ حضرت عزیر علیہ السلام نے خود اپنی آنکھوں سے مردہ گدھے کو زندہ ہوتے دیکھا۔ ان کی نظروں کے سامنے گدھے کی بوسیدہ ٹہریوں سے ڈھانچہ تیار ہوا، پھر اُن پر گوشت چڑھا۔ گدھے کی شکل و صورت بنی اور پھر وہ آواز دینے لگا۔ یہ واقعہ حق الیقین کے درجے میں اس لحاظ سے ہے کہ یہ معاملہ خود عزیر علیہ السلام کے ساتھ پیش آیا۔ وہ خود سو سال تک موت کی آغوش میں رہے۔ اور پھر زندہ ہو گئے۔ جہاں تک پہلے درجے علم الیقین کا متعلق ہے۔ تو حضرت عزیر علیہ السلام کو بھی حاصل تھا۔ کیونکہ آپ اللہ کے نبی اور برگزیدہ مومن تھے اور آپ کو اللہ تعالیٰ کی وحی و وحی اور قیامت کے دن دوبارہ جی اُٹھنے پر علمی لحاظ سے بھی یقین تھا۔

اگلی آیت میں بھی اسی قسم کا واقعہ ہے۔ وہاں بھی اللہ تعالیٰ کی قدرت کا ملکہ کا اظہار اور علم الیقین سے عین الیقین اور حق الیقین تک کا مشاہدہ ہے۔

وَإِذْ قَالَ إِبْرَاهِيمُ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتَىٰ ط قَالَ أَوْ لِمَ
تُؤْمِنُ ط قَالَ بَلَىٰ وَلَٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِي ط قَالَ فَخُذْ
أَرْبَعَةً مِّنَ الطَّيْرِ فَصُرْهُنَّ إِلَيْكَ ثُمَّ أَجْعَلْ عَلَىٰ
كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً ثُمَّ ادْعُهُنَّ يَأْتِينَكَ سَعْيًا ط
وَأَعْلَمْ أَنَّ اللَّهَ عَزِيزٌ حَكِيمٌ ﴿۲۶۰﴾

۵۳۶

ترجمہ: اور اس بات کو یاد کرو جب ابراہیم علیہ السلام نے اپنے پروردگار سے
کہا کہ مجھے دکھا تو مردوں کو کس طرح زندہ کرتے ہے اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کیا تم یقین نہیں
رکھتے۔ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں میں یقین رکھتا ہوں لیکن یہ اس لیے تاکہ میرا
دل تسکین پکڑے، اللہ تعالیٰ نے فرمایا، چار پرندے پکڑ لو اور پھر انہیں اپنے پاس لائیں کہ
وہ اپنے پاس ٹکڑے ٹکڑے کر دو (پھر ہر پاڑ پر ان میں سے ایک ایک جزو رکھ دو۔
پھر ان کو بلاؤ، وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ
کمال قدرت کا مالک اور حکمت والا ہے ﴿۲۶۰﴾

توحید باری تعالیٰ، اُس کی کمال قدرت اور بعث بعد الموت کے متعلق اس
رکوع میں دو واقعات آپ کے ہیں۔ گزشتہ سے پیوستہ درس میں حضرت ابراہیم
علیہ السلام اور غرود کے مناظرے کی تفصیلات بیان ہوئی تھیں۔

تمہید

اور گزشتہ درس میں حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ آیا تھا۔ جس میں انہوں نے موت
وحیات کے منظر کو اپنی آنکھوں سے مشاہدہ اکبر کے اطمینان قلب حاصل کیا۔ آج
کے درس میں اسی قسم کا تیسرا واقعہ بیان ہو رہا ہے۔ اس میں بھی بعث بعد الموت
کا بیان ہے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے خود اللہ تعالیٰ سے سوال کیا کہ انہیں

مردوں کے زندہ ہونے کا مشاہدہ کر لیا جائے تاکہ ان کا ایمان عین یقین کے درجہ تک پہنچ جائے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کی دعا قبول فرمائی۔ اور حکم دیا کہ چار پرندے لے کر ذبح کرو۔ ان کے گوشت آپس میں ملا دو۔ پھر ان کے تھوڑے تھوڑے حصے مختلف پہاڑوں پر رکھ دو۔ اس کے بعد ہر ایک پرندے کو اس کا نام لے کر بلاؤ۔ وہ تمہارے پاس دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ اسی طرح ابراہیم علیہ السلام نے اپنی آنکھوں سے مردہ پرندوں کو زندہ ہوتے ہوئے دیکھ کر اطمینان قلب حاصل کیا۔

بعض مفسرین کہہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اللہ تعالیٰ سے اس سوال کے پس منظر میں یہ بات بیان کرتے ہیں کہ موت اور زندگی سے متعلق حضرت ابراہیم علیہ السلام کا غرور کے ساتھ مکالمہ ہو چکا تھا۔ جس میں آپ نے دعویٰ کیا تھا کہ زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کے قبضہ میں ہے۔ مگر غرور اس کا مطلب نہ سمجھ سکا۔ اور اس نے بے گناہ کو قتل کر دیا اور مجرم کو آزاد کر دیا۔ چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اس کی اس احمقانہ حرکت پر موضوع سخن بدل کر طلوع شمس کی دلیل پیش کر دی جس سے غرور عاجز آ گیا تو مفسرین کلام فرماتے ہیں۔ کہ اگرچہ ابراہیم علیہ السلام کو پورا پورا یقین تھا۔ کہ اللہ تعالیٰ مردوں کو دوبارہ زندہ کرنے پر قادر ہے۔ مگر ان کے دل میں موت و حیات کا منظر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ نہ کیجی خواہش پیدا ہوئی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے آپ کو دکھا دیا۔ کہ کس طرح پرندے زندہ ہو گئے۔

بعض دوسرے مفسرین اس پس منظر میں یہ واقعہ بیان کرتے ہیں۔ کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے دریا کے کنارے پر ایک مردہ جانور پڑا دیکھا۔ جب دریا میں مد آتی اور پانی کناروں سے باہر نکلتا تو دریائی جانور مردہ جانور کا گوشت کھاتے اور جب پانی پیچھے ہٹ جاتا۔ تو خشکی کے جانور اس مردار کا گوشت کھاتے اور اوپر سے پرندے بھی آکر گوشت کھا جاتے۔ یہ دیکھ کر حضرت ابراہیم علیہ السلام کو دل میں خیال پیدا ہوا کہ اس مردار کا گوشت خشکی، پانی اور فضا کے جانور کھا رہے ہیں۔ یہ گوشت کتنے مختلف پیڑوں میں جا رہا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس کے مختلف اجزاء کس کس جگہ سے

کیسے اکٹھے کر کے اس کو دوبارہ زندہ کر لیا۔ لہذا ان کو خواہش پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ انہیں وہ کیفیت مشاہدہ کرائے جس طرح وہ قیامت کے دن لوگوں کو دوبارہ زندہ کرے گا۔

چنانچہ ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حضور عرض کیا۔ وَإِنِّي كُنْتُ لَمِنَ الْكَافِرِينَ۔ رَبِّ ارْنِي كَيْفَ أَخْجِزُ الْمَوْتَى اے مولا کریم! مجھے دکھاؤ تو مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ اللہ تعالیٰ نے جواب دیا قَالَ أَوْ لَمْ تُؤْمِنُ کیا تمہیں یقین نہیں ہے۔ مطلب یہ کہ کیا تمہیں اس معاملے میں کوئی شک ہے۔ قَالَ بَلَىٰ ابراہیم علیہ السلام نے کہا کیوں نہیں، میں یقین رکھتا ہوں مگر سوال کرنے کا مقصد یہ ہے۔ وَاللَّٰكِن لِيُطَمِّنَنَّ قَلْبِي کہ میں اس معاملے میں اطمینان قلب چاہتا ہوں۔

انبیاء شک سے پاک ہیں

اس مقام پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا ابراہیم علیہ السلام کا اللہ تعالیٰ سے یہ سوال کسی شک کی بنا پر تھا کہ واقعی کوئی شخص مرنے کے بعد دوبارہ زندہ ہو سکتا ہے یا نہیں۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ ایسا ہرگز نہیں تھا۔ اس معاملہ میں تو کسی عام مومن کو بھی شک نہیں ہو سکتا۔ ابراہیم علیہ السلام تو اللہ تعالیٰ کے جلیل القدر پیغمبر تھے انہیں یہ شک کیسے ہو سکتا تھا۔ جب اللہ تعالیٰ نے فرمایا أَوْ لَمْ تُؤْمِنُ تو یقین نہیں رکھتا کہ مرے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ تو ابراہیم علیہ السلام کا جواب تھا بلی کیوں نہیں زندہ ہو سکتے؟ اے اللہ کریم! مجھے تو یقین کامل ہے۔ مگر میں محض تسکین قلب کے لیے اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرنا چاہتا ہوں۔ لہذا وہاں پر شک کا کوئی احتمال نہیں تھا۔ صحیحین کی روایت میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا۔ مَنْ أَحَقُّ بِالشَّكِّ مِنْ أِبْرَاهِيمَ یعنی اگر ابراہیم علیہ السلام کو کسی قسم کا شک یا تردد ہوتا تو ہم ان کی نسبت شک کرنے کے زیادہ حقدار ہیں۔ مگر ایسا نہیں ہے۔ نہ حضرت ابراہیم علیہ السلام کو کبھی شک ہوا اور نہ میں نے کبھی اللہ تعالیٰ کی قدرت میں شک کیا ہے۔ انبیاء ہمیشہ شک سے پاک ہوتے ہیں۔ اطمینان قلب کے لیے کسی چیز کا مطالبہ کرنا محال یقین کے منافی نہیں ہے۔ کیونکہ تسکین قلب ایمان سے زائد چیز ہے۔ سورۃ فتح میں حدیث کے واقعہ سے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جب صحابہ کرام درخت کے نیچے بیٹھ کر حضور علیہ الصلوٰۃ

والسلام کے دست مبارک پر بیعتِ رضوان کر رہے تھے۔ تو اللہ تعالیٰ — اُن کے دلوں کی بات کو جانتا تھا فَانْزَلَ السَّكِينَةَ عَلَيْهِمْ اور اُن پر تسکین نازل فرمائی۔ نبی کریم اور تمام صحابہ کرام کو تسکینِ قلب حاصل ہو گئی۔ بعض دوسرے مواقع پر بھی اس قسم کے اشارات ملتے ہیں۔ تو بہر حال نبی کریم علیہ الصلوٰۃ والسلام نے بھی یہی بات سمجھائی۔ کہ مردوں کو زندہ کرنے یا اللہ تعالیٰ کی قدرت کے کسی بھی معاملے میں کسی نبی کو شک نہیں ہو سکتا۔ جب میں کسی معاملہ میں شک نہیں کرتا، تو ابراہیم علیہ السلام کیسے شک کر سکتے تھے۔

حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا مقولہ ہے لَوْ كُشِفَ الْغُطَاءُ مَا زِدْتُ يُقِينًا یعنی اگر غیب کا پردہ بھی کھول دیا جائے۔ تو میرے یقین میں اضافہ نہیں ہو گا۔ اس قول سے بعض لوگوں نے یہ اخذ کیا ہے۔ کہ حضرت علیؑ کا علم یقین اتنا پختہ ہے۔ کہ عین یقین سے ان کے ایمان میں کوئی اضافہ نہیں ہو گا۔ برخلاف اس کے حضرت ابراہیم علیہ السلام اطمینانِ قلب کے لیے خود عین یقین کا مطالبہ کر رہے ہیں لہذا بقول ان کے اس سے حضرت علیؑ کی حضرت ابراہیم علیہ السلام پر فضیلت ثابت ہوتی ہے۔ بجائی! یہ بات نہیں ہے۔ حضرت علیؑ تو اولیاء اللہ میں سے ہیں۔ جب کہ حضرت ابراہیم علیہ السلام خلیل اللہ ہیں۔ ان کے مراتب میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ مفسر قرآن مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ ایک ولی کا عین یقین بھی نبی کے علم یقین تک نہیں پہنچ سکتا، نبی کا اصل یقین ہی اتنا بلند ہے کہ ولی کی دہاں تک رسائی نہیں۔ چہ جائیکہ نبی کے طاعتِ قلب والے یقین تک پہنچ جائے وہ تو اور بھی بلند ہوتا ہے۔ لہذا ولی کی نبی پر فضیلت تو کجا، وہ تو انبیاء کی گرد تک کو بھی نہیں پہنچ سکتے، حضرت علیؑ کا مطلب یہ ہے۔ کہ ایمان کی حد تک ان کا یقین اتنا پختہ ہے۔ کہ اس میں مزید اضافے کی گنجائش نہیں اگرچہ درمیان سے غیب کا پردہ بھی اٹھ جائے اپنے اطمینانِ قلب کی بات نہیں کی۔ یقین اور طاعتِ قلب دو علیحدہ چیزیں ہیں۔ اسی لیے حضرت ابراہیم علیہ السلام نے بھی فرمایا تھا۔ کہ مولا کریم! تیری قدرت پر مجھے پورا پورا

یقین ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں۔ مگر میں دلی اطمینان چاہتا ہوں۔ جو کہ اس سے اگلا درجہ ہے۔ مجھے میری آنکھوں سے مشاہدہ کرائے کہ مرنے کے کس طرح زندہ ہوتے ہیں۔

قَالَ اللَّهُ تَعَالَى نَفْسٌ مَّا قَفْخَذَ أَرْجَعَهُ مِّنَ الطَّيِّبِ چار پرندے پکڑ لو۔
فَقَصَّ هُنَّ الْأَيْدِ الْأَكْمَانُوسِ کو، اپنی طرف مائل کر لو۔ بعض اُسے ص کی زیر کے ساتھ
فَقَصَّ هُنَّ پڑھتے ہیں۔ صَارَ كَيْصِيْلُو كَامَعْنِی الْمَحْرُطَے ٹکڑے کرنا بھی ہوتا ہے۔ اس لحاظ
سے معنی یہ ہوگا۔ کہ چار پرندے لو اور انہیں ٹکڑے ٹکڑے کر دو۔ بہر حال یہ لفظ دونوں
معنوں میں آتا ہے۔ اپنے ساتھ مانوس کر لو۔ یا ذبح کر کے بوٹی بوٹی کر دو۔ بعض مفسرین
کہتے ہیں کہ پرندوں کو محض مانوس کیا گیا تھا، ذبح نہیں کیا گیا تھا۔ مگر یہ تفسیر مردود ہے
اصل بات یہ ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے اُن پرندوں کو ذبح کیا۔ اُن کے پر اُتار
دیے اور ان کا گوشت ٹکڑے ٹکڑے کر کے آپس میں بلا دیا۔ غلط ملط کر دیا۔ سبھی
گوشت کا قیمہ کیا جاتا ہے۔

اب رہا یہ سوال کہ وہ چار جانور کون کون سے تھے۔ قرآن پاک میں تو اسکی
تفصیل نہیں ہے۔ البتہ تفسیروں میں آتا ہے۔ کہ یہ چار جانور، مرغ، گوا، کبوتر
اور مور تھے۔ اور ان پرندوں کا انتخاب اس وجہ سے تھا۔ کہ ان میں کوئی نہ کوئی انسانی
صفت پائی جاتی ہے۔ مثلاً مرغ میں شہوت کا مادہ زیادہ پایا جاتا ہے اور یہی چیز انسان
میں بدرجہ اتم موجود ہے۔ اسی وجہ سے بڑے ہنگامے، جگیں اور پھرتیا ہی ہوتی ہے
کوئے میں حرص کا مادہ بہت زیادہ ہوتا ہے۔ اور بعض انسان بھی حرص و ہوا میں بہت
آگے ہوتے ہیں۔ کبوتر میں دنیا کی محبت بیکھ ہوتی ہے اور بعض دنیا دار انسان بھی اسی
مرض میں مبتلا ہوتے تھے۔ چوتھا جانور مور ہے۔ اس میں تکبر کی فراوانی ہوتی ہے
جب خوش ہوتا ہے۔ تو ناچنے لگتا ہے۔ اور اپنے خوبصورت پر پھیلا دیتا ہے۔
اُسے اپنے حسن و جمال پر بڑا فخر ہوتا ہے۔ مگر جب اپنے پاؤں کی طرف دیکھتا ہے
تو شرمسار ہو جاتا ہے۔ اور پر گر دیتا ہے۔ یہی حال حضرت انسان کا بھی ہے ذرا آسودگی
ملتی ہے۔ تو غرور و تکبر کرتا ہے۔ بات بات پر اکثر نامشروع کر دیتا ہے۔ اور جب اللہ

کی پختہ آتی ہے۔ تو ہتھیار ڈال دیتا ہے۔ بعض لوگوں نے کوسے کی جگہ گدھ کا ذکر کیا ہے وہ بھی کھانے کا بڑا لالچی ہوتا ہے۔ جب کہ اکثر انسان بھی کھانے پینے کو ہی زندگی سمجھتے ہیں۔ انسان میں پائے جانے والے ان چار اوصاف یعنی حرص، شہوت، محبت دنیا اور تکبر کے علاوہ ہر انسان کے بعض اپنے اپنے خواص بھی ہیں۔ جن میں خون، سودا، بلغم اور صفرا شامل ہیں۔ بہر حال ان چار اوصاف والے پرندوں کے انتخاب سے یہ بات بھی سمجھ میں آتی ہے۔ کہ ان کو ذبح کرنے کا مطلب یہ ہے۔ کہ انسان بھی اگر ان اوصاف قبیحہ کو کچل ڈالے، تو کمال تک پہنچ جائے گا۔ جب تک یہ گندے اوصاف انسان میں موجود رہیں۔ وہ کامیابی کی منزل سے ہم کنار نہیں ہو سکتا۔

پرندوں کی
موت و حیات

بہر حال قرآن پاک یا حضور علیہ السلام نے ان پرندوں کی تفصیل نہیں بتائی۔ اس قسم کی باتیں تفسیری روایات میں آتی ہیں۔ اس قسم کی حکمت کی باتیں مفسرین کرام سمجھا جیتے ہیں۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے اللہ تعالیٰ کے حکم کے مطابق چاروں پرندوں کو ذبح کیا۔ اُن کے پر علیحدہ کر دیے۔ پھر اُن کے گوشت کا قیمہ کر کے آپس میں ملا دیا۔ اللہ تعالیٰ نے حکم دیا ثُمَّ اجْعَلْ عَلَىٰ كُلِّ جَبَلٍ مِّنْهُنَّ جُزْءً پھر ہر پہاڑ پر اُس ملے جلے گوشت کا ایک جزو رکھ دو۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام نے تعمیل حکم کیا۔ اُس قیمہ کے چار حصے کیے اور چار مختلف پہاڑوں پر رکھ دیے۔ پھر ارشاد ہوا۔ ثُمَّ ادْعُهُنَّ پھر انہیں بلاؤ تفسیری روایات میں آتا ہے۔ کہ ابراہیم علیہ السلام نے باری باری ہر ایک پرندے کا نام لے کر بلایا۔ اور پھر اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ۔ يَا قَيْنِكَ سَعِيًّا تمہارے پاس دوپڑے ہوئے آئیں گے۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔ جب آپ نے مرغ کو آواز دی تو فضا میں اس کی ہڈیاں نمودار ہوئیں۔ پھر اس کے گوشت کا جو حصہ جس جس پہاڑ پر تھا وہاں سے فوراً آیا اور ہڈیوں پر چڑھ گیا۔ پھر مرغ کے پر اکڑ لگ گئے اور مکمل مرغ بن کر زندہ ہو گیا۔ اس طرح دوسرے پرندے بھی زندہ سلامت ہو گئے۔ جس طرح عزیز علیہ السلام کے گدھے کی ہڈیاں اکٹھی ہوئیں ان پر گوشت چڑھا۔ اور پھر وہ مکمل گدھا بن کر آؤ نہ فیئے لگا۔ اسی طرح حضرت ابراہیم علیہ السلام

کی نظروں کے سامنے ذبح شدہ پرندے دوبارہ زندہ ہو گئے۔ اور اس طرح اللہ تعالیٰ نے دکھا دیا کہ وہ مردوں کو کیسے زندہ کرے گا۔ یہ جواب تھا حضرت ابراہیم علیہ السلام کے اس سوال کا ”رَبِّ اَرِنِي كَيْفَ تُحْيِي الْمَوْتٰی“ کہ مولا کریم! مجھے مشاہدہ کر دے کہ تو کس طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔

کمال قدرت
کا مشاہدہ

زندگی اور موت اللہ تعالیٰ کی کمال قدرت کا ایک نمونہ ہے اس قسم کے پیشمار مشاہدات انسان اپنی روزمرہ زندگی میں کرتا ہے۔ انسان کی آنکھوں کے سامنے زمین بالکل خشک ہو جاتی ہے۔ کوئی سبزہ نہیں ہوتا۔ پھر بارش ہوتی ہے۔ تو پھر سرسبز ہو جاتی ہے۔ گویا اللہ تعالیٰ ”يُحْيِي الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا“ مردہ زمین کو دوبارہ زندہ کر دیتا ہے۔ قرآن ”كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰی“ اسی طرح اللہ تعالیٰ مردوں کو زندہ کر دے گا یہ کوئی عجوبہ نہیں جس کا انکار کر دیا جائے۔ اس قسم کی چیزیں تو ہم ہر روز اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں۔ ہر موسم کی اپنی بہار ہوتی ہے۔ کبھی درخت اور نباتات اپنے جو بن پر ہوتے ہیں۔ پھر خزاں کا موسم آتا ہے۔ تو درختوں کے پتے گر جاتے ہیں۔ اور درخت ٹٹنڈٹ ہو جاتے ہیں۔ پھر جب بہار کا موسم آتا ہے تو نئے تنگوں نے پھوٹتے ہیں۔ اور دیکھتے ہی دیکھتے درخت ہرے بھرے ہو جاتے ہیں۔ ان میں پھل لگتے ہیں۔ پکتے ہیں اور پھر لوگ انہیں ہمارے لیتے ہیں۔ یہی حال سبزیوں اور فصلوں کا ہے جب موسم آتا ہے۔ تو کسان زمین کو پانی دیتا ہے۔ یا آسمان سے بارش برستی ہے۔ پھر زمین میں ہل چلایا جاتا ہے بیج بویا جاتا ہے۔ پھر فصل اور سبزیاں اُگتی ہیں۔ اور جب پک کر تیار ہو جاتی ہیں۔ تو انہیں کاٹ لیا جاتا ہے۔ اور زمین پھر ایک دفعہ ویران ہو جاتی ہے۔

بنی اسرائیل کے ایک مردہ کے زندہ ہونے کا واقعہ گزر چکا ہے اللہ تعالیٰ نے حضرت موسیٰ علیہ السلام کے ذریعے بنی اسرائیل کو حکم دیا کہ گائے ذبح کرو۔ اور اس کے گوشت کا ایک ٹکڑا اس مردہ کو لگاؤ تو وہ زندہ ہو جائے گا۔ وہاں پر بھی یہی الفاظ آئے تھے ”كَذٰلِكَ يُحْيِي اللّٰهُ الْمَوْتٰی“ اسی طرح مردوں کو زندہ کرتا ہے۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے حضرت ابراہیم علیہ السلام کو ان کی

آنکھوں کے سامنے ذبح شدہ پرندوں کو زندہ کیا۔ مطلب یہی تھا کہ اللہ تعالیٰ کمال قدرت کا مالک ہے جب اس کا حکم ہوگا۔ قیامت برپا ہوگی۔ تو تمام مرنے دوبارہ زندہ ہو جائیں گے۔ فرمایا وَأَعْلَمُ اور جان لو، خوب اچھی طرح سمجھ لو، أَنَّ اللَّهَ عَزَّ وَجَلَّ حَكِيمٌ کہ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر غالب ہے۔ جس طرح چاہے کرے، اس کے کام میں کوئی رکاوٹ نہیں ڈال سکتا۔ وہ حکیم ہے۔ اس کا کوئی کام حکمت سے خالی نہیں۔ وہ کمال درجہ کی حکمت کا مالک ہے عزیز کا معنی اعزت دینے والا بھی ہوتا ہے یہ خدا کی صفت ہے۔ وہ عزت کا مالک بھی ہے۔

معجزہ اکرامیت

اس رکوع میں اللہ تعالیٰ کی وحدانیت اور کمال قدرت کے تین واقعات آچکے ہیں۔ خصوصاً بعث بعد الموت کے متعلق حضرت عزیر علیہ السلام کا واقعہ اور حضرت ابراہیم علیہ السلام کا یہ پرندوں والا واقعہ بالکل واضح ہے۔ انبیاء علیہم السلام کے ہاتھ پر اللہ تعالیٰ اس قسم کا جو عجوبہ ظاہر کرتا ہے، اسے معجزہ کہتے ہیں۔ قرآن پاک اور احادیث میں بے شمار معجزات کا تذکرہ موجود ہے۔ اگر اس قسم کے واقعات کسی امتی کے ہاتھ پر ظاہر ہوں تو وہ کرامت کہلاتے ہیں۔ قادری سلسلہ کے بزرگوں میں سے یہاں پنجاب میں ایک ننگ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کی اولاد میں سے تھے ان کے لیے ثابت ہے کہ انہوں نے اللہ کے حکم سے مردہ کو زندہ کیا تھا۔ لکھنؤ میں ایک مردہ کو دوبارہ زندہ کیا گیا۔ لوگوں نے یہ کرامت بھی دیکھی۔ شاہ ولی اللہ دہلویؒ کے چچا کے سامنے بھی ایسا ہی واقعہ پیش آیا تھا۔ انہوں نے بھی مردہ کو زندہ کیا تھا الغرض اس قسم کے واقعات کرامت کہلاتے ہیں۔

یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کر لینی چاہیے۔ کہ معجزہ یا کرامت اللہ تعالیٰ کا فعل ہوتا ہے۔ ایسا کام انسان کے اختیار میں نہیں ہے۔ وَمَا كَانَ لِرَسُولٍ أَنْ يَأْتِيَ بِآيَةٍ إِلَّا بِإِذْنِ اللَّهِ کسی نبی کے اختیار میں بھی نہیں۔ مگر یہ کہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ایسا کر سکتا ہے لہذا معجزات اور کرامات کے جو سچے واقعات ہیں۔ انہیں تسلیم کرنا چاہیے۔ مگر بلا تحقیق مہربے سروپا کو کرامت تسلیم کرنا درست نہیں

ہے۔ شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ پر بہت سی کرامات ظاہر ہوئیں جن کا ثبوت ملتا ہے مگر بارہ سال تک کشتی ڈبلونے والے واقعہ کی کوئی اصل نہیں ہے۔ لہذا یہ قابل تسلیم ہرگز نہیں۔

معجزہ اور کرامت کے علاوہ ایک اور چیز ہے، جسے استدراج کہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ چاہے۔ تو کسی کافر کے ہاتھ بھی کوئی عجوبہ ظاہر کر دے۔ مگر یہ عزت والی بات نہیں ہوتی بلکہ یہ امتحان ہوتا ہے، جس طرح حدیث شریف میں موجود ہے۔ کہ دجال مُردوں کو زندہ کرے گا۔ یہ کرامت نہیں بلکہ استدراج ہوگا۔

توحید باری تعالیٰ اور معاد کے متعلق تین واقعات بیان کرنے کے بعد اُنے سخن پھر انفاق فی سبیل اللہ کی طرف جاتا ہے اگلی آیات کا تعلق پھر اُسی پہلی آیت اَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقْنَاكُمْ کے ساتھ ہے۔ لہذا اگلے رکوع کا موضوع پھر وہیں سے چلیگا، جہاں کچھ بیان ختم ہوا تھا۔ درمیان میں اس کی تائید کے لیے تین واقعات کا ذکر آگیا ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ

رسول مجید پانزدہ (۱۱۵)

الْبَقَّة ۲

آیت ۳۱۲-۳۱۳

مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ
حَبَّةٍ أَنْبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلٍ فِي كُلِّ سُنبُلَةٍ مِائَةٌ
حَبَّةٌ وَاللَّهُ يُضَعِفُ لِمَنْ يَشَاءُ وَاللَّهُ وَاسِعٌ
عَلِيمٌ ۝ (۳۱۲) الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ
لَا يُتَّبِعُونَ مَا أَنْفَقُوا مِمَّا وَلَا آذَى لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ
رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ۝ (۳۱۳) قَوْلُ
مَعْرُوفٍ وَمَغْفِرَةٌ خَيْرٌ مِنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا آذَى ۝
وَاللَّهُ عَزَّ وَجَلَّ حَلِيمٌ ۝ (۳۱۴)

ترجمہ: اُن لوگوں کی مثال جو اللہ کے راستے میں اپنے مال کو خرچ کرتے ہیں۔
اُس دانے جیسی ہے جس نے سات بالوں کو اُگایا۔ ہر بال میں سو دانے ہیں اور اللہ تعالیٰ
دگنا کر دے (بڑھا دے) جس کے لیے چاہے۔ اور اللہ تعالیٰ وسعت والا ہے اور
سب کچھ جاننے والا ہے (۳۱۲) جو لوگ اپنے مال کو اللہ کے راستے میں خرچ کرتے
ہیں۔ پھر جو کچھ انہوں نے خرچ کیا اس کے پیچھے احسان چلانا اور تکلیف دینا نہیں لگاتے
ایسے لوگوں کے لیے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ اور اُن پر کوئی خوف نہیں
ہوگا اور وہ غمگین ہوں گے (۳۱۳) دستبرد کے مطابق بات اور درگزر کرنا ہر صدمہ
سے بہتر ہے۔ جس کے پیچھے تکلیف (ستانا) ہو۔ اور اللہ تعالیٰ بے نیاز اور

بردار ہے (۳۱۴)

آیت انحرسی میں اللہ تعالیٰ کی توحید کا بیان تھا، جو دین کا اصل الاصول اور بنیاد ہے
اس آیت میں اللہ کی صفات کا ذکر بھی آچکا ہے۔ گذشتہ رکوع کی تین آیات میں تین

ربانیات
الغائی فی سبیل اللہ

واقعات بیان ہوئے ہیں، جن کو جان لینے سے یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ ہدایت اور گمراہی اللہ تعالیٰ کے اختیار میں ہے۔ وہ جسے چاہے ہدایت سے نوازتا ہے اور جسے چاہے اس سے محروم رکھتا ہے، زندگی اور موت بھی اللہ جل جلالہ کے دست قدرت میں ہے۔ کسی اور کے اختیار میں نہیں۔ اس سے پہلے بنی اسرائیل کے جہاد کا واقعہ بھی بیان ہوا کہ کس طرح اُن لوگوں نے جہاد سے گمراہ کیا، تو اللہ تعالیٰ نے انہیں سزا میں مبتلا کر دیا۔ اللہ تعالیٰ نے انہیں واضح ہدایت دیں کہ جان و مال کی قربانی سے دریغ نہ کرو۔ اہل ایمان سے یہ بھی فرمایا "أَفَقَوْمٌ ذَقْنُكَ هُمْ" ہم نے جو تم کو رزق دیا ہے۔ اس میں سے خرچ کرو۔ درمیان میں مذکورہ بالا بیانات کے بعد روئے سخن پھر اتفاق فی سبیل اللہ کی طرف ہے۔ ان آیات میں اللہ کے راستے میں خرچ کر نیکی فضیلت کا بیان ہے۔ اور ان شرائط کا ذکر ہے۔ جن کی بنا پر خرچ کیا ہوا مال اللہ کی بارگاہ میں قبول ہوتا ہے۔ اس ضمن میں اللہ تعالیٰ نے سات باتیں بیان کی ہیں۔ ان میں سے دو باتوں کا ذکر آج کے درس میں ہے اور باقی پانچ اگلی آیات میں آئیں گی۔

اجر و ثواب
کے درجے

پہلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔ اور اس کے بدلے میں ملنے والے اجر کا نقشہ کھینچا ہے۔ نیکی کے ہر کام میں خرچ کرنا اتفاق فی سبیل اللہ کہلاتا ہے۔ تاہم جہاد کی خاطر خرچ کرنا اس کی خصوصی مدہ ہے۔ کیونکہ جہاد فی سبیل اللہ کے ذریعے دین کو غلبہ حاصل ہوتا ہے۔ جس سے دین کی اشاعت میں مدد ملتی ہے۔ دینی تعلیم کا فروغ بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ اس کے علاوہ عز و بار و سکین کی اعانت، یوگان اور یتامی کی حاجت روائی اتفاق فی سبیل اللہ کا اہم جزو ہے۔ اس قسم کے تمام اخراجات کی فضیلت اور اجر و ثواب کہ اللہ تعالیٰ نے ایک مثال کے ذریعے سمجھایا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ مَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللَّهِ كَمَثَلِ حَبَّةٍ فِي رَاحٍ اللہ کی راہ میں خرچ کرنے والوں کے مال کی مثال اُس دانے جیسی ہے الَّتِي تَنْبُتُ سَبْعَ سَنَاطِلَ جو سات، نَحْمَشَةٍ اگاتا ہے۔ فِي كُلِّ سَنَةٍ مِائَةُ حَبَّةٍ اور ہر خوشے میں سو دانے پیدا

ہوتے ہیں۔ جس طرح زرخیز زمین میں ایک دانہ بویا جائے اور اس کی مناسب دیکھ بھال اور آبیاری کی جائے تو اس سے سات سوٹانے پیدا ہوتے ہیں۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کی راہ میں خرچ ہونے والے ایک پیسہ کا اجر و ثواب سات سوگنا حاصل ہوتا ہے۔ قرآن و سنت میں ہر نیکی کے اجر و ثواب کے کسی معیار ہیں جن کا ذکر آتا ہے سورۃ الغام میں آتا ہے۔ **مَنْ جَاءَ بِالْحَسَنَةِ فَلَهُ عَشْرُ امثالِهَا**، ایک نیکی کا بدلہ دس گنا ہے جب کہ حدیث میں سات سوگنا تک بیان کیا گیا ہے۔ اس ضمن میں مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ نیکی کے کام میں جس قدر اخلاص پایا جاتا ہے۔ اُس کے مطابق اس نیکی کا اجر و ثواب حاصل ہوتا ہے۔ تاہم سورۃ الغام کی آیت پاک کے مطابق ہر نیکی کا کم از کم اجر دس گنا ہے۔ اس کے بعد جس قدر اخلاص بڑھتا جائیگا۔ ثواب میں بھی اضافہ ہوتا جاتا ہے حتیٰ کہ اعلیٰ درجہ کے اخلاص پر سات سوگنا تک اجر حاصل ہوگا۔ تاہم مفسرین کرام بیان فرماتے ہیں کہ جہاد فی سبیل اللہ جس کے ساتھ دین کی اقامت اور اشاعت والبتہ ہے، اس سلسلہ میں کی گئی ادنیٰ سے ادنیٰ درجہ کی نیکی کا ثواب سات سوگنا سے شروع ہوتا ہے اور پھر جس قدر خلوص بڑھتا جاتا ہے اسی قدر اجر و ثواب بھی بڑھتا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے کہ کسی جہاد کے موقع پر ایک شخص نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں ایک اونٹنی پیش کی جس کو ہمارے ہوئی تھی اور اس پر کجاوہ کا ہوتا تھا آپ بہت خوش ہوئے اور فرمایا، تم نے بہت اچھا کیا۔ اللہ تعالیٰ تمہیں قیامت والے دن ایسی کئے ہوئے کجاوے والی سات سو اونٹنیں عنایت کرے گا۔ گویا جہاد میں خرچ کیے جانے والے مال کا کم از کم اجر سات سوگنا سے شروع ہوتا ہے۔ کیونکہ دین کی عزت اور بقا جہاد کی وجہ سے ہے۔ اور اعلیٰ درجے کی کوئی انتہا نہیں ہے اللہ تعالیٰ جتنا چاہے۔ بڑھا چڑھا کر مے مے وہ مالک ہے۔ اسی لیے فرمایا واللہ ۛ یضوۃ لمن یشاء اللہ تعالیٰ بڑھاتا ہے جسے چاہے واللہ ۛ واسع ۛ علیہم اللہ تعالیٰ بڑی رحمت والا ہے اور سب کچھ جاننے والا۔ گویا اللہ تعالیٰ نے قدر کی فضیلت کے متعلق دو باتیں بیان فرمادیں پہلی یہ

کہ عام نیکی کا بدلہ دس گناہ سے لے کر سات سو گنا تک ہے۔ اور جہاد فی سبیل اللہ میں حصہ لینے کا کم از کم اجر سات سو گناہ اور زیادہ سے زیادہ کی کوئی حد نہیں۔

معیار قبولیت

اگلی آیت میں اللہ تعالیٰ نے اپنی راہ میں خرچ کیے جانے والے مال کی قبولیت کا ایک معیار مقرر کیا ہے۔ اور وہ ہے کہ صدقہ محض رضا النہی کے لیے ہو۔ اور وصول کنندہ

کو نہ تو احسان جتلیا جائے۔ اور نہ اُسے صدقہ کے بدلے اذیت دی جائے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ الَّذِينَ يَنْفِقُونَ اَمْوَالَهُمْ فِي سَبِيلِ اللّٰهِ وہ لوگ جو اللہ کی راہ

میں اپنے مال خرچ کرتے ہیں۔ ثُمَّ لَا يُنْبِعُونَ مِمَّا اَنْفَقُوا مَتًا وَلَا اَذًى پھر اُس خرچ کرنے کے پیچھے احسان اور اذیت نہیں لگاتے یعنی وہ کوئی چیز دے کر

مستحق کو نہ احسان جتلاتے ہیں۔ کہ میں نے تیری فلاں وقت حاجت پوری کی اور نہ اسکو اذیت پہنچاتے ہیں یعنی ستاتے نہیں بعض اوقات ایسا بھی ہوتا ہے کہ غریب آدمی کو

صدقہ دیا۔ اور پھر اُسے بار بار یاد دلاتے ہیں۔ یاد دوسروں کے سامنے بیان کرتے پھرتے ہیں۔ کہ میں نے فلاں آدمی کو زکوٰۃ وغیرہ دی ہے۔ یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ جس

محتاج کو کوئی چیز عطا کی ہے۔ اس کے بدلے میں اس سے بیگاری جائے۔ جو ظاہر ہے کہ اُسے تنگ کرنے اور ستانے کے مترادف ہو گا۔ کسی کو دھکا دیدیا جائے۔

پٹائی کر دی جائے، اگلی نکالی جائے یا طعن و ملامت کی جائے۔ یہ سب ایذا رسانی کی باتیں ہیں۔ فرمایا وہ لوگ جو خرچ کرنے کے بعد ایسی بری حرکات سے باز رہتے

ہیں۔ لَهُمْ لَاجِرٌهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ایسے لوگوں کے لیے ان کے رب کے ہاں اجر ہے۔ جو انہیں کسی گنا بڑھا چڑھا کر دیا جائے گا۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ

وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ایسے لوگوں کو نہ اس دنیا میں کوئی خوف ہو گا۔ اور نہ وہ اگلے جہاں میں غمگین ہوں گے۔ بلکہ ان کی دنیا و آخرت ہر دو مقامات سنور جائیں گے اور

وہ کامیاب و کامران ہونگے۔

برخلاف اس کے اگر کسی شخص نے کسی محتاج کی مالی اعانت بھی کی۔ اور اس کو احسان جتلیا یا اذیت پہنچائی۔ تو اس کا صدقہ باطل ہو گا۔ اور اس کے بدلے میں

کوئی اجر و ثواب بھی حاصل نہیں ہوگا۔ بلکہ وہ الٹا معصیت میں مبتلا ہو کر عذاب کا مستحق ہو جائیگا۔ حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم کا ارشاد گرامی ہے کہ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ احسان جتلانے والے شخص کی طرف نظر شفقت سے دیکھنا بھی پسند نہیں کریگا۔ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کو پاک بھی نہیں فرمائے گا۔ بلکہ ان کے لیے عذاب الیم تیار ہوگا۔ اس حدیث میں آپ نے یہ بھی فرمایا کہ جو شخص اپنا تبعدہ یا شکر یا تحنوں سے نیچے ٹکاتا ہے۔ اس کی طرف نظر شفقت سے نہیں دیکھیگا۔ اور وہ جہنم میں جائیگا۔ حدیث کے الفاظ میں اسفل من العجین نفی النار بھی آیا ہے۔ تحنوں سے نیچے پاجامہ لٹکانا مکروہ تحریمی اور قابل مؤاخذہ ہے۔ بہر حال صدقہ کے متعلق دو چیزوں کی سخت وعید فرمائی۔ کہ صدقہ دینے والا نہ تو احسان جتلائے اور نہ تکلیف دے۔ اگر ایسا کرے گا۔ تو نہ صرف اس کا صدقہ باطل ہو جائے گا۔ بلکہ خود معطلی گنہگار ہوگا اور عذاب کا مستحق ٹھہریگا۔

بعض اوقات سائل لجاجت کرتا ہے۔ منت سماجت کرتا ہے۔ اور اپنے سوال پر اصرار کرتا ہے۔ اس صورت میں فرمایا قَوْلٌ مَّعْرُوفٌ دستور کے مطابق نرم جواب دینا وَمَغْفِرَةٌ اور درگزر کرنا، اس کے اصرار پر بدزبانی سے پرہیز کرنا خَيْرٌ مِّنْ صَدَقَةٍ يَتْبَعُهَا اَذًى اس صدقہ سے بہتر ہے۔ جس کے بعد اذیت پہنچائی جائے مطلب یہ کہ سائل کے بغض ہونے پر اُسے نرمی کے ساتھ جواب دے دیا جائے تو بہتر ہے۔ بجائے اس کے کہ اُسے کچھ دے بھی دیا جائے۔ اور ساتھ طعن تشنیع اور گالی بھی دے دی جائے۔ یا اُسے دھکے دیکر نکال دیا جائے۔ ایسا کرنے سے صدقہ باطل ہو جائے گا۔ لہذا ایسی باتوں سے پرہیز کرنا چاہیئے۔

اللہ تعالیٰ کے راستہ میں خرچ کرتے وقت یہ نہیں سمجھنا چاہیئے کہ اللہ تعالیٰ کو تمہارے صدقہ کا وغیرہ کی ضرورت ہے۔ نہیں، بلکہ واللہ عَزَّوَجَلَّ اللہ تعالیٰ تو ایسی چیزوں سے بے نیاز ہے۔ صدقہ دینے سے انسان کا اپنا ہی فائدہ ہے اسے تقرب الی اللہ حاصل ہوگا۔ اس کا نفس پاک ہو جائے گا۔ اللہ تعالیٰ جَلِیْمٌ بھی ہے۔ بڑا بردبار ہے۔ اکثر اوقات مجرموں کو مہلت دیتا ہے۔ بہت سے

لوگ اللہ کی اس مہلت سے ناجائز فائدہ اٹھا کر بڑے کاموں میں لگ جاتے ہیں۔
 مگر انہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ وقت مقرر پر گرفت بھی کر لیتا ہے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبُقَرَةُ ۲

درس یکصد شانزده (۱۱۶)

(آیت ۲۶۴ تا ۲۶۶)

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطُلُوا صَدَقَتَكُمْ بِالْمَنِّ
وَالْأَذَىٰ ۚ كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ وَلَا يُؤْمِنُ
بِاللَّهِ وَالْيَوْمِ الْآخِرِ فَتَشْلُكُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَيْهِ
تُرَابٌ فَأَصَابَهُ وَابِلٌ فَتَرَكَهُ صَلْدًا ۖ لَا يَقْدِرُونَ
عَلَىٰ شَيْءٍ مِّمَّا كَسَبُوا ۗ وَاللَّهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ ﴿٢٦٤﴾
وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمُ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ
اللَّهِ وَتَشْبِيتًا مِّنْ أَنْفُسِهِمْ كَمَثَلِ جَنَّةٍ بِرَبْوَةٍ أَصَابَهَا
وَابِلٌ فَاتَتْ أَكْطُفَهَا ضِعْفَيْنِ ۚ فَإِن لَّمْ يُصْبِحْهَا وَابِلٌ فَطَلَّ ۗ وَاللَّهُ
بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ ﴿٢٦٥﴾ أَيْوَدُ أَحَدُكُمْ أَن تَكُونَ لَهُ جَنَّةٌ
مِّنْ نَّخِيلٍ وَأَعْنَابٍ تَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْأَنْهَارُ ۚ لَهُ فِيهَا
مِن كُلِّ الثَّمَرَاتِ ۚ وَأَصَابَهُ الْكِبَرُ وَلَهُ ذُرِّيَّةٌ ضُعَفَاءُ ۚ
فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِيهِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ ۚ كَذَلِكَ يُبَيِّنُ
اللَّهُ لَكُمْ الْآيَاتِ لَعَلَّكُمْ تَتَفَكَّرُونَ ﴿٢٦٦﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اپنے صدقات کو باطل نہ کرو۔ احسان جتلا کر اور تکلیف
دے کر۔ اُس شخص کی طرح جو لوگوں کو دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
اور قیامت کے دن پر یقین نہیں رکھتا۔ پس اُس شخص کی مثال (یعنی اس کے خرچ کرنے کی)
صاف چٹان یا پتھر کی ہے، جس پر ٹی ہو پس پہنچے اس کو موسلا دھار بارش
اور چھوڑ دے۔ اس کو بالکل خالی اور صاف۔ یہ لوگ اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں

ہوں گے جو کچھ انہوں نے کمایا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ الکفر کرنے والی قوم کی رہنمائی نہیں کرتا۔ (۲۶۴) اور اُن لوگوں کی مثال جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں، اللہ تعالیٰ کی رضا حاصل کرنے کے لیے، اور اپنے دلوں کی پختگی کے لیے، ان کی مثال باغ عیسیٰ ہے۔ جو اونچی جگہ پر واقع ہو۔ اس کو موسلا دھار بارش پہنچے، پس وہ اپنا پھل دگنا کرے۔ پس اگر زور دار بارش نہ پہنچے تو ہلکی بارش بھی اس کے لیے کار آمد ہوگی، اور اللہ تعالیٰ نگاہ میں رکھتا ہے۔ جو کام تم کرتے ہو (۲۶۵) کیا تم میں سے کوئی شخص اس بات کو پسند کرتا ہے۔ کہ اس کا بھروسہ اور انگوڑوں کا باغ ہو۔ اس کے سامنے نہریں بہتی ہوں۔ اور اس شخص کے لیے اس باغ میں ہر قسم کے پھل ہوں۔ اور اس شخص کو بڑھاپا آ پہنچے اور اس کی اولاد کمزور ہو۔ پس اس باغ کو بگولہ پہنچے جس کے اندر آگ ہو اور وہ اس باغ کو جلا ڈالے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ واضح طور پر اپنی آیات بیان فرماتا ہے۔ تاکہ تم غور و فکر کرو (۲۶۶)

ابطال صدقہ کے متعلق دو وجوہات کا ذکر گذشتہ درس میں بھی آچکا ہے۔ آج کے درس میں ان کا تذکرہ دوبارہ کر رہا ہے۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لَا تَبْطِلُوا صَدَقَتِكُمْ بِالْمَنِّ وَالْأَذَىٰ اے اہل ایمان! اپنے صدقات و خیرات کو احسانِ جلا کر اور تکلیف پہنچا کر باطل نہ کرو۔ یہی دو چیزیں پہلے بھی بیان ہوئی ہیں دہاں فرمایا تھا ثُمَّ لَا يَتَّبِعُونَ مِمَّا انْفَقَوْا مِمَّا وَلَا أَذَىٰ لگایا دونوں مقامات پر احسان اور اذیت کو ابطال صدقہ کا ذریعہ بتایا گیا ہے۔ ایسا کرنے سے نہ صرف صدقہ بے مقصد ہو جاتا ہے۔ بلکہ الٹا انسان گنہگار ہو کر عذاب کا مستحق ہو جاتا ہے۔ گویا یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ اتفاق فی سبیل اللہ کا مفہوم محض اللہ تعالیٰ کی رضا جوئی کیلئے خرچ کرنے کا نام ہے۔ یہ دو باتیں آگئیں۔

ابطال صدقہ کی تیسری وجہ متعلق فرمایا كَالَّذِي يُنْفِقُ مَالَهُ رِثَاءَ النَّاسِ جو شخص لوگوں کے دکھانے کے لیے مال خرچ کرتا ہے اس کا صدقہ بھی اس طرح باطل ہو جاتا ہے۔ جس طرح احسانِ جلا کر اور اذیت پہنچا کر

ابطال صدقہ
کی پہلی وجہ

تیسری وجہ
ریا کاری

ضائع ہوتا ہے۔ ریاکار نہ صرف اجر و ثواب سے محروم رہتا ہے بلکہ الگ گناہ گار ہو جاتا ہے۔ کیونکہ اُس نے اللہ کی رضا کے لیے خرچ نہیں کیا۔ بلکہ شہرت اور نیک نامی کی خاطر کیا ہے۔ حدیث شریفین میں آتا ہے۔ قیامت کے دن اللہ تعالیٰ ریاکار کو فرمائے گا۔ جاؤ تمہارے لیے میرے پاس کوئی اجر نہیں۔ تم ایسے صدقہ کا اجر اُن سے لو جن کی خوشنودی کی خاطر صدقہ کیا تھا۔ کیونکہ انا اغنی الشیخاء میں شریحوں سے پاک ہوں میرا کوئی ہمسر نہیں۔ اسی لیے ریاکار کو شرک اصفیٰ کہا گیا ہے۔ شرک کی بہت سی قسمیں ہیں۔ جن میں ریاکاری قسم کا شرک شمار ہوتا ہے۔

فرمایا ایک تو ایسا شخص دکھائے کے لیے خرچ کرتا ہے اور دوسرے وَلَدٌ یُّؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَالْیَوْمِ الْآخِرِ اللہ تعالیٰ اور قیامت کے دن یقین بھی نہیں رکھتا۔ اگر اُسے اللہ تعالیٰ کی وحدانیت، اس کی قدرت کاملہ اور بعث بعد الموت کا یقین ہوتا۔ تو پھر دوسروں کو دکھائے کے لیے نیکی کا کام نہ کرتا محض رضا الہی کے لیے اپنا مال خرچ کرتا۔

چٹان کی مثال

فرمایا وَمَثَلُهُ كَمَثَلِ صَفْوَانٍ عَلَیْهِ تُرَابٌ ریاکار کی مثال اس چٹان کی سی ہے۔ جس پر مٹی بڑی ہو۔ اور بظاہر یہ نظر آئے کہ اگر اس مٹی میں بیج بودیا جائے تو فصل اُگ آئے گی۔ مگر حقیقت میں وہ مٹی نہیں ہوتی بلکہ سخت اور صاف چٹان پر مٹی کی تر جمی ہوتی ہے۔ فَاصَابَهُ وَابِلٌ جب اُس پر زور کا مینہ برسا، تیز بارش ہوئی فَتَرَكَهُ صَلْدًا تو مٹی بہ گئی اور صاف چٹان باقی رہ گئی۔ مقصد یہ ہے کہ جس طرح چٹان پر بونے گئے بیج سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اسی طرح ریاکاری میں خرچ کیے گئے مال کا کچھ بدلہ نہیں ملے گا۔ جو کبھی صدقہ احسان جتلائے، یا اپنا بچانے یا ریاکاری کے لیے دیا جائے گا وہ باطل ہو جائے گا فَمَا یَا لَیْقَافُ وَرَدُّهُ عَلٰی شَیْءٍ مِّمَّا کَسَبُوْا یہ لوگ اس میں سے کسی چیز پر قادر نہیں ہونگے جو کچھ انہوں نے کمایا ہے یعنی جو صدقہ و خیرات کیا ہے۔ کیونکہ اس میں ریاکاری کا عنصر شامل ہے لہذا انہیں اس کا کوئی اجر نہیں ملے گا۔

کافر راہنمائی
سے محروم ہیں

فرمایا **وَاللّٰهُ لَا يَهْدِي الْقَوْمَ الْكَافِرِينَ** اللہ تعالیٰ کافروں کی راہنمائی نہیں کرتا۔ جو لوگ بظاہر نیکی کا کام کرتے ہیں۔ دھڑا دھڑال خرچ کر رہے ہیں۔ مگر نیت میں خرابی ہے۔ کوئی احسان جتلا رہا ہے۔ کوئی ایذا پہنچا رہا ہے۔ اور کوئی محض ذاتی شہرت کی خاطر خرچ کر رہا ہے۔ تو ایسے لوگ ہمیشہ غلط راستے پر بھٹکتے رہتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ان کی راہِ راست کی طرف راہنمائی نہیں فرمائیں گے۔ یہ ان کے لیے سزا کے طور پر ہے۔ ورنہ اگر ان میں ذرہ بھی نیک نیتی موجود ہو، تو اللہ تعالیٰ ان کی راہنمائی صراطِ مستقیم کی طرف فرمائے۔ مگر جب تک یہ لوگ اپنی بُری حرکتوں سے باز نہیں آئیں گے۔ کھڑا شرک اور فسق و فجور پر نادم ہو کر اس کو ترک نہیں کر دیں گے اور اللہ تعالیٰ سے خود صراطِ مستقیم کی راہنمائی طلب نہیں کریں گے، اللہ تعالیٰ انہیں ہدایت نصیب نہیں کئے گا۔

رضا الہی کے
لیے خرچ

ریا کاری کے طور پر خرچ کرنے کی وضاحت کے بعد اب تصویر کا دوسرا رخ پیش کیا جا رہا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے۔ **وَمَثَلُ الَّذِينَ يُنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ ابْتِغَاءَ مَرْضَاتِ اللّٰهِ** اور ان لوگوں کی مثال جو اللہ کی رضا کے لیے اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں۔ ظاہر ہے کہ رضا الہی کا حصول بہت بڑی نعمت ہے۔ جس سے اللہ راضی ہو گیا۔ اسے سب کچھ مل گیا۔ اور جس کسی سے اللہ تعالیٰ ناراض ہو گیا۔ وہ ہر چیز سے محروم ہو گیا، تو فرمایا جو لوگ اللہ کی رضا حاصل کرنے کے لیے مال خرچ کرتے ہیں **وَيُثَبِّتُنَا مِنْ اَنْفُسِهِمْ** اور ان کا دوسرا مقصد اپنے نفسوں کو ثابت رکھنا ہوتا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کی خوشنودی کے ساتھ ساتھ ان کا مقصد اصلاحِ نفس بھی ہوتا ہے۔ تاکہ دلِ النفاق فی سبیل اللہ اور نیکی کے دوسرے کاموں پر ثابت قدم رہے۔ اور ان کے دلوں سے بخل کا مادہ دور ہو کہ ان میں فیاضی کا مادہ پیدا ہو جائے۔ فرمایا ایسے لوگوں کی مثال **كَمَثَلِ جَنَّةٍ اَوْ بِوَاغٍ** اُس باغ جیسی ہے جو اونچی جگہ پر واقع ہو **اَصَابَهَا وَابِلٌ** جب اس باغ پر زور دار بارش ہو، **فَاَنْتَ اَكُلُهَا ضَعْفَيْنِ** تو وہ دو گنا پھل دے۔ **فَاِنْ لَّمْ**

يُصْبِحُهَا وَابِلٌ فَطَلٌّ اور اگر تیز بارش نہ ہو تو اس کے لیے معمولی بارش جیسے اوس، بھی کافی ہو۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں۔ یہاں پر تیز بارش سے مراد یہ ہے۔ کہ کوئی شخص فیاضی کا خوب مظاہرہ کرتا ہے۔ اور اللہ کے راستے میں کھل کر خرچ کرتا ہے۔ تو اس مثال کے مطابق وہ کئی گنا زیادہ اجر و ثواب کا مستحق ہے۔ اور معمولی بارش یعنی تھوڑی مقدار میں خرچ کرتا ہے۔ تو اس کی کامیابی کے لیے وہ بھی کافی ہے۔ بشرطیکہ اس کی نیت درست ہو، احسان، ایذا اور ریاکاری سے پاک ہو۔ نیت بمنزلہ زمین کے ہے۔ اگر زمین زرخیز ہے یعنی نیت درست ہے۔ تو تھوڑا خرچ کہہنا بھی اس کے لیے مفید ہوگا۔ جیسا کہ حضرت ابوہریرہؓ کی روایت میں آتا ہے۔ اَخْلَصُ فِي دِينِكَ يَكْفِيكَ قَلِيلٌ مِنَ الْعَمَلِ اپنے دین میں اخلاص پیدا کر لو، تو تھوڑا عمل بھی کفایت کرے گا۔ لہذا نبی کے ہر کام میں رضا الہی ہمیشہ پیش نظر ہونی چاہیے، قبولیت کا یہی معیار ہے۔ وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ بَصِيرٌ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اس کو خوب دیکھ رہا ہے۔ تمہارے کسی عمل سے غافل نہیں۔ تمہارے دلوں کے حالات اور نیت سے واقف ہے۔ وہ تمہارے اخلاص کے درجے کو جانتا ہے۔ اُس سے کوئی چیز اور چھل نہیں لہذا ہر کام کرتے وقت اپنی نیت کو درست کر لو۔

باغ کی مثال

کسی متوقع نعمت کے ضائع ہو جانے پر کس قدر پریشانی ہوتی ہے۔ اسکی وضاحت چٹان والی مثال میں ہو چکی ہے۔ اب اللہ تعالیٰ اس قسم کی ایک اور مثال بیان فرماتے ہیں۔ جس میں یہ بات سمجھائی گئی ہے کہ جب اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت پر ہی انسان کا انحصار ہو۔ اور وہ ضائع ہو جائے تو انسان کو کس قدر دکھ ہوتا ہے۔ اور اس کی امیدوں پر کس طرح پانی پھر جاتا ہے۔ اسی طرح جب کوئی شخص نیکی کا کام کرنے کے باوجود بعض وجوہ کی بنا پر اس کے اجر و ثواب سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو اس کے لیے کتنا اذیت ناک ہوتا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے۔ اَلْيَوْمُ أَحَدُكُمْ اَنْ تَكُوْنَ لَهُ جَنَّةٌ مِّنْ خَيْلٍ وَّ اَعْنَابٍ يَجْرِي مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهَارُ کیا تم میں سے کوئی شخص

یہ بات پسند کرتا ہے۔ کہ اس کے پاس کھجوروں اور انگوروں کا باغ ہو۔ جس کے سامنے نہریں بہتی ہوں لَہُ فِیْہَا مِنْ کُلِّ الثَّمَرَاتِ اس باغ میں ہر قسم کے پھل موجود ہوں وَأَصَابَهُ الْکِبَرُ اور باغ کا مالک بڑھاپے کی عمر میں ہو۔ وَلَہُ ذُرِّیَّۃٌ ضَعْفَاءٌ اور اس کی اولاد کمزور ہو۔ یعنی اُن کے لیے کوئی اور ذریعہ معاش بھی نہ ہو۔ تو ایسی صورت میں فَأَصَابَهَا إِعْصَارٌ فِیْہِ نَارٌ فَاحْتَرَقَتْ باغ کسی بجولے کی لپیٹ میں آجائے جس کے اندر آگ ہو جو باغ کو جلا کر خاک کر ڈالے۔ تو ذرا اندازہ کیجئے، ایسی صورت میں اُس باغ کے مالک کی کیا حالت ہوگی۔ اس کا ایک ہی ذریعہ معاش تھا۔ یہ باغ ہی اس کی کل پونجی تھی۔ جس پر اس کا اور اس کی اولاد کا انحصار تھا۔ جب یہ ہی جل کر خاکستر ہو گیا۔ تو وہ کس طرح ہر چیز سے محروم ہو گیا۔

فرمایا احسان جیلانے والے، ایذا پہنچانے والے یا رب یا کار می کے لیے خرچ کھنے والے کی حالت بھی قیامت کے دن ایسی ہوگی۔ جس طرح وہ باغ اپنے مالک کا کبر سنی کا سہارا تھا۔ اسی طرح یہ شخص اپنے خرچ کردہ مال کے اجر و ثواب کی امید لگائے بیٹھا تھا۔ مگر جب قیامت کا دن ہوگا۔ تو ایسا شخص اسی طرح ثواب سے محروم ہو جائے گا۔ جس طرح باغ کا مالک باغ کے جل جانے کے بعد اس کے ثمرات سے محروم ہو گیا، قیامت کے دن ایسا شخص ایک محتاج اور بالکل قلاش کے طور پر پریشان پھپھکے گا، مگر اس کو فائدہ پہنچانے والی کوئی چیز اس کے پاس نہ ہوگی۔

فرمایا کَذٰلِکَ یُبَیِّنُ اللّٰہُ لَکُمُ الْاٰیٰتِ اِی طَرَحَ اللّٰہُ تَعَالٰی اپنے احکام یا نشانیاتہا سے پاس کھول کھول کر بیان کرتا ہے۔ لَعَلَّکُمْ تَتَفَكَّرُوْنَ تاکہ تم غور و فکر کر سکو۔ اچھی اور بُری چیز میں امتیاز کر سکو لہذا آج صراطِ مستقیم پر گامزن ہو جاؤ تاکہ کل قیامت کو پریشانی سے بچ جاؤ۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَرَه ۲

درس یکصد ہفدہ (۱۱۷)

آیت ۲۶۷ تا ۲۶۸

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ وَمِمَّا
 أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ وَلَا تَيَمَّمُوا الْخَبِيثَ مِنْهُ
 تُنْفِقُونَ وَلَسْتُمْ بِآخِذِيهِ إِلَّا أَنْ تُغْنِصُوا فِيهِ وَلَعَلَّكُمْ
 أَنْ اللَّهَ عَنِّي حَمِيدٌ ۝ (۲۶۷) الشَّيْطَانُ يَعِدُكُمُ الْفَقْرَ
 وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وَاللَّهُ يَعِدُكُمْ مَغْفِرَةً
 مِنْهُ وَفَضْلًا وَاللَّهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ ۝ (۲۶۸)

ترجمہ :- اے ایمان والو! وہ پاک چیزیں خرچ کرو، جو تم نے کائی ہیں۔ اور اس
 میں سے بھی جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالی ہیں۔ اور ردی چیز کا قصد نہ کرو کہ تم اس
 سے خرچ کرتے ہو۔ اور خود اس سے لینے والے نہیں، سوائے اس کے کہ تم اس میں
 چشم پوشی کرو۔ اور جان لو کہ بیشک اللہ تعالیٰ بے پروا ہے اور تعریفوں والا ہے (۲۶۷)
 شیطان تم کو فقر کا وعدہ دیتا ہے۔ اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
 تم کو اپنی طرف سے مغفرت اور فضل کا وعدہ دیتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ بڑی وسعت والا
 اور سب کچھ جاننے والا ہے (۲۶۸)

رہنمایا

صدقات کی قبولیت کے متعلق تین شرائط کا پہلے ذکر ہو چکا ہے۔ کہ

کسی کو خیرات دے کر نہ تو اس پر احسان مبتلایا جائے۔ نہ اُسے تکلیف پہنچائی جائے
 اور نہ خرچ کرنے میں ریاکاری کا عنصر شامل ہو، یعنی خالص نیک نیتی کے ساتھ
 رضائے الہی مقصود ہو۔ اگر یہ چیزیں موجود ہوں گی، تو صدقہ باطل ہو جائے گا۔
 اور دینے والا گنہگار ہو کر وٹا و بال میں پڑ جائے گا۔ آج کے درس میں قبولیت کی چوتھی
 شرط مال کی پاکیزگی کا بیان ہے۔

قبولیت کی
جو حقیقی شرط
پاکیزگی مال

ارشاد ہوتا ہے۔ **يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا أَنْفِقُوا مِنْ طَيِّبَاتِ مَا كَسَبْتُمْ**
اے ایمان والو! خرچ کرو پاک اور ستھری چیزیں جو تم نے کمائی ہیں۔ گویا قبولیت صدقہ
کے لیے یہ بھی ایک شرط ہے۔ کہ صاف ستھری اور بہتر چیز اللہ کے راستے میں دی
جائے۔ مفسرین کرام نے طیبات کی تفصیل میں دو چیزیں بیان کی ہیں۔ پہلی چیز یہ ہے
کہ جو مال فی سبیل اللہ خرچ کیا جا رہا ہے، وہ حلال ہو۔ جائز ذرائع سے حاصل کیا گیا
ہو۔ حرام مال سے ادا کردہ صدقہ قابل قبول نہیں۔ مثال کے طور پر اگر کوئی شخص
چوری، ڈاکہ یا رشوت کا مال صدقہ کرتا ہے تو وہ بارگاہِ اہل دی میں کیسے قبول ہو
گا۔ بلکہ ایسا کرنے سے انسان الٹا گنہگار ہوگا۔ مسند احمد کی روایت میں ہے۔ کہ
جو شخص حرام کمائی کی خوراک کھائے گا یا لباس پہنے گا۔ نہ اُس کی عبادت قبول ہوگی
اور نہ اُس کا صدقہ خیرات قبول ہوگا۔ اور اگر ایسا شخص مر گیا اور اپنے پیچھے مال چھوڑ گیا
تو وہی مال اس کے لیے جہنم کا زائورہ ہوگا۔ بعض چیزیں تو شرعاً طعی حرام ہیں اور
بعض مشتبہ ہوتی ہیں۔ مشتبہ مال کی خیرات بھی درجہ قبولیت کو نہیں پہنچتی۔ کیونکہ واضح
حکم موجود ہے۔ **كُلُوا مِمَّا فِي الْأَرْضِ حَلَالًا وَطَيِّبًا** یعنی حلال اور پاکیزہ
چیزیں کھاؤ۔ حرام سے پرہیز کرو۔

طیب کا دوسرا مفہوم یہ ہے۔ کہ جو چیز بھی صدقہ میں دی جا رہی ہے۔ وہ اعلیٰ
اور بہتر ہو۔ نہ کچی اور نہ دی چیز۔ ایسا نہیں ہونا چاہیے۔ کہ اچھی چیز اپنے لیے رکھ
لی جائے اور کم تر چیز زکوٰۃ و صدقات میں دی جائے۔ یہ بھی مناسب نہیں۔ حدیث
شریف میں آتا ہے۔ کہ بعض لوگ ایسے ہیں۔ جو کھجور کے اچھے گچھے اپنے واسطے
محفوظ کر لیتے ہیں اور کمتر گچھے اصحاب صفہ کے لیے لٹکا دیتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ
نے ایسی تقسیم سے منع فرمایا ہے۔ جب تم خود روئی چیز کو پسند نہیں کرتے تو
اللہ تعالیٰ اُسے کیسے پسند کریگا۔ لہذا زکوٰۃ و صدقات میں بہتر چیز دینی چاہیے۔

فرمایا، اے اہل ایمان! اُن پاکیزہ چیزوں میں سے خرچ کرو **مَا كَسَبْتُمْ**
جو تم نے کمائی ہیں۔ اب کمائی کی بھی مختلف صورتیں ہیں۔ منجملہ اُن کے کمائی کا اولین

ذاتی کمائی
میں سے خرچ

ذریعہ انسان کی ذاتی محنت و مشقت ہے۔ کوئی تجارت کرتا ہے۔ دکاندار ہے۔ ملازم ہے۔ کارخانہ دار ہے۔

یامز دور ہے۔ یہ سب ذاتی آمدن کے ذرائع ہیں آمدن کے بعض دوسرے ذرائع فطری ہوتے ہیں۔ جن میں انسان کی ذاتی مشقت کا دخل نہیں ہوتا، مثلاً کہیں سے ہریہ مل گیا، وصیت کے ذریعے کوئی چیز حاصل ہوگی یا اُسے وراثت سے حصہ مل گیا۔ ان ذرائع حاصل مال بھی انسان کی ملکیت ہوتا ہے۔ تو پاکیزہ چیزیں خرچ کرنے کا قانون ان تمام ذرائع سے حاصل شدہ آمدنی پر ہوگا۔ لہذا حکم ہوا ہے کہ تم جس حلال مال سے بھی خرچ کرنا چاہو، اچھی اور بہتر چیز دو۔ اللہ کے راستے میں کم تر چیز دینے کی کوشش نہ کرو۔ پہلے گزر چکا ہے: "أَنْفَقُوا مِمَّا رَزَقَكُمْ" اس میں سے خرچ کرو، جو ہم نے تمہیں دیا ہے۔ جب سائے کا سارا مال اللہ تعالیٰ کا دیا ہوا ہے۔ تو پھر اُسی کے نام پر اچھی سے اچھی چیز دینی چاہیے۔ نہ کہ گھٹیا چیز۔ کیونکہ دینے والا تو وہ خود ہی ہے براہ راست خود محنت کر کے کمانے کے علاوہ ایک ذریعہ آمدنی زرعی پیداوار

بھی ہے۔ اس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اس میں سے بھی خرچ کرو وَمِمَّا أَخْرَجْنَا لَكُمْ مِنَ الْأَرْضِ جو ہم نے تمہارے لیے زمین سے نکالا زرعی پیداوار میں ہر قسم کا غلہ مثلاً گندم، جو، چاول، مکئی، باجرہ اور دالیں وغیرہ شامل ہیں۔ اس کے علاوہ ہر قسم کا پھل اور بنریاں بھی زرعی پیداوار ہیں۔ اب رہا یہ سوال کہ کتنا خرچ کیا جائے۔ تو سب سے پہلے جو کچھ قرض ہے، اُوٹھ ادا ہونا چاہیے، جس طرح تجارت وغیرہ کے مال میں کل مال کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ فرض ہے۔ اس طرح زرعی پیداوار سے عشر یعنی دسواں حصہ اللہ کی راہ میں خرچ کرنا فرض ہے۔ البتہ اس مد کے دو حصے ہیں۔ بارانی زمین یعنی جو زمین مالک کی مشقت کے بغیر سیراب ہوتی ہے۔ اس میں سے دسواں حصہ اور جو نہری یا چاہی زمین ہے۔ جسے مالک خود محنت کر کے پانی بہم پہنچاتا ہے، اس میں سے بیسواں حصہ نکالنا فرض ہے البتہ بعض خود رو چیزوں جیسے گھاس، لکڑیاں اور کانے، ان تین چیزوں پر عشر نہیں

زرعی پیداوار
میں سے خرچ

ہے۔ یہ معاف ہیں اگر یہ چیزیں خود کاشت کی جائیں۔ چائے کے لیے گھاس وغیرہ خود بولی جائے، لکڑی کے لیے درخت لگائیں یا کانے کی کاشت کی جائے، تو پھر ان پر عشر ادا کرنا ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ کا یہ فتویٰ ہے۔ عشر کی ادائیگی تو فرض ہے۔ یہ تو لازمی ہے اس کے علاوہ اگر کوئی مزید خرچ کرے گا۔ تو وہ نوافل میں شمار ہوگا۔ اور بموجب اجرو ثواب ہوگا۔

یہاں پر ایک شبہ کا ازالہ ضروری ہے۔ حضور علیہ السلام کی حدیث ہے۔
لَيْسَ فِي الْخَضِرَوَاتِ صَدَقَةٌ یعنی سبزیوں میں صدقہ نہیں ہے۔ حالانکہ یہ بھی زرعی پیداوار ہے۔ اور زمین ہی سے نکلتی ہے۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس حدیث کا یہ مطلب نہیں ہے۔ کہ سبزیوں پر عشر بالکل معاف ہے۔ بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ سبزیوں کا عشر سرکاری خزانے میں جمع کرانے کی ضرورت نہیں مالک خود اپنی صوابدید کے مطابق مستحقین میں تقسیم کر دے۔ اس کی وجہ یہ بتاتے ہیں۔ کہ سبزیاں جلد خراب ہو جانے والی چیز ہے سرکاری انتظام میں پہنچتے پہنچتے اور پھر تقسیم ہونے تک اس کے ضائع ہو جانے کا خدشہ ہے۔ اس لیے سبزی عشر یعنی دسواں یا بیسواں حصہ مالک کو خود تقسیم کر دینا چاہیے۔ مثال کے طور پر اگر سبزی کے دس گٹھے چلے گئے ہیں۔ تو ان میں سے ایک انشہ کی راہ میں دے دے۔ یا اگر زمین چاہی یا نہری ہے۔ تو بیس گٹھوں میں سے ایک ادا کر دے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ یہی مسلک قرآن و سنت سے موافقت رکھتا ہے۔

زرعی پیداوار کے نصاب کے متعلق فقہائے کرام میں کچھ اختلاف پایا جاتا ہے۔ بعض فرماتے۔ کہ دوسو درہم سے کم مالیت کی زرعی پیداوار پر عشر نہیں ہے کیونکہ یہ حدیث سے ثابت ہے کہ پانچ و سق سے کم انج پر عشر نہیں۔ اور پانچ و سق دوسو درہم کا بنتا ہے۔ مگر امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں۔ کہ یہ حدیث تجارتی مال سے متعلق ہے۔ جس شخص کے پاس تجارت کی غرض سے پانچ و سق سے کم انج ہے وہ زکوٰۃ نہ دے کیونکہ یہ نصاب کو نہیں پہنچتا۔ البتہ زرعی پیداوار کے متعلق فرماتے

ہیں کہ زرعی پیداوار قلیل ہو یا کثیر اس پر عشر ضروری ہے۔ کیونکہ اس کے متعلق حدیث میں واضح الفاظ آئے ہیں۔ زمین کے مالک کو زرعی پیداوار کی کم سے کم مقدار پر بھی عشر ادا کرنا ہو گا۔ البتہ یہ سوال باقی رہتا ہے کہ عشر کون ادا کرے، مالک اراضی یا کاشتکار یا دونوں۔ بعض فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ عشر کی ادائیگی کاشتکار پر لازم آتی ہے۔ مالک اراضی پر نہیں۔ تاہم راجح قول یہ ہے کہ عشر کی ادائیگی کے حصہ رسد دی دونوں ذمہ دار ہیں۔ انہیں چاہیے کہ کل پیداوار سے پہلے عشر نکالیں اور باقی اناج وغیرہ آپس میں تقسیم کریں۔

زمین کی پیداوار کا ایک اور ذریعہ معدنیات ہیں۔ عام زمین میں اور پہاڑوں میں کانیں پائی جاتی ہیں جن سے تانبہ، نمک، کوئلہ، لوہا، ناپائیدار تیل وغیرہ نکلتے ہیں ان تمام چیزوں کی زکوٰۃ خمس یعنی کل آمدنی کا پانچواں حصہ ہے۔ چونکہ ان اشیاء کی پیداوار کے لیے عموماً محنت کی ضرورت نہیں ہوتی، نہ بیج نہ پانی نہ نہلائی وغیرہ اس لیے اس کی کل آمدنی کا پانچواں حصہ یعنی بیس فیصد ادا کرنا ضروری ہے۔ البتہ ایک مسئلہ فقہائے کرام کے درمیان مختلف فیہ ہے کہ ان کانوں کا مالک کون ہے۔ امام ابو حنیفہؒ، امام شافعیؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ کانوں کا مالک وہ شخص ہے جس کی اراضی سے معدنیات برآمد ہو، لہذا خمس بھی وہی ادا کرے گا۔ اگر یہ معدنیات کسی عام جنگل، صحرا یا سمندر سے نکلیں تو ان کی مالک حکومت ہوگی البتہ امام مالکؒ کا مسلک یہ ہے کہ کان خواہ کیس بھی نکلے، اس کی مالک حکومت ہے۔ امام مالک صاحبؒ انفرادی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتے۔

بہر حال فرمایا کہ اگر کھائی تمہاری ذاتی محنت و مشقت کی ہے۔ تو پھر اس میں سے حلال اور طیب چیزیں اللہ کی راہ میں خرچ کرو۔ اور جو زمین کی پیداوار ہے اس میں سے بھی اچھی چیز خرچ کرو، وَلَا تَتَّبِعُوا الْاَخْيَیْثَ مِنْهُ تُنْفِقُوْنَ اور ردی یا کم تر چیز کو خرچ کرنے کا ارادہ نہ کرو۔ خبیث سے مراد ردی یا گھٹیا چیز ہے۔ اور اس کا اطلاق ناپاک چیز پر بھی ہوتا ہے۔ اللہ کی راہ میں صاف

خبیث مال قابل قبول نہیں

تھری چیز دینی چاہیے۔ کیونکہ وَلَسْتُمْ بِالْأَخِذِيْهِ گھٹیا چیز جب تم خود لینے کے لیے تیار نہیں ہو۔ تو اللہ تعالیٰ کی راہ میں ایسی چیز کیوں دیتے ہو۔ گھٹیا چیز قبول کرنے کی ایک صورت ہے کہ إِلَّا أَنْ تَغْضُوْا فِيْهِ تم خود چشم پوشی کر لو۔ مگر یہ تم کرنے کے لیے تیار نہیں ہو۔ لہذا اللہ کی راہ میں بھی اچھی سے اچھی خرچ کرو۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے۔ لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتَّى تُنْفِقُوْا مِمَّا يَخُوفُكُمْ تم ہر گز نیکی کو نہیں پہنچ سکتے جب تک تم اپنی پسندیدہ چیز خرچ نہ کرو۔ ظاہر ہے کہ ہر شخص کے لیے اچھی اوصاف تھری اور بہتر چیز ہی پسندیدہ ہوتی ہے۔ لہذا بہتر چیز ہی فی سبیل اللہ بھی ادا کرو۔

پاکیزہ چیز کے سلسلہ میں ترمذی شریعت کی حدیث ہے حضور علیہ السلام نے فرمایا لَا تُقْبَلُ صَلَوةٌ بَغْيٍ طُهْرٍ وَلَا صَدَقَةٌ مِنْ غُلُوْلٍ یعنی طہارت کے بغیر اللہ تعالیٰ نماز قبول نہیں کرتا۔ اور خیانت کے مال سے صدقہ قبول نہیں کرتا۔ لہذا جس مال کی زکوٰۃ، صدقات، خیرات وغیرہ دی جا رہی ہے اس کا حلال اور طیب ہونا بھی ضروری ہے۔ وَعَلَّمُوْا اِحْسَنَ طَرِيْقَةٍ سے جان لو۔

اِنَّ اللّٰهَ غَفِيْرٌ حَمِيْدٌ کہ اللہ تعالیٰ — بے پردا — اور بے نیاز ہے۔ اس کو تمہارے صدقات و خیرات کی کوئی ضرورت نہیں یہ تو تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے تاکہ تم اس سے آخرت میں مستفید ہو سکو۔ یہ دنیا میں قوم کے غرباء و مساکین کی اعانت کا ایک ذریعہ ہے۔ نیز تمہارے اپنے اخلاق بھی اس کی وجہ سے عالی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ تم پر راضی ہوں گے۔ اللہ تعالیٰ حمید یعنی تمام خوبیوں کا مالک خود ہے تم اچھا کام کرو یا بُرا کرو۔ وہ بے نیاز ہے۔ تمہارے اچھے اعمال نہ اس کی خدائی میں اضافہ کر سکتے ہیں اور نہ

تمہارے بُرے اعمال اسکی خدائی پر اثر انداز ہو سکتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے مال دیا ہے تو اس کی راہ میں خرچ کرو۔ اور اس کا شکریہ ادا کرو، کہ اس نے تمہیں انعام سے نوازا ہے۔

شیطان کا
ہرکاوا

فرمایا، دیکھنا اس محلے میں شیطان کے ہرکاوے میں نہ آجانا۔ شیطان کی یہ ہمیشہ
کوشش ہوتی ہے کہ وہ طرح طرح کے دوسرے ڈال کر انسان کو نیک عمل سے روکنے
کی کوشش کرتا ہے۔ چنانچہ انفاق فی سبیل اللہ کے سلسلے میں الشیطان یَعِدُّكُمْ الْفَقْرَ
شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ شیطان انسان پر اس طرح
حملہ آور ہوتا ہے کہ اگر مال تھوڑا ہے تو وہ ہرکاوتا ہے کہ اگر یہ مال صدقات میں دیدیا
تو پھر تمہارے پاس کچھ نہیں بچے گا۔ تم مفلس ہو کر دوسروں کے محتاج ہو جاؤ گے۔
جب اس قسم کا خیال آئے تو سمجھ لینا چاہیے کہ یہ شیطانی دوسوہ ہے۔ اگر مال
قلیل بھی ہے۔ تو اس میں سے کچھ نہ کچھ مے دو، اللہ تعالیٰ بقیہ مال میں برکت دیگا۔
فرمایا وَمَا أَنْفَقْتُمْ مِّنْ شَيْءٍ فَهُوَ يُخْلِفُهُ أَكْبَرَ خَرْجٍ کہ دے گے تو اللہ تعالیٰ
اس کی جگہ کسی دوسرے ذریعے مال دے دیگا۔ لہذا بخل نہیں کرنا چاہیے۔ بلکہ فراخ دلی کا
مظاہرہ کرنا چاہیے۔

اگر اللہ تعالیٰ نے کسی شخص کو دافرا مال دیا ہے۔ تو پھر شیطان دوسرے طریقے
سے حملہ کرتا ہے وَيَأْمُرُكُمْ بِالْفَحْشَاءِ وہ تمہیں بے حیائی کا حکم دیتا
ہے مطلب یہ ہے کہ مالدار آدمی کو فحاشی کے کاموں کی طرف لگا دیتا ہے کہ
فکر نہ کرو۔ تمہارے پاس بہت مال ہے۔ خوب عیش و عشرت کی زندگی بسر کرو۔
دنیا میں بار بار نہیں آنا۔ لہذا کھاؤ پیو، عیش کرو۔ یا پھر اس کا مال کھیل تماشے اور فضول
رسم و رواج پر خرچ کرنا ہے۔ کہیں دھوم دھام سے شادی ہو رہی ہے۔ سالگرہ
منائی جا رہی ہے۔ باجے بجائے جاتے ہیں۔ چڑیاں کیا جا رہی ہیں۔ کہیں عرس
منائے جاتے ہیں۔ اور لاکھوں روپیہ ان فضول رسم و رواج پر ضائع کیا جا رہا ہے
یہ سب شیطان کے ہرکاوے ہیں۔

اللہ تعالیٰ کا
وعدہ

فرمایا اس کے برخلاف اللہ تعالیٰ تمہیں ابدی نعمتوں سے نوازنا چاہتا ہے
وَاللَّهُ يَعِدُّكُمْ مَّغْفِرَةً مِّنْهُ وَفَضْلًا اللہ تعالیٰ تم سے مغفرت
اور فضل کا وعدہ کرتا ہے۔ اگر اس کے حکم کے مطابق اس کے راستے میں خرچ

کر دے۔ تو اللہ تعالیٰ تمہارے گناہ معاف فرما دیگا۔ دنیا میں بھی برکت عطا کرے گا۔ اور آخرت میں اپنے فضل سے جنت میں داخل کر دیگا۔ یہ اس کا وعدہ ہے۔ لہذا شیطان کے بہکانے میں نہ آنا بلکہ اللہ تعالیٰ کے وعدے پر یقین کر کے اس کے احکام کی بجا آوری کرو۔ اور دائمی فلاح پا جاؤ۔ وَاللّٰهُ وَاسِعٌ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ بڑا ہی وسعت والا ہے۔ اس کے خزانے بہت وسیع ہیں۔ وہ اپنے بندوں کو مایوس نہیں ٹھاتا بلکہ انہیں دُکھ چوگنا عطا کرتا ہے۔ وہ ہر چیز کو جاننے والا بھی ہے۔ وہ علیم بذات الصدور بھی ہے تمہاری نیتوں تک سے واقف ہے۔ جس قدر اخلاص تمہارے دلوں میں موجود ہو گا اللہ تعالیٰ اس کے مطابق بڑھا چڑھا کر تمہیں عطا کریں گے۔

البقرة ۲

آیت ۲۶۹ تا ۲۷۰

تِلْكَ الرُّسُلُ

درس یکصد ہشودہ (۱۱۸)

يُؤْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ ۚ وَمَنْ يُؤْتَ الْحِكْمَةَ فَقَدْ
 أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا وَمَا يَذَّكَّرُ إِلَّا أُولُو الْأَلْبَابِ ﴿٢٦٩﴾ وَمَا
 أَنْفَقْتُمْ مِنْ نَفَقَةٍ أَوْ نَذَرْتُمْ مِنْ نَذْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُكُمْ
 وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ﴿٢٧٠﴾

ترجمہ: ۱۔ اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت عنایت فرماتا ہے اور جس کو حکمت
 دی گئی، اُسے بہت زیادہ بھلائی عطا کی گئی۔ اور نہیں نصیحت قبول کرتے مگر وہ
 لوگ جو عقل والے ہیں ﴿۲۶۹﴾ اور تم جو بھی خرچ کرو صدقہ و خیرات یا کوئی نذر مانو نذر ماننا
 تو بیشک اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ اور ظلم کرنے والوں کے لیے کوئی مددگار نہیں ﴿۲۷۰﴾
 گذشتہ آیات میں اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کی قبولیت سے متعلق چار شرائط
 کا ذکر فرمایا ہے۔ جن میں خیرات دیگر احسان نہ جملنا، ایذا نہ پہنچانا، اریا کاری سے اجتناب
 اور پاکیزگی مال شامل ہیں۔ باقی شرائط کا ذکر اگلے دروس میں آئے گا۔ یہاں درمیان میں
 اللہ تعالیٰ نے حکمت کی تشریح بیان کی ہے۔ اور اُسے خیر کثیر سے تعبیر کیا ہے۔
 اس میں نذر ماننے کے متعلق بیان بھی ہے۔ کہ یہ کس حد تک جائز ہے۔

ارشاد ربانی ہے۔ يُوْتِي الْحِكْمَةَ مَنْ يَشَاءُ اللہ تعالیٰ جسے چاہے
 حکمت عطا کرتا ہے۔ حکمت کا مادہ احکام سے منکلا ہے، جو پختگی کے معنی میں
 استعمال ہوتا ہے۔ لہذا حکمت سے مراد وہ چیز ہے۔ جو پختہ ہو۔ اور پھر صدقہ کے ساتھ
 اس کے مختلف اثرات پیدا ہوتے ہیں۔ حکمت کا عام معنی فہم اور سمجھ کیا جاتا ہے
 بعض مفسرین کلام فرماتے ہیں اَلْوَلْعُ النَّافِعُ الْمُؤَدِّي إِلَى الْعَمَلِ یعنی حکمت
 ایسے علم کو کہا جاتا ہے جو مفید ہو اور انسان کو عمل تک پہنچائے۔
 امام مالکؒ حکمت کا معنی سنت کرتے ہیں۔ حکیم خدا تعالیٰ کی صفت بھی ہے

رابط آیات

حکمت کا
مفہوم

اور قرآن کریم کو بھی حکمت کہا گیا ہے۔ اور حضور علیہ السلام کی سنت مبارکہ کو بھی حکمت کا نام دیا گیا ہے۔ اس کے علاوہ باقی سمجھ یا دانائی کی باتیں بھی حکمت میں شمار ہوتی ہیں۔

حضرت لقمانؑ کے نام پر قرآن پاک میں سورۃ موجود ہے۔ آپ نبی نہیں تھے، بلکہ حکیم تھے عربی میں حکیم اُس شخص کو کہتے ہیں مَنِ اتَّقَنَ الْعِلْمَ وَالْعَمَلَ جَوَ عِلْمٍ اور عمل دونوں میں سچتہ ہو۔ علاج معالجہ کرنے والے کو عربی زبان میں حکیم نہیں بلکہ طبیب کہتے ہیں۔ بہر حال حکمت کا اعلیٰ ترین درجہ انبیاء علیہم السلام کو حاصل ہوتا ہے۔ اس کے علاوہ عام مخلوق میں سے اللہ تعالیٰ جس کو چاہے حکمت و دانائی میں حصہ عطا کرتا ہے۔

بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ قرآن کریم کی سمجھ بہت بڑی حکمت ہے۔ جسے اللہ تعالیٰ عطا کرے۔ حضرت علیؑ کی روایت میں آتا ہے حضور علیہ السلام نے ہمیں عام مسلمانوں سے الگ کوئی خاص چیز نہیں دی۔ اَوْفَهُمْ اَوْتِيَتْكَ رَجُلًا اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک کی سمجھ دی ہو، تو اُس سے انکار نہیں کرتے۔ یہ اللہ تعالیٰ کی خاص عنایت ہے۔ اور خاص طور پر پورے دین کا فہم اور سمجھ حکمت ہے ترمذی شریف کی روایت میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اللہ تعالیٰ نے منافق کو دو چیزوں سے محروم رکھا ہے، ایک اچھا اخلاق اور دوسرے دین کی سمجھ۔ بخاری شریف کی روایت میں حضور کا فرمان ہے مَنْ يُشِرِدِ اللّٰهُ لِبِهِ خَيْرًا لِّفَقْهِهِ فِي الدِّينِ اللہ تعالیٰ جس کے بارے میں بہتری کا ارادہ فرماتا ہے۔ اسے دین میں سمجھ عطا کرتا ہے۔ پھر جب اس سمجھ کے مطابق عمل کرتا ہے۔ تو ایسا شخص ہی حکیم کہلاتا ہے۔

اس زمانہ میں حکیم کے ہم معنی الفاظ دانشور، علامہ یا ڈاکٹر (پی ایچ ڈی) وغیرہ استعمال کیے جاتے ہیں۔ مگر یہ استعمال درست نہیں ہے۔ حکیم کے لیے ضروری ہے کہ علم کی پختگی کے ساتھ اس پر عمل بھی ہو۔ موجودہ دور میں بے شک بڑی بڑی ڈگریاں تو حاصل کر لی جاتی ہیں۔ مگر وہ عمل کہاں ہے جو حکمت کی اصل روح ہے۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے۔ رَأْسُ الْحِكْمَةِ مَخَافَةُ اللّٰهِ

حکمت کی جڑ اور بنیاد خوفِ الہی ہے۔ حکیم وہی ہو سکتا ہے۔ جس کے دل میں خوفِ خدا ہو۔ وگرنہ محض علم حاصل کرنے سے کوئی شخص حکیم نہیں ہو سکتا۔

گذشتہ درس میں گمراہ چکا ہے کہ شیطان تمہیں فقر سے ڈراتا اور بے حیائی کا حکم دیتا ہے۔ شیطان انسان کو یہ سچی پڑھاتا ہے کہ دیکھو اپنے مال کو خرچ نہ کرنا۔ اگر خرچ کر دیا تو تم مفلس ہو جاؤ گے۔ تمہارے بیوی بچے بھوکوں مر جائیں گے۔ تمہارا بڑا پے کا سہارا ختم ہو جائے گا، وغیرہ وغیرہ۔ اس شیطانی دوسرے سے وہی شخص بچ سکتا ہے جسے قرآن پاک کا فہم ہوگا۔ فہم قرآنی والا شخص ہی سچے کا کہ اتفاق فی سبیل اللہ کے لئے کم نہیں ہوگا بلکہ اللہ تعالیٰ اسیں مزید برکت دینگے اسی چیز کا نام حکمت ہے اسی طرح گو حکمت اتفاق فی سبیل اللہ پر اثر انداز نہیں ہوگا۔

فرمایا اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے حکمت عطا کرتا ہے۔ ہر آدمی حکمت حاصل نہیں کر سکتا۔ البتہ جس شخص میں جس قدر حکمت کے حصول کی استعداد ہوتی ہے۔ اس کے مطابق وہ اپنا حصہ وصول کر لیتا ہے۔ اور پھر اس کا نتیجہ نکلتا ہے وَمَنْ يُؤْتِ الْحِكْمَةَ فَقَدْ أُوتِيَ خَيْرًا كَثِيرًا جسے حکمت عطا کر دی گئی، اُسے خیر کثیر سے نوازا گیا۔ گویا حکمت یعنی فہم قرآن یا فہم دین تمام خوبیوں کا منبع ہے۔ اور فہم علم کے ذریعے حاصل ہوتا ہے۔ اور علم کی روشنی دینی مدارس پھیلا ہے ہیں۔ برصغیر میں دارالعلوم دیوبند تقریباً سو سو سال سے مصروف کار ہے۔ اس نے ایک صدی کے عرصہ میں چالیس ہزار علماء تیار کیے ہیں، جو صحیح معنوں میں دین کا فہم رکھنے والے لوگ ہیں۔ انہوں نے دنیا کے کونے کونے میں علم دین کی شمع روشن کی ہے۔ حضرت علیؑ اپنے پیٹوں کو نصیحت فرما رہے تھے۔ انہوں نے شکوے کے

طور پر فرمایا بہت سے آدمی شکل و صورت میں انسان نظر آتے ہیں مگر حقیقت میں وہ جانوروں جیسے ہیں۔ جب مال میں کمی واقع ہوتی ہے۔ تو فوراً سمجھ جاتے ہیں مگر دین سائے کا سارا بھی برباد ہو جائے تو انہیں کچھ پروا نہیں۔ حضرت شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ عقل دو قسم کی ہوتی ہے۔ ایک عقل وہ ہے جو ماہر معاشیات ہے۔ معاش میں ذرہ بھر کمی ملیشی آئے، تو فوراً سمجھ جاتے ہیں۔ مگر دین

اتفاق پر
حکمت کا اثر

حکمت منبع
حنان ہے

کے معاملے میں بڑے سے بڑا نقصان بھی انہیں اپنی طرف متوجہ نہیں کر سکتا۔ دنیا کے بڑے بڑے فلاسفروں، بیرسٹروں اور دانشوروں میں یہی خرابی پائی جاتی ہے کہ ان کی عقل معاش تو اعلیٰ سمجھے گا ہے۔ مگر وہ معاد کے معاملے میں بالکل کوڑے ہیں۔ حقیقت میں کامل شخص وہ ہے۔ جو قیامت اور اپنی بازگشت کے مقام کو سمجھتا ہے۔ بہر حال اللہ تعالیٰ نے صدقات و خیرات کے ضمن میں یہ آیات نازل فرمائی ہیں۔

گفت حکمت را خدا خیر کثیر ہر کج این خیر را بینی بیگر
اللہ تعالیٰ نے حکمت کو خیر کثیر فرمایا ہے۔ یہ جس جگہ بھی ملے اس کو اختیار کر لو، توفیق شریف کی روایت میں آئے کلمۃ الحکمة ضالة المؤمن حکمت کی بات مومن کی گم شدہ چیز ہے۔ اسے جہاں پاتا ہے۔ حاصل کر لیتا ہے۔ حکمت ہی ایسی چیز ہے۔ جو مومن کے ساتھ مناسبت رکھتی ہے۔ لہذا مومن ہمیشہ اس کا متلاشی رہتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے کسی اعلیٰ عہدہ منصب یا کسی دوسری قیمتی سے قیمتی چیز کو خیر کثیر سے تعبیر نہیں کیا۔ مگر یہ لقب صرف حکمت کو عطا ہوا، کیونکہ حکمت تمام خوبیوں کا منبع ہے۔

بعض مفسرین فرماتے ہیں کہ حکمت کی انتہا یہ ہے کہ انسان افضل الاشیا کو افضل العلوم سے معلوم کرے۔ افضل الاشیا خدا تعالیٰ کی ذات، وحدانیت اور اس کی صفات ہیں۔ لہذا جو شخص علم کے ذریعے اس راہ کو پالے گا، وہی صاحب حکمت ہو گا۔ اور پھر علم بھی محض زبانی کلامی نہ ہو، بلکہ اس میں دل کی حضوری اور عقل کا کمال شامل ہو۔ لہذا جسے حکمت عطا کی گئی اُسے گویا بہت بہتری ملے دی گئی۔ اور یہی چیز منبع صفات اور ہر چیز کی جڑ اور بنیاد ہے۔

فرمایا وَصَايَ ذِكْرِكَ اَوَّلًا لِّبَابِ يَادِرْ كَهْوِ نَصِيحَتِ قَبُولِ نَهِيں کرتے۔ مگر وہ جو عقل والے ہیں۔ اور پھر عقل کو صحیح طور پر استعمال بھی کریں۔ دوسرے مقام پر اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے اَلْقُسَمُ الْبِكُمْ اَلَّذِيْنَ لَا يَعْقِلُوْنَ وہ لوگ بہرے اور گونگے ہیں جو عقل کو درست طریقے سے استعمال نہیں کرتے

کافروں کی مثال اللہ نے بیان فرمائی کہ وہ جانوروں سے بھی بدتر ہیں "أُولَٰئِكَ كَالْأَنْعَامِ بَلْ هُمْ أَضَلُّ لَمْ يَكُونُوا نَجَسًا" جانور بھی بعض باتیں سمجھتے ہیں، مگر جو لوگ جانوروں سے بھی بدتر ہیں، وہ کچھ بھی نہیں سمجھتے۔ فرمایا نصیحت کو بھی وہی شخص قبول کرتا ہے جس کے اندر دامانی اور عقل ہوگی۔ دوسرے شخص کو نصیحت سے کچھ فائدہ نہیں پہنچتا۔

انفاق فی سبیل اللہ ہی کے ضمن میں یہاں پر نذر کا مسئلہ بیان ہو رہا ہے۔
وَمَا أَلْفَقْتُمْ مِنْ ثَفْقَةٍ أَوْ تَمْ جَوْجِبِي خَرْجٍ كَرُو كُنِي خَرْجٍ مَوْجِبٍ صَدَقَةٍ
وخیرات ہی ہے۔ اَوْ نَذَرْتُمْ مِّنْ نَّذْرٍ يٰكُوْنِي نَذْرًا لِّمَا لَللّٰهُ يَعْلَمُ
اللہ تعالیٰ اس کو جانتا ہے۔ یہاں پر نذر کو صدقہ کے مقابلے میں ذکر کیا ہے۔
مفسرین کلام فرماتے ہیں کہ اس کا معنی یہ ہے کہ صدقہ و خیرات تو بلاشبہ حنات میں سے ہے۔ مگر نذر جائز ہونے کے باوجود خطرے سے خالی نہیں۔ چنانچہ حدیث شریف میں آیا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: نذر نہ مانا کرو، کیونکہ یہ آدمی کو تقدیر سے نہیں بچا سکتی۔ حدیث کے الفاظ ہیں لَا يَعْصِي نَذْرًا عَنْ قَدَرٍ جو کچھ تقدیر میں ہوتا ہے وہ ہو کر رہتا ہے۔ حضور نے فرمایا کہ نذر بخیل لوگ مانتے ہیں، وگرنہ فیاض آدمی شرط نہیں لگاتے۔ وہ تو غیر مشروط طور پر اللہ کی راہ میں خرچ کرتے رہتے ہیں۔ گویا نذر ماننا مشروط عبادت ہے کہ اگر میرا فلاں کام ہو گیا تو میں اتنے نوافل ادا کروں گا۔ یا روزے رکھوں گا یا اتنا صدقہ خیرات کروں گا وغیرہ وغیرہ۔ یہ تو اللہ تعالیٰ کے ساتھ شرط۔۔۔ باندھنے والی بات ہے۔ اور پھر یہ ہے کہ جب وہ کام ہو جائے تو نذر کا پورا کرنا ضروری ہو جاتا ہے بشرطیکہ وہ نذر جائز ہو۔ اور اگر نذر کو پورا نہ کیا تو انسان گنہگار ہوتا ہے۔

حضور علیہ السلام کا فرمان ہے لَا نَذْرَ فِي مَعْصِيَةِ اللّٰهِ گناہ کے کام میں نذر ماننا جائز نہیں۔ اور اگر ایسا کہہ ہی لیا ہے تو پھر اس کا پورا کرنا درست نہیں بلکہ اس کو توڑ کر نذر کا کفارہ ادا کر دینا چاہیے۔ فقہ کا مسئلہ ہے النَّذْرُ عِبَادَةٌ

”منت بمنزلہ عبادت ہے۔ اور عبادت بدنی بھی ہو سکتی ہے اور مالی بھی۔ بدنی عبادت کی مثال نوافل یا روزے ہیں۔ اور مالی عبادت میں صدقہ خیرات یا جانور ذبح کرنا ہے اسی لیے فرمایا کہ گناہ کے کام کے لیے یہ عبادت جائزہ نہیں ہے۔ اور اگر نذر غیر اللہ کے تقرب کے لیے مانی جائے تو یہ شرک بن جاتا ہے۔ جیسا کہ ہماری فقہ کی کتابوں عالمگیری اور شامی وغیرہ میں موجود ہے فقہائے کرام نے لکھا ہے۔ کہ جو لوگ قبروں کا غلاف پکڑتے ہیں اور نذر دیتے ہیں۔ کہ اے بزرگ! اگر میرا فلاں کام ہو گیا، تو تمہارے دربار فلاں نذرانہ پیش کروں گا، فرمایا ایسی چیز بالاجماع باطل اور حرام ہے۔ کیونکہ نذر عبادت ہے اور عبادت صرف اللہ ہی کی ہو سکتی ہے۔ ہاں اگر ایسی منت مانے کہ اگر فلاں کام ہو گیا۔ تو اسی بزرگ کو ایصالِ ثواب کے لیے محتاجوں کی یہ خدمت کر دینا تو وہ الگ بات ہے۔ اور اگر بزرگ کو ہی حاجت روا سمجھ لیا تو کفر شرک میں مبتلا ہو گیا۔ اسی لیے امام مالکؒ اور امام شافعیؒ فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر سرے سے نذر ہوتی ہی نہیں۔ جیسے کوئی کہے کہ فلاں کام ہونے پر دس آدمیوں کو شراب پلاؤں گا۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ مزاروں پر تیل چڑھانا، موم بتیاں جلانا، چادریں چڑھانا، بجرے چڑھانا یہ سب باطل اور ناجائز منت میں شامل ہیں۔ اور اگر ایسا کرنے سے مراد بزرگ کی قربت حاصل کرنا ہے۔ تو پھر بھی شرک میں داخل ہے۔ اور اگر کوئی یہ سمجھتا ہے۔ کہ خدا کے علاوہ یہ بھی ہماری حاجات پوری کرتے ہیں، تو بھی کفر ہے۔ اور اگر محض مجاوروں کو کھانا مقصود ہے تو یہ تخصیص بھی غلط ہے۔ اپنے گلی محلے، گاؤں شہر کے غریب و مساکین، کو کھلاؤ، ان کی جائز ضروریات کا خیال رکھو۔ مزاروں پر تو عموماً ادبائش قسم کے لوگ ہوتے ہیں۔ اگر نیت درست بھی ہو، تو بھی ایسے لوگوں کو کھانا جائزہ نہیں۔ کیونکہ وہ محتاج نہیں بلکہ پیشہ ور گداگر ہیں۔ مزاروں پر موجود انتظامی عملہ بھی کھانے پینے میں شریک ہوتا ہے۔ حالانکہ وہ بھی اس کے حقدار نہیں ہوتے اگر صاحبِ نصاب ہے تو منت کا مال تو خود منت ماننے والا بھی نہیں کھا سکتا۔ جس طرح زکوٰۃ کے حقدار، صرف اس کے مستحقین ہیں۔ اسی طرح نذر کا مال بھی

غزباد مساکین کا حق ہے۔ لہذا نذر کا مال قبروں کے مجاوروں اور دیگر لواحقین کو کھانا کسی طور جائز نہیں۔

سابع امام ابو حنیفہؒ اور امام احمدؒ فرماتے ہیں کہ معصیت کی نذر بطور نذر تو ہو جاتی ہے مگر اس کو توڑنا ضروری ہے۔ حدیث شریف کے الفاظ ہیں کَفَّارَةٌ كَفَّارَةٌ الْيَمِينِ اس قسم کی نذر کو توڑ کر اس کا کفارہ ادا کر دو مگر معصیت کی نذر کو پورا نہ کر۔ نذر کا کفارہ بھی وہی ہے جو قسم کا کفارہ ہے یعنی دس میکنوں کو کھانا کھلانا یا کپڑے پہنانا۔ ایک غلام آزاد کرنا، یا تین روزے رکھنا۔ ہاں اگر نذر جائز ہے تو اس کو پورا کرنا چاہیے۔ جیسے مسجد میں چٹائیاں بچھا دے۔ طالب علموں کو کھانا کھلا دے۔ ان کی کتب کا بند و بست کر دے وغیرہ وغیرہ۔

بہر حال اللہ تعالیٰ نے فرمایا، کہ تم جو بھی نذر مانو فَإِنَّ اللَّهَ يَعْلَمُ تَوَلَّى اللہ تعالیٰ اس کو خوب جانتا ہے۔ کہ تم نے کس نیت کے ساتھ منت مانی ہے نذر جائز ہے یا ناجائز۔ تم لوگوں کو دھوکا دے سکتے ہو۔ کہ فلاں کام فلاں نیت سے کیا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ تو تمہارے دلوں کے رازوں سے واقف ہے۔ وہ تمہاری ظاہر اور پوشیدہ سب باتوں کو جانتا ہے۔

ظالم بے یار
مددگار ہونگے

وَمَا لِلظَّالِمِينَ مِنْ أَنْصَارٍ ظالموں کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ شرک سب سے بڑا ظلم ہے۔ لہذا جو کوئی شرک کا ارتکاب کرنا ہے۔ کفر کرنا ہے۔ غیر اللہ کی منت ماننا ہے۔ مستحقین کو نظر انداز کرنا ہے۔ کسی قسم کی زیادتی کرنا ہے۔ حق تلفی کا مرتکب ہونا ہے۔ غرضیکہ جو بھی کوئی بڑے سے بڑا یا چھوٹے سے چھوٹا ظلم کرے گا، وہ مدد کے قابل نہیں ہے۔ اس کا کوئی مددگار نہیں ہوگا۔ جو شخص نماز نہیں پڑھتا، جنابت کی حالت میں غسل نہیں کرتا، روزہ نہیں رکھتا، گویا اپنے آپ پر ظلم کر رہا ہے۔ استطاعت کے باوجود حج نہ کرنا، فرائض کو ترک کرنا، کسی کو تنگ کرنا یہ سب ظلم میں شمار ہوتا ہے۔ حضور علیہ السلام کا دشواد ہے الظلم ظلمات یوم القيامة قیامت کے روز اس دنیا میں کیا ہوا ظلم اندھیروں کی صورت

میں سامنے آئے گا اس لیے فرمایا اس دن ظلم کرنے والوں کا کوئی یار و مددگار نہیں ہوگا
 ظالم اپنے ظلم کی وجہ سے پھنسنے ہوئے ہوں گے مگر ان کی خلاصی کے لیے کوئی مدد
 نہیں پہنچے گی۔ لہذا انسان کو چاہیے کہ نہ عبادت میں ظلم کا ارتکاب کرے نہ معاملات
 میں اور نہ حقوق میں غرض کسی چیز میں ظلم نہیں کرنا چاہیے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۲

الْبَقَرَةُ ۲

درس یکمہ نورزدہ (۱۱۹)

آیت ۲۴۱ تا ۲۴۲

اِنْ تَبَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ ۚ وَاِنْ تُخْفَوْهَا وَلُوْا تُوْهَا
 الْفُقَرَاءُ فَهِيَ خَيْرٌ لَّكُمْ وَيُكَفِّرُ عَنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ
 وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ ﴿۲۴۱﴾ لَيْسَ عَلَيْكَ هُدُومٌ وَلٰكِنَّ
 اللَّهَ يَهْدِي مَنْ يَّشَاءُ ۖ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَلَا يُنْفِكُمْ
 وَمَا تُنْفِقُونَ اِلَّا اَبْتِغَاءَ وَجْهِ اللَّهِ ۖ وَمَا تُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ
 يُّؤْتِ الْيَتَامَىٰ وَانْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ ﴿۲۴۲﴾

ترجمہ: اگر تم صدقات کو ظاہر نہ کرو تو یہ اچھی بات ہے۔ اور اگر ان کو چھپا دو اور
 (پوشیدہ طور پر) فقر کو ملے دو، تو یہ تمہارے لیے بہت بہتر ہے۔ اور اللہ تعالیٰ
 تم سے برائیاں دُور کرے گا، اور اللہ تعالیٰ جو کچھ تم کرتے ہو، اس کی خبر رکھتا ہے ﴿۲۴۱﴾
 آپ کے ذمے نہیں ہے ان لوگوں کو راہِ راست پر لانا۔ مگر اللہ راہِ راست پر لاتا ہے
 جس کو چاہے۔ اور جو کچھ اپنے مال سے خرچ کرتے ہو، وہ تمہارے نفسوں کے
 لیے ہے۔ اور تم نہیں خرچ کرتے مگر اللہ کی رضا کے لیے۔ اور جو کچھ بھی تم مال
 سے خرچ کر دو گے۔ تم کو اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا اور تم پر ظلم نہیں کیا جائیگا ﴿۲۴۲﴾

اس سے پہلے ذکر ہو چکا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ان آیات میں صدقاتِ خیرات
 کے متعلق سات اصول بیان کیے ہیں جن میں سے چار کا ذکر گذشتہ آیات میں آچکا
 ہے۔ آج کے درس میں پانچویں بات کا بیان ہے کہ صدقات و خیرات ظاہری
 طور پر بھی ادا کیا جاسکتا ہے۔ اور باطنی پوشیدہ طور پر بھی۔ تاہم خفیہ طور پر دینا زیادہ
 بہتر ہے۔ اس کے بعد چھٹی بات کا ذکر ہے کہ صدقہ و خیرات غیر مسلم کو بھی
 دیا جاسکتا ہے۔ ساتویں بات کا ذکر آئندہ درس میں آئے گا۔

ربط آیات

مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ صدقہ خیرات سے متعلق سب سے اہم چیز دینے والے کی نیت ہے اگرچہ الخواتم نیت میں فتور آئی ہے کسی کو احسان جتلانے یا ایذا پہنچانے کے لیے یا ریاکاری کے طور پر دیا۔ تو صدقہ باطل ہو جائے گا۔ تاہم نیک نیتی کے ساتھ ظاہر یا باطناً دونوں طرح دینا جائز ہے۔ البتہ اس کی افضلیت کے متعلق فقہائے کرام میں اختلاف پایا جاتا ہے۔ رئیس المفسرین حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ فرض صدقات یعنی زکوٰۃ اور عشر کو ظاہر کر کے دینا چاہیے۔ اور نفلی صدقات کو پوشیدہ طور پر دینا بہتر ہے۔ برخلاف اس کے امام حسن بصریؒ، امام رازیؒ، مولانا شاہ شرف علی تھانیؒ اور بعض دیگر مفسرین فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے صدقات کی پوشیدہ طور پر ادائیگی کو افضل فرمایا ہے۔ خواہ وہ صدقہ فرض ہو یا نفلی بمفسرین کرام فرماتے ہیں کہ افضلیت اس بنا پر ہے کہ خفیہ دینے سے ایک تو ریا کا امکان باقی نہیں رہتا دوسرے لینے والے کی عزت نفس مجروح نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ نے اسے بہتر قرار دیا ہے۔

بعض اوقات کسی شخص کے مال کو ظاہر نہ کرنے میں بھی مصلحت ہوتی ہے۔ اگر زکوٰۃ ظاہر کر کے دی جائے تو کل مال کا علم ہو جاتا ہے۔ لہذا اس لحاظ سے خفیہ دینا بہتر ہے۔ البتہ ظاہر کر کے دینے میں ایک مصلحت بھی ہے کہ دیکھنے والے کو بھی شوق پیدا ہو کہ وہ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرے۔ اگر اس نیت سے کھلے طور پر صدقہ خیرات کرے تو یہ مناسب ہو گا۔ بایں ہمہ اکثر مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کی راہ میں خفیہ طور پر خرچ کرنا افضل ہے۔ اس کی تصدیق صحیحین کی روایت سے بھی ہوتی ہے۔ جن سات آدمیوں کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا کہ قیامت کے دن ان کو رب العزت کے عرش کے نیچے جگہ ملے گی، اُن میں سے ایک آدمی وہ ہے **تَصَدَّقَ بِمِمْبِنِهِ حَتَّى لَا تَعْلَمُوا شِمَالَهُ** کہ دائیں ہاتھ سے صدقہ کرتا ہے مگر بائیں ہاتھ کو خبر نہیں ہوتی۔ اس قدر خفیہ طور پر خرچ کرتا ہے۔

الغرض فرمایا **اِنْ تَبَدُّوا الصَّدَقَاتِ فَنِعِمَّا هِيَ**، اگر تم صدقات

کو ظاہر کر دے تو یہ اچھی بات ہے۔ کہ اس میں اقتدار کا پہلو ٹھکاتا ہے، کہ اس کو دیکھ کر دوسرا بھی اتفاق فی سبیل اللہ کے لیے تیار ہو جائے اور اگر زکوٰۃ ادا نہیں کرتا تو کرنے لگ جائے۔ اس کے علاوہ ایسا شخص لوگوں کی طعن و تشنیع سے بھی بچ جائیگا۔ جب وہ لوگوں کے سامنے صدقہ خیرات کرے گا، تو کنجوس کہلوانے سے بچ جائے گا۔ وَلَا تَخْفَوْهَا وَتَوَّ تَوْهَا الْفُقَرَاءُ اور اگر تم اسے چھپاؤ اور فقر اکوڑے دور فہو خیر لکم تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے کہ اس سے نہ تو ریا کاری لازم آئے گی اور نہ لینے والے کی عزت نفس مجروح ہوگی۔ پھر صدقہ و خیرات کی حکمت بھی اللہ تعالیٰ نے بیان فرمائی۔ وَيَكْفُرْ عَنْكُمْ مِّنْ سَيِّئَاتِكُمْ اس وجہ سے اللہ تعالیٰ تمہاری کچھ برائیاں تم سے دور کر دیگا۔ تمہارے بعض گناہ معاف کر دیگا۔ کیونکہ سارے گناہ صدقہ سے معاف نہیں ہوتے حدیث شریف میں آتے ہیں إِنَّ الصَّدَقَةَ لَتُطْفِئُ غَضَبَ الرَّبِّ صدقہ و خیرات اللہ تعالیٰ کے غصہ کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ جب کوئی انسان گناہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ تو اللہ تعالیٰ اس پر ناراض ہو جاتا ہے۔ احسان جتلانے والے کے متعلق آتا ہے کہ اللہ تعالیٰ کے غضب کی یہ حالت ہوتی ہے کہ قیامت کے دن اللہ ایسے شخص کو نظر شفقت سے نہیں دیکھے گا۔ اور عذاب الیم میں ڈالے گا۔ مگر صدقہ و خیرات اللہ تعالیٰ کے غیظ و غضب کو ٹھنڈا کرتے ہیں۔ بسند احمد میں نبی علیہ السلام کا یہ فرمان بھی موجود ہے۔ إِنَّ الصَّدَقَةَ ظِلُّ الْمُؤْمِنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قیامت کے دن صدقہ مؤمن کے حق میں بمنزلہ سایہ کے ہوگا۔ جب میدان محشر میں انتہا درجے کی تپش ہوگی اس وقت صدقہ اپنے دینے والے کے سر پر سایہ کرے گا۔ صدقہ و خیرات کی اس قدر فضیلت ہے۔ اور اس کی اس قدر برکات ہیں۔ واللہ بِمَا تَعْمَلُونَ خَبِيرٌ اللہ تعالیٰ کو تمہارے تمام اعمال کی خبر ہے۔ وہ خوب جانتا ہے۔ کہ تم جو کچھ کر رہے ہو۔ اس کے پیچھے کیا نیت کا رہا ہے۔ پھر جیسی نیت ہوگی۔ اسی کے مطابق اللہ تعالیٰ بدلہ عطا کرے گا۔ بہر حال صدقہ سے متعلق

یہ پانچویں بات بھی آگئی۔

غیر مسلم کے
لیے صدقہ

میں رسول پر یہ ہوتا ہے کہ کیا صدقہ خیرات غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے یا نہیں۔ یہ اس ضمن میں چھٹی بات ہے۔ اس کے متعلق عرض ہے کہ اسلام کے ابتدائی دور میں حضور علیہ السلام نے صرف مسلمانوں کو صدقہ خیرات دینے کا حکم دیا تھا۔ حدیث شریف میں مختلف الفاظ آتے ہیں مثلاً آپ نے فرمایا تَصَدَّقُوا عَلَىٰ أَهْلِ دِينِكُمْ یعنی صرف اہل دین (مسلمانوں) پر صدقہ کیا کرو۔ آپ کا یہ بھی ارشاد ہے لَا تَصَدَّقُوا إِلَّا عَلَىٰ أَهْلِ الْإِسْلَامِ یعنی اہل اسلام کے سوا دوسروں (غیر مسلموں) پر صدقہ نہ کیا کرو۔ اس لیے آپ کے صحابہ کرام غیر مسلموں کو صدقہ دینے سے گریز کرتے تھے۔ پھر جب سترہ میں کفار مکہ سے صلح کا معاہدہ ہو گیا۔ تو مکے اور مدینے والے ایک دوسرے کے ہاں آنے جانے لگے۔ اس دوران میں حضرت اسماءؓ کی والدہ اور حضرت ابوجبر صدیقؓ کی بیوی جو کہ ابھی تک مشرک تھیں مدینے آئی۔ تو حضرت اسماءؓ نے حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضور! میری ماں آئی ہے۔ وہ بھی مشرک ہے اور وہ مشرک ہے۔ تو کیا ایسی حالت میں میں اس سے صلہ رحمی کروں۔ وہ محتاج بھی ہے۔ کیا میں اس کو کچھ صدقہ و خیرات دے سکتی ہوں۔ آپ نے فرمایا، ہاں اجازت ہے۔ تو گویا اللہ کے رسول نے غیر مسلموں کو صدقہ خیرات دینے کی اجازت دے دی۔ لہذا ثابت ہوا کہ صدقہ کا مال غیر مسلموں کو دیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ اس پر بھی اجر عطا کرے گا۔ یاد ہے کہ حضرت ابوجبر صدیقؓ کی بیوی ام رومانؓ تو شروع ہی سے اسلام لے آئی تھیں مگر آپ کی دوسری بیوی یعنی اسماءؓ کی والدہ قبیلہ بنت عبد العزیٰ اسلام نہیں لائی تھیں۔

البتہ زکوٰۃ اور عشر غیر مسلموں کو نہیں دیا جاسکتا۔ کیونکہ یہ فرض ہے۔ اور اس کے متعلق بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ کہ جب حضور علیہ السلام نے حضرت معاذؓ کو یمن کا گورنر بنا کر بھیجا، تو دیگر احکامات کے ساتھ زکوٰۃ کا حکم بھی دیا اور واضح کیا ثَوَخَذُوا مِنْ أَغْنِيَاؤِهِمْ فَتَوَدَّ عَلَىٰ فَقَرَاءِهِمْ (فیاض) کے تفسیر کبیر ص ۸۲

یعنی زکوٰۃ مسلمانوں کے اختیار سے وصول کی جائیگی اور انہیں کے فقرا میں تقسیم کی جائے گی۔ جس سے صاف ظاہر ہے۔ کہ زکوٰۃ و عشر کسی غیر مسلم کو نہیں دیا جاسکتا۔ یہ ناجائز اور حرام ہے۔ ہاں نفل صدقہ، صدقہ فطر کفارہ کا صدقہ جیسے نذر، قسم یا ظہار کا کفارہ ہے، وہ بھی غیر مسلم کو دیا جاسکتا ہے بشرطیکہ وہ محتاج ہو۔

حربی غیر مسلم
محرّم ہے

یہاں پر اس بات کی وضاحت ضروری ہے۔ کہ صدقہ وغیرہ فرمی غیر مسلم کو تو دیا جاسکتا ہے۔ مگر حربی کافر، مشرک وغیرہ کو دینا جائز نہیں۔ یعنی ایسے غیر مسلم جو اہل اسلام کے ساتھ برسر پیکار ہوں، وہ اگر محتاج بھی ہوں تو وہ صدقہ کے حق دار نہیں ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے سورۃ ممتحنہ میں اس کی تفصیل بیان فرمائی ہے: "لَا يَنْهٰكُمُ اللّٰهُ عَنِ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا تَلُوْكُمْ فِي الدِّيْنِ وَلَمْ يُخْرِجُوْكُمْ مِّنْ دِيَارِكُمْ اَنْ تَبْكُوْهُمْ" یعنی جو لوگ تم سے لڑائی نہیں کرتے اور تمہیں تمہارے گھروں سے نہیں نکالتے ان کے ساتھ ملٹی اور احسان کرنے سے اللہ تعالیٰ تمہیں منع نہیں کرتے۔ البتہ اللہ تعالیٰ ایسے لوگوں کے ساتھ دوستی کرنے سے منع فرماتے ہیں۔ جو تم سے لڑائی لڑیں اور تمہیں گھروں سے نکال دیں۔ اور جو کوئی ایسے لوگوں سے راہ و رسم بڑھائیگا۔ تو ان کا شمار ظالموں میں ہوگا جہاں تک کفار کو راہ راست پر لانے کا تعلق ہے۔ تو یہ صرف اور صرف منشاء

ہدایت ہندہ
صرف اللہ ہے

ایزدی پر منحصر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا واضح ارشاد ہے۔ اے پیغمبر علیہ السلام لَيْسَ عَلَيْكَ هٰذَا هَمٌّ اَيے لوگوں کو ہدایت دینا آپ کے ذمے نہیں ہے۔ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ ۗ وَلَا يَهْدِيْ مَنْ يَّشَاءُ ۗ جیسے اللہ تعالیٰ چاہے ہدایت دیدے۔ یہ سراسر اللہ جل شانہ کے اختیار میں ہے۔ حضور علیہ السلام کے چچا ابوطالب نے آپ کی بڑھی خدمت کی۔ ہر مشکل وقت میں آپ کے شانہ بشانہ کھڑے ہوئے۔ مگر حضور کی انتہائی خواہش کے باوجود ابوطالب کو ایمان نصیب نہ ہوا۔ اور وہ کفر کی حالت میں مرا۔ حضور علیہ السلام کو اس بات کا بڑا افسوس تھا۔ مگر اس معاملہ میں آپ بھی مجبور تھے۔ کہ ہدایت تو صرف اللہ تعالیٰ کے ہاتھ میں ہے۔ ابوطالب کے فرزند حضرت علیؑ کم سنی میں ایمان

سے شرف ہو جاتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے داماد، جلیل القدر صحابہ اور خلفائے راشدینؓ میں سے ہیں۔ مگر باپ کو کلمہ نصیب نہیں ہوا۔ کیونکہ وَلَٰكِنَّ اللّٰهَ يَهْدِي مَن يَّشَاءُ دُورًا مَّوْجِبِينَ گیارہوں آتا ہے اَفَلَا نَتَنَكَّرُ النَّاسَ حَتّٰى يَكُوْنُوْا مُؤْمِنِيْنَ گیارہوں کو مجبور کر دیں گے کہ وہ ضرور ہی ایمان لے آئیں۔ بلکہ فَاِنَّمَا عَلَيْكَ الْبَلَاغُ وَعَلَيْكُمَا الْحِسَابُ آپ کے ذمے دین کو پہنچانا ہے۔ آپ سے یہ نہیں پوچھا جائیگا کہ یہ لوگ کیوں ایمان نہیں لائے۔ حساب تو ہمارے ذمے ہے۔

پورا پورا بدلہ

فرمایا وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ فَلَا نَنْفُسِكُمْ اور تم جو کچھ بھی اللہ کی راہ میں خرچ کرتے ہو، یہ تمہارے اپنے ہی فائدے کے لیے ہے۔ اللہ تعالیٰ کو تمہارے مالوں کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تمہیں اجر عطا کرے گا۔ اللہ تعالیٰ تمہارے دلوں میں بنی نفع انسان کے لیے ہمدردی پیدا کرنا چاہتا ہے۔ اور تمہیں اجر و ثواب سے نوازا جاتا ہے۔ وَمَا تُنْفِقُوْنَ اِلَّا اِبْتِغَاءَ وَجْهِ اللّٰهِ اور تم نہیں خرچ کرتے مگر محض رضا الہی کے لیے۔ اس میں کوئی دیگر مقصد نہیں ہے۔ اگر کوئی دوسرا مقصد ہوگا مثلاً کوئی اپنا مفاد و البتہ ہو۔ ریاکاری پائی جائے یا کسی کو ایذا دینا مقصود ہو تو ایسی صورت میں صدقہ ضائع ہو جائے گا۔ لہذا محض اللہ کی رضا کے لیے صدقہ و خیرات کرنا چاہیئے۔ اس کی مخلوق کے ساتھ احسان کرنا چاہیئے۔ محتاجوں کی حاجت براری کرنی چاہیئے۔ یہ سب رضا الہی کے ذرائع ہیں۔

وَمَا تُنْفِقُوْا مِنْ خَيْرٍ اور تم جو بھی خرچ کرو گے، نیکی کرو گے، کسی کے ساتھ بھلائی کرو گے۔ يُؤْتِ اِلَيْكُمْ اس کا پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ ایسی بات نہیں ہے کہ مسلمان محتاج کو دینے سے پورا اجر ملے اور کافر کو دینے سے کم ملے۔ بلکہ پورا بدلہ دیا جائیگا۔ اس بات میں کسی قسم کا شبہ نہیں ہونا چاہیئے خالص نیت کے ساتھ جو بھی خرچ کیا جائیگا، اللہ تعالیٰ اس کے عوض میں بڑھا چڑھا کر دیں گے۔ البتہ فضیلت اس بات میں ہے کہ محتاجوں میں سے بہتر محتاج

کو دیا جائے۔ مثلاً ایک نمازی ہے اور دوسرا بے نماز ہے۔ تو نمازی کو دینا زیادہ اجر و ثواب کا موجب ہے۔ مگر جہاں مجبوری کا معاملہ ہو۔ وہاں کم تر آدمی کو بھی دینا چاہیے۔ اگر کوئی بے نمازی بھوکا رہا ہے۔ تو اسے پہلے دینا چاہیے۔ اللہ تعالیٰ ہر نیکی کا پورا پورا بدلہ دے گا۔ وَأَنْتُمْ لَا تَظْلَمُونَ اور کسی شخص پر ذرہ بھر زیادتی نہیں کی جائے گی۔ اللہ تعالیٰ کسی کی حق تلفی نہیں کرتا۔ کسی کی نیکی کو ضائع نہیں کرتا۔ یہ تو اس کے قانون کے خلاف ہے۔ کہ کسی ادنیٰ سے ادنیٰ نیکی کو بھی نظر انداز کر دے۔

الْبَقَرَةُ ۲

آیت ۲۷۳

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس یکھدبت (۱۲۰)

لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أُحْصِرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا
فِي الْأَرْضِ يَحْسِبُهُمُ الْجَاهِلُ أَغْنِيَاءَ مِنَ التَّعَفُّفِ ۚ
تَعْرِفُهُمْ بِسِيمَاهُمْ ۚ لَا يَسْأَلُونَ النَّاسَ إِلْفًا وَمَا
يُنْفِقُوا مِنْ خَيْرٍ فَإِنَّ اللَّهَ بِهِ عَلِيمٌ ۙ

تِلْكَ الرُّسُلُ

ترجمہ: (صدقات و خیرات) اُن فقراء کے لیے ہیں جنہیں روک دیا گیا ہے۔ اللہ کے
راستے میں۔ وہ زمین میں سفر کرنے کی طاقت نہیں رکھتے۔ انہیں نادانقت آدمی، لالہ لگان
کہتا ہے۔ سوال سے بچنے کی۔ وہ لوگوں سے لجاجت کے ساتھ سوال نہیں کرتے۔ اور تم مال سے جو کچھ بھی خرچ کرو

اللہ تعالیٰ اس کو جاننے والا ہے (۲۷۳)

رہنمائیات

صدقہ و خیرات سے متعلق اس سے پہلے چھ باتیں بیان ہو چکی ہیں۔ آج کے
درس میں ساتویں اور آخری بات کا بیان ہے۔ جیسا کہ گذشتہ دروس میں ذکر آپکا ہے۔ اتفاق
فی سبیل اللہ کے سلسلے میں پہلی بات یہ ہے کہ صدقہ و خیرات دیکر احسان نہ جتلاؤ، دوسری
بات یہ ہے کہ جس کو صدقہ دیا ہے اس کو ایذا نہ پہنچاؤ۔ تیسری بات یہ ہے کہ اس
کام میں ریاکاری کو دخل نہ ہو، چوتھی شرط یہ ہے کہ پاکیزہ مال اور اعلیٰ چیز صدقہ میں دی
جائے، پانچویں یہ کہ صدقہ کھلے طور پر بھی دیا جاسکتا ہے، اور پوشیدہ طور پر بھی بشرطیکہ
نیت درست ہو یعنی اتفاق محض رضا الہی کے لیے ہو، چھٹی بات یہ ہے کہ صدقہ
غیر مسلم مستحق کو بھی دیا جاسکتا ہے۔ یہ صرف مسلمان تک محدود نہیں۔ کیونکہ ہدایت مبینہ
کا اختیار صرف اللہ کے پاس ہے، وہ جسے چاہے ہدایت سے نوازے۔ ہاں
حربی کافر صدقے کا مستحق نہیں، اس کا ذمی ہونا ضروری ہے۔ البتہ عشر اور زکوٰۃ
جو فرض میں سے ہیں، وہ خالص مسلمانوں کے لیے وقف ہیں۔ لہذا کسی قسم کے

غیر مسلم کو نہیں دیے جاسکتے۔

فقیر اور مسکین

آج کے درس میں ساتویں اور آخری بات یہ ہے کہ صدقات و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق کون لوگ ہیں۔ چنانچہ ارشاد ہوتا ہے کہ صدقات لِلْفُقَرَاءِ فقیروں کے لیے ہیں۔ لفظ فقیر اصل میں فقار سے مشتق ہے۔ اور فقار ایسے معذور شخص کو کہتے ہیں جس کا کمرہ ٹوٹا ہوا ہو، اور وہ چلنے پھرنے سے عاجز ہو۔ اسی مناسبت سے عام اصطلاح میں فقیر سے مراد وہ شخص ہے، جو اپنی جائز ضروریات زندگی پورا کرنے کے لیے دوسروں کا محتاج ہو۔ ایسے محتاجوں کا ذکر سورۃ محشر اور دیگر کئی صورتوں میں آتا ہے۔ سورۃ توبہ میں زکوٰۃ کے آٹھ مصارف بیان کیے گئے ہیں جن میں فقراء اور مسکین سب سے پہلے آتے ہیں۔ فقہائے کرام نے فقیر اور مسکین کی مختلف تعریفیں کی ہیں۔ بعض کہتے ہیں کہ فقیر زیادہ مستحق ہے اور بعض مسکین کو پہلے نمبر پر لاتے ہیں۔ تاہم ان کی عام تعریف کے مطابق فقیر وہ ہے جس کے پاس بالکل کچھ نہ ہو اور مسکین وہ ہے جس کے پاس کچھ ہو مگر وہ اسکی جائز ضروریات کے لیے کافی ہو۔ اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے صرف فقیر کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس سے بھی معلوم ہوتا ہے کہ صدقات و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق فقراء ہیں۔ جن کے پاس ضروریات زندگی کے لیے کچھ بھی نہیں۔ لہذا اللہ تعالیٰ نے ان پر خرچ کرنے کا حکم دیا ہے۔

مخصوص فقراء

آیت زہد درس میں فقراء میں سے اُن خاص فقراء پر خرچ کرنے کی ترغیب دی گئی ہے۔ جو روک دیے گئے ہوں۔ یعنی محصور ہو کر رہ گئے ہیں۔ لِلْفُقَرَاءِ الَّذِينَ أَحْصَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ صدقات اُن فقراء کے لیے ہیں۔ جو اللہ کے راستے میں روک دیے گئے ہیں۔ لَا يَسْتَطِيعُونَ ضَرْبًا فِي الْأَرْضِ اور زمین میں سفر کر کے نیکی طاعت نہیں رکھتے۔ ایک مقام پر پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔ احصار کا معنی ہے روک دینا، جیسا کہ حج کے احکام میں اللہ تعالیٰ نے بیان فرمایا کہ جو لوگ حج یا عمرہ کے ارادہ سے نکلیں پھر راستہ میں روک دیے جائیں۔ احرام باندھ چکے ہیں۔ مگر دشمن نے راستہ روک دیا ہے یا کوئی بیمار ہو گیا، کوئی حادثہ پیش آ گیا ہے، تو محصور شخص کو چاہیے کہ وہ قربانی کا جانور دوسرے

شخص کے ہاتھ بھیج دے جسے حرم شریف میں جا کر ذبح کر دیا جائے۔ اہم ابو حنیفہؒ کے فتویٰ کے مطابق ایسی صورت میں محرم احرام کھول دیکھا۔ اور پھر آئندہ موقع پر حج یا عمرہ جیسی بھی صورت ہو اسکی قضا دیکھا۔ یہاں پر بھی اللہ تعالیٰ نے فرمایا ہے کہ صدقہ و خیرات اُن لوگوں کا حق ہے۔ جو اللہ کے راستے میں روک دیے گئے ہیں۔ اور سفر کی طاقت نہیں رکھتے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ اللہ کے راستے میں روک دیے جانے والے لوگوں میں دو قسم کے لوگ شمار ہوتے ہیں۔ فی سبیل اللہ سے عموماً جہاد مراد لیا جاتا ہے۔ لہذا مطلب یہ ہو گا کہ جو لوگ اس قدر نادار ہیں کہ جہاد پر محض اس لیے نہیں جاسکتے کہ انہیں ضروریات زندگی کے لیے محنت مزدوری کرنا ہوتی ہے۔ اگر جہاد پر چلے جائیں تو پیچھے ان کے بچوں کی کفالت ممکن نہیں اور اگر کاروبار میں لگے رہتے ہیں تو جہاد پر نہیں جاسکتے اس طرح وہ جہاد پر جانے سے روک دیے جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ایسے لوگ صدقہ و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں۔ اگر ان کی اعانت کر دی جائے، تو جہاد کے فریضہ پر جاتے وقت وہ گھر کی کفالت سے بھی بے فکر ہو جائیں گے۔ اُن پر خرچ کرنا گویا جہاد کے رستے میں حائل رکاوٹ کو دور کرنا ہے۔

محمودین کی دوسری قسم میں وہ لوگ آتے ہیں جو دینی تعلیم حاصل کرتے ہیں۔ حصول تعلیم کے لیے وہ مدرسہ میں پابند ہو کر رہ گئے ہیں۔ لہذا دیگر کام کاج کرنے سے عاجز ہیں۔ اگر وہ حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ دیگر کاروبار بھی کرنا چاہیں۔ تو ظاہر ہے کسی ایک کام کی طرف بھی پوری توجہ نہیں دے سکیں گے۔ گزر اوقات کے لیے محنت، مزدوری، ملازمت، کاروبار، کھیتی باڑی وغیرہ ہر کام کے لیے پوری توجہ اور محنت کی ضرورت ہے۔ اسی طرح دینی تعلیم کے لیے بھی پورا وقت درکار ہے جب تک پورا وقت نہیں دے گا، نہ قرآن پاک یاد کر سکتا ہے۔ نہ قرآن، حدیث اور فقہ کی تعلیم حاصل کر سکتا ہے۔ ہر وقتی سے دونوں کام ادا ہو سکتے رہ جائیں گے، اور طالب علم کسی کام میں بھی کامل نہیں ہو سکے گا۔ بلکہ بعض اوقات اس طرح کا کام نقصان کا باعث بن جاتا ہے۔ "نیم حکیم خطرہ جان اور نیم ملا خطرہ ایمان" ایک مشہور مقولہ ہے

ناقص التعلیم شخص گمراہی پھیلا کر نقصان کا باعث ہی ہوگا۔ لہذا جو شخص دینی تعلیم حاصل کرنا چاہے اُسے دیگر ضروریات سے بے نیاز بنانے کے لیے اُن پر خرچ کرنا ہوگا۔ مولانا اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں۔ کہ اس دور میں صدقہ و خیرات کے سب سے زیادہ مستحق یہی لوگ ہیں۔ آپ فرماتے ہیں۔ کہ بعض لوگ اعتراض کرتے ہیں۔ کہ دین حاصل کرنے والے لوگ ننھے ہوتے ہیں۔ یہ کوئی دوسرا کام کاج نہیں کر سکتے۔ اس کا جواب خود اللہ تعالیٰ نے دیا ہے کہ یہ لوگ اُحْصِیْ وَاِیْنَ سَبَّیْلَ اللّٰهِ اللہ کے راستے میں روک دیے گئے ہیں انہیں مدرسوں میں دینی تعلیم کے لیے پابند کر دیا گیا ہے۔ دیگر کاروبار کرنے سے ان کی تعلیم اور صوری رہ جائیگی۔ لہذا یہ لوگ تمہارے صدقات و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں فرمایا مستحق فقرا کی ایک پہچان تو یہ ہے یَحْسَبُهُمُ الْجَاهِلُ اَغْنِیَا مِنْ التَّعَفُّفِ ناواقف لوگ ایسے مستحقین کو مالدار سمجھتے ہیں محض اس وجہ سے کہ وہ سوال نہیں کرتے۔ حالانکہ وہ اعانت کے مستحق ہیں۔ ایسے لوگوں کی مثال اصحاب صفہ کی ہے حضور علیہ السلام کی مسجد سے قریب ایک چوڑا تھا، اور پکھور کے پتوں کی چھت بچتی۔ اس مقام پر ایسے لوگ جمع رہتے تھے۔ جنہوں نے اپنی زندگیاں دین کے لیے وقف کر رکھی تھیں۔ بعض اوقات چار چار سو آدمی بھی اکٹھے ہو جاتے تھے۔ حضور علیہ السلام سے تعلیم حاصل کرتے تھے۔ اور جہاد میں جانے کی ضرورت پڑتی تو دھڑ چل دیتے۔ کوئی کاروبار نہ کرتے تھے۔ مگر مستحق ہونے کے باوجود سوال نہیں کرتے تھے حضرت قبیصہؓ نے حضور علیہ السلام کی خدمت میں عرض کیا۔ حضرت! میں بہت مفروض ہو گیا ہوں، میری مدد فرمائیں یعنی زکوٰۃ و صدقات میں سے کچھ دلا دیں آپ نے فرمایا۔ کہ اس وقت تو ہمارے پاس کچھ نہیں۔ البتہ تم رک جاؤ، جب کوئی چیز میسر آئیگی، تو تمہارے معاملے پر غور کریں گے۔ پھر آپ نے فرمایا قبیصہ اِنَّ الْمَسْئَلَةَ لَا تَحُلْ یعنی اے قبیصہ! سوال کتنا حلال نہیں۔ سوائے تین قسم کے آدمیوں کے۔ اول وہ شخص جو ایسے فقیر میں مبتلا ہو جائے۔ کہ مٹی میں مل جائے یعنی اس کے پاس کوئی چیز باقی نہ ہے۔ دوسرا وہ شخص جس پر کوئی تاوان پڑ جائے یا

قرضہ دینا ہے۔ اور تیسرہ شخص جس کی قوم کے تین عقل مند آدمی گواہی دیں کہ واقعی یہ شخص بڑا نادار ہے۔ فاقہ کشی کر رہا ہے۔ اور اس کے پاس کچھ نہیں۔ فرمایا ان تین شخصوں کے علاوہ جو کوئی سوال کرتا ہے، وہ حرام کھاتا ہے۔ اس کے لیے سوال کرنا جائز نہیں۔ حضور علیہ السلام نے یہ بھی ارشاد فرمایا کہ جس شخص کے پاس مال موجود ہو۔ اس کے باوجود وہ سوال کرے، تو ایسا شخص قیامت کے دن اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں اس حالت میں پیش ہوگا کہ اُس کے چہرے پر گورشت ہی نہیں ہوگا۔

اہم ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ جس شخص کے پاس خوراک، لباس اور ہنسنے کے لیے مکان کے علاوہ دوسرے درہم کی مقدار میں مال موجود ہو، وہ صاحب نصاب بن جاتا ہے۔ ایسے شخص کے لیے سوال کرنا حلال نہیں ہے۔ اہم مالکؒ فرماتے ہیں جس کے پاس چالیس درہم ہوں، وہ بھی سوال نہیں کر سکتا۔ اہم سفیان ثوریؒ پچاس درہم کے مقدار بتاتے ہیں حتیٰ کہ ایک اور حدیث میں حضور علیہ السلام کا یہ فرمان بھی ہے کہ جس شخص کے پاس دو وقت کا کھانا موجود ہو، اس کے لیے بھی سوال کرنا جائز نہیں ہے۔ بعض اہل فتنہ یا پیشہ ور ہوتے ہیں، جنہیں کچھ ازار کی ضرورت ہوتی ہے۔ ایسے لوگوں کے پاس اگر چالیس، پچاس یا دس درہم سے کم مال ہو تو ان کے لیے سوال کرنا بھی گنجائش ہے۔ ورنہ سوال کرنا حرام ہے۔

حضرت ابو ہریرہؓ اصحاب صفہ میں سے ہیں۔ ان کے متعلق ترمذی شریف کی روایت میں آتا ہے کہ حضور علیہ السلام کے منبر اور حضرت عائشہؓ کے حجرہ کے درمیان غش کھا کر گر پڑتے تھے۔ فرماتے ہیں کہ لوگ میری گردن پر پاؤں رکھتے تھے اور سمجھتے تھے کہ مجھے جنون کا درورہ پڑ گیا ہے حالانکہ مابہ الا الجموع یہ صرف بھوک کی وجہ سے ہوتا تھا۔ اس قدر زبوں حالی کے باوجود اپنے کبھی دست سوال دراز نہیں کیا۔ یہ ان صحابہ کا حال تھا، جنہیں اپنی عزت نفس اس قدر عزیز تھی۔ اس آیت میں اسی بات کو بیان کیا گیا ہے کہ خوش پوش ہونے اور سوال نہ کرنے کی بنا پر نادان آدمی سمجھتے ہیں کہ یہ شخص بڑا مالدار ہے۔ حالانکہ وہ اپنی

عزت نفس کی خاطر سوال سے گریزاں ہے۔ اکبر الہ آبادیؒ نے اسی چیز کی یوں ترجمانی کی ہے۔ ۷

یہ دنیا رنج و راحت کا غلط اندازہ کرتی ہے
خدا ہی خوب واقف ہے۔ کسی پر کیا گزرتی ہے
آج کے ملحدانہ دور میں بھی عزت نفس کی پاسداری کی جاتی ہے۔ آج تو اشتراک
بھی کہتے ہیں الخبز بالکرامۃ یعنی ہر آدمی کو باعزت روٹی ملنی چاہیے۔ تاکہ اُسے
سوال کرنے کے ذیل نہ ہونا پڑے۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جو لوگ سوال کرنے سے
پاک دامن ہیں۔ وہ صدقات و خیرات کے زیادہ مستحق ہیں۔

مستحق فقرہ کی دوسری پہچان یہ فرمائی تَعْدِفُهُمْ سَيِّئُهُمْ تَمَّ اُنْهِیْ اُنْ کی
نشانوں سے پہچانو گے۔ واضح نشانی یہ ہے کہ بھوک کی وجہ سے لاغر ہوں گے، اُن
کے چہروں پر زردی چھائی ہوگی مزید برآں لَا یَسْتَلْکُوْنَ النَّاسَ الْخَافَاوہ لوگوں
سے لپٹ کر سوال نہیں کرتے۔ اگر ہر امر مجبوری سوال کرنا ہی پڑے تو یہ وقار طریقے سے
کرتے ہیں۔ پیشہ ور بھکاریوں کی طرح پیچھے نہیں پڑ جاتے کہ ضرور دے کہہ ہی چھوڑ دیجئے
اہم البوکر جصاصؒ فرماتے ہیں کہ الکافا سے یہ مراد نہیں ہے کہ وہ لجاجت سے
سوال نہیں کرتے، بلکہ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ بالکل ہی سوال نہیں کرتے۔ کیونکہ
اگر سوال کریں گے تو لوگوں کو علم ہو جائے گا۔ کہ نادار ہیں۔ مگر وہ تو اپنی ناداری کو ظاہر
ہونے ہی نہیں دیتے۔ اسکی دلیل یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ پہلے ہی فرما چکے ہیں۔ کہ سوال
نہ کرنے کی وجہ سے تو لوگ انہیں غنی یعنی مالدار تصور کرتے ہیں۔ اس لیے ایسے لوگ
مطلقاً سوال کرتے ہی نہیں۔

یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ پیشہ ور بھکاری فقر کی فہرست میں شامل گدھی حرام
نہیں ہیں۔ کیونکہ بھیک مانگنا تو سخت معیوب ہے۔ اور جن ناداروں کا یہاں ذکر ہو رہا ہے
ان کی اللہ تعالیٰ نے تعریف فرمائی ہے۔ کہ وہ اس قدر خود دار ہیں کہ سخت ضرورت کے
باوجود سوال سے گریز کرتے ہیں۔ مسلم ممالک میں عموماً اور ہمارے ہاں خصوصاً لوگ جگہ جگہ

کے بعد حساب لگایا گیا تو معلوم ہوا کہ آپ نے زندگی میں پانچ سو پونڈ سیاہی استعمال کی۔ یہ ان لوگوں کے کام کی برکات ہیں کہ دین کا مافکر پل رہا ہے۔ ورنہ اگر اس نے اپنے لئے بھکاریوں والی بات ہوتی، تو پھر دین کا اللہ ہی حافظ تھا۔ اسی لیے فرمایا کہ تم جو کچھ بھی خرچ کرتے ہو، اللہ تعالیٰ اچھی طرح جانتا ہے۔ کہ کس نیت سے خرچ کر رہے ہو اور کس پر خرچ کر رہے ہو۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے خرچ کی بہترین مد بھی بیان فرمادی۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

درس یکصد و بیست و یک (۱۳۱)

الْبُقَرٰہُ ۲

آیت ۲۴۲ تا ۲۴۴

الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِاللَّيْلِ وَالنَّهَارِ سِرًّا وَعَلَانِيَةً
 فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ
 وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٤٢﴾ الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا لَا يَقُومُونَ
 إِلَّا كَمَا يَقُومُ الَّذِي يَتَخَبَّطُهُ الشَّيْطَانُ مِنَ الْمَسِّ ط
 ذَلِكَ بِأَنَّهُمْ قَالُوا إِنَّمَا الْبَيْعُ مِثْلُ الرِّبَا وَأَحَلَّ اللَّهُ الْبَيْعَ
 وَحَرَّمَ الرِّبَا فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّنْ رَبِّهِ فَانْتَهَى
 فَلَهُ مَا سَلَفَ ط وَأَمْرُهُ إِلَى اللَّهِ ط وَمَنْ عَادَ فَأُولَٰئِكَ أَصْحَابُ
 النَّارِ هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ ﴿٢٤٣﴾ يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَا وَيُزِيلُ
 الصَّدَقَاتِ ط وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ كُلَّ كَفَّارٍ أَثِيمٍ ﴿٢٤٤﴾ إِنَّ
 الَّذِينَ آمَنُوا وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ وَأَقَامُوا الصَّلَاةَ
 وَآتَوُا الزَّكَاةَ لَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ وَلَا خَوْفٌ
 عَلَيْهِمْ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ ﴿٢٤٥﴾

ترجمہ: وہ لوگ جو اپنے مالوں کو خرچ کرتے ہیں رات کے وقت اور دن کے وقت، پوشیدہ طور پر اور ظاہری طور پر ان کے لیے ان کے رب کے پاس بدلہ ہے۔ اور نہ ان پر خوف ہوگا اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۴۲﴾ وہ لوگ جو سود کھاتے ہیں، وہ نہیں کھڑے ہوں گے۔ مگر اس شخص کی طرح جس کے حواس شیطان مائل کر دیتا ہے چھٹنے کی وجہ سے۔ یہ اس لیے کہ بیشک انہوں نے کہا کہ بیشک سود اگر بھی سود کی مثل ہے۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے سود اگر بھی کو حلال قرار دیا ہے۔ اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ پس جس کے پاس نصیحت

اگئی اسکے رب کی طرف سے، پس وہ رک گیا پس جو کچھ ہو چکا وہ اسکے لیے ہے اور اسکا معاملہ اللہ کی طرف ہے اور جس نے پلٹ کر کیا، پس یہی لوگ ذلخ والے ہیں اس میں ہمیشہ رہیں گے ﴿۲۷﴾ اللہ تعالیٰ سود کو مٹاتا ہے، اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ناشکر گزار اور گنہگار کو پسند نہیں کرتا ﴿۲۸﴾ بیشک وہ لوگ جو ایمان لائے اور جنہوں نے اچھے کام کیے اور نماز قائم کی اور زکوٰۃ ادا کی۔ اُن کے لیے اُن کے رب کے پاس اجر ہے۔ اُن پر نہ خوف ہوگا۔ اور نہ وہ غمگین ہوں گے ﴿۲۹﴾

صدقہ بقابلہ

گذشتہ کئی دروس میں صدقہ کا بیان آیا ہے۔ اور گذشتہ درس میں صدقات سے متعلق ساتویں بات یعنی اس کے بہترین مصرف کا ذکر تھا۔ اب آج کے درس میں پہلے صدقات ہی کے ضمن میں ان کی فضیلت بیان کی گئی ہے۔ اور پھر اس کے مقابلے میں سود کی مذمت ہے، صدقہ و خیرات کرنے سے انسان کے اندر فیاضی کا مادہ پیدا ہوتا ہے اور نخل دور ہوتا ہے۔ اس کے سبب انسان کے اندر بنی نوع انسان کے لیے جذبہ ہمدردی پیدا ہوتا ہے، مکارم اخلاق کی تکمیل ہوتی ہے، اور پھر یہی خصائل انسان کی نجات کا ذریعہ بن جاتے ہیں۔ برخلاف اس کے سود خور میں نخل کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ اخلاق کا جنازہ نکلتا ہے۔ اور لامحدود پیمانہ پر مال جمع کرنے کی حرص پیدا ہوتی ہے۔ انسانی ہمدردی اور فیاضی اٹھ جاتی ہے سود خور سنگ دل اور ظالم بن جاتا ہے۔ جسکی وجہ سے اس کا دین تباہ و برباد ہو جاتا ہے۔ اُس پر اللہ تعالیٰ کی لعنت برپا ہوتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔

لَعَنَ اللَّهُ أَكْلَ الرِّبَا وَمَوْكَلَهُ ... الخ اللہ تعالیٰ نے سود لینے والے اور دینے والے پر، اسکی دستاویز کے کاتب اور گواہان سب پر لعنت کی ہے اور ہر صدقہ و خیرات کرنے والوں پر اللہ کی رحمتوں کا نزول ہوتا ہے قرآن آیات میں اللہ تعالیٰ نے دونوں متضاد چیزوں کو اکٹھا بیان کیا ہے۔

اس آیت کریمہ میں اللہ تعالیٰ نے خیرات کے چار متحسن مواقع بیان کیے ہیں
الَّذِينَ يَنْفِقُونَ أَمْوَالَهُمْ بِالْإِيلِ وَالْإِفْكَارِ وَهُ لَوْ جُوَپَنے

صدقہ کے
چار مواقع

مالوں کو خرچ کرتے ہیں رات اور دن مَسْئًا قَلْبًا چھپا کر اور ظاہر کر کے۔ یعنی اہل ایمان چار حالتوں میں خرچ کرتے ہیں، وقت کے لحاظ سے رات ہوگی یا دن ہوگا اور حالت کے لحاظ سے پوشیدہ طور پر ہوگا یا ظاہر ہوگا۔ چنانچہ حضور علیہ السلام کے صحابہ کرام اس آیت کے مکمل مصداق تھے۔ امیر المؤمنین حضرت علیؑ کے پاس اگر چار درہم آگئے ہیں۔ تو انہوں نے ایک رات خرچ کر دیا، ایک دن کے وقت ایک پوشیدہ طور پر خیرات کر دیا اور ایک کسی عام مجلس کے اندر، اور اس طرح اس آیت کے میر پر پورا پورا عمل کیا۔ حضرت ابو بکر صدیقؓ کے پاس چالیس ہزار درہم آئے۔ انہوں نے بھی قرآن پاک کے حکم کے مطابق انہیں چار حصوں میں تقسیم کیا۔ دس ہزار درہم رات میں خرچ کیے، دس ہزار دن میں پھر دس ہزار پوشیدہ طور پر اور دس ہزار علانیہ خرچ کئے، حضرت عبدالرحمن بن عوفؓ بہت بڑے تاجر اور مالدار تھے۔ آپ بھی خرچ کرتے وقت چاروں مواقع کا خیال رکھتے تھے۔

یہاں سے یہ بات اخذ ہوتی ہے۔ کہ صدقہ خیرات کے لیے کوئی خاص وقت یا کوئی خاص جگہ معین نہیں ہے۔ بلکہ رات دن کے چوبیس گھنٹوں اور ظاہر باطن ہر حالت میں خرچ کیا جاسکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا فَلَهُمْ أَجْرُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ ایسے لوگوں کے لیے اُن کے رب کے ہاں اجر ہے۔ وہ ضرور اس اجر سے مستفید ہوں گے۔ جس کا نتیجہ یہ ہے۔ وَلَا خَوْفٌ عَلَيْهِمْ وہ مستقبل میں بیش آنے والے کسی خطرے سے خوفزدہ نہیں ہوں گے۔ وَلَا هُمْ يَحْزَنُونَ اور نہ ہی گنہگار ہوئی زندگی پر انہیں کسی قسم کا افسوس اور غم ہوگا۔ کیونکہ انہوں نے دنیا میں نیکی اور بھلائی کا کام کیا ہے۔ وہ عند اللہ ماجور ہوں گے۔

ایصال ثواب
کے لیے تعین وقت

اس آیت پاک سے واضح ہے۔ کہ اللہ تعالیٰ نے صدقہ و خیرات کے لیے کوئی خاص وقت یا دن مقرر نہیں کیا۔ کہ ضرور فلاں دن اور فلاں وقت پر ہو۔ بلکہ ہر روز اور ہر وقت خیرات ہو سکتی ہے۔ مگر اکثر لوگ اس کے لیے جمعرات کا روز یا ہر ماہ کی گیارہویں تاریخ مقرر کرتے ہیں۔ شعبان کی پندرہویں اور رمضان کی ستائیسویں

تاریخ بھی بطور خاص مقرر کی جاتی ہے۔ یہ چیز اصولاً غلط ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ایسی کوئی پابندی عاید نہیں کی۔ البتہ جس چیز کی پابندی ہونی چاہیے، وہ یہ ہے کہ جو کچھ حسنہ و برہ کی جارہا ہے، وہ حلال کما فی سہ ہو۔ دن رات اور تاریخ کا کوئی تعین نہیں۔ عزائم و کمالات کی خدمت کرنی ہے۔ تو کسی وقت بھی کی جاسکتی ہے۔ نیت درست ہوئی چاہیے۔ محض اللہ کی رضا کے لیے ہو۔ مردوں کو ایصالِ ثواب کے لیے تیسرا دن، ساتواں، دسواں، یا چالیسواں دن ہی کیوں ضروری ہے۔ اسی طرح مردوں کے ثواب کے لیے جمعرات کی تخصیص بھی ناقابلِ فہم ہے۔ یہ محض ڈھونگ اور غلط طریقہ ہے۔ صدقہ و خیرات کے لیے کوئی تاریخ اور کوئی وقت مقرر نہیں ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، خود ساختہ شریعت کے احکام ہیں۔

سود خور کی
حالت زار

سود کی مذمت اور حرمت کے متعلق اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے الَّذِينَ يَأْكُلُونَ الرِّبَا یعنی جو لوگ سود کھاتے ہیں۔ ان کی مثال ایسی ہے۔ امام بیضاویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ تعالیٰ نے سود کھانے کا ذکر فرمایا ہے لیکن مراد اس سے لینا دینا ہی ہے، صرف کھانا اور نہیں۔ یہاں پر کھانے کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ انسانی زندگی کھانے پینے پر منحصر ہے اور یہ انسان کی اولین ضروریات میں سے ہے۔ اس لیے جب بھی کوئی محنت مزدوری، کام کاج کرتا ہے تو کہتے ہیں کہ پیٹ کی خاطر یہ کچھ کیا جا رہا ہے۔ آدمی کو دو وقت کی روٹی تو ضرور ملنی چاہیے، باقی چیزیں ثانوی حیثیت رکھتی ہیں۔ تو امام صاحب فرماتے ہیں کہ اس مقام پر کھانے کا ذکر انہی معنوں میں کیا گیا ہے۔ تاہم سود کھانے سے مراد سود کا لینا دینا اور ہر قسم کے استعمال ہیں لہٰذا فرمایا جو لوگ سود کھاتے ہیں لَا يَقُومُونَ وہ قیامت کے دن نہیں کھڑے

ہونگے اپنی قبروں سے الَّذِينَ يَتَّبِعُهُ الشَّيْطَانُ مِنْ الْمُحْسِنِينَ اس شخص کی طرح جسے شیطان نے چمٹ کر مجبوظ الحواس کر دیا ہو جب کسی شخص پر جن اثر ڈالتا ہے۔ جسے جن کا سایہ یا جن کا چمٹنا کہتے ہیں۔ تو وہ شخص اپنے ہوش و حواس قائم نہیں رکھ سکتا۔ اچھے طریقے سے کھڑا نہیں ہو سکتا، طرح طرح کی

حکمتیں کرتا ہے۔ تو فرمایا قیامت کے دن سود خور کی بھی یہی حالت ہوگی۔ جب وہ قبروں سے اٹھیں گے، تو ان کے پاؤں لٹکھڑکتے ہوں گے۔ اور ان پر جنوں کی سی کیفیت طاری ہوگی۔ یہ اُن کے لیے سود خوری کی سزا ہوگی۔

جن کا انسان کو چھپ جانا اکثر مشاہدہ میں آتا رہتا ہے۔ جب کوئی شخص غیظی کرتا ہے۔ جس سے شیاطین کو تکلیف پہنچتی ہے، تو وہ لوگوں کو چھپ کر تکلیف میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ جنات کی مختلف قسمیں ہیں۔ جیسا کہ سورۃ جن میں آتا ہے "هَٰذَا الْمُسْلِمُونَ وَهَٰذَا الْقِسْطُونَ" جطرَح انسانوں میں مؤمن اور کافر فاسق وغیرہ ہوتے ہیں، اسی طرح جنوں میں بھی ہوتے ہیں۔ فرق یہ ہے کہ وہ انسانوں کو نظر نہیں آتے کیونکہ ان کا مادہ تخلیق زیادہ لطیف ہے۔ انسانی آبادی کی طرح یہ دنیا جنوں سے بھی بھری ہوئی ہے۔ وہ بعض اوقات انسانوں کو چھپ جاتے ہیں، مِّنَ الصَّیِّطِ سے یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے۔ مگر یہاں پنجاب میں کچھ مصنوعی اور جعلی کاروبار بھی ہوتا ہے عامل لوگ ایسے واقعات اور بڑھا چڑھا کر بیان کرتے ہیں۔ اکثر عورتوں کو بعض بیماریاں ہوتی ہیں مگر عاملین اُسے بھی جنات چھٹنے پر محمول کرتے ہیں۔ حالانکہ بیماری کا علاج طبی طور پر ہی کرنا چاہیے۔ یہ اعتقاد کی کمزوری اور جہالت کا نتیجہ ہے۔ مگر نہ حقیقی طور پر جن چھٹنے کی کیفیت تو سب کو معلوم ہی ہے کہ انسان کیسی کیسی حرکتیں کرتا ہے۔ اور کس طرح حواس باختہ ہو جاتا ہے۔

تجارت بقابلہ سود فرمایا سود خور قیامت کے روز قبر سے حواس باختہ اٹھے گا۔ ذَٰلِكَ بِأَنَّهُمْ اِس کی وجہ یہ ہے کہ قَالُوا اِنَّمَا اَلْبَيْعُ مِثْلُ الْعِبَادَةِ انہوں نے کہا تجارت سود کی مانند ہے۔ دونوں چیزوں میں کوئی فرق نہیں۔ لوگ تجارت کرتے ہیں، کاروبار کرتے ہیں۔ اور پھر اس میں نفع کھاتے ہیں۔ اس طرح سادہ کار بھی اپنی رقم لگاتا ہے۔ اور اس پر نفع لیتا ہے۔ سود خور کا یہ نظریہ ظاہر کرتا ہے کہ دنیا میں اُسے سرمایہ جمع کرنے اور حلال حرام میں عدم تمیز کا جنون ہو چکا ہے۔ اسی لیے یہ سود کو تجارت کے برابر قرار دے رہا ہے، حالانکہ منافع کی جنس کے بدلے میں ہوتا ہے۔ ایک شخص کوئی چیز

بیچتا ہے۔ اور اپنی لاگت سے زیادہ وصول کر کے نفع کھاتا ہے۔ مگر سود میں تو کسی چیز کا تعلق ہی نہیں ہوتا۔ سود خوردہ کوئی چیز خریدتا ہے۔ اور نہ اُسے بیچتا ہے۔ بلکہ صرف روپیہ ادھار دیکر اُس پر سود لیتا ہے۔ جو قطعاً حرام ہے۔

سود و شکلوں میں ہوتا ہے، ادھار کی شکل میں یا اجناس کی صورت میں۔ اگر کوئی شخص کسی دوسرے شخص کو قرض کے طور پر کچھ رقم دیتا ہے۔ اور پھر مقررہ مدت کے بعد اصل رقم کے ساتھ کچھ زائد بھی لیتا ہے۔ تو یہ صریحاً سود ہے۔ کیونکہ قرض دینے والے نے اس میں محنت کی ہے، نہ وقت دیا اور نہ صلاحیت صرف کی ہے۔ وہ محض اپنی رقم کے بل بوتے پر مقررہ نفع حاصل کرنا چاہتا ہے۔ جو سود ہے۔

جنس کی صورت یہ ہے۔ کہ کوئی شخص جنس کسی دوسرے شخص کو مقررہ مدت کے لیے دے اور پھر واپسی پر ادا شدہ جنس سے زیادہ لے۔ یہ بھی سود ہوگا۔ حضور علیہ السلام کا فرمان ہے **اَلدَّهَبُ بِالذَّهَبِ** یعنی جب جنس کا لین دین ہو۔ اور ایک جنس کا تبادلہ ہو۔ تو برابر برابر ہونا چاہیے۔ سونے کے بدلے سونا ہو، چاندی کے بدلے چاندی ہو، نمک کے بدلے نمک ہو۔ جو کے بدلے جو ہو، گندم کے عوض میں گندم ہو تو یہ تبادلہ برابری کی بنیاد پر اور دست بدست ہونا چاہیے، جو کوئی ایک سیر گندم دیکر دوسرے سیر گندم واپس لے گا تو یہ سود ہوگا اسی طرح ایک سیر گندم دے کر کچھ مدت کے بعد ایک سیر چاول واپس لے تو یہ بھی سود ہوگا۔ ہاں اگر اجناس مختلف ہوں تو شرح تبادلہ میں کمی بیشی جائز ہے۔ مثلاً ایک سیر گندم کے بدلے میں دوسرے جو لے سکتا ہے، ایک تولہ سونے کے عوض کئی گنا زیادہ چاندی حاصل کی جا سکتی ہے۔ علیٰ ہذا القیاس۔ مگر یہاں پر شرط یہی ہے۔ کہ سود دست بدست ہو۔ اگر اس میں ادھار کیا ہے۔ اور اُس مدت کے معاوضہ میں کچھ زیادہ حاصل کر لیا تو یہ سود ہو جائیگا۔

اہم ماکٹ فرماتے۔ کہ جو چیز بطور خوراک استعمال ہو سکتی ہے، جیسے گندم، جو چنا وغیرہ اور وہ اپنی قیمت بھی رکھتی ہے۔ اس میں اگر ادھار کی بنیاد پر کمی بیشی ہو گی، تو یہ سود ہوگا۔ اہم شافعی اور اہم احمد بھی خوراک والی اشیاء میں یہی حکم لگاتے

ہیں۔ امام ابو حنیفہؒ فرماتے ہیں کہ ایسی غیس جس کا وزن یا پیمائش ہو سکتی ہے۔ اُس کے تبادلے میں کمی بیشی کرے گی۔ تو سود شمار ہو گا۔ لوہے کا ایک سر یا دیکھ دوسرے نہیں لے سکتا، ایک من چونا دیکھ ڈیڑھ من وصول نہیں کر سکتا۔ غرضیکہ ہر وہ چیز جو وزن یا ناپ یا پیمائش میں آ سکتی ہے۔ اس کا تبادلہ برابری کی بنیاد پر ہو، تو اجازت ہے۔ اگر زیادہ وصول کیا، تو پھر یہ سود ہو گا۔

فرمایا سود غریوں کا نظریہ یہ ہے۔ کہ تجارت سود کی مثل ہے وَاحِلَ اللّٰهُ الْبَيْعَ وَحَدَّثَ مَالِ الْبَيْعِ حَالًا لَّحَقَّ اللّٰهُ تَعَالٰی نے تجارت کو حلال قرار دیا ہے۔ اور سود کو حرام کیا ہے تجارت میں کبھی منافع ہوتا ہے اور کبھی نقصان کا احتمال بھی ہوتا ہے۔ جب کہ سود ایک مقرر منافع ہے۔ جو ہر صورت رقم دہندہ کو وصول ہوتا رہتا ہے۔ چنانچہ فتح مکہ کے اندر حضور نبیؐ کی رقم نے فرمایا، سود بالکل چھوڑ دو، سابقہ تمام سود ختم ہو گئے۔ فرمایا میرے خاندان والے جو سود وصول کرتے تھے، وہ بھی میں نے ختم کر دیا۔ اب کسی کو سود کی رقم لینے کی اجازت نہیں۔ سب سے پہلے حضورؐ نے اپنے چچا حضرت عباسؓ کا سود ختم کیا، اور فرمایا کہ اصل قرضہ واپس لے سکتا ہے مگر سود کا ایک پیسہ تک لینے کی اجازت نہیں۔ تمام سود مٹا دیے گئے۔

فرمایا فَمَنْ جَاءَكَ مَوْعِدًا مِنْ رَبِّهِ جس شخص کے پاس اس کے رب کی طرف سے نصیحت آگئی۔ یعنی سود کی حرمت کا حکم پہنچ گیا۔ فَاَنْتَهَىٰ تِلْكَ اُس شخص نے سود لینا چھوڑ دیا۔ فَلَهُ مَا سَلَفَتْ تو جو کچھ ہو چکا وہ اُس کے لیے ہے۔ یعنی جو سود حاصل کر چکا ہے۔ اُس کا کچھ مواخذہ نہیں یعنی حرمت سود کا قانون آنے سے پہلے سود کی جو رقم لے چکا ہے۔ وہ اس کی ہو گئی، اب اس کی واپسی کی ضرورت نہیں۔ وَأَمَّا إِلَى اللَّهِ اس کا معاملہ اللہ کی طرف ہے۔ وہ اُسے معاف کرے پر قادر ہے۔ تاہم یہ اس کی نیت پر منحصر ہے۔ کہ اس نے دل سے اللہ کے حکم کو قبول کر لیا ہے۔ یا محض دیکھا دے کے لیے سود لینا بند کیا ہے۔ اسی لیے فرمایا کہ ایسے شخص کا معاملہ اللہ کے سپرد ہے۔ وَمَنْ عَادَ اور جو کوئی دوبارہ سودی کاروبار شروع کرے گا۔ فَاُولَٰئِكَ أَصْحَابُ النَّارِ یہی لوگ اہل جہنم ہیں هُمْ فِيهَا خَالِدُونَ

سابقہ سود کی معافی

وہ ہمیشہ دوزخ میں رہیں گے۔ مطلب یہ کہ اللہ تعالیٰ کا حکم آجانے کے بعد جو شخص سوئی
لین دین سے باز نہ آیا، تو وہ اسی لائق ہے کہ جہنم کے گڑھے میں پھینک دیا جائے۔
جہاں سے کبھی چھٹکارا نہ ہو۔ اگر اُس نے سود کو حلال سمجھ کر کھایا ہے۔ تو پھر تو قطعی کافر
ہے۔ اور حلال تو نہیں جانتا مگر کھارہا ہے۔ تو بھی شدید درجے کا گنہگار ہے اور دوزخ
کا مستحق ہے۔

سود کے واضح احکام بیان کرنے کے بعد اسکی حکمت بھی بیان فرمادی۔
يَمْحَقُ اللَّهُ الرِّبَاۤءَ ۖ اللَّهُ تَعَالٰی سود کو مٹاتا ہے۔ سود کا جتنا بھی مال اکٹھا کر لو، مگر
انجام کار اس سے فائدے کی بجائے نقصان ہی پہنچے گا۔ ایسا مال اکثر تعیش کے
کاموں، لہو و لعب، بنیڈ باجے، آتش بازی، بے جا فیشن یا غلط رسم و رواج کی نظر
ہو جاتا ہے۔ مال حرام بود بجائے حرام رفت کے مصداق حرام کے مال سے صحیح
نتائج مرتب نہیں ہو پاتے اس میں خیر و برکت نہیں آتی، انسان سونے کی طرح محروم
رہتا ہے، حرص بڑھتی رہتی ہے، باقی لوگ خواہ بھوکوں مر جائیں، اسے مال اکٹھا کرنے
سے غرض ہے، یہ سب نقصان دہ چیزیں ہیں۔ اسی لیے اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اللہ تعالیٰ
سود کو مٹاتا ہے۔ وَيُزِيلُ الصَّدَقَاتِ اور صدقات کو بڑھاتا ہے۔ زکوٰۃ و صدقات
دینے والے کے مال میں اللہ تعالیٰ برکت عطا کرتا ہے۔ صدقات کا جذبہ بنی نوع انسان
کے ساتھ اہم و ردی اور خیر گالی کا جذبہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ایسے شخص کے مال میں دنیا میں بھی
اضافہ کرتا ہے۔ اور آخرت میں تو سات سو گنا تک بلکہ اس سے بھی بڑھا چڑھا کر اجر عطا
ہوگا۔ اللہ مالک الملک کھجور کے ایک دانے کو احد پہاڑ جتنا بڑھا کر معاوضہ دے گا۔
صدقہ و خیرات کی یہ برکات ہیں۔ گویا اللہ تعالیٰ صدقات کو بڑھاتا ہے۔ وَاللَّهُ لَا يُحِبُّ
كُلَّ كَفَّارٍ اِشِيْعَ اللّٰهُ تَعَالٰی ناشکر گزار اور گنہگار آدمی کو پسند نہیں کرتا۔ جو شخص
اللہ تعالیٰ کی عطا کردہ نعمت کو چند دن کے لیے کسی کو ادا ہار نہیں دے سکتا، کسی
غریب و لاچار کی مدد نہیں کر سکتا، کسی بھٹو کے کو کھانا نہیں کھلا سکتا۔ اللہ ایسے ناشکر گزار
کو پسند نہیں کرتا۔ اور پھر جو شخص اُلٹا کسی کی مجبوری سے فائدہ اٹھا کر اُسے سود پر قرض

حرمت سود
کی حکمت

دیتا ہے۔ اس کا خون چرتا ہے۔ وہ پہلے ہی کمزور ہے۔ اس پر اور مالی بوجھ ڈالتا ہے۔ وہ شخص سخت گنہگار ہے۔ اور اللہ ایسے آدمی کو بھی ہرگز پسند نہیں کرتا۔

اہل ایمان کے
لیے بشارت

احکام الہی کی خلاف ورزی کرنے والوں کے برخلاف اِنَّ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا جو لوگ ایمان لائے وَعَمِلُوا الصَّالِحَاتِ اور نیک اعمال کئے۔ یعنی اولاً وہ اہل ایمان ہیں۔ ان کا عقیدہ صحیح ہے۔ توحید خداوندی پر پورا یقین رکھتے ہیں۔ بعثت بعد الموت پر یقین ہے۔ کتب سادیر پر ایمان ہے اور ثانیاً وہ اچھے اور شائستہ کام انجام دیتے ہیں۔ برائی سے بچتے ہیں۔ بالخصوص وَاَقَامُوا الصَّلَاةَ نماز کو قائم کرتے ہیں۔ جو کرام العبادۃ المقربہ اللہ کا تقرب دلانے والی چیز ہے۔ اسلام کی جڑ اور بنیاد ہے۔ اس کے علاوہ وَاَتَوْا الزَّكَاةَ زکوٰۃ بھی ادا کرتے ہیں۔ یعنی بدنی عبادت کے ساتھ ساتھ مالی عبادت بھی کرتے ہیں۔ ان کے دل میں انسانی ہمدردی کا جذبہ موجود ہے۔ بخل سے محفوظ ہیں۔ لَہُمْ اَجْرُہُمْ عِنْدَ رَبِّہُمْ اُن کے لیے اُن کے رب کے ہاں اجر مقرر ہے۔ اُن کے نیک اعمال کا ایک ایک ذرہ محفوظ ہے، اگر رائی کے دانے کے برابر بھی کوئی عمل ہے۔ تو اللہ اُسے ضائع نہیں کرتا بلکہ اس کا بدلہ سات سو گنا تک یا اس سے بھی بڑھا چڑھا کر عطا کرتا ہے۔ ایسے ہی نیکو کار لوگوں کے متعلق فرمایا وَلَا تَخْوَفْ عَلَیْہُمْ نہ انہیں اس دنیا میں کسی قسم کا خوف ہوگا، وَكَذَٰلَہُمْ یَحْزَنُوْنَ اُدھر ہی آخرت میں وہ کسی غم و فخر میں مبتلا ہوں گے۔ قیامت کا ڈر تو ہر ایک کو ہونا چاہیے۔ مگر حقیقت میں وہ اپنے اچھے اعمال کی وجہ سے مامون ہونگے برخلاف اس کے اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرنے والے سخت مغوم ہوں گے۔ ایسے لوگ قیامت کے دن اپنے کیے پر پشیمان ہونگے، اور کہیں گے یَحْسَبُوْا عَلٰی مَا فَعَلْتُ فِیْ حُبِّ اللّٰهِ اَفْسُوس اللہ کی دی ہوئی مہلت سے میں نے کوئی فائدہ نہ اٹھایا اور آج قیامت کے دن نقصان اٹھانے والوں میں شمار ہو گیا۔ بہر حال ایمان اور اعمال صالحہ کے حامل لوگوں کو نہ خوف ہوگا۔ اور نہ کسی قسم کا غم ہوگا۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَرَةُ ۲

درس یکصد و ست و دو (۱۳۲)

آیت ۲۷۸ تا ۲۸۱

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا إِن كُنتُمْ مُؤْمِنِينَ ﴿٢٧٨﴾ فَإِن لَّمْ تَفْعَلُوا فَأْذَنُوا بِحَرْبٍ مِّنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ وَإِن تُبْتُمْ فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ﴿٢٧٩﴾ وَإِن كَانَ ذُو عُسْرَةٍ فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ وَإِن تَصَدَّقُوا خَيْرٌ لَّكُمْ إِن كُنتُمْ تَعْلَمُونَ ﴿٢٨٠﴾ وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ فَتَنَّم تُوَفَّىٰ كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ وَهُمْ لَا يُظْلَمُونَ ﴿٢٨١﴾

ترجمہ: اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو، اور جو سود باقی رہ گیا ہے، اُسے چھوڑ دو، اگر تم (حقیقت میں) ایمان نہ ہو ﴿۲۷۸﴾ اور اگر تم نے ایسا نہ کیا، پس سن لو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا چیلنج۔ اور اگر تم توبہ نہ کرو، تو تمہارے اصل مال تمہارے ہی ہیں نہ تم کسی پر ظلم کرو اور نہ تم پر ظلم کیا جائیگا ﴿۲۷۹﴾ اگر وہ شخص تنگ دستی والا مقرر و من ہے، پس اس کو مہلت دینی چاہیے آسودگی تک۔ اور یہ کہ تم صدقہ کرو (بخش دو) یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم جانتے ہو ﴿۲۸۰﴾ اور اس دن سے ڈرو جس دن تم اللہ کے سامنے لوٹو گے۔ پھر ہر نفس کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔ جو اس نے کمایا، اور اُن پر کسی طرح ظلم نہیں کیا جائیگا ﴿۲۸۱﴾

صدقہ و خیرات کی فضیلت کے بعد اللہ تعالیٰ نے سود کی حرمت اور مذمت بیان فرمائی۔ گذشتہ درس میں سود خود کی قیامت کے دن دوبارہ اٹھنے کی حالت کا تذکرہ تھا۔ کہ وہ اپنی قبروں سے اس طرح مجنوب الحواس اٹھیں گے جیسے اُن کو جن چمٹ گیا ہو۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ یہ لوگ دنیا میں مال جمع کرنے کی فکر

میں اس قدر اندھے ہو گئے کہ ان کے نزدیک تجارت اور سود میں کوئی امتیاز نہ رہا۔ حالانکہ اللہ تعالیٰ نے تجارت کو حلال اور سود کو حرام قرار دیا ہے۔ سود کی حرمت کے نفاذ کے سلسلے میں اللہ تعالیٰ نے دو طریقے بتائے ہیں۔ پہلا طریقہ تو گندہ شدہ درس میں بیان ہو چکا ہے۔ ”فَمَنْ جَاءَهُ مَوْعِظَةٌ مِّن رَّبِّهِ“ یعنی وعظ و نصیحت کے ذریعے سود خور کو سود سے باز رکھنے کی کوشش کی جائے۔ اگر وہ اللہ کا حکم مان کر سود سے کنارہ کش ہو جائے تو بہتر و گرنہ ایسے لوگ اصحاب النار ہیں۔ ان کا گناہ ناقابل معافی ہے۔ ”هَوَّيْنَا“ یہ دائمی جہنمی ہیں۔

سود کی لعنت سے نجات دلانے کا دوسرا طریقہ تعزیری عمل ہے جو آج کے درس میں بیان کیا گیا ہے۔ اور یہ اس صورت میں ممکن ہے جب کہ حکومت اسلامی ہو اور وہ اسلامی احکام کا نفاذ کرے اور پھر ان کی خلاف ورزی کرنے والوں کے خلاف تعزیری کارروائی کرے۔ کسی بھی ملک و قوم کے لیے معاشی مسائل بنیادی اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ اگر یہ نظام درست ہو جائے، تو لوگوں کے بیشتر دنیوی مسائل حل ہو جاتے ہیں۔ اسلام کے اقتصادی نظام میں سود ایک بنیادی رخنہ ہے۔ جسے دور کیے بغیر لوگوں کی معاشی حالت درست نہیں ہو سکتی لہذا ایک اسلامی حکومت کا اولین فریضہ ہے کہ ملک کو سود کی لعنت سے پاک کرے اور اس راستے میں آنے والے ہر روڑے کو ہٹائے، اور یہ چیز تعزیری قوانین کے ذریعے حاصل ہوگی، جس کا ذکر آج کے درس میں آ رہا ہے۔

زمانہ جاہلیت میں طائف میں آباد قبیلہ بنو ثقیف کے کچھ لوگ سودی کاروبار کرتے تھے۔ مکہ میں آباد بنو مغیرہ والے بنو ثقیف کے مقروض تھے۔ انہوں نے سود پر ردِ پیر لے رکھا تھا۔ جب اسلام کی شمع نے خطہ عرب کو منور کیا، تو یہ دونوں قبیلے مسلمان ہو گئے۔ چونکہ بنو ثقیف کی رقم بنو مغیرہ کی طرف واجب الادا تھی، اول الذکر نے اپنی اصل رقم مجبوراً سود مطالبہ کیا، تو بنو مغیرہ نے جواب دیا کہ اسلام میں تو سود کا لین دین جائز نہیں ہے۔ لہذا اب تمہارا دعویٰ درست نہیں ہے۔

آخر معاملہ حضور علیہ السلام کی خدمت میں پیش ہوا، اور اللہ تعالیٰ نے یہ آیات نازل فرما کر مسئلہ حل کر دیا۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا اتَّقُوا اللَّهَ اے ایمان والو! اللہ سے ڈرو وَذَرُوا مَا بَقِيَ مِنَ الرِّبَا اور سود کی بقیہ رقم چھوڑ دو، یعنی مطالبہ نہ کرو۔ اب یہ تمہارے لیے روانہ نہیں ہے۔ إِنْ كُنْتُمْ مُؤْمِنِينَ اگر تم فی الحقیقت مومن ہو، یعنی اگر سچے دل سے اللہ اور اس کے رسول پر ایمان لا چکے ہو، تو سود کا خیال قطعاً دل سے نکال دو۔

اس آیت پاک میں سود خوروں کے لیے تعزیر کا بیان ہے۔ حضرت عبداللہ بن عباسؓ فرماتے ہیں کہ اس آیت کی رو سے مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ سودی کاروبار کو ختم کرنے کا انتظام کرے اور اگر سود خور سود خوری سے باز نہ آئے تو پھر ان کے خلاف جہاد کیا جائے چنانچہ ارشاد ہوتا ہے فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا اور اگر تم نے ایسا نہ کیا یعنی سود لینے سے باز نہ آئے، تو پھر فَإِنْ لَّمْ تَفْعَلُوا جُزِبْ مِنَ اللَّهِ وَرَسُولِهِ تو اللہ اور اس کے رسول کی طرف سے لڑائی کا چیلنج من لو تمہارے خلاف جنگ ہوگی یہاں تک کہ تم اس یقین حرکت سے باز آ جاؤ۔ وَإِنْ تَابْتُمْ پھر اگر تم نے توبہ کر لی۔ سودی کاروبار کو ختم کر دیا فَلَكُمْ رُءُوسُ أَمْوَالِكُمْ تو تمہارا اصل زر تمہیں مل جائے گا۔ اور اس رقم پر جو سود لگایا گیا ہے۔ وہ نہیں ملے گا۔ وہ چھوڑنا ہوگا۔

حضرت عبداللہ بن عباسؓ یہ بھی فرماتے ہیں کہ مسلمان حاکم کا فرض ہے کہ سود خور سے توبہ کرائے کہ آئندہ کے لیے سودی کام سے قطعاً دست بردار ہو جائے۔ اگر اُس نے ایسا کر لیا تو معاملہ ختم ہو گیا اور اگر کوئی شخص توبہ سے انکار کرتا ہے، تو حاکم اسے سزا دینے کا پابند ہے، اور یہ سزا سزائے موت بھی ہو سکتی ہے۔ حضرت حسن بصریؒ اور ابن سیرینؒ عجماء بعین میں سے ہیں، وہ فرماتے ہیں کہ اگر سود خور توبہ نہ کرے تو اسلامی نظام کے تحت ایسے شخص کا سر تلوار سے قلم کر دینا چاہیے۔ اب سود لینے والا دو طرح کا ہو سکتا ہے اگر ایسا شخص جو سود کو حرام نہیں سمجھتا، تو وہ دائرہ اسلام سے خارج ہے۔ اور مرتد سمجھا جائے گا۔ کیونکہ اس نے اسلام کے

ایک قطعی حکم کا انکار کیا ہے۔ لہذا اس کے خلاف جہاد ضروری ہو جائے گا۔ جیسا کہ حضرت ابو بکر صدیقؓ نے منکرین زکوٰۃ کے خلاف جہاد کیا تھا۔ اور پھر یہ ہے کہ مرتد نے جو مال اسلام کے دور میں کمایا تھا، وہ اس کے مسلمان ورثا میں تقسیم کر دیا جائے گا۔ اور جو مال اس نے ارتداد کے بعد کمایا تھا، وہ اسلامی بیت المال میں جمع ہو جائے گا۔

سود خور کی دوسری حیثیت یہ ہے کہ وہ طے حرام تو سمجھتا ہے۔ مگر لے رہا ہے ایسا شخص دین کا باغی ہے۔ اور ایسے شخص کے خلاف بھی جنگ ضروری ہے۔ حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں منکرین زکوٰۃ نے زکوٰۃ کی فرضیت کا انکار نہیں کیا تھا۔ بلکہ وہ کہتے تھے کہ ہم زکوٰۃ کا مال بیت المال میں جمع نہیں کریں گے۔ بلکہ اپنی مرضی سے اسے خرچ کریں گے۔ تو ایسے لوگوں کے خلاف حضرت ابو بکر صدیقؓ نے جہاد کیا تھا۔ اسی طرح جو لوگ سود کو حرام سمجھتے ہوئے بھی اسے وصول کرتے ہیں۔ وہ باغی ہیں۔ اور ایک اسلامی حکومت کو ایسے باغیوں کے خلاف جہاد کا حکم ہے۔ اور پھر باغی کا مال بھی چھین لیا جاتا ہے۔ اگر وہ توبہ کر لے تو مال واپس ملے دیا جائے گا۔ اور اگر تائب نہ ہو، تو اس کا مال حکومت کے حق میں ضبط ہو جائے گا۔

فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ ارتداد کے لیے صرف فرائض کا انکار ہی ضروری نہیں بلکہ اگر کوئی شخص سنت کا بھی انکار کرے گا۔ تو مرتد ہو جائے گا۔ اہم محمدؐ نے فرمایا ہے کہ اگر کسی بستی کے لوگ اذان دینا ترک کر دیں، تو ان کے خلاف بھی جہاد ہو گا۔ اگرچہ اذان دینا فرض نہیں ہے بلکہ سنت ہے۔ اسی طرح اگر بعض مسلمان ختنہ کرنا چھوڑ دیں اور سمجھانے پر بھی اس پر آمادہ نہ ہوں، تو ایسے لوگ بھی باغی سمجھے جائیں گے۔ اور اسلامی قانون کے مطابق ان کے خلاف جہاد ہو گا۔ ختنہ کرنا بھی سنت ہے، فرض واجب نہیں ہے۔ مگر اس کے تارکین کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔ جیسا کہ فرائض کے تارکین کے ساتھ روا ہے۔

فرمایا اگر تم اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے سود کو چھوڑ دو، تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے۔ وہ تم لے سکتے ہو۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝

نہ تم کسی پر زیادتی کرو اور نہ تمہارے ساتھ ظلم کیا جائے گا۔ چنانچہ حجۃ الوداع کے موقع پر حضور علیہ السلام نے اعلان فرمادیا کہ جاہلیت کی تمام رسومات کو اللہ تعالیٰ نے میرے پاؤں کے نیچے روند دیا ہے۔ تمام سودی کاروبار ختم ہو گئے ہیں۔ لہذا سب سے پہلے میں اپنے خاندان کے لوگوں کے سودی کاروبار ختم کرتا ہوں۔ حضرت عباسؓ کا سودی کاروبار بڑا وسیع تھا۔ آپ نے یکسر ختم کر دیا۔ اور سود کا ایک پیسہ تک لینے کی اجازت نہیں دی فرمایا کہ اپنی اصل رقم لے سکتے ہو تا کہ تمہیں بھی نقصان نہ ہو اور سود لے کر دوسرے کو بھی نقصان مست پہنچاؤ۔

تنگ دست مقروض
کیلئے ہمت

اس کے بعد مقروض سے متعلق ایک خصوصی مسئلہ بیان کیا گیا ہے وَإِنْ كَانَ ذُو عُسْرَةٍ أَوْ لَمْ يَمْلِكْ مَقْرَضًا اور اگر عسرت ہے وعدہ کے مطابق قرض واپس نہیں کر سکتا فَنَظِرَةٌ إِلَىٰ مَيْسَرَةٍ تو اسے آسودگی تک ہمت دے دینی چاہیے۔ محدثین اور فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ آیت کی رو سے تنگ دست کو ہمت دینا واجب ہو جاتا ہے اور اگر مقروض جان بوجھ کر مال مٹول کر رہا ہے، تو وہ گناہ کبیرہ کا مرتکب ہوتا ہے۔ کیونکہ شرعاً موجود ہونے کے باوجود مال مٹول کرنا اور قرض کی ادائیگی سے اعراض کرنا ظلم کے مترادف ہے۔ اور ظالم شخص تعزیر کا مستحق ہوتا ہے۔ لہذا اگر شبہ ہو کہ مقروض کے پاس مال موجود ہے مگر ادا نہیں کرتا تو قرض خواہ عدالتی چارہ جوئی کر سکتا ہے۔ اور حاکم ایسے مقروض کو قید میں ڈال سکتا ہے۔ اگر اس کے پاس مال موجود ہے تو قرضہ ادا کر کے رہائی حاصل کر لے گا اور اگر عدالت کو یقین ہو جائے کہ یہ شخص قرضہ لوٹانے کے قابل نہیں ہے تو اسے ہمت دی جا سکتی ہے۔

معاذین
بہتر ہے

فرمایا وَإِنْ نَصَّدَ قَوْلًا خَيْرٌ لَّكُمْ اگر مقروض اس قدر مفلوک الحال ہے کہ قرضہ ادا کرنے کے قابل نہیں۔ تو ایسی حالت میں قرضہ بالکل معاف کر دینا ہی بہتر ہے۔ إِنْ كُنْتُمْ لَعَلَّكُمْ اگر تم کچھ جانتے ہو۔ بخاری اور مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے مَنْ أَنْظَرَ مُعْسِرًا جس نے تنگ دست مقروض کو ہمت دی أَوْ وَضَعَ عَنْهُ یا اسے بالکل معاف ہی کر دیا، تو فرمایا نبی علیہ الصلوٰۃ والسلام

نے کہ قیامت کے دن ایسا شخص اللہ تعالیٰ کے عرش کے سامنے میں ہوگا۔ اور وہ ایسا دن ہوگا جس دن عرش کے سامنے کے سوا کوئی سایہ نہیں ہوگا۔ بخاری شریف میں حضور علیہ السلام نے کسی سابقہ امت کے ایک شخص کا واقعہ بیان فرمایا ہے۔ کہ ایک شخص اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں پیش ہوگا جس کے پاس کوئی نیچی نہ ہوگی۔ اللہ تعالیٰ فرمائیں گے — دیکھو اس نے کوئی

نیکی کی ہے۔ دریافت کرنے پر وہ شخص عرض کرے گا کہ میرے پاس نیکی تو کوئی نہیں ہے البتہ ایک بات یہ ہے کہ میں تجارت کرتا تھا۔ نوکر چاکر تھے۔ لوگ مجھ سے قرضہ بھی لیتے تھے۔ میں نے نوکروں کو حکم دے رکھا تھا کہ تنگہ ست کو مہلت دے دیا کرو۔ ایسے شخص پر سختی نہ کیا کرو۔ اس پر اللہ تعالیٰ فرشتوں کے سامنے فرمایا گَنُّنُ أَحَقُّ ہم درگزر کرنے کے زیادہ لائق ہیں۔ یہ شخص دنیا میں تنگہ ستوں سے درگزر کرتا تھا، لہذا آج میں نے اسے معاف کر دیا۔ اسی لیے فرمایا کہ اگر تم قرضہ معاف کر دو، تو یہ تمہارے لیے بہتر ہے۔ اگر تم اس عمل کی حقیقت کو جانتے ہو۔

سودی نظام کی بیخ کنی کے لیے حکومت وقت پر بہت بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ جو حکومت سودی نظام کی سرپرستی کرتی ہے، وہ مٹانے کے قابل ہے ورنہ لوگوں کو کبھی سکون نصیب نہیں ہو سکتا۔ فرماتے ہیں کہ زمین میں دو چیزوں کا ہونا ضروری ہے۔ ایک اللہ وحدہ لا شریک کی عبادت اور دوسرے سود کا قلع قمع۔ سودی نظام کا قیام یہودیت کی سرپرستی ہے۔ ناجائز منافع خوری مخرب اخلاق چیز ہے اور قابل مذمت ہے۔ اسلام نے اس کو مٹانے کا سختی سے حکم دیا ہے۔ مگر آج کی دنیا میں کتنے ملک ہیں جو سودی نظام سے پاک ہیں؟ ہر ملک کے ہر ملک میں سودی کاروبار ہو رہا ہے۔ حالانکہ مسلمان ممالک میں غیر مسلموں کو بھی سودی کاروبار کی اجازت نہیں۔ غیر مسلموں کے ہاں شراب نوشی جائز ہے۔ لہذا وہ پی سکتے ہیں۔ مگر اسلامی حکومت میں اس کی تجارت نہیں کر سکتے۔ اسی طرح وہ سورا کا گوشت حلال سمجھ کر کھا سکتے ہیں مگر سود حرام ہے، وہ نہیں لے سکتے۔ یہ اتنی بُری

حکومت وقت
کی ذمہ داری

واجب نہیں ہے مگر اس کے تارکین کے ساتھ بھی ایسا ہی سلوک کیا جائے گا۔
جیسا کہ فرائض کے تارکین کے ساتھ روا ہے۔

فرمایا اگر تم اللہ کے حکم کی اطاعت کرتے ہوئے سود کو چھوڑ دو، تو تمہارا اصل مال تمہارا ہی ہے۔ وہ تم لے سکتے ہو۔ لَا تَظْلِمُونَ وَلَا تُظْلَمُونَ ۝

چیز ہے۔ بہر حال سورہ کے متعلق بعض تفصیلات بیان ہو گئیں، کچھ مزید باتیں سورہ آل عمران اور سورہ روم میں بھی آئیں گی۔

سورہ کے مسائل بیان کرنے کے بعد فرمایا کہ اگر ان احکام پر عمل نہیں کر دے۔ آخرت میں محاسبہ تو وَاتَّقُوا يَوْمًا تُرْجَعُونَ فِيهِ إِلَى اللَّهِ اُس دن سے ڈراؤ، جس میں تم اللہ تعالیٰ کی طرف لوٹائے جاؤ گے یعنی قیامت کا دن آنے والا ہے۔ وہاں پر ہر شخص کا محاسبہ ہوگا ثُمَّ تَوَفَّى كُلُّ نَفْسٍ مَّا كَسَبَتْ پھر ہر نفس کو اُس کے کئے کا بدلہ دیا جائیگا وَهُمْ لَا يَظْلَمُونَ اور اُن پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔

مفسرین کہہ رہے ہیں کہ قرآن پاک کی سب سے آخر میں نازل ہونے والی یہی آیت ہے۔ اس کے بعد کوئی آیت نازل نہیں ہوئی۔ اس سے پہلے حضور علیہ السلام کی وفات سے تین ماہ قبل حجۃ الوداع کے موقع پر عرفہ اور جمعہ کے دن الْيَوْمَ اكْمَلْتُ لَكُمْ دِينَكُمْ والی آیت نازل ہوئی تھی۔ مگر یہ آیت وَاتَّقُوا يَوْمًا..... سب سے آخر میں نازل ہوئی۔ بعض روایات کے مطابق اس آیت کے نزول کے بعد آپ اس دنیا میں ۲۲ دن تک تشریف فرما رہے۔ شاہ رفیع الدین کی تفسیر کے مطابق آپ صرف تین دن بعد خالق حقیقی سے جا ملے۔ بہر حال حجۃ الوداع والی آیت کے ذریعہ اللہ نے تکمیل دین کا اعلان فرمایا اور پھر اس آخری آیت میں محاسبہ کی یاد دہانی کر کے وحی کا سلسلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا۔ اس آیت کو سورہ بقرہ میں اسی مقام پر رکھنے کا حکم بھی خود اللہ تعالیٰ نے وحی کے ذریعے دیا۔

يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا إِذَا تَدَايَنْتُمْ بِدِينٍ إِلَىٰ آجَلٍ مِّمَّنِّي
فَاكْتُبُوهُ ۖ وَلْيَكْتُبَ بَيْنَكُمْ كَاتِبٌ بِالْعَدْلِ وَلَا يَأْبَ
كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ اللَّهُ ۚ فَلْيَكْتُبْ ۚ وَلْيُمْلِلِ
الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا يَبْخَسَ مِنْهُ
شَيْئًا ۖ فَإِنْ كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا
أَوْ لَا يَسْتَطِيعُ أَنْ يُمْلِلَ هُوَ فليُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ

تین جہیں: اے ایمان والو! جب تم آپس میں ادھار کا معاملہ کرو وقت مقررہ تک
تو اس کو لکھ لیا کرو۔ اور چاہیے کہ تمہارے درمیان لکھے کوئی لکھنے والا انصاف کے
ساتھ۔ اور نہ الکار کرے کوئی کاتب (لکھنے والا) اس بات سے کہ وہ لکھے جیسا کہ اس کو
اللہ تعالیٰ نے سکھایا ہے۔ اور اس کو چاہیے کہ وہ لکھ دے۔ اور چاہیے کہ کھوائے وہ شخص
جس کے اوپر حق ہے۔ اور اس کو چاہیے کہ اللہ سے ڈرتا ہے جو اس کا پروردگار ہے اور
اس میں سے کسی چیز کو کم نہ کرے۔ اور اگر وہ شخص جس کے اوپر حق ہے، بے عقل ہے یا
کمزور ہے، یا لکھنے کی طاقت نہیں رکھتا، پس چاہیے کہ کھوئے اس کا سرپرست
انصاف کے ساتھ۔

اس سورۃ کے چھتیسویں رکوع سے مالی مسائل بیان ہو رہے ہیں۔ پہلے صدقہ و
خیرات کے متعلق مختلف مسائل کا ذکر ہوا۔ پھر سود کی حرمت اور اس کے احکام بیان
ہوئے۔ اب اس رکوع میں اللہ تعالیٰ نے قرض یا ادھار کے قوانین نازل فرمائے
ہیں۔ یہ ایک دوسرے کے ساتھ کین دین کے معاملات ہیں۔ ان میں تین بنیادی
قوانین ہیں اور ان کے ساتھ کچھ ضمنی مسائل ہیں۔ بنیادی قوانین میں

دست ویز کی تیاری، گواہ کا تقرر اور رہن کی تفصیلات شامل ہیں ان کے ذریعے ادھار کے معاملات میں کسی ممکنہ تنازعہ سے بچا جاسکتا ہے۔ آج کے درس میں تحریر یعنی دستاویز کی تیاری کے متعلق احکام ہیں۔ آج کے دور میں تحریر کر لینا ایک معمولی بات نظر آتی ہے۔ کیونکہ تعلیم عام ہے۔ اور یہ کام آسانی کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ مگر چودہ صدیاں قبل جب کوئی پڑھا لکھا آدمی خال خال ہی نظر آتا تھا، تحریر کو بڑی اہمیت حاصل تھی۔ اُس وقت لوگ اپنے معاملات عموماً زبانی ہی طے کرتے تھے جس کی وجہ سے اکثر جھگڑے پیدا ہو جاتے تھے۔ لہذا تحریر کے یہ احکام نازل کیے گئے۔

کسی امر میں تحریر کر لینا کوئی فرض واجب تو نہیں مگر معاملات کی درستگی کیلئے مستحب کے درجہ میں آتا ہے معاملہ طے کرنے پر بعد آدمی بھول بھی سکتا ہے کہ کیا شرط تھیں کتنی مدت مقرر تھی نسی ادم قنیت ذریت کے مصداق حضرت آدم علیہ السلام سے چوک ہوئی تو ان کی اولاد بھی بھول جاتی ہے۔ جس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ بات لڑائی جھگڑے تک پہنچتی ہے اگر تحریر موجود ہوگی۔ تو تنازعہ کے وقت کام آئیگی۔ اور کوئی عدالت اس تحریر کی بنا پر فیصلہ کرے گی، اسی لیے اللہ تعالیٰ نے دستاویز کے احکام نازل فرمائے تاکہ معاشرہ میں اس وجہ سے بگاڑ پیدا نہ ہو۔ اسی لیے مولانا عبید اللہ سندھی فرماتے ہیں کہ تعلیم جبری ہونی چاہیے تاکہ لوگ معاملات کو درست رکھ سکیں۔

ارشاد ہوتا ہے۔ يَا أَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا لِيُذِلَّ لَكُمْ إِذَا تَدَايَيْتُمْ
بِذَيْنِ إِلَىٰ آجَلٍ مُّسَمًّى جب تم کسی خاص مدت تک ادھار کا معاملہ کرو فَاكْتُبُوهُ
 پس اس کو لکھ لیا کرو۔ وَلْيَكُتَبْ بَيْنَكُمُ الْكَاتِبُ بِالْعَدْلِ اور چاہیے کہ تمہارے
 درمیان لکھنے والا انصاف کے ساتھ لکھے۔ اس میں کوئی کمی بیشی نہ کرے۔ کیونکہ
 قلم کا فتنہ بہت بڑا فتنہ ہے۔ لِبَا أَوْقَاتٍ اسکی وجہ سے بڑا نقصان اٹھانا پڑتا ہے
 لہذا کاتب کے لیے ضروری ہے۔ وَلَا يَأْبَ كَاتِبٌ أَنْ يَكْتُبَ كَمَا عَلَّمَهُ
اللَّهُ کہ وہ لکھنے سے انکار نہ کرے جب کہ اللہ نے اُسے علم دیا ہے۔ فَلْيَكُتَبْ
 بلکہ چاہیے کہ وہ لکھ دے یعنی جب کسی ان پڑھ شخص کو تحریر کی ضرورت ہو تو پڑھے

لکھے آدمی کو اسکی مدد کرنا چاہیئے۔ اور حسب ضرورت تحریر کر دینی چاہیئے اللہ تعالیٰ نے علم کی جو نعمت اُسے عطا کی ہے۔ اس میں بخل نہیں کرنا چاہیئے، بلکہ اللہ کا شکر ادا کرنا چاہیئے۔ کہ اُس نے علم کی دولت دی تو اُسے خدمتِ خلق کا موقع ملا۔

حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی ہے۔ اِنَّ مِنَ الصَّدَقَةِ اَنْ تَعِيْنَ صَانِعًا اَوْ تَصْنَعَ لَهَا خَرْقًا یہ بھی صدقہ میں شامل ہے۔ کہ تو کسی کاریگر کی مدد کر دے یا کسی بے ہنر آدمی کو کوئی چیز بنا کر دے دے۔ اس اصول کے مطابق اگر کوئی شخص ان پڑھ ہے۔ خود لکھ پڑھ نہیں سکتا۔ تو اس کی فرائض پر تحریر کر دینا بھی صدقہ میں شامل ہے۔ علاوہ انہیں اپنے علم سے دوسروں کو مستفید نہ کرنے والوں کے لیے حدیث شریف میں وعید بھی آئی ہے۔ مَنْ سُبِّلَ عِلْمًا يَعْلَمُهُ جَسَاسًا كُفِيَ اِيْسَىٰ بَاتِ دِرْيَانَتِ كُفِيَ جَسَاسًا جَسَاسًا جَسَاسًا فَنَكَمَتْهُ پھر اُس نے اُسے چھپایا۔ اے شخص کے متعلق فرمایا اَلْجَحْمُ بِلِجَامٍ مِّنْ نَّارٍ يَوْمَ الْقِيَامَةِ قیامت کے دن ایسے شخص کے منہ میں آگ کی لگام ڈالی جائے گی۔ کیونکہ اس نے دانستہ چیز کو چھپا لیا۔ لہذا کاتب کے لیے ضروری ہے۔ کہ وہ اپنے علم کے مطابق حق و انصاف کے ساتھ تحریر کر دے۔

البتہ یہ بات ذہن میں ہے۔ کہ کاتب کے لیے تحریر کرنا واجب نہیں ہے۔ بلکہ یہ مستحب کا درجہ رکھتا ہے مطلب یہ کہ کسی شخص کو مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ کہ وہ ضروری یہ فرائض پوری کرے، اُسے انکار کرنے کا اختیار ہے۔ اور اگر لکھائی کی اجرت لینا چاہے۔ تو مناسب معاوضہ بھی مانگتا ہے۔ تاہم کچھ دینا بہتر ہے۔ کیونکہ مستحق بات ہے۔ اور اللہ تعالیٰ نے اسکی ترغیب دلائی ہے تاکہ ضرورت مند کی خدمت کی جائے کہ یہ بھی خدمتِ خلق کا ایک حصہ ہے۔

قرض اور دین (ادھار) میں قدرے فرق ہے۔ اگرچہ دونوں الفاظ ادھار کے معنوں میں بھی استعمال ہوتے ہیں۔ مگر ادھار یا دین عام ہے۔ اور قرض خاص ہے قرض صرف رقم کے ادھار پر بولا جاتا ہے۔ جب کہ دین میں ہر قسم کا ادھار شامل ہے خواہ وہ نقد رقم کا لین دین ہو یا کسی چیز کے بدلے میں ادھار ہو۔ قرض کے متعلق

قرض اور دین
میں فرق

پہلے بیان ہو چکا ہے "مَنْ ذَا الَّذِي يَقْرَضُ اللَّهَ قَرْضًا حَسَنًا" جو اللہ کو قرض حسن
 دے۔ یعنی کسی ضرورت مند کو مقررہ مدت کے لیے نقد رقم ادھار پر دے دے اور اس سے
 زائد وصول نہ کرے۔ اگر نقد رقم کی واپسی پر اُس کے ساتھ کچھ زائد وصول کرے گا تو وہ
 سود ہوگا، جس کی حرمت کا بیان آچکا ہے۔ البتہ اگر کسی چیز کے تبادلے کے ضمن میں کوئی
 نقد رقم واجب الادا ہے۔ تو وہ ادھار ہے۔ اس صورت میں چیز نیچنے والا اپنی
 اصل لاگت سے زائد بھی لے سکتا ہے۔ جسے منفعہ کہتے ہیں۔ اور یہ جائز ہے۔ اس
 آیت کریمہ میں اسی بات کا تذکرہ ہے۔ کہ جب تم مقررہ مدت کے لیے ادھار کا معاملہ
 کرو، تو اسے لکھ لیا کرو۔ کوئی شخص مکان یا زمین بیچتا ہے۔ کوئی جانور فروخت کرتا ہے
 جنس کا سودا ہوتا ہے۔ اور رقم کی ادائیگی کے لیے تاریخ یا وزن کا تقرر ہوتا ہے۔ تو مشتری
 کے دے دینے یعنی ادھار ہے۔ جو وہ مقررہ تاریخ پر ادا کرنے کا پابند ہے۔ عام طور
 پر خرید و فروخت نقد ہوتی ہے۔ مالک کے پاس چیز موجود ہے۔ اور گاہک کے پاس
 رقم موجود ہے۔ تو تبادلہ دست بدست ہو جائیگا۔ اور اگر گاہک قیمت کی ادائیگی کے لیے
 مہلت طلب کرے۔ تو یہ ادھار کہلائے گا۔ ہاں اگر دونوں طرف چیز موجود نہ ہو۔ نہ
 تو مالک کے پاس چیز موجود ہے اور نہ گاہک کے پاس رقم اور سودا طے پا جاتا ہے
 مثلاً زمیندار کہتا ہے کہ آئندہ فصل پر میں فلاں جنس اس بھائے پر فروخت کروں گا۔ یا
 کارخانے کی فلاں مینے کی فلاں پیداوار تینے دام میں دوں گا، اور گاہک اُسے تسلیم کر
 لیتا ہے۔ تو شرعی اصطلاح میں اسے "بیع الکالی بالکالی" کہتے ہیں۔ یہ ناجائز ہے
 فقہی عن بیع الکالی بالکالی ایسی خرید و فروخت شریعت نے منع کر دیا ہے۔

بیع سلم

خرید و فروخت کی باقی دو صورتیں جائز ہیں۔ ایک صورت یہ ہے کہ قیمت
 موجود ہے مگر چیز موجود نہیں وہ ادھار ہے۔ اس کو بیع سلم کہتے ہیں حضور علیہ السلام
 کا ارشاد ہے۔ فَلْيَسْلَمْ فِي كَيْلٍ مَعْلُومٍ وَوزنٍ مَعْلُومٍ إِلَى أَحْبَلٍ
 یعنی بیع سلم بعض شرائط کے ساتھ جائز ہے۔ جب کہ اس کی پیمائش، وزن یا مدت
 معلوم ہو اور جگہ بھی معلوم ہو۔ فقہائے کرام فرماتے ہیں۔ کہ جنس بھی معلوم ہونی چاہیے

اور بجاؤ طے کر لینا ضروری ہے۔ مثلاً دو فریقوں کے درمیان طے پانا ہے۔ کہ فلاں چیز یا جنس کا اتنے تول یا ماپ میں فلاں تاریخ کو اس بجاؤ سے لین دین ہوگا۔ چنانچہ قیمت نقد ادا کر کے سودا طے پاتا ہے۔ تو یہ درست ہے۔ چیز کے ماپ تول میں کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ اور بجاؤ کے مطابق اس کی کل قیمت میں بھی کمی بیشی ہو سکتی ہے۔ بیع سلم کے لیے بعض دیگر شرائط بھی ہیں۔ مثلاً یہ کہ سوئے کی مدت کم از کم پندرہ دن ہونی چاہیئے۔ بعض نے ایک ماہ کا تعین کیا ہے۔ ایک شرط یہ بھی ہے کہ جس چیز کا سودا ہوا ہے وہ مارکیٹ سے بالکل معدوم نہ ہو بلکہ معاہدہ طے پاتے وقت بازار میں موجود بھی ہو۔ اس قسم کی بیع میں مدت تبادلہ واضح ہونی چاہیئے۔ اگر مدت کا تعین نہیں ہوگا تو بیع درست نہ ہوگی۔ مثلاً اس قسم کا معاہدہ ہوتا ہے۔ کہ جس کا تبادلہ اس وقت ہوگا جب فصل پکے گی جب کہ فصل پکنے اور کٹنے کی صحیح تاریخ معلوم نہیں۔ اسی طرح کوئی شخص یہ سودا کرتا ہے۔ کہ جب جانور بچہ دیکھا، اُس وقت قیمت ادا کی جائے گی۔ اس قسم کی مجہول مدت قابل قبول نہیں اور ایسی بیع فاسد شمار ہوگی۔ اَجَلٌ مُّسَمًّى کا لفظ وضاحت کر رہا ہے۔ کہ مدت کا تعین لازمی ہے کہ فلاں دن یا فلاں تاریخ کو چیز وصول کی جائے گی۔ اور اگر مدت مجہول ہو تو اسے بیع الغمر کہتے ہیں۔ یہ دھوکے والی بیع ہے۔ اور شریعت کی رو سے ناجائز ہے۔

بیع سلم کی دوسری صورت یہ ہے۔ کہ چیز موجود ہے، وہ گاہک وصول کر لیتا ہے۔ مگر قیمت فوری طور پر ادا نہیں کرتا بلکہ خاص مدت کے لیے ادھار کر لیتا ہے۔ یہ بھی جائز ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ حضرت عائشہ صدیقہؓ نے عرض کیا حضور! آپ کے پاس اوڑھنے کے لیے کپڑا نہیں ہے۔ فلاں یہودی کے ہاں کپڑا موجود ہے۔ آپ پیغام بھیج کر کپڑا ادھار لے لیں۔ اور مدت مقررہ پر رقم ادا کر دیں۔ حضور علیہ السلام نے یہودی کو ایسا پیغام بھیجا تھا، مگر اُس نے کپڑا دینے سے انکار کر دیا تھا۔ تاہم بیع کی یہ صورت بھی جائز ہے۔ مدت مقرر کر کے قیمت کا ادھار کیا جاسکتا ہے۔

ادائیگی قرض کا
عجیب واقعہ

قرض کی واپسی کس قدر ضروری ہے۔ اس کے متعلق حضور علیہ السلام نے سابقہ امت کا ایک عجیب و غریب واقعہ بیان فرمایا۔ فرماتے ہیں۔ ایک شخص نے دوسرے سے مقرضہ مدت کے لیے ایک ہزار دینار قرض لیا۔ قرض خواہ نے کہا۔ کہ کوئی گواہ لاؤ، تو ضرورت مند کہنے لگا۔ میرا گواہ تو اللہ ہی ہے۔ پھر اُس نے کہا، کوئی ضامن ہی لاؤ۔ تو وہ کہنے لگا، میرا ضامن بھی اللہ ہی ہے۔ غرض اس نیک دل آدمی نے بغیر گواہ اور ضامن کے ایک ہزار دینار قرض میں مے میے۔ اتفاق ایسا ہوا۔ کہ جب قرض کی ادائیگی کا وقت آیا، تو مقرض دریا سے اُس پار سفر پر تھا، تاہم اُسے ادائیگی قرض کی ذمہ داری کا احساس تھا۔ وہ کنارے پر آیا، مگر کوئی کشتی نہ پائی جو اُسے دوسرے کنارے پر پہنچا دے۔ سخت پریشان تھا کہ قرض کی ادائیگی وقت پر نہ ہو سکے گی۔ اسی سوچ بچار میں اُس نے دونوں ہاتھ اللہ کی بارگاہ میں دعا کے لیے اٹھائیے اور عرض کیا، مولاکرمیم! میں نے فلاں شخص کے ساتھ وعدہ کیا تھا۔ کہ اس کی رقم فلاں تاریخ کو لوٹا دوں گا۔ رقم موجود ہے۔ مگر دریا کے پار جانے کے لیے سواری موجود نہیں۔ اگر قرض خواہ کو رقم وقت پر نہیں ملتی تو وعدہ خلافی ہوتی ہے۔ اے اللہ! اب تو ہی اس کا انتظام فرما۔ آخر اس کے دل میں ایک خیال آیا۔ اُس نے ایک لکڑی لی۔ اس کو کھوکھلا کر اس میں ایک ہزار دینا اور قرض خواہ کے نام ایک رقم رکھ دیا۔ پھر اس کا منہ اچھی طرح بند کر کے اس کو دریا میں ڈال دیا اور خود پھر ادھر ادھر کشتی تلاش کرنے لگا۔ اُدھر قرض خواہ کو یاد آیا کہ آج قرض کی ادائیگی کی تاریخ ہے۔ اور مقرض دریا سے اُس پار گیا ہو گا۔ پتہ نہیں آتا ہے یا نہیں۔ اسی خیال میں وہ دریا کے کنارے پہنچا۔ مگر دوسری طرف سے کوئی کشتی آتی دکھائی نہ دی۔ وہ مایوس ہو گیا۔ وہ واپس آنے ہی والا تھا۔ کہ اُسے بہتی ہوئی ایک لکڑی نظر آئی۔ اُسے قریب سے لکڑی کو پکڑ لیا کہ گھر میں کسی کام آئے گی۔ یا ایندھن کے طور پر ہی استعمال کر لیں گے۔ گھر پہنچ کر جب اس کو توڑا گیا۔ تو اس میں سے ایک ہزار دینار اور مقرض کا رقم ملا۔ وہ شخص اپنا قرض واپس پا کر مطمئن ہو گیا۔

کئی دن بعد مقرض شخص کو کشتی میسر آگئی چنانچہ وہ دریا پار کر کے قرض خواہ کے ہاں پہنچا۔ اور اُسے ایک ہزار دینار پیش کیے۔ اس کے ساتھ معذرت بھی کی کہ وہ قرض کی رقم مقررہ تاریخ پر نہ لوٹا سکا۔ کیونکہ اُسے کشتی میسر نہیں آئی تھی۔ مگر قرض خواہ نے یہ کہہ کر رقم لینے سے انکار کر دیا کہ مجھے رقم واپس مل چکی ہے۔ جب مقرض نے زیادہ اصرار کیا تو قرض خواہ نے کہا کہ تم حلفیہ بیان کرو کہ کیا تم نے ایک ہزار دینار لکڑی میں بند کر کے سمندر میں نہیں بہا دیے تھے۔ آخر کار اُسے تسلیم کرنا پڑا کہ اُس نے واقعی تاریخ مقررہ پر ایسا ہی کیا تھا۔ چنانچہ ان کے درمیان تصفیہ ہو گیا۔ یہ واقعہ نبی علیہ السلام سے صحیح سند کے ساتھ وارد ہوا ہے۔ اس قسم کے واقعات اللہ تعالیٰ کی قدرت کے نمونے ہوتے ہیں۔ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ واقعہ بیان کر کے مسلمانوں کو یاد دلایا کہ کچے کچے مسلمانوں کا شیوہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ جیسے ان دو مسلمانوں کا تھا۔ کہ قرض دینے والے نے اپنی ذمہ داری کا احساس کیا۔ اور لینے والے نے دوبارہ رقم لینے سے انکار کر دیا۔ مگر آج کے مسلمان کا حال یہ ہے۔ کہ مقررہ تاریخ گزر جاتی ہے۔ قرض خواہ پیچھے پیچھے پھرتا ہے۔ اور مقرض ٹال مٹول کرتا چلا جاتا ہے۔ حتیٰ کہ نوبت لڑائی جھگڑے تک پہنچتی ہے۔ نہ مقرض کو اپنی ذمہ داری کا احساس ہے۔ اور نہ قرض خواہ اسکی مجبوری کو سمجھتا ہے دونوں خود غرضی کا شکار ہیں۔ ایک دوسرے کی بات سننے کو تیار نہیں ہوتے۔ نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ انسانی ہمدردی مفقود ہو جاتی ہے جس سے معاشرے میں بگاڑ پیدا ہوتا ہے۔ مذکورہ مثال سے یہی نتیجہ نکلتا ہے۔ کہ جب فریقین نیک نیت ہوں تو پھر اللہ تعالیٰ بھی ان کی مدد فرماتا ہے۔

دستاویز کی اہمیت کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ نے یہ بھی واضح کر دیا کہ دستاویز کی تیاری کس کا حق ہے۔ یعنی کون فریق اس کو لکھوانے کا حقدار ہے۔ فرمایا وَلْيُمْلِلِ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ مَعْنٰی تحریر وہ شخص کرائے جکے اوپر حق ہے۔ اور وہ ملوٹن یا مقرض ہے۔ اُسے چاہیے کہ وہ قرضہ کی شرائط ٹھیک ٹھیک لکھوائے۔ اور اس معاملہ میں کسی قسم کی زیادتی نہ کرے۔ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ اور اپنے پروردگار سے ڈر جائے۔

تحریر ملوٹن کا حق ہے

وَلَا يَبْخَسُ مِنْهُ شَيْئًا اور تحریر کرتے وقت کسی چیز کی کمی نہ کرے، بلکہ دستاویز بالکل درست طور پر لکھوائے کہ اتنی رقم یا فلاں چیز قرض پر لی گئی ہے۔ اور یہ فلاں تیسرے کو فلاں جگہ واپس کر رہی ہے۔ بعض اوقات لکھاتے وقت بھی ڈنڈی مار جاتے ہیں۔ اور تحریر میں زبانی معاہدے کے برخلاف لکھواتے ہیں، ایسا نہیں ہونا چاہیے اور انصاف کی بجائے ظلم قائم ہو جاتا ہے۔

بعض اوقات ایسا ہوتا ہے کہ لکھوانے والا اس قابل نہیں ہوتا کہ وہ درست طریقے سے دستاویز تیار کر سکے۔

ایسی صورت کے متعلق فرمایا: كَانَ الَّذِي عَلَيْهِ الْحَقُّ سَفِيهًا أَوْ ضَعِيفًا اُولَٰئِكَ يَسْتَطِيعُ أَنْ يَمْلِكَ هُوَ لَعْنَةُ اللَّهِ اَلَّذِي اِذَا مَقْرُوضٌ جِئَ دَسْتَاوِيزُ لِكُھْوَانِ كَا حَقِّ هٖ اَبَ عَقْل هٖ اِضْعِيفَ هٖ۔ یا تحریر کرنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ مقصد یہ کہ اس میں کوئی ایسی فطری کمزوری ہے جسکی بنا پر وہ درست تحریر کرنے سے قاصر ہے۔ ایسا کم عقل ہے۔ کہ معاملے کو سمجھتا نہیں۔ یا بہت کمزور یا بوڑھا ہے کہ وہ اس درست نہیں یا زبان نہ جاننے کی وجہ سے لکھانے کی استطاعت نہیں رکھتا، تو فرمایا فَلْيُمْلِلْ وَلِيُّهُ بِالْعَدْلِ اس کے ترجمان، ولی، سرپرست، نمائندہ یا وکیل کی ذمہ داری ہے کہ وہ انصاف کے ساتھ تحریر مکمل کر دے۔ اور کسی قسم کی رو رعایت نہ کرے۔ اور ہمارے متعلق باقی دو قوانین یعنی گواہی اور رہن کا ذکر آئندہ دروس میں آئیگا۔

وَأَسْتَشْهِدُوا شَهِيدَيْنِ مِنْ رِجَالِكُمْ فَإِنْ لَمْ يَكُونَا
 رَجُلَيْنِ فَرَجُلٌ وَامْرَأَتَانِ مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشُّهَدَاءِ
 أَنْ تَضِلَّ إِحْدَاهُمَا فَتُذَكِّرَ إِحْدَاهُمَا الْأُخْرَىٰ وَلَا
 يَأْبَ الشُّهَدَاءُ إِذَا مَا دُعُوا وَلَا تَسْعَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا
 أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلِهِ ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ وَأَقْوَمُ لِشَهَادَةٍ
 وَأَذْنَىٰ لَا تَرْتَابُوا إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُونَهَا
 بَيْنَكُمْ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا وَأَشْهِدُوا
 إِذَا تَبَايَعْتُمْ وَلَا يُضَارَ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ وَإِنْ تَفَعَّلُوا
 فَإِنَّهُ فُسُوقٌ بِكُمْ وَاتَّقُوا اللَّهَ وَيَعْلَمَ اللَّهُ اللَّهُ وَاللَّهُ بِكُلِّ
 شَيْءٍ عَلِيمٌ ﴿۲۸۲﴾

تہجہ ۲: اور گواہ بنالو دو گواہ اپنے مردوں میں سے۔ پس اگر نہ ہوں "مرد" تو ایک مرد
 اور دو عورتیں ان میں سے جن کو تم گواہوں میں سے پسند کرتے ہو اس وجہ سے کہ
 اگر ان دو عورتوں میں سے ایک بھول جائے تو دوسری اس کو یاد دلائے۔ اور
 گواہ انکار نہ کریں جس وقت ان کو بلایا جائے گواہی کے لیے، اور نہ دیگر ہو اس
 بات سے کہ کچھ تم معاملے کو چھوٹا ہو یا بڑا اس کی مدت تک، یہ بات زیادہ انصاف
 والی ہے اللہ کے نزدیک، اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی ہے۔ اور یہ
 زیادہ قریب ہے کہ تم شک نہ کرو مگر یہ کہ درست بدست تجارت ہو جس کو تم اپنے
 درمیان گردش دیتے ہو۔ اور تم پر گناہ نہیں ہے۔ اس بات میں کہ اسے نہ لکھو، اور
 گواہ بنالو جس وقت تم سودا کرتے ہو، اور نہ نقصان پہنچایا جائے لکھنے والے کو

اور دو گواہ کو، اگر تم ایسا کر دے تو یہ تمہارے اندر فتنہ اور نافرمانی والی بات ہوگی۔ اور اللہ سے ڈرتے رہو۔ اور اللہ تم کو سکھاتا ہے۔ اور اللہ تعالیٰ ہر چیز کو بخشنا والا ہے (۲۸۲)

ادھار کے معاملے سے متعلق تین قوانین کا ذکر گذشتہ درس میں ہو چکا ہے یعنی دستاویز کی تیاری، گواہی اور رہن۔ ان میں دستاویز یعنی تحریر کے احکام بیان ہو چکے ہیں۔ آج کے درس میں گواہی سے متعلق احکام ہیں اور اس کے ساتھ تحریر کی دوبارہ تاکید آئی ہے۔ البتہ دوسرے اصول یعنی رہن کا ذکر اگلی آیت کریمہ میں آئے گا۔

آپس میں لین دین کرتے وقت یا کوئی دیگر معاملہ طے کرتے وقت مندرجہ بالا **اِسْتَشْهِدُوا مَشْهَدَيْنِ مِنْ رَجَالِكُمْ** اپنے میں سے دو گواہ مقرر کر لو۔ گواہی کی ضرورت مختلف معاملات میں پڑتی ہے۔ مثلاً مقدمات میں سے فوجداری مقدمہ اور دیوانی مقدمہ میں گواہی کے معیار مختلف ہیں۔ اسی طرح دینی معاملات اور نبوی معاملات میں گواہی کی شرائط مختلف ہیں۔ تو جس قسم کا معاملہ درپیش ہوگا اس کے مطابق گواہی کی شرائط عائد ہونگی۔ عام معاملات میں اس آیت کی روشنی میں از کم دو گواہ ہونے چاہئیں مگر حدیث نبوی کی روایت کے متعلق ایک نکتہ درمی کی شہادت بھی کافی ہے۔ عام معاملات میں آزاد مرد کی گواہی قابل قبول ہوتی ہے، غلام کی گواہی معتبر نہیں ہوتی۔ روایت کے مسئلہ میں اگر استاد اور شاگرد یا مجلس میں موجود ہوں تو شاگرد کی روایت مقبول ہے۔ مگر دنیوی معاملہ میں شہادت علی الشہادۃ کا اصول تسلیم کیا جاتا ہے۔ جب اصل موجود ہو، تو فرع کی گواہی معتبر نہیں سمجھی جاتی۔ یعنی اصل کی موجودگی میں فرع گواہی نہیں دے سکتا۔

اس آیت کریمہ میں جس گواہی کا ذکر ہے، وہ عام معاملات سے متعلق ہے ان میں سے فوجداری مقدمات میں سے حدود و قصاص کے مقدمات میں صرف مردوں کی گواہی قابل قبول ہے۔ عورتوں کی شہادت قبول نہیں کی جاتی۔ زنا کے مقدمہ میں سورۃ نور میں **بَارِئَةً مِّنْ بَارِئَةٍ مَّشْهُدًا** کا ذکر ہے۔ یعنی چار مرد علی گواہ

گواہی کی
شرائط

ہونے چاہئیں۔ وہاں پر عورتوں کی شہادت قابل قبول نہیں ہے۔ عام طور پر نابالغ بچے کی گواہی تسلیم نہیں کی جاتی مگر اہم مالک بعض شرائط کے ساتھ بچے کی گواہی بھی تسلیم کرتے ہیں۔ دیگر ائمہ کا موقف یہ ہے کہ گواہی کے سلسلے میں رجال کا لفظ استعمال ہوا ہے۔ جس سے مراد بالغ مرد ہے، مذکورہ نابالغ بچہ، اسی طرح مسلمان کی گواہی معتبر ہے۔ مگر کافر کی گواہی قابل قبول نہیں۔ جب کہ وہ مسلمان پر ہو۔ ہاں کافروں کی گواہی ایک دوسرے کے خلاف درست ہے۔ علاوہ انہیں گواہ کا عادل ہونا بھی شرط ہے۔ فاسق کی گواہی معتبر نہیں۔ جو شخص شرعی حدود کی علی الاعلان خلاف ورزی کرتا ہے۔ وہ فاسق ہے اور ایسے شخص کی گواہی بھی مقبول نہیں۔ پھر گواہ کے لیے یہ بھی شرط ہے کہ جس معاملے کے متعلق گواہی دے رہا ہے۔ اس معاملے کا اسے علم ہو۔ اگر اُسے علم ہی نہیں۔ تو پھر اس کی گواہی چہ معنی۔ وہ تو جھوٹا گواہ کہلائے گا۔

شہادت میں گواہ کا ذاتی مفاد نہیں ہونا چاہیے اگر اُسے کوئی ذاتی فائدہ پہنچ رہا ہے تو ایسی گواہی مردود ہوگی۔ یا اگر گواہ اس لیے گواہی دے رہا ہے کہ وہ خود کی نقصان پہنچ جائیگا تو ایسی شہادت بھی مقبول نہ ہوگی اسی طرح گواہ لالچی اور بے شرم نہیں ہونا چاہیے جبکہ خلاف گواہی دے رہا ہے اسے ساتھ کوئی ذاتی دشمنی نہیں ہونی چاہیے۔ دُر گواہی باطل ہو جائیگی فقہائے کرام فرماتے ہیں کہ جہاں تمام کا اطلاق ہوتا ہو وہاں بھی گواہی قبول نہیں کی جائیگی مثلاً باپ بیٹے کے باپے میں گواہی دے تو نا منظور ہوگی۔ یا غلام نوکر وغیرہ اپنے مالک کے حق میں گواہی نہیں دے سکتا۔ کیونکہ وہ محکوم ہے اور لازماً اپنے حاکم کے حق میں جگلا۔

فرمایا معتبر گواہی یہ ہے۔ کہ تم میں سے دو مرد گواہی دیں فَإِنْ لَمْ يَكُونا جَدِيلَيْنِ اور اگر دو مرد گواہ میسر نہ ہوں فَزَجِلْ وَأَمْرًا تَنْتِ تو ایک مرد اور دو عورتیں کافی ہیں۔ یعنی دو عورتوں کو ایک مرد کے برابر قرار دیا۔ اور یہ گواہ ایسے ہوں مِمَّنْ تَرْضَوْنَ مِنَ الشَّهَدَاءِ جو تمہیں پسند ہوں۔ ظاہر ہے۔ کہ پسند نہی ہونگے، جو نیک اور عادل ہوں گے۔ جن سے ٹھیک ٹھیک گواہی کی امید رکھی جاسکتی ہے۔ کیونکہ غیر ثقہ اور جھوٹ آدمی سے درست گواہی کی توقع نہیں کی جاسکتی۔

فرمایا ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کو اکٹھا رکھنے میں حکمت یہ ہے۔
أَنْ تَضِلَّ أَحَدُهُمَا۔ اگر ان میں سے ایک بھول جائے۔ فَذَكَرَ

عورتوں کی
گواہی

اِحْدَاهُمَا الْاُخْرٰی تو دوسری اسکو یاد دلانے کیلئے عورتیں عام طور پر مردوں کے مقابلے میں کمزور ہوتی ہیں، ان کے دماغ میں رطوبت کا مادہ زیادہ ہوتا ہے۔ اس لیے ان سے نسیان زیادہ واقع ہوتا ہے اور وہ بھول جاتی ہیں یہ ایک انسانی فطرت ہے وگرنہ بعض عورتیں بڑی ذہین ہوتی ہیں۔ بعض اوقات ایک لڑکی امتحان میں لڑنے کے لیے زیادہ نمبر حاصل کر لیتی ہے۔ بعض عورتوں کو اللہ تعالیٰ نے خاص صلاحیت بخشی ہوئی ہے۔ جس کی وجہ سے وہ بعض اوقات مردوں کے مقابلے میں زیادہ ذہین ثابت ہوتی ہیں۔ تاہم عام فطرت کے مطابق اللہ تعالیٰ نے یہ قانون عطا کیا۔ کہ چونکہ عورت کا مزاج اعصابی ہوتا ہے۔ اکثر بھول جاتی ہیں۔ اللہ نے دماغی کیفیت ہی ایسی بنائی ہے۔ لہذا ایک مرد کے مقابلے میں دو عورتوں کی گواہی مقبول ہوگی حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے ایک دفعہ خطبہ کے دوران فرمایا کہ عورتیں ناقصات العقل والبدن ہیں۔ ایک عورت نے عرض کیا کہ ہم ناقص العقل کیوں ہیں۔ ہم میں کیا کمزوری پائی جاتی ہے۔ آپ نے ارشاد فرمایا۔ کیا اللہ نے دو عورتوں کی شہادت ایک مرد کے برابر نہیں رکھی۔ تو اس نے عرض کیا۔ ہاں حضور ایسا ہی ہے۔ آپ نے فرمایا یہ عقل کی کمی کی وجہ سے ہے۔ عورت میں نسیان یعنی بھول کا مادہ زیادہ ہوتا ہے پھر فرمایا کہ عورتوں میں دین کا نقصان یہ ہے۔ کہ وہ ہر ماہ کئی روز تک نماز نہیں پڑھ سکتیں، روزہ نہیں رکھ سکتیں، یہ دین کا نقصان ہے۔ اگرچہ گناہ نہیں ہے۔ یہ ان کی مجبوری ہے مگر نقصان تو بہر حال ہے۔

شہادت اور قسم

یہ شہادت کا قانون ضروری ہے۔ کیونکہ حضور علیہ السلام نے ارشاد فرمایا کہ کسی مقدمہ کا فیصلہ دو طریقہ سے ہو سکتا ہے۔ یا تو فریقین گواہ پیش کریں گے یا فیصلہ قسم پر ہوگا۔ مسلم شریف کی روایت میں آتا ہے۔ قَضٰی بَیِّنٍ وَشَہَادٍ یعنی حضور علیہ السلام نے یا تو گواہوں پر فیصلہ فرمایا یا قسم پر۔ یعنی اگر گواہ موجود نہیں ہیں۔ تو پھر فیصلہ قسم کے ذریعے ہوگا۔ اہم شافعی فتویٰ بھی فرماتے ہیں کہ معاملات میں چونکہ دو گواہ ضروری ہیں۔ اور اگر دو کی بجائے صرف ایک ہی گواہ میسر ہو، تو دوسرے

گواہ کی کئی قسم اٹھانے سے پوری ہوگی، دیگر فیصلہ درست نہ ہوگا۔ امام ابو حنیفہؒ اور دیگر ائمہ کرام فرماتے ہیں۔ البینۃ علی المدعی والیصین علی من انکر یعنی گواہ پیش کرنا مدعی کی ذمہ داری ہے اور قسم اٹھانا مدعا علیہ کے ذمہ ہے۔ بہر حال حضورؐ نے بعض اوقات گواہوں پر فیصلہ کیا اور بعض اوقات قسم پر یعنی اگر موقع کا کوئی گواہ موجود نہیں ہے۔ تو مدعا علیہ کی بریت کے متعلق اس سے قسم اٹھوائی کہ وہ بے گناہ ہے۔

گواہ کی ذمہ داری

گواہوں کی حاضری کے متعلق اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا وَلَا يَأْبُ الشُّهَادَةُ إِذَا حَادُّعُوا اور جب گواہوں کو طلب کیا جائے تو وہ گواہی کے لیے آنے سے انکار نہ کریں۔ یہ ان کی ذمہ داری ہے۔ کوئی معاملہ الجھ گیا ہے۔ وہ موقع کے گواہ ہیں تو انصاف کا تقاضا ہے کہ وہ ٹھیک ٹھیک شہادت دیکر معاملہ کا تصفیہ کرادیں۔ یہ ان کی اخلاقی ذمہ داری بھی ہے۔ تاہم فقہائے کرام فرماتے ہیں، کہ گواہ کا گواہی دینا استجاب کے مرتبے میں ہے، اسے گواہی کے لیے مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ بل ان کے معاملہ اس پنج کا ہے کہ کوئی اور گواہ نہیں ہے۔ صرف یہی ایک گواہ ہے۔ جو شہادت دینے پر آمادہ نہیں۔ تو ایسی صورت میں اس پر واجب ہو جاتا ہے۔ کہ وہ گواہی کے لیے حاضر ہو، وہاں انکار کی کوئی گنجائش نہیں ایسے ہی معاملہ سے متعلق فرمایا۔ کہ جب گواہوں کو شہادت کے لیے طلب کیا جاوے تو وہ انکار نہ کریں۔

جھوٹی گواہی

حضور علیہ السلام نے جھوٹی گواہی (شہادت زور) کو شرک کے برابر قرار دیا ہے خود اللہ تعالیٰ نے سورۃ فرقان میں عباد الرحمن کی صفات بیان فرمائی ہیں ان میں یہ بھی ہے۔ "وَالَّذِينَ لَا يَشْهَدُونَ الزُّورَ" کہ وہ جھوٹی گواہی نہیں دیتے۔ جھوٹی گواہی دنیا سخت گناہ کی بات ہے۔ اس کی وجہ سے ہی جھوٹ کا سچ اور سچ کا جھوٹ بن جاتا ہے۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ انگریز کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق شہادت خود بنائی جاتی ہے۔ اس معاملہ میں گواہ آزاد نہیں ہوتا۔ کہ وہ اپنی صوابدید کے مطابق

شہادت دے بلکہ وکیل حضرات اور خود پولیس والے گواہ کو کھاتے پڑھاتے ہیں۔ کہ اس طرح کنسا ہے۔ اور اس طرح نہیں کہنا۔ یہ چیز دینا تدری کے خلاف ہے۔ اللہ تعالیٰ کا حکم قریم ہے۔ "أَقِمْ وَتَشْهَادَ لِلَّهِ" اللہ کے لیے بغیر کسی رو رعایت کے گواہی دو۔ کسی امیر غریب، چھوٹے بڑے اعلیٰ ادنیٰ کا لحاظ نہ کر دہمکہ صحیح صحیح واقعہ بیان کر دو۔ نہ کسی فریق سے ناجائز امید رکھو اور نہ کسی کے شر کا خوف دل میں لاؤ بلکہ گواہی کو محض اللہ کے لیے قائم کر دو۔ اگر یہ چیز پیدا نہ ہوگی، تو دنیا میں امن قائم نہیں ہو سکے گا۔ لوگ ذلیل و خوار ہی ہوتے رہیں گے۔ لہذا گواہی کو بڑی اہمیت حاصل ہے اس کے بغیر انصاف کے تقاضے پورے نہیں ہو سکتے۔

تحریر کی ضروری ہے

آیت کے اگلے حصے میں اللہ تعالیٰ نے تحریر کی دوبارہ تاکید فرمائی ہے۔ فرمایا
وَلَا تَقْسَمُوا أَنْ تَكْتُبُوهُ صَغِيرًا أَوْ كَبِيرًا إِلَىٰ أَجَلٍ ۚ مُّعَاوَاةٌ جُحُوًّا هُوَ
بڑا معمولی نوعیت کا ہوا اہم ٹسے لکھنے میں دیکھ نہ ہوں یعنی تحریر میں تاہل نہیں کرنا
چاہیے۔ بلکہ ٹسے مدت مقررہ تک لکھ لینا چاہیے۔ مستدرک امام حاکم کی روایت
ہے جسے امام ابن کثیر نے بھی بیان فرمایا ہے۔ کہ حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم
نے ارشاد فرمایا، کہ تین قسم کے آدمیوں کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ پہلا شخص وہ ہے
جو خود مومن اور عادل ہے۔ مگر اس کی بیوی بدکردار، بد اخلاق اور فاسق ہے وہ
سمجھانے سے بھی نہیں سمجھتی۔ اگر ایسا شخص برہمنی عورت کو طلاق دے کہ جدا نہیں
کرتا، تو اس کی دعا قبول نہیں ہوتی۔ کیونکہ وہ بے غیرتی کا مظاہرہ کر رہا ہے۔ دوسرا
شخص وہ ہے۔ جو کسی یتیم کا سرپرست ہے مگر یتیم کے بالغ ہونے سے پہلے
ہی اس کا مال اس کے حوالے کر دیتا ہے اور بچہ مال کو ضائع کر دیتا ہے۔ ایسے
شخص کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی، فرمایا، تیسرا شخص وہ ہے، جو کسی کو قرض دیتا
ہے مگر اسے لکھتا نہیں، یہ شخص بھی اللہ کے احکام کی خلاف ورزی کرتا ہے
لہذا اس کی دعا بھی قبول نہیں ہوتی۔

فرمایا تحریر کر لینا ذَلِكُمْ أَقْسَطُ عِنْدَ اللَّهِ اللہ تعالیٰ کے ہاں زیادہ

انصاف والی بات ہے۔ وَأَقْوَمُ لِلشَّهَادَةِ اور گواہی کو زیادہ درست رکھنے والی چیز ہے۔ وَأَدْنَىٰ أَلَا تَرْتَابُوا اور زیادہ قریب ہے کہ تم شک و شبہ میں نہ پڑو۔ یہ سب تحریر کے فوائد میں سے ہیں۔ ہاں ایک صورت میں عدم تحریر کی گنجائش ہے إِلَّا أَنْ تَكُونَ تِجَارَةً حَاضِرَةً تُدِيرُوكَ بِئْسَ كَمَدٌ کہ دست بہ دست تجارت ہو جسے تم اپنے درمیان گردش دیتے ہو۔ یعنی معاملہ ایسا ہو کہ ادھر چیز لی اور ادھر رقم ادا کر دی یعنی سودا بالکل نقد ہے۔ اس میں ادھار کا کوئی معاملہ نہیں ہے۔ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَلَّا تَكْتُبُوهَا تو پھر نہ لکھنے میں بھی کوئی حرج نہیں۔ تحریر کا مقصد قریہ ہے کہ مقرر مدت پر جب لین دین ہو، تو کوئی جھگڑا نہ کھڑا ہو جائے۔ مگر جب ادھار کا معاملہ ہی نہیں ہے۔ اور تعین مدت کا سوال ہی نہیں تو پھر تنازعہ پیدا ہونے کی کوئی وجہ نہیں ہے۔ لہذا نقد معاملے میں تحریر کی ضرورت نہیں ہے ہاں اگر ایسی صورت میں بھی کوئی لکھنا چاہے۔ تو احسن ہے۔ اگر آئندہ زمانے میں معاملے کی نوعیت معلوم کرنا چاہو، تو تحریر کے ذریعے ٹھیک ٹھیک معاملات حاصل ہو سکیں گی۔ تاہم ایک عام اصول یہ بتایا کہ لین دین کے معاملہ میں وَأَشْهَدُوا اِذَا تَبَايَعْتُمْ سَوَدًا کہ تے وقت گواہ ضرور بنا لو، اگر اس کی تحریر نہیں کرتے تو کوئی حرج نہیں۔ مگر گواہ ضرور بنا لو۔ کہ لین دین کا معاملہ ہے کسی وقت بھی کوئی تنازعہ پیدا ہو سکتا ہے جس سے عہدہ بڑھونے کے لیے گواہی ضروری ہے۔

اللہ تعالیٰ نے جہاں کتابت اور گواہ کی اہمیت بیان فرمائی ہے۔ وہاں کاتب اور گواہ کا تحفظ بھی فرمایا ہے۔ تنازعہ کی صورت میں بعض اوقات فریقین کے ساتھ کاتب اور گواہ کو بھی مشکلات پیش آتی ہیں۔ جن کی وجہ سے انہیں نقصان اٹھانا پڑتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کے زمانے میں کوئی شخص گواہی دینے کے لیے تیار نہیں ہوتا۔ وہ جانتا ہے کہ اُسے کتنی دفعہ عدالت میں حاضر ہونا پڑے گا۔ اور اُس کا کتنا وقت ضائع ہوگا۔ اور پھر جس کے خلاف گواہی دیگا۔ وہ اس کا دشمن بن جائے گا اور اُسے نقصان پہنچائے گا۔ گواہی سے باز رکھنے کے لیے کہتے

کاتب اور
گواہ کا تحفظ

گواہوں کو اغوا کر لیا جاتا ہے۔ اور بعض اوقات قتل کر دیا جاتا ہے۔ اس مقام پر اللہ تعالیٰ نے معاملے کے فریقین کو نصیحت فرمائی ہے وَلَا يُضَارُّ كَاتِبٌ وَلَا شَهِيدٌ اور نہ نقصان پہنچایا جائے بکھنے والے کو اور نہ گواہ کو۔ اگر ان اصحاب کو اور کوئی تکلیف نہ ہو تو کم از کم ان کے وقت کی قدر اور ان کی ساری کا انتظام تو ہونا چاہیے۔ تاکہ کسی دوسرے شخص کی گواہی کے لیے انہیں ذاتی طور پر نقصان نہ ہو۔ اسی لیے فرمایا کہ کاتب اور گواہ کو تکلیف نہ دو اُسے نقصان نہ پہنچاؤ۔

فرمایا وَإِنْ تَفْعَلُوا اگر تم ایسا کرو گے۔ ان شریف آدمیوں کو نقصان پہنچاؤ گے، ان کا تحفظ نہیں کرو گے۔ فَإِنَّهُ مَسْئُوقٌ بِكُمْ یہ فسق ہوگا، خدا کی اطاعت سے باہر نکلنے کے مترادف ہوگا، لہذا جہاں اپنے حقوق کا تحفظ چاہتے ہو، وہاں کاتب اور گواہ کی جان و مال کے بھی محافظ بنو، اور انہیں ناجائز تکلیف نہ پہنچاؤ۔

فرمایا وَاتَّقُوا اللَّهَ اللہ سے ڈر جاؤ۔ اس کے احکام کی خلاف ورزی نہ کرنا معاملہ دین کا ہو یا نکاح طلاق کا، ہر حالت میں خوفِ خدا کو دل سے نہ نکالنا۔ دنیا کے معاملات کے متعلق ہمیر اچھیری کر کے، دھوکا اور فریب دیکر معاملے کو رفع دفع کر لینے سے بظاہر مسئلہ ختم ہو جاتا ہے۔ مگر اللہ تعالیٰ یاد کر رہے ہیں۔ کہ یہ معاملہ ایک دین اللہ کی عدالت میں بھی پیش ہونا ہے۔ یہاں تو تم چالاک کر کے مواخذہ سے بچ جاؤ گے مگر اس سب سے بڑی عدالت کے سامنے کوئی چال کام نہیں آئیگی۔ وہاں دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی ہو کر رہے گا۔ لہذا اللہ تعالیٰ سے ڈر جاؤ جس کی عدالت میں بالآخر تمہیں پیش ہونا ہے۔ فرمایا وَيُعَلِّمُكُمُ اللَّهُ اللہ تمہیں ایسی ہی نیکی اور اچھائی کی باتیں سکھاتا ہے۔ دیوانی اور فوجداری مقدمات کے معاملات اور ان کے متعلق احکام تمہیں اللہ تعالیٰ سکھاتا ہے۔ ان پر عمل کرو گے تو اس دنیا میں بھی چین کی زندگی بسر کرو گے اور آخرت میں بھی اس کی گرفت سے بچ جاؤ گے اور یاد رکھو وَاللَّهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيمٌ اللہ تعالیٰ ہر چیز کو جانتا ہے۔ یہ نہ سمجھنا کہ وہ تمہارے حال سے ناواقف ہے بلکہ وہ تمہاری نیتوں سے بھی واقف ہے لہذا تم اس کی گرفت سے نکل نہیں سکتے

اپنے اعمال کو ہمیشہ درست رکھو گے، تو فلاح پاؤ گے۔

قرآن پاک کی یہ سب سے لمبی آیت ہے اس ایک آیت میں اللہ تعالیٰ نے
 بیسیوں مسائل بیان فرمائے ہیں۔ تاہم لہن دین کے معاملے میں دو قوانین یعنی تحریر اور
 گواہ کا بیان آچکا ہے۔ اب اگلی آیت میں تیسرے اہم قانون رہن کا تذکرہ ہوگا۔

وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفَرٍ وَلَمْ تَجِدُوا كَاتِبًا فَرِهْنَ
مَقْبُوضَهُ فَإِنْ أَهَمَّ بَعْضُكُم بَعْضًا فليُؤَدِّ الَّذِي
أُؤْتِمِنَ أَمَانَتَهُ وَلْيَتَّقِ اللَّهَ رَبَّهُ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ
وَمَنْ يَكْتُمْهَا فَإِنَّهُ إِثْمٌ قَلْبُهُ وَاللَّهُ بِمَا تَعْمَلُونَ
عَلِيمٌ (۲۸۳)

ترجمہ: اور اگر تم سفر میں ہو، اور کاتب (لکھنے والے) کو نہ پاؤ، پس رہن ہے
قبضہ کیا ہوا۔ پس اگر تمہیں بعض کو بعض پر اعتبار ہو، پس چاہیے کہ وہ شخص ادا کرے
اس چیز کو جس میں اس پر اعتبار کیا گیا ہے اور جس کے پاس امانت رکھی گئی ہے۔ وہ
اپنی امانت کو ادا کرے اور ڈرتا ہے اللہ سے جو اس کا پروردگار ہے اور مت چھپا
گواہی کو۔ اور جو شخص اس گواہی کو چھپائے گا۔ بیشک اس کا دل گنہگار ہوگا اور اللہ
جو کچھ تم کام کرتے ہو، اس کو خوب جانتا ہے۔ (۲۸۳)

ربط آیت

اس سے پہلے لین دین کے معاملے سے متعلق دو احکام کا بیان آچکا ہے۔
سب سے پہلے اللہ جل شانہ نے تحریر کے متعلق احکام اور اس کی اہمیت بیان
فرمائی۔ پھر ایسے معاملات میں گواہ کی ضرورت اور اس کی اہمیت کا ذکر فرمایا۔ اب اگلی
آیت میں تیسرے اصول یعنی رہن کے متعلق مسائل کا تذکرہ ہے۔ یعنی جب کسی کو
ادھار دو اس کے بدلے میں کوئی چیز رہن کے طور پر رکھ لو۔ جب قرضہ واپس ہوگا
تو رہن شدہ چیز واپس کر دی جائے گی۔

رہن وہ چیز ہوتی ہے۔ جو قرض کے بدلے میں کسی شخص کے پاس رکھی جاتی ہے
اور اس کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ اگر قرضہ کی رقم مقررہ مدت میں ادا نہ کی جائے تو قرض خواہ
اس چیز کو فروخت کر کے اپنی رقم پوری کر لے، اور جو کچھ باقی بچے وہ قرض کو ٹوٹنے

مکمل رہن

اس اصطلاح میں مفروض یا مدیون کو راہن کہتے ہیں کہ اُس نے کوئی چیز رہن رکھی ہے اور جس کے پاس رہن رکھی جاوے وہ مرہن کہلاتا ہے۔ رہن میں چیز پر قبضہ ہونا ضروری ہے۔ اس کے بغیر رہن مکمل نہیں ہوتا۔ فَرِهْنٌ مَّقْبُوضَةٌ میں اسی طرف اشارہ ہے رہن میں منقولہ یا غیر منقولہ کوئی بھی جائیداد رکھی جاسکتی ہے۔ مثلاً مکان، زمین، باغ۔ جانور، زیور، گاڑی وغیرہ وغیرہ۔

ارشاد ہوتا ہے۔ وَإِنْ كُنْتُمْ عَلَى سَفْسٍ اور اگر تم سفر پر ہو وَلَكُمْ تَجَارِدُوا کا تبا اور کا تب نے فَرِهْنٌ مَّقْبُوضَةٌ پس رہن ہے قبضہ کیا ہوا۔ اس آیت کریمہ میں رہن کے لیے سفر کی حالت ہونا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ تم سفر کی حالت میں ایسا کر سکتے ہو، مگر فقہائے کرام اور محدثین غظام کا اس بات پر اتفاق ہے کہ رہن حضر یعنی اقامت کی حالت میں بھی درست ہے۔ اور یہاں پر سفر کا ذکر اس لیے کیا گیا ہے کہ اس عمل کی ضرورت سفر میں زیادہ پڑتی ہے۔ خاص طور پر جبکہ بکھنے والا میسر نہ ہو تو پھر اس کے بغیر چارہ نہیں کہ مرہن راہن کی کوئی چیز بطور رہن رکھ لے۔ اور جب راہن قرضہ واپس کرے تو اپنی مرہن چیز واپس لے لے۔ اقامت کی حالت میں رہن خود حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کے عمل سے ثابت ہے، بخاری اور ترمذی شریف کی صحیح حدیث میں آتا ہے۔ کہ آپ نے اپنے گھریلو اثراجات کے لیے مدینہ کے ایک یہودی (ابو اشم) سے بیس صاع اور بعض روایات کے مطابق تیس صاع انج ادھار پر لیا تھا۔ اور اس کے بدلے میں اپنی درع یہودی کے پاس رہن رکھی تھی مگر آپ نے اپنی حیات مبارکہ میں واپس نہ لے سکے۔ آپ کے وصال کے بعد حضرت ابو بکرؓ نے قرض ادا کر کے درع واپس لی۔ مقصد یہ کہ رہن آپ نے مدینہ میں قیام کے دوران رکھا تھا۔ لہذا اس آیت میں مضر کی قید اتفاقی ہے۔

یہاں پر سوال پیدا ہوتا ہے کہ کیا مرہن رہن تندرہ چیز سے فائدہ اٹھا سکتا ہے یا نہیں مثلاً زیور پہن سکتا ہے یا نہیں، باغ کا پھل یا زمین کی پیداوار حاصل کر سکتا ہے یا کوئی دودھ دینے والا جانور ہے، تو اس کا دودھ پی سکتا ہے یا نہیں۔ اس معاملے

رہن شدہ چیز سے
فائدہ اٹھانا جائز
نہیں

میں محدثین اور فقہائے کرام کے درمیان قدرے اختلاف ہے۔ بعض فرماتے ہیں کہ
 راہن کی اجازت سے فائدہ اٹھایا جاسکتا ہے۔ مگر جمہور فقہائے کرام جن میں اہم ابوحنیفہؒ آپ
 کے شاگردان اہم ابو یوسفؒ اور اہم محمدؒ اہم زفر حسن بن زیادؒ اہم سفیان ثوریؒ وغیرہ فرماتے
 ہیں کہ رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا جائز نہیں ہے۔ وہ فرماتے ہیں کہ جن روایات سے
 استفادہ حاصل کرنے کا جواز ملتا ہے۔ وہ ابتدائی دور کی روایات ہیں جب کہ —
 سود کی حرمت نازل نہیں ہوئی تھی۔ جب سود کی ممانعت ہو گئی۔ تو رہن شدہ چیز سے
 نفع حاصل کرنا بھی جائز نہ رہا۔ ہاں نفع اٹھانا صرف ایک شکل میں جائز ہے۔ کہ جتنی
 مالیت کا فائدہ اٹھایا ہے۔ اتنی رقم قرض میں سے سہا کر دی جائے۔ مگر ہونہ چیز اور
 اس کی آمدنی سرتن کے پاس بطور امانت ہوتی ہے۔ لہذا اس سے فائدہ اٹھا کر امانت
 میں خیانت کا مرتکب ہونا قطعاً جائز نہیں۔ آجکل اکثر لوگ مکان یا زمین وغیرہ نفع اٹھانے
 کی غرض سے رہن رکھتے ہیں۔ چونکہ رہن مجبور ہوتا ہے۔ لہذا وہ اس کی مجبوری سے
 ناجائز فائدہ اٹھا کر اس سے اجازت لے لیتے ہیں۔ اس ضمن میں فقہائے کرام فرماتے
 ہیں کہ رہن کی اجازت کے باوجود سرتن کو فائدہ اٹھانے کی اجازت نہیں۔ یہ تو
 ایسا ہی ہے۔ جیسے کوئی شخص مقرض کی اجازت سے سود کو جائز قرار دے لے۔ لہذا
 رہن شدہ چیز سے فائدہ اٹھانا کسی طرح بھی جائز نہیں۔

امانت کی
 پاسداری

فَرِيَا قَانَ اٰمِنْ بَعْضُكُمْ بَعْضًا اِذَا قَالُوْا سَمِعْنَا بِكَ اٰمَنْتَ
 الَّذِيْ اَوْ تَحْصِنَ اَمَّا كُنْتُمْ تَزْحَمْنَ اَمَّا كُنْتُمْ تَزْحَمْنَ اَمَّا كُنْتُمْ تَزْحَمْنَ
 کہ اپنی امانت واپس کر دے۔ مقصد یہ ہے کہ اگر قرض خواہ دیون پر اعتبار کر کے بلا گواہ
 یا بلا رہن قرض دے دیتا ہے۔ تو پھر قرض کی رقم مقرض کے پاس امانت ہے اُسے
 یہ امانت مقررہ مدت پر واپس لوٹانی چاہیے۔ اس ضمن میں حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی
 بھی ہے۔ عَلٰی الْيَدِ حَتّٰی تَوَدَّحٰی چیز حاصل کرنے والے پر لازم ہے کہ وہ اُسے
 واپس بھی کرے اس کو این سمجھ کر رقم یا کوئی دوسری چیز دی گئی تھی۔ لہذا امانت میں
 خیانت نہیں ہونی چاہیے۔ وَلَيَسْتَقِ اللّٰهُ رَبُّهُ اور اپنے پروردگار سے ڈرنا

ہے۔ کہ اگر امانت واپس نہ کی، تو اس کا ضرور مؤخذہ ہوگا۔ اور اللہ کی گرفت سے بچ نہیں سکیگا،

کتمانِ شہادت
گنہ ہے

گو اہی کا مسئلہ پہلے بیان ہو چکا ہے۔ کہ گواہ کون ہو اور گواہی کا نصاب کیا ہے
یہاں پر شہادت کا ایک دوسرا پہلو بیان کیا گیا ہے۔ کہ اگر کوئی شخص کسی معاملے کو
جانتا ہے۔ اور وہ متنازعہ کے تصفیہ میں معاون ہو سکتا ہے۔ وَلَا تَكْتُمُوا الشَّهَادَةَ
تو پھر شہادت کو چھپانے کی اجازت نہیں ہے۔ وَمَنْ يَكْتُمْهَا اُولٰٓئِكَ يَكْتُمُهَا
کو چھپائیگا فَإِنَّهُ اَتٰهُ قَلْبُهُ تو اس کا دل گنہگار ہوگا۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ
یہاں پر دل کا اس لیے ذکر کیا گیا ہے کہ دل جسم انسانی میں ایک اعلیٰ حیثیت کا جزو
ہے۔ اگر دل کی اصلاح ہو جائے تو سارا جسم درست ہو جاتا ہے۔ اور دل کا بگاڑ پورے
جسم کا بگاڑ ہے۔ دل مرکزِ اخلاق ہے۔ عقیدہ کی اچھائی یا برائی کا تعلق بھی دل سے
ہے۔ اس لیے یہاں پر فرمایا کہ جو کوئی گواہی کو چھپائے گا۔ حقیقت میں اس کا دل گنہگار
ہے۔ اس کے دل میں فتور ہے۔ ورنہ وہ ایسی حرکت نہ کرتا۔ حضور علیہ السلام کا ارشاد گرامی
ہے کہ انسان کے جسم میں ایک لوتھر ہے۔ اگر وہ ٹھیک ہے۔ تو سارا جسم ٹھیک
ہے۔ اگر وہ بگڑ گیا ہے۔ تو سارا جسم خراب ہے فرمایا اَلَا وَهِيَ الْقَلْبُ يَادُّ رُكُودَ
لُوتھر دل ہے۔ جس پر سارے جسم کا دار و مدار ہے۔ یہ دل ایسی چیز ہے کہ جب
اللہ تعالیٰ نے دوزخ میں سزا کا ذکر کیا ہے۔ تو وہاں بھی فرمایا تَطَّلِعُ عَلَى الْآفِئِدَةِ
جہنم کی آگ کا اثر پہلے دل پر ہوگا۔ پھر جسم پر ہوگا۔ اسی لیے مفسرین کرام فرماتے ہیں
کہ جب گواہی نہ دینے سے کسی کا حق ضائع ہو رہا ہو تو پھر گواہ کے لیے لازم ہو جاتا
ہے کہ وہ ضرور گواہی دے۔ گواہ کی یہ ذمہ داری وجوب کے درجہ کو پہنچ جاتی ہے
اگر گواہی سے انکار کرتا ہے۔ تو کتمانِ شہادت کا مرتکب ہو کر گنہگار ہوگا۔ اسی طرح اگر کوئی
جھوٹی شہادت دیتا ہے۔ تو وہ بھی کتمانِ شہادت کا مرتکب تصور ہوگا۔ گویا گواہی کو چھپانا
جھوٹی گواہی دینا برابر ہے۔

شہادت کا
اصول

یہ ایک اصولی بات ہے۔ کہ جب کسی شخص پر کوئی چیز واجب ہو جائے، تو پھر

اس کی عدم ادائیگی گناہ کا باعث ہوگی۔ لہذا اس کے لیے اُس کام کا معاوضہ طلب کرنا جائز نہیں رہتا۔ اگر ایسا کرتا ہے تو اس نے واجب کی ادائیگی نہیں کی بلکہ مالی منفعہ کے لیے گواہی دی ہے۔ ہاں اتنی گنجائش موجود ہے کہ گواہی دینے پر گواہ کو بھی کوئی نقصان نہیں ہونا چاہیے۔ اگر وہ اپنی جیب سے گواہی خرچ کر کے گواہی کے لیے جاتا ہے یا اپنی سواری استعمال کرتا ہے، خورد و نوش کا سامان خود کرتا ہے۔ تو ظاہر ہے کہ اس کا مالی نقصان ہوگا۔ اگر وہ اسے خوشی سے برداشت کرنے کے لیے تیار ہے۔ تو کوئی حرج نہیں تاہم اگر وہ متعلقہ فریق کی سواری استعمال کرے، اس کی طرف سے کھانا کھائے، یا جس قدر اس کا خرچ ہوا، وہ اسے تو اس میں کوئی گناہ نہیں ہے۔ یہ اس کے لیے جائز ہے۔

فَرَمَا وَاللّٰهُ بِمَا تَعْمَلُونَ عَلِيمٌ ﴿۱۰﴾ تم جو کچھ بھی کرتے ہو، اللہ تعالیٰ کے علم میں ہے۔ اس کا علم ہر چیز پر محیط ہے حتیٰ کہ وہ تمہارے ارادوں اور مخفی عزائم سے بھی واقف ہے۔ تم غلط کام کر کے اس کی گرفت سے نہیں بچ سکتے۔ آیت کے آخر میں اللہ تعالیٰ نے تقویٰ کا حکم دیکر انسان کی مزید رہنمائی فرمائی ہے کہ اگر گرفت سے بچنا ہے۔ تو تقویٰ اختیار کرو۔ جیلے بہانے سے غلط کام کرنے کی کوشش نہ کرو۔ تم اللہ تعالیٰ سے کوئی چیز چھپا نہیں سکتے۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

البقرة ۲

درس یکصد و شش ۱۲۶

آیت ۲۸۴

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۚ وَانْ تَبَدُّوْا
 مَا فِيْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ خَفَوْهُ يَحْصِبْكُمْ بِاللّٰهِ ۚ فَيَغْفِرْ لِمَنْ
 يَّشَآءُ وَيُعَذِّبْ مَنْ يَّشَآءُ ۗ وَاللّٰهُ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ ﴿۲۸۴﴾

تس جہدہ اللہ ہی کے واسطے ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے
 اور اگر تم ظاہر کرو اس چیز کو جو تمہارے نفسوں میں ہے یا اسے چھپاؤ تو اللہ تعالیٰ اس
 کا حساب لے گا تم سے۔ پس بخش دے گا جس کو چاہے اور سزا دے گا جس کو چاہے۔

اور اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قدرت رکھتا ہے ﴿۲۸۴﴾

اختصاصی کلمات

سورۃ البقرہ کے دروس اختتام پذیر ہیں۔ اور آج کے درس سے سورۃ کا چالیسواں
 اور آخری رکوع شروع ہو رہا ہے قرآن پاک کی اس سب سے لمبی سورۃ میں مختلف الالزاع
 احکام بیان ہوئے ہیں۔ جن میں اصول بھی ہیں اور فرعی مسائل بھی ہیں، عبادات، معاملات
 مالی و جانی جہاد، نکاح و طلاق اور دیگر بے شمار مسائل بیان ہوئے ہیں۔ اس لحاظ سے
 اس سورۃ کو نام القرآن بھی کہا گیا ہے۔ گویا سورۃ مبارکہ قرآن پاک کی کوہن ہے۔ اس
 کو قرآن پاک میں بلند مقام حاصل ہے۔

سورۃ کے آخری رکوع میں قرآن پاک کو نازل کرنے والے اللہ جل جلالہ کی حاکمیت
 اعلیٰ کا بیان ہے کیونکہ اس میں مندرج تمام احکام و شرائع اسی کی جانب سے ہیں۔ اس کے
 علاوہ اس کی قدرت اور تصرف کا بیان ہے۔ کہ اقتدار اعلیٰ ابھی اسی کے پاس ہے
 اور ہر چیز کے تصرف پر بھی اُسی کا حق ہے۔ وہ جس طرح چاہے۔ اپنی پیدا کردہ اشیاء
 کو تصرف میں لائے۔ رکوع کی آخری آیات میں ایمان کی تفصیلات کا تذکرہ ہے۔
 اور پھر بالکل آخر میں اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں دعا کا قانون بتایا گیا ہے۔ اور وہ کلمات
 سکھائے گئے ہیں۔ جن کے ذریعے ایک بندے کو اپنے خالق و مالک کے حضور

دست بدعا ہونا چاہیے، اور اپنے مالکِ حقیقی سے اپنے گناہوں کی مغفرت اور اللہ تعالیٰ کی مدد کی درخواست پیش کرنی چاہیے۔

حاکمیت

اللہ تعالیٰ کی حاکمیت اعلیٰ کا اعلان اِن الفاظ میں ہوتا ہے۔ **لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ طٰوْعًا** اور زمین میں ہے سب اللہ ہی کے لیے ہے۔ یعنی کائنات کا ذرہ ذرہ اللہ تعالیٰ ہی کے لیے خاص ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ کسی چیز کی تخصیص کی تین وجوہات ہو سکتی ہیں۔ جن کی بناء پر کہا جاسکتا ہے کہ فلاں چیز کو فلاں کے ساتھ خصوصیت حاصل ہے۔ تخصیص کی پہلی وجہ یہ ہے کہ کوئی شخص کسی چیز کا بنایا والا ہو۔ مثلاً اگر کوئی شخص کوئی برتن، مشینری، اوزار بنا رہا ہے تو اس کے حق میں وہ چیز خاص ہوتی ہے۔ خصوصیت کی دوسری وجہ ملکیت ہوتی ہے جس چیز کا کوئی مالک ہے۔ اُسے اس کے ساتھ تخصیص حاصل ہے۔ اور تیسری وجہ حق تصرف ہے۔ جس شخص کو کوئی چیز تصرف میں لانے کا حق ہے۔ اُس کو بھی خصوصیت حاصل ہے۔

اب اللہ تعالیٰ کی تمام کائنات کے ساتھ تخصیص ملاحظہ فرمائیے۔ اللہ تعالیٰ میں مذکور بالا تینوں صفات پائی جاتی ہیں۔ جن کی بناء پر اُسے کائنات کے ذرہ ذرہ کے ساتھ تخصیص ہے۔ وہ ہر چیز کو بنانے والا۔ **وَهُ يَبْدِئُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ** ہے آسمان و زمین کو پیدا کرنے والی وہی ذات ہے۔ وہی ہر شے کا صانع ہے **الَّذِي اَنْشَأَ كُلَّ شَيْءٍ** ہر چیز اللہ تعالیٰ کی کمال صنعت اور کاریگری کا شاہکار ہے۔ خود انسان اللہ تعالیٰ کا بنایا ہوا ہے **لَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ فِيْ اَحْسَنِ تَقْوِيْمٍ** ہم نے انسان کو بہترین شکل و صورت میں پیدا کیا۔ حدیث شریف میں آتا ہے **وَاللّٰهُ صَافِعٌ كُلَّ صَافِعٍ وَصَنَعَهُ** ہر چیز اور اس کی صنعت کو پیدا کرنے والا اللہ وعدہ لاشریک ہے۔

چونکہ اِن تمام چیزوں کا خالق اللہ تعالیٰ ہے۔ اُسی نے ہر چیز کو بنایا ہے۔ لہذا اِن کا مالک حقیقی بھی وہی ہے **لَهُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ** کائنات

کی تمام چیزیں اس کی ملک ہیں۔ اللہ کے علاوہ انسان کو جن چیزوں کی ملکیت حاصل ہے یہ عارضی ہے اور اللہ کے حکم سے ہے۔ حقیقی ملکیت صرف خدا تعالیٰ کی ہے۔ کیونکہ اللہ تعالیٰ کے حکم سے ہی کسی انسان کی ملکیت قائم رہتی ہے۔ وہ جب چاہتا ہے کسی سے حق ملکیت سلب کر لیتا ہے۔ اور پھر نہ ملکیت باقی رہتی ہے اور نہ قبضہ۔ انسان خود فنا ہو جاتا ہے۔ اور وہ تمام چیزیں جن پر ملکیت کا دعویٰ تھا۔ یہیں رہ جاتی ہیں۔ گویا حقیقی مالک بھی ہر چیز کا اللہ ہی ہے۔

تیسری چیز تصرف ہے۔ اور کائنات کے ذرے ذرے پر اللہ تعالیٰ ہی کو کمال اور مکمل تصرف حاصل ہے۔ اگر کسی درجے کو تصرف کی اجازت ہے۔ تو وہ خاص وقت تک کے لیے اور عارضی ہے اور وہ اللہ تعالیٰ کی قدرت سے ہی ہے۔ اللہ کے سوا کسی کو ذاتی تصرف حاصل نہیں۔ چونکہ خلقت، ملکیت اور تصرف کی تینوں صفات اللہ تعالیٰ ہی میں پائی جاتی ہیں۔ اسی لیے فرمایا اللہ مَافِ السَّمٰوٰتِ وَمَافِ الْاَرْضِ اَسْمَانُ وَزَمِنْ کی ہر چیز اللہ ہی کے لیے ہے۔

اللہ تعالیٰ نے اپنی مالکیت اعلیٰ بیان کرنے کے بعد بنی نوع انسان سے فرمایا وَلَنْ تُبَدُّوْا مَافِیْ اَنْفُسِكُمْ اَوْ تَخْفَوْهُ يَحْسِبْكُمْ بِهٖ اللّٰهُ جَمِیْعًا تمہارے دلوں میں ہے، تم اسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اس کا حساب لے گا یہاں پر یہ بات قابل غور ہے۔ کہ کسی اچھے یا بُرے کام کا مرتکب ہونا اور کسی چیز کا محض دل میں خیال آنا، دو مختلف چیزیں ہیں۔ کسی غلط کام کے کرنے سے مجاہدے کا عمل تو نہ ہن میں آتا ہے۔ محض دل میں کسی خیال کے آجانے سے مجاہدہ کیا ہو گا جب کہ یہ ایک غیر اختیاری چیز ہے۔ اس ضمن میں شاہ رفیع الدین محدث دہلوی فرماتے ہیں کہ انسان کے نفس میں جو چیزیں آتی ہیں، وہ پانچ اقسام ہیں۔ ان میں سے پہلی چیز احمقہ دہے۔ انسان کا اعتقاد کیا ہے، وہ توحید پر کار بند ہے یا شرک میں طوشت ہے۔ اس کے دل میں اخلاص پایا جاتا ہے۔ یا نفاق سے پُر ہے۔ اور پھر یہ بھی کہ اُسے اللہ تعالیٰ پر سچتہ یقین ہے یا وہ تردد اور شک کا شکار ہے۔ اعتقاد

سے متعلق جو کچھ بھی اس کے دل میں پایا جاتا ہے۔ اس کا محاسبہ ہوگا۔ اگر وہ مؤحد مخلص اور اللہ پر یقین رکھنے والا ہے۔ تو اللہ کے ہاں جزا پائیگا اور اگر مشرک، منافق یا متردد ہے۔ تو سزا کا مستحق ہوگا۔ بہر حال ہر انسان کا اعتقاد قابل محاسبہ اور قابل مواخذہ ہے۔

دوسری چیز جس پر محاسبہ کا دار و مدار ہے، محبت یا نفرت کا جذبہ ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے اَفْضَلُ الْأَعْمَالِ الْحُبُّ فِي اللَّهِ وَالْبُغْضُ فِي اللَّهِ محض اللہ کی خاطر محبت یا نفرت ہونا اچھے اعمال میں سے ہے۔ ایسا شخص اللہ کے ہاں جزا کا حقدار ہے۔ اور جس کے دل میں جذبہ محبت و نفرت اپنی ذاتی اغراض یا غیر اللہ کے لیے ہے۔ وہ لازماً سزا کا مستوجب ہوگا۔ دوسری حدیث میں فرمایا من احب لله والبغض لله واعطى الله ومنع الله فقد استكمل الايمان جس نے اللہ کی خاطر کسی سے محبت کی۔ اُسی کی خاطر نفرت کی۔ اُسی کی خاطر دیا اور اسی کی خاطر نہ دیا۔ تو اس نے ایمان کو مکمل کر لیا۔ ایک اور روایت میں اَنْكَحَ لِلّٰهِ کے الفاظ بھی آتے ہیں۔ یعنی کسی کو اللہ کے لیے نکاح کر دیا تو وہ کامل ایمان دار بن گیا۔ مقصد یہ ہے کہ دل میں آنے والے محبت یا نفرت کے جذبات اپنی اپنی نوعیت کے اعتبار سے قابل محاسبہ ہیں۔

اس ضمن میں تیسری چیز فرمایا نیت اور عزم ہے۔ کسی کام کو کرنے یا نہ کرنے سے متعلق اچھی یا بُری نیت قابل محاسبہ ہے۔ اگر کوئی شخص اچھائی کا کام کرنے کی محض دل سے نیت کرتا ہے۔ اور ابھی اس پر عمل درآمد شروع نہیں کیا، تو اسکو نیکی حاصل ہو جاتی ہے۔ اور پھر جب نیک عمل کو کر گزرتا ہے۔ تو دس نیکیوں کا حقدار ہو جاتا ہے۔ جہاں تک بُری نیت کا متعلق ہے۔ محض نیت پر مواخذہ نہیں ہے۔ البتہ جب اس نیت یا ارادے کے مطابق عمل کرے گا۔ تو اس کے نامہ اعمال میں صرف ایک ہی برائی لکھی جائیگی، اور وہ قابل محاسبہ ہوگا۔

نفس انسانی میں غیر اختیاری طور پر آنے والی چوتھی چیز اخلاق ہے۔ اور اس میں تقویٰ، زہد، حرص، لالچ وغیرہ آتے ہیں۔ کسی انسان کے اندر جس قدر تقویٰ اور زہد ہوگا

اُسی قدر اُس کے درجات بلند ہوں گے۔ اس کا ہر عمل اُس کے تقویٰ اور زہد کے ساتھ پرکھا جائیگا۔ اور اگر کوئی شخص حرص، لالچ یا دیگر قبیح اشیاء کا شکار ہے۔ تو پھر اس کے مطابق اس کا فیصلہ ہوگا۔ بہر حال اخلاق بھی قابلِ محاسبہ اور قابلِ مواخذہ ہیں۔ پانچویں چیز جس پر محاسبہ انسانی کا انحصار ہے، وہ خطرات ہیں جو انسان کے دل میں کھٹکتے رہتے ہیں۔ ان خیالات کی کئی قسمیں ہیں۔ جن میں سے بعض قابلِ مواخذہ ہیں اور بعض پر کوئی گرفت نہیں۔ پہلی چیز ایسا خیال ہے جو انسان کے دل میں پیدا ہوتا ہے کہ فلاں غلط کام کرنا چاہیے۔ مگر فوریہ خیال خود بخود چلا جاتا ہے۔ ایسے خیال پر کوئی مواخذہ نہیں طے حارجس کہتے ہیں۔ دوسری قسم کا ایسا خیال ہے جو انسان کے دل و دماغ پر وارد ہو کہ کچھ دیر قائم رہتا ہے اور پھر زائل ہو جاتا ہے اسے خاطر کتے ہیں اور اس پر بھی کوئی محاسبہ نہیں۔ تیسری قسم کا خیال ایسا ہے کہ چب تیر آتا ہے تو اس سے انسان لطف اندوز بھی ہوتا ہے، اُسے کو ہم کہتے ہیں۔ اور ہماری امت میں ایسے خیال کا بھی کوئی محاسبہ نہیں، چوتھی قسم کا خیال حدیثِ نقض ہے۔ کہ انسان خود اپنے دل میں کوئی ایسی ویسی قابلِ مواخذہ بات کہتا ہے جس پر عمل نہیں کرتا ایسے خیال پر بھی امت محمدیہ پر کوئی مواخذہ نہیں اگرچہ بالبقہ امتیں قابلِ مواخذہ تھیں اس ضمن میں حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا قول مشہور ہے۔ کہ ایسے خیالات سے بچا کرو۔ کیونکہ جس گھر میں جھوٹا اٹھتا ہے۔ وہ اگرچہ جلاتا تو نہیں مگر گھر کو سیاہ ضرور کر دیتا ہے۔ اس قسم کے خیالات انسان پر ضرور اثر انداز ہوتے ہیں۔ لہذا معلوم ہوا، کہ پہلی امتیں اس سے مستثنیٰ نہ تھیں تاہم ہماری امت میں اس خیال پر بھی کوئی مواخذہ نہیں۔

فرمایا ان خطرات کی پانچویں قسم وہ عزم اور ارادہ ہے جس کے ذریعے انسان برائی پر عملدرآمد میں پختہ ہو جاتا ہے۔ ایسے خیالات کا دل میں آنا قابلِ مواخذہ ہے۔ جب یہ آیت نازل ہوئی، کہ تم اپنے دل کی بات ظاہر کر دیا چھپاؤ، یُکاسِیْکُوْا بِاللّٰهِ اللّٰہ تم سے حساب لیگا، تو صحابہ کرام پریشان ہو گئے۔ اور حضور علیہ السلام سے عرض کیا۔ حضور؟ ہم نماز، روزہ، صدقہ، جہاد وغیرہ کی تکالیف برداشت کر سکتے ہیں

مگر اب ایک ایسی چیز کا حکم آیا ہے۔ جو ہمارے بس میں نہیں۔ دل میں خیالات کا آنا ایک ایسی چیز ہے جسے از خود ٹال نہیں سکتے۔ اگر اس پر محاسبہ شروع ہو گیا، تو ہمارے لیے کوئی جائے رفتن نہ ہوگی۔ ہم اللہ کے ہاں کیسے سرخرو ہوں گے۔ حضور علیہ السلام نے فرمایا اقم اس طرح کے لوگ نہ بنو جس طرح موسیٰ علیہ السلام کی قوم تھی۔ جنہوں نے کہا تَحْصِعْنَا وَنَعَصِفْنَا یعنی ہم نے احکام کو سن لیا مگر ان پر عمل نہیں ہو سکتا۔ بلکہ تمہارا کام یہ ہے کہ اللہ مالک الملک کی طرف سے جو بھی حکم آئے اس کے سامنے تسلیم خم کر دو اور اس کیلئے جذبہ اطاعت کا اظہار کر دو۔ اور اللہ تعالیٰ نے بخشش کی دعا مانگو، چنانچہ جیسا کہ آگے آ رہا ہے صحابہ کرام ہر حکم کی تصدیق اس طرح کیا رہے تھے۔ سَمِعْنَا وَأَطَعْنَا عَفْوًا لَكَ رَبَّنَا یعنی اے ہمارے رب ہم نے تیرا حکم سن لیا۔ اسکی اطاعت کی۔ تو ہمیں معاف فرما دے۔ چنانچہ حضور علیہ السلام نے صحابہ کے سوال کے جواب میں فرمایا کہ اللہ تعالیٰ میری امت کے دلوں میں آنے والے دوسو سال پر مواخذہ نہیں فرمائیں گے۔ بلکہ گرفت ان کی ہے جو دل سے نکل کر زبان پر آجائیں گے۔ یا انکی پر عمل درآمد ہو جائے گا جب تک عمل نہیں ہوگا، ایسے خیالات پر مواخذہ نہیں ہوگا۔

حضرت امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ باطل اعتقادات، برے اخلاق یا فاسد نیت جو دل میں راسخ ہو جاتے ہیں۔ ان پر اللہ تعالیٰ مواخذہ کرے گا ایمان مین حضرت عائشہ صدیقہؓ اسکی اس طرح توجیہ فرماتی ہیں کہ مواخذہ تو ہر چیز پر ہوتا ہے مگر انسان کو جو تکلیفیں اور مصیبتیں پہنچی رہتی ہیں، وہ ایسے اعمال کا کفارہ بن جاتی ہیں اور انسان محاسبے سے بچ جاتا ہے۔ حضور کا فرمان ہے کہ جب کسی شخص کو کوئی کانٹا چھو جائے، بھٹو کر لگ جائے۔ یا وہ کوئی چیز رکھ کر بھول جائے تو اس وجہ سے اس کو جو پریشانی لاحق ہوتی ہے، وہ اسکی خطاؤں کا کفارہ بن جاتی ہے۔ اور انسان جب دنیا سے جاتا ہے تو پاک صاف ہوتا ہے۔

فرمایا محاسبے کے اس قانون کے باوجود **فَيَغْفِرُ لِمَن يَشَاءُ** اللہ تعالیٰ

جسے چاہے معاف کر دے۔ جس شخص میں بخشش حاصل کرنے کی صلاحیت موجود ہوگی، اللہ تعالیٰ اُسے معاف فرمائے گا۔ وَيُعَذِّبُ مَنْ يَشَاءُ اور جو سزا کے قابل ہوگا، اُسے سزا میں مبتلا کر دے گا۔ اللہ تعالیٰ عادل ہے۔ وہ کسی کو ناجائز تکلیف میں نہیں ڈالتا۔ کیونکہ اس کا اپنا فرمان ہے وَمَا كُنْ بِظِلَالٍ لِّلْعَبِيدِ اللہ تعالیٰ اپنے بندوں پر ظلم کرنے والا نہیں ہے۔ اس کے ہاں رائی کے ایک دینے کے برابر بھی کسی پر ظلم نہیں ہوگا۔ اس سے پہلے بھی آچکا ہے وَأَنْتُمْ لَا تَظْلِمُونَ تم پر ظلم نہیں کیا جائے گا۔ تمہارے ساتھ انصافی نہیں ہوگی اور یہ بھی فرمایا كُلُّكُمْ لَهَا ہر شخص کو پورا پورا بدلہ دیا جائے گا۔

فرمایا یہ سزا اور جزا اللہ تعالیٰ کو ہی سزا دار ہے۔ کیونکہ وَاللَّهُ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ۔ اللہ تعالیٰ ہر چیز پر قادر ہے۔ وہ مالک ہے اور اسے حق حاصل ہے۔ کہ وہ جس طرح چاہے تصرف کرے۔ الغرض گذشتہ دروس میں آنے والے ہزاروں مسائل کا یہ اجتماعی تبصرہ ہے۔ کہ مالک الملک جو چاہے کرے۔ وہ جو بھی حکم دے، بندوں کا فرض ہے کہ اسکی تعمیل کریں۔ اور ہر مشکل حکم پر اس سے آسانی کی دعا کریں اور اس کے ساتھ بخشش طلب کریں۔

تِلْكَ الرُّسُلُ ۳

الْبَقَرَةِ ۲

درس یکصد و بیست و ہفت (۱۲۷)

آیت ۲۸۵

أَمِنَ الرَّسُولُ بِمَا أُنْزِلَ إِلَيْهِ مِنْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ ط
 كُلٌّ آمَنَ بِاللّٰهِ وَمَلٰئِكَتِهِ وَكُتُبِهِ وَرُسُلِهِ لَا نُفَرِّقُ
 بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ قَدْ وَقَلُّوا سَبْعًا وَاطْعَنَّا ثَغْرَكَ
 رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ ۲۸۵

ترجمہ: ایمان لایا ہے رسول اُس چیز پر جو اس کے پروردگار کی طرف سے اس پر اتاری گئی ہے۔ اور مومن بھی ایمان لائے ہیں۔ سب ایمان لائے ہیں۔ اللہ پر، اس کے فرشتوں پر، اس کی کتابوں اور اس کے رسولوں پر (اور وہ یہ کہتے ہیں) ہم نہیں تفریق کرتے کسی میں اس کے رسولوں میں سے۔ اور انہوں نے کہا کہ ہم نے سن لیا اور ہم اطاعت کرتے ہیں۔ ہم تیری بخشش چاہتے ہیں اے ہمارے پروردگار! اور تیری طرف ہی لوٹ کر جانا ہے (۲۸۵)

گزشتہ آیت میں محاسبہ کا تذکرہ تھا۔ کہ جو کچھ تمہارے دلوں میں ہے اُسے ظاہر کرو یا چھپاؤ، اللہ تعالیٰ اُس کا حساب لیگا۔ نزول آیت پر صحابہ کرام کو سخت تشویش ہوئی۔ کہ اگر غیر اختیار می خیالات پر بھی النان کی گرفت ہو گئی، تو حجابات مشکل ہو جائے گی۔ صحابہ کرام نے اپنی تشویش کا ذکر حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم سے کیا۔ تو آپ نے ارشاد فرمایا۔ تم یہودیوں کی طرح یوں نہ کہو سَمِعْنَا وَعَصَيْنَا یعنی ہم نے سن لیا اور انکار کر دیا۔ بلکہ اس قسم کی صورت حال میں یوں کہا کرو۔

سَمِعْنَا وَاطْعَنَّا ہم نے سن لیا اور مان لیا۔ اور اس کے بعد اللہ تعالیٰ سے معافی مانگو۔ چنانچہ صحابہ کرام نے دل کی پوری محبت کے ساتھ کہا "سَمِعْنَا وَاطْعَنَّا عَفْرَاكَ رَبَّنَا وَإِلَيْكَ الْمَصِيرُ"

اس آیت میں درحقیقت اللہ تعالیٰ نے صحابہ کرام کی تعریف فرمائی ہے۔ صحابہ کرام

کیونکہ انہوں نے دلی محبت کے ساتھ اللہ تعالیٰ کے احکام کو قبول کیا۔ اور اس میں کسی قسم کا لیت و لعل نہ کیا۔ بلکہ اللہ کے حضور اپنی عاجزی کا اظہار کیا، جس کی وجہ سے اللہ تعالیٰ کو صحابہؓ کی ادائپند آئی اور اس کے ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام کا ذکر مبارک بھی ہے۔ جس کی وجہ سے صحابہؓ کی شان مزید بلند ہو گئی۔ مولانا شاہ اشرف علی تھانویؒ فرماتے ہیں کہ اس آیت میں اللہ نے صحابہؓ کے ساتھ حضور نبی کریمؐ کا ذکر کر کے یہ بات واضح کی ہے کہ صحابہؓ کرامؓ بھی حضور کی طرح ایماندار تھے۔ اور ان کے ایمان حضور کے ایمان کے ساتھ سٹے ہوئے ہیں۔ اگرچہ پیغمبر کا ایمان اکمل درجے کا ہوتا ہے۔ اور صحابہؓ کا ایمان کامل درجے کا۔ مگر دونوں طرح کے ایمانوں کو باہم ملانے سے صحابہؓ کرامؓ کے درجات کی بلندی کی نشان دہی ہوتی ہے صحابہؓ کرامؓ کی اس اطاعت گزاری پر اللہ تعالیٰ نے ارشاد فرمایا اَمَّا الرَّسُولُ فَمِمَّا كُنَّا مِنْكُمْ

بِمَا كُنَّا مِنْكُمْ رَبِّهِ وَالْمُؤْمِنُونَ جَوِزٌ رَّسُولٍ کی طرف اس کے رب کی طرف سے اتاری گئی تھی۔ رسول اس پر ایمان لایا۔ اور اس کے ساتھ مومن بھی ایمان لائے۔ یہاں پر ایک بات توجہ ثابت ہوتی ہے کہ شریعت نبی پر نازل ہوتی ہے کسی غیر نبی پر نہیں۔ اور دوسرے یہ کہ صحابہؓ بھی اس چیز پر ایمان لائے جس پر پیغمبر لایا ہے۔ توجہ صحابہؓ کرامؓ کی مدح ہو گئی۔ اور ان کی حوصلہ افزائی ٹھہری اور یہ کیفیت اس وقت پیدا ہوئی جب کہ صحابہؓ نے کمال عاجزی و انکساری کے ساتھ اللہ کے حکم کو قبول کیا۔ اور اپنی لغزشوں کی معافی طلب کی۔

اور آگے ایمان کے ارکان کا بیان ہے اَمَّا بِاللَّهِ سَرَب کے سب صحابہؓ کرامؓ اللہ تعالیٰ پر ایمان لائے۔ بنیادی طور پر ایمان کے پانچ ارکان ہیں جن کی درل سے تصدیق کرنا ضروری ہے۔ ورنہ ایمان مکمل نہیں ہو گا۔ یہ ارکان سب سے پہلے اللہ پر ایمان لانا، پھر فرشتوں پر، رسولوں پر، کتابوں پر اور قیامت کے دن پر ایمان لانا ہے۔ شاہ عبد القادر احمٰدؒ کا ترجمہ مان لیا کرتے ہیں یعنی دل سے تسلیم کر لیا۔ گویا درل سے تصدیق کرنے کا نام ایمان ہے۔ اگرچہ زبان سے اقرار

تصدیق
بالقلب

بھی لازم ہے۔ مگر اس کی تکمیل تصدیق قلبی سے ہی ہوتی ہے۔ اِقْدَارٌ بِاللِّسَانِ
وَقَصْدٌ بِلِقَابِ الْقَلْبِ

ایمان باللہ

سب سے پہلے ایمان باللہ کا درجہ ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کے وجود کا قائل ہونا
کیونکہ یہ بنیادی چیز ہے۔ نہ صرف اس کا وجود ہے بلکہ وہ واجب الوجود بھی ہے
یعنی اس کا وجود خود بخود ہے۔ کسی دوسرے کا بتایا ہوا نہیں ہے۔ اللہ کے علاوہ
ہر چیز کا وجود عطا کیا ہوا ہے اور عارضی ہے مگر اللہ ہی ایک واحد ذات ہے
جو واجب الوجود ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ذاتی نام ہے۔ اور اس لفظ میں یہ چیز پائی جاتی
ہے۔ واجب الوجود المستجمع لجميع صفات کمال واجب الوجود
وہ ذات ہے جس میں تمام صفات کمال پائی جاتی ہیں۔ وہ ذات مبدء عن
النقص والذوال ہے۔ اس ذات میں نہ کوئی غیب ہے اور نہ کوئی نقصان
والی چیز ہے۔ وہ ہمیشہ سے ہے اور ہمیشہ دائم و قائم رہے گا۔ اُسے کبھی زوال
نہیں آئے گا۔ جب لفظ اللہ بولا جاتا ہے تو یہ تمام صفات اس میں آجاتی ہیں۔
فارسی زبان میں جب اللہ کا ترجمہ خدا کیا جاتا ہے۔ تو اس کا معنی بھی یہی ہے۔ کہ وہ
ہستی جو خود بخود ہے۔ کسی دوسرے کی محتاج نہیں، گویا یہ لفظ بھی واجب الوجود کا
ہی ہم معنی ہے کہ وہ ذات خود بخود ہے اور جمیع صفات کمال کے ساتھ
متصف ہے۔ وہ ذات نقص و زوال جیسی صفات سے پاک ہے۔

اللہ تعالیٰ کی صفات کمال کا ذکر قرآن پاک میں موجود ہے۔ اور ان ہی سے
اللہ کی پہچان ہوتی ہے۔ ان صفات میں الرحمن، الرحیم، المالك، القهار، السار
الصمد، الغنی، المحی القيوم وغیرہ ہیں۔ یہ سب وجودی یا مثبت صفات ہیں۔
اور اللہ تعالیٰ کی بعض منفی صفات ہیں مثلاً "لَوْ يَلِدُ وَلَوْ يُؤَلِّدُ، لَوْ
يَخْذُ وَلَدًا، لَوْ تَكُنْ لَهُ صَاحِبَةٌ،" یعنی نہ اس کی اولاد ہے۔ اور
نہ وہ کسی کی اولاد ہے اور نہ اس کی بیوی ہے۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ ———
کھاتا ہے اور نہ پیتا ہے۔ "لَا تَأْخُذْهُ سِنَّةٌ وَلَا نَوْمٌ" اس کو نہ اونگھ آتی

ہے اور نہ غنہ آتی ہے۔ اللہ تعالیٰ ان تمام عیب اور نقصان والی صفات سے پاک اور منزہ ہے۔ جب سبحان اللہ کہا جاتا ہے تو اس کا معنی ابھی یہی ہے کہ خدا تعالیٰ نقصان اور عیب والی صفات سے پاک ہے۔ نہ اس کو تھکاوٹ ہوتی ہے۔ اور نہ اُس پر موت طاری ہوتی ہے۔ الحمد للہ کا بھی یہی معنی ہے کہ وہ تمام صفات کمال کا مالک ہے۔

صفات الہی
پر ایمان

جس طرح اللہ کی ذات پر ایمان لانا ضروری ہے۔ اسی طرح اس کی صفات پر ایمان لانا بھی لازمی ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ مثلاً کوئی شخص اللہ تعالیٰ کی ہستی کو مانتا ہے۔ مگر توحید کو نہیں مانتا، تو وہ ایماندار نہیں ہے۔ یا ایک کی بجائے دو یا تین الہ مانتا ہے جیسے مجوسی یا عیسائی وغیرہ، تو بھی مشرک اور کافر ہو گیا۔ اگر توحید میں کوئی خرابی آئے گی تو انسان کافر ہو جائے گا۔ حضرت امام شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں کہ اگر کوئی شخص خدا کی ہستی کو ماننے کے باوجود کہتا ہے کہ اللہ تعالیٰ ہدایت کے لیے رسول نہیں بھیجتا، تو پھر بھی کافر ہے۔ کیونکہ رسول معبودت کرنا اللہ کی صفت ہے۔ جس سے انکار کیا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت آدم علیہ السلام سے لے کر حضور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم تک ایک لاکھ سے زیادہ انبیاء اور رسول بھیجے ہیں اور آخر میں آپ کو مکمل پروگرام دے کر سلسلہ نبوت کو ختم کر دیا ہے اب قیامت کا انتظار ہے۔ کوئی نیا پروگرام نہیں آئے گا۔

اللہ تعالیٰ کی ایک صفت تقدیر بھی ہے۔ حضرت ابو ہریرہؓ اور حضرت عبداللہ بن عمرؓ کی روایت میں تصریح ہے کہ جب تک کوئی تقدیر پر ایمان نہیں لائے گا، خدا کی بارگاہ میں اس کی عبادت مقبول نہیں۔ خواہ وہ اھد پائڑ کے برابر سونا خرچ کر دے اور تقدیر کا مطلب یہ ہے کہ جو کچھ کائنات میں ہو چکا ہے، ہو رہا ہے یا آئندہ ہوگا، سب کچھ اللہ تعالیٰ کے علم، قدرت اور مشیت سے ہوتا ہے وَالَّذِي قَدَّرَ فَهَدَىٰ وہی ذات ہے جس نے تمام چیزوں کو مقدر فرمایا ہے لہذا لفظ اللہ میں تقدیر پر ایمان لانا بھی

فرشتوں پر
ایمان

اگیا، کیونکہ یہ اللہ کی صفت ہے اور اس کی تمام صفات پر ایمان لانا ضروری ہے
فرمایا رسول اور اس کے صحابہ اللہ پر ایمان لائے۔ وَمَلٰئِكَتُہٗ اور اس کے
فرشتوں پر بھی ایمان لائے، فرشتوں پر ایمان لانا، ایمان کا دوسرا رکن ہے جس کے
پہلے فرشتوں کے وجود پر ایمان لانا ہوگا۔ اور پھر فرشتوں کی بہت سی قسمیں
ہیں۔ جیسے۔ ملائع الاعلیٰ اور ملائع السافل، عرش کے گرد گھومنے والے فرشتے،
علین میں رہنے والے، آسمانوں پر مقیم اور پھر فضا میں بہنے والے، زمین پر رہنے والے
یہ تمام فرشتوں کی مختلف اقسام ہیں۔ اہم شاہ ولی اللہ فرماتے ہیں۔ ملائع الاعلیٰ
سے ملائع السافل تک فرشتوں کی سات قسمیں متعین ہیں اور ہر ایک قسم کو اللہ تعالیٰ
نے الگ الگ اور مختلف نوعیت میں پیدا کیا ہے۔ جو فرشتے ملائع الاعلیٰ والے
ہیں وہ اعلیٰ ترین یا نفیس ترین ہیں۔ میلے فرشتے خواہ اوپر کے ہوں یا نیچے
کے دوسری مخلوق سے لطیف تر ہیں۔ اس نورانی مخلوق میں روح عقل اور شعور
پایا جاتا ہے۔ وہ ہر وقت اللہ تعالیٰ کی تعریف بیان کرتے رہتے ہیں۔ اور یہ
عبادت الہی سے نہ تھکتے ہیں نہ اکتاتے ہیں۔ وہ معصوم ہیں۔ اللہ تعالیٰ کی نافرمانی
کبھی نہیں کرتے۔ لَا یَعْصُونَ اللّٰہَ مَا اَمَرَہُمْ ؕ اور اللہ تعالیٰ انہیں
جو کچھ حکم کرتا ہے۔ اس کی تعمیل کرتے ہیں وَکَیْفَ عَمُوْنَ مَا یُؤْمَرُوْنَ
یہ اللہ تعالیٰ کی مقرب مخلوق ہے۔ اللہ تعالیٰ کا جو فیضان کائنات میں پہنچتا
ہے وہ انہی فرشتوں کے ذریعے پہنچتا ہے فرشتوں کے بعد لطافت کے
لحاظ سے دوسرے درجے کی مخلوق جنات ہیں۔ مگر وہ معصوم نہیں ہیں۔ بنی نوع
الانسان میں سے صرف انبیاء کی جماعت معصوم ہے باقی کسی مخلوق کو یہ گارنٹی حاصل
نہیں ہے۔

لطیف مخلوق ہونے کی وجہ سے فرشتے ہمیں اس دنیا میں نظر نہیں آتے
ہاں اگر وہ شکل تبدیل کر لیں تو انسانوں کو بھی نظر آ سکتے ہیں۔ حضور علیہ السلام کے زمانہ
مبارک میں جب جبرائیل علیہ السلام وحیہ کلبیؑ یا کسی ماسفر کی صورت میں آتے تھے، تو

نظر آتے تھے۔ عالم بزرخ اس مادی جہاں سے لطیف ہے اور حشر اس سے بھی زیادہ لطیف ہے۔ جب انسان اس جہاں میں پہنچیں گے، تو ان میں بھی کمال درجے کی لطافت پیدا ہو جائیگی، لہذا سب کو فرشتے نظر آئیں گے۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ جنتی لوگوں کے پاس فرشتے آکر سلام کہیں گے۔ سَلَامٌ عَلَیْكُمْ طِبْتُہُمْ غَرْضِیکُمْ فرشتوں پر ایمان لانا بھی ارکانِ ایمان میں سے ہے۔

کتبوں پر
ایمان

ایمان باللہ اور ایمان بالملائکہ کے بعد فرمایا وَکُتِبَہُ یعنی حضور رسول مقبول اور صحابہ کرام اللہ تعالیٰ کی کتبوں پر بھی ایمان لائے ہیں۔ کتب جمع کا صیغہ ہے۔ کہ کہ اجمالاً تمام آسمانی کتب پر ایمان لانا اور تفصیلاً قرآن پاک پر ایمان لانا ضروری ہے۔ قرآن پاک کا ہر حکم صحیح، برحق اور واجب التعمیل ہے۔ پہلی کتابیں بھی اللہ تعالیٰ نے مختلف ادوار میں لوگوں کی ہدایت کے لیے نازل فرمائیں۔ ان کے تمام احکام پر عمل کرنا ہمارے لیے ضروری نہیں ہے۔ کیونکہ ان میں سے اکثر احکام منسوخ ہو چکے ہیں۔ تاہم ان کے سنزل من اللہ ہونے پر ایمان لانا ضروری ہے

رہا یہ سوال کہ اللہ نے کل کتنی کتابیں نازل فرمائی ہیں۔ اس بارے میں قرآن پاک کی کسی آیت یا کسی صحیح روایت میں کوئی تصریح نہیں ملتی۔ ہاں بزرگانِ دین کی روایت سے معلوم ہوتا ہے کہ چار کتابیں تو بڑی ہی ہیں یعنی زبور، تورات، انجیل اور قرآن پاک اس کے علاوہ کچھ چھوٹی کتابیں یا صحیفے ہیں۔ اہم شافعی کی روایت کے مطابق ایک سو چار کتابیں اور صحیفے اللہ نے نازل فرمائے۔ ہر نبی کے لیے کتاب کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ بہت سے انبیاء اپنے سے قبل آنے والی کتاب کی ہی پیروی کا درس دیتے رہے۔ مثلاً نزولِ تورات کے بعد جتنے نبی آئے وہ تورات کی ہی تبلیغ کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ کی جانب سے ان پر وحی آتی تھی، مگر قانونِ تورات کا ہی چلتا تھا۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے صحیفوں کا ذکر آتا ہے۔ اسی طرح یونس علیہ السلام اور بعض دیگر انبیاء کے صحیفے بھی تھے۔ موجودہ بائبل یعنی تورات کے ساتھ ۹ صحیفے اور انجیل بھی ہے۔ پہلے پانچ باب تورات کے ہیں اور باقی دس کنونینوں کے

صحیفے میں۔ اس طرح یہ سب غلط طے ہو چکا ہے۔ یہود و نصاریٰ نے اللہ کی کتابوں میں بہت گڑبڑ کی ہے۔ مگر کچھ چیزیں آج بھی صحیح ہیں اور قرآن کے مطابق ہیں۔ یہ روایت بھی مشہور ہے کہ حضرت ادریس علیہ السلام پیمپس صحیفے نازل ہوئے تھے۔ بہر حال آسانی کتابوں پر ایمان لانا ارکان ایمان میں سے ہے۔

رسولوں پر ایمان

آگے ایمان کے چوتھے جزو کے متعلق فرمایا وَرَسُولٍ یعنی اللہ کے تمام رسولوں پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ اس کے بغیر ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ اگر کوئی شخص اللہ کے رسولوں میں سے کسی ایک کا بھی انکار کرے گا۔ تو کافر ہو جائے گا۔ نصاریٰ کو دیکھ لیں۔ سابقہ تمام انبیاء کو مانتے ہیں مگر حضور خاتم النبیین کو تسلیم نہیں کرتے، لہذا کافر ٹھہرے۔

تمام رسولوں پر ایمان لانے کی کیفیت اللہ تعالیٰ نے اس طرح بیان فرمائی لَا تَفَرِّقُوا بَيْنَ أَحَدٍ مِّنْ رُّسُلِهِ ہم اللہ کے رسولوں کے درمیان تفریق نہیں کرتے۔ یعنی ایسا نہیں ہے کہ کسی رسول کو مان لیا اور کسی کا انکار کر دیا۔ یہودیوں کا یہی حال ہے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان ہے۔ مگر حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے منکر ہیں۔ حضور خاتم النبیین کو بھی نہیں مانتے، لہذا یہ کافر ہی ہیں۔ جب تک ہر رسول پر ایمان نہ رکھیں خواہ ان کا نام معلوم ہے یا نہیں۔ اللہ تعالیٰ نے جس جس دور میں جس جس نبی کو مبعوث فرمایا۔ وہ سب اس کے برگزیدہ بندے تھے۔ اپنی اپنی قوم کے ہادی اور راہنما تھے، ہم ان سب کی تصدیق کرتے ہیں وَمَا أَوْفَى النَّبِیُّونَ مَن رَّبُّهُمْ جو کچھ بھی اللہ نے اپنے نبیوں کو دیا ہے سب برحق ہے۔ اور ہمارا ان پر ایمان ہے لَا تَفَرِّقُوا کا یہی معنی ہے۔

حضرت ابوذر غفاریؓ کی روایت میں موجود ہے۔ انہوں نے عرض کیا حضور انبیاء کرام کا سلسلہ کیسے شروع ہوا۔ تو آپؐ نے فرمایا کہ سب سے پہلے بنی آدم علیہ السلام تھے۔ گویا سب سے پہلے انسان بنی تھے۔ صحابی نے عرض کیا حضور کیا وہ بنی تھے ارشاد فرمایا، ہاں بنی مکلم تھے۔ اللہ نے ان سے کلام فرمایا تھا۔ اور سب سے آخری بنی

حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم ہیں۔ روایت میں یہ بھی ہے کہ مجموعی طور پر ایک لاکھ چوبیس ہزار ایک سو وپیش نبی اور رسول آئے ہیں۔ ان میں سے رسول تین سو تھے تین سو پندرہ اور تین سو پچیس کی روایت بھی آتی ہیں۔ بہر حال یہ سب برحق نبی اور رسول تھے۔ رسول وہ ہوتا ہے جس کو مستقل شریعت ملے، اُسے کتاب کا ملنا ضروری نہیں ہے۔ شریعت ضروری ہے۔ مثلاً حضرت اسماعیل علیہ السلام اللہ کے رسول تھے مگر اُن پر مستقل کتاب نازل نہیں ہوئی۔

الغرض! تفریق بین المرسل کفر ہے۔ تمام انبیاء اور رسل پر ایمان لانا ضروری ہے اگر کسی ایک کا بھی انکار کیا۔ تو سب کے انکار کے مترادف ہو گا۔ اس آیت میں ایمان کے اجزاء بیان ہو چکے اور ساتھ ساتھ حضور علیہ السلام کے صحابہ کی تصریح بھی بیان ہو گئی۔

وَقَالُوا سَمِعْنَا اِنْ سَبَّ نَعْمًا فِي سُبْحَانَكَ رَبَّنَا رَبِّهِمْ لَئِنْ لَمْ يَنْتَفِعْ بِهِنَّ مِنْكَ فَمَا هُنَّ اِلَّا كَذٰبٌ مِّنْ عِندِكَ عَلِيمٍ

جو کچھ نازل فرمایا ہے۔ وہ ہم تک پہنچ گیا۔ وَاَطَعْنَا اور ہم اس کی دل و جان سے فرمانبرداری کرتے ہیں۔ اطاعت کرتے ہیں۔ کسی چیز کا انکار نہیں کرتے۔ غُفْرَانَكَ رَبَّنَا اے پروردگار! ہم تجھ سے بخشش کے طلبگار ہیں۔ ہمیں بخش دے۔ اور ہماری کوتاہیوں کو معاف کر دیا جائے۔ بخیران کا معنی اڑھانپ دینا ہوتا ہے۔ یہاں مقصد یہ ہے کہ ہماری لغزشوں کو اپنی بخشش کے پردے میں ٹھانی لے۔ ان پر کوئی باز پرس نہ کرنا۔

محبش کی طلب

قیامت
پر ایمان

اب ایمان کے پانچویں جزو کے متعلق فرمایا وَ اٰتَيْتُكَ الْمَصِيْرَ ۔
اور تیری ہی طرف لوٹ کر جانا ہے۔ گویا معاد یعنی قیامت پر ایمان لانا بھی ضروری
ہے۔ کہ ایک وقت آئے گا۔ جب قیامت برپا ہوگی۔ پھر سب کو اللہ تعالیٰ کی
عدالت میں حاضر ہو کر اپنے اپنے اعمال کی جوابدہی کرنا ہوگی۔ اس کے بغیر بھی انسان
کا ایمان مکمل نہیں ہوتا۔ گویا یہ ایمان کے پانچ جزو ہو گئے، توحید، رسول، ملائکہ،
کتاب اور قیامت کا دن۔ درجہ مقام پر فرمایا وَ بِالْاٰخِرَةِ هُمْ يُوقِنُوْنَ ۔

وہ آخرت کے دن پر ایمان رکھتے ہیں۔ وہ اس جہاں کا آخری دین ہوگا۔ اس کے بعد دوسرے جہاں کے ایام شروع ہو جائیں گے۔ اور ان کی نوعیت الگ ہوگی۔ لہذا آخرت کے دن (Day of Judgment) پر ایمان لانا بھی ضروری ہے۔ کہ وہ دن آنے والا ہے۔ جب حساب کتاب ہوگا۔ اور اس کے نتیجے میں جزا یا سزا اور جنت یا دوزخ کی منزل برحق ہے۔ جب انسان کو ملکوت بنایا گیا ہے۔ تو پھر اس کے لیے جزا و سزا کا ہونا بھی لازمی ہے۔ اس کی تصدیق ضروری ہے۔ ورنہ آدمی کافر ہو جائے گا۔ جب تک ایمان کے تمام ارکان پر ایمان نہیں لائے گا، گرفت سستی نہیں بچ سکتا۔ یہ وہی اجزائے ایمان ہیں۔ جن کے متعلق سورۃ کی ابتداء میں اشارہ کیا گیا تھا۔

يُؤْمِنُونَ بِالْغَيْبِ یعنی متقین وہ ہیں جو بن دیکھے ایمان رکھتے ہیں۔ یہاں پر اسی چیز کی تشریح ہے۔ کہ وہ کون کون سے امور ہیں۔ جن پر ایمان لانا ضروری ہے۔ تو یہاں پر واضح کر دیا کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بمع اسی صفات، ملائکہ، کتابیں رسول اور روز قیامت ان سب پر ایمان لانا ضروری ہے۔ حالانکہ نہ ملائکہ کو دیکھا، نہ رسول کو اور نہ قیامت کو دیکھا مگر ان پر ایمان لانا ضروری ہے۔ یہی ایمان بالغیب ہے۔

لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا لَهَا مَا كَسَبَتْ وَعَلَيْهَا
مَا اكْتَسَبَتْ رَبَّنَا لَا تُؤْخِذْنَا إِنْ نَسِينَا أَوْ أَخْطَانَا
رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْ عَلَيْنَا إَصْرًا كَمَا حَمَلْتَهُ عَلَى
الَّذِينَ مِنْ قَبْلِنَا رَبَّنَا وَلَا تُحَمِّلْنَا مَا لَا طَاقَةَ لَنَا بِهِ
وَاعْفُ عَنَّا وَاقْفُ وَأَعْفِرْ لَنَا وَاقْفُ وَارْحَمْنَا أَنْتَ مَوْلَانَا
فَاَنْصُرْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ ﴿۲۸۶﴾

۲۸۶

ترجمہ: اللہ تعالیٰ کسی نفس کو تکلیف نہیں دیتا مگر اس کی طاقت کے مطابق۔ اس
نفس کے لیے وہی ہے جو اس نے کیا۔ اور اس کے اوپر وبال بھی اُس چیز کا ہے
جو اس نے کیا۔ اے ہمارے پروردگار! ہم سے مواخذہ نہ کر اگر ہم بھول جائیں یا غلطی کر
جائیں۔ اے ہمارے پروردگار! ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے ان لوگوں پر ڈالا جو
ہم سے پہلے گزرے ہیں۔ اے ہمارے پروردگار! اور نہ اٹھاؤ ہم سے وہ چیز جسکی
ہم طاقت نہیں رکھتے۔ اور درگزر کر دے ہم سے۔ اور بخش دے ہم کو اور ہم پر
رحم فرما۔ تو ہی ہمارا آقا ہے۔ پس کافر قوم کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ ﴿۱۸۶﴾

دین آسان
ہے

مسلم شریف کی روایت میں موجود ہے کہ جب صحابہ کو تشریش لاحق ہوئی کہ
کہیں دل میں پیدا ہونے والے غیر اختیاری خیالات پر اللہ تعالیٰ کی گمراہی نہ آجائے، تو
نبی علیہ السلام نے انہیں فرمایا کہ تم موسیٰ علیہ السلام کی قوم کے برعکس لیوں کہا کہ وَتَسْمِعُنَا
وَاطْعُنَا غُفْرَانُكَ رَبَّنَا وَلَئِنْكَ الْمَصِیْنُ چنانچہ جب صحابہ کرامؓ نے
دل کی گہرائیوں سے یہ کلمات کہے اور اللہ تعالیٰ سے معافی مانگی تو حضور علیہ السلام نے
انہیں صحابہ کو تسلی دی کہ غیر اختیاری چیزوں پر اللہ تعالیٰ مواخذہ نہیں کرتا۔ اور پھر اللہ تعالیٰ
نے ایک عام قائل بنادیا کہ لَا يَكْلِفُ اللَّهُ نَفْسًا إِلَّا وُسْعَهَا اللہ تعالیٰ

کسی جان کو تکلیف میں نہیں ڈالتا۔ مگر اس کی طاقت کے مطابق کسی کی قوت برداشت سے زیادہ بوجھ ڈالنا عقل کے بھی خلاف ہے جس چیز پر انسان کا بس ہی نہیں اس پر مجاہد کرنا یکے روا ہو سکتا ہے۔ بلکہ دین اسلام میں تو آسانی کا قانون کام کر رہا ہے۔ اسی سورۃ میں رمضان کے روزوں کے متعلق گزر چکا ہے۔ "يُرِيدُ اللَّهُ بِكُمُ الْيُسْرَ وَلَا يُرِيدُ بِكُمُ الْعُسْرَ" اللہ تعالیٰ تمہارے ساتھ آسانی چاہتا ہے۔ وہ تمہارے ساتھ تنگی کا ارادہ نہیں کرتا۔ وہ تو رحمن اور رحیم ہے۔ وہ کسی کوتاہی میں نہیں ڈالتا۔ قرآن کریم میں دو سکر مقام پر آتا ہے "مَا جَعَلَ عَلَيْكُمُ فِي الدِّينِ مِنْ حَرَجٍ" اللہ تعالیٰ نے دین میں تنگی نہیں ڈالی حضور علیہ السلام کا ارشاد ہے "الدِّينُ يُسْرٌ" دین آسان ہے۔ اس میں کسی پر سختی نہیں کی گئی، نماز کے متعلق آتا ہے۔ "فَإِنْ لَّمْ تَسْتَطِعْ اَکْمِدْ طَاقَتَكَ" نہ ہو کہ کھڑے ہو کر نماز ادا کر سکو فَصَلِّ قَاعِدًا تو بیٹھ کر پڑھ لو۔ اور بیٹھ کر بھی نہیں پڑھ سکتے فَعَلَى جَنْبٍ تو لیٹ کر پہلو کے بل پڑھ لو۔ گویا ہر شکل کے وقت اللہ تعالیٰ نے رخصت دی ہے جو چیز انسان کے بس میں نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس پر مجبور نہیں کیا ہے۔ اگر کوئی شخص نابینا ہے تو اسے دیکھنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ کیونکہ اس میں دیکھنے کی صلاحیت ہی موجود نہیں ہے۔ اسی طرح جس شخص کے پاؤں کٹے ہوئے ہوں اُسے چلنے پر مجبور نہیں کیا جاسکتا۔ اور جس کے ہاتھ موجود نہ ہوں۔ اسے کوئی چیز پکڑنے کے لیے نہیں کہا جائے گا۔ اسی طرح اللہ تعالیٰ کسی شخص کو اسکی صلاحیت سے زیادہ تکلیف میں نہیں ڈالتے، اور غیر اختیاری باتوں پر اس کا مواخذہ نہیں ہوتا۔ اسی لیے فرمایا لَهَا مَا كَسَبَتْ انسان کے لیے وہ چیز ہے جو اس نے کائی وَحَلَمَهَا مَا كَسَبَتْ اور جو کچھ اپنے ارادہ اور اختیار کے ساتھ کمائے گا وہی اس کو مفید ہوگی۔ اور اسی چیز کا اس پر وبال پڑے گا۔ گویا اچھی چیز کا اچھا بدلہ ملے گا اور بُرائی پر مواخذہ ہوگا۔ اہم شاہ ولی اللہ محدث دہلویؒ فرماتے ہیں کہ انسانی افعال اس کے اخلاق، نیت اور اندرونی ملک کے مطابق سرزد ہوتے ہیں۔ ان پر مواخذہ ہوتا ہے۔

بھول اور
خطا میں فرق

نیان یا بھول ایسی غلطی کا نام ہے۔ جس میں نیت یا ارادے کو دخل نہ ہو۔ بلکہ کوئی کام بھول کر ہو جائے اور خطا سے مراد یہ ہے کہ نیت کچھ اور کام کی ہوتی ہے مگر عمل کوئی دوسرا ہو جاتا ہے۔ مثلاً روزے کی حالت میں کلی کی نیت سے منہ میں پانی ڈالا مگر وہ حلق سے نیچے اتر گیا۔ کسی شخص نے شکار کے جانور کے لیے گولی چلائی مگر وہ کسی انسان یا دوسرے جانور کو لگ گئی، یہ خطا ہوتی ہے۔ اور آخرت میں اس پر کوئی گناہ نہیں ہوگا۔ البتہ دنیا میں اس کی دیت اور کفارہ دینا پڑتا ہے۔ اگر کوئی شخص خطا قتل ہو گیا ہے۔ تو اس کا خول بہا بھی دینا پڑیگا اور کفارہ کے طور پر دو ماہ کے روزے بھی رکھنے ہوں گے۔

اور اگر کسی کو عمدہ قتل کیا ہے۔ تو اس کا دنیا میں بھی قصاص ہوگا اور آخرت میں اللہ کے ہاں بھی مواخذہ ہوگا۔ (اگر توبہ نہ کی ہو) بھول اور خطا میں یہ فرق ہے۔
بھول کے متعلق حضور علیہ السلام کی حدیث میں آتا ہے۔ **إِنَّ اللَّهَ كَفَعَ عَنْ أُمَّتِي الْخَطَاءَ وَالنِّسْيَانَ وَمَا اسْكُرَهُ عَلَى عَيْنِ اللَّهِ تَعَالَى** نے میری امت سے ایسے گناہ کو اٹھا دیا ہے۔ جو بھول، خطا یا جبر کی وجہ سے سرزد ہو۔ ایسے عمل پر کوئی مواخذہ نہیں ہوگا۔ اگر کسی کو مجبور کر کے کوئی کام کرایا جائے تو وہ اگر اس کیلئے مثلاً کوئی شخص دوسرے کو مجبور کر دے کہ شراب پی لو یا فلاں کام کر دو ورنہ تجھے قتل کر دیا جائے گا۔ توبہ عمل اگر اچھا ہوگا۔ اور اللہ کے ہاں اس پر کوئی محاسبہ نہیں ہوگا۔

بھول اور
خطا پر مواخذہ
نہیں

البتہ دنیا میں ایسے امور کی تلافی کرنا پڑتی ہے۔ حدیث شریف میں آتا ہے کہ اگر کوئی شخص نماز پڑھنا بھول جائے، تو جس وقت اس کو یاد آئے اس وقت ادا کرے۔ اگر ایک دفعہ بھول گیا ہے تو اب بالکل ترک نہیں کر سکتا۔ بلکہ بعد از وقت بھی ادا کرنا ہوگی۔ اسی طرح روزہ کی حالت میں غلطی سے پانی حلق کے اندر چلا گیا۔ تو اگرچہ عذر اللہ اس کا مواخذہ نہیں۔ مگر جو روزہ ضائع ہوا، اس کی قضا دینا ہوگی۔ البتہ روزہ میں بھول کر کھانے پینے کی معافی ہے۔ ایسی صورت کے متعلق حضور علیہ السلام نے فرمایا **أَطْعَمَهُ اللَّهُ وَسَقَاهُ** اللہ نے اس کو کھلایا یا پلایا۔ اس کا روزہ مکمل

ہوگی۔ اسے روزہ دوبارہ کھنے کی ضرورت نہیں۔ اسی طرح اگر بھول کر بغیر طہارت کے نماز پڑھ لی، تو اسے ٹوٹنا ہوگی۔ اس کی نماز نہیں ہوئی۔

چنانچہ اسی نسیان اور خطا کے متعلق اللہ تعالیٰ نے دعائیہ کلمات کھائے۔ کہ دعائیہ کلمات
اے میرے بندو! جب بھول جاؤ یا خطا ہو جائے تو مجھ سے ان کلمات کے ساتھ معافی
طلب کر لیا کرو رَبَّنَا اِنْ تَوَلَّوْنَا فَاَوْخِطْنَا لَآ اَنْ نَّسِيَنَّآ اَوْ اَخْطَاْنَا اے ہمارے پروردگار
اگر ہم بھول جائیں یا ہم سے خطا ہو جائے تو ہمارا مؤخذا نہ کر۔ حضور علیہ السلام نے ارشاد
فرمایا کہ سورۃ بقرہ کے آخر میں جو دعائیں مذکور ہیں۔ جب بندہ ان کو ادا کرتا ہے۔ تو
ہر دعا کے اختتام پر اللہ تعالیٰ فرماتا ہے نَعَمْ قَدْ فَعَلْتَ یعنی اے میرے بند
ہاں! میں نے ایسا کر دیا، تیری دعا قبول کر لی۔

اس کے بعد دعا کا اگلا حصہ فرمایا رَبَّنَا وَلَآ تَحْمِلْ عَلَيْنَا اِصْحَابُ
ہمارے پروردگار! تو ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال کَمَا حَمَلْتَهُ عَلَی الَّذِیْنَ مِنْ
قَبْلِنَا جیسا کہ تو نے ہم سے پہلے لوگوں پر بوجھ ڈالا۔ یہاں پر بوجھ سے مراد وہ
مشکل احکام ہیں۔ جو پہلی امتوں پر وارد ہوئے۔ بعض سرین کرام مثلاً کے طور پر فرماتے
ہیں۔ اسرائیلیوں پر پانچ سو سے زیادہ نمازیں فرض تھیں لہذا وہ امت محمدی سے زیادہ
مشکل میں تھے۔ بعض امتوں کو ہمیشہ روزے رکھنے کا حکم تھا اور بنی اسرائیل کی شریعت
میں یہ حکم بھی تھا۔ کہ جس کپڑے پر نجاست لگ جاتی تھی وہ دھونے سے پاک نہیں ہوتا
تھا۔ بلکہ قیمتی سے قیمتی کپڑا بھی نجاست والی جگہ سے کاٹ ڈالنا پڑتا تھا۔ اسی طرح
بنی اسرائیل حلال جانور کا گوشت تو کھا سکتے تھے مگر اس کی چربی استعمال نہیں کر
سکتے تھے۔ لہذا وہ گوشت نے چربی کو مشکل علیحدہ کر کے پھر کھاتے تھے اللہ تعالیٰ
نے ان کی توبہ قبول کر کے ان کی توبہ قبول ہوئی اپنے
ہزاروں کی تعداد میں بنی اسرائیل قتل ہوئے، تب جا کر ان کی توبہ قبول ہوئی اپنے
مال کا چوتھا حصہ انہیں بطور زکوٰۃ ادا کرنا پڑتا تھا۔ حدیث شریف میں آتا ہے۔
کہ جو کوئی آدمی گناہ کا مرتکب ہوتا تھا۔ تو رات کے وقت فرشتے اس کے دروازے

پر کھنٹتے تھے۔ جس سے اسکی سخت رسوائی ہوتی تھی۔ اللہ تعالیٰ نے اس قسم کے بوجھ سابقہ امتوں پر ڈال رکھے تھے جن کے متعلق یہاں پر دُعا کی جا رہی ہے کہ اے پروردگار ہم پر ایسا بوجھ نہ ڈال جیسا تو نے پہلی امتوں پر ڈالا تھا۔ رَبَّنَا وَلَا تَحْمِلْنَا مَآلًا طَاقَةً لَّنَا بِهِ اور ہم سے وہ چیز نہ اٹھاؤ جسکی ہم طاقت نہیں رکھتے۔ بعض مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ تَحْمِلْ عَلَيْنَا سے شرعی احکام کا بوجھ ہے۔ جس کے متعلق دُعا کی گئی ہے کہ ہم پر مشکل احکام نہ ڈال اور لَا تَحْمِلْنَا سے مراد وہ قدرتی آفات و بلیات ہیں جو کسی قوم پر نازل ہو جائیں۔ تو یہاں پر اُن تکوینی مصائب کا ذکر کیا گیا ہے۔ کہ مولا کریم! ہم سے ایسے قدرتی مشکلات کا بوجھ بھی نہ اٹھاؤ کہ جس کی ہم طاقت ہی نہیں رکھتے۔ مقصد یہ کہ ہمیں شرعی اور تکوینی ہر دو مشکل امور سے محفوظ رکھے۔

معافی کی درخواست

وَاعْفُ عَنَّا اے پروردگار! ہم کو معاف فرمائے۔ ہماری خطاؤں سے مراد گنہ گراؤں کا عفو و کفاروں کی معافی کا معنی دینا ہوتا ہے۔ یعنی ہماری تمام لغزشوں کو اپنی رحمت سے ڈھانپ دے۔ وَلَا تَحْمِلْنَا ہم پر رحم فرما۔ ہم پر مہربانی فرما اَنْتَ هُوَ لَنَا تَدْعُو ہمارا مولا ہے۔ جیسا کہ قاموس قرآن لکھتے ہیں لفظ مولا بچپن معنوں میں استعمال ہوتا ہے۔ تاہم اس مقام پر مولا کا معنی آقا اور کار گزار ہے۔ یعنی ہمارے کاموں کا بنانے والا اور ہماری سرپرستی کرنے والا تو ہی ہے۔

مولا معبود کے معنوں میں بھی آتا ہے۔ اس کا معنی اساتھی، صاحب، رفیق وغیرہ بھی ہے۔ مفسرین کرام فرماتے ہیں کہ یہاں پر مراد ہمارا آقا ہے۔ متولی امورنا ہمارا کاموں کو بنانے والا، ہماری حاجات پوری کرنے والا۔ اے مولا کریم! تو ہی ہے فَانصَبْنَا عَلَى الْقَوْمِ الْكَافِرِينَ اور کافروں کے مقابلے میں ہماری مدد فرما۔ یعنی ہم کو غلبہ عطا فرما۔

حضرت امام شاہ ولی اللہؒ فرماتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے مسلمانوں کو کافروں پر غلبے کی نعمت بھی عطا فرمائی ہے مگر اس شرط کے ساتھ کہ وہ اہل دین اپنے دین پر قائم رہیں۔ جیسا کہ دوسرے مقام پر فرمایا "اَنْتُمْ اَلْاَعْلَوْنَ اِنْ كُنْتُمْ مُّؤْمِنِينَ"۔

غلبہ اسلام

اگر تم صحیح ایمان پر قائم رہو گے، تو تم ہی غالب آؤ گے۔ خلفائے راشدین کا زمانہ اس غلبے کا بہترین ثبوت ہے۔ صفین کے واقعہ تک مسلمان نصف دنیا پر غالب تھے۔ اور باقی دنیا میں بھی کوئی ایسی طاقت نہیں تھی۔ جو اہل ایمان سے ٹکڑے سکے۔ یہ غلبہ صرف پچاس سال تک قائم رہ سکا۔

غرضیکہ اگر دین طے دین پر قائم رہیں اور عام لوگ ان کے معاون ہوں، نفاق سے بچتے رہیں۔ بدعت سے بیزار رہیں امر بالمعروف اور نہی عن المنکر پر قائم ہوں، رشوت سود اور دیگر حرمت سے بچتے رہیں، تو کسی غیر قوم کو مسلمانوں پر تسلط حاصل نہیں ہو سکتا۔ جب مسلمانوں میں یہ قباحتیں پیدا ہو جائیں گی، تو دوسری قومیں ان پر مسلط ہو جائیں گی اور یہ مغلوب ہو کر رہ جائیں گے۔ اب دیکھ لیجئے یہ تمام لغتیں مسلمانوں میں موجود ہیں۔ حرام خمری عام ہے بدعت کا چرچا ہے۔ بلکہ اس کو عین کار ثواب سمجھ کر اس پر اصرار کیا جا رہا ہے۔ بدعت کے علاوہ لوگ شرک میں ڈوبے ہوئے ہیں۔ کسی حکومت نے امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کا فریضہ انجام نہیں دیا۔ زبانی جمع خمری ہو رہا ہے۔ عمل صفر کے برابر ہے۔ منافق کی تمام علامتیں مسلمانوں میں موجود ہیں۔ ان حالات میں اسلام کو غلبہ کیوں کر حاصل ہو سکتا ہے۔ اللہ تعالیٰ ہمیں معاف فرمائے اور صحیح دین اختیار کر نیکی توفیق عطا فرمائے۔

حضور علیہ الصلوٰۃ والسلام نے سورۃ بقرہ کو فسطاط القرآن فرمایا ہے۔ یعنی یہ سورۃ قرآن پاک کا بڑا خیمہ ہے۔ جس طرح ایک بڑے خیمے میں بہت سے ساز و سامان رکھنے اور رہائش کی گنجائش ہوتی ہے۔ اسی طرح اس سورۃ مبارکہ میں اللہ تعالیٰ نے نظام خلافت کبریٰ کے تمام اصول و فرائض بیان کر دیے ہیں۔ اس سورۃ میں دعوت الی التوحید والہدایہ کا بیان ہے۔ قرآن کریم کی حقانیت اور صداقت بیان کی گئی ہے۔ فرائض خمسہ کے علاوہ جہاد، نظام سلطنت اور بے شمار مثالیں اور حکمت کی باتیں اس سورۃ میں پائی جاتی ہیں، اس لیے طے فسطاط القرآن کہا گیا ہے۔

سورۃ بقرہ کی خصوصیت

ایک دوسری حدیث میں اس سورۃ کو تمام القرآن یعنی قرآن کی کوٹن سے تعبیر

کیا گیا ہے۔ جس طرح اونٹ کی کومان سے بلند ہوتی ہے۔ اسی طرح قرآن پاک میں یہ سورۃ بلند مرتبہ رکھتی ہے۔ اس سورۃ مبارکہ کی آخری دو آیتیں حضور علیہ السلام کو معراج کے موقع پر عطا ہوئی تھیں۔ اَمِنْ الرَّسُولِ لِيَكْرِ قَوْمَ الْكَافِرِينَ تک کی آیتیں معراج کا خاص تحفہ ہے۔ پانچ نمازیں بھی معراج کا تحفہ ہے جو حضور امت کے لیے لائے۔ اور تیسرا تحفہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم یہ لائے۔ کہ میری امت کا جو شخص خدا تعالیٰ کے ساتھ کسی کو شریک نہیں بنایگا، اس کی غلطیوں کو معاف کر دیا جائے گا۔ ان آیات کی اہمیت اسی امر سے واضح ہے کہ ان میں اسلام کے ارکان خمسہ کا بیان ہے۔ جو سب سے اہم چیز ہیں۔ اور پھر اس میں اللہ کی مناجات ہے اور اس سے دعا کا طریقہ سکھایا گیا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔ کہ جو شخص ان آیات کو رات کے وقت تلاوت کرے گا۔ یہ آیات اس کے لیے ساری رات کی عبادت کے قائم مقام ہو جائیں گی۔ یا فرمایا تجھ کے قائم مقام ہوں گی بشرطیکہ انسان فرائض کا پابند ہو اور خلوص نیت کے ساتھ تلاوت کرے۔ یہ بڑی فضیلت والی آیتیں ہیں۔ انہیں ورد کے طور پر اختیار کر لینا چاہیے ایک روایت میں یوں آتا ہے۔ کہ عرش معلیٰ کے نیچے اللہ تعالیٰ کا ایک خزانہ ہے سورۃ بقرہ کی یہ آخری دو آیتیں اللہ تعالیٰ نے اس خزانہ میں سے نازل فرمائی ہیں۔ ان آیات کی اس قدر فضیلت ہے۔ سبحانک اللہم وبحمدک

فضائل آیت
آخر سورۃ

احکام حج

مع زیارات

مکنا المکرمہ و مدینۃ المنورہ

مرتب

مولانا حاجی محمد فیاض خان سواتی

ملنے کا پتہ: بھکتہ درس القرآن فاروق گنج گوہر النورہ۔ صفحات ۱۲۸ قیمت ۱۷ روپے